تاریخ عربی ادب

جلد اول۔ زمانہ جاہلیت

جلد دوم۔ رسول پاکؐ سے خلفائے راشدینؓ تک

ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

پرنٹ لائن پبلشرز

تاریخ عربی ادب

جلد اول۔ زمانہ جاہلیت

جلد دوم۔ رسول پاکؐ سے خلفائے راشدینؓ تک

ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

پرنٹ لائن پبلشرز

7234002 723 [illegible]89 [illegible]

فہرست

تیسرا باب

چوتھا باب

اصحاب المجمہرات

اصحاب المنتقیات

صعالیک

جلد دوم

دوسرا باب

از: حضرت مولینا ابوالحسن علی حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مقدّمہ

جلد اوّل

ہندوستان میں اسلام کی آمد اور مسلمانوں کی سکونت و استقرار کے بعد سے عربی زبان و ادب کے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری ہے۔ اسلام اور عربی زبان کا ایسالازوال رشتہ ہے کہ وہ کسی عہد اور کسی ملک میں بھی منقطع نہیں ہوسکتا۔ عربی زبان میں قرآن مجید کے نزول نے اس کی ابدیت اور جہاں گیری پر آخری مہر لگادی ہے۔ اور اب اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں نے نہ صرف یہ کہ عربی زبان کی اہمیت محسوس کی اور اس کو ہر دور میں سینے سے لگائے رکھا بلکہ اس کی خدمت و اشاعت اور توسیع و ترقی میں اپنا مخصوص کردار ادا کیا۔ اور انھوں نے تصنیف و تالیف کے میدان میں نہ صرف یہ کہ اہل زبان کی ہمسری و رفاقت کی بلکہ کبھی کبھی ان کی رہنمائی اور رہبری کا فرض بھی انجام دیا اور نہ صرف یہ کہ اہل زبان کی ہم زبانی اور ہم نوائی کی جرأت کی جو ایک عجمی قوم کے لیے سرمایۂ فخر و مباہات ہے بلکہ کبھی کبھی جدّت و اجتہاد سے بھی کام لیا۔ شاہراہ عام سے ہٹ کر نئی روشیں پیدا کیں اور قصر ادب میں بعض نئے نئے دریچے اور نئے روزن بھی کھولے۔ مثال کے طور پر اس جدت و جرأت کا سہرا ایک ہندوستانی عالم ہی کے سر ہے کہ اس نے ایک مستند ترین معجم (لغت) کی شرح کا بیڑا اٹھایا اور اس میں زبان کی ایسی ادا شناسی اور نکتہ سنجی کے نمونے پیش کئے کہ اہل زبان نے بھی اس کی زبان دانی اور دقیقہ رسی کا اعتراف کیا۔ میرا اشارہ علامہ مجدالدین فیروزآبادی کی شہرہ آفاق لغت "القاموس المحیط" کی عربی شرح "تاج العروس" کی طرف ہے۔ جو تیرھویں صدی کے مشہور ہندوستانی فاضل علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی معروف بزبیدی (م ۱۲۰۵ھ) کے قلم سے دس ضخیم جلدوں میں نکلی ہے اور پانچ ہزار

صفحات پر مشتمل ہے۔ میرے علم میں نہ صرف عربی زبان بلکہ کسی دوسری زبان میں بھی کسی عظیم وضخیم لغت کی شرح کی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات پر سب سے زیادہ مستند اور مفصل کتاب ایک ہندی ہی عالم کے قلم سے، کشاف اصطلاحات الفنون کے نام سے نکلی اور پوری علمی دنیا میں مقبول ہوئی۔ اس کے مصنف قاضی محمد اعلیٰ تھانوی بارھویں صدی کے علماء میں ہوئے ہیں۔

عربی لغت ومعاجم کے میدان میں اس خدمت کے ماسوا ہندوستانی علماء نے اور میدانوں میں بھی اپنی ذہانت قوت ایجاد واختراع سے کام لیا۔ مولانا سید عبد الجلیل بلگرامی اور ان کے نامور نواسے میر غلام علی آزاد بلگرامی نے فن بلاغت وبدیع اور فن عروض میں نئے اضافے کئے اور عربی شاعری میں ہندوستانی موزونیت طبع اور ہندی وفارسی شاعری کے پیوند لگا کر ذہن وذوق میں نئی تحریک اور جمود وتقلید کی ساکن سطح میں نیا تموج پیدا کیا۔ جسٹس کرامت حسین لکھنوی اور مولانا سید سلیمان اشرف بہاری نے فقہ اللسان اور المبین کے ذریعے عربی زبان کے فلسفہ لغت اور نحو واشتقاق کے بہت سے اسرار کی نقاب کشائی کی اور اپنی سلامتِ ذوق اور جودتِ طبع کے نادر نمونے پیش کیے۔

لیکن عجیب بات ہے کہ ہندوستان میں تاریخ ادب عربی پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ یہاں صدیوں سے سبعہ معلقہ اور متنبی نظم میں اور مقامات حریری نثر میں زیر درس چلی آرہی ہیں۔ لیکن کوئی کتاب ایسی نصاب میں داخل نہیں تھی جس سے طلبا کو دور جاہلیت، دور اسلامی (عہد اموی وعہد عباسی) کا فرق معلوم ہو اور وہ ہر دور کے نامور شعراء کے ناموں، ان کے اسالیب، ان کے طبقات اور ان کی خصوصیات سے واقف ہوں، یا عربی زبان وادب کے ارتقا اور عہد بعہد کی تبدیلیوں اور خارجی اثرات کی کارفرمائی کا ان کو کچھ بھی اندازہ ہو۔ خود اصحاب معلقات، شعرائے حماسہ اور متنبی کے حالات زندگی، ان کے عہد اور ماحول کا ان کے کلام کے پس منظر اور ان کی شاعری کی اندرونی وبیرونی محرکات کا کچھ علم ہو۔ وہ جب معلقات یا حماسہ پڑھتے ہیں تو ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک تاریک سرنگ سے گزر رہے ہیں جس میں ان کو اپنے چپ وراست اور گرد وپیش کا کوئی علم نہیں۔ اگر ان کتابوں کی شرح میں چند سطریں کسی شارح نے ان شعراء کے متعلق لکھ دی ہیں تو وہ ان کو بے دلی سے پڑھ لیتے ہیں اور نہ یہ بھی نہیں۔ تنقید ادب (النقد الادبی) اور فلسفہ تاریخ تو بہت دور کی چیز ہے ان کو بقدر ضرورت بھی ان شعراء وادباء اور ان کے عہد کے متعلق ابتدائی معلومات بھی حاصل نہیں ہوتیں، اس کی وجہ سے ان سے شعرا کے زمانے کا تعین، ان کے معاصرین یا ممدوحین کے عہد کے بارے میں نثر تلمیحات، واشارات کے سمجھنے میں بڑی

بڑی افسوسناک غلطیاں ہو جاتی ہیں جن سے ان کو اہل فن کے سامنے خفت اٹھانی پڑتی ہے اور وہ اس نقص کی وجہ سے ان شعراء کے کلام یا زبان و ادب سے حقیقی لطف اٹھانے اور ان کا مرتبہ متعین کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں تقریباً نصف صدی سے زیادہ سے عربی زبان وادب کے نصاب کی اصلاح وتکمیل اور اس کی توسیع و ترقی کا کام شروع ہوا۔ اس بارے میں بہت سے اچھے اقدامات کئے گئے بہت سی مفید کتابیں شامل کی گئیں جو عربی زبان وادب کی صحیح نمائندگی کرتی ہیں اور ان سے زبان کا صحیح ذوق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن تاریخ ادب عربی کی طرف توجہ بڑی تاخیر سے شروع ہوئی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہندوستان میں سب سے پہلے استاذ محترم مولانا خلیل عرب نے جو ایک صحیح الذوق اور کامل الفن معلم تھے اس علم کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے روشناس کرایا۔ اس وقت تک خود عربی زبان میں صرف جرجی زیدان کی کتاب "تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" جو چار جلدوں میں ہے مشہور رہتی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ مصنف نے ادب عربی کو اس کے وسیع مفہوم میں لیا ہے اور وہ کتاب عربی واسلامی ثقافت پر ایک اوسط درجے کی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ضخیم کتاب کا یہاں کے مدارس اور جامعات میں پڑھانا ممکن نہ تھا۔ عرب صاحب نے اس کے خلاصے کو داخل نصاب کروایا۔ اس کا نام مختصر تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" اور اس کے مصنف کا نام توفیق دیان مصری ہے۔ عرصے تک یہ کتاب لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل رہی اور میں نے بھی مولانا خلیل عرب صاحب سے خانگی مدرسے میں یہ کتاب پڑھی اور بہت فائدہ اٹھایا۔ میں اسی کتاب کے ذریعہ اول اول تاریخ ادب عربی سے روشناس ہوا اور وہ اجنبیت و ناواقفیت دور ہوئی جو عربی کے طلبا کو اس ملک میں ماحول عہد اور طبقات شعراء سے ہوتی ہے۔ غالباً اسی زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے اردو میں تاریخ الادب العربی پر کتاب لکھی جو اس وجہ سے کہ اردو میں اس وقت تک اس موضوع پر کوئی کتاب نہ تھی خاصی مقبول ہوئی اس موقع پر اس حقیقت کا اعتراف کرنا ایک اخلاقی فرض ہے کہ اس میدان میں یونیورسٹیاں ہمارے عربی مدارس سے سبقت لے گئیں۔ انھوں نے اس مضمون کی اہمیت کو بہت پہلے محسوس کیا اور اس کو اپنا جزو نصاب بنایا۔ اس سلسلہ میں پروفیسر نکلسن کی کتاب "اے لٹریری ہسٹری آف دی عربس A LITERARY HISTORY OF THE ARABS، تقریباً ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں میں داخل نصاب اور شعبہ عربی کے اساتذہ کا سب سے بڑا مرجع اور ماخذ ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں یہ مضمون داخل نصاب ہوا۔ اس وقت

تک مصر کے مشہور ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز احمد حسین الزیات کی کتاب تاریخ الادب العربی اس موضوع پر سب سے اچھی کتاب سمجھی جاتی تھی اور درسی ضروریات کے لیے ہی لکھی گئی تھی اور مصر کے عام مدارس اور کالجوں میں داخل نصاب تھی۔ غالباً ۲۶۔۱۹۲۵ء میں وہ دار العلوم کے بعض نوجوان اساتذہ کی تحریک سے داخل نصاب کی گئی اور ابھی تک وہ نصاب میں داخل ہے۔ میں ۱۹۵۱ء میں جب قاہرہ میں اس کے مصنف زیات سے ملا اور میں نے ان کو بتایا کہ ان کی کتاب ہمارے یہاں داخل نصاب ہے اور مجھے کئی سال اس کے پڑھانے کا شرف حاصل ہوا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اس کو مصر کی مقبولیت کی دلیل اور اپنی خوش قسمتی سمجھی۔ یہ کتاب اپنے مصنف کے مسلم ادبی ذوق اور حسن انتخاب کا نمونہ ہونے کے باوجود بہت سی حیثیتوں سے محل نظر ہے۔ اس میں ہم ہندی طلبا اور فضلاء کے لحاظ سے بعض جگہ تطویل ہے اور بعض جگہ اختصار اور پھر اس میں ان کی انشا پردازی بہت جگہ تاریخ نویسی پر غالب آگئی ہے۔ ایک بڑی کمی یہ ہے کہ ہندوستان اور اس کے مخصوص کردار کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس سے ہندوستانی علماء کی ان ادبی خدمات اور مساعی کا بالکل علم نہیں ہوتا جو انھوں نے مختلف عہدوں میں انجام دیں اور جن کو تاریخ ادب کا کوئی مصنف اور زبان عربی کا دلدادہ اور بہی خواہ فراموش نہیں کر سکتا۔ نیز اب اس سلسلہ میں ہندوستان میں جو کام ہو رہا ہے اور ندوۃ العلماء کے دبستان سے تعلق رکھنے والے اس سلسلہ میں جس کوشش و کاوش میں معروف ہیں اسی طرح بعض اور مدارس اور یونیورسٹیوں نے جس طرح عربی زبان کو ہندوستان میں قائم رکھا ہے اور اس کے ساتھ غیر معمولی اعتناء سے کام لے رہی ہیں ان کا ذکر نہ کرنا ایک حق ناشناسی اور علمی کوتاہی ہے۔

بہت عرصے سے مجھے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ خود ہندوستان میں تاریخ ادب عربی پر مستقل کتاب لکھی جائے کہ ایک ہندوستانی فاضل ہی ان کوششوں اور کامیابیوں کا صحیح طور پر جائزہ لے سکتا ہے جو یہاں عربی کے سلسلہ میں حاصل ہوئیں نیز وہی اس تناسب کو ملحوظ رکھ سکتا ہے جس تناسب سے ایک ہندوستانی طالب علم کے سامنے یہ معلومات پیش کرنا چاہیئے۔ وہی اپنے ہموطنوں اور ہم جنسوں کے لیے "خذ ما صفا ودع ما کدر" اور "ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے اصول پر عمل کر سکتا ہے۔ میرا خیال عربی میں اس کتاب کو تیار کرانے کا تھا اور میں نے دار العلوم کے ان نوجوان اساتذہ سے جو ادب عربی اور تاریخ ادب کی تدریس کا فرض انجام دیتے ہیں۔ اس کا تذکرہ بھی کیا۔ اگر خدا کی توفیق شامل حال رہی تو دوسرے مضامین کی طرح اس موضوع پر شاید ندوۃ العلماء کوئی کتاب عربی میں مہیا کر سکے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے نوجوان فاضل مولوی عبد الحلیم ندوی صدر شعبہ عربی، جامعہ

ملیہ اسلامیہ نے اس موضوع پر ایک کتاب اردو میں عربی ادب کی تاریخ کے نام سے تیار کرلی جو اس وقت پیش نظر ہے۔ یہ کتاب ابھی زیر ترتیب ہے۔ میرے سامنے اس کا جو مسودہ ہے جو غالباً کتاب کا پہلا حصہ ہوگا وہ عہد جاہلی کے ساتھ مخصوص ہے۔ مولوی عبدالحلیم صاحب ندوی اس موضوع پر قلم اٹھانے کے ہر طرح سے اہل ہیں۔ انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ انھوں نے ذوق و دلچسپی کے ساتھ تاریخ ادب عربی پڑھی۔ جامعہ ملیہ میں تعلیم پانے کے بعد وہ مصر گئے اور وہاں قاہرہ یونیورسٹی اور مصر کے ادبی، علمی حلقوں اور ماحول سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی نظر عربی انگریزی دونوں ماخذ پر ہے۔ وہ اس موضوع کے مقتضیات و آداب اور اس کے مزاج سے واقف ہیں۔ وہ اس موضوع کے وسیع رقبے اور اس کے آفاق و اطراف سے بھی ناآشنا نہیں۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس سلسلہ میں اب کیا کیا نئی بحثیں پیدا ہوگئی ہیں۔ اس کے لیے کیا مقدمات اور بنیادی معلومات ضروری ہیں۔ جدید دانش گاہوں اور عصری جامعات میں اس کو کس طرح ایک زندہ اور ترقی پذیر مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاسکتا ہے۔ اس کا زندگی سے کیسا گہرا ربط ہے اور اس قوم و ملک اور اس عہد میں اس کی جڑیں کتنی گہری اور وسیع ہیں۔ اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے خود مصنف میں کیا صلاحیتیں و مناسبتیں ضروری ہیں اس کے اندر کس درجہ کا ادبی ذوق اور خود اپنی زبان و ادب سے کس حد تک واقفیت ضروری ہے، اس سے بھی وہ ناآشنا نہیں ہیں۔ میں نے مسودہ پر نظر ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اس منزل کو طے کیا ہے۔ ان کا مطالعہ بہت سے مستشرقین کی طرح وقتی اور محدود نہیں ہے کہ جب کسی موضوع پر لکھنا پڑا تو اسی وقت سے مطالعہ شروع کیا اور اس سے ضروری واقفیت بہم پہنچا دی گئی۔ ان کے ذہن و ذوق نے اس موضوع کو صحیح طور پر ہضم کرلیا ہے اور وہ اس میں محض نقال اور خوشہ چیں نہیں ہیں بلکہ اس سے لطف لینے میں اہل زبان کے شریک اور اہل ذوق کے ہم نفس اور ہمنوا ہیں۔ ان کی تحریر میں سنجیدگی بھی ہے، شگفتگی بھی، سلاست بھی حلاوت بھی، مورخ کا احساس ذمہ داری بھی اور ادب کے ایک طالب علم اور صاحب ذوق کا انبساط و احتظاظ بھی۔ اگر یہ سلسلہ مکمل ہوگیا تو ہمارے نصاب تعلیم کا ایک بڑا خلا پر ہوگا اور ایک اہم ضرورت کی تکمیل۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کو اس کی تکمیل کی توفیق عطا ہو اور ان کی یہ کتاب عام قبولیت پائے۔

ابوالحسن علی الندوی

مقدّمہ

جلد دوم

بہت دن ہو گئے ۔ اس کتاب کے پہلے حصہ کو چھپے ہوئے تقریباً دس سال بیت گئے۔ ان دس برسوں میں پہلی جلد نے اپنا چولا تو نہیں بدلا مگر اس کے تین ایڈیشن نکل چکے جس سے اندازہ ہوا کہ کتاب قدر و منزلت کے ہاتھوں لی گئی، اور ذوق و شوق کی نظر سے پڑھی گئی اور میری محنت ٹھکانے لگی۔ پتہ نہیں پڑھنے والوں کو کچھ دے پائی یا نہیں پر مجھے شکر و سپاس گزاری کے احساس کے ساتھ سکون و اطمینان کی وہ دولت دی گئی جو شاید ہزاروں کھنکتے سکے نہ دے سکتے۔ اور یہ بہت بڑا حاصل ہے مجھ جیسے طالب علموں کے لیے، جنھوں نے اپنی عمر ناؤ و نوش کو تحقیق و تدوین، تلاش و جستجو اور عربی ادب و تاریخ کے ناپیدا کنار بحر بیکراں سے علم و فن کے جواہر ریزے نکالنے میں بتادی، کہ پہلا حصہ ثمرہ تھا، کم و بیش دس سال کی محنت شاقہ کا، اور اب یہ حصہ بھی تقریباً دس سال کی ہی محنت و جانکاہی کا نتیجہ ہے۔ ان دس برسوں میں مجھے کتنی بار خجالت اور احساس ندامت کے ساتھ اپنی کوتاہی کا احساس ہوا ہے، اس کو نہ پوچھیے کہ ہر یونیورسٹی میں دو ایک طالب علم ضرور ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن کر مجھے گھیر لیتے تھے اور میں سوائے اس کے کچھ اور نہ کہہ پاتا تھا کہ دوسرا حصہ تیار ہو رہا ہے، اور جلد ہی چھپ جائے گا۔ بعض وقت مجھے ان کا تلخ مگر با ادب انداز سوال بڑا پیارا لگتا، کیونکہ ان کے ان سوالوں سے اس شدید کمی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا جو وہ دوسرے حصے کے نہ ہونے پر محسوس کرتے تھے۔ پر کون جانے کہ ان حصوں کی تیاری

کے دوران اور پھر ان کی تیاری کے بعد زندگی کن کن راہوں سے گزر کر ہر حصہ کے خاتمہ پر ایک نئے موڑ پر کھڑی ہوجاتی تھی، اور میں بے چارہ حیرت و حسرت کا مارا، پیچھے مڑکر عمر رمیدہ کو آواز دینے کی کوشش کرتا تو مستقبل تصور و تخیل کے پردے پر ایک ایسی بوقلموں مگر عزم و حوصلے سے بھرپور زندگی کے خدو خال ابھار دیتا کہ میں اس میں رنگ بھرنے میں یہ بھی بسا اوقات بھول جاتا کہ رو میں ہے رخش عمر اور یوں وقت کا قافلہ گذر جاتا، اور کتاب بچھڑ جاتی۔

اب یہی دیکھئے کہ جب پہلی جلد تیار ہوئی اور چھپنے کے لیے پریس گئی تو کارکنان قضا و قدر نے اسی کے ساتھ دلی سے ہمارے کوچ کا بگل بجادیا۔ اور جب یہ جلد چھپ کر باہر نکلی تو بادشس بجز جامعہ ملیہ اسلامیہ، اپنی مادر علمی سے باہر لوگوں کے کہنے کے مطابق پتھروں کے شہر، مگر طرحدار حیدرآباد کے ایک علمی و تعلیمی مرغزار سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز میں پہنچا دیا۔ جہاں چند دنوں پہلے مستقبل نے تصور کے پردے پر جو ہلکے خطوط کھینچے تھے ان کو اُجاگر کرنے اور ان میں رنگ بھرنے میں لگ گیا، اور اسی کے ساتھ اس دوسرے حصہ کے خدو خال اُبھارنے میں بھی، اور جب انسٹی ٹیوٹ کا شعبہ عربی نوزائیدگی کی کلفتوں سے نجات پاکر، ترقی و تکمیل کی منزلوں کو طے کرکے جوان رعنا ہوگیا، اور کتاب کا یہ حصہ مکمل چھپنے کے لیے تیار ہوا تو کارکنان قضا و قدر کے تیور بدلے، اور وقت نے رخش عمر کی لگام کھینچ دی کہ ٹھہر زندگی کے سفر کا پھر ایک مشکل مقام آیا۔ اور وہ مقام تھا۔ ریٹائرمنٹ کا، جس کی تاریخ فرشتوں کے لکھے پر تو نہیں البتہ کارکنان دفتر کے لکھے پر ۱۲ مارچ ۱۹۸۶ء تھی، جسے بڑھاکر انسٹی ٹیوٹ کے قاعدوں اور قانون نے ۱۶ اپریل ۱۹۸۶ء یعنی اختتام تعلیمی سال تک کردیا تھا۔ رخت سفر باندھا اور اسی کے ساتھ اس حصہ کا مسودہ بھی۔ اور بچشم پرنم، یا باحساس حسرت و یاس نہیں، بلکہ اپنی ذمہ داریوں کو پوری ایمانداری، دیانتداری اور قدرت کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لاکر، کام کو عبادت سمجھ کر مکمل کرلینے کی خوشی اور سکون و اطمینان کے احساس کے ساتھ حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر ایک بار پھر ذوق کی دلی طرف جو اب اپنی بھی دنیائے دل ہے، چل پڑے، جہاں نہرو یونیورسٹی کے

دبستان صد رشک بہاراں نے اپنی آغوش قدر و منزلت میں اس طرح سمولیا کہ نہ خوف زیاں رہا اور نہ خوف دوری منزل، کہ سفینہ کنارے سے آلگا۔ اور اب۔۔۔ ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ۔

اس دوسری جلد کی تیاری کے سلسلہ میں جب تاریخ و ادب کے اصلی عربی مصادر و مراجع جیسے اغانی للاصفہانی، طبقات فحول الشعراء للجمحی، کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ، معجم الشعراء للمرزبانی، یتیمۃ الدھر للثعالبی، وفیات الأعیان لابن خلکان، اور الآمالی للقالی، الکامل للمبرد اور عیون الاخبار لابن قتیبہ وغیرہ کا مطالعہ کیا اور ان کے بعد موجودہ زمانے کے تذکرہ نگاروں مثلاً جرجی زیدان اور مصطفیٰ صادق الرافعی اور طٰہٰ حسین سے لے کر احمد حسن الزیات، شوقی ضیف، عمر فروخ، اور حنا الفاخوری وغیرہ کا تقابلی مُطالعہ کیا تو دیکھا کہ ان مصنفین میں سے اکثر نے اصل عربی مراجع سے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ اکثر نے اپنے مضامین کی ابتدار انھیں کتابوں کے حرف بحرف تمہیدی کلمات سے ہی کی ہے، اور انھیں کے انداز و اقوال پر اپنی کتابوں کو ڈھال دیا ہے۔ بعض نے اور خاص طور سے مصطفیٰ صادق الرافعی، طٰہٰ حسین، شوقی ضیف اور حنا الفاخوری نے ان مراجع سے استفادہ کرنے کے بعد اپنے انداز سے سوچ و بچار کرکے فکر و نظر کے لیے نئی راہیں نکالی ہیں اور بحث و تحمیص اور تحقیق و تدقیق کے نئے علمی اصولوں پر نوشتوں کو پرکھ کر اپنے نتیجے پیش کیے ہیں جن سے میں نے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ البتہ جن موقعوں یا موضوعات پر مجھے اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے نتیجے میں ان سے اختلاف نظر آیا، اس کی نشاندہی کرکے دلائل و براہین کی روشنی میں پوری صفائی سے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کردی ہے۔ اب قاری کو اختیار ہے کہ میری بات کو مانے یا ان بزرگوں کے نقطۂ نظر کی پیروی کرے یا اپنی الگ رائے قائم کرے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ ان بزرگوں کی کوششوں اور محنت شاقہ نے مدفون سفینوں سے گہرہائے تابناک نکال کر اور ان پر پڑی زمانے کی گرد و غبار کو صاف کرکے، ہمارے سامنے تحقیق و تدقیق، اور تلاش و جستجو کے ایسے انمول مرقعے پیش کردیئے ہیں کہ رہتی دنیا تک ان کے یہ علمی کارہائے نمایاں علم و ادب اور تاریخ و تذکرہ کی دنیا میں قابل تقلید نمونہ کی حیثیت سے ہمیشہ رہنمائی کا کام کرتے رہیں گے۔

یہ حصہ جو عربی ادب کی تاریخ : زمانۂ جاہلیت سے موجودہ زمانہ تک۔ کی دوسری جلد ہے کتاب کے خاکہ کے مطابق آنحضرت اور خلفائے راشدین کے زمانہ پر (جس کو اصطلاح میں صدر اسلام کہتے ہیں) مشتمل ہے۔

اس حصہ کی تصنیف میں بھی وہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو پہلی جلد کا ہے۔ یعنی اس عہد سے پہلے اس کے بیک گراؤنڈ کا مختصر مگر جامع نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ اس عہد کی امتیازی خصوصیات کی جھلک سامنے آجائے اور ان سیاسی واقتصادی و تہذیبی و تمدنی حالات و کیفیات اور افراد و معاشرہ کے ذہنی رجحانات اور فکری میلانات کا پتہ چل جائے جنھوں نے عربی ادب پر اپنی چھاپ چھوڑی ہے، اس کے بعد اس عہد میں نشو و نما پائے ہوئے علوم و فنون اور ان کے ممتاز فنکاروں کا کہیں قدرے تفصیل سے اور اکثر مختصر مگر جامع تذکرہ کیا گیا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ اس عہد میں فکر و فن کے مروجہ مکاتب فکر کے سب سے ممتاز شخصیت کا بطور نمونہ تفصیل سے تقابلی مطالعہ کیا جائے اور اس فن میں اس کے رول اور اس کی خدمات کو اجاگر کرکے اس کا درجہ اور حیثیت متعین کی جائے تاکہ آنے والی نسلوں کے سامنے غور و فکر کرنے اور تحقیق و تدقیق اور بحث و تمحیص کے لیے راہ ہموار کی جاسکے کہ اسی طرح کاروان علم و دانش اور قافلۂ فکر و فن اپنی منزل کی طرف جادۂ پیما رہتا ہے۔

البتہ اس حصہ میں اس عہد کے شعری مضامین کے نمونے طوالت کے خیال سے نہیں دیئے گئے ہیں، معلوم نہیں میری کوششیں کہاں تک بار آور ہوئی ہیں، اور میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، مگر اتنا ضرور ہے کہ یہ انداز گفتار اور طریقۂ تالیف ہمارے طالب علموں اور عربی زبان و ادب کے دوستوں کے دلوں میں کچھ سوالات کو ضرور ابھارے گا، جن کے جوابات تلاش کرنے کے لیے شاید انھیں رندان جامعات میں سے کوئی جیالا نکل آئے۔ اگر ایسا ہوگیا تو میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا اور میری سعی تمام ہوگئی کہ حرف آخر لکھ دینے یا کہہ دینے کے لیے بڑا جگر اور خارہ شگاف قلم چاہئے جس سے یہ خاکسار محروم ہے، خدا سے دعا ہے کہ میری محنت کو شرف قبولیت بخشے اور عربی زبان و ادب سے

شغف رکھنے والے طلبا، و اساتذہ کو یہ کام پسند آئے اور کسی نہج سے ان کو فائدہ پہونچانے میں کامیاب ہو سکے۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلاَّ بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

اس مسوّدے کی ترتیب و تبییض میں میری بیٹی ہما حلیم ایم۔ اے مربک (اب ہما یحییٰ) نے بڑا ہاتھ بٹایا، خدا ان کو صحت و تندرستی کے ساتھ زندہ رکھے اور علم و ادب کے وافر حصّے سے نوازے۔

شکر گذار ہوں، ذمہ داران ترقی اُردو بیورو، حکومت ہند کا جن کے تعاون اور اشتراک کے بغیر کتاب زیور طباعت سے اس طرح آراستہ ہو کر سامنے نہ آسکتی جس طرح آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

پہلا باب

جلد اول

جزیرہ نمائے عرب، عرب قوم اور عربی زبان کا مختصر تعارف

ملک عرب

عرب قوم زمین کی جس حصہ پر رہتی ہے، اس کو "جزیرہ نمائے عرب" کہتے ہیں۔ اس کے تین طرف پانی ہے، اور ایک طرف خشکی۔ یہ جزیرہ نما، براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کی شمالی سرحدیں شام، جزیرہ (سعودی عرب) اور عراق سے ملتی ہیں، اور جنوبی سرحدیں بحر ہند سے۔ اس کی مشرق میں خلیج فارس اور عُمان کے علاوہ بحر ہند واقع ہیں، اور مغرب میں بحر احمر یا بحر قلزم (Red Sea) ملک عرب کے باشندوں کی مجموعی تعداد، یورپ کی مجموعی آبادی کی چوتھائی ہے۔ اس جزیرہ نما کے اندر پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے، جسے کوہ سرات کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ شام کی سرحدوں سے جا ملتا ہے، اور اس کی وجہ سے جزیرہ نما عرب قدرتی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔

(۱) مغربی حصہ

(۲) مشرقی حصہ

مغربی حصہ کوہ سرات کے دامن سے لے کر بحر احمر (RED SEA) کے ساحل تک نیچا ہے اسی لیے اس کے نشیبی علاقے کو (غور) کہتے ہیں اور چونکہ اس علاقے میں گرمی بہت پڑتی ہے اس لیے اسے (تہامہ) یعنی پیاس لگنے کی جگہ بھی کہتے ہیں۔

مشرقی حصہ ابھرا ہوا ہے، اور اس کی سرحدیں عراق سے ملی ہوئی ہیں۔ اس لیے اس کو نجد یعنی "اونچی زمین" کہتے ہیں۔ ان دونوں حصوں کے بیچ میں زمین کا جو ٹکڑا ہے اسے حجاز یعنی "حد فاصل"

کہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں کے درمیان حدفاصل کا کام کرتا ہے۔ اس حصہ کا وہ خطہ جس میں نجد کے بعض علاقوں کے علاوہ یمامہ، بحرین اور عمان بھی آجاتے ہیں۔ "عروض" یعنی "چوڑائی میں پڑا ہوا حصہ" کہلاتا ہے اس لیے کہ یہ یمن اور نجد کے بیچ چوڑائی میں پھیلا ہوا ہے۔ حجاز کے جنوب میں جو علاقہ ہے اسے "یمن" کہتے ہیں۔ یمن کے معنی "داہنی جانب اور خیروبرکت والی زمین" کے ہیں۔ چونکہ یہ خانہ کعبہ کی داہنی جانب ہے، اور خاصا سرسبز و شاداب علاقہ ہے، اسی لیے سب سے پہلے یونانیوں نے اسے خیروبرکت کی سرزمین کے نام سے یاد کیا۔ اس کے بعد عربوں نے بھی اسی نام کو اپنایا اور آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔

حجاز جزیرہ نما عرب کا، خاصا گرم خطہ ہے۔ یہاں بہت پرانے پہاڑ پائے جاتے ہیں، جن پر سورج کی سخت کرنیں جب پڑتی ہیں تو یہ گرم ہو کر سارے خطہ کو آگ سے بھر دیتے ہیں۔ یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے، اسی لیے عام طور سے یہاں سوکھے کا سا سماں رہتا ہے۔ ان پہاڑوں کے بیچ میں بعض وادیاں بھی ہیں جن میں جہاں تہاں گھاس پھوس اُگ آتی ہے۔ طائف اس علاقہ کا سب سے سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ یہاں ہریالی کے علاوہ پھلوں میں انجیر، انگور، سیب اور زیتون بکثرت پیدا ہوتا ہے۔

حجاز کے مشہور شہر

حجاز میں کئی مشہور اور بڑے شہر پائے جاتے ہیں، مگر ان میں سب سے زیادہ مشہور اور مسلمانوں کے نزدیک مقدس دو شہر ہیں:

۱۔ مکہ۔

۲۔ مدینہ۔

مکہ شہر اونچے پہاڑوں سے گھرے ایک خشک اور بنجر وادی میں آباد ہے۔ اسی چٹیل اور خشک وادی میں جہاں ہریالی کا نام و نشان بھی نہ تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کو خدا کے حکم سے لاکر چھوڑا تھا۔ بعد میں اسی وادی میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے خاندان جرہم میں شادی کی اور یہیں سے اس وادی میں آبادی کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ شہر شمالاً اور جنوباً دو میل لمبا ہے اور شرقاً و غرباً ایک میل چوڑا۔ اسی شہر مکہ میں خدا کا گھر کعبہ ہے، جس کا مسلمان ہر سال حج کرتے ہیں اور دنیا کے کسی خطہ میں رہتے ہوں اسی کی طرف منھ کرکے پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی یہ گھر بہت مقدس اور خدا کا گھر سمجھا جاتا تھا چنانچہ عرب کے لوگ ہر سال اس کا حج کرتے تھے۔ اور اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں میں اسی سے سہارا لیتے تھے۔ کعبہ سے بالکل ملا ہوا پانی کا وہ مشہور کنواں ہے جسے زمزم کہتے ہیں۔ اسی شہر مکہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

مدینہ

حجاز کا دوسرا مشہور اور مقدس شہر مدینہ ہے، جسے "مدینۃ النبی" "طیبہ" یا صرف "المدینہ" کہتے ہیں اسلام سے پہلے اس شہر کا نام "یثرب" تھا۔ یہ شہر بھی پہاڑوں سے گھری ایک وادی میں آباد ہے۔ اس شہر کے شمال میں تھوڑی دور پر اُحد کا وہ مشہور پہاڑ ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ والوں میں سخت لڑائی ہوئی تھی۔ مدینہ میں کھجور کے باغات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ عرب کے مشہور کھجوروں کی قسمیں یہیں پیدا ہوتی ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ چھوڑ کر یہیں پناہ لی تھی، اور ساری عمر یہیں رہے اور یہیں انتقال فرمایا اور یہیں اپنی مسجد میں، جسے مسجد نبوی کہتے ہیں آرام فرما رہے ہیں۔ کعبہ کا حج کرنے کے لیے جو بھی حاجی آتے ہیں وہ آپ کے قبر کی زیارت کرنے کے لیے مدینہ ضرور آتے ہیں۔

یمن اور اس کے مشہور شہر

حجاز کے جنوب میں جو علاقہ آباد ہے اسے یمن کہتے ہیں۔ یہ خطہ حجاز کے مقابلہ میں بہت سرسبز و شاداب ہے اور پرانے زمانے سے تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ اس علاقہ میں تاریخ کی چند بہت مشہور اور ممتاز قومیں ابھری ہیں جنہوں نے تہذیب و تمدن کی بعض ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو صدیوں تک ان کی ذہنی ارتقا اور ان کے فضل و کمال کی نشاندہی کرتی رہیں گی۔

یمن کے مشہور شہروں میں "نجران" کا ذکر تاریخ ادب عربی میں خاص طور سے آتا ہے۔ یہاں کے لوگ عیسائی مذہب کے ماننے والے تھے۔ یہاں مکہ کے کعبہ کی طرح ایک کعبہ بھی تھا جس میں یہاں کے لوگ عبادت کرتے تھے۔

یمن کا دوسرا شہر "صنعاء" ہے۔ اس کے شمال مشرق میں "مأرب" کا وہ مشہور شہر آباد تھا جسے "سبا" بھی کہتے تھے۔ مشہور "ملکہ سبا" یہیں کی رہنے والی تھی یہیں پر وہ مشہور بند تھا جس کا ذکر قرآن شریف میں "سد مارب" کے نام سے آیا ہے اور جو بعد میں مشہور سیلاب میں بہ گیا تھا اور جس کی وجہ سے یہاں کے باشندے قبیلہ ازد کے لوگ ہجرت کر کے عمان میں جا بسے تھے۔

حجاز کے اسی جنوبی حصہ میں "حضرموت" کا علاقہ ہے جس کے شمال میں شہر "احقاف" آباد تھا، جہاں "عاد" کی قوم رہتی تھی اور جس کا ذکر قرآن میں سورۃ "الاحقاف" کے نام سے آیا ہے۔

جزیرہ عرب کا مشرقی علاقہ جو عمان سے عراق کی حدود تک پھیلا ہوا ہے "بحرین" کہلاتا ہے۔ اس کا سب سے مشہور شہر "ہجر" تھا۔ یہاں اس کثرت سے اور اتنی اچھی کھجور پیدا ہوتی تھی کہ ضرب المثل بن گئی تھی۔(۱)

(حاشیہ صفحہ نمبر ۲۶ پر)

جزیرہ عرب کے بیچ کا حصہ صحرا ہے، جس میں بعض مقامات پر تھوڑی بہت ہریالی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صحرا کے بھی کئی حصے اور ان کے مختلف نام ہیں۔ چنانچہ اس صحرا کے اس حصہ کو جو شام سے ملتا ہے "بادیۃ الشام" اور جس حصہ کی سرحدیں عراق سے ملتی ہیں، اسے "بادیۃ العراق" اور عراق کے شمال میں جو حصہ ہے اسے "بادیۃ الجزیرہ" کہتے ہیں۔

جزیرہ عرب کی آب و ہوا

جزیرہ عرب کے اکثر خطوں کی آب و ہوا گرم اور خشک ہے۔ مگر بعض علاقے ایسے بھی ہیں جیسے طائف، جہاں گرمیوں کی راتیں بڑی پر کیف اور خنک ہوتی ہیں، اور سردیوں میں ٹھنڈک اتنی بڑھ جاتی ہے کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف جم جاتی ہے، اور دور سے دیکھنے میں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ سردی گذرنے کے بعد یہی برف پگھل کر چھوٹی چھوٹی نہروں کی شکل میں میدانوں میں بہ کر نکلتی ہے جس سے کھیتی پھل پھول اور سبزی ترکاری سینچی جاتی ہے۔ اس گرمی و سردی کی وجہ سے عرب میں دو قسم کی ہوائیں چلتی ہیں جن کا ذکر عربی شاعری میں اکثر آتا ہے۔ ایک ہوا "باد صبا" ہے یہ وہ لطیف اور خنک ہوا ہے جو مشرق سے آتی ہے اور بڑی نشاط انگیز کیف آور اور حیات آفریں ہوتی ہے۔ یہ ہوا غزل گو شعرا کی پیامبر، دکھ درد کی شریک اور واردات قلبی کی امین سمجھی جاتی ہے۔ دوسری ہوا "باد سموم" ہے۔ یہ لو کے وہ جھکڑ ہیں جن کے لیے صحرائے عرب مشہور ہے۔ یہاں پانی کی قلت کی وجہ سے باقاعدہ نہروں کا انتظام نہیں ہے، اسی لیے ان علاقوں میں، جہاں تھوڑی بہت قابل کاشت زمین نکل آتی ہے بارش کے سہارے کچھ کاشت کر لی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں اگر اچھی بارش ہو گئی تو وادیوں میں گھاس پھوس بھی اگ آتی ہے، جس سے اونٹ اور بکریاں اپنا پیٹ بھرتی ہیں اور عرب اپنی زندگی گزارنے کے لیے جو اور مسور بو لیتے ہیں۔

جزیرہ نمائے عرب میں سب سے زیادہ زرخیز علاقہ یمن کا علاقہ ہے۔ یہاں بارش بھی خوب ہوتی ہے اور زمین بھی بڑی اچھی اور زرخیز ہے۔ یونانی اور رومی اسی لیے یمن کو "عرب کا خوش بخت اور بابرکت علاقہ" کہتے تھے۔

غرض کہ جزیرہ نمائے عرب ایسا جزیرہ ہے، جہاں مختلف موسم، مختلف آب و ہوا اور مختلف طرز زندگی پائی جاتی ہے۔ اس جزیرہ میں جو قوم رہتی ہے اسے "عرب قوم" کہتے ہیں۔

۱۔ چنانچہ کہتے تھے کہ "کناقل التمر الی ھجر" یعنی "الٹے کھجور ہجر کو" جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں "الٹے بانس بریلی کو"

عرب قوم اور اس کے مختلف قبائل

مورخین اقوام کے نزدیک عرب قوم، سامی اقوام کی ایک شاخ ہے۔ یہ قومیں حضرت نوح کے ایک لڑکے "سام" کی اولاد میں سے ہیں۔ اسی لیے ان سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ان قوموں میں بابلیون، سریانیوں، عبرانیوں، فینیقیون، آرمینیون، حبشیون، سبئیون اور عربوں کو شمار کیا جاتا ہے۔ مورخین میں اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ قومیں مختلف جگہوں میں پھیلنے سے پہلے، دنیا کے کس حصہ میں رہتی تھی۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ یہ قومیں ایشیا ہی کے کسی حصہ میں رہتی تھیں۔ مگر پھر اس بات میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ وہ خطہ جزیرہ عرب تھا یا ارمینیہ یا وادی فرات کا نچلا حصہ۔ بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ قومیں ابتدا میں افریقہ میں رہتی تھیں اور وہاں سے ایشیا کی طرف منتقل ہو گئیں۔ بہرحال اس بات سے شاید کسی کو اختلاف نہیں کہ یہ قومیں قدیم زمانے میں ہی ادھر ادھر پھیل گئی تھیں۔ چنانچہ بابلیوں اور اشوریوں نے اپنا مسکن عراق کو بنایا، فینیقون نے شام کے ساحلی علاقے پسند کئے، عبرانیوں نے فلسطین کو اپنی جائے سکونت بنائی اور حبشیوں نے حبشہ ہی کو ترجیح دی۔

عرب اقوام کی تقسیم

مورخین عرب اقوام کو مندرجہ ذیل تین قسموں میں تقسیم کرتے ہیں:

عرب بائدہ

یہ وہ عربی اقوام ہیں جن کے حالات کا نہ تو تاریخ سے پتہ چلتا ہے اور نہ ہی ان کے کسی آثار سے۔ تاریخ میں جو کچھ ان کے متعلق مواد ملتا ہے وہ اتنا گنجلک اور الجھا ہوا ہے کہ اس سے ان کی نہ کوئی صحیح صورت سامنے آتی ہے اور نہ ہی جو صورتیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان کی تردید ہی کی جا سکتی ہے۔ بہرحال ان قوموں کے مشہور قبیلے مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) عاد[1] (۲) ثمود[2] (۳) طسم و جدیس[3] (۴) عملیق[4] (۵) عبد ضخم[5]

۱۔ یہ قبیلہ احقاف میں رہتا تھا۔ (۲) ثمود کے لوگ مقام حجر میں (جسے آجکل مدائن صالح کہتے ہیں) اور "وادی القری" میں، جو حجاز اور شام کے درمیان واقع ہے، رہتے تھے۔

۳۔ طسم و جدیس قبیلے یمامہ میں ایرانی طوائف الملوکی کے زمانہ میں رہتے تھے اور آپس ہی میں لڑ کر کٹ مرے

۴۔ عملیق جمع عمالقہ ان کے آباد و اجداد پہلے یمن میں رہتے تھے، پھر مکہ اور یثرب (مدینہ) جا بسے اس کے بعد شام ہجرت کر گئے۔

۵۔ قبائل عبد ضخم طائف میں رہتے تھے۔ مورخین انساب کا کہنا ہے کہ انھیں لوگوں نے سب سے پہلے عربی رسم خط ایجاد کیا۔

ان قبائل کا ذکر عربی شاعری میں اکثر آتا ہے، قرآن نے عاد و ثمود کی تباہی کا ذکر اس سے سبق حاصل کرنے کے لیے کیا ہے[6]۔ طسم و جدیس کی تباہی کا سبب ایک عورت کی پیشین گوئی تھی۔ جس کی بعد دونوں قبیلے آپس میں اس طرح کٹ مرے کہ کسی کا جنس ہی نہ بچا[7]

عرب عاربہ یا قحطانی عرب

یہ یمن کے وہ باشندے ہیں، جو نسلاً یعرب بن قحطان کی اولاد میں سے ہیں اور جنھیں تورات میں "یارح بن قحطان" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ عربی زبان کے اصل بانی یمنیوں کے یہی بزرگ ہیں حضرت حسان نے انھیں کا نام لے کر عدنانیوں (قریشیوں) کے مقابلہ میں فخریہ کہا تھا:

تعلمتم من منطق الشیخ یعرب   أبینا، فصرتم معربین ذوی نفر

۲۔ عربِ مُستَعرِبَہ یا عدنانی عرب

یہ حجاز کے وہ عرب ہیں، جو عدنان کے نسل سے تھے، اور عدنان حضرت اسمعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ یہ لوگ انیسویں صدی قبل مسیح میں حجاز میں آکر ٹھیرے اور یہیں رہ بس گئے ان قوموں کو "مستعربہ" اس لیے کہتے ہیں کہ حضرت اسمعیل کی مادری زبان عربی نہ تھی، انھوں نے عربی زبان جُرہُم کے قبیلے سے سیکھی جو یمنی قبیلہ تھا اسی لیے ان کی اولاد مستعربہ کہلائی یعنی "عرب بنی ہوئی قوم"۔

جنوبی (یعنی یمن میں رہنے والی قحطان کی آل اولاد) اور شمالی (یعنی حجاز میں رہنے والی عدنان کی اولاد) عربوں کی نسل اپنے علاقوں میں اتنی بڑھی کہ متعدد قبیلے بن گئے اور انھوں نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ کی صفحات میں اپنا نام محفوظ کر گئے، چنانچہ قحطانی عربوں میں "حِمیَر" کا قبیلہ عربوں کی تاریخ میں بہت مشہور رہا ہے۔ حمیر کی شاخ میں زید الجمہور، قُضَاعَہ اور سَکَاسِکُ بہت مشہور قبیلے گذرے ہیں۔ کہلان کا مشہور قبیلہ بھی نسلاً قحطانی تھا۔ اس قبیلہ میں ہَمدان طئی، مِذحَج، کِندَہ، لَخم، جُذَام مشہور ذیلی قبائل ہیں۔ حیرہ کا شاہ منذر اسی لخم کی اولاد میں سے تھا۔ مدینہ کے یہودی قبائل اوس و خزرج اور شاہان غساسنۃ، اَزْد کی اولاد میں سے ہیں۔

۶۔ قرآن نے ثمود کی تباہی کا ذکر اس طرح کیا ہے " فاما ثمود فاهلكوا بالطاغية" اور عاد کی تباہی کا نقشہ یوں کھینچا ہے " واما عاد فاهلكوا بريح صرصر عاتيه "

۷۔ قصہ کی تفصیل کے لیے دیکھئے تاریخ کی متداول کتابوں کے علاوہ عمران بن محمد بن عمران کا عربی مضمون "طسم جدیس" مطبوعہ مجلۃ "العرب" الریاض ماہ ذوالحجہ ۱۳۸۹ھ

عدنانیوں کی اولاد بھی حجاز میں بہت پھل پھولی۔ ان کی تعداد اتنی بڑھی اور ان کے قبائل اس قدر پھیلے کہ اوپر جاکر ان کے آباد اجداد کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ چنانچہ ان عدنانی عربوں کا نسب نامہ عدنان پر ہی جاکر رک جاتا ہے اور حضرت اسمٰعیل سے جو ان کے پہلے جد امجد ہیں، صحیح طریقے سے نہیں مل پاتا۔

اس طبقے میں بھی بہت نام آور قبائل ہوئے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں: رَبِیعَہ، مُضَر، اَنمَار، اَیَاد۔ ربیعہ سے عبدالقیس اور عبدالقیس سے وائل کے دونوں بیٹوں بکر اور تَغلِب کی نسل چلی۔ مُضَر سے قیس عیلان اور الیاس بن مضر پیدا ہوئے۔ قیس عیلان کے مشہور قبیلے ہوازن اور غطفان ہیں۔ غطفان سے بغیض کی دو بیٹے عبس و ذبیان کی نسل جاری ہوئی۔ الیاس کی اولاد تمیم بن مر، ہذیل بن مدرکہ، اسد بن خزیمہ، اور کنانہ بن خزیمہ کے خاندان ہیں۔ اسی کنانہ سے قریش کے خاندان نے جنم لیا۔ قریش کے بھی مختلف گھرانے ہیں۔ ان میں مشہور جمح، سہم، مخزوم، تیم، عبدالدار اور عبد مناف ہیں۔ عبدمناف کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سب سے چھوٹے ہاشم تھے، جن سے عبدالمطلب پیدا ہوئے۔ عبدالمطلب کے ۱۲ بیٹے تھے، ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ سب سے چھوٹے تھے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قحطانیوں (یعنی یمنی عرب) اور عدنانیوں (یعنی حجازی عرب) کے درمیان زمانہ قدیم سے، حسب نسب، زبان اور تہذیب و تمدن میں نمایاں اختلاف کی وجہ سے ہمیشہ دشمنی رہتی تھی۔ چنانچہ یہ یمنی اور حجازی عرب ایک دوسرے کے مقابلہ میں بڑے زور شور سے اپنے حسب و نسب اور تہذیب و تمدن پر فخر کیا کرتے، اور اس قدیمی دشمنی کا نتیجہ وہ اختلاف اور ناچاقی تھی جو مدینہ والوں (اوس و خزرج (جو نسلاً قحطانی یمنی تھی) اور مکہ والوں (جو نسلاً عدنانی حجازی تھے) کے درمیان اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد تک جاری رہی۔ اسلام کے بعد مسلمانوں سے جو لڑائیاں ہوئیں شاید ان میں بھی اس احساس برتری اور پرانی دشمنی کا اثر رہا ہو۔

قبیلہ کا نظام

اوپر کے بیان سے اندازہ ہوا کہ قحطانی (یمنی عرب) اور عدنانی (حجازی عرب) قبائل بعد میں بڑھ کر مختلف قبائل میں بنٹ گئے، اور عرب قوموں میں قبیلہ، افراد کے لیے، ریڑھ کی ہڈی کی طرح اہم ہوتا تھا۔ قبیلہ ہی وہ بنیاد تھا جس پر عربوں کی تہذیب و تمدن کی عمارت کھڑی ہوتی تھی۔ یہ ایک بڑا خاندان ہوتا تھا، جس کا ہر فرد یہ سمجھتا تھا کہ ہم سب ایک باپ کی اولاد ہیں۔ اس

لیے ہم کو دکھ سکھ، رنج وراحت اور مصیبت و پریشانی میں سب کا ساتھ دینا چاہیئے۔ عام طور سے قبیلہ اپنے جداعلی کے نام سے پکارا جاتا تھا، جیسے ربیعہ، مضر، یا اوس وخزرج۔ کبھی کبھی کسی قبیلہ کا نام کسی مخصوص حادثہ میں شہرت پا جانے یا منسوب ہو جانے کی وجہ سے، اسی کے نام پر رکھ دیا جاتا تھا جیسے "غسان" کہ یہ ایک چشمہ تھا جہاں پر ایک قبیلہ اترا تھا، چنانچہ اس قبیلہ کا نام ہی غسان پڑگیا۔

ہر قبیلہ کا ایک سردار یا شیخ ہوتا تھا جس پر پورے قبیلے کے افراد کی اطاعت فرض ہوتی تھی۔ یہی شیخ جنگ وصلح کا فیصلہ کرتا۔ آپس کے جھگڑوں کو چکاتا۔ افراد قبیلہ کی خبر گیری اور نگہبانی ونگرانی کرتا۔ بعض قبیلوں میں یہ رواج بھی تھا کہ شیخ قبیلہ کو افراد قبیلہ کی موت وزندگی پر پورا اختیار ہوتا تھا

اسی طرح ہر قبیلہ کا ایک شاعر یا مختلف شعراء ہوتے تھے، جو قبیلہ کی تعریف میں قصائد کہتے اور اپنے کلام کے ذریعہ، قبیلہ کے شاندار کاموں کا ذکر کرکے فخر کرتے، قبیلہ کی بہادری، مہمان نوازی اور سخاوت کے واقعات بیان کرکے، دوسرے قبائل پر اپنی فضیلت اور برتری ثابت کرتے۔ دوسرے قبائل کے شعراء اگر ہجو کرتے یا ان کے مقابلے میں اپنے کارنامے گنا کر فخر کرتے تو یہ شعراء ان کا جواب دیتے، اور اپنے قبیلہ کی برائیاں چھپاتے اور دوسرے قبیلوں کی برائیوں کو اچھالتے اور انھیں غیرت دلاتے۔ قبیلہ کا ہر فرد اپنے افراد قبیلہ کے جائز اور ناجائز طرفداری کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ " انصر اخاک ظالما اومظلوما " اپنے بھائی کی، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، مدد کرو۔ قبیلہ بحیثیت مجموعی اپنے مقتول افراد کے خون کا بدلہ لیتا، افراد کے مصیبتوں اور پریشانیوں میں ان کا ساتھ دیتا۔ یہ بھی رواج تھا کہ اگر کوئی فرد قبیلہ میں من مانی کرکے اتنے جرائم کرتا، اور اتنے خون بہا دیتا کہ قبیلہ اس کی دیت (یعنی جان کے بدلے میں جان یا مال) نہ دے پاتا تو اس کو قبیلے سے بے تعلق کر دیا جاتا، اب قبیلہ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہ ہوتی ایسا شخص "خلیع"، یعنی برادری سے باہر یا " ٹاٹ باہر " آدمی سمجھا جاتا اور اس کا خون مباح ہوتا یعنی اگر کوئی اسے مار دیتا تو اس کا قبیلہ اس کے خون بہا کا مطالبہ نہ کرتا۔

یہ عربی قبائل ہمیشہ ایک دوسرے سے جنگ وجدال میں مصروف رہتے۔ ایک قبیلہ موقع پاکر دوسرے قبیلہ پر حملہ کر دیتا اور اس کے اونٹ بکریاں حتی کہ لڑکیوں اور عورتوں کو بھی لوٹ کر لے جاتا، اور پھر جب موقع ملتا تو یہ قبیلہ حملہ آور قبیلے پر چڑھائی کرکے اس کا بدلہ لیتا، اس طرح ان میں ہمیشہ جنگ وجدال کی کیفیت رہتی اور امن وسکون سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ ان
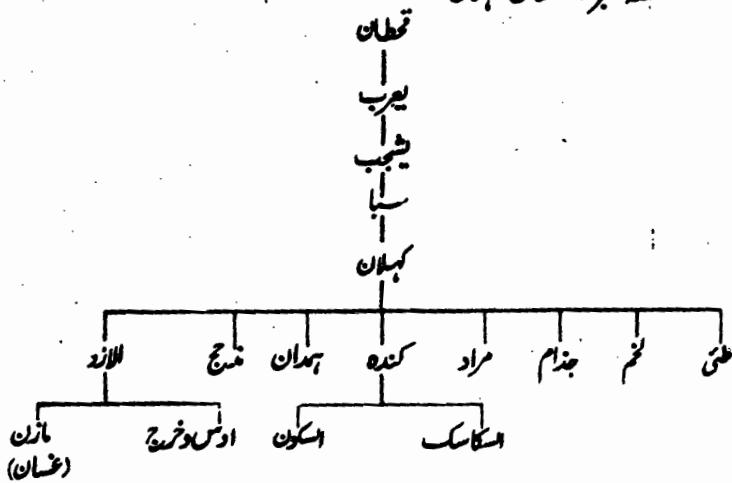
جنگوں کی تباہ کاریوں سے عاجز آکر کبھی کبھی یہ قبائل آپس میں صلح وصفائی بھی کر لیتے اور آپس میں معاہدہ کر لیتے کہ اب لڑائی جھگڑا نہیں کریں گے، بلکہ ایک دوسرے کے آڑے وقتوں میں کام آئیں گے، ایسے قبیلے ایک دوسرے کے "حلیف" (یعنی ساتھی یا معاہدہ کئے ہوئے) کہلاتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی دوسرا قبیلہ ان حلیف قبیلوں میں سے کسی ایک پر بھی حملہ کرتا تو ساتھی قبیلہ فوراً اس کی مدد کو دوڑتا اور اس پر فخر کرتا۔ یہ عہد و پیمان اتنے مقدس اور پائیدار سمجھے جاتے تھے کہ اگر کوئی قبیلہ عہد شکنی کرتا تو ساری عرب دنیا میں اس کی ناک کٹ جاتی اور بڑی بے عزتی اور حقارت سے اس کا ذکر ہوتا۔ اس قسم کے جنگوں، صلحوں اور معاہدوں کا ذکر جاہلی شاعری میں بہت آیا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا عرب قوم دو بڑے طبقوں میں تقسیم کی جاتی ہے :

۱۔ قحطانی یعنی یمنی عرب اور (۲) عدنانی یعنی حجازی عرب۔ یہ دونوں طبقے مختلف دو بڑی شاخوں میں بنٹ گئے۔ چنانچہ عدنانیوں کی دو بڑی شاخیں تھیں؛ ربیعہ اور مضر، پھر ان سے اور چھوٹے چھوٹے قبیلے پیدا ہوئے۔ اسی طرح قحطانیوں کی بھی دو بڑی شاخیں تھیں: کہلان اور حمیر، اور ان سے پھر دوسرے قبیلے پھوٹے اور پروان چڑھے۔ ذیل میں تین شجرہ نسب دیئے جاتے ہیں جن میں قحطانیوں، عدنانیوں، اور قریشیوں کے آباؤ اجداد کی تفصیل ہے :
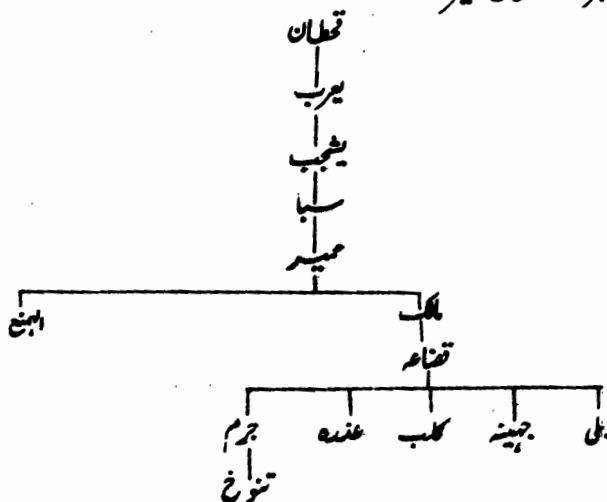
شجرہ نسب قحطانی یا یمنی عرب اقوام

ان کی دو بڑی شاخیں تھیں (۱) شاخ کہلان (۲) شاخ حمیر

نقشہ نمبر ۱ شاخ کہلان
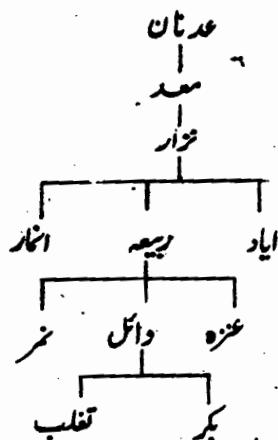
عدنانی یا حجازی عربوں کی بھی دو اہم شاخیں تھیں
(۱) شاخ ربیعہ (۲) شاخ مضر
شجرہ نسب ذیل سے ان کی وضاحت ہوتی ہے :
۱۔ شاخ ربیعہ
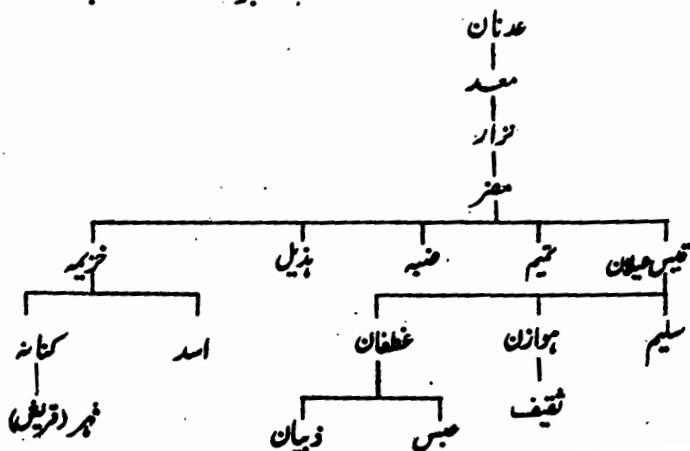
عدنان
|
معد
|
نزار
ایاد — ربیعہ — انمار
(ربیعہ): عنزہ — وائل — نمر
(وائل): بکر — تغلب

۲۔ شاخ مضر

عدنان
|
معد
|
نزار
|
مضر
قیس عیلان — تمیم — ضبہ — ہذیل — خزیمہ
(قیس عیلان): سلیم — ہوازن — غطفان
(ہوازن): ثقیف
(غطفان): عبس — ذبیان
(خزیمہ): اسد — کنانہ
(کنانہ): فہر (قریش)

۳۔ شجرۂ نسب قریش :
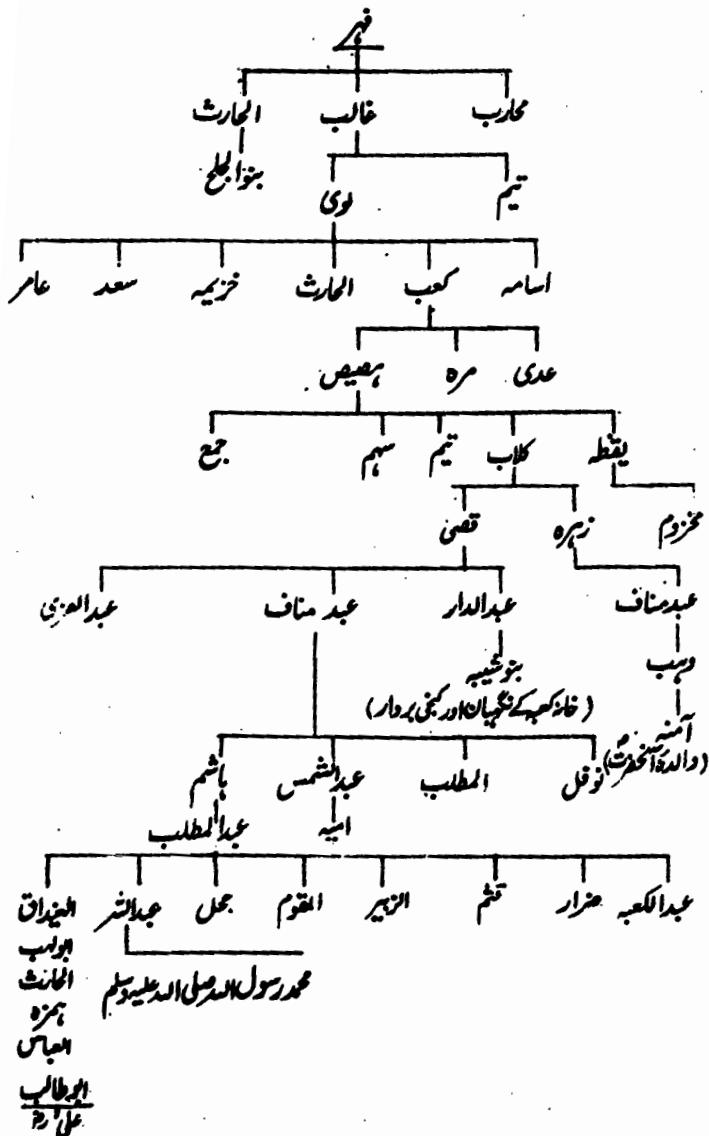
دوسرا باب

اسلام سے پہلے عربوں کی سیاسی حالت

عربوں کی قدیم تاریخ کا ابہام

پرانے زمانے میں اور خاص طور سے زمانہ جاہلیت کے دور اول (۱) میں عربوں کی سیاسی اور ادبی حالت کا پتہ لگانا بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس زمانے کے باوثوق ذرائع سے جمع کی ہوئی کوئی مستند اور صحیح تاریخ نہیں ملتی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عرب اقوام عام طور سے اور ان میں شمالی عرب خاص طور سے ان پڑھ تھی، ان کی زندگی خانہ بدوشانہ تھی، جس میں نہ سکون و اطمینان تھا نہ کوئی مضبوط بنیادوں پر قائم معاشی نظام اور نہ اعلیٰ اقدار پر مبنی کوئی سماجی ڈھانچہ زندگی اور اس کا مقصد اونٹوں اور بکریوں کے چرانے، ان کی خاطر چراگاہوں کی تلاش میں صحرا نوردی کرنے اور جب قحط یا خشک سالی ہو جائے تو دوسرے قبائل پر حملہ اور غارت گری کر کے جو کچھ ملے اس پر قبضہ کر لینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ظاہر ہے جب زندگی کا یہ نہج ہو تو اس میں لکھ کر محفوظ رکھنے کی اول تو کوئی بات ہوتی نہیں، پھر اگر ہو بھی تو اسے کرتا کون اور کیوں؟ اس لیے جن باتوں کو عرب محفوظ رکھنا ضروری سمجھتے تھے، جیسے حسب نسب پر فخر کرنا، قبیلہ یا افراد قبیلہ کی بہادری کے قصے یا جنگوں میں اپنی فتحمندی و کامرانی کے واقعات تو انھیں افراد قبیلہ زبانی یاد رکھتے تھے اور اپنے بعد

(۱) زمانہ جاہلیت کا دور اول زمانہ ماقبل تاریخ سے شروع ہو کر پانچویں صدی عیسوی تک چلتا ہے۔ زمانہ جاہلیت کا دوسرا دور پانچویں صدی عیسوی سے ساتویں صدی تک چلتا ہے جب کہ اسلام ظاہر ہوا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: طبقات ابن سعد ۱/۵۶۔ جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام ۱/۴۱

آنے والی نسل کو بھی زبانی یاد کرا دیتے تھے تاکہ اپنی عظمت و شوکت کا انھیں احساس رہے اور خاندانی اور قبائلی عصبیت زندہ رہے، اور اگر کسی موقعہ پر شکست ہوئی ہے تو غنیم سے انتقام لیا جا سکے۔

جنوب کے عرب جو یمن میں رہتے، اگرچہ شمالیوں کے مقابلہ میں زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ تھے لیکن انھوں نے بھی اپنی کوئی مدوّن تاریخ ایسی نہیں چھوڑی جس سے ان کی کوئی صحیح اور مستند تصویر بن سکے۔

البتہ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے یمن میں ماہرین نے جو کھدائیاں کرائی ہیں، ان میں بہت سی عبادت گاہیں، ستون، یادگاری مینار، چہار دیواریاں، گنبد اور قلعے برآمد ہوئے ہیں، جن پر کچھ عبارتیں اور کچھ نقوش کھدے ہوئے ہیں، اسی طرح سے مختلف قسم کے نقوش شمالی حجاز میں بھی ثمود اور لحیانیوں کے رہنے کی جگہوں میں اور شام کے حدود میں بھی ملے ہیں۔ ان نقوش اور کندوں کو پڑھ کر علمائے لسانیات نے یہ بات تو تحقیق سے معلوم کر لی ہے کہ جنوبی عربوں (یعنی یمن کے باشندوں[1]) اور شمالی عربوں (یعنی حجاز کے باشندوں) کے زبان میں بڑا فرق تھا۔ لیکن ان اکتشافات اور آثار کے تلنے پانے سے عربوں کی کوئی مسلسل اور مربوط سیاسی یا سماجی تاریخ نہیں بن پائی ہے۔

زمانہ جاہلیت کے اس دور کے عربوں کے متعلق خود عرب مورخین جیسے ابن ہشام، طبری اور ابن خلدون نے، اور یونانی و یہودی مورخین نے بھی لکھا ہے، ان کے علاوہ ان کا ذکر اختصار کے ساتھ توراۃ میں بھی ہے۔ لیکن ان سب روایتوں میں بڑا اختلاف ہے۔ نہ تو بادشاہوں کے نام ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور نہ ہی واقعات کے بیان اور ان کی ترتیب میں کوئی مطابقت یا یکسانی پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس زمانہ کی تاریخ اور حالات و کوائف کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی، سوائے ان واقعات اور تذکروں کے جن کا ذکر قرآن کریم اور حدیث شریف میں آیا ہے۔ اور ہمارا خیال ہے کہ موجودہ زمانے کے علمائے آثار نے قرآن و حدیث میں ان قوموں کے تذکروں سے فائدہ اٹھا کر ان مخصوص جگہوں پر کھدائیاں کرائی ہیں، اور جن کے نتیجہ میں قدیم عربوں کی تاریخ سے متعلق بہت قیمتی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔[2]

۱۔ جنوبی اور شمالی عربوں کی تاریخ کے لیے دیکھیے: تاریخ العرب قبل الاسلام جواد علی۔ (۲) جرجی زیدان۔ (۳) تاریخ عرب فلپ حتی۔ (۴) دائرۃ المعارف الاسلامیہ: کلمات: قتبان، معین، سبا، حضرموت، نبط، ثمود، لحیان (۵) اور فقہ اللغۃ اور علم اللغۃ مولفہ الدکتور علی عبدالواحد وافی، مطبوعہ لجنۃ البیان العربی، المنیرہ، القاہرہ سنہ ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۲ء

۲۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد عراق و شام میں عربی آثار اور قدیم عرب بستیوں اور قوموں کا پتہ لگانے کے لیے جو کھدائیاں شروع ہوئیں، ان میں مقامات اور قوموں کی جائے سکونت کو متعین کرنے میں قرآن کریم کی آیات سے بڑی مدد ملی۔ اور اصحاب کہف اور رقیم کی بستیوں کا تعین تو محض سورہ کہف کی آیتوں سے ہو سکا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے رسالہ "العربی" ماہ نومبر ۱۹۶۶ء اور اس کی تلخیص اردو میں رسالہ معارف، جون ۱۹۶۷ء۔ (بقیہ حاشیہ ص ۳۹)

قحطانی عرب

جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے یمنی عربوں کا سلسلہ نسب قحطان سے ملتا ہے۔ یہ قحطانی لوگ گروہوں کی شکل میں مختلف خطوں میں محلے بناکر جنھیں "مخلاف" کہتے ہیں رہا کرتے تھے۔ ان بستیوں کے ارد گرد ان کے کھیت اور چراگاہیں ہوتی تھیں۔ ان کا ایک سردار ہوتا تھا جسے "قیل" (جمع اقیال) کہتے تھے۔ ہر قیل اپنے افعال و اعمال کا خود ذمہ دار اور اپنی قلمرو میں آزاد و خود مختار ہوتا تھا۔ ان گروہوں میں آپس میں کوئی خاص تعلق نہ تھا، بلکہ ان میں اکثر جنگ و جدال، لوٹ مار ہوتی رہتی تھی جس میں طاقتور کمزور کو ہڑپ کر لیتا۔ یہ لوگ ایک سلسلہ دراز تک اسی طرح رہتے رہے، یہاں تک کہ ان کے یہاں، رفتہ رفتہ تہذیب و تمدن نے جنم لیا۔ اور ایک زمانہ ایسا آیا جس میں یمن میں مختلف حکومتیں قائم ہوئیں، جن میں دو حکومتیں بہت اہم تھیں، اور جن کے حالات قدرے وضاحت اور صحت کے ساتھ ہم تک پہنچ سکے ہیں:

سلطنت سبا۔ ۷۵۰۔ ۱۱۵ ق۔م

سب سے پہلے ملک سبا کا ذکر تورات اور اس کے بعد یونانی اور رومانی جغرافیہ کی کتابوں میں قدرے وضاحت سے آیا ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے اس کا ذکر جس انداز سے کیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ ملک سبا اپنے زمانے میں انتہائی ترقی یافتہ اور تہذیب و تمدن کا مثالی نمونہ ملک تھا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس ملک کا نقشہ یوں کھینچا ہے "لقد کان لسبا فی مسکنھم آیۃ، جنتان عن یمین وشمال، کلوا من رزق ربکم واشکروا لہ، بلدۃ طیبۃ

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸

طوفان نوح سے متعلق انکشافات کے لئے دیکھئے مجلۃ "العربی" ماہ جنوری ۱۹۷۷ء اور اس کی اردو میں تلخیص رسالہ معارف، اعظم گڑھ، ماہ مارچ ۱۹۷۷ء۔

جزیرہ نمائے عرب کے شمالی حصہ میں واقع "مدائن صالح" کے بارے میں جہاں قوم عاد و ثمود رہا کرتی تھیں، ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر خالد الصوفی کا مضمون "من المدینۃ المنورہ الی مدائن صالح" مطبوعہ "مجلۃ العربی" کویت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۹ء۔ اور عادل عباس کا مضمون "تیماء من الناحیۃ العصریہ" اور محمد سعید کمال کا مضمون "من تاریخ الطائف" مطبوعہ رسالہ "العرب" ذوالحجہ ۸۶ھ (آذار ۱۹۶۷) وادی فرات میں عربوں کی قدیم تاریخ کے انکشافات کے سلسلہ میں ڈاکٹر ابراہیم ندوی کا مضمون "الحضارۃ العربیہ فی ماری فی عصر سیدنا ابراھیم" مطبوعہ مجلۃ العربی ماہ اکتوبر ۱۹۷۰ اور "فقہ اللغۃ" الدکتور علی عبد الواحد وافی، لجنۃ البیان العربی، القاهرہ سنہ ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۲ء

و ربٌ غفور" (اہل صبا کے لیے ان کے رہنے کی جگہ میں نشانی تھی۔ ان کے داہنیں بائیں دو دو باغ تھے، اپنے رب کے رزق میں سے کھاؤ اور اس کا شکر بجالاؤ کہ ملک بھی بہترین ہے اور رب بھی معاف کرنے والا ہے) ملک سبا اس عروج کو حضرت مسیح سے کئی صدی پہلے ہی پہنچ چکا تھا علمائے آثار کو ان کے جو کتبے ملے ہیں ان سے انھوں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ ملک آٹھویں صدی قبل مسیح میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔

اس حکومت کا دارالسلطنت شہر "مارب" تھا، اور اپنے عروج کے زمانے میں انتہائی فارغ البال اور متمول شہر تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک زمانے میں ہندوستان، مصر و شام اور حبشہ کے درمیان تجارت اکثر بحری راستوں سے ہوتی تھی، مگر ایک عرصے کے بعد جب سمندری ڈاکوؤں کی وجہ سے سمندری راستہ پرخطر ہوگیا، تو تجارت خشکی کے راستہ سے ہونے لگی۔ چنانچہ ہندوستان اور حبشہ سے سامان تجارت جزیرہ عرب کے بندرگاہوں پر آتا اور وہاں سے سبا کے رہنے والے اسے شام، مصر اور عراق کے بازاروں میں پہنچاتے۔ پھر ساحل جزیرہ سے تجارتی قافلے مآرب ہوکر شمال کی طرف مکہ پہنچتے اور وہاں سے مقام "بطرہ" میں، پھر بحر روم کے ساحلی علاقہ غزہ میں۔ چنانچہ تجارتی سامان کے اس دو رویہ آمد و رفت سے یمنیوں کو بہت فائدہ پہنچا اور ان کی حیثیت بہت بڑھ گئی، روپئے پیسے کی ریل پیل ہوگئی، فارغ البالی اور خوشحالی کا ایسا سنہری دور آیا جس کی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ انھوں نے تالاب کھودے، بند باندھے، عظیم الشان محلات بنائے اور امن وچین کی بنسری بجاتے رہے۔ غالباً یہ صورت حال پہلی صدی عیسوی تک جاری رہی، اس کے بعد سمندری راستہ پھر سے پرامن ہوگیا، اور ہندوستانی تجارت پھر اپنے سمندری راستہ پر آگئی۔ اب ہندوستان کا مال تجارت حضرموت ہوتا ہوا "درہ باب المندب" تک سمندر کے راستے پہنچنے لگا اور ان کی معاشی حالت گرنے لگی۔ اس کے بعد ان کی زمینوں کی سرسبزی و شادابی کا سرچشمہ ان کا مشہور "مارب" کا بند بھی ایک طوفانی سیلاب میں ٹوٹ گیا، جو اپنی روانی میں ترقی و عروج کے سارے مظاہر کے ساتھ یمنی قوم کو بھی بہالے گیا۔

مارب کا بندھ

"سد مارب" یا "مارب کا بندھ" ایک مضبوط اور چوڑا بند تھا، جس کے ذریعہ یمنی لوگ پانی کو روکتے تھے۔ اس کی شکل بالکل آج کل کے "ڈیمس" کی سی تھی۔ اس بندھ کے باندھنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یمن میں ہمیشہ بہنے والے قدرتی دریا یا چشمے نہ تھے۔ البتہ ان کے یہاں

بارش کا خاصا پانی جمع ہو جاتا تھا لیکن وہ سب رفتہ رفتہ بہ کر صحرا میں چلا جاتا تھا۔ چنانچہ یمنیوں نے اپنے زمانۂ عروج میں سوچا کہ کیوں نہ اس پانی کو روک کر جمع کر لیا جائے، اور حسب ضرورت کھیتی باڑی میں استعمال کیا جائے۔ انھوں نے پہاڑوں کی گھاٹیوں میں مختلف جگہ بند باندھ کر پہلے پانی کے رخ کو ایک راستہ پر کیا، اس کے بعد سب سے اخیر میں ایک بہت چوڑا بند باندھا، یہ بڑا بند "مارب کا بند" تھا۔ یہ بند مارب شہر کے جنوب مغرب میں باندھا گیا تھا۔ اس علاقہ میں بڑے بڑے پہاڑ اور گہری وادیاں بکثرت تھیں۔ جب پانی برستا اور سیلاب آتا تو مختلف وادیوں کا پانی بہ کر ایک بڑی وادی میں جسے "اذنہ" کہتے تھے، جمع ہو جاتا تھا۔ جب یہ وادی بھی بھر جاتی تو پھر پانی کا رخ ایک درّہ کی طرف ہو جاتا جو مارب سے تین گھنٹوں کی مسافت پر واقع تھا، اور اس درّہ کے ذریعہ پانی صحرا میں پھیل جاتا تھا۔ یمنیوں نے اس درہ پر ایک مشہور بند باندھ کر پانی کو اپنے قبضہ و تصرف میں کیا تھا۔ اس بند کے دونوں سروں پر انھوں نے دریچے اور کھڑکیاں بنا رکھی تھیں، جنھیں کھول کر حسب ضرورت پانی لے لیتے اور ان کو بند کر دیتے۔ بند کے دونوں کناروں کے پیچھے ان کے باغات اور کھیتیاں تھیں، جو اس پانی سے سیراب ہو کر لہلہایا کرتی تھیں۔ اسی نسبت سے قران کریم نے کہا ہے کہ "ان کے دائیں بائیں دو دو باغ تھے"۔ ایک عرصۂ دراز تک اہل یمن، اس بند سے فائدہ اٹھاتے رہے، مگر اس کی دیکھ بھال اور مرمت کا کسی کو خیال نہ آیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ اتنا زبردست اور طوفانی سیلاب آیا کہ یہ بند ٹوٹ گیا۔ بند کا ٹوٹنا تھا کہ بستیاں بہ گئیں۔ شہر تباہ ہو گئے، مکانات منہدم ہو گئے۔ دوسری طرف بند کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے پانی بھی جمع نہیں ہو پاتا تھا جس سے یمنی اپنی کھیتیاں سینچ سکتے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں مستقل طور سے قحط پڑنے لگا۔ خشک سالی اور قحط سے جب لوگ مرنے لگے تو مجبور ہو کر انھوں نے شمال کی طرف رخ کیا اور یہیں سے جنوبی عربوں کی شمال یعنی حجاز کی طرف ہجرت کا آغاز ہوتا ہے، اور یہ زمانہ ہے تیسری صدی عیسوی کا۔ ان ہجرت کرنے والے قبائل میں "ازد" کا قبیلہ بھی تھا جس کی نسل سے مدینہ کے "اوس و خزرج" کے قبائل تھے۔ کہتے ہیں کہ مارب کے بند کے بعض حصے اب بھی موجود ہیں۔ یمنی اس حادثہ کے بعد ایسے تتر بتر ہوئے کہ عربی زبان میں منتشر ہونے کے لیے ضرب المثل بن گئے، چنانچہ کہتے ہیں کہ "تفرقوا ایدی سبا" یعنی ایسے بکھرے جیسے سبا کے لوگ!(۱)

علمائے آثار قدیمہ کو یمن اور نواح میں جو کتبے اور نقوش ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا

---

(۱)۔ سد مارب کے متعلق ملاحظہ کیجئے:۔ اسعد الفرد حضارۃ العرب صفحہ ۳۶ مطبوعہ مطبع ہندیہ الموسکی، مصر۔ اور مصور رپورتاژ "سد مارب" از سلیم زبان۔ مجلۃ العربی، کویت، ماہ مارچ ۱۹۷۳ء

ہے کہ ان کے بادشاہوں کے نام اور ان کی زبان، اس کے لکھنے کا طریقہ اور اس کے اصول و قواعد ان عربی ناموں اور عربی زبان سے بالکل مختلف ہیں جسے ہم آج عربی زبان سمجھتے ہیں۔

سلطنت حمیر

قبیلہ حمیر بھی سبا کی ایک شاخ تھا۔ حمیریوں نے بھی اپنی ایک الگ حکومت قائم کی تھی، جس کا دارالسلطنت "ظفار" تھا۔ غالب گمان یہ ہے کہ ان کی سلطنت، دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر چھٹی صدی عیسوی کے اوائل تک قائم رہی۔ اس پورے عرصہ سلطنت حمیر کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا، کیونکہ ان کے درمیان، کبھی ایرانیوں سے اور کبھی حبشیوں سے ہمیشہ جنگیں ہوتی رہتی تھیں جن میں فتح عام طور پر حمیر ہی کو ہوتی رہی۔ تاریخ سے ان کے بادشاہوں کی تعداد اور ان کے دور حکومت کی تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔

مورخین عام طور سے اس سلطنت کے بادشاہوں کو دو طبقوں میں بانٹتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق پہلے طبقہ کے بادشاہوں کی حکومت تیسری صدی عیسوی کے آخر تک جاری رہی اور دوسرے طبقہ کے بادشاہوں نے، اپنے حدود سلطنت "شحر اور حضرموت" تک بڑھالی تھیں۔ اس طبقہ کے بادشاہوں کو "تبع، جمع، تبابعہ" کہتے ہیں۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ "ذونواس" تھا۔

کہتے ہیں کہ یہ آخری تبع حکمراں ذونواس، سخت قسم کا یہودی تھا۔ اس وقت تک عیسائی مذہب جزیرہ عرب میں خاصا رواج پاگیا تھا اور یمن کے ملک نجران میں عیسائی مراکز قائم ہو چکے تھے، ذونواس کو عیسائیت کی یہ بڑھتی ہوئی مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی، چنانچہ اس نے اپنی رعایا میں سے ان لوگوں کو سخت دردناک سزائیں دیں جنہوں نے مذہب عیسوی قبول کرلیا تھا۔ اور عام منادی کرادی تھی کہ سب لوگ یہودی مذہب قبول کرلیں، مگر اس کی رعایا نے اس کی بات ماننے سے انکار کردیا چنانچہ اس نے منکرین کو زندہ جلادیا۔ ملک حبش نے جو بہت پہلے مذہب عیسوی قبول کرچکا تھا، یمن کے ان مظلوم عیسائیوں کی مدد کے لیے یمن پر چڑھائی کردی۔ جنگ میں ذونواس اور اس کی قوم کو شکست فاش ہوئی اور ۵۲۵ء کے لگ بھگ یمن پر حبشہ کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ اسلام کے آنے سے چند سال پہلے تک عرب کے لوگ، یمن کی سب حکومتوں اور یمنیوں کی جملہ زبانوں کو حمیری ہی کہتے تھے، کیونکہ یمنیوں کا یہ قبیلہ تمام قبایل عرب میں زیادہ طاقتور اور رعب و دبدبہ میں مشہور تھا۔

عربوں میں یمنیوں سے متعلق بہادری شجاعت اور اعلیٰ کارناموں کی بہت سی جھوٹی سچی کہانیاں مشہور ہیں، اگرچہ تاریخی اعتبار سے ان میں سے بہت سی کی کوئی حقیقت نہیں ہے، پھر بھی عربی شعروشاعری، قصے کہانیوں، اور ضرب الامثال پر ان کا بہت اثر ہے۔

عدنانی عرب

جنوب کے قحطانی یمنیوں کے مدمقابل شمال میں عدنانی تھے۔ عدنانی حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہیں، اور حجاز، تہامہ اور نجد کے علاقوں میں رہتے تھے۔ ان میں کچھ عراق اور جزیرہ عرب میں بھی رہتے تھے۔

عدنانیوں اور قحطانیوں میں بہت سی باتوں میں بڑا فرق ہے۔ ان میں سے چند باتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ عدنانی عربوں کے اکثر قبایل خانہ بدوش تھے۔ قریش مکہ کو چھوڑ کر بہت کم قبیلے ایسے تھے جو ایک جگہ مستقل طور سے جم کر رہتے ہوں۔ ان کے برخلاف قحطانی قبایل شہروں میں گھر بنا کر رہتے اور ایک ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کے مالک تھے۔

۲۔ عربوں کے ان دونوں قسموں میں زبان کا بہت بڑا اختلاف تھا۔ چنانچہ قحطانیوں کی زبان اور عدنانیوں کی زبان میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ البتہ اسلام سے کچھ زمانہ پیشتر عدنانیوں میں سے قریش کی زبان کو فوقیت حاصل ہونا شروع ہوئی جو اسلام کے آنے کے بعد مکمل ہوگئی۔

۳۔ اسی طرح عبادت کے طریقوں اور معبودوں میں بھی ان دونوں قبایل میں بہت اختلاف تھا۔ چنانچہ اسلام سے پہلے یمنی اپنے جن خاص دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے، عدنانی انہیں نہیں مانتے تھے۔

جیسا کہ سابقہ شجرہ نسب سے معلوم ہوا ہوگا، عدنانیوں کی بھی بہت سی شاخیں ہوگئیں، ان میں سب سے اہم اور ممتاز دو شاخیں تھیں؛ ربیعہ اور مضر۔ اور اسلام سے دو سو سال پہلے تک یہی دونوں قبیلے سب سے زیادہ طاقتور اور با اثر قبیلے شمار کئے جاتے تھے۔

باوجود اس کے کہ یہ دونوں قبیلے ایک ہی آباد اجداد کی اولاد تھی، پھر بھی ان میں سخت دشمنی چلی آرہی تھی جس کی وجہ سے ان دونوں میں سخت خونریز جنگیں ہوئیں، جن میں دونوں طرف کے سینکڑوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ یہ لڑائیاں جب چھڑ جاتی تھیں تو رکنے کا نام نہیں لیتی تھیں بلکہ برسہا برس تک ان کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ ان لڑائیوں میں سے چند مشہور درج ذیل ہیں جو بہت ہی معمولی باتوں کی وجہ سے چھڑ گئیں اور ایک مدت دراز تک خون کی ہولی کھلواتی رہیں:

جنگ بسوس

یہ خونریز لڑائی قبیلہ ربیعہ کی شاخ بکر و تغلب کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کا سلسلہ اتنا کھنچا کہ چالیس سال تک تلواریں چلتی رہیں۔ کہتے ہیں کہ اس جنگ کا سبب سراب نامی ایک اونٹنی تھی، جس کی مالکن "بسوس" نام کی ایک عورت تھی۔ ایک دفعہ یہ اونٹنی کلیب بن ربیعہ کی چراگاہ میں، جو بنو تغلب کا سردار تھا، چلی گئی۔ یہ چراگاہ ایک مقام جس کا نام "عالیہ" تھا، واقع تھی۔ کلیب کا رعب و دبدبہ اتنا تھا کہ بغیر اس کی اجازت کے کوئی جانور تو کیا کوئی آدمی بھی اس میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسی طرح جس گھاٹ پر اس کے جانور پانی پیتے تھے، وہاں پر دوسرے اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتے تھے، جہاں اس کی آگ جلتی تھی، وہاں کوئی دوسرا اپنی آگ نہیں جلا سکتا تھا۔ کلیب نے قبیلہ شیبان میں جو بکر کی ایک شاخ تھی، شادی کر رکھی تھی۔ بسوس نامی یہ عورت اسی خاندان کے ایک شخص جساس بن مرۃ الشیبانی کی خالہ تھی۔ چنانچہ جب کلیب نے اس شیبانی عورت کی اونٹنی کو اپنی چراگاہ میں دیکھا تو تاک کر اس کی تھن میں تیر مارا۔ یہ ماجرا جساس دیکھ رہا تھا، خالہ اور اس کی اونٹنی کی یہ بے عزتی اس سے نہیں دیکھی گئی، وہ کلیب پر جھپٹا اور اسے قتل کر ڈالا۔ اور اس کے بعد بکر و تغلب میں اس منحوس لڑائی کا سلسلہ چھڑ گیا، جو عربی ادب میں نحوست کی ضرب المثل بن گئی۔

حرب داحس و غبرا

قبیلہ مضر کی شاخوں میں جو لڑائیاں ہوئیں، ان میں سب سے مشہور "داحس اور غبرا" کی جنگ ہے۔ یہ جنگ مضر کی دو شاخوں، قبیلہ ذبیان اور عبس کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ قبیلہ عبس کے ایک شخص "قیس بن زہیر العبسی" نے "حذیفہ بن بدر الفزاری" کے ساتھ، جو ذبیان کا آدمی تھا، گھوڑ دوڑ کے مقابلہ کی شرط باندھی۔ چنانچہ فزاری نے اپنا گھوڑا "الغبراء" دوڑایا، اور عبسی نے اپنا گھوڑا "داحس" چھوڑا۔ داحس آگے نکل گیا۔ لیکن نشان تک پہنچنے سے پہلے ایک چیز سے ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔ اتنے میں فزاری کا گھوڑا "الغبراء" بالا مار گیا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ بنو فزارہ نے راستے میں کوئی اڑنگا رکھ دیا تھا، جس سے عبسی کا گھوڑا ٹکرا کر گر گیا تھا۔ اس پر ہر ایک قبیلہ اپنے گھوڑے کے جیتنے کا دعوی کرنے لگا، ہوتے ہوتے بات بڑھ گئی، اور ایسی خونریز جنگ کی صورت اختیار کر گئی جو "حرب بسوس" کی طرح چالیس سال تک چلتی رہی۔

اسی طرح مضر کے دوسرے قبایل، مثلاً قریش اور کنانہ، میں بھی مستقل جنگوں کا سلسلہ چلتا رہا ہے۔ ان جنگوں کو "حرب فجار" کہتے ہیں[1]۔ غرضکہ عدنانیوں کے مختلف قبایل میں آپس میں اکثر جنگیں رہا کرتی تھیں، جن کی وجہ سے نہ صرف جان و مال کا نقصان ہوتا تھا بلکہ یہ جنگیں ان قبایل کے لیے ایک مستقل عذاب بنی ہوئی تھیں، جنھوں نے ان کا چین و سکون اور زندگی کا لطف کھو دیا تھا مگر ان جنگوں کا ایک دوسرا اچھا پہلو یہ تھا کہ ان کی وجہ سے ان عربوں میں بہادری، جوش و خروش، وفا، اور خودداری کے جوہر پیدا ہو گئے تھے، جن کا عکس ہمیں ان کی شاعری میں اور خاص طور سے حماسہ کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ جس نے آگے چل کر شاعری کی ایک مستقل صنف کی شکل اختیار کر لی۔ مقتولوں پر نوحہ کرنے اور رنج و غم کے اظہار اور بین کرنے سے شاعری میں مرثیہ گوئی کا فن پیدا ہوا، جس میں شعرا کو چھوڑ کر بعض مرثیہ گو شاعرات نے کمال پیدا کیا ہے جیسے تماضر خنساء، کہ مرثیہ گوئی میں انھوں نے مرد شاعروں سے بھی زیادہ نام پیدا کیا۔ ان فنون کے علاوہ ان رزم آرائیوں کی وجہ سے اور کئی فنون پیدا ہوئے جن کا ذکر مناسب موقع پر آئے گا۔

عدنانیوں کا سب سے بڑا مرکز شہر مکہ تھا، جس میں ان کی شاخ قریش اور کنانہ رہا کرتی تھی ان قبایل کی دوسروں کے مقابلہ میں بڑی عزت اور وقعت تھی۔ کیونکہ خانہ کعبہ کی تولیت کا شرف انھیں کو حاصل تھا۔ اخیر زمانہ میں یہ عزت صرف قریش کے لیے مخصوص ہو گئی۔ اس زمانے میں قریش کے سردار قصی بن کلاب تھے۔ یہ بڑے ذہین بہادر، پر وقار اور سخی آدمی تھے، اس لیے مکہ والوں نے نہ صرف جنگ کا قائد و سپہ سالار انھیں کو بنایا تھا بلکہ خانہ کعبہ کی حفاظت و نگرانی کا کام اور اہم منصب بھی انھیں کے حوالہ کر دیا تھا۔ یہ لوگ مشکل مسائل اور آڑے وقتوں میں ان سے مشورہ لیتے اور ان کی بات پر عمل کرتے۔ خانہ کعبہ کے سامنے ان کی انجمن "دار الندوہ" میں امتیازی حیثیت انھیں کو حاصل تھی۔ قصی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے یہ رسم نکالی کہ باہر سے آتے ہوئے حاجیوں کو کھانا کھلاتے۔ ان کے لیے پینے کے پانی کا انتظام کرتے، کیونکہ یہ لوگ اللہ کے مہمان تھے۔ اس کا خرچ چلانے کے لیے انھوں نے قریش پر ایک ٹیکس عائد کیا تھا جسے سب لوگ بخوشی ادا کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

1۔ تفصیل کے لیے دیکھئے سیرت کی کتابیں اور "أيام العرب في الجاهلية" محمد ابو الفضل ابراہیم و علی محمد البجاوی۔ مطبوعہ مصر: (دار احياء الكتب العربية)

قصی کی سرداری اور اہمیت کا یہ وقت پانچویں صدی عیسوی کے اوائل کا زمانہ ہے۔
ان کی وفات کے بعد قریش کی سیادت اور خانہ کعبہ کی نگرانی و تولیت کے فرائض ان کی بیٹے عبد مناف، ہاشم اور اخیر میں عبد المطلب کو سونپی گئی۔ عبد المطلب، جیسا کہ سب جانتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا تھے۔ انھیں عبد المطلب کی سرداری کے زمانہ میں حبشہ کے بادشاہ ابرہہ نے خانہ کعبہ کو گرانے کے لیے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ لیکن اس کی فوج میں ایک سخت وبا پھیلی اور جیسا کہ قرآن شریف نے کہا ہے، اللہ نے ایک قسم کی چڑیوں کو ان پر مسلط کر دیا جنھوں نے کنکریاں مار کر انھیں ایسا سراسیمہ کیا کہ جو بچ رہے وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ اس سال کو عربوں نے " ہاتھی کے سال" کے نام سے موسوم کیا ہے، کیونکہ اس چڑھائی میں اہم رول ابرہہ کے ہاتھی " محمود" کو ادا کرنا تھا مگر بقول مورخین وہ کعبہ کے سامنے ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا بلکہ بیٹھ جاتا تھا۔ اس واقعہ کے بارے میں ایک سورت " الفیل" (ہاتھی) کے نام سے قران میں نازل ہوئی ہے۔

عبد المطلب کے انتقال کے بعد، قریش کے قبایل میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے اور ہر ایک نے خانہ کعبہ کے مختلف کاموں میں شرکت کرنی چاہی، چنانچہ بنو ہاشم کو حاجیوں کے پیاؤ کا انتظام سونپا گیا، بنی امیہ کو فوجوں کی سپہ سالاری دی گئی، اور بنی نوفل کے حصہ میں بچھڑے ہوئے حاجیوں کی خبر گیری، رہنمائی اور مالی امداد کا کام سپرد ہوا۔ اور اس طرح خانہ کعبہ کے مختلف کاموں میں شرکت کی عزت سے قریش کے سارے قبایل مشرف ہوتے۔

عربوں کا غیر قوموں سے تعلق اور اس کے ذرائع

باوجود اس کے کہ عرب بڑی حد تک عزلت پسند قوم تھی، مگر حالات کے تقاضوں اور ضروریات کے ماتحت انھوں نے دوسری اقوام سے اپنا رشتہ جوڑا، اور ان تعلقات اور میل جول سے عربی ادب کو بہت فائدہ ہوا۔ نئے نئے الفاظ، نئی نئی ترکیبیں، اور نئے نئے اسالیب بیان آئے، جنھوں نے عربی ادب کو بہت مالا مال، وسیع اور پر مغز بنا دیا۔

عربوں کا تعلق اپنے پڑوسی ملکوں سے اور قوموں سے مختلف طریقوں سے ہوا، ان میں جو بہت اہم اور نتیجہ خیز تھے:

(۱) تجارت

تجارت میں یمن کے باشندے ایک زمانے میں مشہور تھے، ان کے بعد اس میدان میں قریش مکہ بھی داخل ہو گئے۔ چنانچہ قدیم زمانے سے یمنی حضرموت، ظفار، ہندوستان، افریقہ اور

بحر یمن سے سامان تجارت لاکر، مصر و شام کی منڈیوں میں بیچا کرتے تھے۔ اور اس طرح ان کا ربط و ضبط۔ ان ملکوں اور وہاں کے باشندوں سے ہوا۔

چھٹی صدی عیسوی میں، جب ان کے اندر کمزوری آئی، اور حالات ان کے موافق نہ رہے جن کا ذکر قدرے تفصیل سے پہلے ہو چکا ہے، تو حجاز کے عرب اور خاص طور قریشیوں نے ان کی جگہ لی چنانچہ یہ لوگ اب یمنیوں اور حبشیوں سے سامان تجارت خرید کر مصر و شام کے بازاروں میں کھپاتے تھے۔ قریشی سال میں دو مرتبہ تجارتی سفر پر جاتے تھے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ذکر ہے، ایک سفر جاڑے میں اور دوسرا گرمی میں کرتے تھے۔ جاڑوں میں ان کے تجارتی قافلے یمن جاتے، اور گرمیوں میں شام۔ خانہ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے ان کی جو عزت تھی اور عرب قبایل ان کی جو قدر و منزلت کرتے اس کی وجہ سے ان کے یہ دونوں سفر بغیر کسی خطرے اور لوٹ مار کے ڈر کے، بڑے اطمینان اور پر امن طریقے سے انجام پاتے تھے جس کی وجہ سے ایک طرف قریش کی مالی حالت بہت اچھی ہوگئی، تو دوسری طرف عربی زبان کو مالا مال ہونے کا موقع ملا۔ کیونکہ یہ قریشی تاجر جب دوسرے ممالک میں جاتے تو وہاں کی زندگی، رہن سہن اور گھر بار دیکھتے، اس سے ان کے ذہن میں وسعت اور فکر میں جلا پیدا ہوتی۔ پھر ان ملکوں کے باشندوں سے لین دین کرنے میں، ان کے زبان کے بہت سے الفاظ غیر شعوری طور پر ان عربوں کی زبان پر چڑھ جاتے، جنھیں یہ اپنے ملک لاتے اور بول چال میں استعمال بھی کرتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے فارسی، رومی، مصری اور حبشی الفاظ ان کی اپنی زبان میں داخل ہو گئے، جنھیں ان عربوں نے اپنی زبان کے قواعد و ضوابط کے مطابق ڈھال کر اپنی زبان کا حصہ بنا لیا۔

۲۔ سرحدی ریاستیں

عربوں کا دوسری قوموں سے ملنے کا ذریعہ وہ عربی ریاستیں بھی بنیں، جنھیں انھوں نے سرحدوں پر قائم کیا تھیں۔ ان ریاستوں میں دو کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ان میں سے ایک "حیرہ" کی ریاست تھی اور دوسری "غسانیوں" کی۔

ان ریاستوں کے وجود میں آنے کا سبب یہ ہے کہ ایرانی اور رومی سلطنتوں کی سرحدیں، عربوں کی سرحدوں سے ملتی تھیں، یہ عرب لوگ موقع پا کر ان پر مستقل حملے کرتے رہتے اور اپنی لوٹ مار سے ان کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ اور چونکہ یہ لوگ صحرا میں رہتے تھے، لوٹ مار کر کے اپنے صحرا میں غائب ہو جاتے اور یہ حکومتیں ان کا کچھ نہ بگاڑ پاتیں۔ اس لیے عربوں کی ان

ناگہانی حملوں سے بچنے کے لیے ایرانیوں نے اپنی سرحدوں سے متصل "حیرہ" کی عربی ریاست قائم کی، اور رومیوں نے اپنے سرحدوں کے قریب "غسانیوں" کی، تاکہ عربوں سے یہ ریاستیں نبٹ لیا کریں اور انھیں اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت نہ پڑے۔

(الف) حیرہ کی ریاست

اس ریاست کو ایرانیوں نے قائم کیا تھا، یہ کوفہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع تھی۔ اس کی ریاست قبیلہ لخم (یمنی۔ کہلانی) کو سونپی گئی تھی۔ ایران کا بادشاہ والی ریاست مقرر کرتا تھا، جو ایک معمولی رقم بطور خراج ایران کو دیتا تھا۔ یہ والی ریاست کے اکثر معاملات میں آزاد ہوتا تھا۔ حیرہ کا سب سے پہلا والی "عمرو بن عدی" ہوا ہے، جسے ساپور اول بن اردشیر نے ۲۴۲ء میں مقرر کیا تھا۔ حیرہ کی یہ عربی ریاست ۶۳۳ء تک قائم رہی، اس کے بعد خالد بن الولید مشہور اسلامی سپہ سالار نے اسے فتح کر کے اسلامی سلطنت کا حصہ بنا دیا۔

حیرہ کے یہ عرب حکام، عربوں اور ایرانیوں میں واسطہ کا کام بھی کرتے تھے، اور ان کے اس میل جول سے عربی ادب کو بڑا فایدہ پہنچا۔ کیونکہ اس واسطہ سے عربی زبان میں ایرانی تہذیب و تمدن کے نمونے آئے، تجارتی تعلق سے فارسی کے الفاظ اور تعبیریں آئیں۔ یہاں کے والیان ریاست بڑے علم پرور اور ادب نواز تھے۔ ان میں خاص طور سے قابل ذکر ابوقابوس النعمان الخامس تھا، جس کے دربار میں معلقات کا مشہور شاعر نابغہ ذبیانی حاضر ہوا تھا اور اس کی شان میں اپنا مدحیہ قصیدہ پڑھا تھا۔

والیان حیرہ نے اس ریاست میں "خورنق" اور "سدیر"(۱) نام کے دو بہت عظیم الشان قلعے بنائے تھے۔ عربی ادب میں ان دونوں قلعوں کا ذکر مضبوطی، شان و شکوہ اور عظمت کے نشان کے طور پر بکثرت آتا ہے، کیونکہ ان عربوں نے اتنے عظیم الشان قلعے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اسی خورنق

۱۔ ایک جاہلی شاعر کا قول ہے:

واذا انتشیت فاننی	رب الخورنق والسدیر
فاذا صحوت فاننی	رب الشویهة والبعیر

یعنی جب ترنگ میں ہوتا ہوں تو اپنے آپ کو خورنق اور سدیر قلعوں کا مالک سمجھنے لگتا ہوں۔ لیکن جب نشہ اتر جاتا ہے تو پھر وہی اونٹ اور بکریوں کا مالک ہی جانتا ہوں۔

کے بانی "سنمار" کا ذکر بھی اولوالعزمی اور شان و شوکت میں ضرب المثل کے طور پر بہت زیادہ آتا ہے۔ عربوں کے بعض گروہ اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ حیرہ کے لوگوں نے اسلام سے پہلے قریشیوں کو زندقہ سکھایا، اور اسلام کے بعد انہیں لوگوں نے قریشیوں کو لکھنا پڑھنا بھی۔

(ب) غسانی ریاست

رومیوں نے شام کی اپنی سرحدوں پر غسانی ریاست قائم کی تھی۔ اس ریاست کا پایۂ تخت دمشق کے قریب ایک بستی "جلق" تھا۔ مشہور صحابی شاعر حضرت حسان بن ثابت نے شاہان غسان اور جلق کی تعریف بڑے والہانہ انداز سے کیا ہے۔[1] اس ریاست کے والیوں میں سب سے زیادہ مشہور "الحارث بن جبلہ" گزرا ہے، اس کو شہنشاہ کوستنیان نے ۵۲۹ء میں والی مقرر کیا تھا۔ حارث مذہباً عیسائی تھا۔ یہی وہ حارث ہے جو امرؤالقیس کو لے کر ۵۴۲ء میں قسطنطنیہ گیا تھا اور قیصر سے سفارش کی تھی کہ باپ کے قتل کے بعد امرؤالقیس پر جو مصیبت پڑی ہے اس میں اس کی مدد کرے۔

غسانی والیان ریاست میں آخری والی جبلہ بن الایہم تھا۔ جب مسلمانوں نے شام کو فتح کیا تو یہ اسلام لے آیا، لیکن بعد میں حضرت عمرؓ نے ایک معمولی مسلمان، بنو فزارہ کے ایک فرد کے ساتھ زیادتی کرنے پر جبلہ کے خلاف فیصلہ دیا تو یہ خفا ہو کر بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا اور پھر عیسائی ہو گیا، اور اسی حال میں ۲۰ھ میں گزر گیا۔

غسانی والیان ریاست بھی، والیان حیرہ کی طرح، عربوں اور رومیوں کے درمیان واسطہ کا کام دیتے تھے۔ ان کے ذریعہ عربوں میں رومی تہذیب و تمدن کے اثرات آئے، ان کے الفاظ، ترکیبیں اور تعبیریں آئیں۔ یہ غسانی والیان ریاست بھی بڑے مہمان نواز، علم دوست اور شاعر و ادیب نواز تھے۔ ان کے دربار میں اس زمانے کے جلیل القدر اور نامور شعراء آتے تھے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر واپس جاتے تھے۔ ان میں قابل ذکر معلقات کے دو شاعر "نابغہ الذبیانی اور الاعشیٰ" ہیں۔

۱۔ غسانی بادشاہوں اور جلق کی تعریف میں حسان کا ایک بہت مشہور مدحیہ قصیدہ ہے جس میں کہتے ہیں:

لله در عصابة نادمتهم　　　يوماً بجلق في الزمان الاول

"بریص" شام کا وہ مرغزار جہاں غسانی بادشاہ رہتے اور بردی شام کے بڑے دریا کا ذکر فرمایا ہے:

يسقون من ورد البريص عليهم　　　بردى يصفق بالرحيق السلسل

اللہ اس جماعت کو سلامت رکھے جن کے ساتھ میں نے جلق میں ابتدائی زمانے کے دن گزارے۔ جو لوگ بریص میں ان کے پاس آتے ہیں تو انہیں وسیلے کے بردی کا خالص شراب ملا پانی پلاتے ہیں۔

ان کے علاوہ جاہلی شعراء میں علقمۃ الفحل اور مخضرم میں حسان بن ثابت بھی ان کے دربار سے متعلق رہے تھے اور ان کی شان میں مدحیہ قصائد لکھ کر لے جاتے اور انعام و اکرام سے نوازے جاتے۔

عربوں کی اجتماعی حالت

سماجی اور معاشرتی لحاظ سے عربوں کو دو گروہوں میں بانٹا جاسکتا ہے:

۱۔ بادیہ (دیہات) میں رہنے والے عرب

۲۔ شہروں میں رہنے والے عرب

۱۔ بادیہ میں رہنے والے عرب (بدو)

ملک عرب جیسا کہ بیان ہوچکا ہے، ایک جزیرہ نما ہے، جہاں کی زمین خشک، بنجر اور بے آب و گیاہ ہے۔ پانی کی کمی اور نہروں اور دریاؤں کے نہ ہونے کی وجہ سے، وہاں نہ کھیتی باڑی ہوسکتی ہے اور نہ ہی مستقل بستیاں اور شہر بس سکتے ہیں۔ اسی لیے عرب کے اس حصہ کے باشندے صحرا میں اپنی چھوٹی چھوٹی بستیاں بسا کر، دیہاتی زندگی گزارتے تھے۔ یہ لوگ خانہ بدوش تھے، اور کہیں جم کر نہیں رہتے تھے، بلکہ چراگاہوں اور سبزہ زاروں کی تلاش میں ادھر ادھر منتقل ہوتے رہتے تھے اور خیموں میں زندگی گزارتے تھے۔ ان کی زندگی کا دار و مدار ان کے جانوروں پر تھا جو صرف اونٹ، بکری اور گھوڑے تک محدود تھے۔ نجد کے اونچے علاقوں میں جب سردیوں میں بارش ہوتی، اور تھوڑی بہت گھاس پھوس اگ آتی تو یہ لوگ اپنے مویشیوں کو لے کر ادھر چلے جاتے، اور جب یہاں کی گھاس اور ہریالی ختم ہوجاتی، اور گرمیوں کی لوئیں چلنے لگتیں، تو اپنے خیمے اپنے مویشیوں پر لاد، اپنے دیہاتوں میں واپس آجاتے۔ ان کے یہ خیمے ان کے جانوروں کی کھالوں کے ہوتے تھے، جن کو نصب کرنے کے بعد دو حصے کردیئے جاتے تھے، ایک حصہ مردانہ، اور ایک حصہ زنانہ۔ عام طور سے زنانہ حصہ پیچھے ہوتا تھا۔

عربی شاعری میں ان خیموں کو اور جن جگہوں میں نصب ہوتے تھے، اور جہاں جہاں قبیلہ رہتا تھا، بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ عربی کی غزلیہ شاعری میں، ان خیموں کا اور ان میں رہنے والی (خدر) نوجوان پردہ نشیں حسیناؤں اور جن بستیوں میں یہ نصب ہوتے ان کا ذکر عام طور سے بڑے دلکش انداز سے آتا ہے۔ اسی طرح عہد جاہلیت کے شعراء ان خیموں کے "اطلال" کو دیکھ کر، یہاں زہرہ جبینوں سے جو عہد و پیمان ہوئے تھے، انھیں یاد کرکے بے قابو ہو پڑتے تھے اور خود بھی روتے تھے اور اپنے دوست واحباب کو بھی دعوت گریہ دیتے تھے۔" اطلال" سے مراد وہ اونچی

جگہیں تھیں جہاں خیمے نصب ہوتے تھے اور وہ نشانات تھے جو قبیلہ کے کسی جگہ سے کوچ کر جانے کے بعد وہاں رہ جاتے تھے۔ جیسے چولھوں کے پتھر جو دھویں سے کالے ہو چکے ہوتے تھے یا ان چولھوں کی راکھ، یا خیموں کے چاروں طرف کی زمین پر بنی ہوئی منڈیریں جس سے پانی یا رینگنے والے جانور اندر نہ آسکیں، یا جانوروں کے گوبر اور اونٹوں اور بکریوں کی مینگنیاں یا بچوں کے ریت کے گھروندے۔ شاعر کو یہ سب نشانات دیکھ کر اپنی محبوبہ اور اس کے ساتھ اس جگہ جو حسین لمحات گذرے ہوتے، یاد آجاتے اور وہ بیخود ہو کر رو پڑتا۔ اس بدعت کو سب سے پہلے جاہلی شاعر" امرؤالقیس" نے ایجاد کیا۔ (۱)

ان خانہ بدوش عربوں کی غذا اپنے جانوروں کا دودھ اور کھجور ہوتی تھی۔ بکریوں اور اونٹوں کا گوشت بھی کھاتے تھے، مگر ان جانوروں کی مہنگائی اور افادیت کے پیش نظر ان کا گوشت سب کو میسر نہ تھا۔

اونٹ ان کی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اونٹ کا گوشت کھاتے، اس کا دودھ پیتے، اور اس کے اون اور کھال سے اپنے کپڑے بناتے، اپنے خیمے تیار کرتے، اور اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر سفر کرتے، اپنا سامان ڈھوتے اور عام سواری کے طور پر استعمال کرتے۔ انھیں اونٹوں کے بدلے میں لین دین کرتے، ان کے بدلے میں اپنے قیدیوں کو چھڑاتے، مقتولین کے فدیہ میں دیتے، اور انھیں کو مہر میں دے کر شادیاں کرتے۔ غرضکہ اونٹ ان کی زندگی کا وہ گرانمایہ سرمایہ تھا، جس کے بغیر ان کی زندگی مشکل ہو جاتی اسی لیے عرب ان کی دیکھ ریکھ اور افزائش نسل کا خاص خیال رکھتے تھے، اور اس اہتمام کا اثر زبان پر بھی پڑا۔ چنانچہ عربوں نے اپنی زبان میں اونٹ کے ہر عضو کے لیے مناسب نام رکھے اور ان سے تشبیہات اور استعارے وضع کئے۔ ان کے سہارے بہت سی ضرب المثلیں اور کہاوتیں بنائیں، اور ان کی تعریف و توصیف میں لمبے چوڑے قصیدے لکھے۔ ان کو تیز چلانے کے لیے گانے کی ایک اچھوتی قسم " حدی" ایجاد کی، جسے بڑی لے سے گاتے اور اونٹ اسے سن کر بیخود ہو جاتا اور تیز قدم چلنے لگتا۔

عرب گھوڑوں کو بھی بڑے شوق اور اہتمام سے پالتے تھے۔ خالص گھوڑوں کی افزائش نسل کے خیال سے ان کے شجرہ نسب یاد رکھتے تھے۔ اسی دیکھ ریکھ کا نتیجہ ہے کہ اب بھی دنیا میں

۱۔ چنانچہ اس نے اپنے مشہور معلقہ میں کہا ہے کہ:

قفا نبک من ذکری حبیب ومنزل بسقط اللوی بین الدخول وحومل

یعنی اے میرے دونوں ساتھیو، ذرا ٹھیرنا، ہم اپنے محبوب اور اس کے گھر کو یاد کر کے، جو سقط لوی میں دخول اور حومل کے درمیان ہے، رو تو لیں۔

عربی نسل کے گھوڑوں کی شہرت ہے۔ سپہ گیری میں مہارت پیدا کرنے، اور اس فن کو زندہ رکھنے کے لیے جو تدبیریں عرب کرتے تھے ان میں ایک گھوڑ دوڑ بھی شامل تھی۔ اس دن خاص اہتمام ہوتا، مقابلہ میں حصہ لینے والے قبایل آمنے سامنے جمع ہوتے، میدان میں ایک بانس کا ٹکڑا گاڑ دیا جاتا اور گھوڑے چھوڑ دیئے جاتے۔ جو گھوڑسوار آگے نکل جاتا وہ اپنے ساتھ اس بانس کے ٹکڑے کو بھی اکھاڑے جاتا اور پالا مار لیتا۔ اس رسم سے عربی زبان میں "حاز قصب السبق"(۱) کی مثل ایجاد ہوئی یعنی پالا مار لیا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، عربی قبایل ہمیشہ جنگ و جدال، لوٹ مار، قتل و غارت گری میں معروف رہتے تھے۔ ان جنگوں کے جہاں برے اثرات مرتب ہوتے تھے، وہاں ان کی وجہ سے چند مفید نتائج بھی نکلے۔ عربوں کی تاریخ میں پہلی دفعہ اس کشت و خون کو دیکھ کر ایک جاہلی شاعر نے صلح و آشتی، اور امن و سلامتی کا نعرہ لگایا وہ چیخا کہ خدا کے لیے اس مذموم و منحوس جنگ و جدال کو بند کرو، ورنہ یہ تم کو اور تمھاری آل و اولاد کو ہمیشہ کے لیے بھسم کر کے رکھ دے گی۔ اور یہ شاعر تھا اصحاب معلقات کا زاہد اور فلسفی شاعر زہیر بن ابی سلمی۔ زہیر بن ابی سلمیٰ نے جب یہ وحشت و بربریت دیکھی تو بڑے دلنشیں انداز سے صلح صفائی، میل جول اور محبت و الفت کا پیغام دیا اور اس حرص و ہوس کی ماری دنیا میں یہ آواز شبنم کے قطروں کی طرح سوکھی اور پیاسی زمین کے لیے مژدۂ جانفزا بن کر پھیلی۔

عربوں کی اس جنگجویانہ طبیعت اور ماحول کا اثر زبان پر پڑے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ پوری عربی شاعری جنگ کے حالات اور ان کے وصف، معرکہ کارزار کے بیان، انتقام لینے کی خواہش، کامیابی پر فخر، ذلت برداشت کرنے کے مقابلے میں مرجانے کو ترجیح دینے، عزت و ناموس کی خاطر جان کی بازی لگا دینے اور اپنے وقار اور خودداری پر سب مال و متاع کو قربان کر دینے کے جذبات سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح ان جنگوں کے نتیجے کے طور پر ہتھیاروں اور آلات جنگ کے نام عربی زبان میں آئے۔ چنانچہ جو شخص مذکورہ اوصاف پر پورا اترتا وہ قبیلہ کی آنکھ کا تارا مانا جاتا، جس کی عزت صرف قبیلہ کے لوگ ہی نہیں بلکہ حریف بھی کرتے۔

بدویانہ زندگی گذارنے کی وجہ سے سیر و شکار کا مشغلہ بھی ان عربوں کے یہاں رائج تھا، جس کا ذکر جاہلی شاعری میں، خاص طور سے امرؤ القیس اور مرقش الاکبر اور علقمۃ الفحل کے یہاں بہت ملتا ہے(۲)

۱۔ لفظی معنی " مقابلے کے بانس پر قبضہ کر لیا"۔

۲۔ امرؤ القیس اور علقمۃ الفحل کے درمیان جو شعری مقابلہ ہوا تھا اس میں ہار جیت کا فیصلہ بھی شکار سے متعلق ایک شعر پر ہوا تھا۔ تفصیل علقمۃ الفحل کے حالات زندگی میں دیکھیے۔

چنانچہ نیل گایوں اور گورخروں کے شکار کے تذکرہ سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔ شیر کے شکار کا بھی رواج ان کے یہاں تھا اور اس کے لیے یہ بدو لوگ کسی اونچی جگہ گڈھا کھود دیتے تھے جسے "زبیہ" عربی کہتے تھے۔ اسی زبیہ عربی کی ضرب المثل "بلغ السیل الزبی" یعنی "پانی سر سے اونچا ہو گیا" نکلی ہے۔(۴)

شراب اور جوا ان عربوں میں عام تھا چنانچہ اس کا ذکر بھی جاہلی شاعری میں بہت اچھے انداز سے ملتا ہے۔ انھیں شراب کی محفلوں میں گانے کی ایجاد ہوئی جسے خاص قسم کی لونڈیاں گایا کرتی تھیں جنھیں قیان (قینۃ کی جمع) کہتے تھے۔ شراب کا بہترین وصف علقمۃ الفحل کے اس قصیدے میں ملتا ہے جس کا مطلع ہے:

هل ما علمت وما استودعت مكتوم امحبلها اذ نأتك اليوم مصروم

عورت اور بدویانہ زندگی

اس بدویانہ معاشرہ میں عورت کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں شریک ہوتی تھی۔ یہ لکڑیاں لاتی تھی، جانوروں کو دوہتی تھی، کپڑے بنتی تھی۔ ان کے یہاں پردہ کا رواج نہ تھا، چنانچہ عورتیں بھی مہمانوں کا استقبال کرتی تھیں۔ شادی کے معاملے میں ان کو پوری آزادی حاصل تھی اور اپنے شوہر اپنی مرضی سے پسند کرنے کا اختیار انھیں حاصل تھا۔ جنگوں میں یہ مردوں کے پیچھے رہتی تھیں کہ مرد انھیں دیکھ کر اس خیال سے بے جگری سے لڑیں گے کہ اگر ہار ہو گئی تو ان کی عورتیں لونڈیاں باندیاں بنالی جائیں گی۔ ان بدوی عورتوں میں سے بہت سی نے بہادری، قوت ارادہ، عقلمندی اور شعروادب میں بھی نام پیدا کیا ہے (۱) اس بدوی زندگی کے ان سب مظاہر کا ذکر ہمیں جاہلی شاعری میں پوری طرح ملتا ہے۔

عورتوں کی اس اہمیت اور زندگی میں ناگزیری کے باوجود بعض قبایل اپنی لڑکیوں کو زندہ قبر میں دفن کر دیتے تھے۔ مگر یہ رواج بہت عام نہ تھا۔ صرف تیم اور اسد کے بعض قبایل اس مذموم حرکت کے مرتکب ہوتے تھے۔ اس کی ایک وجہ جیسا کہ قرآن کریم نے بیان کیا ہے، غربت تھی۔ یہ قبایل سمجھتے تھے کہ لڑکی ذات صرف بار بڑھائے گی، ہاتھ نہیں بٹائے گی۔ چنانچہ قرآن نے کہا کہ "تم ان کو فاقہ اور تنگ دستی کے ڈر کی وجہ سے نہ مارو، کیونکہ ہم تم کو بھی کھلاتے ہیں اور ان کو بھی" (۲) اس خطرے کے علاوہ سب سے

---

(۴) لفظی معنی: سیلاب شیر کے شکار کے گڈھے تک پہنچ گیا۔

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے: ۱۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، جرجی زیدان ج ۱، اور الاغانی کے مختلف حصے۔ (۲) تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام، ڈاکٹر شکری فیصل مطبوعہ دمشق (۳) الغزل فی العصر الجاہلی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

بڑی وجہ ان کی عزت نفس اور خودداری تھی۔ ان قبائل کو اس میں اپنی ہتک اور توہین محسوس ہوتی تھی کہ کسی کے خسر اور کسی کے سالے کہلائیں۔

جہاں تک جاہلی شاعری کا تعلق ہے، اس میں تو مرکزی حیثیت عورت ہی کو حاصل ہے۔ اس دور کے تمام شعراء اپنے کلام کی ابتدا عورت سے اظہار تشبیب سے ہی کرتے تھے، اور اس کے بعد گریز کرکے اصل مطلب پر آتے تھے۔ عام طور سے یہ شعری محبوبہ اپنی بیوی ہوتی تھی۔ غیر عورت سے اظہارِ تشبیب کرنا جاہلی شعراء اور جاہلی معاشرہ میں معیوب بات تھی۔ سب سے پہلے بیوی کے علاوہ دوسری عورت سے اظہار عشق کی ابتدا امرؤ القیس نے کی ہے، جس نے کئی لڑکیوں سے بیک وقت اظہار تشبیب کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی یہ عشقیہ شاعری اس کے باپ کے خفا ہونے کا سب سے بڑا سبب تھی۔ کیونکہ اس بدعت کو سارے عرب بہت معیوب سمجھتے تھے۔

۲۔ شہروں میں رہنے والے عرب

دوسری قسم ان عربوں کی تھی، جو عام طور سے شہروں میں پختہ مکانات بنا کر رہتے تھے اور شہری زندگی کی آسائشوں اور آسانیوں سے بہرہ مند تھے۔ یہ شہری عرب یمنی تھے، انھوں نے یمن میں بڑے بڑے محلات اور کوٹھیاں بنا رکھی تھیں اور تجارت و زراعت کی کمائی سے عیش و عشرت کی زندگی گذارتے تھے۔ مورخین کہتے ہیں کہ ان کی تہذیب و تمدن اس زمانے میں اتنی ترقی یافتہ تھی کہ ان کے گھروں میں سونے چاندی کے برتن استعمال ہوتے تھے، یہ لوگ باریک کپڑے زیب تن کرتے تھے اور اپنے محلات اور گھروں کو بہت قیمتی ساز و سامان سے سجاتے تھے۔ ظاہر ہے جہاں عیش و عشرت اور شہری زندگی کی اتنی آسانیاں ہوں، وہاں کے لوگوں میں سخت کوشی، محنت کرنے کی عادت، اور جنگجو قوموں کی صفات مثلاً بہادری، بے خوفی، اور بیباکی نہیں پیدا ہو پاتی، چنانچہ یمن کے لوگ شمال کے عربوں کے مقابلہ میں ان صفات میں کم تھے۔

حجازیوں میں، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، قریش مکہ متمدن، مہذب اور شہری لوگ تھے، ان کی خوشحالی کا سبب ان کی تجارت تھی، جو یمنیوں کے بعد انھیں کی اجارہ داری میں آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ کعبہ کی تولیت اور اس کی وجہ سے ان کے احترام سے بھی ان کے یہاں فارغ البالی اور خوشحالی آئی۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) ڈاکٹر احمد محمد الحوفی مطبوعہ مصر۔

۲۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: "لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق، نحن نرزقھم و ایاکم"، اپنے اولاد کو تنگ دستی اور فاقہ کے ڈر کی وجہ سے نہ مارو، ہم ان کو اور تم کو بھی رزق دیتے ہیں۔

عربوں کی دینی حالت

زمانہ جاہلیت میں سب عربوں کا کوئی ایک مشترک مذہب نہ تھا، بلکہ ہر قبیلہ اور قبیلہ کی ہر شاخ اپنا ایک الگ مذہب رکھتی تھی۔ چنانچہ ان میں سے بعض سورج کو پوجتے تھے، اور اس کے نام پر "عبد شمس" یعنی سورج کا بندہ نام رکھتے تھے۔ بعض قبایل چاند کی پرستش کرتے تھے۔ قبیلہ لخم، خزاعہ اور قریش "شعری ستارہ" کو معبود سمجھتے تھے۔ ان میں سے بعض فرشتوں کی اور بعض قبایل جنات کی بھی عبادت کرتے تھے۔ قریش کے کچھ لوگ دو خدا مانتے تھے۔ ایک نور کا، اور دوسرا ظلمت (تاریکی) کا۔ خدائے ظلمت کو فتنہ و فساد اور برائیوں کی جڑ سمجھتے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے سرے سے مذہب کا انکار کر دیا تھا۔

ان چھوٹے موٹے خداؤں کے علاوہ، عام طور سے سارے عرب میں بت پرستی کا رواج تھا۔ قرآن کریم نے ان تمام بتوں کے نام گنائے ہیں، جنھیں اہل عرب پوجتے تھے۔ ان میں سب سے ممتاز بت، لات، منات، عزی، یغوث، یعوق، نسر، ود اور سواع تھے۔ ان میں سب سے زیادہ پرانا بت "منات" تھا۔ یہ بت مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ رکھا رہتا تھا۔ یہاں آکر سارے عرب کے لوگ اس کی عبادت کرتے اور قربانی کے جانور ذبح کرتے۔ قبیلہ اوس اور خزرج کا یہ محبوب بت تھا۔ قبیلہ ثقیف کا محترم بت "لات" تھا، جس کا طائف میں انھوں نے مندر بنا رکھا تھا۔ عربوں میں ان بتوں کے نام پر نام رکھنے کا رواج بھی عام تھا۔ چنانچہ "عبد مناف" "زید منات"، "زید اللات" اور "تیم اللات" کے نام عام طور سے عربوں میں پائے جاتے تھے۔ عزی قریشیوں کا محبوب ترین بت تھا۔ اس کے علاوہ قریش نے خانہ کعبہ میں بھی کئی بت رکھ چھوڑے تھے۔ ان میں سب سے بڑا "ہبل" تھا، جو انسان کی شکل کا عقیق پیرے کا بنا ہوا تھا۔

عربوں کی زندگی پر ان بتوں کا اثر اور ان کی کارفرمائی بہت نمایاں تھی۔ یہ لوگ ان سے برکت حاصل کرتے، مدد مانگتے، ان پر چڑھاوے چڑھاتے، فال نکالتے، سفر میں جاتے وقت اور واپس آکر ان کو چھوتے اور اپنے جسم پر ملتے۔ غرضکہ بت پرستی اور اس کے اثرات عربوں کی زندگی اور معاشرت میں بری طرح سرایت کر چکے تھے۔ دین ابراہیمی، جس کا پیرو اپنے آپ کو بتاتے تھے، بھولی بسری کہانی بن گیا تھا۔

یمن اور یثرب (مدینہ) میں تیما اور خیبر کے کچھ لوگ یہودی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے۔ بعض غسانی، قبیلہ طئی اور نجران وحیرۃ کے کچھ لوگ مذہب عیسوی کو مانتے تھے۔ مشہور جاہلی شاعر السموئل بن عادیا بھی یہودی مذہب کا پیرو تھا۔

قبایل ربیعہ وغسان اور قضاعہ کی بعض شاخوں میں مذہب عیسوی کا رواج تھا۔ حیرہ میں عرب کے مختلف قبایل جن کو "العباد" کہتے تھے، مذہب عیسوی کے پیرو تھے۔ اسی طرح یمن میں نجران کا شہر عیسائی مذہب کا گڑھ تھا۔ عیسائی شعراء میں قس بن ساعدہ الایادی، امیہ بن أبی الصلت اور عدی بن زید کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے علاوہ ایک جماعت ایسی بھی تھی، جو صرف ایک خدا کی عبادت کرتی تھی، اور بت پرستی، یہودیت یا نصرانیت کے قائل نہ تھی۔ یہ لوگ "حنفی" (یعنی خالصۃً صرف ایک خدا کو ماننے والے) کہلاتے تھے۔ یہ لوگ قریشیوں کی بت پرستی کو خام خیالی اور اوہام پرستی سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کے چڑھاوے کے جانوروں کے گوشت کو یہ لوگ حرام سمجھتے تھے۔

یہ تو عام معاشرہ کی دینی حالت تھی لیکن اگر ہم جاہلی شاعری پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ شعراء نے دین اور اس کے معتقدات و نظریات کو دینی حیثیت سے اپنی شاعری کا موضوع عام طور سے نہیں بنایا اور نہ انھوں نے ان مسائل پر کبھی گفتگو کی۔ البتہ بعض شعراء ایسے ملتے ہیں جن کے یہاں لات وعزیٰ کی قسم ملتی ہے، مگر اول تو یہ بہت کم ہے، اور جہاں ہے بھی تو یہ غالباً اس وجہ سے ہے کہ شاید مخاطب اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہو جو ان بتوں کو مانتا ہو۔ اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ جاہلیت میں عام عرب اور خاص طور سے شعراء دین کو سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ دوسری بات بھی ممکن ہے کہ اسلامی عہد میں جب ان شعراء کا کلام مرتب ہوا تو شعر کے راویوں نے جان بوجھ کر ایسے اشعار مرتب نہیں کیے، جن میں غیر اسلامی عقاید یا بت پرستی کا ذکر تھا، کیونکہ ان کے خیال میں اس سے اسلامی تعلیمات اور اسلامی عقاید کے مجروح ہونے کا ڈر تھا

عربوں کی ذہنی وفکری حالت

جب کسی قوم کی اجتماعی زندگی کا نہج وہ ہو جس پر عربوں اور خاص طور سے بدنانیوں کی معاشرتی زندگی چل رہی تھی تو علم اور علمی کام کرنے والے لوگ، اس کو منظم اور منضبط کرنے والے علماء نہیں ابھر پاتے، اور خاص طور سے ایسے معاشرہ میں جہاں لکھنے پڑھنے کا رواج صفر کے برابر ہو، کیونکہ علمی کام کے لیے سکون خاطر کے ساتھ معاشی سکون اور ایک ایسی تہذیب وتمدن کی ضرورت ہوتی ہے جہاں اس کی قدر اور اس سے استفادہ کے مواقع اور اس کو آگے بڑھانے کے امکانات موجود ہوں۔ اور یہی چیزیں بڑی حد تک اس معاشرہ میں مفقود تھیں۔ اسی لیے ہمیں اس زمانے میں کوئی ایسا علمی کام یا تصنیف نہیں ملتی جو خالصۃً عربوں کی دین ہو، اور جس نے علمی دنیا میں کوئی مقام حاصل کیا ہو

مگر کتابوں اور منضبط علوم وفنون کے نہ ہوتے ہوئے بھی ان عربوں نے اور خاص طور سے

عدنانیوں نے ضرورت کے تقاضے سے زندگی کے بہت سے مسائل اور اس سے متعلق کئی فنون میں اپنے تجربات کی روشنی میں یک گونہ دسترس حاصل کرلی تھی۔ جنگ میں لگے رہنے کی وجہ سے جانوروں کے علاج و معالجہ میں ان کو خاصی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ فن سپہ گری میں یہ لوگ یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے۔ بارش اور گھاس پر ان کے جانوروں کی زندگی کا دار و مدار تھا، چنانچہ وہ ان تاروں کو پہچانتے تھے جن سے بارش کی اطلاع ملتی تھی۔ یا تاروں کے ذریعہ ملکوں کے جائے وقوع معلوم کر لیتے تھے (۱) یا بری اور بحری سفروں میں تاروں کی مدد سے تاریک راتوں میں رہنمائی حاصل کر لیتے تھے۔ ان عربوں نے اپنی نسلوں کی بقاء اور قومی تعصب کو زندہ رکھنے کے لیے علم نسب، اپنے قابل فخر کارناموں اور واقعات کو بیان کرنے اور انھیں اس طرح محفوظ رکھنے کے لیے قصہ گوئی اور کارناموں کو دوام بخشنے کے لیے شاعری میں اچھا خاصا درک پیدا کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ فراست (۲) اور قیافہ شناسی میں ان کو ایک گونہ مہارت حاصل تھی۔

صحیح علم کے فقدان کی وجہ سے ان لوگوں کے یہاں عرصہ سے کہانت، عرافت اور چڑیوں کو اڑا کر فال لینے اور ان سے فیصلہ کرنے کا رواج بہت عام تھا۔ بیماری آزاری میں صحراء کی بعض جڑی بوٹیوں کے استعمال کے علاوہ یہ لوگ اپنے کاہنوں سے بھی مشورہ لیتے تھے، اسی طرح اپنے مشورہ طلب اور پیچیدہ مسائل میں عرافوں کی طرف رجوع کرتے تھے (۳)

---

(۱) جیسے یمن کی سمت کو سہیل ستارہ کی مدد سے متعین کرتے تھے ایک جاہلی شاعر نے کہا ہے:

ذريني ما أمن بنات نعش ... من الطيف الذي ينتاب ليلا

ولكن إن اردت فهيجينا ... إذا رمقت باعينها سهيلا

(۲) فراست ظاہری آثار و قرائن سے اندرونی حالات کو سمجھ لینے کا نام ہے۔ مثلاً کسی شخص کی باتوں اور اس کے ناک نقشہ سے اس کے اخلاق و عادات کا اندازہ لگانا۔

(۳) چہرے کے خد و خال سے آدمی کی طبیعت اور مزاج کا پتہ لگا لینے کو "قیافہ" کہتے ہیں۔ عرافت و کہانت: غیب کی باتیں معلوم کرنے، نیز گزری ہوئے اور آنے والے واقعات کو بتانے کو کہتے ہیں۔ "کاہن اور عراف" میں فرق یہ ہے کہ "کاہن" آنے والے واقعات کو بتانے والے کو کہتے ہیں (تکہن یتکہن پیشینگوئی کرنا) اور "عراف" اس شخص کو کہتے ہیں جو گذشتہ زمانے کے حالات کو بتائے۔ عربوں کا خیال تھا کہ کاہنوں اور عرافوں کے جنات تابع ہوتے ہیں جو پوشیدہ طور پر عالم غیب سے حالات سن کر ان کو بتا جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان پر وہ یقین رکھتے تھے اور اہم معاملات میں ان سے مشورہ لیتے تھے۔
(باقی ص پر)

"غرض کہ عربوں کا اجتماعی نظام صرف قبائل تک محدود تھا۔ زبان، سیاست اور معاشی اعتبار سے ان میں آپس میں کوئی یگانگت نہ تھی۔ البتہ خلقت، ذہنیت اور ادب کے لحاظ سے ان میں ایک گونہ اشتراک پایا جاتا تھا، اگر ان کے ادب کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان میں بلند، عالی دماغ، ذہین و طباع ہستیاں ملیں گی۔ دور رسی، تجربہ کاری، وسعت نظر کی ایسی مثالیں بھی ملیں گی جو تمام تر ان کی اپنی جودت فکر اور طباعی کا نتیجہ ہیں۔ ان کی زبان نے، جو درحقیقت ان کی اجتماعی زندگی کی ترجمان ہے، روحانی، مادی، فکری و خیالی، اجتماعی اور انفرادی، الغرض آسمان و زمین کی کسی چیز کو بھی ایسا نہ چھوڑا جس کے اظہار معانی کے لیے اپنے اندر کوئی لفظ نہ بنایا ہو" اور اس کا اظہار ان کے خطبات ان کے امثال اور حکیمانہ مقولوں اور بیان سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

عربی زبان کی ابتدا اور اس کی نشو و نما

یہ عرب جن کا ذکر اوپر ہوا، عربی زبان بولتے تھے۔ عربی زبان دنیا کی ان وسیع، شیریں، سلیس، پاکیزہ اور خوبصورت زبانوں میں سے ہے، جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس کے الفاظ کے مخارج بڑے سامعہ نواز، پیرایہ بیان بڑا بلیغ، تراکیب بڑی دل آویز اور صوتی اثرات بڑے وقیع اور موثر ہوتے ہیں۔ پھر اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ایک ہی مادہ سے (اکثر صرف تین حروف سے) مختلف قسم کے افعال نکلتے ہیں جن میں بسا اوقات سات حروف تک ہوتے ہیں اور جن کے معنی بالکل مختلف ہوتے ہیں، اس کے علاوہ صلات کے بدلنے سے بھی معنی کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ بات کو پر اثر بنانے کے لیے مجاز و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ وغیرہ کا، اور معانی میں وسعت اور گہرائی و گیرائی پیدا کرنے کے لیے مرادفات کا استعمال ہوتا ہے۔ الفاظ کی آخری آواز (اعراب) کو حروف کے ذریعہ ہی ادا کیا جاتا ہے، انہیں لکھا نہیں جاتا چنانچہ زبر، زیر اور پیش کو علامت کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے، حروف سے نہیں۔ جیسا کہ آریائی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آریائی زبانوں کے مقابلے میں اس کی حروف تہجی بھی زیادہ ہیں، جن کی وجہ ہر قسم کے الفاظ لکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ عربی زبان کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنے قالب میں ڈھال لینے (معرب کرنے میں) اور بدل کر خوبصورت شکل دیدینے

زجر: جانوروں کے ڈرانے یا چڑیوں کے اڑانے کی آواز کو کہتے ہیں۔ عرب ان کی حرکت و ہیئت سے آئندہ پیش آنے والے واقعات کا اندازہ لگاتے تھے مثلاً اگر کوئی شخص کسی پرندہ کو پتھر مار کر یا شور مچا کر اڑاتا اور وہ پرندہ اس کے دائیں سمت سے اڑتا ہوا چلا جاتا تو وہ اسے فال نیک (اچھا اور مناسب) سمجھتے اور اگر بائیں جانب سے ہو کر اڑتا تو وہ اسے بدشگونی قرار دیتے اور اس کام سے باز رہتے

الترتيب العربي الكامل للحروف	عبرى	سبأي	لحياني	ثمودي	صفوي
ا	א				
ب	ב				
ج	ג				
د	ד				
ذ	ד̄				
ه	ה				
و	ו				
ز	ז				
ح	ח				
خ	ח̄				
ط	ט				
ظ	ט̄				
ی	י				
ك	כ				
ل	ל				
م	מ				
ن	נ				
س	ס				
ع	ע				
غ	ע̄				
ف	פ				
ص	צ				
ض	צ̄				
ق	ק				
ر	ר				
ش	ש				
ت	ת				
ث	ת̄				

شکل ١ صفوی، ثمودی رسوم التحریر

شکل-۱-

«آ»

«ب»

«ج»

«د»

شکل (الف) شاہ تنوخ (۲۵۰ سے ۲۷۱ء) کے زمانے کا طرزِ تحریر۔ (ب) نمارہ کا طرزِ تحریر ۲۲۸ء۔ (ج). حجر زبد ۵۱۱ء کی تحریر، جس میں پہلے یونانی، پھر سریانی اور اخیر میں عربی رسم خط ہے۔ (د) ۵۲۹ء اور ۵۴۹ کے درمیان حوران میں رائج طرزِ تحریر

عہد سبئی کے طرز تحریر کا ایک نمونہ

میں یہ زبان اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اس کی یہی امتیازی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر خدا نے اپنے کلام کے لیے اسی زبان کو انتخاب فرمایا اور قرآن کریم جیسی معجز نما کتاب اس زبان میں اتاری، جو بلا اختلاف عربی زبان و ادب کی وہ واحد کتاب ہے جس کی ایک سورۃ کی مثال بھی عرب کا بڑا سے بڑا شاعر اور ادیب اب تک نہ لا سکا۔ قرآن کے بعد اسی زبان میں خدا کے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیثیں ارشاد فرمائیں جو عربی ادب میں بلا اختلاف اپنی فصاحت و بلاغت اور معنوی جامعیت میں شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

عربی زبان کا سامی زبانوں سے رشتہ

زبان کے ماہر علماء کے خیال کے مطابق عربی زبان ان سامی زبانوں کی ایک شاخ ہے، جسے حضرت نوح کے بیٹے سام بن نوح کی اولاد کسی زمانے میں، اپنی بستیوں میں بولا کرتے تھے اور اس طرح اس زبان کا آریائی اور حامی زبانوں سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ ان سے بالکل مختلف ایک الگ زبان ہے۔ جب جگہ کی تنگی اور حالات کے ناقابل برداشت ہو جانے کی وجہ سے سامی اقوام ہجرت کر کے مختلف خطوں میں گئیں، اور دوسری قوموں سے اور دوسری زبانوں سے ان کا میل جول بڑھا تو ان کی زبان میں اختلاف پیدا ہونا شروع ہوا اور جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، حالات بدلتے گئے، سامی اقوام کی جائے رہائش اور مرکز بھی بدلتے گئے اور اسی حساب سے ان کی زبانوں میں بھی اختلاف اور دوری پیدا ہوتی گئی، یہاں تک کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ان کے مختلف لہجوں میں پوری مغایرت پیدا ہو گئی اور حالت یہاں تک پہنچی کہ ان کے مختلف لہجے بذات خود مستقل زبانیں بن گئیں۔ مگر چونکہ اصل سرچشمہ ایک تھا اس لیے ان کے اکثر الفاظ میں بڑی حد تک مشابہت اور قرب باقی رہا۔ اس کی مثال ہمیں عربی اور عبرانی زبان کے الفاظ میں پوری طرح ملتی ہے۔ چنانچہ بعض ایسے الفاظ جو عربی میں "شین" سے بولے جاتے ہیں، عبری میں "سین" سے بولے جاتے ہیں۔ عربی میں جو "الف" ہوتا ہے وہ عبری میں "واد" بن جاتا ہے۔ جیسے عربی کا "سلام" عبری میں "شلوم" بولا جاتا ہے۔ اسی طرح عربی کا "ث" عبری میں "ش" ہو جاتا ہے، جیسے عربی کا "ثور" عبری میں "شور" لکھا جاتا ہے۔ "ضاد" سے عربی کے جو الفاظ بولے جاتے ہیں وہ عبری میں "صاد" سے ادا کیے جاتے ہیں جیسے عربی کا لفظ "أرض" عبری میں "أرص" کہا جاتا ہے۔

ماہرین لسانیات نے پرانی زبانوں کو مختلف گروہوں اور حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان کی تقسیم کے مطابق آریائی زبانوں کے تین حصے یا تین بولیاں ہیں: لاطینی، یونانی، اور سنسکرت۔ اسی طرح انھوں نے سامی زبانوں کو بھی تین مختلف حصوں میں بانٹ دیا ہے: آرامی، کنعانی اور عربی۔ کہتے ہیں کہ آرامی زبان سے کلدانی، اشوری اور سریانی زبانیں پیدا ہوئیں، اور کنعانی سے عبرانی اور فینیقی۔ عربی سے

معز کی خوبصورت اور فصیح زبان کے علاوہ دوسری بولیاں جنھیں یمنی اور بعض حبشی قبایل بولتے ہیں، وجود میں آئیں۔

عربی زبان

عربی زبان اپنی اصلی شکل میں کس طرح وجود میں آئی، اس کا یقینی پتہ لگانا بڑا مشکل کام ہے۔ کیونکہ جس وقت اس کی تاریخ واضح شکل میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ وہ اسلامی زمانہ ہے اور اس وقت عربی زبان اپنے عروج کو پہنچ ہوئی تھی۔ اس سے پہلے جن مرحلوں سے یہ زبان گزری ہے اس کے متعلق کوئی بات اب تک یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی، مگر اب مستشرقین اور آثار قدیمہ کے ماہروں نے یمن، شام اور شمالی حجاز میں دریافت شدہ ان کتبوں سے جو پتھروں، مندروں، لاٹھوں، چہار دیواری، گنبدوں اور قلعوں میں ملے ہیں، عربی زبان سے متعلق بہت سی اہم باتیں معلوم کر لی ہیں۔ چنانچہ ان کتبوں اور نقوش کو ان علماء نے تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے جن سے مندرجہ ذیل تین لہجوں کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) جنوبی عربی لہجے: اس زبان کے کتبے یمن کے علاقہ قتبان، معین اور سبا وغیرہ میں ملے ہیں، جہاں اس لہجہ کا رواج تھا۔

(۲) شمالی عربی لہجے: اس زبان کے کتبے حجاز کے شمال میں ثمود کے رہنے کی جگہوں میں ملے ہیں۔

(۳) آرامی نبطی لہجے: یہ لہجے مذکورہ بالا لہجوں کے مقابلہ میں نئے ہیں۔ ان لہجوں کے لکھنے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب زبانوں کے لکھنے اور بولنے میں بڑا اختلاف تھا۔ مگر بعد میں حالات کے تقاضوں سے لہجوں کا یہ اختلاف مٹ گیا اور سب کے میل جول اور خاص طور سے دینی تقاضوں کے ماتحت ایک خوبصورت صاف ستھری اور شیریں زبان نکل آئی۔

اصل بات یہ ہے کہ عرب قوم ان پڑھ قوم تھی۔ قوموں اور گروہوں میں تعلقات اور رابطہ قائم کرنے کی ساری بنیادیں، مثلاً دین، تجارت یا حکومت، ان میں سے کوئی چیز ان میں ایسا میل جول اور تعلق نہ پیدا کر سکی جس سے آپس میں گہرا تہذیبی اور لسانی لین دین پیدا ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قبایل ایک ہی چیز کو مختلف ناموں سے پکارنے لگے اور ایک ہی مقصد کو ادا کرنے کے لیے الگ الگ طریقۂ ادا اختیار کرنے لگے، زندگی چونکہ خانہ بدوشانہ تھی، اس لیے شروع میں دوسروں سے اخذ کرنے کے مواقع بہت کم ملتے تھے، مگر جب ان کا تعلق دوسروں سے ہوا تو ان کی زبان میں بھی ان قبیلوں کے الفاظ آنے شروع ہو گئے اور اس طرح ان کی زبان میں تبدیلی آنی شروع ہوئی اور ایک ہی معنی کے لیے مختلف قبایل میں مختلف الفاظ اور تعبیریں آگئیں اور اس سے مترادفات کی کثرت ہوئی۔

پھر تعلیل وغیرہ کے اختلاف سے لہجوں میں بہت اختلاف ہوگیا۔ اس کے علاوہ بہت بڑا اختلاف بعض جملوں، بعض الفاظ اور حروف کو مروج طریقوں کے علاوہ مختلف طریقوں سے ادا کرنے کی وجہ سے بھی پیدا ہوا جیسے قبیلہ مازن کا "ابدال" کا طریقہ (۱) یا "اتمام و نقص" (۲) کا رواج جو قبیلہ خثعم اور زبید میں رائج تھا یا جیسے قبیلہ قضاعہ کا "عجعجہ"، یا حمیر کا "طمطمانیہ" ہذیلیوں کا "فحفحہ" یا قبیلہ تمیم کا "عنعنہ" قبیلہ ربیعہ یا اسد کا "کشکشہ" اور قبیلہ طئی کا "قطعہ"۔

عربی زبان کی تقسیم

قبائل کے مختلف لہجات میں مذکورہ بالا اختلاف کی وجہ سے علمائے لغت نے عربی زبان کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔

۱۔ جنوبی عربی زبان: جو یمن میں رائج تھی۔
۲۔ شمالی عربی زبان: جو حجاز میں رائج تھی۔

جنوبی عربی زبان میں جو یمن میں بولی جاتی تھی، سبا اور حمیر کی زبان شامل تھی۔ مگر فوقیت حمیر کی زبان کو حاصل تھی اس لیے اس کو حمیری زبان بھی کہتے ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا یہ شمالی زبان

---

(۱) یہ لوگ "م" کو بدل کر "ب" کر دیتے تھے اور "ب" کو بدل کر "م" کر دیتے تھے چنانچہ "ما اسمک" کی جگہ "با اسمک" اور "بکر" کی جگہ "مکر" بولتے تھے۔ (۲) یہ لوگ "من" حرف جار کے "نون" کو حذف کر دیتے تھے اور "خرجت من البیت" کی جگہ "خرجت ملبیت" کہتے تھے۔ آج بھی مصر اور لبنان میں اکثر جگہ اسی طرح بولتے ہیں

۳۔ عجعجہ یہ ہے کہ اگر کسی لفظ میں "عین کے بعد" ی" آجائے تو اس کو "ج" سے بدل دیا جائے جیسے "راعی" کو "راعج" اور "کرسی" کو "کرسج" کہا جائے۔ چنانچہ "الراعی خرج معی" کو قضاعہ والے "الراعج خرج معج" کہتے تھے۔ "طمطمانیہ"۔ "ال" کی جگہ "ام" بولنے کو کہتے ہیں جیسے "البر" کو "امبر" "الصیام" کو "امصیام" یا "طاب الہواء" کی جگہ "طاب امہوا" کہنا۔ "ح" کی جگہ "ع" بولنے کو "فحفحہ" کہتے ہیں جیسے "احل الحلال" کو "اعل العلال" کہا جائے یا "الحسن" کو "العسن" کہا جائے۔ "عنعنہ" میں شروع لفظ کے ہمزہ کو "عین" سے بدل دیتے تھے جیسے "أمان" کو "عمان"، "ان" کو "عن" کہتے تھے۔ "کشکشہ" یہ ہے کہ مؤنث حاضر کے "ک" کو "ش" سے بدل دیا جائے اور "علیک" کی جگہ "علیش" کہا جائے یا "ک" کے بعد "ش" بڑھا دیا جائے اور "علیک" کی جگہ "علیکش" بولا جائے۔ "قطعہ" کسی لفظ کے آخری حرف کو حذف کر دینے کا نام ہے، جیسے "یا ابا الحسن" کو "یا ابا الحسا" کہا جائے۔

یعنی حجازی کے مقابلہ میں زیادہ قدیم زبان ہے، کیونکہ یہ یمنیوں کی اصل زبان تھی۔ جنوب میں یمنیوں کی یہ زبان شمال میں عدنانیوں کی زبان سے بہت مختلف تھی۔ یمن میں جو کتبے وغیرہ ملے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جنوبی یمنی زبان، شمال کی عدنانی زبان سے نہ صرف صیغوں، تنوین، جمع مذکر سالم اور ضمیروں وغیرہ میں مختلف تھی بلکہ اس کے حروف تہجی بھی بڑی حد تک مختلف تھے۔ اسی لیے مشہور لغت کے عالم عمرو بن علا نے کہا تھا کہ "مالسان حمیر من لساننا فی شیئ، وما لغتھم من لغتنا فی شیئ" یعنی نہ تو حمیر (یمن) کی زبان ہماری زبان ہے اور نہ ان کی لغت ہماری لغت

شمالی علاقہ حجاز میں جو عربی بولی جاتی تھی، وہ عدنانیوں کی زبان تھی اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا یہ یمنی زبان کے مقابلے میں نئی زبان تھی اور ہمارے پاس جاہلی شاعری کا جو سرمایہ پہنچا ہے وہ اسی عدنانی لہجہ میں ہے، کیونکہ یہ جن شعراء کا کلام ہے وہ یا تو قبیلہ ربیعہ سے تعلق رکھتے تھے جیسے الاعشیٰ اور طرفہ بن العبد جو قبیلہ تغلب سے تعلق رکھتے تھے یا مضر سے، جیسے النابغہ الذبیانی اور عنترہ بن شداد العبسی جن کا تعلق قبیلہ مضر سے تھا۔ اور یہ دونوں قبیلے عدنان کی شاخیں ہیں۔ یا اگر کوئی شاعر نسلاً یمنی ہے بھی، تو وہ ان قبیلوں سے تعلق رکھتا ہے جو شمال کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے جیسے قبیلہ طئی، کندہ اور تنوخ۔ کہتے ہیں کہ شمال کی یہ عدنانی زبان اپنی اصل زبان سامی سے، دوسری زبانوں کے مقابلے میں، بہت قریب تھی۔ کیونکہ ان عدنانی قبایل کا دوسری قوموں سے بہت کم میل جول ہوا۔ اسی طرح یہ قبایل دوسری سامی قوموں جیسے عبرانی، بابلی، اور اشوری کی طرح دوسری قوموں کے کبھی غلام نہیں رہے، کیونکہ صحرا میں رہنے کی وجہ سے حملہ آوروں کی دست برد سے یہ ہمیشہ محفوظ رہے۔

جنوبی اور شمالی عربی زبانوں میں اختلاف کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں آپس میں سرے سے کوئی تعلق رہا ہی نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب یمن میں عرم کا سیلاب آیا اور اس کی وجہ سے تاریخ قدیم کا مشہور بند "مارب" ٹوٹا، اور اس ملک کے شہروں اور گاؤں کو اس سیلاب نے تباہ و برباد کر دیا تو سبا کے قبایل نے وہاں سے ہجرت کر کے جزیرہ عرب میں پناہ لی۔ یمن کے

(۱) یمنی قبایل کی اس حادثہ اور ان کے آپس کے جنگ و جدال کی وجہ سے تتر بتر ہو جانے کا واقعہ اتنا مشہور ہے کہ عربی ادب میں یہ حادثہ ضرب المثل بن گیا، چنانچہ کہتے ہیں کہ تفرقوا أیدی سبا یعنی ایسے تتر بتر ہوئے جیسے سبا کے قبایل۔

یہ لوگ متمدن، طاقتور اور ذہین و زیرک تھے، چنانچہ انہوں نے شمال میں آکر کوشش کی کہ جس طرح یمن میں عدنانی ان کے تابع تھے، اسی طرح یہاں بھی ان کے زیر نگیں رہیں، مگر ان کو اپنی اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی، کیونکہ عدنانیوں کا پورے صحرا پر قبضہ تھا اور یہاں ان کی حیثیت کافی مضبوط تھی۔ ایک دوسرے پر غلبہ اور بالادستی حاصل کرنے کی یہ کوشش بعد میں تعلقات قایم کرنے اور میل ملاپ بڑھانے کا ذریعہ بن گئی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ دونوں گروہوں میں سیاسی اور تجارتی تعلقات قائم ہوگئے اور اس طرح دونوں میں غیر شعوری طور پر الفاظ اور طریقہ ادا کا لین دین بھی ہونے لگا اور زمانے کے ساتھ ساتھ دونوں زبانوں میں یکسانیت کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ یہ کشمکش چھٹی صدی عیسوی تک قایم رہی یہاںتک کہ یمن میں حمیری حکومت کا زور رفتہ رفتہ، کبھی ایرانی اقتدار کی وجہ سے اور کبھی حبشیوں کے تسلط کی وجہ سے کم ہوتا گیا۔ ادھر عدنانیوں کی حالت ان کے برعکس پہلے سے بہت اچھی ہوتی گئی۔ یہ لوگ بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں شریک ہوتے تھے، حج بیت اللہ کی سربراہی ان کو حاصل تھی اس کے علاوہ یہ لوگ حمیری اور ایرانی حکومتوں سے نبرد آزمائی کے لیے تیار رہتے تھے۔ پھر تجارت کی وجہ سے آس پاس کے ملکوں سے تعلقات استوار تھے۔ چنانچہ انہوں نے موقع پاکر، اپنی زبان و ادب کو تباہ شدہ اور خستہ و مغلوب حمیریوں پر تھوپ دیا۔ اکھاڑ پچھاڑ اور بناؤ بگاڑ کا یہ دور ابھی چل ہی رہا تھا کہ اسلام آگیا اور اس کی وجہ سے رہی سہی کسر بھی پوری ہوگئی اور ایک وقت ایسا آیا کہ یمنی لہجہ اور یمنی قوت بالکل ختم ہوگئی کیونکہ قرآن کے قریشی لہجہ میں اترنے کی وجہ سے اس لہجہ کو دوسرے تمام لہجوں پر فوقیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ دوسری تمام زبانیں اور لہجے ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئے، اور اب صرف لہجہ قریش کی حکمرانی اور اس کا غلبہ ہوگیا، جو قرآن کی وجہ سے اب تک جاری ہے۔ (ص)

قریش کی زبان کو غلبہ حاصل ہونے میں جہاں اسلام اور قرآن کے نزول کا دخل ہے، وہاں بعض دوسرے اسباب بھی ہیں جنھوں نے اس فوقیت کو قایم اور برقرار رکھنے میں مدد کی۔ (۱) ان میں سے بعض درج ذیل ہیں :

(ص) قریش کے لہجہ کی فوقیت کے اسباب و علل کے لیے ملاحظہ کیجیے :۔ مضمون " مقدمہ تاج العروس: دراسۃ نقدیۃ از ڈاکٹر محمد عبدالسلام اشرف الدین، نیجیریا۔ مطبوعہ " اللسان العربی " الرباط، مراکش۔ المجلد الثالث عشر عام ۱۳۹۶ ھ/۱۹۷۶ء۔ صفحہ ۱۳۶ " قریش واللغۃ المشترکۃ "

(۱) سامی زبانوں سے متعلق تفصیلات کے لیے ملاحظہ کیجیے : (۱) " فقہ اللغۃ " مولفہ دکتور علی عبدالواحد وانی۔ (۲) " علم اللغۃ " (باقی اگلے صفحہ پر)

میلے اور بازار

عربوں کا دستور تھا کہ سال کے خاص مہینوں میں، جن میں عام طور سے لڑائی جھگڑا لوٹ مار بند رہتی تھی، خاص قسم کے میلے، بازار لگاتے اور تہواروں کی طرح انھیں مناتے۔ اور اپنا سامان تجارت بیچتے اور ضرورت کی چیزیں خریدتے۔ ان میلوں اور بازاروں میں جمع ہونے کے بعد صرف مال تجارت کا ہی لین دین نہیں ہوتا تھا بلکہ زبان و لغت، افکار و خیالات، کا بھی لین دین ہوتا تھا۔ کیونکہ ان میلوں میں عرب کے ممتاز شعراء، خطباء، روساء بڑی شخصیتیں اور قابل قدر لوگ جمع ہوتے تھے۔ جب اس قسم کا اجتماع کہیں ہونے لگے، اور خاص طور سے عرب جیسی قوم کے افراد کا تو ظاہر ہے اپنی اور اپنے قبیلے کے اہم واقعات، بہادری کے قصے، حسب نسب میں برتری کے دعوے، زبان دانی اور اس میں تفوق کے مظاہرے بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان میلوں میں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تجارتی منڈیاں، جن کی حیثیت "انٹر عرب نمائشوں" کی سی تھی، ایک طرف شعراء و خطباء کے افکار و خیالات کی نشرگاہیں بننے لگیں تو دوسری طرف عربوں کو اپنے دین، اخلاق، عادات و اطوار اور اپنی زبان میں اتحاد پیدا کرنے کا موقع بھی ملنے لگا۔

ان میلوں کی سب سے بڑی اور اہم مجلس "محفل مشاعرہ" ہوتی تھی، جس میں کلام سنانے کے لیے شعراء بہت پہلے سے اور بڑی ریاض کرکے تیاری کرتے تھے۔ عام دستور تھا کہ کسی سن رسیدہ باوقار اور متفق علیہ شاعر کو ثالث یا "میر مشاعرہ" مقرر کیا جاتا۔ پھر شعراء اپنا کلام پڑھ کر سناتے اور لوگ سن کر سر دھنتے اور جب سب شعراء فارغ ہو جاتے تو ثالث یا میر مشاعرہ اپنا فیصلہ سناتا کہ اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

مؤلفہ مصنف مذکور: مطبوعہ لجنۃ البیان العربی، المنیرہ، القاہرہ ۱۳۸۱ھ ۱۹۶۲ء۔ (۳) تاریخ العرب قبل الاسلام الدکتور جواد علی ج ۷، مطبعۃ المجمع العلمی العراقی (۴) فقہ اللغۃ وخصائص العربیۃ: محمد المبارک مطبوعہ دار الفکر الحدیث لبنان۔ (۵) الفلسفۃ اللغویۃ: جرجی زیدان، مطبوعہ الہلال مصر ۱۹۰۴ء۔ (۶) نشوء اللغۃ العربیۃ ونموھا واکتمالھا، مطبوعہ القاہرہ ۱۹۳۸ء۔ (۷) مقدمۃ لدراسۃ لغۃ العرب: عبداللہ العلایلی مطبوعہ القاہرہ۔ (۸) من اسرار العربیۃ: ڈاکٹر ابراہیم انیس، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۸ء (۹) دراسات فی العربیۃ وتاریخھا: محمد الخضر حسین مطبوعہ دمشق ۱۹۶۰ء۔ (۱۰) اللغۃ الشاعرۃ: عباس محمود العقاد، مطبوعہ قاہرہ۔ (۱۱) مشکلات اللغۃ العربیۃ: محمود تیمور، قاہرہ (۱۲) دراسات فی فقہ اللغۃ: ڈاکٹر صبحی الصالح، دمشق ۱۹۶۲ء۔ (۱۳) دراسات فی اللغۃ: ڈاکٹر ابراہیم السامرائی، بغداد ۱۹۶۱ء۔

سال کس شاعر کا قصیدہ سب سے اچھا رہا، چنانچہ اس قصیدہ کو لکھ کر خانہ کعبہ کے دروازہ پر لٹکا دیا جاتا۔ یہی وہ قصیدے ہیں جن کو "معلقات" (لٹکائے ہوئے قصیدے) کہتے ہیں۔ عکاظ کے میلہ میں عام طور سے مشہور جاہلی شاعر "النابغہ الذبیانی" مشاعروں کا میر یا ثالث مقرر ہوتا تھا۔ اس کے لیے چمڑے کا ایک خاص قسم کا سرخ رنگ کا خیمہ لگایا جاتا جہاں وہ بڑی عزت و احترام سے قیام کرتا تھا۔ مشاعروں کے علاوہ شعراء نجی طور پر بھی اس کو اپنا کلام دکھا کر اس کی رائے معلوم کرتے تھے۔

ان میلوں میں سنایا ہوا کلام عربوں کے مختلف قبائل میں پھیل کر بہت جلد عام ہو جاتا۔ نشر و اشاعت کے اس عوامی طریقہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف لہجوں، مروجہ افکار، پڑھے لکھے طبقہ کے خیالات، اسلوب بیان اور طریقہ ادا میں رفتہ رفتہ ہم آہنگی اور تال میل پیدا ہونا شروع ہوا جس کی وجہ سے ایک مربوط گٹھی ہوئی اور شستہ زبان پیدا ہو گئی جو سب کا مشترک سرمایہ بن گئی۔

یوں تو اس قسم کے کئی میلے لگتے تھے (۱) جن میں بعض کی حیثیت بالکل مقامی کی سی تھی، لیکن ان میں سب سے مشہور اور انتر عرب حیثیت کے میلے تین تھے:

۱۔ عکاظ

۲۔ مجنہ

۳۔ ذوالمجاز

عکاظ نخلہ اور طائف کے درمیان اور مکہ سے تین منزل کی دوری پر ایک گاؤں تھا، اس جگہ میلہ لگنے کا رواج ۵۴۰ء سے شروع ہوا۔ (۲) اور اسلام کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر میں خوارج کی لوٹ مار کی وجہ سے ۱۲۹ھ سے اس کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

---

(۱) جیسے "دومۃ الجندل" کا میلہ جو یکم ربیع الاول سے شروع ہوتا تھا۔ یا ہجر، عمان، حضرموت، عدن اور صنعاء کے میلے، جن کے بعد عکاظ کا میلہ شروع ہوتا تھا۔ عکاظ کے میلہ کی تاریخ بعض مورخین نے عام الفیل کے پندرہ سال بعد بتائی ہے، اس حساب سے ۵۸۵ء تاریخ نکلتی ہے۔

(۲) اسواق اور مجالس عرب کے لیے تاریخ کی کتابوں کے علاوہ ملاحظہ ہوں: اسواق العرب۔ یعقوبی ج ۱ طبع لیدن، المحبر، ابن حبیب طبع حیدرآباد۔ معجم البلدان یاقوت الحموی، معجم ما استعجم للبکری، وصفۃ جزیرۃ العرب للہمدانی، والاغانی للاصفہانی ج ۱، ۲، ۳، ۷، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۴، اور ۱۹ اور تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان ج ۱، طبعۃ جدیدۃ تحقیق الدکتور شوقی ضیف مطبوعہ دار الہلال ۱۹۵۸ء۔

مجنة مجنۃ (یا محنہ) مکہ کے قریب ایک بستی تھی۔

ذوالمجاز میدان عرفات سے ایک فرسنگ کے فاصلہ پر ایک بازار تھا۔

مجالس ادب اور چوپالیں

میلوں ٹھیلوں کے علاوہ عربوں نے بعض بیٹھکیں بھی بنا رکھی تھیں، جن میں عام سماجی مسائل پر غور وخوض کے علاوہ ادبی نشستیں بھی ہوتی تھیں، ان میں شعراء اپنا کلام سناتے اور بڑے بوڑھے مسائل اور معاملات پر اپنی رائے دیتے اور فیصلہ کرتے۔ ان بیٹھکوں میں مشہور "نادی قریش" اور "دارالندوہ" تھیں جو کعبہ شریف کے سامنے واقع تھیں۔ ان کے علاوہ محلوں میں امراء کے گھروں کے سامنے خاص بیٹھکیں بھی ہوتی تھیں جہاں روزمرہ کے مسائل اور معاملات پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ بادیوں میں بھی ان مجالس اور بیٹھکوں کا رواج تھا، جہاں لوگ جمع ہو کر اپنے مسائل پر غور و خوض کرنے کے علاوہ شعر و شاعری اور حسب نسب پر مفاخرہ کرتے تھے۔

مکہ کی مرکزیت

ان میلوں ٹھیلوں اور مجالس نے زبان کو ترقی دینے اور لہجات کے اختلاف کو مٹانے میں جہاں اہم رول ادا کیا ہے، وہاں خود مکہ کی جائے وقوع، اور قریش کی حیثیت نے بھی اس سلسلہ میں اہم کام کیا ہے۔ کیونکہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط سے یہ علاقہ ان قافلوں کی پڑاؤ کی جگہ تھی جو ہندوستان اور یمن کا تجارتی مال لے کر جنوب سے آتے تھے۔ مکہ والے ان سے تمام مال خرید کر خود اس مال کو شام اور مصر کے بازاروں میں کھپاتے تھے۔ خانہ کعبہ کی حرمت اور قریش کی بزرگی پر تمام قبایل کے اتفاق نے مکہ کے تجارتی راستے ان کے لیے پرامن بنا دیئے تھے۔ چنانچہ قریشی اپنے تجارتی مال سے لدے ہوئے قافلے بخوبی سے لیجاتے تھے۔ بازاروں اور میلوں میں شرکت، ملکوں کی سیاحت، اور تجارتی سفروں نے ان کے کاروباری معلومات میں اضافہ کر دیا تھا۔ عقل اور سمجھ بڑھنے کی وجہ سے، زندگی کے دوسرے مسائل سے بھی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی پھر مالی حالت بھی سدھر گئی تھی۔ اس کے علاوہ خود مکہ عرب والوں کی ایک تجارتی منڈی بن گیا تھا، جہاں لوگ پاپیادہ اور سواریوں پر چاروں طرف سے آ کر جمع ہوتے تھے تاکہ ارکان حج (بھی) بجا لائیں اور اپنی ضرورت کا سامان (بھی) وہاں سے خرید لائیں۔

قریش کی حیثیت اور سرداری کا اثر

مختلف لہجات کے میل جول اور آپس میں الفاظ و تعبیرات کے لین دین اور انتخاب کرنے میں قریش کی حیثیت اور ان کی سرداری اور برتری کو کافی بڑا دخل ہے۔ خاندان قریش مکہ کا اصلی

— باشندہ تھا اور حسب نسب میں سب سے اونچا اور وہاں کا مالدار طبقہ۔ انہیں اپنے تمدن، خانہ کعبہ کے انتظام، دیکھ بھال، حج کی قیادت، عکاظ کے بازار پر حکمرانی، جاڑوں میں یمن اور گرمیوں میں شام کی تجارتی سفروں نے تمام عربی قبایل سے ربط وضبط رکھنے، اور ان سے بخوبی واقف ہونے کا پورا موقع بہم پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ وہ ان کی متفرق بولیوں اور لہجوں کو سن کر ان میں غور اور اپنی زبان سے مقابلہ کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے ان میں الفاظ کے پرکھنے کا اچھا خاصا ملکہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی مدد سے انہوں نے اپنے لیے ایک پیاری اور نہایت شیریں زبان منتخب کر لی تھی، جو الفاظ اور لہجوں کی خامیوں سے پاک وصاف اور نہایت درجہ دلنشیں ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مواد کے لحاظ سے بھی سب سے زیادہ گراں قدر تھی۔ پھر شعراء وخطباء وغیرہ نے اس زبان کو اپنا کر اس کی ترویج و اشاعت اور ترقی کے راستے ہموار کر دیئے۔ اور بعد میں جب قرآن مجید بھی اسی زبان میں اترا تو اس کے کامل غلبہ اور بالادستی میں جو کمی باقی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔

عربی زبان کی امتیازی خصوصیات

کسی زبان کی اہمیت اور مقبولیت کا پیمانہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا دائرہ عمل زمین کے کتنے لمبے اور چوڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے یا اسے دنیا کی آبادی میں سے کتنی بڑی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ اس کی کسوٹی یہ بھی ہے کہ اس کا دامن کتنا وسیع ہے۔ اس میں کتنی گہرائی اور کتنی گیرائی ہے۔ اس کے نحوی قاعدوں اور گرامر کے اصولوں میں کتنا استحکام، پختگی اور اسی کے ساتھ کتنی وضاحت ہے۔ اس کے الفاظ کتنے شیریں، اس کا پیرایہ بیان کتنا دلکش اور اس کا طریق تلفظ اور صوتی اثرات کتنے موثر اور اس کے سیکھنے سکھانے کے امکانات اور طریقے کتنے سادے اور آسان ہیں۔ جس زبان میں دائرہ عمل کی وسعت اور کثرت استعمال کے ساتھ ساتھ نحوی قاعدے (گرامر) جتنے سائنٹفک، واضح اور مستحکم ہوں گے، جس کے الفاظ جتنے شیریں اور طرز ادا جتنا دلکش اور اسلوب بیان جتنا موثر اور جس کے معانی جتنے عمیق اور گہرے ہوں گے اسی اعتبار سے زبان کی اہمیت، مقبولیت اور کارفرمائی کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس نقطہ نظر سے اگر ہم عربی زبان کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس میں یہ تمام خوبیاں پوری طرح موجود ہیں۔ اور اس وجہ سے اسے دنیا کی مروجہ زبانوں میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ عربی زبان کی یہی بے مثال خوبیاں اور امتیازی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے سرداران قریش باہر سے آنے والوں عربوں کے کانوں میں قرآن کی بھنک بھی نہ پڑنے دینا چاہتے تھے کہ مبادا اس کی سحر طرازی کی وجہ سے اسلام لے آئیں۔ اس زبان کی یہی خوبیاں اور امتیازی خصوصیات ہیں، جنھوں نے ڈیڑھ ہزار سال سے نہ صرف اسے بول چال کی ایک کثیر الاستعمال زبان کی حیثیت سے قائم رکھا ہے بلکہ ایک ترقی پذیر، وسیع اور دلکش ادبی وفنی زبان کے قالب میں زندہ رکھا ہے اور اس کو بدلنے یا کمزور کرنے کی مختلف کوششوں کے باوجود اس کے اثر و رسوخ اور ہمہ گیری میں

کوئی کمی نہیں آئی۔ کیونکہ اس میں زندہ رہنے، ترقی کرنے، زمانے کے ساتھ چلنے اور پھلنے پھولنے کی وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک زبان کو زندہ جاوید بنا دیتی ہیں۔

سامی زبانوں کی شاخوں میں عربی زبان سب سے زیادہ سائنٹفک مربوط، منضبط اور اصول وقواعد کے اعتبار سے گٹھی اور منظم زبان ہے جس کی وجہ سے اس میں چند ایسی امتیازی خصوصیات پیدا ہوگئیں جو عام طور سے دوسری زبانوں میں کمیاب ہیں۔ ان خصوصیات میں سے چند درج ذیل ہیں۔

عربی زبان کی گرامر

عربی زبان کو لکھنے بولنے اور اس میں مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے جو نحوی اور صرفی قاعدے وضع کئے گئے ہیں ان کی بنیاد قرآن وحدیث کے لسانی شواہد خالص عربی قبائل میں مروج طریقوں اور مستند علماء وادبا کے طریق استعمال پر ہے۔ اور ان کے وضع کرنے میں علمائے لغت نے بڑی کاوش اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اور مدتوں کی تحقیق وجستجو، جہاں بینی اور غور وفکر کے بعد ان کو آخری شکل دی ہے۔ اس لیے ان میں ایسا استحکام، ایسی پختگی اور تیقن کی شان پیدا ہوگئی ہے کہ تغیر وتبدل، حذف اضافہ کی مطلقاً گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔ زبان کے قاعدوں کی امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیکھنے سکھانے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے کیونکہ جو قاعدہ ہے وہ اپنی جگہ اٹل ہے اور اگر کہیں استثناء کی شکل ہوتی ہے تو اس کا ذکر بھی اسی جگہ کردیا جاتا ہے اور اس قسم کی استثنائی صورتیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اس صفت کی وجہ سے ان قاعدوں کو یاد کرکے برتنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ یوں تو عربی زبان کے قواعد ایک مستقل فن بن گئے ہیں، لیکن جہاں تک زبان سیکھنے، اس میں دسترس حاصل کرنے اور مافی الضمیر کو ادا کرنے کی ضرورت ہے اس پورے دفتر کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اس میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی۔ یہ کام تو ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو "نحو" کو بحیثیت فن سیکھنا چاہتے ہوں اور ایسے لوگوں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ عربی زبان کے ادیب یا انشاپرداز بن جائیں۔ زبان کو لکھنے بولنے اور سمجھنے کے لیے ان سب قاعدوں کو نوک زبان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کام کے لیے تو چند گنے چنے اور متعین قاعدے یاد کرکے انہیں قلم وزبان پر رواں کرلینا ہی کافی ہے۔ اور تجربہ نے بتایا ہے کہ اس طریقہ پر عمل کرکے بعض علما اس ہندوستان میں بھی عربی ادب کے اچھے انشاپرداز اور خطیب بن گئے ہیں۔

عربی زبان کا اعراب

عربی زبان دنیا کی شاید ان چند زبانوں میں سے ایک ہے جن میں الفاظ کی آوازوں کو علامتوں

کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور یہ اس زبان کے وسیع، متمدن اور صاف ستھرے ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ عربی میں الفاظ کے صوتی شکلوں کو لکھ کر نہیں بلکہ چند اشاروں کے ذریعہ جنہیں اعراب کہا جاتا ہے، ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور اس کے لیے زیر، زبر اور پیش کی علامتیں ایجاد کی گئی ہیں۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے کے حروف کم ہو جاتے ہیں اور اس سے وقت کی بچت ہو جانے کے علاوہ ادبی ذوق اور ملکہ کی پوری طرح آبیاری ہوتی ہے کہ اگر گرامر کے قاعدے اور اصول ذہن نشین ہیں تو عبارت کو پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

نزاکت بیان

زبان میں نزاکت کا وجود خواہ وہ لفظی ہو یا معنوی یا ترکیبی، اس کی خوبصورتی اور دل آویزی میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ عربی زبان اس نقطۂ نظر سے دنیا کی بڑی سامعہ نواز اور دل آویز زبانوں میں سے ہے۔ اس کے حروف تہجی میں ثقیل حروف مثلاً ڑ، پھ، چھ، ڈھ، گھ، ڑھ وغیرہ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کے الفاظ بہت شیریں اور سامعہ نواز ہو گئے ہیں۔ غیر زبانوں کے جو الفاظ اس میں مستعار آئے ہیں انھیں عربی ذوق کا ایسا جامہ پہنا دیا گیا ہے کہ معرب ہو کر وہ بھی عربی زبان کے حسن میں ڈھل کے نکھر گئے ہیں۔ عربی الفاظ کی نزاکت بیانی کا یہ عالم ہے کہ معانی کے جزئیات بھی پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں اور کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہتا۔ جیسے دن کے ہر گھنٹہ اور پہر کے لیے ایک الگ مخصوص نام کا پایا جانا۔ یا چاندنی رات کے ہر مرحلہ کا ایک مخصوص نام۔ اسی طرح بالوں، آنکھوں اور ان کے امراض کے اور اونٹ و گھوڑے کے ذرا سے فرق کے ساتھ الگ نام اور تلوار کے اس کے صفات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل الگ اور امتیازی نام۔ اسی طرح اس زبان میں بعض ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کے معانی میں اتنی وسعت اور گہرائی ہے کہ اس کا ترجمہ کئی سطروں میں آتا ہے۔ یہی حال مصادر اور ان کے مشتقات کا ہے کہ ایک ہی مصدر کی جڑ سے مختلف معانی دینے والے مختلف قسم کے افعال مشتق ہوتے ہیں۔ چنانچہ افعال میں ایک حرف بڑھا دینے سے یا گھٹا دینے سے معانی بالکل بدل جاتے ہیں۔ جیسے "طعم" (کھایا) "اطعم" کھلایا۔ اسی طرح صلات کے بدلنے سے افعال کے معنی بالکل بدل جاتے ہیں جیسے "رغب الی" (کسی کی طرف مائل ہونا) اور "رغب عن" (کسی سے منہ موڑ لینا۔ نفرت کرنا)۔ عربی ادب میں صلات کے علم کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ بعض علما نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ زبان دانی صرف صلات کا علم ہے۔ انسان کے اوصاف اور اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لیے جو موزوں ترین طریقے اور جو الفاظ عربی زبان میں پائے جاتے

ہیں شاید ان کی مثال دوسری زبانوں میں نہ ملے۔ چنانچہ صرف محبت کے جذبات اور اس کے مختلف نازک ترین مراحل کے اظہار کے لیے عربی زبان میں کم سے کم دس الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نفرت و حسد اور بخل و سخاوت اور لالچ اور ان کے مختلف مراحل کے لیے بھی متعدد الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جو ان صفات واحساسات کے جزئیات تک کو واضح کر دیتے ہیں۔

اعجاز و ایجاز

عام طور سے دنیا کی ہر زبان میں کم الفاظ کے ذریعے بہت معانی پیدا کرنے کا طریقہ رائج ہے جسے اصطلاح میں "اعجاز" کہا جاتا ہے۔ عربی زبان اعجاز کے معاملہ میں منفرد زبان ہے۔ اس میں بکثرت ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جن کی تشریح کے لیے ایک دفتر چاہیئے۔ مثلاً لفظ "الحمد" کو لے لیجئے جس سے قرآن کی سورہ فاتحہ شروع ہوتی ہے جس کے معانی علما یہ بتاتے ہیں کہ انعامات واحسانات کے اعتراف کے جذبہ کے ساتھ انسان نے شکر ادا کرنے کے جتنے طریقے ایجاد کئے ہیں یا ایجاد کرے گا یا سوچا ہے یا سوچ سکتا ہے وہ سب اس خدائے منعم ومحسن کے لیے مخصوص ہیں۔ اس ایک لفظ میں ایسی وسعت اور شمولیت ہے کہ دفتر کے دفتر اس معنی کو ادا کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ اور الفاظ کی یہ صفت جامعیت عربی زبان میں بہت عام ہے۔ بات کو اشاروں کے ذریعے پر لطف بنانے کے لیے کنایہ، مجاز اور اسلوب کو دلنشیں اور موثر بنانے کے لیے معانی و بدیع کا استعمال عربی زبان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

مترادفات اور اضداد کا وجود

دنیا کی تقریباً تمام زبانوں میں ایک معنی کے ادا کرنے کے لیے کئی لفظ استعمال کرنے کا طریقہ رائج ہے۔ ان الفاظ کو "مترادفات" یا "مراوف الفاظ" کہا جاتا ہے۔ عربی زبان کا دامن مترادفات کے معاملہ میں بڑا وسیع ہے۔ چنانچہ علماء لغت نے صرف سال کے لیے ۲۴ نام اور روشنی کے لیے ۲۱ تاریکی کے لیے ۵۲، کنویں کے لیے ۸۸، پانی کے لیے ۱۷۰، شیر کے لیے ۳۵۰ اور اونٹنی کے لیے ۲۵۵ نام لکھے ہیں۔ اسی طرح انسانی حلیہ کے لیے اور اوصاف کے لیے بھی متعدد الفاظ آتے ہیں۔ چنانچہ عربی میں درازی قد کے لیے ۹۱ الفاظ، پستہ قدی کے لیے ۱۴۰ الفاظ آئے ہیں۔ اوصاف میں بخل سخاوت، شرافت، رذالت وغیرہ کے الفاظ کے لیے بھی مختلف الفاظ آئے ہیں۔

الفاظ کے معانی کے اظہار کے سلسلہ میں عربی زبان کو دوسری زبان کے مقابلہ میں یہ امتیازی خصوصیت حاصل ہے کہ اس میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو متضاد معنی دیتے ہیں جیسے "دون"

کا لفظ ہے کہ اس کے معنی کم، زیادہ، قریب، دور اور آگے پیچھے کے بھی آتے ہیں۔

ایک لفظ سے کئی معانی کا نکالنا

غالباً عربی زبان دنیا کی زبانوں میں اس حیثیت سے بالکل منفرد زبان ہے کہ ایک ہی لفظ بسا اوقات کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ علما لغت نے دو سو سے زائد الفاظ ایسے جمع کئے ہیں جو تین معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور ایک سو سے زائد الفاظ جو چار اور پانچ معنی دیتے ہیں۔ یہانتک کہ بعض الفاظ ۲۵ معنی دینے والے بھی ہیں۔ چنانچہ "فال" کا لفظ ۲۷ معنی کو ظاہر کرتا ہے اور "عین" کا لفظ ۳۵ معنی کو اور "عجوز" کا لفظ ۶۰ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

حکم و امثال کا وجود

کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی کو دلنشیں انداز میں ظاہر کرنے کا طریقہ کم و بیش ہر زبان میں پایا جاتا ہے جسے مثل یا کہاوت کہتے ہیں۔ مگر عربی زبان میں اس کی بہت کثرت اور اس میں بڑا تنوع ہے۔ عربوں کو اپنے مخصوص طرز زندگی کی وجہ سے عناصر فطرت سے براہ راست مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اس طرز زندگی کے تجربات سے عربوں نے براہ راست نتائج اخذ کئے۔ ان نتائج کو حکمت و فلسفہ، دانشمندی و جزرسی کی آمیزش سے الفاظ کے ایسے خوبصورت قالب میں ڈھالا گیا جو صوتی اثرات کے حسن و جمال کے علاوہ معنویت میں بھی ایک بحر بیکراں تھے اور یہی قالب "ضرب الامثال" یا کہاوتیں کہلائیں۔

ان اہم اور امتیازی خصوصیات کے علاوہ عربی زبان میں "سجع" یعنی مقفی اور مرصع نثر کا طریقہ بھی رائج تھا جسے عام طور سے اسلام سے پہلے پروہت (کہان) اور مقررین بھی استعمال کرتے تھے الفاظ کے صوتی اثرات کے ذریعہ منظر کشی کرنے میں عربی زبان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس زبان میں بعض ادبا ایسے گزرے ہیں جنہوں نے الفاظ کے ذریعے کسی چیز کا ایسا نقشہ کھینچ دیا کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ جیسے ابو زید الطائی نے حضرت عثمان کے سامنے شیر کا حلیہ اس طرح بیان کیا کہ اس کا مہیب تصور آنکھوں کے سامنے آگیا۔ (۱)

---

(۱) عبارتوں کے لیے جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ۔ ج ۱ صفحہ ۵۵۔ ملاحظہ کیجئے ضرب الامثال کے لئے دیکھئے: فجر الاسلام۔ احمد امین۔ الفن و مذاہبہ، ڈاکٹر شوقی ضیف۔ الامثال فی النثر العربی القدیم۔ عبد المجید عابدین۔ لفظ مثل دائرۃ المعارف الاسلامیۃ۔

غرضکہ عربی زبان ان گوناگوں امتیازی خصوصیات کی وجہ سے مختلف زمانوں کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی، مختلف ملکوں اور قوموں سے تعلق پیدا کرتی ہوئی، کبھی ان سے چھنتی ہوئی کبھی ان سے جڑتی ہوئی نہ صرف آج تک باقی ہے بلکہ روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اپنا دائرۂ اثر و عمل بڑھا رہی ہے۔

عربی ادب کی مختلف ادوار میں تقسیم

عربی ادب، تاریخ کے مختلف مراحل اور زمانے کے مختلف نشیب و فراز سے گزر کر موجودہ صورت کو پہنچا ہے۔ جنھوں نے اسے ترقی دینے، مستحکم کرنے اور دوام بخشنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پوری تاریخ کو ان مراحل اور ادوار میں تقسیم کر دیا جائے جن سے گزرتا ہوا اس نے اپنی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ تاکہ مطالعہ میں آسانی ہو اور نتائج کے اخذ کرنے میں اسباب و علل کے تانے بانے کے ڈھیلے پڑ جانے یا مخلوط ہو جانے کی وجہ سے غلطی نہ ہونے پائے۔

۱۔ زمانۂ جاہلیت :

اس زمانہ کو دو دوروں میں تقسیم کیا جاتا ہے :

پہلا دور : پانچویں صدی عیسوی سے پہلے کا زمانہ یعنی الجاہلۃ الاولیٰ (پہلا جاہلی زمانہ) (۱)

دوسرا دور : پانچویں صدی عیسوی کے بعد سے ۲۳-۶۲۲ء تک یعنی ظہور اسلام سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے شروع ہوتا ہے اور ہجرت نبوی پر یعنی ۲۳-۶۲۲ء پر ختم ہوتا ہے۔

۲۔ اسلامی زمانہ :

اس زمانے کے بھی دو دور ہیں۔

---

(۱) جاہلۃ الاولیٰ اس زمانے کو کہتے ہیں جس میں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے اور الجاہلۃ الاخریٰ دوسرا جاہلی زمانہ، اس زمانہ کو کہتے ہیں جس میں آنحضرت پیدا ہوئے طبقات ابن سعد ۸/ ۱۴۳-۱۴۵، اور تاریخ العرب قبل الاسلام جواد علی ۱/ ۳۱۔ جاہلی زمانہ کی تعریف اور بحث کے لیے دیکھیے : شعر المخضرمین واثر الاسلام فیہ ص۸۹ اور اس سے آگے مولفہ ڈاکٹر یحییٰ الجبوری

پہلا دور: صدر اسلام۔

یہ دور آنحضرتؐ کی ہجرت سے شروع ہو کر آخری خلیفہ حضرت علیؓ کے دور تک رہتا ہے یعنی سنہ ۱ھ سے سنہ ۴۰ھ مطابق ۲۳-۶۲۲ء سے ۶۲-۶۶۱ء تک۔

دوسرا دور: عہد بنی امیہ

یہ دور حضرت معاویہ کی خلافت سے شروع ہو کر عباسی سلطنت کے قیام یعنی سنہ ۴۱ھ سے سنہ ۱۳۲ھ مطابق سنہ ۶۶۱ء سے سنہ ۷۵۰ء تک رہتا ہے۔

۳۔ عباسی زمانہ:

اس زمانے کو بھی دو دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا دور (ترقی و عروج کا زمانہ) سنہ ۱۳۲ھ سے سنہ ۲۳۲ھ مطابق سنہ ۷۵۰ء سے سنہ ۸۴۶ء تک۔

دوسرا دور (طوائف الملوکی کا زمانہ) سنہ ۲۳۲ھ سے سنہ ۶۵۶ھ مطابق سنہ ۸۴۶ء سے سنہ ۱۲۵۸ء تک (زوال بغداد)

۴۔ عثمانی زمانہ یا عہد تنزل و انحطاط:

یہ زمانہ سنہ ۶۵۶ھ سے سنہ ۱۲۲۰ھ مطابق سنہ ۱۲۵۸ء سے سنہ ۱۷۹۸ء تک رہتا ہے۔

۵۔ عبوری زمانہ

یہ زمانہ نپولین کے مصر پر قبضہ سنہ ۱۷۹۸ء اور اس کے بعد محمد علی پاشا کے بر سر اقتدار آنے یعنی سنہ ۱۸۰۵ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۹۲۰ء پر ختم ہوتا ہے۔

۶۔ موجودہ زمانہ:

سنہ ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر اب تک چل رہا ہے۔

عربی ادب کی تعریف

عربی ادب کی تاریخ کے مختلف مراحل میں ادب کی مختلف تعریفیں کی جاتی رہی ہیں کبھی اس میں اتنی وسعت دی گئی کہ سارے علوم و فنون کو اس میں جمع کر دیا گیا اور کبھی اس کا دامن اتنا تنگ کر دیا گیا کہ صرف نظم و نثر کی ایک مخصوص قسم کے اندر ادب سمٹ کر رہ گیا۔ چنانچہ تاریخ ادب کے ابتدائی مرحلوں میں ادب سے مراد وہ علوم لیے جاتے تھے جن کے ذریعہ سے تہذیب نفس کا کام لیا جائے جس کے نتیجے میں آدمی کے اندر اچھے اخلاق، بلند کردار، بے داغ سیرت اور معاملہ و برتاؤ میں صفائی اور ستھرائی پیدا ہوتی ہے۔

مگر جب عربی معاشرہ میں وسعت اور عربی فکر و نظر میں جلا اور گہرائی پیدا ہونے لگی تو ادب کے مذکورہ دائرہ میں تعلیم کو بھی شامل کر لیا گیا۔ چنانچہ "مودِّب" یا "معلم" اس شخص کو کہا جانے لگا جو تعلیم کو بطور پیشہ اختیار کر کے اس سے اپنی روزی کماتا ہو اور ادب میں علوم دینیہ مثلاً قرآن و حدیث اور ان کی شرح و تفسیر کو چھوڑ کر وہ سارے علوم شامل کئے جانے لگے جو یہ "مؤدِّب" یا "معلم" اپنے شاگردوں کو سکھاتا تھا، خواہ وہ قصے کہانیاں ہوں، شعر و شاعری ہو یا تاریخی واقعات یا انساب وغیرہ۔ حضرت علی سے روایت ہے کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ "یا رسول اللہ نحن بنو اب واحد ونراک تکلم وفود العرب بما لا نفهم اکثرہ" یعنی اے رسول اللہ ہم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ عربوں کے وفدوں سے ایسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں جس کا بیشتر حصہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ تو آپ نے فرمایا کہ "ادبنی ربی فاحسن

تادبني و ربيت فی بنی سعد " مجھے میرے رب نے تعلیم دی ہے اور بہترین تعلیم دی ہے۔ پھر میں نے قبیلہ بنو سعد میں پرورش پائی ہے۔ (حلیمہ سعدیہ کا خاندان جو اس زمانے میں فصاحت و بلاغت میں قبائل عرب میں ممتاز تھا۔) یہاں پر آپ نے " ادبنی " کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے " ادب " کا لفظ پہلی دفعہ عربی زبان میں آپ ہی کی زبان مبارک سے نکلا ہے۔ اس سے پہلے ادب کا لفظ غالباً استعمال نہیں ہوا۔ جس کے معنی بہر حال ادب یا تہذیب سکھانے کے نہیں ہیں۔ کیونکہ خود قرآن کا فیصلہ ہے کہ " انك لعلی خلق عظیم " (یعنی آپ بڑے بلند اخلاق کے مالک ہیں) یہاں " ادبنی " سے مراد " علمنی " ہے یعنی مجھے تعلیم دی ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صدر اسلام میں تادیب بمعنی تعلیم کے لیے جاتے تھے۔ چنانچہ مؤدب بمعنی معلم بولا جاتا تھا اور عہد اموی میں بھی ممتاز اساتذہ کی جماعت کو " مؤدبین " کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ اس زمانہ کے دستور کے مطابق نظم و نثر اور اخبار و وقائع کی تعلیم روایت کے طریقے سے دیتے تھے۔ (۱)

ادب کا مذکورہ بالا مفہوم صدر اسلام اور پہلی صدی ہجری تک قائم رہا۔ بعد میں جب اسلامی معاشرہ میں اور وسعت پیدا ہوئی۔ مختلف قوموں کے اس میں داخل ہونے سے علم و فن میں ترقی کے ساتھ انہیں مختلف شاخوں میں متعین اصطلاحوں کے ساتھ تقسیم کیا جانے لگا تو زبان سے متعلق علوم بھی علاحدہ تقسیم کئے گئے۔ چنانچہ نحو و صرف، بلاغت، معانی، بیان، بدیع وغیرہ کے فنون پیدا ہوئے اور ان فنون کو بھی ادب میں شامل کر لیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب مجموعہ فنون ہو گیا۔ جس میں زبان سے متعلق علوم و فنون کے علاوہ تاریخ، سیرت، قصے کہانیاں، انساب غرضکہ اس زمانہ تک کے تمام مروجہ علوم و فنون کے سارے ذخیرے کو ادب کے دائرہ میں کر دیا گیا اب مشکل یہ تھی کہ اگر ادب علوم و فنون کے اس تمام مجموعے کا نام ہے تو اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت کیا رہی؟ اس موقع پر اس زمانے کا مایہ ناز ادیب اور ممتاز عالم جاحظ اٹھا اور اس نے اعلان کیا " الادب ھو الاخذ من کل فن بطرف " تمام مروجہ فنون میں سے تھوڑے کو بقدر ضرورت استعمال کرنے کو ادب کہتے ہیں (۲) جاحظ

۱۔ فی الادب الجاہلی : ڈاکٹر طہ حسین ۔ ۲۔ اسس النقد الادبی عند العرب ۔ للدکتور احمد ۔ احمد بدوی ۔ فی الادب الجاہلی کے مقدمہ میں ڈاکٹر طہ حسین نے ادب کے معنی و مفہوم پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ محمد حسین ہیکل نے اپنے مضمون " اللغۃ الادب " میں بھی ادب سے متعلق اچھی بحث کی ہے۔

۲۔ البیان والتبیین ۔ جلد اول

نے ان تمام مروجہ علوم و فنون میں سے تھوڑے سے اور بقدر ضرورت کی قید لگا کر ادب اور ان علوم و
فنون کے فرق کو واضح کر دیا ہے اور اس طرح سے کہ اگر آپ ان علوم و فنون پر تفصیل اور پوری
شرح و بسط کے ساتھ بحث کرنے لگیں گے تو ظاہر ہے کہ یہ بحث یا تحریر اس فن کا حصہ ہو جائے گی کیونکہ
اس میں مجرد حقائق کا بیان آ جائے گا اور مجرد حقائق بذات خود کبھی ادب کا حصہ اس لیے نہیں بن سکتے کہ ان
سے انسانی جذبات و احساسات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ عقل کو اپیل کرتے ہیں، انسانی مشاعر یا احساسات کو نہیں۔
لیکن اگر ان علوم و فنون کو ضرورت کے تقاضے کے مطابق تھوڑا سا اور ادب کے اصولوں کے مطابق استعمال کیا
جائے تو وہ ادب کا حصہ ہو جائیں گے۔ اسی لیے جاحظ نے ادیب کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ
جملہ فنون کے اصول اور مبادیات اسے ضرور آنے چاہئیں تاکہ وہ حسب ضرورت ان سے مدد
لے سکے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر ادب میں ان تمام علوم و فنون کو شامل کرنے کی۔ خواہ کسی مقدار
میں کیوں نہ ہو۔ ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی زبان میں جتنے مروجہ علوم و فنون ہوتے ہیں ان کا کوئی نہ کوئی
موضوع ہوتا ہے۔ مثلاً فن تاریخ ہے کہ اس کا موضوع اقوام و افراد کے واقعات کی تحقیق و جستجو اور
ان کے عروج و زوال کے اسباب و علل معلوم کر کے نتیجے اخذ کرتا ہے۔ اسی طرح ادب کا موضوع انسان
ہے۔ جب ادب کا موضوع انسان ٹھہرا تو ظاہر ہے کہ جو چیزیں اور جو علوم انسان سے متعلق ہوں گی
وہ سب اس کے دائرہ میں آ جائیں گی۔ انسان سماجی مخلوق ہے۔ یہ ایک جگہ رہتا ہے۔ لوگوں سے تعلقات
رکھتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ حکومت و جہانبانی کرتا ہے۔ اس کے جسم میں ایک دماغ اور دل ہے، جو
جذبات و احساسات اور مشاعر کے مرکز اور سرچشمہ ہیں چنانچہ ادب کا انسان کے ناتے سے ان سب
چیزوں اور ان سب علوم سے تعلق پیدا ہو گیا اور اس طرح بالواسطہ ادب میں تاریخ، اقتصادیات،
نظم و نثر، فنون جمیلہ، آرٹ اور فن سبھی علوم آ گئے اور انھیں مرقعوں سے زندگی تشکیل پاتی ہے اس
طرح دوسرے لفظوں میں ادب کا موضوع درحقیقت انسان کی زندگی ہے، اور ادیب زندگی کے
ان سب مظاہر یعنی فنون سے بحث کرتا ہے۔ مگر بحیثیت فن نہیں بلکہ ضمنی طور پر ایک خاص حد
تک۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ خاص حد کیا ہے؟۔ وہ خاص حد یہ ہے کہ ان علوم و فنون کو اس قدر اور
اس انداز سے استعمال کیا جائے جس سے پڑھنے والے یا سننے والے کے جذبات میں تغیر آ جائے یعنی جس
ذہنی یا جذباتی کیفیت میں اس نے اس چیز کو سننا یا پڑھنا شروع کیا ہے اس کو ختم کرنے کے بعد وہ
جذبات یا کیفیات بدل کر دوسری کیفیت اور دوسرے جذبات طاری ہو گئے ہوں۔ دوسرے لفظوں

میں یوں کہہ لیجئے کہ اگر قاری یا سامع کے جذبات میں ہیجان یا تغیر پیدا ہو گیا تو وہ چیز ادب پارہ ہو گئی ورنہ وہ فن رہ گئی۔ اور جذبات کا یہ تغیر اور ذہنی کیفیت کا یہ انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا جب تک بیان کردہ چیز میں ندرت بیان، رفعت تخیل اور دقت معانی اور جاذبیت و کشش کی ایسی کیفیت نہ ہو جو انسان کو مسحور کر دے اور معانی میں نزاکت، خیال میں رفعت، بیان میں ندرت و جاذبیت اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک اس کو حسین طریقے سے بیان کرنے کے لیے منتخب، حسین، چیدہ اور خوبصورت و موثر الفاظ اختیار نہ کیے جائیں۔ جب معانی کو ان چیدہ اور منتخب الفاظ کے ذریعہ حسین پیرایۂ بیان اور دلکش انداز کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا جائے گا تو اس میں جذب و کشش اور اثر اندازی کی وہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ جس کی طرف انسان کا دل خود بخود کھینچنے لگے گا۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائیگی تو اس میں اعجاز و فسوں کاری کی وہ حالت پیدا ہو جائے گی جو اس تحریر یا تقریر کو ادب کا شہ پارہ بنا دے گی۔ اسی لیے کسی تحریر کو یا تقریر کو۔ خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں۔ ادب پارہ ہونے کے لیے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اس میں ایسے معانی و مطالب کا ذکر ہو جو انسان کے جذبات و احساسات کو جگا دیں دوسرے یہ کہ ان معانی و مطالب کو خوبصورت، موزوں اور منتخب الفاظ کے ذریعہ بیان کیا جائے۔ یہیں سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر نحو کے قاعدوں کو نظم کر دیا جائے تو اس سے پڑھنے والے کے جذبات یا کیفیات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ بیان انسان کے عقل اور ذہنی کاوش کا نتیجہ ہوگا جو اس کے جذبات و احساسات کو نہیں بلکہ صرف عقل کو اپیل کرے گا۔ اسی طرح دوسرے فنون کا حال بھی ہے، کہ ان کو پڑھ کر یا سن کر انسانی جذبات اور احساسات میں ارتعاش نہیں پیدا ہوتا بلکہ صرف عقل کی آبیاری ہوتی ہے۔ اور اس لیے یہ ادب میں شامل نہیں۔ کیونکہ ان میں جذبات و احساسات میں ہیجان پیدا کرنے کی شرط مفقود ہے۔ پھر ان فنون کو بیان کرنے کے لیے آدمی خوبصورت الفاظ یا حسین پیرایۂ بیان بھی نہیں اختیار کرتا جس کی وجہ سے لذت اندوزی جو احساسات کو متاثر کرنے کے لیے ضروری ہے مفقود ہو جاتی ہے اور یہ فنون اپنی ادبی حیثیت کھو دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ ہمارے کلام کا وہی حصہ ادب پارہ ہے جس میں جذبات و احساسات کو جگا دینے کی صفت ہو اور یہ خوبصورت چیدہ الفاظ کے ذریعہ دلکش اور حسین پیرایۂ بیان میں ادا کیا گیا ہو اسی کو "الجید من المنظوم والمنثور" یعنی نظم و نثر کا اعلا مثالی نمونہ کہتے ہیں۔ نظم و نثر کا یہ اعلا نمونہ جسے ہم ادب العالیہ بھی کہہ سکتے ہیں نظم و نثر کی وہ قسم ہے جس کو سن کر یا پڑھ کر آدمی کے احساسات و جذبات میں ارتعاش و ہیجان پیدا ہو جائے اور وہ فرط لذت سے جھوم جائے یا

شدت کرب والم سے دل گیر ہو جائے۔ یعنی ادب عالیہ وہ تحریر یا تقریر ہے جس میں اثر اندازی کی وہ شان ہو جو انسان کو اس کے موجودہ عالم سے نکال کر اس عالم میں پہنچا دے جہاں ادیب اس کو لے جانا چاہتا ہے۔ جب ہم کوئی بہترین غزل یا قصیدہ یا بہترین تقریر یا موثر کہانی سنتے یا پڑھتے ہیں تو ہمارے دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور ہم اس کیفیت میں نہیں رہتے جس میں اس کے سننے یا پڑھنے سے پہلے تھے۔ اس کیفیت کو ہم لذت اندوزی، طرب انگیزی، تاثر پذیری یا جھومنے سے تعبیر کرتے ہیں یہ کیفیت ہم پر بالکل اسی طرح طاری ہوتی ہے جس طرح کسی اچھے گانے کو یا موسیقی کی کسی سحر طراز نغمہ کو سن کر یا کسی خوبصورت تصویر یا دل آویز مجسمہ کو دیکھ کر طاری ہوتی ہے۔ یہ کیفیت ہم پر اس لیے طاری ہوتی ہے کہ یہ فن پارے ہمارے احساسات، جذبات، خیالات اور اس سے بڑھ کر ہمارے ذوق جمال کی آبیاری کرتے ہیں۔ اور اس طرح ہمارے دل کی گہرائیوں میں پہنچ کر گوش و ہوش کے تاروں کو جھنجھنا دیتے ہیں اور ہم بے خود و مست ہو کر جھوم جھوم اٹھتے ہیں یا غم واندوہ کا موقعہ ہے تو آنکھوں سے مئے عشرت شبانہ بہانے لگتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ادیب جب کوئی منظر یا کوئی چیز دیکھتا ہے تو اس کے اثرات کو اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتار لیتا ہے پھر ان سے اپنے تجربات کی روشنی میں حسین الفاظ اور خوبصورت ترین پیرایۂ بیان سے ایک مرقع بنا دیتا ہے اور مرقع کی اثر انگیزی دوبالا کرنے کی غرض سے تخیل کی چاشنی، یا مبالغہ کی آمیزش سے کام لے کر اسے تحریر یا تقریر یا تصویر کے پیکر میں ڈھال دیتا ہے۔ جب ڈھلا ڈھلایا۔ ترشا ترشایا الفاظ کا یہ پیکر سامع یا قاری کے سامنے آتا ہے تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس میں گم ہو جاتا ہے اور اسی کو "الجید من المنظوم والمنثور" یعنی نظم و نثر میں سب سے پسندیدہ ترین حصہ کہا جاتا ہے جس کا دوسرا نام "ادب خاص" "فنی ادب" یا "ادب عالیہ" ہے جو درحقیقت جان ادب ہے۔ اثر انگیزی اور لذت افروزی کا یہی وہ بلند مقام ہے جہاں ادب صرف جادو ہی نہیں بن جاتا۔ ان من البیان سحراً۔ بلکہ خود زندگی بن جاتا ہے۔ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ادیب زندگی میں ڈوب کر، اس کے تلخ و شیریں مزہ کو چکھ کر، اس کی اتھاہ گہرائیوں سے حقیقت کے موتی نکالتا ہے۔ کیونکہ بقول ڈاکٹر سید عابد حسین "ادب شاعر یا ادیب کے ذہن میں سوئے ہوئے خیالات کا نام ہے جو زندگی کی چھیڑ سے جاگتے ہیں۔ زندگی کی آنچ میں تپتے ہیں اور زندگی کے سانچے میں ڈھل کر خود زندگی بن جاتے ہیں۔ ادب کی اسی قسم کی تاریخ کا مطالعہ ہمارا موضوع ہے۔ زندگی کی انہیں حقیقتوں کا اظہار ہم اپنے خیالات کے ذریعہ کرتے ہیں اور یہ خیالات یا تو نظم میں ظاہر کئے جاتے ہیں یا نثر میں۔ اس لیے ہمارے کلام کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ نظم ۲۔ نثر

اب ہم صفحات ذیل میں ادب کے ان دونوں حصوں کا تاریخی مطالعہ کریں گے۔ پہلے نثر کا پھر نظم کا۔

تیسرا باب

جاہلی زمانہ میں نثر

نثر کی تعریف

ہم اپنے گھروں، بازاروں، دفتروں اور ملنے جلنے کی دوسری جگہوں پر اپنی روزمرہ ضروریات کو پوری کرنے، اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے زبان سے جو کچھ بولتے ہیں اسے عام طور سے نثر میں بولتے ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقعوں پر انسان سوچ سمجھ کر خاص ترتیب سے اور اپنی باتوں میں موزونیت یا موسیقیت پیدا کر کے دوسروں سے مخاطب نہیں ہوتا اور نہ ہی اپنے خیالات و افکار پیش کرنے میں فنی تسلسل کا خیال

۱۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے مولیئر کی ایک کہانی کا ذکر کیا ہے جس میں JOURDAN اپنے فلسفی استاد سے کہتا ہے کہ "میں آپ سے ایک راز کی بات کہنا چاہتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ شوق سے کہو۔ اس پر شاگرد جھجکتے ہوئے کہتا ہے کہ میں ایک خوبصورت خاتون کو ایک خط لکھنا چاہتا ہوں اور اس میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔ گرو کہتا ہے کہ ہاں، ہاں شوق سے۔ مگر تم خط شعر میں چاہتے ہو؟ جوردان نے کہا جی نہیں۔ پھر نثر میں؟ گرو بولا۔ نہ نثر میں۔ جوردان نے جواب دیا۔ اس پر استاد گرو کہتا ہے کہ بھائی تمہیں نثر میں یا شعر میں سے کسی کو پسند کرنا ہی ہوگا کیونکہ کلام یا تو نثر میں ہوتا ہے یا نظم میں۔ یہ سن کر جوردان تعجب سے اپنے گرو سے پوچھتا ہے "تو گویا میں جب اپنے نوکر سے کہتا ہوں کہ ذرا میری ٹوپی یا میرا جوتا اٹھا دینا تو میں نثر میں بولتا ہوں؟" جب گرو اثبات میں سر ہلاتا ہے تو جوردان کہتا ہے کہ ارے کتنی تعجب کی بات ہے کہ میں پورے چالیس سال سے نثر بول رہا ہوں اور مجھے احساس تک نہیں کہ میں کیا بول رہا ہوں۔"

(من حدیث الشعر والنثر ص ۱۲ - مطبوعہ دارالمعارف - مصر)

رکھتا ہے اور نہ عقلی اور منطقی اصولوں کو پیش نظر رکھتا ہے اور نہ اس کی کوشش کرتا ہے کہ اپنے مطالب کو بیان کرنے کے لئے منتخب اور چیدہ الفاظ کو استعمال کرے۔ بلکہ ایسے موقعوں جس ترتیب اور موقع محل کے اعتبار سے جس انداز سے خیالات اس کے ذہن میں آتے جاتے ہیں انھیں بیان کرتا جاتا ہے۔ اس طرز تخاطب یا اس انداز سے اپنے دل کی بات کہنے کو اصطلاح میں "عام بول چال" کہتے ہیں۔ کیونکہ عام بول چال میں وہ فنی باریکیاں نہیں ہوتیں جو کسی کلام کو عام سطح سے اٹھاکر اس خاص سطح پر پہنچا دیں جہاں کلام ہماری روزمرہ کی بول چال سے ممتاز ہوکر اس بلند اور اعلیٰ سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں سامع کے گوش و ہوش جھنجھنا اٹھتے ہیں یا کسی ابدی حقیقت کا اس پر انکشاف ہوتا ہے یا ایسی پتہ کی بات معلوم ہوتی ہے جو عام طور سے روزمرہ کی گفتگو میں نہیں معلوم ہوتی اسی لئے نثر کی اس قسم کو ادب کا درجہ حاصل نہیں۔ کیونکہ جب کسی کلام میں فنی شرائط مفقود ہوں تو وہ کسی زبان ولغت کا وہ حصہ یا جز نہیں بن سکتا ہے جسے "ادب" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے "کلام جس میں نحوی وصرفی غلطی ہو یا نحوی وصرفی اعتبار سے تو کوئی خامی نہ ہو لیکن اس میں بلند افکار وخیالات نہ ہوں۔ یا اگر ایسے خیالات وافکار ہوں بھی مگر انھیں مربوط ومنظم اور سلیقہ سے اور خوبصورت ودلکش انداز میں پیش نہ کیا گیا ہو تو اسے ہم ادب کے زمرے میں شامل نہیں کرسکتے کیونکہ کسی کلام کے نثری ادب پارہ ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ ایسے مضامین، اغراض یا خیالات جن سے جذبات میں انقلاب، تغیر یا ہیجان پیدا ہوجائے۔ یعنی کلام کی اثر اندازی۔

۲۔ خوبصورت اور چیدہ الفاظ کے ذریعہ ان مضامین یا خیالات کو بیان کرنا۔

چونکہ ہماری روزمرہ کی گفتگو میں یہ شرائط مفقود ہوتی ہیں اس لئے وہ ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ لیکن اگر کسی نثر میں مذکورہ بالا شرائط پائی جائیں تو وہ ادب میں شمار ہوگا اور ایسے ادب کو ہم "نثر فنی" کہیں گے۔ کیونکہ نثر فنی اس مقصدی نثر کو کہتے ہیں جس میں وزن اور قافیہ نہ ہو لیکن وہ خاص قاعدوں، ضابطوں اور فن کے متفقہ اور معین کردہ اصولوں کے مطابق خوبصورت الفاظ اور دلکش انداز میں ادا کیا جائے تاکہ اثر اندازی کا وصف جو کسی کلام کے ادب ہونے کے لئے ضروری شرط ہے، پوری طرح ظاہر ہو۔[1]

اس قسم کے نثر کو یا تو زبان سے بولا جائے گا یا قلم کے ذریعے لکھ کر ادا کیا جائے گا۔ زبان سے

۱۔ "نثر فنی" سے متعلق ملاحظہ کیجئے: التوجیہ الادبی طٰہٰ حسین اور النقد الادبی، احمد امین وغیرہ۔

کہا جائے تو اس کی دو شکلیں ہوں گی۔

۱۔ بول چال یا گفتگو کے ذریعہ

۲۔ تقریر یا خطابت کے ذریعہ

اور اگر قلم سے لکھا جائے تو اس کو فن "انشاپردازی" کہیں گے۔ اس وقت ہم نثر فنی کی صرف ان قسموں کو بیان کرتے ہیں جن کا تعلق زبان سے ادا کرنے سے ہے۔ "فن انشاپردازی" سے متعلق گفتگو بعد میں آئے گی۔

نثر کی پہلی قسم یعنی بول چال کے اس حصہ کے بارے میں جس میں مذکورہ دونوں شرائط پائی جائیں۔ مورخین کا خیال ہے کہ عربوں نے اس کے بہت سے نمونے چھوڑے تھے۔ لیکن راویوں نے صرف انھیں کو محفوظ رکھا جو مختصر، دلکش اور موثر ہونے کے علاوہ اپنے اندر ابدی حقائق رکھتے تھے۔ جیسے حکیمانہ مقولے، کہاوتیں، بعض مختصر لیکن مثالی خطبے اور بعض قصے۔

زمانۂ جاہلی میں نثر کی قسمیں

ذیل میں ہم نثر کی مختلف قسموں کا ذکر کرتے ہیں جن کا رواج جاہلی زمانہ میں عام طور سے تھا۔ اور جن کے نمونے ہم تک کم و بیش پہنچ سکے ہیں۔

۱۔ محاورہ یا بول چال

انسان عام طور سے اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں صرف نثر سے کام لیتا ہے۔ اس کے ذریعہ اپنے کسی ساتھی یا عام مخاطب سے اپنا کوئی ذاتی معاملہ بیان کرتا ہے یا احباب یا متعدد اشخاص سے کسی مجلس میں کسی مسئلہ میں مشورہ لیتا ہے اور تبادلۂ خیال کرتا ہے اور مخاطب کی بات سن کر اس کا جواب دیتا ہے۔ یہ طرز بیان "گفتگو" یا "بول چال" کہلاتا ہے۔ اب گفتگو کرنے والے کی ذہنی سطح جتنی اونچی، ذہن جتنا صاف اور بیان جتنا مربوط اور دلکش ہوگا اسی کے بقدر سننے والے پر اس کا اثر ہوگا اور اس کی طرف سے اس کا ردعمل اچھا یا برا ظاہر ہوگا۔ عربوں کی بول چال کی زبان بھی لکھنے کی زبان سے کم دلکش اور موثر نہ تھی۔ وہ اسی فصاحت و بلاغت سے بولتے بھی تھے جس انداز سے لکھتے تھے۔ یہ فرق ضرور تھا کہ موقع محل کے لحاظ سے لکھی ہوئی عبارت میں فصاحت اور بلاغت کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ اور یہ طبعی بات بھی ہے کیونکہ لکھتے وقت دل و دماغ اس موضوع پر ہر طرح مرکوز ہوتے ہیں۔ بولنے میں یہ بات نہیں ہوتی۔ پھر بھی زمانۂ جاہلی کے عربوں کے محاورہ یا بول چال کے جو نمونے ہم تک پہنچے ہیں وہ بہت دلکش ہیں۔ ان کا اسلوب بیان اور الفاظ کی سج دھج بھی بہت موثر اور حقیقت افروز ہے۔ جیسے کہاوتیں یا حکیمانہ مقولے، نصیحتیں وغیرہ۔ بلکہ بعض مناظرے تو ایسے

ملتے ہیں کہ جن کی زبان پر گفتگو کا نہیں بلکہ کتابت کا شبہہ ہوتا ہے۔

۴۔ خطابت یا تقریر

تقریر نثر فنی کی بہترین قسموں میں شمار ہوتی ہے یہ نثر کی اس قسم کو کہتے ہیں جس میں کوئی ممتاز شخص کسی ملکی، قومی، سماجی مسئلہ یا زندگی کے کسی اہم پہلو پر کسی مجمع میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت اس غرض سے کرے کہ وہ مجمع کو متاثر کرکے اپنا ہم خیال بنالے۔

چونکہ تقریر یا خطابت کا اصل مقصد یہ ہے کہ مقرر یا خطیب کسی مسئلہ یا موضوع پر مجمع کو اپنا ہم خیال بنائے، اس لئے اسے ایسا طرز بیان اختیار کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کہ جس سے مجمع کے افراد اپنے خیالات و نظریات اور رایوں کو مقرر کے خیالات، نظریات اور رایوں کے مقابلے میں چھوڑ دیں اور مقرر کے ہم خیال اور ہم رائے ہو جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مقرر میں مندرجہ ذیل دو شرطیں پائی جائیں۔

۱۔ سننے والوں کو اپنے انداز خطابت اور استدلال کی قوت کے ذریعہ مطمئن کرکے اپنا ہم رائے بنانے کی صلاحیت کا پایا جانا۔

۲۔ سننے والوں کو اس بات پر آمادہ کر لینا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اسے مان لیں اور جو کرانا چاہتا ہے اسے کرنے لگیں۔ اس طرح سے مقرر کے اندر دو صفات کا ہونا ضروری ہے۔ ایک مطمئن کرنے کی صلاحیت اور دوسری سننے والوں کو اپنی طرف کھینچنے کی قدرت۔ مقرر میں جب یہ دونوں شرطیں اور صفات پیدا ہو جائیں تو یہ طرز کلام نثری ادب کا ایک فن بن جاتے گا جسے فن خطابت کہتے ہیں۔

فن خطابت کی تعریف

فن خطابت اس فن کو کہتے ہیں جس میں کوئی شخص انسانوں کے کسی مجمع میں ان کو مطمئن اور قائل کرنے یا اپنا ہم خیال بنانے کے لئے زبانی تقریر کرے۔ جب فن خطابت کی یہ غرض وغایت ہے تو خطیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ سننے والوں کی عقلی و ذہنی سطح و کیفیت سے پوری طرح واقف ہو۔ پھر جس موضوع پر بول رہا ہے اس میں اسے مہارت تامہ حاصل ہو۔ اور زبان پر ایسی قدرت ہو کہ جب بولنا شروع کرے تو اپنی قوتِ بیان کی جاذبیت، الفاظ کے زیر و بم و خوبصورتی، قوت استدلال کے اچھوتے پن اور ندرت سے سامعین کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جائے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہو کر وہ سب کچھ کہنے لگیں جسے مقرر ان سے کہلوانا چاہتا ہے یا وہ سب کچھ کرنے لگیں جسے مقرر ان سے کرانا چاہتا ہے۔

خطبات کی تقسیم　عربی ادب میں خطبات کی حسب ذیل تقسیمیں کی گئی ہیں۔

۱۔ سیاسی تقریریں

وہ تقریریں ہیں جو سیاسی جماعتوں کے لیڈر اور رہنما سیاسی پلیٹ فارموں پر ملک یا بیرونِ ملک کے سیاسی مسائل پر کرتے ہیں۔ یا وہ تقریریں جو ملک کے نمائندے پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلیوں میں کرتے ہیں۔

۲۔ دینی تقریریں

اس صنف میں وہ تقریریں یا مواعظ آتے ہیں جو علماء لوگوں کو خدا، دین اور مذہب کی باتیں سمجھانے کے لئے کرتے ہیں۔

۳۔ قانونی تقریریں

اس ضمن میں وہ تقریریں آتی ہیں جو عدالتوں میں وکلاء اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لئے اور جج حضرات کسی مقدمہ میں اپنا فیصلہ سناتے وقت کرتے ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں تقریر کے محرکات ، ان کے خاص اغراض اور تقریر کے ڈھنگ

زمانۂ جاہلیت کے نثری ادب کا اگر ہم مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ خطابت کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کوئی نثر اگر صحیح معنوں میں نثر فنی کی حیثیت رکھتی تھی تو وہ صرف خطابت ہے۔ اس زمانے میں فن خطابت کے بہت سے ماہرین پیدا ہوئے جنہوں نے اس صنف میں ایسی دسترس، ایسی قادر الکلامی اور طلاقت لسانی کا ثبوت دیا ہے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب قوم ان پڑھ تھی۔ لکھنے پڑھنے کا عام رواج نہ ہونے کی وجہ سے اپنی بات کہنے کا ذریعہ صرف ان کی اپنی زبان تھی۔ اور یہ زبان بھی کیسی، ایسی کہ جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ دنیا کی واحد زبان ہے کہ جس میں سامعہ نوازی و دلکشی وسعت و گہرائی اور حسن و رعنائی کا وہ جوہر ہے کسی اور زبان میں نہیں ملتا۔ یہی نہیں بلکہ ان کا خیال تھا کہ دل کے لطیف محسوسات کو صحیح طریقے سے بیان کرنے کا سلیقہ صرف ان کی اپنی ہی زبان میں ہے اور یہ تو عام بات ہے کہ عرب اپنے آپ کو دنیا کی وہ تنہا قوم سمجھتے ہیں جو "ضاد" بول سکتی ہے۔ اس لئے یہ قوم اپنے آپ کو "عربی" یعنی اپنے دل کی بات زبان کے ذریعہ کہنے والی" اور دوسری قوموں کو "عجمی" یعنی "گونگی" کہتی تھی۔ اپنی زبان کے متعلق یہ زعم اس بات کا بہت بڑا محرک تھا کہ اس کے ذریعہ اپنی گفتار و تعبیر کے جوہر دکھائے جائیں۔ پھر یہ قوم منتشر اور مختلف علاقوں میں قبیلوں کی صورت میں پھیلی رہتی تھی۔ جن میں آپس میں نفرت و عداوت، قتل و غارت گری کی فضا قائم رہتی تھی۔ ایسی صورت میں اگر ان کو ایک دوسرے سے کوئی بات کہنی ہوتی تو انھیں کسی مقررہ جگہ پر جمع کرنا دشوار تھا۔ پھر رسل و

رسائل اور پیغام رسانی کے طریقے اور ذریعے بھی ناپید نہیں تو اس حد تک دشوار ضرور تھے، کہ ان کے ذریعے دور تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس لئے اگر کوئی مسئلہ کھڑا ہو جاتا تو کسی قاصد کی ضرورت ہوتی جو زبان کا ماہر ہوتا۔ قوت بیان اور قوت استدلال میں کار آزمودہ ہوتا۔ اس کے علاوہ جھگڑا اور لڑائی کی معمولی سی بات پر لڑمرنے کی وجہ سے بھی ان عربوں کو ایسے شعلہ بیان، قادر الکلام اور چرب زبان اشخاص کی ضرورت رہتی تھی جو اپنے قبیلہ کے موقف کی وضاحت اس انداز سے کر سکیں کہ اس پر ظلم و زیادتی کا الزام نہ عائد ہو سکے۔ یا اگر کسی سے انتقام یا دیت (جان کے بدلے میں مال لینا) لینی ہے تو اس کے لئے سارے قبیلے کو اپنی جادو بیانی اور قادر الکلامی سے ابھار سکے۔ ان محرکات اور سماجی ضروریات کی بنا پر جاہلی زمانہ میں خطابت کو بڑی ترقی ہوئی۔ اسی لئے زمانۂ جاہلیت میں خطیب اور شاعر کی بڑی قدر و منزلت تھی کہ دونوں قبیلہ کی زبان تھے۔ اور اس کی عزت و آبرو کے پاسبان اور ان کی طرف سے زبان کے ذریعے لڑنے والے سورما اور بہادر۔

تقریر کرنے کا انداز

عام طور سے عرب کسی بلند جگہ یا اپنی سواری پر کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر تقریر کرتے تھے۔ تاکہ آواز دور تک جا سکے، اور لوگوں کو اپنی شخصیت اور تقریر کے دوران اعضا و جوارح کے اشاروں سے متاثر کر سکیں۔ ہاتھ میں چھڑی، نیزہ، سونٹا یا کمان رکھتے تھے، جس سے ٹیک لگاتے یا حسب ضرورت اشارے کرتے تھے مقرر کے لئے ضروری تھا کہ اس کی آواز گونجدار، انداز بیان دلکش اور موثر اور استدلال قوی اور طاقت گویائی بے پایاں اور شخصیت پرکشش، پُر رعب اور پروقار ہو۔

یوں تو عربوں میں بہت سے ممتاز اور نامور مقرر گزرے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کے حالات اور کمالات کا ہمیں علم نہیں۔ پھر بھی قدیم ترین خطباء میں کعب بن لوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آبا و اجداد میں سے تھے[1] اور حرثان بن محرث جو ذو الاصبع العدوانی کے لقب سے مشہور ہیں، بہت نامور گزرے ہیں۔

۱۔ احمد ذکی صفوت نے "جمہرۃ خطب العرب" حصہ اول میں صفحہ ۳۳ پر ان کا ایک خطبہ اور چند اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ خطبہ کا انداز اور موضوع تقریباً وہی ہے جو قس بن ساعدۃ الایادی کا مگر خطبے کے بعض الفاظ سے یہ شبہہ ہوتا ہے کہ یہ بعد کی ایجاد ہے کیونکہ آخر میں کہتے ہیں کہ "زینوا حرمکم وعظموہ وتمسکوا بہ ولا تفارقوہ، فسیاتی لہ نبا عظیم وسیخرج منہ نبی کریم" نبی کریم کے پیدا ہونے کی بشارت دینا، وہ بھی اتنے پہلے

بعد کے مقررین میں سے جن کو اپنی فصاحت و بلاغت میں شہرت دوام حاصل ہوئی قیس بن خارجہ بن سنان ہے جو داحس اور غبرا کی مشہور جنگ کا مشہور مقرر گزرا ہے۔ خویلد بن عمرو الغطفانی، جس نے حرب فجار کے موقع پر امتیاز حاصل کیا تھا۔ قس بن ساعدہ الایادی بازار عکاظ کا مشہور مقرر، اکثم بن صیفی اور عمرو بن معدی کرب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ہم مذکورہ بالا خطباء میں سے صرف مندرجہ ذیل تین کے حالات زندگی، اسلوب بیان، طرز خطابت اور اس فن میں ان کے رتبہ کا ذکر کریں گے۔

۱۔ قس بن ساعدہ الایادی۔

۲۔ عمرو بن معدی کرب۔

۳۔ اکثم بن صیفی۔

(باقی حاشیہ ص ۸۸)

اور پھر ایسے آدمی کی زبانی جس کی دینداری اور اللہ سے تعلق کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو، سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کو بنی ہاشم میں ہی مقید ہونے کی دلیل میں اسے گڑھا گیا ہے۔ اس شبہہ میں تقویت ان کے اشعار سے بھی ہوتی ہے اور خاص طور سے اس شعر سے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام "محمد" تک لے لیا گیا ہے۔ حالانکہ اتنے پہلے انھیں رسول اللہ کا نام کیسے معلوم ہوگیا؟ وہ شعر درج ذیل ہے:

علی غفلة یأتی النبی محمد   فیخبر أخبارًا صدوق خبیرها

زمانۂ جاہلیت کے نثری نمونے اور ان کے فنکار

۱۔ خطابت یا تقریر

۱۔ قس بن سَاعِدَہ الایادی

قس بن ساعدہ قبیلہ ایاد کا نامور خطیب اور نجران کا پادری تھا۔ اسے صرف دورِ جاہلی ہی کا مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق مقرر نہیں سمجھا جاتا بلکہ واقدی کے قول کے مطابق وہ پوری عرب قوم میں سب سے ممتاز، قادرالکلام، شعلہ بیان اور سحر طراز مقرر گزرا ہے۔ فصاحت و بلاغت اور زبان پر پوری قدرت رکھنے کی وجہ سے اس کی مثال دی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس دورِ جہالت میں یہ پہلا شخص تھا جس نے نعرۂ توحید بلند کیا اور مرنے کے بعد پھر سے اٹھائے جانے اور حساب و کتاب دینے کے عقیدہ کا پرچار کیا۔ عربوں کو بت پرستی چھوڑ کر صرف ایک خالق کے سامنے سر اطاعت خم کرنے کی دعوت دی۔ اور عام جلسوں، میلوں ٹھیلوں اور جشنوں کے موقعوں پر لوگوں کو عبرت و موعظت کے قصے اور حکمت و فلسفہ کی باتیں سنا کر ایمان و عمل اور حسنِ اخلاق کی طرف مائل کرتا تھا۔ اور جزا و سزا کا فلسفہ سمجھا کر انہیں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا تھا۔ لوگ اس کی نیک دلی، دانشمندی، معاملہ فہمی اور بے لوثی سے اس قدر متاثر تھے کہ اپنے پیچیدہ معاملات میں اس سے مشورہ لیتے۔ اپنے مقدمات اس کے سامنے فیصلہ کرنے کے لئے پیش کرتے اور اس کا فیصلہ سر آنکھوں سے تسلیم کرتے۔ قس بن ساعدہ ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے مقدمات میں یہ اصول نکالا کہ "البینۃ علی من ادعی والیمین علی من انکر" یعنی مدعی کے لئے جرم کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے اور جو جرم سے انکار کرے اس پر قسم لازم ہے۔ آج کل جمعہ کے خطبوں میں خاص طور سے اور عربی تقریروں میں عام طور سے حمد و ثناء کے بعد "اما بعد" کہنے کا جو رواج ہے دراصل اسے سب سے

پہلے قس ہی نے کہا تھا۔ یہ جملہ اس قدر پسند کیا گیا کہ اس وقت سے لے کر آج تک ہر تقریر کا جزو بن گیا ہے اور مستقل استعمال ہو رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قس کو عکاظ کے میلے میں تقریر کرتے ہوئے سنا تو آپ اس کی خدا لگتی اور ایمان و یقین سے بھرپور باتوں کو سن کر بے حد متاثر ہوئے اور آپ نے اس کی بڑی تعریف فرمائی۔

جاحظ نے لکھا ہے کہ قبیلہ ایاد اور تمیم کے لوگوں کو تقریر میں ایسی امتیازی شان حاصل تھی کہ جو کسی اور کو نہیں۔ اور خاص طور سے قس کو اس فن میں جو مہارت اور دسترس حاصل تھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کے کمالِ فن کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف عکاظ کے میلے میں قس کے مٹیالے رنگ کے اونٹ پر بیٹھ کر تقریر کرنے کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ آپ نے قریش اور عربوں سے اپنی زبان مبارک سے اس کی تقریر کی بھی روایت کی ہے۔ آپ اس کے بولنے کے دلکش انداز سے کبھی اتنے متاثر ہوتے تھے کہ دل کھول کر اس کی داد دیتے تھے، اور جو کچھ کہتا تھا اس کی تصدیق بھی فرماتے تھے کہ قس کو زبان پر یہ قدرت اور اثر اس لئے حاصل ہوا کہ وہ توحید کی دعوت دیتا تھا، اور قیامت اور جزا و سزا کے معانی بیان کرتا تھا، اور خلوص و نیک نیتی پر لوگوں کو ابھارتا تھا۔[1] روایتوں میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا کہ خدا قس پر رحم فرمائے۔ مجھے امید ہے کہ وہ قیامت کے روز ایک تنہا امت کی شکل میں اٹھائے جائیں گے۔ (رحم اللہ قسا انی لارجو یوم القیامۃ ان یبعث امۃ واحدۃ)

قس بن ساعدہ قیصر روم کے پاس اکثر آیا جایا کرتا تھا۔ قیصر روم اس کے علم و فضل، حکمت و فلسفہ سے بہت متاثر تھا۔ ایک دن قیصر نے ان سے کہا کہ "سب سے بہترین عقلمندی کیا ہے؟" قس نے کہا: "آدمی کا اپنے علم کی حد پر ٹھہر جانا۔" اس نے پھر پوچھا مروت (یعنی انسانی شرافت) کا بہترین نمونہ کیا ہے؟ قس نے کہا: "آدمی کا اپنا بھرم قائم رکھنا۔" ——— پھر قیصر نے پوچھا: "بہترین مال کیا ہے؟" قس نے جواب دیا: "وہ دولت جس سے حقوق ادا کئے جائیں۔"

آخر عمر میں قس نے بالکل ترک دنیا کر دی تھی۔ عبادت و ریاضت میں روکھی پھیکی کھا کر زندگی گزارتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے بڑی عمر پائی تھی۔ ۶۰۰ء میں بعثت نبوت سے پہلے ہی انتقال کر گیا۔

امتیازی خصوصیات

قس بن ساعدہ الایادی نے جہاں پند و نصیحت کرنے میں اچھوتا اور بہت ہی دلکش اور موثر انداز ایجاد کیا ہے وہاں اس نے فنِ خطابت میں بعض ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جو آج تک چل رہی ہیں ان میں

۱۔ البیان والتبیین ۱ر ۵۲، مطبوعہ لجنۃ التالیف والترجمہ، مصر ۱۹۴۹ء۔

سے ایک تو یہ ہے، اس نے سب سے پہلے "امابعد" کہنے کی رسم ایجاد کی تھی جو آج تک جمعہ کے خطبوں میں خاص طور سے اور دوسری تقریروں میں عام طور سے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ پہلا شخص ہے جس نے تقریر کے دوران چھڑی یا تلوار پر سہارا لینے کی ریت نکالی۔ یہ ریت اس قدر مقبول ہوئی کہ آج تک عرب ملکوں میں خاص طور سے مسجدوں میں خطبہ دیتے وقت امام صاحبان عصا کا سہارا لے کر ممبر پر کھڑے ہوتے ہیں۔

جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے قس کا انداز بیان بہت شستہ اور شگفتہ تھا۔ الفاظ بڑے شیریں اور منتخب ہوتے تھے۔ ترکیب بڑی دلآویز اور موثر ہوتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے لیکن انتہائی گٹھے اور نپے تلے اور بسا اوقات خوبصورت مسجع جملے کہتا تھا۔ اور بیچ بیچ میں ضرب الامثال اور کہاوتوں کا بھی استعمال بکثرت کرتا تھا۔ گزشتہ زمانے کے ظالم، جابر اور سرکش لوگوں کی کہانیاں اور ان کے انجام کی داستان سنا کر لوگوں کو متاثر کرتا اور عبرت دلاتا تھا۔ وہ لفاظی اور مبالغہ آمیز باتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتا تھا۔ اس لئے اس کی تقریروں میں جادو کا سا اثر ہوتا، اور حاضرین سر دھنے لگتے۔ کہتے ہیں کہ اس نے موزوں طبیعت بھی پائی تھی اور اچھے خاصے شعر بھی کہہ لیتا تھا جس میں بڑا اثر، درد اور سوز ہے۔ اس کی طرف ایک مرثیہ بھی منسوب کیا جاتا ہے، جسے اس نے اپنے دو بھائیوں کے مرنے کے بعد ان کی قبر پر جو دیر سمعان میں تھی کھڑے ہو کر کہا تھا۔ یہ مرثیہ واقعی بہت پر اثر اور دلخراش ہے، اور بقول جاحظ جس کی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے[1] جس میں اس نے کہا ہے کہ "یا ایہا الناس اسمعوا وعوا من عاش مات ومن مات فات" الخ اس کا ترجمہ یہ ہے:

اے لوگو! گوش و ہوش سے سنو! اور یاد رکھو کہ جو زندہ ہے اسے ایک دن مرنا ہے اور جو مر گیا وہ ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ جو چیز آنے والی ہے وہ آکر رہے گی۔ ایک گھٹا ٹوپ اندھیری رات ہے اور ایک پر سکون انمٹ دن، ایک مختلف برجوں والا آسمان ہے اور اس میں چمکتے دمکتے ستارے (ایک طرف) ٹھاٹھیں مارتے سمندر ہیں اور دوسری طرف ٹھوس اور مضبوطی سے جمے پہاڑ اور (حد نگاہ تک) پھیلی ہوئی زمین اور بہتے ہوتے دریا، آسمان میں کچھ چیزیں ہیں (یعنی آسمان اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ کوئی بڑی ہستی خالق ہے) اور زمین میں عبرتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جاتے ہیں تو واپس نہیں آتے، کیا ان کو وہ جگہ ایسی بھا گئی ہے کہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ یا ان کو وہاں چھوڑ دیا گیا تو ہمیشہ کے لئے وہیں سو گئے۔ قس خدا کی ایسی قسم کھا کر کہتا ہے جس میں ذرہ بھر بھی گناہ کا شائبہ نہیں کہ اللہ کا ایک خاص دین ہے جس کو وہ تمہارے لئے سب

---

[1] البیان والتبیین، ۲/۳۰۸، لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر، قاہرہ۔

سے زیادہ پسند کرتا ہے اور اس دین سے بہت بہتر ہے جسے تم مانتے ہو۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ قس نے اپنے قبیلے کے سامنے ایک مختصر لیکن بڑی موثر اور عبرت و موعظت سے بھری تقریر کی جس میں گزشتہ زمانہ کے مشہور اور طاقتور قوموں اور بادشاہوں کے عبرتناک انجام کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ زمانہ نے سب کو پیس کر رکھ دیا جن کا اب نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اس کے بعد اپنے کہے یہ اشعار پڑھے،

فی الذاھبین أولیـن من القرون لنا بصائر

لما رأیت موارداً للموت لیس لھا مصادر

ورأیت قومی نحوھا تمضی الأکابر والأصاغر

لا یرجع الماضی إلیھا ولا من الباقین غابر

أیقنت أنی لا محالۃ حیث صار القوم صائر

ترجمہ۔ گذشتہ بھولی بسری صدیوں (زمانوں) میں ہمارے لئے آنکھیں کھولنے والی باتیں پوشیدہ ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ موت کی طرف جانے کا راستہ تو ہے لیکن واپس آنے کا کوئی راستہ نہیں اور یہ کہ میری قوم کا ہر چھوٹا بڑا اس کی طرف ضرور جاتا ہے۔

اور یہ کہ جو یہاں سے چلا جاتا ہے (مرجاتا ہے) وہ لوٹ کر واپس میرے پاس نہیں آتا، اور جو رہ گئے ہیں ان کو دوام حاصل نہیں تو؛

میں نے یقین کر لیا کہ میرا بھی ضرور وہی انجام ہونا ہے جو ان سب کا ہوا (یعنی مرکر یہاں سے چلا جانا ہے)

قس کو اپنے دو بھائیوں کے مرنے کا بہت غم تھا۔ اگرچہ دنیا کی بے ثباتی اور موت پر اس کا پورا یقین تھا لیکن جب دیر سمعان میں اپنے بھائیوں کی قبر پر پہنچا تو اس کے اندر کا انسان غم پنہاں کو چھپا نہ سکا، اور بڑے درد و کرب کے ساتھ پکار اٹھا۔

خلیلی ھبا طالما قد رقدتما أجدکما لا تقضیان کراکما

ألم تعلما أنی بسمعان مفرد وما لی فیھا من حبیب سواکما

أقیم علی قبریکما لست بارحا طوال اللیالی أو یجیب صداکما [1]

۱۔ الصدی۔ شدید پیاس: بڑے سر کا ایک الو جو عام طور سے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ عربوں کا خیال تھا کہ مقتول (باقی ۹۴ پر)

جری الموت مجری اللحم والعظم منکما   کأن الذی یسقی العقار سقاکما

فلو جعلت نفس لنفس وقایۃ   لجدت بنفسی ان تکون فداکما

ترجمہ: اے میرے دونوں پیارو، اب اٹھو بھی جاؤ۔ تمھیں سوئے ہوئے بڑی دیر ہو گئی۔ مجھے تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ تم کبھی بھی اپنی نیند پوری نہیں کر پاؤ گے۔

کیا تمھیں یہ نہیں معلوم کہ سمعان میں میں اکیلا رہ گیا ہوں، اور تم دونوں کے سوا میرا وہاں اب کوئی ساتھی نہیں۔

اب میں تم دونوں کی قبروں پر ہی رو پڑوں گا، اور پوری راتیں یہیں بتا دوں گا۔ یا تم دونوں کی (صدا) روح میری باتوں کا جواب دے۔

موت تمھاری رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گئی ہے کہ جیسے (عقار، ایک تیز قسم کی شراب) پلانے والے نے تمھیں بھی یہ شراب پلا دی ہو۔

اگر کوئی جان کسی جان کے بچانے کے لئے دی جا سکتی تو بلا تکلف میں اپنی جان کو تم پر فدا کر دیتا۔"

اصحاب سیر کا کہنا ہے کہ قس بن ساعدہ نے نثر میں حکمت و فلسفہ اور عقلمندی کی بعض باتیں ایسی کہی ہیں جو عربی زبان میں ضرب المثل بن گئی ہیں۔ مثلاً "جو شخص تمھیں کسی چیز سے عار دلائے تو اس میں بھی وہ چیز ضرور ہو گی۔" "اگر کوئی شخص تم پر ظلم کرے گا تو اس کو بھی کوئی ظلم کرنے والا مل جائے گا۔" "اگر تم کسی کو کسی بات سے روکو تو سب سے پہلے اس کی ابتدا اپنے آپ سے کرو۔" "کسی مشغول آدمی سے مشورہ مت لو چاہے وہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو۔" "اور نہ کسی بھوکے سے، چاہے کتنا ہی سمجھدار کیوں نہ ہو، اور نہ کسی ڈرے ہوئے آدمی سے چاہے وہ کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو۔"

۲۔ اکثم بن صیفی

اکثم بن صیفی عہد جاہلیت میں زور بیان، قوت خطابت اور عقل و حکمت کے علاوہ نسب دانی

کا باقی ۹۳ کا

کے سر سے یہ الّو پیدا ہوتا ہے اور جب تک مقتول کے خون کے بدلے میں قاتل کو قتل نہ کر دیا جائے اس وقت تک یہ چلا چلا کر کہتا رہتا ہے کہ "مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ"۔ چنانچہ جاہلی شاعری میں صدیٰ کا ذکر عام طور سے خون کا بدلہ خون سے لینے پر ابھارنے کے لئے اکثر آتا ہے۔

ضرب الامثال اور اصابت رائے اور قوت استدلال میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ رواۃ نے لکھا ہے کہ اس کے جیسا قادر الکلام مقرر اور صحیح فیصلہ کرنے والا حکم اور اپنی قوم میں معزز و محترم شخص مشکل سے ملتا ہے۔ اس کی دور بینی، معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ کی چہار دانگ عالم میں شہرت تھی۔ اس کے حکیمانہ مقولے اور پند و نصیحت کے جملے سارے عربوں کی زبان پر تھے۔

اس کی انھیں صفات کی وجہ سے النعمان بن المنذر نے کسری نوشیرواں کے پاس عربوں کی فضیلت اور برتری ثابت کرنے کے لئے جن کو بھیجا تھا ان کا سردار اسی کو منتخب کیا تھا۔ حالانکہ اس جماعت میں اس زمانے کے جلیل القدر اور ممتاز ترین مقررین، جیسے عمرو بن معدی کرب، حاجب بن زرارۃ التمیمی وغیرہ شامل تھے۔ چنانچہ اسی نے ہی سب سے پہلے کسریٰ کے دربار میں تقریر کی۔ تقریر کے بعد کسریٰ نے اکثم سے چند سوالات کئے۔ کسریٰ اس کے جوابات سے اس قدر خوش اور متاثر ہوا کہ اس نے کہا کہ اگر عربوں کے پاس تمہارے علاوہ کوئی اور نہ بھی ہوتا تو تم ہی کافی تھے۔ اکثم نے بڑی لمبی عمر پائی تھی۔ آنحضرتؐ جب مبعوث ہوئے تو اس نے اپنی قوم کو جمع کیا اور آپ پر ایمان لانے کی تلقین کی، لیکن خود اس کے اسلام لانے کے بارے میں مختلف روایتیں بیان کی جاتی ہیں[2]۔

۱- پورا سلسلۂ نسب یہ ہے، اکثم بن صیفی رباح بن حارث بن مخاشن بن معاویہ بن شریف بن جروہ بن اسید بن عمرو بن تمیم التمیمی۔
اکثم صیفی کے لئے ملاحظہ کیجئے۔ البیان والتبیین، جاحظ ۳/۳۵۰
الاصابۃ فی احوال الصحابہ۔ ص ۲۴۲۔ المعمرین للسجستانی۔ ص ۱۲۔

۲- ایک روایت یہ ہے کہ جب انھیں آنحضرتؐ کے مبعوث ہونے کی خبر ملی تو انھوں نے خود آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا لیکن ان کی قوم نے ان کو روک دیا تو انھوں نے اپنی قوم میں سے دو آدمیوں کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ وہ دونوں آپ کی باتیں سن کر آئے اور انھیں اکثم سے بیان کیا، تو انھیں سن کر ان کے دل کو بڑی ٹھنڈک پہنچی۔ چنانچہ ان کا اونٹ لایا گیا اور وہ حضورؐ سے ملنے کے ارادے سے نکل پڑے مگر راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل آیت انھیں کے بارے میں اتری تھی۔ "ومن یخرج من بیتہ مہاجراً الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ"۔ یعنی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول کی خاطر نکل کھڑا ہوا، پھر اسے موت آجائے تو اللہ کے ذمہ اس کا اجر یقینی ہو گیا ——————— اور یہیں سے بعض راویوں کا خیال ہے کہ وہ مسلمان مرا۔

خصوصیات

اکثم بن صیفی اپنی تقریروں میں مجاز و کنایہ کم استعمال کرتا تھا۔ اس کو مختصر اور چھوٹے جملے کہنے میں کمال حاصل تھا۔ اس کی تقریروں میں الفاظ بہت خوبصورت اور سبک، معانی بہت گہرے اور دور رس ہوتے تھے۔ اکثر ضرب الامثال استعمال کرتا۔ سننے والوں کو مطمئن کرنے کے لئے زوردار دلیل لاتا اور ان کو متاثر کرنے کے لئے اپنا پورا زورِ بیان، اپنی فصاحت و بلاغت اور اپنی شخصیت کا جلال و جمال صَرف کر دیتا۔ لیکن مبالغہ یا دور از کار باتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتا تھا۔ انھیں خصوصیات کی وجہ سے وہ جاہلی دور کے مقررین کے صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے کسریٰ کے دربار میں النعمان کے ایما پر جو تقریر کی تھی وہ اس کے اسلوب بیان اور اندازِ خطابت کا مثالی نمونہ ہے جس میں اس نے کہا تھا :

ان افضل الاشیاء اعالیھا...... ......[1]

ترجمہ۔ (دنیا کی) چیزوں میں سب سے بہتر اور افضل وہ ہیں جو سب سے اعلیٰ ہوں، اور لوگوں میں سب سے اونچے اور ارفع ان کے بادشاہ ہیں۔ اور بادشاہوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جن کے ذریعہ نفع عام ہو اور زمانوں میں سب سے بہتر خوشحالی اور ہریالی کا زمانہ ہے۔ اور مقررین میں سب سے بہتر حق گو ہیں۔ سچائی نجات کا ذریعہ ہے اور جھوٹ تباہی کا گڈھا ہے۔ برائی کی جڑ اس میں پڑا رہنا ہے۔ عقلمندی اور دانشمندی کی راہ بڑی کٹھن راہ ہے۔ اور عاجزی و انکساری کی راہ بڑی آسان راہ ہے۔ خود رائی کا روگ خواہشات نفسانی ہیں اور کچھ نہ کر سکنا (بے عملی) غریبی کی کنجی ہے۔ سب سے اچھی بات صبر کرنا ہے اور اپنے سے (حسنِ ظن) میں ہلاکت ہے، اور سوءِ ظن میں حفاظت ہے۔ رعایا کی خرابی کی اصلاح کرنا بادشاہ کی اصلاح کرنے سے بہتر ہے۔ جس کے خاص دوست اور ہمراز بُرے ہوں تو اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جسے پانی سے پھندا لگ گیا ہو۔ بدترین ملک وہ ہے جہاں کوئی بادشاہ نہ ہو اور بدترین بادشاہ وہ ہے جس سے بے گناہ لوگ ڈریں۔ آدمی خود سپر ڈال دے ایسے تدبیر نہیں ہارتی۔ بہترین فوجوں میں فتح کی سب سے زیادہ مستحق وہ فوج ہوتی ہے جس

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے :

(۱) جمہرۃ رسائل العرب فی العصور العربیۃ الزاہرۃ۔ جلد اوّل۔ احمد زکی ۱۹۳۷ء۔

(۲) جمہرۃ خطب العرب فی العصور العربیۃ الزاہرۃ۔ ۱/۲۱ - (۱۹۳۳ء)

(۳) العقد الفرید، لابن عبد ربہ، الجزء الاوّل۔

کے اخلاق وعادات پاکیزہ ہوں۔ تمہارے لئے زادراہ اتنا ہی کافی ہے جس سے منزل مقصد تک پہنچ سکو۔ کسی بُرائی کا صرف سن لینا ہی کافی ہے۔ خاموشی عقلمندی ہے لیکن اسے اپنانے والے بہت کم ہیں۔ بلاغت درحقیقت اختصار کا نام ہے۔ جو سخت کوشی کرتا ہے اس سے لوگوں کو نفرت ہو جاتی ہے اور جو سہل انگاری سے کام لیتا ہے لوگوں کو اس سے الفت و محبت ہو جاتی ہے۔؎

اکثم صیفی سے بعض وصیتیں اور رسائل بھی منسوب کئے جاتے ہیں جن کے ذکر کرنے کا یہاں موقع نہیں۔[1]

۳۔ عمرو بن معدی کرب الزبیدی

عمرو بن معدی کرب کی کنیت ابو ثور تھی۔ قبیلہ زبید کا فرد تھا۔ سلسلۂ نسب یمنی قبیلہ قحطان سے ملتا ہے۔ بہت اچھا گھوڑ سوار تھا، اس لئے اسے فارس الیمن یعنی یمن کا شہسوار کہتے تھے۔ ۹ھ ہجری میں جب آنحضرت غزوۂ تبوک سے واپس آرہے تھے تو عمرو اپنی قوم کے ساتھ آپ سے ملا اور اسلام لے آیا۔ لیکن چونکہ زندگی گزری تھی کسی اور ڈھب سے جس میں دن معرکوں میں اور راتیں کاشانوں میں گزرتی تھیں۔ اس لئے قید و بند کو قبول نہ کر سکا اور مرتد ہو گیا۔ لیکن پھر حق نے اس کے دل میں روشنی پیدا کر دی اور دوبارہ مسلمان ہو گیا اور اسلام کی راہ میں کئی جنگوں میں شریک ہوا۔ اسلام کی مشہور جنگ قادسیہ میں بھی شریک ہوا تھا۔ اور بقول رواۃ اس وقت اس کی عمر ایک سو دس سال سے بھی زیادہ تھی۔

امتیازی خصوصیات

کہتے ہیں کہ عمرو بن معدی کرب بھاری بھرکم طاقتور اور خوش خور آدمی تھے۔ سب لوگ ان کی عزت اور احترام کرتے تھے۔ تلوار کے دھنی ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کے بھی دھنی تھے۔ مقررین کی صف اول میں اور شعرا کی دوسری صف میں شمار کئے جاتے تھے۔ خطابت میں بڑا زور تھا۔ تقریر کرتے وقت عام طور چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرتے تھے۔ بلا تکلف اگر سجع آجاتا تو سجع اپنی تقریر کو پُراثر بناتے۔[2] زندگی کے تجربوں اور ضرب الامثال اور اشارہ کنایہ سے اپنی تقریر کو موثر، دلکش اور دل نشین بناتے۔ اکثر خالص بدوانہ اور مشکل الفاظ استعمال

۱۔ جمہرۃ رسائل العرب اور جمہرۃ خطب العرب، احمد زکی صفوت جلد اوّل میں اس کی وصیتیں اور رسائل درج ہیں۔

۲۔ جاحظ نے روایت کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے عمرو بن معدی کرب سے سعد بن ابی وقاص والیِ کوفہ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جو جواب دیا ہے وہ ان کی خوبصورت اور دلکش مسجع کلام کا بہترین نمونہ ہے تفصیل کے لیے دیکھئے۔ البیان والتبیین جلد اوّل و ثانی اور جلد چہارم۔

کرتے تھے۔ اشعار میں عام طور سے اپنی بہادری و شجاعت اور زبان پر قدرت کا ذکر کر کے فخر کرتے۔ شاعری میں انداز بیان بہت خوبصورت، دل نشین، غریب و ثقیل الفاظ سے پاک وصاف ہے۔ جاحظ نے کئی موقعوں پر ان کے کلام سے استدلال کیا ہے[1]

کہتے ہیں کہ نعمان بن المنذر نے انھیں عمائدین عرب کی ایک جماعت کے ساتھ انوشیرواں کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ یہ لوگ اپنے "زور بیان" کو دکھلا کر عربوں کی زبان دانی، شرافت و فضیلت اور مروت کے بارے میں اس کے دعووں کی تصدیق اور ان پر اس کے فخر کو حق بجانب ثابت کریں۔ چنانچہ عمرو بن معدی کرب نے انوشیرواں کے سامنے حسب ذیل مختصر اور جامع تقریر کی۔

انما المرء باصغریہ، قلبہ ولسانہ، فبلاغ المنطق السداد وملاک النجع الارتیاد وعفو الرای خیر من استکراہ الفکرۃ.......... الخ[2]

ترجمہ۔ آدمی اپنی دو چھوٹی چیزوں سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک اس کا دل اور دوسری اس کی زبان۔ طاقت گویائی کی معراج حق گوئی ہے چراگاہ پانے کی کنجی تلاش و جستجو ہے۔ (یعنی مقصد بلا دوڑ دھوپ کے حاصل نہیں ہوتا) جو بات دل میں سب سے پہلے بغیر کچھ سوچے بچارے آجائے وہ ذہن پر زور دے کر قائم کی ہوئی رائے سے بہتر ہے۔ تجربات کی روشنی، حیرت و پریشانی کے اندھیارے سے بہتر ہے۔ تو آپ ہماری اطاعت کو اپنے الفاظ کے ذریعے کھینچ لیجئے اور جلد بازی میں ہم سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے اپنی بردباری سے برداشت کیجئے۔ آپ ہمارے لئے اپنے شانے نرم کر لیجئے (نرم خوئی اختیار کیجئے) تو آپ کے لئے ہماری رہنمائی کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ ہم ایسے لوگ ہیں کہ اگر کوئی شخص ہمیں تباہ و برباد کر دینے کے ارادے سے لوہے کے ٹکڑے کو (یعنی ہتھیاروں کو) کھنکھٹائے تو اس سے ہماری عادات و اخلاق پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ ہم نے اپنی چراگاہ کی ہر اس شخص سے حفاظت کی ہے جو ہمیں ہڑپ کر جانا چاہتا ہے۔

۱۔ جمہرۃ خطب العرب الاول، احمد ذکی صفوت، الاغانی لابی فرج الاصفہانی۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔ خزانۃ الادب للقیروانی، اسد الغابہ الاصابۃ فی احوال الصحابہ، العقد الفرید جلد اول، الاستیعاب۔

۲۔ تفصیل کے لئے جمہرۃ خطب العرب اول دیکھئے۔

عمرو بن معدی کرب نے بھرپور اور بامقصد زندگی گزار کر حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال کیا۔

۲۔ وصیتیں

"وصیت" ان چھوٹے چھوٹے مگر حکمت و فلسفہ اور عقلمندی کے جملوں کو کہتے ہیں جو کوئی شخص اپنے قریب کسی عزیز، دوست یا جاننے والے سے بربنائے خلوص کسی خاص موقع پر اس نیت سے کہے کہ اسے کسی کام سے نقصان پہنچنے کے ڈر سے باز رکھے یا نفع کی امید میں کوئی کام کرنے کی ترغیب دے۔ یہ ضروری نہیں کہ وصیت مرنے سے پہلے ہی کی جائے۔ جیسا کہ ہماری اردو زبان میں اس اصطلاح کا مفہوم "مرنے والے" کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ عربی میں وصیت بالکل نصیحت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جو مرنے والے اور زندہ آدمی دونوں کے لئے مستعمل ہے

دور جاہلی میں جن لوگوں نے دلکش اور موثر انداز بیان میں مفید اور نفع بخش باتوں کی تلقین کی، ان میں زہیر بن جناب الکلبی اور ذوالاصبع العدوانی خاص طور پر مشہور ہیں۔ جاہلی نثر میں وصیتوں کو بھی فصاحت و بلاغت، جامعیت اور معنویت میں ایک خاص مقام حاصل ہے ذیل میں چند وصیتوں کے ترجمے بطور نمونہ دیئے جاتے ہیں۔

۱۔ زہیر بن جناب الکلبی

زہیر بن جناب الکلبی نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: "اے میرے بیٹو! میری عمر بہت لمبی ہو چکی ہے اور اپنی زندگی کی ساری خواہشات کو پورا کر چکا۔ زندگی کے معاملات اور کاموں سے جو تجربات میں نے حاصل کئے ہیں، انھوں نے مجھے کندن بنا دیا ہے۔ اس لئے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو اور اچھی طرح یاد رکھو۔ خبردار! مصیبت کے وقت ہمت مت ہارنا۔ اور نہ پریشانی میں کسی کا سہارا ڈھونڈنا۔ کیونکہ یہ بات غم کو بلاتی ہے اور دشمنوں کو خوش ہونے کا موقع دیتی ہے۔ اور اپنے آپ سے بدگمانی پیدا کرتی ہے۔ خبردار! حوادث زمانہ کی طرف سے کبھی غافل نہ رہنا اور نہ اپنے کو ان سے محفوظ و مامون سمجھنا۔ اور نہ کبھی ان کا مذاق اڑانا۔ کیونکہ جب کبھی کسی قوم نے ان کا مذاق اڑایا ان سے دوچار ہوئے۔ مگر تم ان سے دوچار ہونے کی توقع رکھے رہنا کیونکہ انسان اس دنیا میں اس نشانہ جیسا ہے جس پر تیر پھینکنے والے نشانہ بازی کیا کرتے ہیں، تو بعض تیر چوک جاتے ہیں اور بعض اس کی جگہ کو پار کر جاتے ہیں اور بعض اس کے دائیں اور بائیں پڑتے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ ایک دن اس کو نشانہ بنالیں۔"[1]

۱۔ جمہرۃ خطب العرب، جلد اول، امالی السید مرتضیٰ، جلد اول۔

۲- ذوالاصبع العدوانی

مرتے وقت ذوالاصبع العدوانی نے اپنے بیٹے اسد کو بلایا اور یہ وصیت کی ــــ اے میرے بیٹے! بیشک تمھارا باپ زندگی میں ہی ختم ہو چکا تھا اور اس قدر کہ زندگی سے اکتا گیا تھا۔ میں تمھیں ایسی باتوں کی نصیحت کر رہا ہوں کہ اگر تم نے انھیں یاد رکھا تو تم بھی اس مرتبہ کو پہنچ جاؤ گے جس مرتبہ کو میں پہنچ چکا ہوں۔ اس لئے تم میری طرف سے یہ باتیں اچھی طرح یاد رکھو کہ تم اپنی قوم سے نرمی کا برتاؤ کرو وہ تم سے محبت کرے گی۔ ان سے خاکساری سے ملو، وہ تم کو بلند رتبہ دے گی۔ ان سے خندہ پیشانی سے ملو، وہ تمھاری غوانروری کرے گی۔ ان کے مقابلہ میں کسی چیز کو ترجیح نہ دو، وہ تمھیں سردار بنائے گی۔ ان کے چھوٹوں کا بھی ایسا ہی احترام کرو جیسا کہ ان کے بڑوں کا کرتے ہو، تو ان کے بڑے تمھارا احترام کریں گے۔ اور چھوٹے تمھاری محبت پر پروان چڑھیں گے۔ اپنے مال سے سخاوت کرو۔ اپنی عورتوں کی حفاظت کرو، اور اپنے مہمان کی عزت کرو۔ اور جو مصیبت کے وقت مدد کے لئے پکارے، اس کی مدد کے لئے فوراً اٹھ کھڑے ہو۔ اس لئے کہ تمھاری موت کا وقت مقرر ہے۔ جو ٹل نہیں سکتا۔ کسی سے کوئی چیز مانگنے سے اپنی عزت بچائے رکھو، اس طرح تمھاری سرداری مکمل ہو جائے گی!

ایک دیہاتی عورت (اعرابیہ) نے اپنی لڑکی کو شب زفاف میں اس طرح نصیحت کی۔

"اے میری لاڈلی! اگر زیادتی علم وادب کی بنا پر نصیحت نہ کی جاتی ہوتی تو میں تمھیں نصیحت نہ کرتی لیکن نصیحت سے غافل آدمی کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور عقلمند آدمی کو اس سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اگر کوئی عورت ماں باپ کی مالداری اور انھیں اس کی شدید ضرورت ہونے کی وجہ سے شوہر سے مستغنی ہو سکتی، تو یقیناً تم لوگوں میں سب سے زیادہ مالدار ہوتیں۔

اے میری بچی! تم وہ ماحول چھوڑ کر جس میں پلی بڑھی تھیں اور اس آشیانہ کو خیرباد کہہ کر جس میں تم رہی بسی تھیں، ایسے آشیانے میں جا رہی ہو جسے تم نہیں جانتی ہو اور ایسے ساتھی سے مل رہی ہو جس سے اب تک تمھارا کوئی واسطہ نہیں پڑا ہے۔ اس لئے میرے پاس سے دس عادتیں لیتی جاؤ کہ تمھارے آڑے وقت میں کام دیں گی۔

قناعت کے ساتھ اس کے ساتھ رہنا اور فرمانبرداری اور اطاعت سے اُس کے ساتھ زندگی گذارنا۔

۱- جمہرة خطب العرب، جلد اوّل، احمد زکی صفوت، الاغانی الاصفہانی، ج ۳۔

اور اس کی نگاہ پڑنے کی جگہ کو دیکھتی رہا کرنا۔ اور اپنی کسی برائی پر اس کی نگاہ نہ پڑنے دیا کرنا۔ اس کے بعد اس کے کھانے کے وقت کو اچھی طرح جان لینا اور اس کے سونے کے وقت پُرسکون رہا کرنا۔ کیونکہ بھوک کی آگ مزاج کی تیزی کو بڑھا دیتی ہے، اور نیند کو خراب کر دینا بغض پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ رنجیدہ ہو تو اس کے سامنے خوشی کے اظہار سے اور جب خوش ہو تو غم کے اظہار سے پرہیز کرنا۔ کیونکہ پہلی عادت اس کے حق میں کوتاہی ہے اور دوسری عادت سے بے کیفی پیدا ہوتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی تعظیم کیا کرنا تو وہ سب سے زیادہ تمھاری عزت کرے گا۔ اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اپنی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں میں جب تک اپنی مرضی کے مقابلہ میں اس کی مرضی کو ترجیح نہ دو گی، اس وقت تک اپنی مراد حاصل نہیں کر سکو گی۔ اور اللہ تمھارا بھلا کرے[1]

۳۔ کہاوتیں (ضرب الامثال)

کہاوت اس جملہ کو کہتے ہیں جو کسی خاص موقع پر کسی خاص بات کو مختصر لیکن جامع طریقے سے بیان کرنے کے لئے کہا گیا ہو اور وہ جملہ خاص و عام میں مقبول ہو کر زبان پر چڑھ گیا ہو۔ عربی زبان کی کہاوتوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ بخلاف شعر انھیں صرف پڑھے لکھے اور مہذب لوگوں ہی نے نہیں کہی ہیں بلکہ عوام نے بھی حکیمانہ کہاوتیں کہی ہیں۔ اسی لئے بعض کہاوتوں میں لفظ و معنی کا وہ حسین امتزاج نہیں ہے جو عام طور سے ان کہاوتوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یعنی ان میں وہ خوبصورت اور دقیق معنی نہیں جو پڑھے لکھے اور مہذب طبقہ کے افراد کی کہاوتوں میں ملتے ہیں۔ جیسے "اذل ما اطلع ضب ذنبہ"۔ اسی لئے بعض کہاوتوں کے معنی الفاظ سے نہیں، بلکہ بطریق سماع معلوم ہوتے ہیں جیسے "بعین ما ارینک"۔ ابو الہلال العسکری نے اپنی کتاب جمہرۃ الامثال میں اس کے معنی جلدی کرو کے بتائے ہیں۔ جو الفاظ سے نہیں ملتے۔ محض سن کر یہ معنی معلوم ہوتے۔

عربی زبان میں کہاوتیں دو طرح کی پائی جاتی ہیں۔ حقیقی یعنی جنھیں انسانوں نے کہی ہیں اور فرضی جو جانوروں کے منہ سے ادا کرائی گئی ہیں۔ جانوروں کے منہ سے کہاوتیں کہلانے کا رواج اس وقت پڑا جب معاشرہ میں حکمران طبقہ اور سربرآوردہ لوگوں کی ظلم و زیادتی بڑھ گئی اور مفکرین و مصلحین کو اس کا خطرہ پیدا ہوا کہ اگر انھوں نے اپنی زبان سے اس قسم کے جملے کہے جن کی چوٹ حکمراں طبقے پر یا سربراہ مملکت پر پڑے گی تو وہ ان پر ظلم و زیادتی کریں گے۔

کہاوتوں (ضرب الامثال) کے علاوہ جاہلی نثر کے نمونوں میں پہیلیاں اور بوجھ بجھی ملتے ہیں۔ اگرچہ

۱۔ جمہرۃ خطب العرب، مجمع الامثال للمیدانی، ج ۲۔ العقد الفرید لابن عبدربہ ج ۳۔

نقاد اور تذکرہ نگاروں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور انھیں جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ پہیلیاں اور بجھاوتیں مختلف کتابوں میں بکھری پڑی ہیں۔ جیسے عبید بن الابرص اور امرؤالقیس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عبید نے امرؤالقیس سے شعر میں پہیلی کہی اور اس کا جواب اس نے شعر میں دیا۔ عبید نے کہا۔

ماحية ميتة قامت بميتها   درداء ما انبتت نابا و اضراسا

یعنی وہ کونسی زندہ اور مردہ چیز ہے جو اپنی لاش کے سہارے کھڑی رہتی ہے اور چھونے میں کھردری ہے لیکن نہ اس کے دانت ہیں اور نہ ڈاڑھ۔

امرؤالقیس نے اس کی بوجھ بتائی۔

تلك الشعيرة تسقى فى سنابلها   قد اخرجت بعد طول المكث اكداسا [1]

وہ جو ہے جو اپنی بالیوں کے ذریعہ پانی پیا کرتا ہے اور ایک مدت تک زمین میں پڑے رہنے کے بعد ڈھیر کے ڈھیر دانے پیدا کرتا ہے۔

یا امرؤالقیس کی یہ قسم کہ وہ صرف اس لڑکی سے شادی کرے گا جو اس کی یہ پہیلی "ماثمانية واربعة واثنين" (یعنی ۸-۴ اور ۲ کیا ہیں) بوجھ لے گی اب تک جتنی لڑکیوں سے اس نے یہ پہیلی بجھائی تھی۔ سب نے کہا کہ چودہ (۱۴) چنانچہ وہ ایسی لڑکی کی تلاش میں چلا جا رہا تھا کہ اس نے ایک آدمی کے ساتھ ایک بہت ہی خوبصورت کمسن لڑکی دیکھی۔ اس سے وہی پہیلی پوچھی، تو اس نے جواب دیا: "آٹھ تو کتیا کے تھن ہیں چار اونٹنی کے تھن اور دو عورت کی چھاتیاں"۔[2] چنانچہ رواۃ نے لکھا ہے کہ امرؤالقیس نے لڑکی کے باپ سے رشتہ مانگا اور شادی کر لی۔

ذیل میں زمانہ جاہلی کی چند منتخب کہاوتیں دی جاتی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں نے زندگی

۱۔ اسی طرح اس کا وہ شعری مقابلہ بھی قابل ذکر ہے جو اس کے اور الحارث بن التوأم الیشکری کے درمیان ہوا تھا جس میں امرؤالقیس نے شعر میں پہیلی کہی، اور اس کا جواب حارث نے بھی شعر ہی میں دیا۔ دیکھئے مذکورہ بالا کتابیں۔ اس کے علاوہ شعر النصرانیہ شیخو الیسوعی میں بھی امرؤالقیس کے شعری مقابلوں کا تفصیلی ذکر ہے۔ ابو عمرو نے روایت کی ہے کہ ابن التوأم نے جب اسے زچ کر دیا تو اس نے قسم کھائی کہ اب کبھی کسی شاعر کے منہ نہ لگے گا۔ مگر جدید تحقیق یہ ہے کہ یہ شعری مقابلے اور یہ شعری پہیلیاں من گھڑت چیزیں ہیں۔ کیونکہ ان میں ایسی باتوں کا ذکر ہے اور ایسی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں جو اس زمانے میں رائج نہ تھیں۔ بلکہ ان کا رواج بعد میں اسلامی زمانے میں ہوا۔

۲۔ فقالت "اما ثمانية فاطباء الكلبة واما اربعة فاخلاف الناقة واما اثنتان فثديا المرأة": کہتے ہیں کہ اس لڑکی نے بھی اس سے کچھ شرطیں رکھی تھیں اور اس سے کچھ پہیلیاں بجھوائی تھیں۔ ان قصوں کے لئے الاغانی للاصفہانی اور مجمع الامثال للمیدانی اور المعلقات العشر و اخبار شعرائها للشیخ احمد بن الامین الشنقیطی دیکھئے۔

اور تجربات سے ایسی جامع ومانع اور موثر کہاوتیں وضع کی ہیں جو آج تک اپنی معنویت اور جامعیت میں نمونہ اور عربی ادب کی جان ہیں۔ اور آج بھی ان کے استعمال سے کلام میں حسن اور معنی میں گہرائی اور اعجاز پیدا کیا جاتا ہے:

۱- "ان البغاث بأرضنا تستنسر" یعنی کمزور چڑیاں بھی ہماری زمین میں گدھ جیسی طاقتور بن جاتی ہیں۔ یہ مثل ایسے موقع پر کہی جاتی ہے جب کمزور آدمی طاقت اور قوت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ گھٹیا آدمی بڑا بن جائے جیسے اردو میں کہتے ہیں: "بلی بھی اپنے دروازے پر شیر ہوتی ہے"۔

۲- "رب رمیة من غیر رام" یعنی کبھی تیر اندازی نہ جاننے والے کا تیر بھی ٹھیک نشانہ پر لگ جاتا ہے اسے سب سے پہلے ابن عبد الغوث النقری نے کہا تھا۔ یہ ایسے موقع پر بولتے ہیں جب ہمیشہ غلطی کرنے والا کبھی صحیح بات کہہ جائے یا صحیح کام کر جائے۔ جیسے اردو میں "اندھے کے ہاتھ بٹیر"۔

۳- "الحدیث ذو شجون" یعنی یہ بات مختلف راستوں والی ہے۔ اسے ضبعہ بن ادبن طابخہ نے کہا تھا۔ جیسے اردو میں: "بات سے بات نکلتی ہے"۔

۴- "ان العوان لا تعلم الخمرة" شادی شدہ عورت کو دوپٹہ اوڑھنا نہیں سکھایا جاتا۔ یعنی بوڑھے لوگوں کو ادب تمیز نہیں سکھائی جاتی، جیسے بوڑھے طوطے نہیں پڑھائے جاتے۔ اس مثل کو ایسے موقع پر بھی بولتے ہیں جب کوئی کم علم والا بڑے عالم یا تجربہ کار بزرگ کے سامنے باتیں بنائے جیسے اردو میں کہتے ہیں "چھوٹا منہ بڑی بات"۔

۵- "سبق السیف العذل" تلوار ملامت سے سبقت لے گئی۔ اسے ضبعہ بن ادبن طابخہ نے کہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت گزرنے کے بعد تلافی ممکن نہیں۔ جیسے اردو میں "تیر کمان سے نکل گیا" یا "اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"۔

۶- "ان کنت ریحا فقد لاقیت اعصارا" یعنی اگر تم ہوا تھے تو گرد باد یعنی بگولے سے تمہارا سابقہ پڑ گیا۔ یہ اس شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو اپنے آپ کو بہت زیادہ چالاک اور ہوشیار سمجھتا ہو لیکن اس کا پالا اس سے بھی چالاک اور ہوشیار آدمی سے پڑ جائے۔ جیسے "سیر کو سوا سیر" یا "جیسے کو تیسا"۔

۷- "رمتنی بدائها وانسلت" یعنی اپنی بیماری میرے اوپر تھوپ کر کھسک گئی۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی آدمی اپنی غلطی یا برائی کو دوسرے کے سر منڈھنے کی کوشش کرے، جیسے اردو میں کہتے ہیں: "ناچ نہ آوے آنگن ٹیڑھا"۔

۸- "انک لا تجنی من الشوک العنب" یعنی تم کانٹوں سے انگور نہیں توڑ سکتے۔ یعنی کسی برے آدمی

سے بھلائی کی امید نہیں کی جا سکتی یا کسی بُری جگہ سے خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ جیسے نیم نہ میٹھا ہوئے سینچو گڑ گھی سے۔

۹۔ "ذکرنی فوک حمار ی اہلی": تیرے منہ نے میرے گھر کے دونوں گدھے یاد دلا دیئے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب امید و توقع کے خلاف کوئی بات ہو جائے۔ اس کہاوت کو ایک آدمی نے کہا تھا، اس کے دو گدھے کھو گئے تھے، وہ ان دونوں کو ڈھونڈنے نکلا۔ راستے میں ایک عورت دکھائی دی، اور اسے بھا گئی۔ چنانچہ گدھوں کو بھول کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد راستے میں جب اس نے اپنا منہ کھولا اور اس آدمی نے اس کا بدصورت چہرہ دیکھا تو یہ مثل کہی۔ جیسے اردو میں کہتے ہیں "ڈھول میں پول"۔

۱۰۔ "اوسعتهم سبا واودوا بالابل": میں نے انھیں جی بھر کے گالیاں دیں لیکن وہ اونٹ لے بھاگے۔ اس کہاوت کے پیچھے بھی ایک واقعہ ہے۔ ایک آدمی اپنے اونٹ چرا رہا تھا۔ اچانک کچھ لوگوں نے حملہ کر دیا اور اونٹ لے بھاگے۔ یہ بیچارہ کمزور تھا، اپنے اونٹ نہ چھڑا سکا۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو ایک ٹیلہ پر چڑھ گیا اور خوب چلا چلا کر سخت گالیاں دیں اور منہ لٹکائے اپنے قبیلہ میں چلا آیا۔ لوگوں نے کہا منہ کیوں لٹکائے ہوئے ہو اور اونٹ کیا ہوئے۔ تو یہ مثل کہی۔ جیسے اردو میں کہتے ہیں — "کھسیانی بلی کھمبا نوچے"۔

۴۔ فلسفیانہ اور حکیمانہ مقولے

وہ دلکش، جامع ومانع اور خوبصورت جملے جن میں زندگی کے تجربات کی بنا پر ایسی صحیح اور اٹل حقیقت کا اظہار ہو جن کا کوئی انکار نہ کر سکے۔ عربی زبان میں کہاوتیں اور حکیمانہ مقولے نظم و نثر دونوں اصناف میں ملتے ہیں۔ اور بڑے ہی دلکش اور موثر ہوتے ہیں[1]

۱۔ "من سلك الجدد امن العثار": یعنی جو سیدھی راہ چلتا ہے، ٹھوکر سے بچا رہتا ہے۔ جیسے اردو میں کہا جاتا ہے "سیدھی راہ چلو چاہے دور ہو"۔ "راہ راست برو گرچہ دور است"۔

۲۔ "خير الموت تحت ظلال السيوف": بہترین موت تلواروں کے سایہ میں ہے۔ یعنی بہادری سے جان

۱۔ امثال سے متعلق پوری تفصیل کے لئے دیکھئے۔

احمد امین، فجر الاسلام، اوّل ص ۷۲ تا ۷۹، طبع ثانیہ ۱۹۳۳ء مطبعۃ الاعتماد، مصر۔

مجمع الامثال للمیدانی۔

جمهرة امثال العرب للعسكری۔

دینا ذلت کی موت سے بہتر ہے۔

۳۔ "جرح اللسان انکی من کلم السنان" زبان کا زخم نیزہ کے زخم سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

۴۔ خیر الغنی القناعۃ: یعنی قناعت بہترین مالداری ہے۔

۵۔ "رضا الناس غایۃ لا تدرک": یعنی لوگوں کو خوش رکھنا ایسا مقصد ہے جو کبھی پورا نہیں ہوتا۔

۶۔ "رب عجلۃ تہب ریثا": یعنی کبھی جلد بازی تاخیر کا باعث بن جاتی ہے۔ اس سے ملتا جلتا اردو میں "جلدی کا کام شیطان کا"۔

۷۔ "انجز حر ما وعد": یعنی شریف آدمی جو وعدہ کرتا ہے اسے پورا کرتا ہے۔

۸۔ "اترک الشر یترکک": یعنی تم برائی کو چھوڑ دو، وہ بھی تمہیں چھوڑ دے گی۔

۹۔ "من ضاق صدرہ اتسع لسانہ": جس کا دل چھوٹا ہوتا ہے اس کی زبان لمبی ہوتی ہے۔

۱۰۔ "رب ملوم لا ذنب لہ": بسا اوقات ملامت کئے جانے والا آدمی بےگناہ ہوتا ہے۔

۵۔ نثر مرسل و مسجع

"مرسل" نثر کی وہ قسم ہے جس میں عبارت کے آخری کلمات میں قافیہ بندی نہ ہو یعنی ہر جملہ کا آخری لفظ ایک وزن پر ختم نہ ہوتا ہو۔

"مسجع" ہر جملہ یا دو جملوں یا ان سے زیادہ جملوں کے بعد کے الفاظ میں قافیہ بندی یعنی ہم وزن الفاظ استعمال کئے جائیں، تو یہ مسجع کہلائے گا۔ سجع اگر بغیر تکلف کے عبارت میں آجائے تو اسے برا نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ اس قسم کی عبارت بشرطیکہ آمد ہو، آورد نہ ہو، کانوں کو بھلی لگتی ہے اور موسیقیت کی وجہ سے دل و دماغ میں جلد اتر جاتی ہیں۔ عبارت کو اس طریقہ سے حسین و دلکش بنانے کا رواج زمانہ جاہلی کی تقریروں کہاوتوں، حکمت اور عقلمندی کے مقولوں، فخریہ موقعوں اور کاہنوں کی بانیوں میں زیادہ ملتا ہے۔ جہاں تک لکھنے کا سوال ہے تو ایک عرصہ تک عرب کے انشاپرداز اس طرز پر لکھتے رہے ہیں۔ ان میں سے جن ادبا کی تحریروں میں بلا تکلف صنعت سجع آگئی ہے، وہ پسندیدہ رہیں اور جن ادبا نے باتکلف اور قصداً سجع عبارتیں لکھی ہیں اپنے زمانے میں وہ چاہے کسی وجہ سے مقبول رہی ہوں، لیکن بعد میں انہیں ناپسند کیا جانے لگا۔ اور ان کا رواج ختم ہو گیا۔

"نثر مرسل" کی بہترین مثال ابو جمیل قیس بن خفاف البرجمی کے وہ جملے ہیں جو اس نے حاتم طائی نے ذمہ ایک خون بہا لینے کے بعد کہے تھے۔

"انی حملت دماء عولت فیہا علی مالی وآملی فقدمت مالی وکنت اکبر آملی"

فان تحملتها فكم من حق قضيت وهم كفيت وان حال دون ذلك حائل۔ لم اذم
يوماً ولم ايأس من غد ؎

ترجمہ۔ میں نے اپنے ذمہ ایسا خون بہانے لیا ہے جس کو ادا کرنے کے لئے میں نے اپنے مال اور اپنی امید سے لو لگا رکھی ہے۔ جہاں تک میرے مال کا تعلق ہے تو وہ میں پیش کر چکا۔ اب رہی امید سو وہ تم ہو۔ تو اگر تم اسے برداشت کر لو تو یہ تمہارے لئے کوئی بڑی بات یا کوئی نئی بات نہیں کیونکہ تم نے تو کتنے ہی حقوق پورے کئے ہیں اور کتنی ہی تکلیفیں دور کی ہیں۔ اور اگر اس راستہ میں کوئی حادثہ آجائے تو میں تمہارے آج کے دن کی برائی نہیں کروں گا اور نہ تمہارے آئندہ کل سے مایوس ہوں گا۔

کاہنوں کے سجع کی مثال

کاہنوں کے سجع کے نمونے کے طور پر کاہن ربیعہ سطیح بن مازن کے ان اقوال کو پیش کیا جاتا ہے جو اس نے یمن کے بادشاہ ربیعہ بن نصر اللخمی کے ایک خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے کہے تھے۔

" احلف بما بين الحرتين من حنش ليهبطن ارضكم الحبش۔ وليملكن ما بين ابين الى الجرش "

ترجمہ۔ کالے پتھروں والی زمین کے درمیان جتنے سانپ ہیں یا انسان ہیں ان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے ملک پر حبشی لوگ اتریں گے اور ابین اور جرش کے درمیان جو کچھ ہے اس پر قبضہ کر لیں گے (ابین اور جرش دو قصبے تھے۔

کاہن شق انمار نے جو کسریٰ انوشیرواں کے زمانہ میں گذرا ہے، اس نے بھی اس خواب کی تعبیر سجع میں دی۔ اس نے کہا۔

" احلف بما بين الحرتين من الانسان، لينزلن ارضكم السودان۔ وليغلبن على كل طفلة البنان وليملكن الى ما بين ابين ونجران "

ترجمہ۔ دونوں کالے پتھروں والی زمینوں کے درمیان جتنے انسان رہتے ہیں ان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے ملک پر سوڈانی لوگ اتریں گے اور ہر نرم انگلیوں والی پر غلبہ حاصل کر لیں گے اور ابین اور نجران کے درمیان جو کچھ ہے اس پر قبضہ کر لیں گے۔

کاہنوں کے علاوہ مخضرم شاعر لبید بن ابی ربیعہ[1] کی طرف بھی سجع میں ایک پودے کا نقشہ کھینچنا

۱۔ اس سجع کا قصہ لبید کے حالات زندگی میں دیکھئے۔ ج ۲،

یوں بیان کیا گیا ہے۔ اس پودے کو تربہ کہتے ہیں۔

* ھذہ التوبة التی لاتذکی ناراً، ولا توصل داراً ولا تسرجاراً، عودھا فیئل و فرعھا کلیل وخیرھا قلیل بلدھا شاسع، نبتھا خاشع وآکلھا جائع والمقیم علیھا ضائع، اقصرالبقول فرعا واخشنھا مرعی واشدھا قلعاً فتعسالھا وجدعاً

ترجمہ۔ تربہ وہ پودا ہے جو نہ آگ جلا سکتا ہے اور نہ کسی گھر میں سبزی کے طور پر کام آسکتا ہے اور نہ کسی پڑوسی کو خوش کر سکتا ہے۔ اس کا تنا کمزور، اس کی شاخ بے جان اور اس کا نفع بہت کم ہے۔ اس کا ملک بہت دور اور اس کا پودا زمین سے لگا ہوا یعنی بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کا کھانے والا بھوکا اور اس کے نیچے رہنے والا برباد ہو جاتا ہے۔ سارے پودوں میں اس کی شاخ چرنے میں بدترین اور اکھاڑنے میں سخت ترین، خدا اسے برباد کرے اور کاٹ دے۔

یہاں پر یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ سجع کے معاملہ میں نقادوں کی مختلف رائیں ہیں۔ بعض اس صنف کو اچھی سمجھتے ہیں اور بعض بری۔

چنانچہ جو نقاد اسے بری اور معیوب سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ لکھنے یا بولنے کا یہ طریقہ فطری نہیں ہے، بلکہ اس میں لکھنے والے یا بولنے والے کو ذہن پر زور دے کر ایسی عبارت لکھنی پڑتی ہے کہ نفس موضوع کی طرف دھیان نہیں رہتا، اور موضوع کا تسلسل اور بیان کا ربط اور معنی ومفہوم کی وضاحت خبط ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے موضوع تشنہ رہ جاتا ہے پھر بانکلف لکھنے سے اس کا فطری حسن جاتا رہتا ہے۔ اور بعض اوقات محض سجع کی وجہ سے معانی تشنہ اور مضمون مبہم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وزن لانے کے لئے غریب الفاظ بھی استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اس کا مظاہرہ کاہنوں کے سجع میں بہت ملتا ہے۔ ان کے یہاں بعض الفاظ ایسے ملتے ہیں، جن کے معنی اب تک صاف نہیں اور اگر واضح ہیں تو معنی سیاق وسباق کی وجہ سے خود لفظ اپنے معنی واضح طور پر ظاہر نہیں کرتا۔

جو نقاد صنف سجع کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ درحقیقت کلام کا اعلیٰ درجہ اسی کو حاصل ہے کیونکہ وزن کی وجہ سے جملوں میں جو موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے وہ براہ راست دل پر اثر کرتی ہے اس کے علاوہ اس سے ادیب کی زبان پر قدرت، الفاظ کے ذخیرہ اور ان کے برمحل استعمال کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن کریم جو عربی کی سب سے پہلی معجزہ نما کتاب ہے اس کی اکثر سورتیں پوری کی پوری مسجع ہیں۔ جیسے سورہ رحمن، سورہ القمر وغیرہ۔ اس کے علاوہ اکثر سورتوں میں قرآن کریم نے سجع کا التزام رکھا ہے۔ قرآن کے بعد فصاحت وبلاغت کا نمونہ آنحضرت تھے۔ آپ کا بھی اکثر کلام مسجع ہے۔

جیسے "یا ایہا الناس افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا باللیل والناس نیام" اور بعض جگہ تو آپ نے محض سجع کی خاطر نحوی اور صرفی قاعدوں کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔ جیسے آپ کا اپنے نواسے کے بارے میں فرمانا "اعیذہ من الہامۃ وکل عین لامۃ" یہاں پر لامہ در حقیقت ملمہ ہے کیونکہ الم سے ملم ہی بنتا ہے۔ مگر آپ نے ہامہ اور سامہ کی نسبت سے لامہ فرمایا۔ رہ گئی یہ بات کہ آپ نے کاہنوں کے سجع پر ایمان ویقین رکھنے سے منع فرمایا ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس طرز بیان سے روکا ہے، بلکہ اس خرافی مضمون کی طرف توجہ دینے اور اس پر یقین رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ جو ان کی سجع میں ہوتا ہے۔ جیسے غیب کے بارے میں اٹکل پچو باتیں یا مبہم اور غیر مانوس اشارے۔

ان لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ دور جاہلیت میں جب کہ زبان وبیان میں فطری انداز غالب تھا۔ سجع ہی کو لوگ پسند کرتے تھے۔ کیونکہ اس میں موسیقیت تھی۔ پھر اس سجع سے بعد میں شعر اور اس کا وزن اور قافیہ بھی نکلا ہے جس نے ادب کی ایک مستقل صنف اختیار کرلی

مگر ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ سجع کے بارے میں یہ رائیں قدما کی ہیں۔ عباسی دور کے آخری زمانہ سے سجع اور خاص طور سے باتکلف سجع کا رواج جس کی زندہ مثال حریری کے مقامات ہیں، بالکل ختم ہوگیا۔ جن ادبا نے سجع کو مستحسن سمجھا ہے، انھوں نے اس کے لئے چند شرائط عائد کی ہیں جو اگر پوری ہوں تو وہ سجع مستحسن اور مقبول ہے ورنہ ناپسندیدہ اور نامقبول[1]

موجودہ زمانے میں ادبا اور نقاد عام طور سے مسجع عبارت کو ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ البتہ بے ساختہ آمد کے طور پر سجع عبارت میں اگر کہیں آجائے اور معنی و موضوع کو گنجلک اور مبہم نہ بنا دے تو کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔

۶۔ قصے کہانیاں

قوموں کی ادبی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب سے انھوں نے اجتماعی زندگی گزارنی شروع کی اس وقت سے کہانیاں ان کی زندگی کا لازمی جز بن گئیں۔ چنانچہ ہندوستانی، ایرانی، یونانی اور رومی سبھی قوموں کے ادب میں شہرۂ آفاق کہانیاں ملتی ہیں۔ ان میں بعض کہانیاں اتنی مقبول ہوئیں کہ ان کو ادب

۱۔ سجع سے متعلق تفصیل کے لئے دیکھے۔

المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر: ضیاء الدین بن الاثیر۔ ۶۳۷ھ۔ صبح الاعشیٰ للقلقشندی۔

اسس النقد الادبی عند العرب: الدکتور احمد احمد بدوی: طبعۃ ثالثۃ، ۱۹۶۴ء

میں قومی حیثیت حاصل ہو گئی جو اب تک برقرار ہے۔ ان قوموں میں سے جو قوم ذہنی اور تخیلی اعتبار سے جتنی بلند تھی اسی لحاظ سے ان کے قصے کہانیاں بلند پر اثر، دلچسپ اور فنی اعتبار سے معیاری ہیں۔

عرب قوم بھی دنیا کی قدیم قوموں میں سے ہے۔ جس نے زندگی کے مختلف نشیب و فراز دیکھے ہیں اور ان سے حاصل شدہ تجربات کو کبھی شعر میں اور کبھی نثر میں بیان کیا ہے۔ نثر میں بیان کردہ اصناف میں ایک قصہ بھی ہے جو عربوں کے یہاں بہت عام تھا۔ جاہلی زمانے میں لوگ دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر "ندوات سمر" رات میں گپ شپ کے حلقے یا مجلسیں منعقد کرتے تھے۔ جن میں یہ لوگ اپنے اسلاف کے کارناموں، ان کی بہادری اور شجاعت کے قصوں کو بیان کرتے تھے: "قیل لبعض اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ماکنتم تتحدثون بہ اذا خلوتم فی مجالسکم؟ قال: کنا نتناشد الشعر ونتحدث باخبار جاھلیتنا:" یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ سے پوچھا گیا کہ جب آپ لوگ اپنی بیٹھکوں میں جمع ہوتے تھے تو کیا باتیں کیا کرتے تھے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم ایک دوسرے کو شعر سناتے تھے اور زمانۂ جاہلیت کے اخبار (قصے) بیان کرتے تھے۔ اسی طرح کہانیاں سننے کا رواج اسلامی عہد میں بھی ایک زمانہ تک رہا۔ خود قرآن کریم نے بھی عبرت کے لئے گذشتہ قوموں کے قصوں کو مختلف جگہوں پر بیان کیا ہے[1] اور اس معجزہ نمائی کے ساتھ کہ بعض سورتیں عربی ادب کا شہ پارہ ہو گئی ہیں۔ رواۃ نے بیان کیا ہے کہ حضرت معاویہ کے پروگرام کا سب سے اہم حصہ رات کو گذشتہ قوموں کے اخبار اور تاریخ و وقائع کا سننا تھا۔

زمانۂ جاہلیت میں جن قصوں کا رواج تھا۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو ان قصوں کی ہے جنہیں ہم لوک کتھا کہہ سکتے ہیں۔ چونکہ عرب قوم بہادر اور جنگجو قوم تھی اور زندگی کا بیشتر حصہ جنگی سرگرمیوں یا غارتگری

1۔ قرآن میں وارد قصوں کی تفصیل ان کی تقسیم اور غرض و غایت کے متعلق دیکھئے:

ا۔ القرآن والقصۃ الحدیثۃ : محمد کمال حسن المحامی

ب۔ التصویر الفنی فی القرآن : سید قطب

2۔ مضمون "القصۃ فی القرآن الکریم": ڈاکٹر عبداللہ محمود شحاتۃ، مجلۃ "العربی" ماہ مارچ 1977ء ربیع الاوّل 1397ھ

میں گزرتا تھا۔ اس لئے عام طور پر ان کہانیوں کا موضوع جنگ اور بہادروں کی شجاعت اور دلیری کے کارناموں کو بیان کرنا ہے۔ اس قسم کی کہانیوں میں سب سے زیادہ مشہور عنترہ، الزیر سالم بن ہلال البطال، الامیرۃ ذات الہمہ، سیف بن یزن اور فیروز شاہ ہیں

ان کہانیوں میں عام طور سے جنگ اور جنگجو بہادروں کا ذکر ہے۔ یوں تو ان کہانیوں میں سے بعض کی بنیاد تاریخی واقعات پر ہے، لیکن زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں اس قدر تغیر و تبدل ہوا کہ تاریخی بنیاد منہدم ہو کر صرف تخیلی عمارت رہ گئی۔ ان کہانیوں میں سب سے زیادہ مشہور اور مقبول کہانی "عنترہ" کی ہے۔ جسے قصصی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اگرچہ تاریخی اور فنی اعتبار سے اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔ یہ وہی عنترہ ہے جس کا معلقہ مشہور ہے۔ اور جو اپنی بہادری کے کارناموں کی وجہ سے عرب قوم کا ہیرو بن گیا تھا۔

کہانی "عنترہ" محض ایک جنگجو اور بہادر عرب ہی کی کہانی نہیں ہے بلکہ یہ عہد جاہلیت کے ایک غیور، بہادر، ہمت ور، شریف اور مخلص وفادار شخصیت کا پیکر ہے۔ "عنترہ" اپنے قبیلہ کا سردار ہے۔ ہمت، بہادری، اخلاص و وفاداری اور قربانی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اس کے قبیلہ کی ایک دوسرے قبیلہ سے جنگ ہوتی ہے۔ عنترہ بڑی ہمت و عزم سے اپنی فوج کی قیادت کرتا ہے۔ گھمسان کا رن پڑا ہے وہ بڑی بے جگری اور عدیم المثال بہادری سے لڑتا ہے۔ اتنے میں اس کے سینے میں دشمن کا زہر میں بجھا ہوا ایک تیر آکر لگ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ زخم کاری ہے اور زہر نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا ہے اور وہ اب چند لمحوں کا مہمان ہے تو اس خیال سے کہ اس کی غیر موجودگی کی وجہ سے اس کی فوج میں بد دلی نہ پھیل جائے اور وہ غنیم سے شکست کھا جائے، جلدی سے اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے اور اپنے نیزے پر ٹیک لگا لیتا ہے۔ اور اس حالت میں اس کی روح نکل جاتی ہے۔ جب دشمن دور سے اس طرح اسے گھوڑے پر سوار نیزے پر ٹیک لگائے دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ زندہ ہے اور گھوڑے پر بیٹھا اپنی فوج کی کمان کر رہا ہے۔ چنانچہ خوف و دہشت کے مارے اس کے قریب آنے کی جرأت نہیں کرتے ہیں [1]

تاریخی اعتبار سے اس میں بڑا سقم ہے پھر فنی اعتبار سے بھی اس میں خامیاں ہیں، نہ فقروں میں ربط ہے نہ کہانی کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ ایک بدوی کی صحیح تصویر

1۔ دراسات فی القصۃ والمسرح، محمود تیمور

ہے۔اس لئے عہد جاہلیت کی مقبول ترین کہانی سمجھی جاتی ہے۔ اور "عنترہ" کی ذات عربوں میں "ہیرو" کی طرح مانی جاتی ہے۔ تاریخی واقعات پر مبنی لیکن حقائق سے دور کہانیوں میں "الزبا" کی موت کا قصہ بھی ہے، جس کی روایت ہشام بن محمد الکلبی سے کی گئی ہے۔ اس عربی کہانی میں اور ثقہ مورخین نے "زنوبیا" کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس میں بڑا اختلاف ہے۔ اس کے پیش نظر عربی کہانی بالکل من گھڑت اور خیالی نظر آتی ہے۔ اور تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ یہ بات اب تک نہیں معلوم ہو سکی کہ اس کو گھڑنے میں دور جاہلیت کے لوگوں کا ہاتھ ہے یا اسلامی دور میں اسے تخیلی جامہ پہنایا گیا۔[1]

جنگی کارناموں اور بہادری کے قصوں میں ان قصوں کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے جنھیں ہم عربی ادب میں ایام العرب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ ان جنگوں کی کہانیاں ہیں جو عرب قبیلوں میں باہم بہت معمولی باتوں پر چھڑ جاتی تھیں۔ جیسے داحس اور غبرا کی جنگ یا "یوم الفجار" اور "یوم ذی قار" جو بنو شیبان اور ایرانیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ان جنگوں میں داحس اور غبرا کی جنگ بہت مشہور اور عبرتناک ہے۔ اور جاہلی ذہنیت اور فطرت کی آئینہ دار۔[2]

جنگوں اور بہادروں کے کارناموں کے قصوں کے علاوہ عہد جاہلیت میں بعض قصے حسن و عشق کے بھی ملتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور "منخل الیشکری" مشہور غزل گو شاعر اور نعمان بن منذر کی بیوی متجردہ کا قصہ حسن و عشق ہے۔[3]

عہد جاہلیت کی کہانیوں کی دوسری قسم ان کہانیوں کی ہے جنھیں عربوں نے دوسری قوموں سے لیا ہے اور انھیں اپنے ذوق کے مطابق عربی زبان کا ایسا جامہ پہنایا ہے کہ پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ جیسے شریک نامی شخص کا واقعہ جو منذر کے ساتھ پیش آیا۔ اس واقعہ کی مختصر روداد یہ ہے کہ حنظلہ نامی ایک شخص منذر کے پاس آیا۔ منذر نے کسی وجہ سے اس کو قتل کرنے کی ٹھان لی۔ حنظلہ نے اس سے ایک سال کی

۱۔ فجر الاسلام احمد امین ۱/۸۰ ۔ الطبعۃ الثانیہ جنوری ۴۴
۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے اس کتاب کا صفحہ ۴۳ ـــــ اور عقد الفرید، ابن عبدربہ ـــــ مجمع الامثال للمیدانی ـــــ ایام العرب فی الجاہلیۃ، محمد ابو الفضل ابراہیم و علی محمد البجادی۔
۳۔ منخل کے لئے اس کتاب کے علاوہ دیکھئے، الاغانی جلد ۱۰۔ کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ، شعراء النصرانیۃ للشیخو الیسوعی اور زوزنی شارح سبع معلقات نے "نابغہ" کے اس قصیدے کے ذکر میں جو اس نے متجردہ کے بارے میں کہا تھا۔ منخل اور متجردہ کے تعلقات پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ص ۱۰۹، مطبوعہ مطبعہ السعادہ، مصر، ۱۹۲۵ء

مہلت مانگی منذر نے کہا کہ اپنا کوئی ضمانتی لاؤ۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تم ایک سال کے بعد قتل ہونے کے لئے آجاؤ گے۔ اس نے شریک بن عمرو کو اپنے ضمانتی کے طور پر پیش کیا۔ جب ایک سال گزر گیا تو المنذر اپنے دربار میں بیٹھ کر حنظلہ کا انتظار کرنے لگا، لیکن وقت گزرتا گیا اور وہ نہ آیا۔ تب اس نے شریک بن عمرو سے کہا کہ اب تم اس کے بدلے میں قتل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس نے گردن جھکا دی۔ جلاّد تلوار لے کر اس کی گردن مارنے کے لئے تیار ہوا ہی تھا کہ دور سے دھول اڑتی دکھائی دی۔ غور سے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ کوئی گھوڑ سوار سرپٹ چلا آرہا ہے۔ قریب آیا تو معلوم ہوا کہ حنظلہ ہے۔ اس نے آتے ہی تاخیر کی معافی چاہی اور جلاد کے آگے گردن کر دی۔ المنذر پر ان دونوں کی دوستی، وفاداری، شرافت اور پاس عہد کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے دونوں کو بخش دیا، اور ہمیشہ کے لئے اس طرح قتل کرنے کی رسم کو ختم کر دیا۔

یہ قصہ جاہلی لوک کتھاؤں میں بہت مقبول اور مشہور ہے اور اسے اس طرح عربی رنگ میں بیان کیا گیا ہے کہ شبہہ بھی نہیں گزرتا ہے کہ یہ عربی لوک کتھا نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت ایک مشہور یونانی کہانی ہے جسے عربی جامہ پہنا کر معرب کر دیا گیا ہے۔

یا قبیلۂ بنی ضبۃ کے ایک شخص کا مشہور قصہ، جس کے سات لڑکے تھے۔ ایک دن ساتوں لڑکے کتوں کو لے کر شکار کے لئے گئے۔ جنگل میں آرام کرنے کے لئے وہ ایک غار میں گھس گئے۔ اتفاقاً پہاڑی پر سے ایک چٹان ٹوٹ کر غار پر گری اور سب کے سب گھٹ کر مر گئے۔ باپ بیٹوں کا انتظار کرتے کرتے جب تنگ گیا تو تلاش کرنے کے لئے نکلا، اور ان کے پاؤں کے نشانات پر چلتا چلتا جب غار کے پاس پہنچا تو نقشِ پا یہاں آکر ختم ہو گئے۔ آگے بڑھ کر جب غار کا منظر دیکھا تو ان کا انجام سمجھ میں آگیا۔ اور الٹے پاؤں گھر کو واپس لوٹ آیا، اور اس سلسلے میں چند شعر کہے۔ یہ قصہ بھی اسلوب بیان اور ماحول اور کردار کے اعتبار سے بالکل عربی نژاد معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت یہ مسیحی دور کے ابتدائی زمانہ کا ایک قصہ ہے جس کا عرب سرزمین سے کوئی تعلق نہیں!

اسی طرح عرا ن میں بہت سے ایرانی قصے مشہور تھے، جن کے متعلق بہت کم لوگ جانتے تھے کہ دراصل یہ قصے سرزمین ایران سے عرب پہنچے۔ کیونکہ جس شکل میں انھیں سنایا جاتا تھا وہ بالکل عربی تھا۔ فارسیت کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

اسلام کے آنے سے قبل تک یہ قصے کہانیاں دورِ جاہلیت کے دستور کے مطابق سینہ بہ سینہ منتقل

۱۔ فجر الاسلام، جلد اوّل، بحوالہ الاغانی، جلد ۱۹ اور الامالی للقالی، جلد ۱۔

ہوتی رہیں۔ لوگ اپنی بیٹھکوں، چوپالوں اور خاص مجلسوں میں مزے لے لے کر انھیں سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں بعض لوگ قصہ گوئی میں خاص شہرت پا چکے تھے، اور اسلامی زمانہ میں تو "قاص" قصہ گویوں کی ایک خاص صنف پیدا ہو گئی، جن کا کام ہی یہ تھا کہ وہ امراؤ، خلفاء اور اغنیاء کو دلیس بدلیس کے قصے کہانیاں ان کی تفنن طبع کے لئے یا عبرت و موعظت کے لئے سنایا کریں۔ تاریخوں میں آتا ہے کہ عہد اموی میں خلفاء بعض قصہ گویوں کو صرف اس غرض سے مقرر کرتے تھے کہ وہ مسجدوں میں لوگوں کو انبیاء اور بادشاہوں کے حالات بغرضِ عبرت و موعظت سنایا کریں[1]۔

ان قصے کہانیوں اور کچھ ادھر ادھر سے لی ہوئی داستانوں سے اسلامی زمانہ میں قصے کہانیوں کی "الف لیلہ و لیلہ" جیسی ضخیم کتابیں وجود میں آئیں جو آج بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور جو کہانی کے فنی معیار پر چاہے نہ اترتی ہوں لیکن جہاں تک زبان و اسلوب کا تعلق ہے ان میں ایسی روانی اور سلاست، اور بے ساختگی اور سادگی کے ساتھ پُرکاری ہے کہ زبان سے واہ نکل جاتی ہے۔

دورِ جاہلی کی نثر کی امتیازی خصوصیات

مذکورہ بالا صفحات میں نثر کی جن اصناف کا ہم نے مطالعہ کیا ہے ان کی روشنی میں جاہلی دور کی نثر کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ زمانۂ جاہلی کے فنکار الفاظ میں تناسب، توازن اور ان کے صوتی اثرات میں یکسانی اور یک رنگی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے جس طرح کے مناسب الفاظ ان کی سمجھ میں آتے اور زبان سے بے ساختہ بروقت نکل جاتے، استعمال کر لیتے تھے۔

۲۔ ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے مترادف اور ہم معنی جملے اور عبارتیں کم استعمال کرتے تھے۔

۳۔ اپنی عبارت کو دلکش، اسلوب بیان کو موثر اور سجع کو طلسماتی بنانے کے لئے کاہنوں اور بجھکڑوں کے برخلاف سوچ کر باتکلف جملے نہیں گڑھتے تھے۔

۴۔ جملے عام طور سے چھوٹے یا درمیانی ہوتے تھے۔ یہ بات خاص طور سے حکمت و فلسفہ، مقولوں، کہاوتوں اور وصیتوں میں ملحوظ رکھی جاتی تھی۔

۵۔ ایسی اختصار پسندی جس سے مفہوم خبط نہ ہو پسند کی جاتی تھی۔

۱۔ التوجیہ الادبی طٰہٰ حسین، ص ۱۷۔ مطبع امیریہ، قاہرہ ۱۹۴۰ء۔

۶۔ ایسی صراحت کے مقابلہ میں جس سے مفہوم میں پھیکا پن پیدا ہو جاتے، ایسے کنایہ کا زیادہ رواج تھا جس سے مفہوم کے سمجھنے میں دشواری بھی نہ ہو اور کنایہ کا لطف بھی بھرپور باقی رہے۔ چنانچہ اکثر ایسا کرتے تھے کہ جس چیز کی طرف اشارہ کرنا ہے عام طور سے صرف اس کی خاص امتیازی خصوصیات کا ذکر کر دیتے، کھل کر نام نہ لیتے۔ کہا کرتے تھے "الکنایۃ افضل من التصریح" کھل کر کسی شے کے بیان کرنے کے مقابلہ میں اس کی طرف بند لیکن واضح اشارہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔

۷۔ مشکل اور ادق نظریاتِ وافکار یا پیچیدہ اور گہرے معنی پیدا کرنے کی طرف جن میں ذہن اور عقل پر زیادہ زور دینا پڑے، دورِ جاہلیت میں فنکاروں کا رجحان کم تھا۔

۸۔ بدوی اور فطری زندگی کی محدود ضروریات اور گنے چنے نظریات اور سطحی افکار و خیالات کو فطری طریقہ سے بے ساختہ اور سادہ اسلوب میں بیان کیا جاتا تھا۔

اسی لئے اس زمانہ میں گہرائی فکر، ندرت بیان اور دقیق معنی و مطالب نہیں ملتے۔ مگر جہاں تک الفاظ و ترکیب کا سوال ہے۔ اپنی جگہ گٹھے اور چست ہوتے تھے۔

۹۔ عبارتوں میں کبھی باموقعہ اور کبھی نسبتاً بے موقع بھی، کبھی ضرورتاً اور کبھی بے ضرورت بھی، کہاوت، ضرب المثل یا بانیوں کو استعمال کرتے تھے۔

تحریر یا کتابت دورِ جاہلی میں

رسم الخط کیا ہے؟

تحریر یا کتابت سے مراد رسائل (خطوط، نوٹس وغیرہ) یا کتابوں کا لکھنا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ لکھائی کسی چیز پر کسی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے معین قسم کے نشانات یا نقوش بنانے کا نام ہے۔ ان معین نشانات یا مقررہ نقوش کا اصطلاحی نام رسم الخط ہے۔ طرز تحریر سب سے پہلے کیسے وجود میں آئی، کسی خاص مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کسی خاص نشان کو کیسے متعین کیا گیا اور پھر مختلف نقوش یا نشانات یکجا ہو کر پورے جملے کا مفہوم کس طرح دینے لگے۔ اس کی دلچسپ کہانی ہے۔ جسے بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ جرجی زیدان نے اپنی کتاب "فلسفۃ اللغۃ" میں رسم الخط کے ایجاد کے مختلف مراحل بیان کئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور سے رسم الخط چار مرحلوں سے گزر کر اپنی اصلی شکل و صورت یعنی حروف و الفاظ کے قالب میں ظاہر ہوا ہے۔ پہلا مرحلہ اپنی بات کو تصویر کے ذریعہ سمجھانے کا تھا۔ اشیاء کی یہی تصویریں ایک زمانے کے استعمال کے بعد رفتہ رفتہ ترقی کرتی ہوئی حروف اور حروف سے الفاظ کا جامہ پہننے لگیں اور ہمارا موجودہ رسم الخط وجود

میں آگیا۔[1]

قوموں کو رسم الخط کے ایجاد کرنے کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے، جب ان کے یہاں تہذیب و تمدن جنم لیتا ہے۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں ترقی ہوتی ہے۔ اور حکومت اور نظام حکومت کو ٹھوس بنیادوں پر مستحکم اور استوار کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ آج سے ہزاروں سال پہلے مصریوں نے جب تہذیب و تمدن، صنعت و حرفت اور جہاں بانی و حکمرانی میں ایسی ترقی کر لی کہ شاید ہم اب بھی اس درجہ پر نہیں پہنچ سکے ہیں تو انھوں نے دل کی بات بتانے اور انھیں لکھ کر ادا کرنے کے لئے نشانات یا مخصوص نقوش بنانے کا ایک خاص طریقہ ایجاد کیا جسے عرف عام میں رسم الخط "ہیروغلیفی" یا قدیم مصری تحریر کہتے ہیں۔
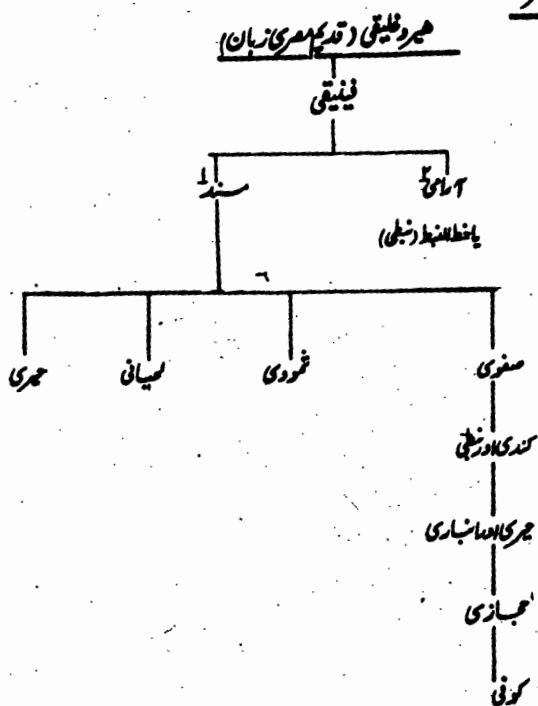
اس قدیم مصری طرز تحریر سے ہمارے عربی رسم الخط کا سلسلہ جا ملتا ہے۔ وہ اس طرح کہ قدیم مصری رسم الخط سے خط فینیقی نکلا[2] اور اس سے خط آرامی[3] اور مسند نکلا، خط مسند کی جائے پیدائش یمن ہے۔ ڈاکٹر جواد علی نے "تاریخ العرب قبل الاسلام ج ۷، ص ۵۵، پر یہ لکھا ہے کہ بعض علماء کا خیال ہے کہ مسند کی اصل "کتاب سینا" پر ہے جس میں ایسے کتبے ملے ہیں جو جنوبی عربی کتبوں سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ تیسرا نظریہ خط کنعانی سے مسند کے نکلنے کا ہے۔ خط مسند کی پھر کئی اور مختلف قسمیں ہو گئیں۔ چنانچہ جزیرۂ عرب کے شمالی حصہ میں رسم خط صفوی، ثمودی اور لحیانی کا رواج رہا اور جنوبی حصہ میں نبیری کا۔

عربوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنا حجازی رسم خط، حیرہ اور انبار کے لوگوں سے لیا ہے۔ اور انھوں

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: فلسفۃ اللغۃ، جرجی زیدان Dr Chayne :- The Arabic Language فقہ اللغۃ ۔ ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی، لجنۃ البیان العربی، القاہرہ۔

۳۔ علم اللغۃ، ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی، مکتبۃ النہضۃ مصر، القاہرہ۔

۲۔ "فینیقی، کنعان میں رہتے تھے۔ یہ علاقہ جبل لبنان سے ملا ہوا بحر روم کے ساحل پر واقع تھا۔ فینیقیا، دراصل یونانی لفظ ہے اسے سب سے پہلے یونانیوں نے ان کنعانیوں کے لئے استعمال کیا، جو "لال ارجوان" لال کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی کنعانیوں کی طرح مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔" (محمد ادیب العامری) مجلۃ الادیب، اکتوبر ۱۹۷۰ء۔ تفصیل کے لئے ڈاکٹر ہٹی کی کتاب HISTORY OF THE ARABS ملاحظہ کیجئے۔

۳۔ آرامی قدیم سامی قوموں کو کہتے ہیں۔ یہ لوگ فلسطین، شام اور عراق میں رہتے تھے

عربی رسم الخط کا شجرہ

۱۔ خط مسند یمن میں پیدا ہوا، اور قبل میلاد مسیح سے جزیرہ نمائے عرب میں مستعمل تھا، اور یہ خط آرامی کے مقابلے میں زیادہ قدیم خط ہے، اور یہ فینیقی ابجد سے ایک ہزار سال قبل مسیح نکلا تھا۔ (جواد ج ۷، ص ۳۰)

۲۔ خط آرامی یا نبطی خط مسند سے متاخر ہے، لیکن یہودیوں اور نصرانیوں کے واسطے سے جو بنی ارم کے طرز تحریر پر لکھتے تھے جنوبی عربوں کو چھوڑ کر جاننا اور بقیہ جزیرہ کے عربوں میں یہ رسم خط آیا۔ اس خط نے خط مسند کو ختم کر دیا اور زمانۂ اسلام میں نبطی یا آرامی رسم خط پر لکھائی شروع ہو گئی۔ (جواد: ج ۱، ص ۳۰)

نوٹ: رسم الخط العربی الشمالی (حجاز و مکہ وغیرہ) کو مرامر بن مرۃ، اسلم بن سدرۃ، اور عامر بن جدرۃ نے ایجاد کیا تھا۔

نے کندہ[1] اور نبط[2] سے اور ان لوگوں نے خط مسند سے۔ اس طرح عربی رسم الخط کا سلسلہ مسند سے جا ملتا ہے اور اسی خط مسند سے لحیانی اور خط ثمودی اور خط صفوی نکلے ہیں، کیونکہ مسند سب سے قدیم اور زیادہ رواج یافتہ رسم خط تھا۔ (ڈاکٹر جواد علی: ج ۱۲، ص ۵۴) اپنے دعوی کے ثبوت میں وہ کہتے ہیں کہ خط مسند کی بعض شاخیں نبطیوں کی سرزمین اور اس کے شمالی حصہ میں ملی تھیں۔ جیسے صفوی کہ یہ اپنی اصلی زبان فینیقی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس کے علاوہ حروف ردف جیسے ثخذ، ضظغ صرف خط مسند میں ملتے ہیں اور آرامی میں نہیں ملتے۔ علاوہ ازیں تمام عرب راویوں کا اتفاق ہے کہ عربی رسم خط، حیری اور انباری رسم خط سے لیا گیا ہے اور دونوں کو کندیوں اور نبطیوں نے مسند خط سے نکالا تھا۔ خط کوفی جس کو ایک الگ رسم خط سمجھ لیا گیا ہے درحقیقت حجازی ہی کی ایک شکل ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حجازی سادہ طرز تحریر ہے اور کوفی میں جیومیٹری کے قاعدوں کے مطابق آرائش وزیبائش پیدا کر دی گئی ہے۔

بعض عرب قبائل جن میں لکھنے کا رواج تھا

تحریر یا کتابت کو اپنی محدود اور ابتدائی ضرورتوں میں استعمال کرنے کے بعد قومیں اس کے ذریعہ اپنی تاریخ، اپنا ادب، اپنی تہذیب وتمدن کی امتیازی خصوصیات اور دیگر علوم وفنون مرتب کرتی ہیں اور یہ منزل اس وقت آتی ہے جب قوموں میں تہذیب وتمدن، علم وفن، تجارت، حرفت اور مستحکم حکومت ونظام سلطنت قائم ہو چکتا ہے۔ چنانچہ عربوں کے جن قبیلوں میں جس حد تک یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں اس حد تک ان کے یہاں تحریر یا لکھائی کی کارفرمائی رہی ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ اسلام سے پہلے جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں تبع قوم اور شمال میں غسانی اور منذری سارے عرب قبائل میں تہذیب

۱۔ ابن عباس سے جب عربی رسم الخط کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قریش نے عربی رسم خط حرب بن امیہ سے سیکھا اور اس نے عبداللہ بن جدعان یا بشر بن عبدالملک سے، جو دومۃ الجندل والی اکیدی کا بھائی تھا۔ بشر مکہ میں آیا اور حرب بن امیہ سے رشتہ قائم کیا اور قریش کی ایک جماعت کو لکھنا سکھایا اور ان دونوں نے حیرہ اور انبار کے لوگوں سے لکھنا سیکھا جہاں کندہ قبیلہ کا ایک آدمی یمن سے آ گیا تھا۔ اور یمنی بہت پہلے ہی سے لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

نبطیوں کی سلطنت پہلی صدی قبل مسیح شمالی حجاز سے لے کر دمشق تک پھیلی ہوئی تھی اور مدین، صبح غصبہ، حجر، فلسطین اور حوران پر ان کا قبضہ تھا۔

وتمدن اور علم وفن کے اعتبار سے ترقی یافتہ تھے۔ تبع قوم میں مسند اور حمیری، منذریوں اور غسانیوں کے یہاں انباری رسم خط کا رواج ایک عرصہ دراز سے چلا آرہا تھا۔ اس لئے گمان یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کارناموں اور علوم وفنون کو مدوّن کیا ہوگا۔ لیکن ان کے نمونے زمانے کی دست برد کی نذر ہوگئے اور ہم تک نہ پہنچ سکے۔ البتہ ان کی تحریر کے نمونے ان کی قبروں، ان کی رہنے کی جگہوں اور بستیوں سے کھدائی کے بعد نکلی ہیں۔ ماہرین نے ان کی بستیوں، گھروں اور رہن سہن کے طریقوں کا مطالعہ کرکے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ انھوں نے اپنی ان تحریروں میں اپنا علمی سرمایہ بھی چھوڑا ہوگا۔ مگر وہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ ممکن ہے آئندہ جو کھدائیاں ہوں، ان میں ان کی لکھی ہوئی چیزیں دستیاب ہو جائیں، جس طرح ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۶ء تک کی دجلہ کے ساحلی علاقوں کی کھدائیوں میں تقریباً چار ہزار سال پرانی تحریریں تختیوں پر کندہ برآمد ہوئی ہیں اور ان سے مسماری طرز تحریر کا اندازہ ہوتا ہے۔ جو کیل کی طرح لکھی جاتی تھی۔ یا جزیرۂ عرب کے شمالی حصہ یعنی "مدائن صالح" میں جو کتبے اور تحریریں برآمد ہوئی ہیں، ان سے ۱۰۰ قبل مسیح سے لے کر ۰ے ق،م تک کی تحریروں کا اندازہ ہوتا ہے۔[1]

عہد جاہلیت کے نثر نگار

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ دور جاہلی میں لکھنے والے ضرور رہے تھے۔ لیکن گردش زمانہ اور عربوں کے مخصوص حالات کی وجہ سے ان لکھنے والوں کے حالات اور ان کے نمونے ہم تک نہیں پہنچ سکے۔ البتہ دو آدمیوں کے ناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان میں ایک لقیط بن العمیر الایادی ہے اور دوسرا عدی بن زید العبادی[2] اور اس کا ایک لڑکا۔ ان تینوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسریٰ انوشیرواں کے دربار میں محرّر اور مترجم تھے۔

---

۱ حوالے اس کتاب کے ص پر ملاحظہ کیجئے۔ DRIVER: SEMITIC WRITING FROM PICTOGRAPH TO ALPHABETS LONDON

۲۔ جاحظ نے اس کے متعلق البیان والتبیین میں مختلف جگہ لکھا ہے۔ جلد ۲، ص ۳۲۳ میں اس کا شعر بھی نقل کیا ہے جس میں کہتا ہے:۔

وابیضاض السواد من نذر الموت وھل مثله لحی نذیر

نیز جاحظ نے ابو ایاس النصری سے روایت کی ہے کہ اس نے کہا "کانوا یقولون اشعر العرب ابو دواد الایادی وعدی بن زید العبادی" ج اول، ص ۹۰

جزیرہ نمائے عرب کے شمال اور جنوب کے علاوہ باقی عرب جیسے مصر کے عام باشندے، قحطان کے قبیلے، اور وسطی جزیرہ کے بدو، تو یہ لوگ عام طور سے ان پڑھ تھے اور لکھنے پڑھنے سے نابلد۔ ان لوگوں کے یہاں لکھنے پڑھنے کا رواج جاہلی دور کے آخر زمانہ میں شروع ہوا ہے۔ چنانچہ عمرو بن معدی کرب کے بیان میں گزر چکا ہے کہ اس نے سب سے پہلے اپنے خطوط میں "باسمک اللھم" اے اللہ تیرے نام سے شروع کرتا ہوں، اور اما بعد، لکھنے کا رواج ڈالا[1]۔ بعض لوگوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ "من فلاں إلی فلاں" یعنی فلاں از فلاں کا رواج بھی جاہلی دور کے اسی اخیر زمانہ میں پڑا ہے۔ عربوں کے اس گروہ میں صحیح معنوں میں پڑھنے لکھنے کا رواج اسلام کے آنے کے بعد پڑا۔ اور پھر انھوں نے اس میں ایسی ترقی کی کہ سارے قبیلوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

۱۔ قریش بعثت نبوی سے پہلے ہی سے "باسمک اللھم" لکھا کرتے تھے اور اس کا ایک دلچسپ سبب اس واقعہ کو بھی بیان کیا جاتا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ امیہ بن ابی الصلت قریش اور قبیلہ ثقیف کے ایک قافلے کے ساتھ ملک شام تجارت کی غرض سے گیا تھا۔ واپسی میں ایک منزل پر ٹھہرے تو رات کو کھانا کے وقت ایک سانپ نکل آیا، جسے ان میں سے کسی نے ایک پتھر مارا، چنانچہ وہ بھاگ گیا۔ کھا پی کر چلے تو ایک بڑھیا دکھائی دی، اس نے ان سے کہا کہ تم نے رحیمہ کو کھانا کیوں نہیں کھلایا؟ لوگوں نے کہا کہ تو کون ہے؟ تو بولی کہ میں "ام العوام" ہوں۔ ایک مدت سے بیوہ ہو چکی ہوں۔ خدا کی قسم تم لوگ ادھر ادھر مارے مارے ہی پھرتے رہو گے۔ اس کے بعد اس نے اپنا عصا زمین پر مارا اور سارے اونٹ بھاگ گئے۔ یہ بیچارے انھیں دن بھر ڈھونڈتے رہے، جب رات کو سب اونٹوں کو جمع کر کے چلنے کے لئے تیار ہوئے تو پھر وہی بڑھیا آگئی اور پھر اس نے وہی حرکت کی اور پھر سارے اونٹ بھاگ کر صحرا میں تتر بتر ہو گئے۔ انھوں نے پھر دن بھر انھیں ڈھونڈا اور رات کو جب چلنے کے لئے تیار ہوئے تو پھر بڑھیا آگئی اور اس نے پھر وہی حرکت کی۔ اب امیہ اس طرف گیا جہاں سے بڑھیا آئی تھی، وہاں اس نے ایک بزرگ نے کہا کہ اب کی مرتبہ جب بڑھیا یہ حرکت کرے تو تم کہنا "سبعًا من فوق و سبعًا من اسفل باسمک اللھم" چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، پھر بڑھیا کا جادو نہ چل سکا۔ یہاں سے جب مکہ پہنچے اور سب کو یہ قصہ بتایا تو قریش نے "باسمک اللھم" لکھنا شروع کیا۔

تفصیل کے لئے دیکھئے: الاغانی، للاصفہانی ــــــ مروج الذھب للمسعودی
صبح الاعشی، للقلقشندی ــــــ الجمھرۃ رسائل العرب لاحمد صفوت۔

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، زمانۂ جاہلیت میں جنوب کے عرب یعنی یمنی اور شمال کے عرب یعنی منذری اور غسانیوں نے تہذیب و تمدن، حکومت و سطوت میں خاص ترقی کر لی تھی۔ اس لئے ان کے یہاں طریقۂ آبپاشی، فن تعمیر، حساب، طب، جانوروں کا علاج معالجہ اور کھیتی باڑی کے علوم خاص طور سے ترقی یافتہ تھے۔ یہ لوگ چونکہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اس لئے قیاس یہ ہے کہ ان لوگوں نے ان علوم و فنون میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوگا۔ مگر جیسا کہ پہلے بیان ہوا وہ زمانہ کے دست برد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اس کے باوجود جن علوم کا سراغ ملا ہے، اس کی تفصیل پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

چوتھا باب

جاہلی زمانہ میں شعر و شاعری

گزشتہ صفحات میں ہم نے بیان کیا ہے کہ کلام کے دو حصے ہیں، ایک نثر اور دوسرا نظم یا شعر
جاہلی زمانہ میں نثر اور اس کی قسموں کا تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد اب ہم اس دور کے شعر و شاعری کا
مطالعہ کریں گے اور سب سے پہلے یہ معلوم کریں گے کہ عربی زبان میں شعر کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی
کیا ہیں اور وہ کیا موضوعات ہیں جن سے دور جاہلی میں عرب شاعروں نے بحث کی ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھیں
گے کہ عربی زبان میں کن شعرا نے سب سے پہلے شعر کہے اور کن شعرا نے اسے بام عروج تک پہنچایا۔

دنیا کی قوموں میں شاید عرب وہ قوم ہے جسے شاعری کا ذوق فطری طور پر ملا ہے۔ یہ قوم بدوی
زندگی گزارتی تھی۔ جن میں اس کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی نہ حاکم نہ حاکم کی عملداری۔ اس قوم کے افراد
آغوش فطرت میں آنکھیں کھولتے تھے اور اسی آغوش میں پروان چڑھتے تھے۔ حد نگاہ تک پھیلا ہوا صحرا
تیز اور جھلسا دینے والا سورج، تند اور تیز آندھیاں، چمکتا دمکتا چاند، ہنستے مسکراتے ستارے، نشیلی صبحیں
اور پرکیف شامیں، ان کا سرمایہ فکر و نظر تھیں اور یہ سرمایہ ایسا ہے جس کی نہ انتہا ہے اور نہ جسے زوال۔
چنانچہ عربی اپنی اس فطری زندگی اور فطری ماحول میں ڈوب کر اور ان سے متاثر ہو کر اپنے احساسات اور
خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ زبان اتنی شیریں اور پر تاثیر ملی تھی کہ خیالات و افکار کی سادگی اور انکی واقعیت
الفاظ کی خوبصورتی، اثر اندازی اور موسیقیت سے جب ہمکنار ہوتی تھی تو جادو بن جاتی تھی۔ یہی وجہ
ہے کہ دور جاہلی کے شعر و شاعری کا جو سرمایہ ہم تک پہنچا ہے وہ بہت موثر، رفیع اور دلکش ہے۔

مگر قبل اس کے کہ ہم اس دور کے شعری سرمایہ کا مطالعہ کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ

دیکھیں کہ عربوں کے نزدیک شعر کا مفہوم کیا ہے۔

شعر کی تعریف

شاعری ان فنونِ لطیفہ میں سے ایک فن ہے جسے عربوں نے "ادب عالیہ" کا نام دیا ہے اور جس میں شعر کے علاوہ نقاشی، پینٹنگ اور موسیقی بھی آتی ہے۔ ماہرین عروض نے شعر کی تعریف یوں کی ہے کہ "شعر موزوں و مقفیٰ کلام کو کہتے ہیں" مگر یہ تعریف ناقص ہے کیونکہ اس طرح ہر قسم کا کلام جس میں "وزن اور قافیہ" ہو، وہ شعر ہو جائے گا حالانکہ ایسا نہیں۔ کیونکہ نقاد کہتے ہیں کہ اگر جغرافیہ کے مسائل یا صرف و نحو کے قواعد یا تاریخی واقعات یا اقتصادی مسائل کو وزن و قافیہ کے قالب میں ڈھال دیا جائے تو بھی ہم اسے شعر نہیں کہیں گے، وہ منظوم فن یا موضوع تو ہو سکتا ہے مگر اسے شعر کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے وہ ادب کا حصہ نہیں بن سکے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خیال یا حقیقت کو صرف نظم کر دینا شعر ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ اور خصوصیات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ خصوصیات کیا ہیں؟ وہ ہیں "اچھوتے خیالات و افکار، لطیف جذبات و احساسات" کی ایک خاص نہج سے تعبیر۔ چنانچہ یہ نقاد شعر کی یوں تعریف کرتے ہیں "شعر وہ فصیح و بلیغ کلام ہے جس میں وزن کے علاوہ نادر اور اچھوتے خیالات اور لطیف جذبات و احساسات کی عکاسی اس طرح کی گئی ہو کہ انسان کے دل و دماغ پر براہِ راست اس کا اثر پڑے۔

ان نقادوں کے نزدیک شعر کے اجزائے ترکیبی میں چونکہ ندرت خیال اور لطافت جذبات و احساسات اور وزن کے ساتھ اثر اندازی کو اولیت حاصل ہے اس لئے اس میں سے بعض نے ہر اس کلام کو جس میں یہ صفات موجود ہوں شعر کا نام دیدیا ہے، چاہے وہ نثر ہی کیوں نہ ہو۔ اور اپنے دعویٰ کے ثبوت میں حضرت حسان کا وہ قول نقل کرتے ہیں، جس میں انھوں نے اپنے بیٹے کے نثر میں کہے گئے جملوں کو سن کر کہا تھا کہ "رب کعبہ کی قسم یہ تو شعر ہے" [1]

1۔ اس جملہ کے کہنے کی تقریب یہ ہے کہ حضرت حسان کے بیٹے کو کسی کیڑے نے کاٹ لیا تھا۔ اس کا نام وہ نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا نقشہ یوں کھینچا کہ "وہ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ وہ حیرہ کی دو چادروں میں لپٹا ہوا" "کانہ ملتف فی بردی حبرۃ" حیرہ کی چادریں نقش و نگار اور خوبصورتی میں اس زمانے میں بہت مشہور تھیں۔ موقع و محل کے لحاظ سے یہ انداز بیان اتنا خوبصورت اور دلنشین تھا کہ حضرت حسان بے ساختہ کہہ اٹھے کہ "شعر و رب الکعبہ"۔

مگر انسانی جذبات اور مشاعر میں اس وقت تک ہیجان یا بیداری پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ شاعر اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر خوبصورت اور چیدہ الفاظ اور وزن و قافیہ کے تانے بانے سے معانی میں ہم آہنگی پیدا کر کے سامع یا قاری کے دل کے تاروں کو جھنجھنا نہ دے۔ اسی وجہ سے اگر علوم و فنون کو نظم کر دیا جائے تب بھی انھیں شعر کا درجہ نہیں دیا جاتا، کیونکہ یہ نظم درحقیقت ایسے حقائق کا بیان ہوگا جس میں تخیل اور تاثر کا فقدان ہوگا، جو جذبات میں تغیر پیدا کرنے کے محرکات ہیں۔ پھر حقائق ثابتہ کے علم سے انسانی جذبات یا مشاعر میں کوئی ہیجان یا تغیر نہیں پیدا ہوتا کیونکہ یہ حقائق دلیل اور شواہد سے ثابت کئے جاتے ہیں اور ان کے لئے منطق و فلسفہ کی ضرورت ہے جو عقل کو قائل کر کے دعوی کو تسلیم کراتی ہے۔ اس کے برخلاف شعر میں منطق و فلسفہ سے استدلال نہیں کیا جاتا کہ اس کا مخاطب عقل نہیں بلکہ انسانی جذبات یا مشاعر ہیں جن کی آماجگاہ دل ہے۔ اور دل کی اندرونی کیفیات کو متاثر کرنے کے لئے دل ہی سے نکلی ہوئی چیز یعنی خیال اور اس کی رفعت اور ندرت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے شعر کی صحیح ترین اور مکمل ترین تعریف یہ ہوگی کہ "شعر وہ موزوں اور مقفی کلام ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلے اور انسان کے جذبات اور احساسات کو بھڑکا دے" یعنی اس میں اتنا زور اور اتنا تاثر ہو کہ انسانی جذبات اور مشاعر میں ایک ہیجان سا برپا ہو جائے۔ اس اثر اور ہیجانی کیفیت کے پیدا کرنے میں خوبصورت اور چیدہ الفاظ وہی رول ادا کرتے ہیں جو ساز و گانے کے الفاظ میں۔ اسی لئے جب بلند خیال اور خوبصورت الفاظ کا حسین امتزاج، وزن کے قالب میں ڈھل جاتا ہے تو جادو کا سا اثر پیدا کر دیتا ہے۔ اور جب یہ مرقع انسانی زندگی کے کسی گوشہ کی عکاسی کرنے لگے تو پھر یہ سحر حلال بن جاتا ہے جو معراج فن اور حاصل شاعری ہے کہ "شعر کے معنی ہیں دل سے کسی بات کو محسوس کرنا"[1] اور اس طرح موزوں کئے ہوئے کلام کو اصطلاح میں "شعر فنی" کہتے ہیں۔

۱۔ شعر کی تعریف، اس کی ماہیت سے متعلق ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) نقد النثر اور نقد الشعر، نقدامہ بن جعفر (عرب نقادوں میں اسی نے سب سے پہلے شعر کی تعریف کی ہے)

(۲) عیار الشعر لابن طباطبا۔

(۳) الشعر والشعراء لابن قتیبہ

(۴) العمدۃ لابن رشیق القیروانی

(۵) اسس النقد الادبی عند العرب۔ دکتور احمد احمد بدوی، مطبوعہ مصر ۱۹۶۴ء

شعر فنی کے عناصر ترکیبی

شعر فنی کے اجزائے ترکیبی تین متعین کئے گئے ہیں:

۱۔ ایسے معانی اور مطالب کا پایا جانا جنھیں خیال نے جنم دیا ہو۔

۲۔ ایسے خوبصورت اور چیدہ الفاظ کا پایا جانا، جن سے شعر کے تخیل اور موسیقیت میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

۳۔ ان الفاظ کا ایک خاص سج دھج سے اس طرح ترتیب دینا کہ ان کے ذریعہ اثر اندازی کی شان دوبالا ہو جائے اور یہ صفت "وزن" کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے۔

یہاں پر ایک بات ذکر کر دینا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض لوگوں نے وزن کو شعر کے لئے ضروری نہیں قرار دیا ہے۔ لیکن اکثر عرب اور مغربی نقادوں نے اس کو شعر کا لازمی عنصر قرار دیا ہے۔ کیونکہ بقول میتھو آرنولڈ "وزن فنی تکمیل کا ایک عنصر ہے" جب سے انسان نے انسان کی حیثیت سے زندگی شروع کی، اس نے اپنے قلبی احساسات کو مترنم انداز میں ادا کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ وزن اور قافیہ کے خلاف کوششوں کے باوجود دنیا کی زبانوں میں عام طور سے اور عربی زبان میں خاص طور سے وزن کی ضرورت اور اس کی ہمہ گیری بدستور قائم رہی اور آج بھی موزوں و مقفیٰ اشعار کا ہی بول بالا ہے۔ آزاد نظم کی تحریک پروان نہ چڑھ سکی۔

عربی زبان میں شعر کی ابتدا کیسے ہوئی؟

اس بات میں عام طور سے مورخین اور نقادوں میں اختلاف ہے۔ کہ عربی زبان میں شعر کی ابتدا کیسے ہوئی۔ بعض کہتے ہیں کہ عربوں نے سب سے پہلے نثر شروع کی اور اس کے ذریعہ اتفاق سے شعر تک پہنچ گئے۔[1]

بعض کہتے ہیں کہ سجع کے بعد مقفیٰ و موزوں کلام کا دور آیا۔ بہر حال یہ بات متفقہ ہے کہ سب سے پہلی چیز جو شعر سے ملتی جلتی تھی وہ مسجع جملے تھے۔ جنہیں عام طور سے کاہن (پروہت یا سادھو قسم کے دینی پیشوا) اور دانشور لوگ کہا کرتے تھے۔ یہ مقفیٰ جملے ہوتے تھے، جنھیں منتروں کی طرح عبادت گاہوں میں دعا وغیرہ کے موقع پر کہا جاتا تھا۔ یا ان کے ذریعہ حکمت و فلسفہ کی باتوں کو زبانی

یاد کر لیا جاتا تھا۔ یا وہ علوم جن کو عرب یاد رکھنا چاہتے تھے، انھیں سجع اور مختصر جملوں میں زبانی یاد کر لیتے تھے[1] اس سجع میں رفتہ رفتہ وزن اور قافیہ کا اضافہ ہوا۔ وہ اس لئے کہ یہ مختصر اور جامع کلمات سننے میں کانوں کو بھلے لگتے تھے اور جب ان میں وزن اور ایک آواز پر آخری الفاظ ٹوٹنے سے ترنم سا پیدا ہو گیا تو شعر کی ابتدائی قدیم شکل یعنی وزن پیدا ہوا۔ جسے "رجز" کہتے ہیں۔ اس رجز کے ایجاد کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔

کہتے ہیں کہ مضر بن نزار اپنے اونٹ پر سے ایک دفعہ گر پڑا اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا، لوگ جب اسے اٹھا کر لے چلے تو شدت تکلیف سے اس نے چلا کر کہنا شروع کیا۔ "وا یداہ وا یداہ" یعنی ہائے میرا ہاتھ، ہائے میرا ہاتھ۔ آدمی خوش گلو تھا۔ چنانچہ جب اس کے منہ سے ایک خاص زیر و بم اور خاص وقفہ سے یہ الفاظ نکلنے لگے، جن میں تکلیف اور درد کی وجہ سے سوز بھی پیدا ہو گیا تھا۔ تو اونٹوں نے انھیں غور سے سنا اور آواز کے پیچھے تیز چلنے لگے۔ اس سے عربوں کو پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ اگر اس طرح کی آواز اس انداز سے نکالی جائے تو اونٹ تیز چلنے لگتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مضر کے جملے کے مطابق "ھایدا، ھایدا" کی آواز منہ سے نکالی اور محسوس کیا کہ اونٹوں پر اچھا اثر ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا رواج پڑ گیا اور اس طرح آواز پیدا کر کے اونٹوں کو تیز چلانے کے لئے "حدی خوانی" کی اصطلاح بنی جو دراصل گانے کی ایک شکل تھی اور اسی گانے کو رجز کہتے ہیں۔ رجز کے لفظی معنی ہیں اونٹ کا چلنا اور اس کا ہلنا۔[2]

رجز کی ایجاد کے بعد اس میں اور ترقی ہوئی اور دوسرے اوزان اور بحریں پیدا ہوئیں۔

۱۔ سجع کی تعریف کے لئے دیکھئے اس کتاب کا صفحہ۔ ا۔ سجع دراصل فاختہ یا کبوتری کی آواز کو کہتے ہیں جو عام طور پر ایک ہی زیر و بم سے بولتی ہے اور بڑی پرسوز ہوتی ہے۔

۲۔ رجز کی مثال:۔ رجز کی یہ بحر اونٹ کی آہستہ چال سے ملتی جلتی ہے۔

راجز نے کہا ہے:۔

دع المطایا تنسم الجنوبا ان لها لنبا عجیبا	حنینها وما اشتکت لغوبا
یشهد ان قد فارقت حبیبا ما حملت الا فتی کئیبا	یسومها اعلنت نصیبا
لو ترک الشوق لنا قلوبا اذن لآثرنا بهن النیبا	ان الغریب یسعد الغریبا

چنانچہ رزمیہ اور فخریہ موقعے کے لئے الگ وزن ایجاد ہوا۔ اور غزل وغیرہ کے لئے الگ اور اسی طرح رفتہ رفتہ عربی شاعری کی ساری بحریں پیدا ہوئیں، جن کی تعداد خلیل بن احمد کے نزدیک پندرہ ہے۔ مشہور نحوی اخفش نے ایک اور بحر کا اضافہ کیا جس کا نام اس نے متدارک رکھا۔

" سجع" اور اس کے بعد " رجز" دونوں میں باعث کشش وہ نغمگی یا موسیقیت ہے جو کلام کے کسی اور نمونے میں اس وقت تک نہیں ملی تھی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ گانے اور شعر کا چولی دامن کا ساتھ ہے، بلکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان کی اس فطری خواہش کا کہ وہ اپنے لطیف جذبات کا اظہار خوبصورت اور دلکش آواز میں یعنی گا کر کرے شعر کہنے سے گہرا تعلق ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انسان نے سب سے پہلے گا کر اپنے دل کی بات اپنے معبودوں سے اور اس کے بعد اپنے بادشاہوں سے کہی۔ چنانچہ یونانیوں اور رومایوں کے یہاں کہتے تھے "شعر گایا" "شعر موزوں کیا یا شعر کہا" نہیں کہتے تھے۔ اسی طرح عربی میں بھی "انشد الشعر" یعنی لحن کے ساتھ گا کر شعر پڑھا، ابھی تک استعمال ہوتا ہے۔

عربوں میں گا کر شعر پڑھنے کا رواج جاہلی زمانہ سے چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ الاعشیٰ کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اپنا کلام گا کر سنایا کرتا تھا اور اسی لئے عربوں نے اس کا نام "صناجۃ العرب" یعنی عربوں کا جھانجھ" (باجا) رکھا تھا۔ بعد کے زمانوں میں بھی اشعار کو گا کر سنانے کا رواج قائم رہا۔ ہارون رشید کے متعلق مشہور ہے کہ وہ مدحیہ قصائد گوا کر سنا کرتا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں رواج تھا کہ جس شاعر کی آواز اچھی نہیں ہوتی تھی وہ خوش گلو کمسن لڑکوں سے اپنا کلام پڑھواتا تھا۔

ایک زمانہ کے بعد شعر میں سے گانے کا عنصر ختم ہو گیا اور شعرا نے اس کی کوشش کی کہ مروجہ بحروں میں سے ان بحروں میں شعر کہیں، جن میں موسیقیت کا پہلو غالب ہو تا کہ عہد اول میں جس طرح رکیک کلام کو بھی نغمگی، نہ موسیقیت کے ذریعہ دلکش بنا دیا جاتا تھا، اس کی ضرورت نہ رہے۔ اور شعر خود ہی اس قدر موسیقیت لئے ہوتے اور سامعہ نواز ہو کہ بغیر ساز و آہنگ کے بھی دلکش اور موثر رہے چنانچہ یہیں سے شعر فنی اور گانے کی راہیں جدا جدا ہو گئیں۔ اور دونوں قسموں کے لکھنے کے طریقے بھی الگ ہو گئے۔ یہی صورت حال آج تک قائم ہے۔[1]

۱- گانے اور شعر کے بارے میں ملاحظہ فرمائیے: (۱) الفن ومذاہبہ، ڈاکٹر شوقی ضیف

اور "الشعر والغنا فی مکۃ والمدینہ"۔

(۲) ترجمہ حسین نصار۔ H.G. FARMER HISTORY OF ARABIC MUSIC

(۳) المتوجہ الادبیہ۔ طہ حسین وغیرہ (۴) تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، جرجی زیدان، جلد ۱۔

شعر کی تقسیم

شعر کو مندرجہ ذیل تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مگر یہ تقسیم عربی ادب میں مغربی ادب سے لی گئی ہے ورنہ زمانہ جاہلیت میں یہ اصناف معروف نہ تھے اور نہ شعر سے متعلق اس زمانے میں ذہن اتنا واضح تھا۔ ہم نے اس تقسیم کو اس لئے اپنایا ہے کہ اس سے دورجاہلی کو سمجھنے اور پرکھنے میں مدد ملے گی اور یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ اس تقسیم کے مطابق جاہلی شعروشاعری پوری اترتی ہے کہ نہیں اور یہ کہ ان اصناف میں سے کون سے اصناف دورِ جاہلی میں پائے جاتے تھے اور کون سے نہیں اور پھر اس کی وجہ کیا تھی![1]

۱۔ رزمیہ یا الشعر القصصی

۲۔ تمثیلیہ یا الشعر التمثیلی

۳۔ طربیہ یا الشعر الغنائی

۱۔ رزمیہ یا الشعر القصصی

رزمیہ یا الشعر القصصی اس نظم کو کہتے ہیں جس میں جنگ کے واقعات اور بہادری کے کارناموں کا ذکر ہوتا ہے یعنی ایسے اشعار جن میں ہیرو کے بہادری کے کارنامے بیان کئے جاتے ہیں۔ عام طور سے شعرا اپنے ہیرو کے کارناموں کا ذکر کرتے وقت مافوق الفطرت اوصاف کو بھی اس سے منسوب کر دیتے ہیں اور یہ مافوق الفطرت باتیں عام طور سے بے محل یا بُری نہیں لگتیں کیونکہ شاعر اس میں اپنی قوت متخیلہ کا سہارا لے کر انھیں اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس میں عظمت وشوکت کا پہلو دوبالا ہو جائے۔ کیونکہ رزمیہ شاعری میں عظمت اور شان وشوکت اصل چیز ہوتی ہے اور یہ بغیر قوت متخیلہ کا سہارا لئے پیدا نہیں ہو پاتی۔ اس قوت متخیلہ سے کام لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر بسا اوقات اپنے ہیرو کے کارنامے بیان کرنے میں، مبالغہ سے بھی کام لیتا ہے اور الفاظ اور اسلوب بیان کے ذریعہ ایسی رنگ آمیزی کرتا ہے کہ ہیرو کے اوصاف یا اس سے متعلق کوئی خاص

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے:

جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ العربیہ - جلد اول۔

الوسیط: احمد الاسکندری۔ جاحظ: البیان والتبیین۔

واقعہ پوری آن بان سے آنکھوں کے سامنے تصویر کی طرح پھر جائے۔ رزمیہ شاعری میں عام طور سے مکالمے بھی پائے جاتے ہیں اور ان سے بیان میں زور اور اثر میں زیادتی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں مختلف کردار ہوتے ہیں اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے جو شاعر کی قوت متخیلہ کی جولان گاہ ہوتا ہے۔

رزمیہ شاعری تمام اصناف شعر میں سب سے قدیم سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا وجود شروع میں دینی اغراض کے لئے ہوا۔ اس لئے قدیم رزمیہ شاعری کے کردار عام طور سے دیوی اور دیوتا ہوتے تھے۔ رزمیہ شاعری کی مثال ہومر کی الیازہ، ہندوستان کی مہابھارت یا راماین، عبرانی میں داؤد کے اسفار اور فارسی زبان میں فردوسی کا شاہنامہ ہے۔

جہاں تک عربی زبان میں رزمیہ شاعری کے وجود کا سوال ہے تو بعض مورخین جیسے جرجی زیدان اور عصر حاضر کے بعض ادبا اور نقاد جیسے ڈاکٹر طٰہٰ حسین وغیرہ کا خیال ہے کہ دور جاہلی میں رزمیہ یا الشعر القصصی کا وجود تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ "عربوں نے بھی عبرانیوں کی طرح دینی اشعار کہے ہوں گے، جنھیں وہ اپنے بتوں، لات، ہبل اور عزیٰ کے سامنے پڑھتے ہوں گے لیکن ان کے یہ اشعار زمانہ کی دست برد کے نذر ہو گئے کیونکہ نہ تو ان کو مدوّن کیا جا سکا اور نہ ہی ان کو زبانی یاد رکھا جا سکا۔ بعد میں جب عربوں کے درمیان اسلام سے پہلے آپس میں لڑائیوں اور جنگوں کا زور ہوا تو ان کی توجہ فخر و حماسہ کی طرف مبذول ہو گئی اور جب اسلام آیا تو راویوں نے اس صنف نظم کی نہ روایت کی اور نہ ہی اسے یاد رکھا کیونکہ اس میں بت پرستی کی عظمت تھی اور اسلام اسے حرام قرار دیتا ہے۔ اس لئے انھوں نے جاہلی شعرا کا صرف وہی کلام یاد رکھا جس کا تعلق فخر و حماسہ سے تھا مگر اس کے باوجود دینیات سے متعلق کچھ اشعار ہم تک پہنچے ہیں جن کا ذکر بعض شعرا کے تذکروں میں ضمناً آتا ہے۔ جیسے امیہ بن ابی الصلت کے تذکرہ میں ملتا ہے[1]۔ اور یہاں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ "ہمارے تذکرہ نگاروں اور عرب نقادوں نے اس صنف شاعری کی تلاش و جستجو کی طرف بھی شاید دھیان نہیں دیا ورنہ جس طرح "الیازہ" اور "اوڈیسی" نے یونانی رزمیہ شاعری کے جمال و جلال کو اجاگر کیا ہے اسی طرح ہماری قدیم شاعری نے بھی ہماری اجتماعی زندگی اور ہمارے ہیروؤں کی زندگی کا نقشہ کھینچنے میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہوگا۔

١۔ جرجی زیدان، تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، جلد ١۔

لیکن ہمارا تصور یہ ہے کہ ہم نے اپنے ادب کا اس نقطہ نظر سے کبھی مطالعہ نہیں کیا ورنہ یہ حقیقت
کھل کر سامنے آجاتی کہ ادب عربی رزمیہ شاعری میں کسی ادب سے کم نہیں ہے۔[1]

یہ بات اس مفروضہ پر کہی جاتی ہے کہ بعض مورخین کے خیال کے مطابق ہومر کے الیازہ اور
مہابھارت ورامائن وغیرہ کے مقابلہ میں جاہلی شعرا کا کلام کہیں زیادہ تھا۔ یہ لوگ دلیل میں یہ
کہتے ہیں کہ ابوتمام مصنف حماسہ کو ۱۴ ہزار مختصر قصیدے یاد تھے۔ اور بڑے بڑے قصائد اور چھوٹی
نظموں کے علاوہ تھے۔ حماد راویہ کو ۲۷ ہزار قصیدے یاد تھے۔ اس کے علاوہ حروف تہجی کے ہر حرف
پر اسے ایک ہزار قصیدے یاد تھے۔ اسی طرح اصمعی کو ۱۶ ہزار مختصر قصیدے یاد تھے۔ ابوضمضم ایک سو شعرا
کے اشعار کی روایت کرتا تھا اور ان میں سے ہر ایک کا نام عمرو تھا اور یہ بات یوں قرین قیاس
معلوم ہوتی ہے کہ عمرو بن العلاء مشہور راوی اور نقاد نے کہا ہے کہ "ما انتہی الیکم مما قالت
العرب الا اقلہ، ولو جاءکم وافرا لجاءکم علم وشعر کثیر"[2]

لیکن ہمارا خیال ہے کہ دور جاہلی میں رزمیہ یا الشعر القصصی کا وجود نہیں ہے۔ کیونکہ رزمیہ شاعری
کی بنیاد، شاعر کی قوت تخیل اور دیومالائی تصورات پر ہے اور عربوں میں ہمیشہ سے اور خاص
طور سے دور جاہلی میں نازک خیالی یا دقیق قوت تخیل جس کی بنیاد ذہنی کاوش پر ہو، مفقود رہی
ہے۔ پھر جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ اس صنف شاعری میں تخیل و تدقیق کی ضرورت ہوتی ہے اور
عرب ہمیشہ سے اس سے گریز پا رہے ہیں، اور یہ بات محقق ہے کہ عربوں کے یہاں "اساطیر" یعنی
دیومالائی تصورات اور ان سے متعلق قصوں کا وجود نہیں تھا۔ اس لئے ان کے یہاں اس قسم کی شاعری
کے وجود کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بہادری وغیرہ کے جن قصوں کا ذکر کیا جاتا ہے جیسے ابوزید عنترہ کے قصے تو ان میں زبان واسلوب
کی چاشنی ضرور ہے لیکن رزمیہ شاعری کے دوسرے عناصر مفقود ہیں۔ پھر خود ڈاکٹر طہ حسین وغیرہ
نے ان کی صحت پر شک وشبہہ کا اظہار کیا ہے۔ رہا جرجی زیدان کا یہ کہنا کہ مسلمان راویوں نے بت پرستی
کے مضامین کی وجہ سے ایسے اشعار کو یاد نہیں کیا کیونکہ اسلام میں بت پرستی حرام ہے تو اس
میں کوئی جان نہیں۔ آخر انھیں مسلمان راویوں نے تو امرؤالقیس اور عمرو بن کلثوم کی معاملہ بندی
کی داستانوں اور النابغۃ الذبیانی کا وہ مشہور قصیدہ نقل کیا ہے۔ جس میں متجردہ (نعمان کی بیوی)

۱۔ ڈاکٹر طہ حسین: من حدیث الشعر والنثر۔

۲۔ المزہر للسیوطی

کا ایسا وصف ہے جس میں اس کا انگ انگ اس طرح جھلکتا ہے جیسے صاف ستھرے پانی میں کسی بلوریں مجسمہ کا عکس دکھائی دے۔ ان کے علاوہ کئی دیگر شعرا کی محبوباؤں کے سراپا کے اشعار نقل کئے ہیں، جو انتہائی عریاں اور فحش ہیں۔ حالانکہ اسلام نے اس عریانی اور فحاشی سے بھی منع کیا ہے۔ پھر انھیں مسلمان راویوں نے بشار بن برد، ابونواس، مسلم بن الولید اور الضحاک جیسے اباحی اور عریاں گو شعرا کے کلام کو محفوظ رکھا اور اسے مدوّن کر کے عمر جاوداں بخشی۔ حالانکہ یہ اشعار اتنے عریاں، مخرب اخلاق، غارت گر دین و ایمان تھے کہ اس کی سزا میں بعض شعرا کو کوڑے مارے گئے اور بعض کو قتل تک کر دیا گیا[1] اس لئے اس قول میں کوئی جان نہیں۔ یہ محض اپنی زبان کی عصبیت اور احساس برتری کا نتیجہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دورِ جاہلی میں رزمیہ شاعری کا وجود نہیں اور نہ حالات اور نہ عربوں کی بیک گراؤنڈ ایسی تھی کہ اس میں رزمیہ شاعری پیدا ہو سکتی۔ البتہ ان کے یہاں رزمیہ جیسی شاعری کی ایک دوسری قسم "رجزیہ" ملتی ہے جس کا رواج زمانہ جاہلی سے چلا آرہا تھا۔ تفصیل کتاب کی دوسری جلد میں آئے گی۔

۲۔ تمثیلیہ یا الشعر التمثیلی

تمثیلی نظم درحقیقت "منظوم مکالمہ" کا دوسرا نام ہے اور یہیں سے تمثیلی نظم کا تعلق ڈرامہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جب شاعر یہ دیکھتا ہے کہ کلام کو محض شعر کے قالب میں ڈھال دینے سے اثر اندازی میں وہ زور پیدا نہیں ہوتا، جسے وہ پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے خیالات و افکار اور محسوسات کو وہ واقعات کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ اور انھیں کرداروں کی زبان سے اس طرح ادا کرتا ہے کہ واقعات کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اسی لئے تمثیلیہ میں کرداروں کے ساتھ عام طور سے مناظر بھی پیش کئے جاتے ہیں اور انھیں اس طرح مربوط کیا جاتا ہے کہ اسٹیج پر بھی دکھانا ممکن ہو سکے۔

شعرا عام طور سے اس صنفِ شاعری کے ذریعہ اخلاقی فضائل اور انسانی خوبیوں یا حکمت و فلسفہ کی عکاسی کرتے ہیں خواہ انھیں اسٹیج پر دکھانا ممکن نہ ہو۔ اس لئے دنیا کی تمام ترقی

۱۔ اس زمانے کی شاعری کی عریانی وغیرہ کا اندازہ مالک بن دینار کے اس جملے سے بخوبی ہوتا ہے، جو انھوں نے بشار کے بارے میں کہا تھا۔ "ما شیٔ ادعی لاھل ھذہ المدینۃ الی الفسق من اشعار ھذا الاعمی الملعون" مخضرم شعرا میں الاغلب العجلی کے عریاں و فحش قصیدہ کے لیے دیکھیے طبقات فحول الشعراء جمحی ص ۲۳۔

یافتہ زبانوں میں منظوم ڈرامے بکثرت ملتے ہیں۔

رزمیہ شاعری کی طرح تمثیلیہ بھی دورِ جاہلی میں نہیں ملتا اور اس کے بھی وہی اسباب ہیں، جن کا ذکر رزمیہ شاعری کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ جہاں تک حاتم طائی کی سخاوت کے قصوں یا سموئل بن عادیا کی وفاداری کی داستانوں کا تعلق ہے تو یہ سب محض زیبِ داستان کے لئے وضع کی گئی ہیں۔ ان کے اندازِ بیان اور سیاق و سباق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب اسلامی دور کی پیداوار ہیں۔[1] رواۃ نے انھیں لوگوں کو فضائل اور اخلاقِ جمیلہ پر ابھارنے کے لئے وضع کیا تھا مشہور منظوم ڈرامہ نگار عزیز اباظہ نے کھلے لفظوں میں اور افسوس کے ساتھ عربوں کے اسی تقصیر کا اعتراف کیا ہے۔ (۴)

۳۔ طربیہ یا الشعر الغنائی

طربیہ شاعری کا مفہوم شروع میں یہ رہا کہ یہ شاعری کی وہ قسم ہے جسے گا کر پڑھا جا سکے۔ ان گانوں کا تعلق عام طور سے حسن و عشق اور قلبی واردات سے ہوتا تھا۔ اس میں غمِ جاناں کے ساتھ غمِ دوراں بھی جھلکتا تھا۔ اور پھر یہ غمِ دوراں بڑھ کر خود شاعر کا اپنا غم بھی بن جاتا تھا۔ رزمیہ شاعری کے برخلاف طربیہ میں شان و شکوہ اور جلال نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مواد ہلکا پھلکا لیکن نشیلا اور رسیلا ہوتا ہے طربیہ میں شاعر حسن و عشق کے جان فزا نغمے بھی گاتا ہے اور حب الوطنی کے سرمدی اور لاہوتی راگ بھی۔ یہاں شاعر اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ اپنے دل کی دھڑکنیں سناتا ہے اور انھیں کے ذریعہ دوسروں کے دل کی دھڑکنیں سن کر ان کا غم اپنا غم بنا لیتا ہے کیونکہ شاعر یہاں اپنی شخصیت میں کائنات کے درد و غم اور اس کی ابدی مسرتوں کو سمو لیتا ہے اور زندگی کے تجربات کو بڑی خوبصورتی سے اپنی شخصیت کا حصہ بنا لیتا ہے اور پھر طربیہ کے ذریعہ اس کا بھرپور اظہار کرتا ہے۔ اس لئے طربیہ میں صرف مسرت اور حسن و عشق اور حکایت دیدہ و دل کے دل فریب

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے:

(۱) جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغۃ العربیہ۔ جلد ۱۔

(۲) محمود تیمور: دراسات فی القصۃ والمسرح۔

(۳) احمد امین: فجر الاسلام، الفصل الخامس

(۴) محمد عبد الغنی حسن کی کتاب "الشعر العربی فی المہجر" پر ان کا مقدمہ مطبوعہ دار العلم الکویت

نغموں کو ہی شامل نہیں کیا جاتا بلکہ اس میں مدح، ہجو، حماسہ، فخر اور مرثیہ وغیرہ کو بھی شامل کیا جاتا ہے اور چونکہ طربیہ میں انسانی زندگی اور اس کے تجربات کی پوری عکاسی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ صنف غالباً اسی وقت شروع ہو چکی تھی جب کہ انسان نے لکھنا پڑھنا نہیں شروع کیا تھا۔

دور جاہلی کی شاعری میں طربیہ کے تمام اصناف اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ خاص طور سے غزل فخر و حماسہ اور مرثیہ میں جاہلی شعرا نے اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس کی مثال بعد میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بعض اصناف میں تو بعد میں آنے والوں نے جاہلی دور کے شعرا ہی کی خوشہ چینی کی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ عربوں کی زندگی اور ان کے مخصوص حالات میں طربیہ کے تمام دواعی اور بواعث موجود تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس میں اپنے دل و دماغ اور فکر و نظر کی تمام توانائیاں صرف کر دی ہیں۔ جس کا اندازہ آگے ان کے کلام کے مطالعہ سے ہوگا۔

جاہلی زمانہ میں شعر اور شعرا کی اہمیت

جاہلی زمانہ میں شعراء اور ان کے کلام کی بڑی اہمیت تھی۔ لوگ ان کی بات کو دھیان سے سنتے اور اس کو قدر و قعت کی نگاہ سے دیکھتے۔ عرب قبائل کی صورت میں رہتے تھے۔ اپنے ہتھیاروں اور لوگوں کی تعداد کے علاوہ انھیں اپنے قبیلہ کے مفاخر کو گنانے، اپنی خوبیوں اور بھلائیوں کا ذکر کرنے، دوسرے قبائل کے شعراء اگر ہجو کہیں تو ان کا جواب دینے کے لئے اور فخر و مباہات کے موقع پر مقابلہ میں آنے کے لئے انھیں شعرا کی ضرورت پڑتی تھی۔ انھیں ضروریات اور اہمیت کے پیش نظر جب کسی قبیلہ میں کوئی شاعر پیدا ہو جاتا تو سارا قبیلہ خوشی کے شادیانے بجاتا، جشن کرتا اور شادی بیاہ سے بڑھ دھوم دھام کرتا۔ ابن رشیق نے لکھا ہے کہ "جب کسی عربی قبیلہ میں کوئی شاعر پیدا ہو جاتا تو دوسرے قبیلے اس کے پاس آتے اور اسے مبارکباد دیتے اور پکوان پکاتے، عورتیں آتیں اور "مزہر" یعنی عود بجاتیں، جس طرح شادی بیاہ کے موقعوں پر کرتی ہیں اور چھوٹے بڑے سب خوشیاں مناتے۔ اس لئے کہ یہ (شاعر) ان کی عزتوں کو بچاتا، دوسروں کے مقابلہ میں ان کی حمایت کرتا، ان کے مفاخر اور کارناموں کو دوام بخشتا اور ان کی تعریف میں قصیدے کہہ کر ان کو رفعت و بلندی عطا کرتا تھا۔ اس لئے عربوں کا دستور تھا کہ وہ صرف تین موقعوں پر مبارکباد دیتے تھے۔ ایک تو اس وقت جب کسی کے یہاں کوئی لڑکا پیدا ہوتا یا کوئی شاعر ابھرتا، یا کوئی (اصیل) گھوڑی بچہ دیتی۔[1]

۱۔ العمدة ، لابن رشیق القیروانی ۔

جاہلی سماج میں شاعر کی یہ حیثیت بلا وجہ نہ تھی ۔ اس معاشرہ میں شاعر کی اتنی اہمیت اور سماج میں اتنا اثر تھا کہ محض ایک شعر کے کہہ دینے سے عزتیں بگڑ جاتیں اور بگڑی عزتیں بن جاتی تھیں۔ سر کو اونچا کر کے، اکڑ کر چلنے والے افراد گردنیں جھکائے نظریں بچائے چلتے ، اور جو لوگ ذلیل وخوار سمجھے جاتے ، وہ کسی شاعر کے صرف ایک شعر کے کہہ دینے سے گردنیں اونچی کر کے چلتے اور اپنا نام اور قبیلہ کا نام بتاتے وقت غرور سے سر اونچا کر کے نام لیتے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ جب کسی شاعر نے کوئی قصیدہ یا شعر کہا تو فوراً زبان زد خاص وعام ہو کر سارے قبائل میں پھیل جاتا تھا۔ اس کا تذکرہ ان کی بیٹھکوں اور محفلوں میں ہوتا، اور اس کے اثرات سارے قبائل پر پڑتے۔ اغانی نے روایت کی ہے کہ شاعر کے اس اثر کے پیش نظر جب معلقات کا مشہور شاعر اعشیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر آپ کی شان میں مدحیہ قصیدہ پڑھنا چاہا، اور اس کی خبر ابو سفیان کو ہوئی ہے تو انھوں نے قریش کے ممتاز افراد کو جمع کر کے کہا کہ "خدا کی قسم اگر یہ محمد کے پاس چلا گیا اور آپ کی پیروی کر لی تو اپنے اشعار کے ذریعہ سارے عرب کی آگ تمہارے خلاف بھڑکا دیگا۔ اس لئے اس کے لئے سو اونٹ جمع کرو۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور اعشیٰ نے وہ اونٹ لے لئے اور اپنے شہر کو چلا گیا۔" شاعر کے کلام کے اثر اور خاص طور سے اس اعشیٰ کے کلام کے اثر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ محض اس کے ایک شعر کہہ دینے سے آٹھ مایوس لڑکیوں کی شادیاں آناً فاناً ہو گئیں۔

کہتے ہیں کہ قبیلہ کلاب کے ایک شخص محلق نامی کی آٹھ لڑکیاں تھیں جن کی شادی اس وجہ سے نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ غریب تھا۔ اتفاق سے انہیں دنوں اعشیٰ مکہ جاتے ہوئے ادھر سے گزرا۔ محلق کی بیوی کو جب اس کا علم ہوا، تو اس نے اپنے شوہر کو بھیج کر سب سے پہلے اس کو اپنے یہاں مدعو کر لیا۔ محلق نے اس کے لئے ایک اونٹنی ذبح کی اور اس کی بیوی نے بڑے عزت واحترام سے اس کی خاطر و مدارات کی اور خوب کھلایا پلایا۔ چنانچہ رات بھیگے جب شراب کا نشہ چڑھا تو اعشیٰ نے محلق سے اس کے بال بچوں کے متعلق پوچھ لیا۔ محلق نے اپنی لڑکیوں کی بپتا سنادی۔ شاعر کے دل میں اس کی بات اتر گئی۔ چنانچہ جب وہ عکاظ کے میلے میں پہنچا تو اس نے اپنا مشہور قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے:

أرقت وما هذا السهاد المؤرق ومابی من سقم ومابی معشق

یعنی میں رات بھر نہ سو سکا۔ اس کی وجہ بیماری یا عشق نہ تھا۔

اس کے بعد گریز کر کے محلق اور اس کی سخاوت و مہمانداری کی تعریف بڑے بلیغ انداز

میں کی۔ کہتا ہے:

لعمری لقد لاحت عیون کثیرۃ ۔۔۔ الی ضوء نار فی الیفاع تحرق

تُشب لمقرورین یصطلیانہا ۔۔۔ وبات علی النار الندی والمحلق

رضیعی لبان ثدی امٍ تقاسما ۔۔۔ باسحم داج عوض لا نتفرق

یعنی میری جان کی قسم بہت سے لوگوں نے یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھا کہ ایک میدان میں آگ جل رہی ہے، جسے دو سخت سردی کھائے ہوئے اشخاص تاپ رہے ہیں، ان میں سے ایک تو سخاوت تھی اور دوسرا محلق تھا جنھوں نے پوری رات ساتھ گزاری، ان دونوں نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے، اور قسم کھائی ہے کہ زندگی میں کبھی بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

تاریخ میں آتا ہے کہ جونہی اعشیٰ نے محلق کی شان میں یہ مدحیہ قصیدہ ختم کیا، چاروں طرف سے امراء، شرفاء اور بڑے لوگوں نے اس کی لڑکیوں کے پیام دینا شروع کر دیا، اور ایک ہفتہ کے اندر ہی اس کی آٹھوں لڑکیوں کی شادیاں رئیسوں کے گھرانوں میں ہو گئیں۔

شعر اور شاعر کے اثرات کے واقعات تاریخ کی کتابوں میں بھرے پڑے ہیں[1] جن سے

[1] اس طرح کی ایک مثال حضرت حسان کا واقعہ ہے جو بنی عبد المدان کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت حسان نے ان کی ہجو ان اشعار سے کی تھی۔ لا باس بالقوم من طول و من غلظ ـــ جسم البغال واحلام العصافیر یعنی اگر یہ لوگ قد آور اور تنومند ہیں تو کوئی خاص بات نہیں ہے، کیونکہ ان کے یہ جسم خچروں کے سے اور عقلیں چڑیوں کی ہیں۔ چنانچہ بنی عبد المدان کے لوگوں نے ان سے کہا کہ خدا کی قسم اے ابو الولید آپ نے تو ایسا کر دیا ہے کہ اب ہم کو اپنے جسموں کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ حالانکہ ایک زمانہ میں ہم اپنی تنومندی پر فخر کیا کرتے تھے۔ اس پر حسان نے فرمایا کہ خیر کوئی بات نہیں ہے، میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ اس کے بعد انھوں نے ان لوگوں کی شان میں مندرجہ ذیل شعر کہے، جن سے ان کی عزت پھر بحال ہو گئی۔

وقد کنا نقول اذا رأینا ۔۔۔ لذی جسم یعد وذی بیان

کأنک أیہا المعطی لسانا ۔۔۔ وجسما من بنی عبد المدان

یعنی جب ہم کسی ایسے آدمی کو دیکھتے تھے، جو خوش اندام اور خوش بیان ہوتا، تو کہتے تھے کہ اے وہ شخص جسے اتنی اچھی زبان اور ایسا جسم عطا ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تو بنی عبد المدان کا فرد ہے۔ چنانچہ اس مدح کے بعد پھر عبد المدان کے لوگ اپنے سینے پھلا کر اور سر اونچا کر کے چلا کرتے تھے۔

اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی جاہلی معاشرہ میں شاعر کو وہ حیثیت حاصل تھی جو کسی بادشاہ کو بھی میسّر نہ تھی۔ وہ اپنی زبان سے وہ کر دیتا، جو بڑے بڑے جابر یا صاحب عزّ و جاہ اپنی طاقت اور سطوت کے باوجود نہ کر پاتے تھے۔

عرب شعر کیسے کہتے تھے

عرب جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، فطرتاً شعری ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ دورِ جاہلی میں عام طور سے شعراء فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ جب طبیعت جولانی میں آتی تو زبان سے بغیر کد و کاوش کے اشعار نکلنے لگتے اور اس طرح کہ نہ الفاظ کے حسن و خوبصورتی اور موزونیت میں کمی ہوتی اور نہ معانی و مطالب میں نقص اور نہ اسلوب بیان میں جھول، جیسے حارث بن حلزہ (الیشکری) اور عمرو بن کلثوم کہ ان کو شعر کہنے کے لئے سوچنے یا طبیعت پر زور دینے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ مگر جن شعراء نے شاعری کو پیشہ بنا رکھا تھا اور اس کے ذریعہ مال و دولت اور انعام و اکرام حاصل کرتے تھے اور اپنے اشعار کو بڑی محفلوں اور بڑے موقعوں پر پڑھتے تھے، ان کا معاملہ دوسرا تھا۔ یہ لوگ ذہن و دماغ پر زور دے کر بتکلف شعر کہتے۔ پھر ان اشعار پر نظر ثانی کرتے، الفاظ و اسلوب بیان، معانی و مطالب پر دوبارہ غور کرتے اور ان میں کتر بیونت کر کے اچھے اشعار چھانٹ کر اور ان کی نوک پلک ٹھیک کر کے قصیدہ کو آخری شکل دیتے۔ ظاہر ہے اس طرح سے جب شعر کہے جائیں گے تو وہ فن کا اعلیٰ اور بے مثال نمونہ ہوں گے۔ چنانچہ جن شعراء نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔ ان کا کلام جاہلی شاعری کا اعلیٰ اور بے مثال نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کے شعراء میں خاص طور سے زہیر بن ابی سلمٰی اور نابغہ الذبیانی کا نام آتا ہے۔ زہیر بن ابی سلمٰی تو ایک قصیدہ کی سال بھر تک اصلاح اور نظر ثانی کیا کرتا تھا۔ اسی لئے اس کے قصائد کو حولیات (جن پر ایک سال گزر چکا) کہتے ہیں۔ نابغہ الذبیانی کے معذرت کے اشعار اس طریقہ کے بہترین مثال سمجھے جاتے ہیں۔

عام جاہلی شعراء کے کلام میں اس زمانہ کے اعتبار سے اعلیٰ اخلاقی تعلیمات، شریف اور پاکیزہ معانی اور بلند پایہ اغراض و مقاصد ملتے ہیں۔ ان کے یہاں انعام و اکرام کی لالچ سے کسی امیر یا بڑے آدمی کی مدح یا کسی قبیلہ کی خواہ مخواہ اور بلا سبب ہجو نہیں ملتی مگر کچھ شعراء ایسے بھی گزرے ہیں، جنھوں نے شعر کو مال و دولت، انعام و اکرام حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ چنانچہ یہ شعراء اس زمانے

۱۔ حارث نے ایک پورا قصیدہ برجستہ کہا جو فخر و حماسہ میں مثال ہے۔ تفصیل اس کے حالات زندگی میں ملاحظہ کیجئے۔

کے بادشاہ، رؤسا، اور امراء کی شان میں مدحیہ قصیدے کہتے تھے اور انھیں پیش کرنے کے لئے سفر کرکے ان کے درباروں میں جاتے اور اپنا کلام سنا کر ان کے انعام واکرام سے مالا مال ہو کر اپنے گھروں کو واپس آتے تھے۔ اس زمرہ میں خاص طور سے النابغہ الذبیانی اور حسان بن ثابت کا نام لیا جاتا ہے۔ جو النعمان بن المنذر اور غسانی بادشاہوں کی تعریف میں مدحیہ قصیدے کہتے تھے اور زہیر بن ابی سلمٰی کا نام بھی ہے جو ہرم بن سنان کی شان میں اور امیہ بن ابی الصلت کا جو عبد اللہ بن جدعان کی شان میں اور اعشیٰ قیس کا جو نہ صرف بادشاہوں بلکہ عوام اور بازاری لوگوں کی شان میں بھی مدحیہ قصیدے کہتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہے کہ وہ عجمیوں کے درباروں میں بھی مدحیہ قصیدے لکھ کر لے جاتا اور ان سے بھی انعام واکرام لینے میں شرم وحجاب نہ محسوس کرتا۔ اس کی وجہ سے آخر میں اس پیشہ کو اشراف حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے اور شعر وشاعری کرنے کے مقابلہ میں خطابت کو ترجیح دیتے تھے

جاہلی زمانہ کی شاعری کی امتیازی خصوصیات

گزشتہ صفحات میں ہم نے شعر، اس کی حقیقت، اس کی نشو و نما اور ترقی کے مدارج کا قدرے تفصیل سے مطالعہ کیا۔ آیئے اب یہ دیکھیں کہ دورِ جاہلی میں شعرا نے کن اصنافِ سخن اور اغراض پر طبع آزمائی کی ہے اور اس عہد کی شاعری اور شعرا کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ آسانی کے لئے ہم اس حصہ کو حسبِ ذیل عنوانوں پر تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ جاہلی دور میں شاعری کے اصناف و اغراض
۲۔ جاہلی دور میں شاعری کے معانی اور مطالب
۳۔ جاہلی دور میں شاعری کا اسلوبِ بیان اور الفاظ کی سج دھج
۴۔ جاہلی دور میں شاعری کا وزن اور قافیہ

جاہلی دور میں شاعری کے اصناف و اغراض

یوں تو جاہلی دور کے شعرا نے اپنی ذہنیت، اپنی عقلی و فکری نشو و نما، اپنے ماحول اور اپنی سماجی اور شخصی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اس زمانہ کے مخصوص حالات کی وجہ سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے شاید بہت سے نمونے ہم تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ البتہ جن اغراض و اصناف کے نمونے ہم تک پہنچے ہیں، ان میں سے مشہور اور مروج اصنافِ سخن جن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ حسبِ ذیل ہیں:

غزل : اسے "نسیب اور تشبیب" بھی کہتے ہیں

جاہلی دور کے اصناف سخن میں سب سے اہم اور ممتاز صنف غزل ہے اور اس غزل کا موضوع اور محور عورت تھی کیونکہ غزل کے معنی ہیں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی آپس کی بات چیت اور عورتوں سے لطف اندوزی اور ان سے حسن و محبت کی باتیں کرنا[1]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب قبائل اور خاص طور سے جزیرۂ عرب کے شمال کے عرب بدوی زندگی گزارتے تھے اور جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، چارہ اور پانی کی تلاش میں ادھر ادھر آیا جایا کرتے تھے۔ اس طرز زندگی میں مختلف قبائل اور ان کے افراد، لڑکے لڑکیوں، بڑے بوڑھوں کو آپس میں ملنے جلنے کے مواقع بھی ملتے تھے۔ زندگی فطری تھی اور فراغت کے اوقات بہت زیادہ اور جذبات کی فراوانی۔ اس لئے حسن و عشق کے قصوں کے پروان چڑھنے کے خاصے مواقع حاصل تھے۔ چنانچہ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس معاشرہ میں بھی دلوں کی دنیائیں آباد ہوتیں اور اس کا مرکز و محور عورت ہوتی، جو فطری بات تھی۔ کیونکہ عورت اس معاشرہ میں صرف دل کی دنیا ہی نہیں آباد کرتی تھی، بلکہ وہ مردوں کے دوش بدوش کارگاہِ حیات میں شریک اور ساتھی بھی تھی، اور اس وجہ سے صحیح معنوں میں زندگی کی النصف الجمیل تھی۔ جب تک یہ "خوبصورت نصف زندگی" نہ مل جاتی، زندگی نامکمل، سونی اور ویران تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عربی ادب میں جانِ غزل، شانِ غزل اور مرکز غزل ہمیشہ سے ہی عورت رہی ہے۔

امرؤ القیس سے لے کر عمر بن أبي ربیعہ اور جمیل سے لے کر قیس اور اس کے ہم مشرب شاعروں کی دنیائے دل کی ملکہ، ان کی شاعری کا سرچشمہ یہی عورت تھی۔ اس لئے اس کی خاطر سب کچھ لٹا دینے سے شاعر دریغ نہیں کرتا تھا۔ امرؤ القیس، جسے الملک الضلیل کے نام سے پکارا جاتا ہے، اپنی صحرا نوردیوں کے بعد جب ایک دفعہ اپنی محبوبہ عنیزہ کے پاس رات کی تاریکی میں آیا تو اس نے کہا کہ:

---

[1] لغوی اعتبار سے غزل، نسیب، تشبیب میں بہت تھوڑا فرق ہے اور ان سب الفاظ کے معنی ہیں: "حدیث الفتیان و الفتیات واللهو مع النساء و مغازلتهن" لسان العرب، جلد ۱۴۔ ابن سلام الجمحی نے طبقات الشعراء میں کہا ہے کہ "یعتبر الغزل والنسیب والتشبیب کلمات مترادفة" یعنی غزل، نسیب اور تشبیب ہم معنی الفاظ ہیں۔ مگر بعض علماء نے غزل اور نسیب میں تھوڑا سا فرق کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ "غزل جس کے الفاظ، معنی و مطالب پاک صاف ہوں، جس میں شاعر اپنی محبوبہ کا نام نہ لے اور صرف اظہار شوق کرے وہ نسیب" کہلاتا ہے۔

سبحانك الله انك فاحش　　الست ترى السمار والناس احوالی

یعنی اللہ تجھے غارت کرے تو نے تو مجھے رسوا کر ڈالا۔ کیا تجھے دکھائی نہیں دیتا ہے کہ لوگ میرے آس پاس ابھی تک جاگ رہے ہیں اور گپ شب میں لگے ہوئے ہیں۔ تو اس نے برجستہ کہا کہ:

یمین اللہ ابرح قاعدًا　　ولو قطعوا رأسی لدیک واوصالی

یعنی خدا کی قسم میں یہاں سے نہیں اٹھوں گا چاہے لوگ میرا سر اور ہاتھ پاؤں تیرے پاس کاٹ کر رکھ دیں۔

یہ اس لئے کہ بدوی شاعر کے نزدیک "عورت زمین پر چلنے والی ہر شے سے زیادہ مکمل اور جاذب نظر ہے"۔ نابغہ ذبیانی کہتا ہے کہ:

غراء أکمل من یمشی علی قدم　　حسنا وأملح من حاورته کلما

اعشیٰ نے پیرانہ سالی کے باوجود عورت کو مسیحا بتایا ہے۔ کہتا ہے:

لو اسندت میتا الی نحرها　　عاش ولو ینقل الی قابر

یعنی اگر اس کی گردن سے کسی مردہ کو بھی چھوا دو تو وہ زندہ ہو جائے گا اور پھر اسے قبرستان لے جانے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اعشیٰ کو اپنی مبالغہ بیانی کا احساس تھا۔ خود ہی کہتا ہے کہ:

حتی یقول الناس مما راوا　　عجبا للمیت الناشر

یعنی لوگ فرط حیرت میں بول پڑیں گے کہ دیکھو تو کتنی تعجب کی بات ہے کہ مردہ زندہ ہو گیا۔

عنترہ جیسا سخت کوش، تندخو اور جنگ جویانہ طبیعت کا مالک شاعر بھی جو ہر ظالم و جابر سے لڑنے مرنے کو تیار رہے، خود فراق محبوبہ میں مرا جا رہا ہے۔ کہتا ہے:

اقاتل کل جبار عنید　　وتقتلنی الفراق بلا قتال

میں ہر سرکش و سخت ظالم آدمی سے برسرپیکار ہو جاتا ہوں، لیکن فراق مجھے بغیر لڑائی کے مارے ڈالتا ہے۔

عورت کی اس حیثیت اور اس سے اس قسم کے تعلق کی بنا پر جاہلی شاعری میں غزل کا موضوع عورت بن گئی جو اموی دور کے آخر تک حسن و عشق کے تخت زریں پر ملکہ غزل و تشبیب بنی رہی یہاں تک کہ عباسی دور کے شروع میں عجمی شعرا نے اسے اس کے تخت زریں سے اتارنے کی کوشش کی لیکن روایت پسند شعرا اور سماج کے صحت مند عناصر نے اس رجحان کے خلاف زبان و قلم سے جنگ کر کے

اس بدعت کا استیصال کر دیا۔ اور پھر سے عورت دنیائے غزل کی ملکہ بن گئی۔[1]

جاہلی شاعر اپنی غزل اپنی محبوبہ کے محاسن بیان کرنے سے شروع کرتا تھا جس میں اس کے گورے اور عطر بیز بدن، لمبی گردن، گلاب جیسے رخسار اور اس سے بڑھ کر اس کے اچھے اخلاق و عادات کی تعریف کرتا تھا، جیسے کہ نابغہ نے کہا تھا۔

بیضاُ کالشمس وافت یوم اُسعدھا　　　لم توذ اُھلا ولم تفحش علیٰ جار

والطیب یزداد طیبا ان یکون بھا　　　فی جید واضحة الخدین معطار

وہ سورج کی شعاعوں کی طرح گوری چٹی ہے ۔۔۔۔۔۔ اپنے مرادوں کے دنوں کو پہنچ چکی ہے یعنی جوان ہو گئی ہے۔ نہ تو اس نے اپنے گھر والوں میں سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی اور نہ ہی کسی پڑوسی کے ساتھ بدکلامی کی۔ اور عطر کی خوشبو اس کی گردن سے لگ کر دوبالا ہو جاتی ہے جس میں دو گلگوں اور عطر بیز رخسار جڑے ہیں۔

اس کے بعد اپنی محبوبہ کے قیام اور پھر وہاں سے رخصتی کی داستان سناتا ہے۔ جیسے بقول زہیر بن ابی سلمیٰ :-

تبصر خلیلی ھل تری من ظعائن　　　تحملن بالعلیا من فوق جرثم

علون بانماط عتاق وکلة　　　وراد حواشیھا مشابھة الدم

اے میرے دوست ذرا نظر تو ڈالنا، کیا تجھے اس اونچی زمین پر جرثم تالاب کے اوپر کچھ عورتیں ہودوں میں بیٹھی ہوئی جاتی نظر آرہی ہیں (بیس سال گزرنے کے بعد شاعر اس جگہ سے گزر رہا ہے جہاں اس کی محبوبہ اس تالاب کے کنارے ٹھہری تھی اور جب اس کے قبیلے نے کوچ کیا تھا تو اس تالاب کے اوپر سے ہوتی ہوئی وہ گئی تھی۔ آج شاعر جب اس جگہ پہنچا تو اپنی گزشتہ محبت کے دنوں میں ایسا کھو گیا کہ اسے ہوش بھی نہ رہا کہ بیس سال گزرنے کے بعد بھلا کوچ کا وہ منظر اب تک کیسے قائم رہ سکتا ہے)۔ ان عورتوں نے اپنے ہودوں میں خوبصورت اور عمدہ فرش بچھا رکھے ہیں جن سے باریک اور حسین پردے لٹک رہے ہیں، جن کے کنارے خون جیسے سرخ ہیں۔

پھر محبوبہ کے کوچ کر جانے کے بعد اس کی نگری اور اسکے گھر کا ذکر کرتا ہے۔ اور اونٹ کی اور فاختاؤں یا کبوتروں کی آواز سن کر یا بجلی کی چمک دیکھ کر یا آگ کی روشنی کو پاکر یا نسیم کی

۱۔ تفصیل کتاب کی تیسری جلد میں ملاحظہ ہو۔

سرسراہٹ سن کر محبوبہ سے ملنے کی شدید خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ بھران چشموں یا تالابوں کا ذکر کرتا ہے جہاں محبوبہ ٹھہری تھی، ان مرغزاروں کو یاد کرتا ہے جہاں اس نے چہل قدمی کی تھی۔ اس کے بعد اس کی ٹھہرنے کی جگہوں اور آس پاس جو خوبصورت اور خوشبودار پودے اور پھول ہیں، ان کا بڑے والہانہ انداز سے ذکر کرتا ہے[1]

اب رہا یہ سوال کہ جاہلی شاعروں میں سب سے پہلے غزل کس نے کہی، تو اس کا جواب بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس جاہلی شاعری کا جو ذخیرہ ہے اس سے اس کا بالکل اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ وہی ہے جس کا پہلے بھی ذکر آچکا ہے، یعنی سلسلہ وار تاریخی اعتبار سے صحیح کوئی چیز ہم تک نہیں پہنچ سکی ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے امرؤالقیس نے غزل کہی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں غزل کہنے کا سہرا نابغہ الذبیانی اور الاعشیٰ کے سر ہے۔ بہرحال اس میں سب کا اتفاق ہے کہ دور جاہلی میں عورت سے اظہار عشق اور اس کے اوصاف بیان کرنے میں امرؤالقیس کے مقابلہ میں کسی کو سبقت نہیں ہے اور نہ ہی اس سے بڑھ کر اس صنف میں کوئی پرگو گزرا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جاہلی شعرا کے غزلیہ کلام میں عورت سے اظہار عشق کرتے ہوئے کن جذبات

1۔ عنترہ نے محبوبہ کی نگری کے بارے میں کہا ہے۔

حییت من طلل تقادم عہدہ — اقوی واقفر بعد ام الہیثم

زہیر نے محبوبہ کے ٹھہرنے کی جگہ پر بیس سال گزرنے کے بعد پہنچنے کا ذکر یوں کیا ہے۔

وقفت بہا من بعد عشرین حجۃ — فلأیا عرفت الدار بعد توہم

محبوبہ کے جانے کے بعد جو چیزیں اور نشانیاں اس کی یاد دلانے کے لئے رہ گئیں تھیں، ان کا ذکر یوں کیا ہے۔

اثافی سفعا فی معرس مرجل — ونؤیا کجذم الحوض لم یتثلم

کبوتر کی آواز سن کر محبوبہ کی یاد آنے کے بارے میں نابغہ نے کہا ہے۔

ان تغن بالحمام الورق یہیجنی — وان تغربت عنا ام عمار

محبوبہ کے قافلے نے قیام کرنے کی جگہوں کا ذکر زہیر کے یہاں یوں ہے:۔

بکرن بکورا واستحرن بسحرۃ — فہن لوادی الرس کالید للفم

فلما وردن الماء زرقا جمامہ — وضعن عصی الحاضر المتخیم

کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا خیال ہے کہ جاہلی شعرا اپنی غزلیہ شاعری میں لطیف احساسات اور پاکیزہ جذبات کی عکاسی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ انکی غزل ایک طرح سے عورت کا سراپا ہے۔ ان کے یہاں حکایت دیدہ و دل کی لطیف بیانی اور نازک خیالی نہیں ملتی۔ وہ عورت کا تذکرہ بھی اس طرح کرتے تھے، جس طرح اپنے اونٹ کا اور کہیں جذبات اور احساسات کا ذکر ہے تو وہ محض سخن گسترانہ بات تھی جو بہت جلد ختم ہو جاتی تھی اور اس کی بنیاد بھی جنسی جذبات پر ہوتی تھی۔ کیونکہ انکے جذبات اور احساسات کا سرچشمہ جنسیت اور لذتیت تھی۔ اسی لئے امرؤالقیس اور نابغہ کے یہاں عورت کا یہ مادی وصف نمایاں ملتا ہے، جس میں عورت کے اعضا اور محاسن کا ذکر تو بہت تفصیل سے ہے مگر پاکبازی اور عفت کا پہلو بہت کمزور ہے[1]

مگر ہمارے خیال میں یہ بات پوری طرح صحیح نہیں کیونکہ ہمیں جاہلی غزل گو شعرا میں بعض ایسے شاعر بھی ملتے ہیں، جن کے کلام میں پاکیزہ جذبات اور احساسات کا وصف بہت ہے۔ بلکہ پاکیزہ جذبات کے ساتھ رفعت خیال اور ندرت بیان بھی ہے۔ جیسے المرقش الاکبر اور الشنفری کا غزلیہ کلام۔ یہ اور بات ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور ان کے ہم نفس اس قسم کے اشعار کی صحت سے انکار کرتے ہیں اور اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کا نمونہ اپنی جگہ پر آئے گا۔ (۲)

فخر و حماسہ

یہ صنف بھی جاہلی شاعری کے محبوب اصناف میں سے ہے۔ اس صنف میں شاعر اپنی، اپنے آباؤ اجداد کی اچھائیاں، ان کے نیک کام، ان کی بہادری اور شجاعت، ان کی تعداد اور حسب و نسب میں برتری کے قصے سنا کر دوسرے قبائل کے مقابلہ میں فخر کرتا ہے اور جنگ و جدل کے موقعوں پر انھیں فضائل کو گنا کر جوش پیدا کرتا ہے۔ فخر و حماسہ عربی کی اتنی ممتاز اور نمایاں صنف ہے کہ ابوتمام اور بحتری نے حماسہ کے نام سے جاہلی دور کی فخریہ اور جوشیلی شاعری کے مجموعے مرتب کئے ہیں جو بہت مقبول اور اب تک رائج ہیں خاص طور سے حماسہ ابوتمام کہ اس کو کئی جگہ نصاب تعلیم میں داخل کیا گیا ہے۔

۱۔ حدیث الاربعا، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، جلد اول۔

۲۔ نمونہ مرقش کے کلام میں صفحہ ۹۶، پر ملاحظہ کیجیے۔

مدح

مدح سے مراد کسی باحیثیت آدمی یا کسی بادشاہ، وزیر یا سپہ سالار کے اخلاق فاضلہ کی تعریف توصیف ہے۔ یہ اخلاق حمیدہ جاہلی شاعر کے نزدیک سخاوت وکرم، مہمانداری، بہادری، پاکدامنی وپاکبازی اور عدل وانصاف اور صلح وصفائی تھے۔ چنانچہ جن لوگوں میں یہ صفات پائی جاتی تھیں، جاہلی شعرا انکی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ ان کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ ان کی بدولت ہمیں بعض بادشاہوں، امراء اور رؤسا کے اخلاق وعادات، طرز زندگی اور بود وباش کا اندازہ ہوتا ہے اور اس طرح اس زمانے کے کلچر کی ایک جھلک بھی سامنے آجاتی ہے، جو اور کہیں نہیں ملتی۔ اور چونکہ اس کے ذریعہ محاسن ومفاخر اور اخلاق حمیدہ کا ایک طرف چرچا ہوتا تھا تو دوسری طرف یہ خوبیاں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی تھیں۔ اس لئے ممدوحین دل کھول کر اس کا صلہ بھی دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں بقول یزید الحارثی "اگر ان خوبیوں پر تعریف وتوصیف نہ کی گئی تو گویا آدمی پیدا ہی نہیں ہوا —— إذا الفتى لاقى الحمام رأيتهٗ

لولا الثناءُ، كأنـه لم يولد

مدحیہ قصائد کا عروج جاہلی شاعری میں اس وقت ہوا جب کہ بعض شعراء نے اسے حصول مال وجاہ کا ذریعہ بنالیا اور ممدوحین نے اس کے صلہ میں خوب انعام واکرام دینا شروع کیا۔ جاہلی شعراء میں مدحیہ قصائد کہنے میں زہیر بن ابی سلمٰی، نابغہ الذبیانی اور الاعشٰی کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

مرثیہ

مرثیہ کا مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کے اوصاف واخلاق کا ذکر کرکے اس کے مرنے پر رنج وغم کا اظہار کیا جائے اور اس کے بچھڑ جانے سے گھر اور خاندان پر جو مصیبت پڑی ہے اس کا ذکر کیا جائے۔ ابن رشیق نے اپنی کتاب العمدہ میں لکھا ہے کہ جاہلی زمانہ میں جب کوئی کسی کے مرنے پر مرثیہ کہتا تھا تو "بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہوں کی موت، بڑے بڑے ملکوں کی تباہی، عظیم الشان قوموں کی فنا کی مثالیں دیتا اور ان کے مقابلہ میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہنے والے تنومند پہاڑی بکروں اور جھاڑیوں میں چھپے رہنے والے شیروں اور چٹیل میدانوں میں پھرنے والے زبروں، گدھوں، عقابوں اور سانپوں کی قوت ودرازی عمر کی طرف توجہ دلاتا۔ مطلب یہ تھا کہ بڑے اور شریف لوگوں کی عمریں تھوڑی ہوتی ہیں اور جنگلی جانور، چرند وپرند بہت دنوں تک جیا کرتے ہیں۔ گویا کہ موت

بڑائی کی نشانی ہے اور طول عمر بے مصرف ذلت کی زندگی۔

ہجو

ہجو کا مطلب یہ تھا کہ کسی آدمی یا کسی قبیلہ کی برائیاں، اچھالی جائیں۔ اور اچھائیاں چھپائی جائیں۔ ابتدا میں عربوں کا قاعدہ تھا کہ ہجو میں بیہودہ گوئی یا فحش باتیں نہیں کہتے تھے، بلکہ جس کی ہجو کرتے تھے اس کا مذاق اڑاتے تھے اور سماج و معاشرہ میں اس کی جو حیثیت تھی اسے گرانے کی کوشش کرتے، اس کی ظاہری سج دھج اور ٹیپ ٹاپ کا خاکہ اڑاتے مگر بعد میں جب شعر و شاعری پیشہ بن گئی اور روزی کمانے کا ذریعہ، تو ہجو میں فحش گوئی اور ابتذال شامل ہو گیا۔ جیسے زہیر بن ابی سلمی کا قول :

وما أدري ولست اخال أدري　　　أقوم آل حصن أم نساء

یعنی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قبیلہ حصن کے لوگ مرد ہیں یا عورتیں ہیں۔

معذرت

معذرت جیسا کہ لفظ سے ظاہر ہے کسی سے اپنی غلطی کے لئے اظہار افسوس کر کے یا اگر کوئی تہمت لگائی گئی ہے تو اسے صاف کر کے، جس شخص سے معذرت کی جا رہی ہے، اس کے دل سے اس اثر کو مٹانے کو کہتے ہیں۔ جاہلی شعرا میں النابغہ الذبیانی کو اس فن میں کمال حاصل تھا۔

سراپا یا وصف

وصف یا منظر کشی یا سراپا بھی جاہلی شاعری کے اصناف میں سے ایک اہم اور مشہور صنف ہے۔ سراپا یا وصف یہ ہے کہ شعر میں کسی چیز کی ایسی ہو بہو تصویر کھینچ دی جائے، جیسی کہ وہ خارج میں ہے۔ تاکہ اس کا نقشہ سامع کے ذہن میں اتنا واضح اور صاف آجائے گویا کہ وہ اپنی آنکھوں اس چیز کو دیکھ رہا ہے یا محسوس کر رہا ہے۔ دور جاہلی میں عام طور سے وصف حقیقت پر مبنی ہوتا تھا۔ لیکن بعض شعرا نے اس غرض سے کہ موصوف کی عظمت کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر دکھائیں یا اس کی صورت کو بہت زیادہ بگاڑ دیں، وصف میں مبالغہ سے بھی کام لیا ہے، اس لئے عربی زبان میں وصف دونوں طرح کا ملتا ہے یعنی بلند اور معیاری اور بعض گھٹیا اور ناپسندیدہ۔ عربوں نے وصف کے اتنے طریقے ایجاد کئے ہیں اور ان کے موصوف میں اتنا تنوع ہے کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ کیونکہ جن چیزوں کا بھی تعلق ان کی زندگی یا ان کے ماحول سے رہا ہے، انھوں نے ان سب کا نقشہ کھینچا ہے اور اس میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ اونٹ کا جو ان کی ریڑھ کی ہڈی تھا، نقشہ کھینچنے میں انھوں نے اپنی پوری ذہانت و فطانت صرف کر دی ہے اور ایسے انداز سے اس کا وصف بیان کیا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ان

کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جاہلی شعرا میں طرفہ بن العبد کو اونٹ کی وصف نگاری میں کمال حاصل تھا۔ اسی طرح اس نے گھوڑے کی بھی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ اور ہر زاویہ اور ہر نقطۂ نظر سے تصویر کھینچی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں جانور ان کی زندگی کا لازمی حصہ اور سفر و حضر کے بہترین ساتھی تھے۔ امرؤ القیس سے ابو دؤاد اور علقمہ کو بھی جاہلی شعرا میں فن وصف میں امتیاز حاصل ہے۔ اسی طرح سے جاہلی شعرا نے درندوں اور جنگلی جانوروں، خطرناک چڑیوں، رینگنے والے زہریلے جانوروں کا بھی نقشہ کھینچا ہے یہی نہیں بلکہ نباتات وجمادات، چاند سورج، ستارے، بادل بجلی بارش، اونچے ریت کے ٹیلے، اپنی محبوبہ کے ڈیرے اور ان کے نشانات اور ان پر ہواؤں اور بارشوں کا جو اثر ہوتا ہے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ غرضکہ ان تمام چیزوں کی وصف میں کچھ نہ کچھ کہا ہے جن سے ان کا زندگی میں سابقہ رہا[1]

ان چیزوں کے علاوہ جاہلی شعرا نے انسان کا سراپا کھینچنے میں اس کے اخلاق و عادات، اس کے مختلف حالات مثلاً سفر و حضر، صلح و جنگ، لڑائی جھگڑا کا نقشہ بھی بہت ہی دل آویز اور موثر انداز سے کھینچا ہے جسے پڑھ کر ان کی قادر الکلامی اور ہر چیز کے واضح تصور رکھنے کا پورا اندازہ ہوتا ہے

---

(۱) عنترہ نے اونٹنی کے وصف میں کہا ہے؛

هل تُبلغنی دارها شدنیة   لعنت بمحروم الشراب مصرم

خطارة غب السری زیافة   تطس الإکام بوخد خف میثم

امرؤ القیس نے جنگلی جانوروں کے بارے میں کہا ہے؛

عنّ لنا سرب کأنّ نعاجه   عذاری دوار فی ملاء مذیل

فأدبرن کالجزع المفصل بینه   بجید معم فی العشیرة مخول

جنگلی چڑیوں کے بارے میں کہا ہے؛

کأنّ مکاکی الجواء غدیة   صبحن سلافا من رحیق مفلفل

ایک جاہلی شاعر نے سانپ کا وصف اس طرح بیان کیا ہے؛

یدیر عینا للوقوع کأنّها   سمراء طاحت من نقیض برید

وکأن شدقیه إذا استعرضته   شدقا عجوز مضمضت لطهور

امرؤ القیس نے پہاڑ کا نقشہ یوں کھینچا ہے؛

(باقی ص ۱۴۸ پر)

عورت کے سراپا کھینچنے میں بھی جاہلی شعرا نے بڑی ہی دقت نظری، باریک بینی اور جزرسی کا ثبوت دیا ہے۔ امرؤالقیس نے اپنی محبوبہ کے محاسن اور مفاتن کا جس انداز سے ذکر کیا ہے، بڑا جذبات انگیز ہے۔ "دارۃ جلجل" تالاب پر اس نے جو رنگ رلیاں منائیں، یا دورانِ سفر اس نے جو خوشہ چینیاں کی ہیں، وہ غزل اور وصف نگاری میں جنسیت کو شامل کر کے پرکیف بنا دینے کی بہترین مثال ہے۔

اسی طرح نابغہ ذبیانی نے متجردہ کے انگ انگ کا جس خوبصورتی سے سراپا کھینچا ہے۔ اس کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے جو بڑی دلکش، بڑی جاذب نظر اور بڑی جذبات انگیز ہے۔

حکمت و فلسفہ اور ضرب الامثال

گزشتہ صفحات میں حکمت و فلسفہ اور عقلمندی کی باتوں کے متعلق تفصیل سے لکھا جاچکا ہے۔ جاہلی شعراء کے کلام میں حکیمانہ مقولے، عقلمندی کی باتیں، زندگی کے تجربات کے بعد آتی ہیں۔ اس لئے جب انھوں نے ایسی باتیں اپنے کلام میں کہی ہیں تو وہ ضرب الامثال بن گئی ہیں۔ حکمت و فلسفہ اور عقلمندی کی باتیں کہنے والے اس دور جہالت میں خال خال تھے، اس لئے جب کسی شاعر کے منہ سے ایسی باتیں نکلتی تھیں تو ان کا اثر بہت ہوتا تھا۔ اس صنف میں زہیر بن ابی سلمی نے دور جاہلی میں نام پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد نابغہ الذبیانی کا نام آتا ہے۔

جاہلی دور میں اشعار کے معانی و موضوع

مذکورہ بالا اصناف سخن سے متعلق جو خیالات و احساسات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں انھیں وہ الفاظ کا جامہ پہنا کر اشعار کے روپ میں پیش کرتا ہے، اور اسی روپ کو معانی یا موضوع کہتے ہیں۔ اشعار میں جس قدر معانی یا موضوع صاف واضح اور موثر اور حقیقت سے قریب ہوں گے۔

(بقیہ ص ۱۴۶ کا)

كأن ثبيراً في عرانين وبله   كبير أناس في بجاد مزمل

طرفہ نے اپنی محبوبہ کے دیار کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

لخولة أطلال ببرقة ثهمد   تلوح كباقي الوشم في ظاهر اليد

محبوبہ کے دیار کا نقشہ ایک مدت گزرنے کے بعد امرؤالقیس کی زبانی:

قفا نبك من ذكرى حبيب وعرفان   ورسم عفت آياته منذ أزمان

أتت حجج بعدي عليها فأصبحت   كخط زبور في مصاحف رهبان

اسی اعتبار سے کلام کو اچھا اور معیاری سمجھا جاتے گا۔ اس معیار کے مطابق جاہلی شاعری میں حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

۱۔ جاہلی شاعری کے معانی و موضوع بہت واضح، صاف اور حقیقت و واقعیت سے بہت قریب اور بعض حالات میں بالکل مطابق ہیں۔

۲۔ جاہلی شاعری میں اتنا مبالغہ اور غلو نہیں ہے کہ اس کے معانی و مطالب انسانی فطرت اور اور روزمرہ کی زندگی اور واقعات سے مطابقت نہ کھائیں۔

۳۔ جاہلی شاعری میں مشکل اور ایسے موضوع جن کے سمجھنے میں ذہن و فکر پر بہت زور دینا پڑے، بہت کم ہیں۔ اسی طرح حقیقت سے دور تشبیہیں، دور از کار استعارے، بہت گہرے اور دقیق مضامین، حسن تعلیل اور دوسرے اصناف بلاغت جن کو سمجھنے کے لئے بہت غور و فکر اور کد کاوش کی ضرورت پڑے، نہ ہونے کے برابر ہیں۔

۴۔ جاہلی شعرا کے کلام میں موضوع اور فکر میں ہم آہنگی اور ترتیب کا بڑی حد تک فقدان ہے۔ چنانچہ جو خیال اور موضوع جس طرح ان کی سمجھ میں آیا، اپنے اشعار میں باندھ دیتے تھے۔ یہ خیال نہیں رکھتے تھے کہ ان کے افکار و خیالات میں کوئی ترتیب اور ہم آہنگی ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاعر ایک چیز کے بارے میں بیان کر رہا ہے مگر بغیر کسی مناسبت کے دوسرے معنی اور موضوع کی طرف منتقل ہو گیا، جس کا تعلق پہلے مضمون یا خیال سے بالکل نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر پہلے موضوع کی طرف لوٹ آیا، اور ابھی ختم نہیں ہوا کہ تیسرا مضمون شروع کر دیا۔ اس کی وجہ ہے کہ عرب اس دور میں عام طور سے فی البدیہہ اور بغیر ذہن و فکر پر بہت زور ڈالے، شعر کہتے تھے۔ چنانچہ جو موضوع اور جو خیال جس ترتیب سے ان کے ذہن میں آتا گیا، اسے بیان کرتے گئے۔ اسی لئے بعض پیشہ ور شاعر پورے پورے قصیدے کہنے کے بعد ان پر نظر ثانی کر کے ان میں کتر بیونت اور کاٹ چھانٹ کرتے تھے تاکہ معانی و مطالب اور افکار و خیالات مسلسل، مرتب اور مربوط ہو جائیں اور ایک دوسرے میں ہم آہنگی اور موافقت پیدا ہو جائے۔

جاہلی شاعری کے الفاظ اور اسالیب بیان

چونکہ عرب بدوی قوم تھی اور شاعری کا ملکہ اس کے اندر فطری تھا۔ اس لئے بغیر تکلف اور ذہن و فکر پر زور ڈالے شعر کہتی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے اشعار جیسا کہ پہلے گزرا، صاف

اور واضح ہوتے تھے جن میں نہ تکلف ہوتا تھا اور نہ مبالغہ اور نہ جزرسی اور دقت پسندی جس کی وجہ سے موضوع اور خیال کھل کر سامنے آجاتا تھا۔ یہ صفت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب موضوع کو بیان کرنے کے لئے مناسب الفاظ انتخاب کر کے شعر کہے جائیں۔ چنانچہ الفاظ اور اسلوب بیان کے اعتبار سے جاہلی شاعری میں حسب ذیل خصوصیات ملتی ہیں۔

۱۔ جاہلی شعرا معانی اور موضوع کے لحاظ سے مناسب ترین اور خوبصورت ترین الفاظ استعمال کرتے تھے۔ یہ اس وجہ سے تھا کہ وہ الفاظ کے صحیح معنی اور استعمال کے صحیح موقع و محل کو خوب سمجھتے تھے۔

۲۔ عام طور سے جاہلی شعرا بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ استعمال کرتے تھے۔

۳۔ عام طور سے جاہلی شعرا ان الفاظ کو استعمال کرتے تھے جنھیں بعد میں آنے والے شعرا محدثین (عہد عباسی کے نوجوان شعرا) نے اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ ان کے زمانے میں ان کے معنی بدل گئے تھے یا پورے معنی نہیں دیتے تھے۔ یا اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ انھوں نے ان کی جگہ نسبتاً اور عام فہم الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیا۔

۴۔ جاہلی شعرا کے کلام میں مجاز کا استعمال بقدر ضرورت سے زیادہ نہیں ملتا۔

۵۔ جاہلی شعرا "عجمی" یعنی غیر عربی الفاظ کے استعمال کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ اس قسم کے الفاظ اگر کہیں ملتے ہیں تو صرف بطور خوش مذاقی، دلچسپی اور سخن گسترانہ بات کے طور پر جیسے کہ اعشیٰ کے اشعار میں بعض فارسی الفاظ، مثلاً "گل" "یاسمین" وغیرہ ملتے ہیں۔[1]

۶۔ علم بدیع کے اصناف مثلاً "الجناس" "المقابلہ" اور "المطابقہ" وغیرہ کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔

۷۔ اپنے کلام میں ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتے تھے جس کے ذریعے معانی اور اغراض بہت جلد اور خوبصورتی سے ذہن میں منتقل ہو جائیں۔ اور شعر کی لذت اور اثر دوبالا ہو جاتے۔ اس کے لئے وہ کبھی "تجاہلِ عارفانہ" کا انداز اختیار کرتے اور کہیں محبوبہ کے اجڑے دیار اور ان کی نشانی ٹیلوں کو اپنا مخاطب بناتے اور ان سے اپنا دکھ درد کہتے یا گزشتہ حسین دنوں کا ذکر کر کے

۱۔ جیسا اس کا قول "شاهدنا الجل والياسمين" والسمعات بالقصابها۔ آج تک عرب لوگ "گل" کہا کرتے ہیں۔

بجر و فراق کی موجودہ تکلیف دہ زندگی کا تذکرہ کرتے۔

۸۔ ایجاز یعنی اختصار کو "اسہاب" یعنی تفصیل پر ترجیح دیتے تھے۔

جاہلی شاعری میں وزن اور قافیہ

عربوں میں موزونیِ طبع فطرتاً پائی جاتی تھی، اور وہ ہمیشہ سے شاعری کرتے رہے ہیں۔ لیکن انھوں نے عروض و قوافی کی تعلیم نہ تو حاصل کی اور نہ اس کی طرف کوئی توجہ کی۔ وہ شعر کہتے تھے، انھیں گاتے تھے، لوگوں کو محفلوں اور مشاعروں میں سناتے تھے، اور اپنے اونٹوں کو سنا کر تیز چلاتے تھے۔ یہ اشعار مختلف بحروں یعنی اوزان میں ہوتے تھے۔ اور جہاں تک قافیہ کا سوال ہے وہ بھی ضرور ہوتا تھا لیکن عربوں کو اس کا واضح علم نہیں تھا اور نہ ہی اس کا شاید احساس کہ وہ اپنے اشعار ایک خاص نغمگی اور وزن کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ موسیقیت اور تاثر پیدا ہو رہا ہے مگر اس کے باوجود ان کا کوئی شعر وزن اور عروض کے حدود سے باہر نہیں ہے۔ مشہور نحوی عالم خلیل بن احمد نے جاہلی شعرا کے کلام کا مطالعہ اور چھان بین کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ عربی شاعری کے تمام نمونے ایک خاص وزن اور لحن پر کہے گئے ہیں اور انھیں کو اصطلاح میں بحر (METRE) کہتے ہیں، عربی شاعری میں یہ بحریں ۱۵ ہیں۔ جن کے نام اس نے متعین کئے اور جو آج تک عمل ہے۔ بعد میں ایک دوسرے نحوی اخفش نے ایک وزن اور بڑھایا جس کا نام متدارک رکھا۔

یہ بات خاص طور سے یاد رکھنے کی ہے کہ بعض شعرا صرف ایک ہی بحر یا ایک ہی وزن میں شعر کہتے تھے۔ دیگر اوزان اور بحریں ان کے یہاں نہیں ملتیں۔ اسی طرح سے عرب اپنے تمام اشعار میں ایک ہی قافیہ کی پابندی کرتے تھے۔

دورِ جاہلی میں مختلف اصنافِ شعر کے نمونے

اب ہم ذیل میں جاہلی دور کی شاعری کے نمونے مع ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

غزل یا نسیب

الصمہ بن عبداللہ القشیری

یہ حماسہ کا شاعر ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے اپنی چچا زاد بہن 'ریّا' سے محبت تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے چچا سے 'ریّا' کا رشتہ مانگا۔ چچا نے کہا کہ اگر ایک سو اونٹ دو تو شادی کر دوں گا۔ الصمۃ نے اپنے باپ سے چچا کی بات بتائی۔ چنانچہ الصمۃ کا باپ اونٹ لے کر اپنے بھائی کے پاس گیا، اور کہا کہ یہ لو اونٹ، اور اپنی بیٹی ریّا کی شادی میرے بیٹے سے کر دو۔ جب ریّا کے باپ نے اونٹ گنے تو ایک کم نکلا۔ اس پر اس نے کہا کہ میں تو پورے سو لوں گا، تب شادی کرونگا۔ الصمۃ کا باپ بخیل آدمی تھا اس نے کہا کہ خدا کی قسم اس سے زیادہ ہرگز نہ دوں گا۔ اس پر بات بگڑ گئی اور ریّا کے باپ نے الصمۃ سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ الصمۃ نے جب دیکھا کہ وصال کی اب کوئی شکل نہیں ہے تو وہ اپنے اونٹ پر بیٹھا اور قبیلہ چھوڑ کر باہر چلا گیا اور وہیں تنہائی کی زندگی گزار کر مر گیا۔ مندرجہ ذیل غزل اس نے اپنی محبوبہ ریّا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑتے وقت کہی تھی۔

حننت الی ریّا و نفسک باعدت   مزارک من ریّا وشعبا کما معا

ترجمہ۔ تیرے دل میں ریّا سے ملنے کا شدید اشتیاق پیدا ہوا مگر خود تمہارے دل نے ہی تمہارے اور اس کے درمیان جدائی و فراق پیدا کر دیا۔ حالانکہ تم دونوں کے قبیلے ایک ساتھ ہی رہ رہے تھے۔

فما حسن ان تأتي الامر طائعا   وتجزع إن داعي الصبابة أسمعا

ترجمہ: یہ تو کچھ اچھی بات نہیں ہے کہ تم دنیائے شوق میں تو راضی خوشی آؤ۔ مگر جب رسولِ محبت تم کو بلائے تو رونے دھونے لگو۔

قفا ودعا نجدا ومن حل بالحمیٰ   وقل لنجد عندنا أن تودعا

ترجمہ۔ اے میرے دونوں دوستو! ذرا ٹھہرو اور نجد اور وہاں کے باسیوں کو رخصت تو کر لو اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے تو نجد کو بہت ہی کم الوداع کہا ہے کیونکہ وہ محبوبہ کی نگری ہے۔

بنفسی، تلک الارض ما أطیب الربیٰ   وما أحسن المصطاف والمتربعا

ترجمہ۔ میری جان کی قسم اس کی سرزمین کے ٹیلے کتنے حسین ہیں اور یہ سرزمین فصلِ بہار اور گرمی گزارنے کے لئے کتنی پیاری اور جان فزا ہے۔

فلیست عشیات الحمیٰ برواجع   الیک ولکن خل عینیک تدمعا

ترجمہ۔ اب تو تمہارے پاس اس نگری کی شامیں دوبارہ لوٹ کر نہیں آسکتیں۔ اس لئے اب اپنی آنکھوں کو آنسوؤں کی لڑیاں پرونے دو۔

تلفت نحو الحیٔ حتی وجدتنی   وجعت من الاصغاء لیتا واُخدعا

ترجمہ۔ میں محبوبہ کی نگری کی طرف پلٹ پلٹ کر اتنی دیر تک دیکھتا رہا کہ میری گردن کی "لیتا" اور "اخدع" رگ میں سخت درد ہونے لگا۔

وأذکر أیام الحمیٰ ثم انثنی   علی کبدی من خشیۃ أن تصدعا

ترجمہ۔ میں جب محبوبہ کے دیار میں اس کے ساتھ گزشتہ دنوں کو یاد کرتا ہوں تو ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیتا ہوں کہ کہیں پھٹ نہ جائے۔

الحسین بن مطیر الاسدی

(اس غزل میں جاہلی شاعر کا ذوقِ جمال اور عورت کے صفات تن بھی ظاہر ہوتے ہیں)

لقد کنت جلدا قبل أن توقد النوی   علی کبدی جمرا بطیئا خمودها

وقد کنت أرجو أن تموت صبابتی   إذا قدمت أیامها وعهودها

فجعلت فی حبۃ القلب والحشا   عهاد الهوی تولی بشوق یعیدها

بسود نواصیها وحمر أکفها   وصفر تراقیها وبیض خدودها

مخصرۃ الأوساط زانت عقودها   بأحسن مما زینتها عقودها

ترجمہ:

(۱) ہجر و فراق کے میرے دل پر ایسے انگارے جلانے سے پہلے، جو بڑی دیر میں بجھتے ہیں، میں بڑا کٹھور اور دلیر تھا۔

(۲) مجھے امید تھی کہ محبوبہ کے عہد و پیمان پر جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا میری محبت خود بخود مرجائے گی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا کیونکہ:

(۳) مگر اس محبت نے تو ایسا کر دیا ہے کہ میرے دل و دماغ پر ہر وقت دکھ درد کی گھٹا چھائی رہتی ہے۔ جیسے شوق فراوان بار بار ستاتا رہتا ہے۔

(۴) اور یہ ہوا ہے کالی گھنیری زلفوں والی، مہندی رچے سرخ ہتھیلیوں والی زیوروں سے جھلملاتے سینوں والی اور گورے گورے رخساروں والی نازنینوں کی (محبت) کی وجہ سے۔

(۵) میری محبوبہ کی کمر پتلی ہے اور اس نے اپنے ہار کو اس سے کہیں زیادہ حسن بخشا ہے جتنا کہ ہار نے اسے بخشا ہے۔

فخر و حماسہ

المرقش الاکبر

ان تبتدر غاية يوما لمكرمة … تلق السوابق منا والمصلينا

وليس يهلك منا سيد أبدا … الا افتلينا غلاما سيدا فينا

إنا لنرخص يوم الروع أنفسنا … ولو نسام بها في الأمن أغلينا

شمث مقادمنا نهبى مراجلنا … نأسو بأموالنا آثار أيدينا

إني لمن معشر أفنى أوائلهم … قول الكماة ألا أين المحامونا

لو كان في الألف منا واحد فدعوا … من فارس خالهم إياه يعنونا

إذا الكماة تنحوا ان يصيبهم … حد الظبات وصلناها بأيدينا

ولا تراهم وان جلت مصيبتهم … مع البكاة على من مات يبكونا

ترجمہ:

(۱) اگر کسی روز بھلائی کے کسی نقطہ (مقصود) تک پہنچنے میں پہل کرنے کا موقع آتا ہے تو ہم ہی میں سب سے پہلے پہنچنے والے اور اس کے بعد پہنچنے والے پاؤ گے۔ رہی ہوئی ... ہمارے ہی

آدمی ہوں گے)

(۲) جب کبھی ہمارا کوئی سردار ہلاک ہو جاتا ہے، تو اس کی جگہ پر ہم اپنے کسی نوجوان کو سردار بنا لیتے ہیں۔

(۳) ہم جنگ کے دن اپنی جانوں کو سستی کر دیتے ہیں، اور اگر ان جانوں کا سودا امن کے زمانے میں کیا جاتے تو ہم بہت مہنگے پڑتے ہیں۔

(۴) ہماری پیشانیاں (میدان جنگ کے گرد و غبار کی وجہ سے) گرد آلود ہیں اور ہماری ہتیلیاں لوٹی کھسوٹی پڑی ہیں (یعنی مہمان نوازی کرتے کرتے ہماری ہتیلیاں ہر وقت خالی رہتی ہیں) اور اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کا علاج ہم اپنے مال سے کرتے ہیں یعنی قتل کرنے کے بعد ہم خون بہا دیدیتے ہیں۔

(۵) میں ایسے لوگوں کا فرد ہوں کہ ان کے پرکھوں کو بہادروں کے اس قول نے ختم کر دیا کہ ہمیں بچانے والے کہاں ہیں؟ یعنی ہمارے آبا و اجداد اتنے بہادر تھے کہ بڑے بڑے بہادر بھی انہیں مدد کے لئے پکارتے تھے۔

(۶) ایک ہزار آدمیوں میں بھی اگر ایک آدمی ہمارا ہوتا ہے اور لوگ آواز لگائیں کہ ہے کوئی شہسوار تو یہ سمجھتا ہے کہ لوگ اسی کو بلا رہے ہیں۔

(۷) جب بہادر لوگ اس خطرہ سے آنا کانی کرنے لگیں کہ کہیں تلوار کی دھار ان پر نہ پڑ جائے۔ تو ہم اپنے ہاتھوں سے ان دھاروں سے ملتے ہیں۔

(۸) وہ لوگ (میرے ہم قبیلہ) اتنے صابر اور جری دل ہیں کہ مصیبت چاہے کتنی بڑی ہی کیوں نہ ہو، رونے والوں کے ساتھ روتے نہیں، یا مصیبت ان پر آن پڑے پھر بھی تم ان کو رونے والوں کے ساتھ روتا ہوا نہ دیکھو گے۔

عمرو بن کلثوم

وقد علم القبائل من معد — اذا قبب بابطحها بنينا

بانا المطعمون اذا قدرنا — وإنا المهلكون إذا ابتلينا

وإنا المانعون لما أردنا — وانا النازلون بحيث شينا

وإنا التاركون اذا سخطنا — وإنا الآخذون إذا رضينا

وإنا العاصمون إذا أطعنا — وإنا العازمون إذا عصينا

ونشرب إن وردنا الماء صفوا — ويشرب غيرنا كدرا وطينا
إذا ما الملك سام الناس خسفا — أبينا أن نقر الذل فينا
ملأنا البر حتى ضاق عنا — وملء البحر نملؤه سفينا
إذا بلغ الفطام لنا صبي — تخر له الجبابر ساجدينا

ترجمہ:۔

(۱) معد کے قبیلوں کو یہ بات اس وقت معلوم ہوئی جب ہم نے اپنے گھران کی زمینوں میں بنا تے کر:۔

(۲) جب ہمیں قدرت حاصل ہو جاتی ہے تو ہم خوب کھلاتے پلاتے ہیں اور جب ہماری آزمائش کی جاتی ہے تو ہم ہلاک کر دیتے ہیں۔

(۳) ہم جس چیز کو چاہتے ہیں، روک دیتے ہیں اور جہاں ہمارا جی چاہتا ہے ہم اتر پڑتے ہیں۔

(۴) اور جب ہم غصہ ہوتے ہیں تو بالکل ترک تعلق کر لیتے ہیں اور جب خوش ہوتے ہیں تو دستگیری کرتے ہیں (بعض شارحین نے یہ ترجمہ کیا ہے کہ جب ہم غصہ ہو جاتے ہیں تو ہدیہ وغیرہ نہیں لیتے اور جب خوش ہوتے ہیں تو تحفہ تحائف لے لیتے ہیں) [1]

(۵) اور جب ہماری اطاعت کی جاتی ہے تو ہم پشت پناہی کرتے ہیں اور جب ہماری نافرمانی کی جاتی ہے تو ہم بدلہ لینے کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں۔

(۶) اور جب ہم گھاٹ پر پانی پینے کے لئے آتے ہیں تو صاف ستھرا پانی پیتے ہیں اور ہمارے علاوہ دوسرے لوگ گدلا اور مٹی ملا پانی پیتے ہیں۔

(۷) جب بادشاہ لوگوں کو اپنے سامنے ذلیل وخوار ہونے کے لئے مجبور کرنے لگیں، تو ہم اپنے اندر ذلت کو برداشت کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

(۸) ہم نے خشکی کو اپنے آدمیوں سے اتنا بھر دیا ہے کہ وہ تنگ ہو گئی ہے اور سمندر کے پانی کو اپنی کشتیوں سے بھر دیا ہے۔

(۹) جب ہمارا کوئی بچہ دودھ چھوٹنے کی عمر کو آتا ہے، تو اسی وقت سے اس کے سامنے بڑے بڑے جابر لوگ سجدہ کرنے لگتے ہیں۔

۱۔ نعقدنی۔

عنترہ بن شداد العبسی

لما رأیت القوم أقبل جمعهم   یتذامرون کررت غیر مذمم

یدعون عنتر والرماح کأنها   أشطان بئر فی لبان الأدہم

ما زلت ارمیہم بثغرۃ نحرہ   ولبانہ حتی تسربل بالدم

فازور من وقع القنا بلبانہ   وشکا إلی بعبرۃ وتحمحم

لو کان یدری ما المحاورۃ اشتکی   ولکان لو علم الکلام مکلمی

ولقد شفی نفسی وأذہب سقمہا   قیل الفوارس ویک عنتر اقدم

والخیل تقتحم الخبار عوابسا   من بین شیظمۃ واخر شیظم

ترجمہ۔

(۱) جب میں نے دیکھا کہ مخالف قوم کا گروہ ایک دوسرے کو جنگ پر ابھارتے ہوتے آیا ہے تو میں نے بہت ہی قابل تعریف حملہ کیا۔

(۲) لوگ مجھے عنترہ کہہ کر پکار رہے تھے اور نیزے اس تیزی سے میرے گھوڑے کے سینے پر پڑ رہے تھے کہ جیسے کہ بٹی ہوئی موٹی رسیاں کنویں میں پڑتی ہیں۔

(۳) میں اپنے گھوڑے کی گردن کی ہڈی اور سینہ پر سے برابر نیزہ بازی کئے گیا، یہاں تک کہ گھوڑا خون میں شرابور ہوگیا۔

(۴) تو گھوڑے نے اپنے سینے پر نیزوں کے مستقل پڑنے کی وجہ سے منہ پھیر لیا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور ہنہناہٹ سے اپنی تکلیف مجھ سے بیان کی۔

(۵) اگر اسے گفتگو کرنی آتی ہوتی، اور بات کرنا جانتا ہوتا تو یقیناً وہ مجھ سے اپنا دکھ درد زبان سے بیان کرتا۔

(۶) میرے دل کو بڑی تسلی ہوئی اور اس کی تکلیف شہسواروں کے اس کہنے سے بالکل جاتی رہی کہ عنترہ بھلا کرے خدا تمھارا، بڑھے رہنا۔

(۷) اور حالت یہ تھی کہ گھوڑے منہ بسورے ہوتے میدان جنگ کی نرم زمین میں گھسے جا رہے تھے۔ ان میں بڑے ڈیل ڈول کے گھوڑے اور گھوڑیاں دونوں تھیں۔

مدح

زہیر بن ابی سلمٰی

ہرم بن سنان کی تعریف کرتے ہوئے

وأبيض فياض يداه غمامة — على معتفيه ما تغب فواضله

أخي ثقة لا يهلك الخمر ماله — ولكنه قد يهلك المال نائله

تراه إذا ما جئته متهللاً — كأنك تعطيه الذي أنت سائله

(۱) زہیر بن ابی سلمٰی نے ہرم بن سنان کی تعریف میں کہا ہے کہ میرا ممدوح پاکباز و سرخرو اور بڑا سخی داتا ہے۔ اس کے ہاتھ بارش کی طرح ہیں اور جو لوگ اس کی طرف دست سوال دراز کرتے ہیں ان سے ان کی داد و دہش کبھی ختم نہیں ہوتی۔

(۲) وہ بھروسے کے لائق ہے اور شراب اس کے مال کو ختم نہیں کر پاتی لیکن اس کی سخاوت البتہ اس کے مال کو ختم کر سکتی ہے:

(۳) جب تم اس سے مانگنے کی غرض سے اس کے پاس آتے ہو تو اسے دیکھو گے کہ وہ اتنا خوش ہوتا ہے کہ جیسے تم ہی اسے وہ چیز دے رہے ہو جو تم اس سے مانگ رہے ہو۔

الاعشٰی

محلق کی تعریف میں

لعمري لقد لاحت عيون كثيرة — إلى ضوء نار باليفاع تحرق

تشب لمقرورين يصطليانها — وبات على النار الندى والمحلق

رضيعي لبان ثدي أم تقاسما — بأسحم داج عوض لا نتفرق

ترى الجود يجري ظاهراً فوق وجهه — كما زان متن الهندواني رونق

يداه يدا صدق فكف مبيدة — وكف إذا ما ضن بالمال تنفق

(۱) میری جان کی قسم بہت سی آنکھیں اس آگ کی روشنی کی طرف اٹھ گئیں جو ایک ویرانے میں جلائی جا رہی تھی۔

(۲) یہ آگ دو سردی کھائے ہوئے آدمیوں کے لئے جلائی جا رہی تھی جو اسے تاپ رہے تھے اور وہ سخاوت اور محلق تھے جنھوں نے اپنی ساری رات اس آگ کے پاس گزار دی۔

(۳) دونوں نے ایک ہی ماں کی چھاتیوں کا دودھ پیا ہے اور انھوں نے ایک گھنگھور تاریک

رات میں قسم کھائی تھی کہ کبھی بھی ایک دوسرے علیحدہ نہ ہوں گے۔

(۴) تم اس کے چہرے کی طرف دیکھو، تو تمھیں اس پر سخاوت کی آن بان جھلکتی نظر آئے گی۔ جس طرح ہندوستان کی بنی تلوار کی دھار کو آب وتاب نکھار دیتی ہے۔

(۵) اس کے دونوں ہاتھ درحقیقت جود وسخا کے ہاتھ ہیں، تو ایک ہتیلی مال کو ٹھکانے لگاتی ہے اور دوسری جب لوگ مال خرچ کرنے میں بخل کرنے لگیں تو خرچ کرتی ہے۔ یعنی جب خشک سالی ہوتی ہے اور لوگ بچا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، تو یہ خرچ کرتا ہے۔

ھجو

قریط بن انیف

نے اپنے قوم کی ہجو ملیح کرتے ہوتے اور انھیں بزدلی پر عار دلاتے ہوتے کہا:

لو كنت من مازن لم تستبح ابلى	بنو اللقيطة من ذهل بن شيبانا
لكن قومى وان كانوا ذوى عدد	ليسوا من الشر فى شئ وان هانا
يجزون من ظلم أهل الظلم مغفرة	ومن إساءة أهل السوء احسانا
كأن ربك لم يخلق لخشيته	سواهم من جميع الناس انسانا
فليت لى بهم قوما اذا ركبوا	شدوا الاغارة فرسانا وركبانا

(۱) اگر میں خاندان مازن کا فرد ہوتا تو ذہل بن شیبان کے بیہتو لڑکی کی اولاد میرے اونٹوں کو آسانی سے یوں مفت میں نہ لے جا سکتے تھے۔

(۲) لیکن میری قوم چاہے کتنی بڑی تعداد میں کیوں نہ ہو، برائی میں چاہے کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، نہیں پڑتی۔

(۳) میرے آدمی ظلم کرنے والوں کے ظلم کا بدلہ معافی سے اور بدکیش لوگوں کی برائیوں کا حسن سلوک سے دیتے ہیں۔

(۴) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے رب نے اپنے سے ڈرنے کے لئے تمام لوگوں میں سے صرف انھیں کو پیدا کیا ہے۔

(۵) کاش مجھے ان کے بدلے میں ایسی قوم ملتی کہ جو گھوڑے پر اور اونٹ پر بیٹھ کر سخت حملہ کرتی۔

معذرت خواہی

النابغہ الذبیانی

نعمان بن المنذر سے معذرت کرتے ہوئے

حلفت فلم اترک لنفسک ریبۃ — ولیس وراء اللہ للمرء مذھب
لئن کنت قد بلغت عنی خیانۃ — لمبلغک الواشی أغش وأکذب
ولکنني کنت امرأ لی جانب — من الارض فیہ مستراد ومذھب
ملوک واخوان إذا ما أتیتھم — أحکم فی أموالھم وا قرب
کفعلک فی قوم أراک اصطنعتھم — فلم ترھم فی شکرذ لک اذ نبوا
فلاتترکنی بالوعید کأنني — إلی الناس مطلی بہ القار أجرب
ألم تر أن اللہ اعطاک سورۃ — تری کل ملک دونھا یتذبذب
بأنک شمس والملوک کواکب — إذا طلعت لم یبد منھن کوکب
ولست بمستبق أخا لا تلمہ — علی شعث أی الرجال المھذب

ترجمہ:-

(۱) میں نے ایسی قسم کھائی ہے جس کے بعد (میری صداقت میں) کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی، کیونکہ اللہ کے بعد آدمی کے لئے اور کوئی جائے پناہ نہیں رہ جاتی۔

(۲) اگر آپ کو میری طرف سے کسی خیانت کی اطلاع دی گئی ہے تو (یقین کیجیے کہ) آپ کو یہ خبر دینے والا چغلخور، دھوکہ باز اور جھوٹا ہے۔

(۳) میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ زمین پر میرے لئے ایسا حصہ ہے جہاں میں آجا سکتا ہوں۔

(۴) یہ چند بادشاہ اور بھائی ہیں، جب میں ان کے پاس پہنچ جاتا ہوں تو ان کے مال کا حکم بنا لیا جاتا ہوں، اور قریب کر لیا جاتا ہوں۔

(۵) بالکل آپ کے اسی عمل کی طرح کہ جب آپ کسی قوم کے ساتھ حسن سلوک اور بھلائی کرتے ہیں تو وہ حسن سلوک اور بھلائی پر شکریہ ادا کر کے گنہگار نہیں ہو جاتے ہیں۔

(۶) آپ مجھے دھمکی دے کر یوں نہ چھوڑ دیں کہ میں لوگوں کے درمیان ایسا دکھائی دوں جیسا تارکول ملا ہوا خارشتی اونٹ۔

(۷) کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ نے آپ کو ایسا رعب و دبدبہ دیا ہے کہ آپ کے سامنے سارے بادشاہ کانپتے رہتے ہیں۔

(۸) وہ یوں کہ آپ سورج ہیں اور دوسرے تمام بادشاہ ستارے ہیں اور جب سورج طلوع ہوجاتا ہے تو ستارے غائب ہوجاتے ہیں۔

(۹) آپ کوئی ایسا بھائی نہ رکھ پائیں گے جسے اس کی لغزش پر آپ کو سرزنش کرنے کی نوبت نہ آئے۔ پورے مہذب لوگ کہاں ملتے ہیں؟

مرثیہ

قس بن ساعدہ الأیادی

نے اپنے دو بھائیوں کی قبر پر کھڑے ہو کر مرثیہ کے یہ اشعار پڑھے

خلیلی ھبا طالما قد رقدتما — اجدکما لا تقضیان کراکما

ألم تعلما أنّی بسمعان مفرد — ومالی فیہ من حبیب سواکما

اقیم علی قبریکما لست بارحا — طوال اللیالی أو یجیب صداکما

جری الموت مجری اللحم والعظم منکما — کأن الذی یسقی العقار سقاکما

فلو جعلت نفس لنفس وقایۃ — لجدت بنفسی ان تکون فداکما

سابکیکما طول اللیالی وما الذی — یرد علی ذی عولۃ إن بکاکما

(۱) میرے دونوں دوستو اب اٹھ بھی جاؤ، بڑی دیر تک سو لئے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تم اپنی نیند پوری نہیں کر پاؤ گے۔

(۲) کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں دیر سمعان میں اکیلا رہ گیا ہوں، حالانکہ اس میں تم دونوں کے سوا میرا اپنا کوئی دوست نہیں ہے۔

(۳) میں تم دونوں کی قبروں پر پوری پوری راتیں پڑا رہوں گا اور وہاں سے کہیں نہ جاؤں گا یا تمہاری روح میری بات کا جواب دے۔

(۴) موت تمہارے گوشت اور ہڈیوں تک میں سرایت کر چکی ہے، ایسا لگتا ہے کہ تیز قسم کی شراب پلانے والے نے تمہیں بھی وہ شراب پلا دی ہے۔

(۵) اگر کوئی جان کسی جان کے بدلے میں، بچانے کے لئے دی جا سکتی تو میں اپنی جان تم دونوں پر بلا خوف و خطر نچھاور کر دیتا۔

(۶) میں پوری باتیں تم کو رونے میں بتا دوں گا، اور مصیبت زدہ اگر تم دونوں کو رونے تو اسے بھلا کوئی چیز اس سے روک سکتی ہے۔

وصف : سَراپا، منظرکشی

امرؤ القیس اپنی محبوبہ کا سراپا کھینچتے ہوئے۔ باقی تمام شعرا جاہلی نے کم و بیش اس صنف میں اس کی تقلید کی ہے۔

مهفهفة بيضاء غير مفاضة ترائبها مصقولة كالسجنجل

وجيد كجيد الريم ليس بفاحش اذا هي نصته و لا بمعطل

وفرع يزين المتن أسود فاحم اثيث كقنو النخلة المتعثكل

غدائره مستشزرات الى العلا وتضل المدارى فى مثنى ومرسل

وكشح لطيف كالجديل مخصر . ساق كانبوب السقى المذلل

ترجمہ:۔

(۱) میری محبوبہ گوری، چھٹی اور پتلی کمر والی ہے۔ اس کا پیٹ ڈھلکا ہوا (بدنما) نہیں ہے۔ اس کا سینہ آئینہ کی طرح چکنا اور شفاف ہے۔

(۲) اور اس کی گردن سفید، ہرنی کی گردن جیسی (موزوں) ہے۔ جب وہ اپنی گردن کو اٹھاتی ہے تو اس کی لمبائی بدنما نہیں معلوم ہوتی اور نہ ہی (زیورات نہ ہونے کی وجہ سے) سونی دکھائی دیتی ہے۔

(۳) اور میری محبوبہ کی گندھی ہوئی چوٹی کے بال اتنے کالے اور گھنیرے ہیں کہ پشت کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور اتنے گھنے ہیں کہ جیسے خوشوں سے لدی ہوئی کھجور کے درخت کا خوشہ ہوں۔

(۴) اس کی زلفیں اوپر کو اس طرح اٹھی ہوئی ہیں کہ گندھے ہوئے بال بٹے ہوئے اور لٹکے ہوئے بالوں میں بوجہ کثرت کے کھوئے سے جاتے ہیں۔

(۵) اور اس کی کمر اتنی پتلی اور لچک دار ہے، جیسے کہ اونٹنی کی مہار ہو، اور اس کی پنڈلی ایسی صاف ستھری کہ جیسے سرسبز و شاداب بردی کا پودا ہے جو بہت زیادہ سینچائی کی وجہ سے اتنا نرم و نازک ہو گیا ہے کہ جھکا پڑتا ہے۔

گھوڑے کا سراپا کھینچتے ہوئے :۔

وقد اغتدی والطیر فی وکناتها   بمنجرد قید الأوابد هیکل

مکر مفر مقبل مدبر معا   کجلمود صخر حطه السیل من عل

له أیطلا ظبی وساقا نعامة   وإرخاء سرحان وتقریب تتفل

(۱) میں صبح تڑکے جب کہ چڑیاں اپنے گھونسلوں میں بسیرا لئے ہوتی ہیں، ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل کھڑا ہوتا ہوں جس کے بال کم ہیں اور جو اتنا برق رفتار ہے کہ جنگلی جانوروں کو دوڑ کر پکڑ لیتا ہے اور خوب لمبا چوڑا ہے۔

(۲) (جس کی خوبی یہ ہے کہ) وہ ایک ہی وقت میں جب موقع ہو جھپٹ پڑتا ہے، بھاگ کھڑا ہوتا ہے، آگے بڑھ جاتا ہے اور پیچھے ہٹ آتا ہے۔ اور اتنا سبک رو اور تیز رفتار ہے کہ جیسے وہ سخت پہاڑی کی چٹان ہو، جسے تیز سیلاب کے دھارے نے نیچے کو اوپر سے پھینک دیا ہو۔

(۳) اس کی کمر کے دونوں پہلو ہرن کے پہلوؤں کی طرح باریک ہیں اور اس کی پنڈلیاں شترمرغ کی پنڈلیوں کی طرح لمبی ہیں اور سبک رفتاری ایسی ہے جیسے بھیڑیئے کی دوڑ اور دلکی ایسی جیسے لومڑی کے بچے کی سرپٹ۔

رات کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے :۔

ولیل کموج البحر ارخی سدوله   علی بأنواع الهموم لیبتلی

نقلت له لما تمطی بصلبه   وأردف أعجازا وناء بکلکل

ألا أیها اللیل الطویل ألا انجلی   بصبح وما الإصباح منك بأمثل

نیالك من لیل کأن نجومه   بکل مغار الفتل شدت بیذبل

(۱) اور اس رات نے جو سمندر کی موج کی طرح ہیبت ناک اور تاریک تھی جب مجھے آزمانے کے لئے مختلف قسم کی پریشانیوں اور مصیبتوں کی جھولیں میرے اوپر ڈال دیں۔

(۲) اور جب اس نے اپنی پیٹھ کو لمبا کیا اور اپنے پچھلے حصہ کو پیہم لاتی رہی اور اپنے سینہ کو دراز کیا (یعنی دھیرے دھیرے رات طویل ہونے لگی۔ تشبیہ اونٹ کے بڑی دیر میں اطمینان سے بیٹھنے سے دی گئی ہے) تو میں نے کہا کہ

(۳) اے لمبی رات کیا تو صبح کے جلو میں درخشاں نہیں ہو سکتی، مگر وہ صبح بھی تو تجھ سے زیادہ خوش آئند نہیں ہے (کیونکہ میں دن میں بھی اسی طرح پریشان خاطر اور رنجور رہتا ہوں جس طرح

رات میں بے چین اور بے کل رہتا ہوں۔

(۴) تو بھی کیا خوب رات ہے، مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے کہ تیرے ستارے یذبل پہاڑ (جو نجد میں ہے) سے مضبوط بٹی ہوئی رسیوں سے کس کر باندھ دیئے گئے ہوں۔

حکمت و فلسفہ

زہیر بن ابی سلمیٰ

ومن لم یصانع فی امور کثیرۃ — یضرس بأنیاب ویوطأ بمنسم

ومن یجعل المعروف من دون عرضہ — یفرہ ومن لایتق الشتم یشتم

ومن یک ذا فضل فیبخل بفضلہ — علی قومہ یستغن عنہ ویذمم

ومن یوف لایذمم ومن یہد قلبہ — إلی مطمئن البر لایتجمجم

ومن ھاب أسباب المنایا ینلنہ — وان یرق أسباب السماء بسلم

ومن یجعل المعروف فی غیر أھلہ — یکن حمدہ ذما علیہ ویندم

ومھما تکن عند إمری من خلیقۃ — وان خالھا تخفی علی الناس تعلم

وکائن تری من صامت لک معجب — زیادتہ أو نقصہ فی التکلم

لسان الفتی نصف ونصف فؤادہ — فلم یبق إلا صورۃ اللحم والدم

(۱) اور جو شخص اکثر معاملات میں نرمی اور مدارات سے کام نہیں لیتا، وہ دانتوں سے کاٹ لیا جاتا ہے۔ اور پاؤں سے روند دیا جاتا ہے۔

(۲) اور جو شخص اپنی عزت و آبرو کو نیکی اور بھلائی کے ذریعہ محفوظ رکھتا ہے تو گویا وہ اسے بڑھاتا رہتا ہے، اور جو شخص لوگوں کو گالی گلوچ دینے سے نہیں بچتا، اسے بھی گالی دی جاتی ہے۔

(۳) اور جو شخص اپنی ضرورت سے زیادہ مال و دولت ہونے کے باوجود بھی اپنی قوم کے ساتھ بخل کرتا ہے تو اس سے بے پروائی برتی جاتی ہے اور اس کی برائی کی جاتی ہے۔

(۴) اور جو شخص اپنا عہد و پیمان پورا کرتا ہے، اس کی برائی نہیں کی جاتی اور جس کا دل ایسی بھلائی کی طرف رہنمائی کرے جس سے دل کو سکون و چین نصیب ہو تو ایسا آدمی اس میں پس و پیش نہیں کرتا۔

(۵) اور جو شخص اسباب موت سے ڈرا تو پھر موت اسے پالیتی ہے چاہے وہ زینہ لگا کر آسمان کے

کناروں پر کیوں نہ چڑھ جاتے۔

(۶) اور جو شخص ایسے آدمی کے ساتھ بھلائی کرتا ہے، جو بھلائی کئے جانے کے لائق نہیں ہے تو اس بھلائی کے بدلے تعریف کی جگہ اسے بُرائی ملتی ہے اور اسے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ یعنی

نکوئی با بداں کردن چنانست ۔۔ کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

(۷) اگر کوئی شخص کسی بُری عادت میں مبتلا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ وہ لوگوں کو معلوم نہیں ہوگی تو یہ غلط ہے، کیونکہ ایک نہ ایک دن وہ طشت از بام ہو کر رہے گی۔ یعنی بُرائی کو لاکھ چھپاؤ ایک نہ ایک دن وہ ظاہر ہو کر رہے گی۔

(۸) بسا اوقات ایک چپ اور خاموش انسان تمھیں بہت بھلا لگتا ہے، لیکن اس کی کمی اور زیادتی (یعنی بُرائی اور بھلائی) بولنے میں ہوتی ہے یعنی جب وہ منہ کھولتا ہے تو اسکی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

(۹) زبان نوجوان کا نصف حصہ ہے اور اس کا دل اس کا دوسرا نصف حصہ۔ اب سوائے گوشت اور خون کی شکل کے اور کچھ اس میں بچ نہ رہا یعنی درحقیقت انسان زبان اور عقل سے عبارت ہے گوشت پوست یعنی شکل وصورت کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

ضرب الامثال

طرفہ بن العبد

کل خلیل کنت خاللتہ ۔۔ لاترک اللہ لہ واضحہ

کلھم أروغ من ثعلب ۔۔ ما اشبہ اللیلۃ بالبارحہ

ترجمہ:-

(۱) ہر دوست جس سے میں نے دوستی کی ، خدا نے اس کے دانت نہ چھوڑے یعنی جس سے بھی میں نے دوستی کی اس نے خندہ پیشانی اور ہنسی خوشی سے نہیں نبایا۔

(۲) سب کے سب لومڑی سے بھی زیادہ چالباز ہیں۔ آج کی رات کل گزشتہ (کل کی رات) سے کتنی مشابہ ہے۔

زمانہ جاہلی کے مشہور شعراء

جیساکہ اوپر گزر چکا ہے کہ عربوں نے زمانہ جاہلی میں شعر کے اکثر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان اصناف میں شعر کہنے والوں کی تعداد بھی زیادہ رہی ہو گی چنانچہ مشہور ادیب اور ناقد عمرو بن العلا کہا کرتے تھے کہ "ما انتهیٰ الیکم مما قالت العرب الا اقله، ولو جاءکم وا فر لجاءکم علم و شعر کثیر" یعنی تم تک عربوں کے کلام میں سے جو کچھ پہنچ سکا ہے وہ بہت تھوڑا ہے اگر تمہارے پاس کافی تعداد میں ان کا کلام آیا ہوتا تو تمہارے پاس علم و شعر کا بہت سا ذخیرہ آگیا ہوتا لیکن اس بیان سے ہم کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے کہ عربوں نے جن جن اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، وہ اصناف کیا تھے۔ اسی طرح اس کے بارے میں بھی کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی کہ ان جاہلی قصیدوں یا کلام کے نمونے کی تعداد کیا تھی۔ البتہ بعض مورخین کا خیال ہے کہ ان کی تعداد ایک سو سے بھی زیادہ تھی۔ اسی طرح بعض کا کہنا ہے کہ دور جاہلی کے شعرا نے ہزاروں اراجیز (رزمیہ کلام) اور سینکڑوں لمبے قصیدے کہے تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عربوں نے اپنی زندگی سے متعلق تمام مسائل پر طبع آزمائی کی تھی۔ اسی لئے اس دور کی شاعری کو "دیوان العرب"[1] کہتے ہیں۔ اور جب ان کی شاعری ان کی زندگی کا رجسٹر ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں اس کے تمام پہلوؤں کی عکاسی رہی ہو گی۔ اور زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کرنے کے لئے سینکڑوں کیا ہزاروں قصیدے بھی ناکافی

۱۔ چنانچہ عام مقولہ ہے کہ "الشعر دیوان العرب" یعنی شعر عربوں کی زندگی کا رجسٹر ہے جس میں ان کی زندگی اور اس کے مظاہر کے تمام پہلو آگئے ہیں۔ اس کو سب سے پہلے عبداللہ بن عباس نے کہا تھا، ابن الأنباری نے اتقان سے نقل کیا ہے کہ "ابن عباس قال یوماً: الشعر دیوان العرب" فاذا خفي علینا الحرف من القرآن... رجعنا إلی دیوانها فالتمسنا معرفته (الاتقان للسیوطی)

ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ سب راویوں، شعر کے یاد کرنے والوں، عالموں اور ادیبوں کے اسلامی جنگوں میں شرکت اور ان میں شہادت کی وجہ سے ضائع ہو گئے۔ اس کے باوجود اسلامی دور میں جب ان کی تدوین اور جمع کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ ابو تمام صاحب حماسہ، شعر و ادب کا مشہور راوی و عالم حمّاد الراویہ، مشہور ماہر لغت اور نقاد الأصمعی اور ابو ضمضم وغیرہ کو زمانہ جاہلی کے ہزاروں قصیدے، رجزیہ کلام اور چھوٹے بڑے لاتعداد قصیدے یاد تھے۔

جاہلی شعرا میں سے بعض ممتاز شعرا نے بڑے لمبے قصیدے کہے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف ان کو بلکہ ان کے قصیدوں کو بھی شہرت دوام حاصل ہو گئی۔ اس نقطۂ نظر سے ان شعرا کو سات طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر طبقہ میں تقریباً سات ہی نامور شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔

۱۔ اصحاب المُعَلَّقَات
۲۔ اصحاب المُجَمْهَرَات
۳۔ اصحاب المُنْتَقَيَات
۴۔ اصحاب المُذَهَّبَات یا المُذَهَّبَات
۵۔ اصحاب المراثی
۶۔ اصحاب المَشُوبَات
۷۔ اصحاب المُلْحَمَات

مذکورہ بالا تقسیم میں بعض شعرا عہد اسلامی کے بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں طبقہ کے شعرا میں نامی اور قادر الکلام شعرا وہ ہیں جن کو شہرت اور ناموری اسلامی عہد کے اول زمانہ میں حاصل ہوئی۔

شروع کے چار طبقوں میں اکثر جاہلی شعرا آجاتے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور شعرا وہ ہیں جنھوں نے معلقات کہے ہیں۔[1]

معلقات کی حقیقت:۔

مورخین ادب میں اس بات میں خاصا اختلاف رہا ہے کہ معلقات کن قصیدوں کو کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ وہ لمبے قصیدے ہیں جنھیں عربوں نے اتنا پسند کیا کہ انھیں سونے کے پانی

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: جرجی زیدان جلد اوّل ص ۹۷، اور طبقات الشعرا، عبدالسلام ندوی

سے لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا تھا۔ لیکن بعض اس خیال کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لٹکائے نہیں گئے تھے بلکہ حماد راویہ نے جب یہ دیکھا کہ لوگوں کو شعر و شاعری سے دلچسپی کم ہونے لگی ہے تو اس نے یہ قصیدے جمع کئے اور لوگوں کو سنایا اور کہا کہ یہی جاہلی زمانہ کے مشہور قصیدے ہیں۔ اس لئے ان کا نام مشہور قصیدے رکھا گیا۔ لیکن اکثر مورخین، نقاد اور راویوں کا اتفاق ہے کہ یہ قصیدے خانہ کعبہ میں لٹکائے گئے تھے۔ اسی لئے انھیں معلقات یعنی "لٹکائے ہوئے" قصیدے کہتے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں ابن عبد ربہ نے العقد الفرید میں اور ابن رشیق نے کتاب العمدۃ میں اور ابن خلدون نے اپنی کتاب میں تفصیل سے لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "عربوں کو شعر و شاعری کا اتنا ذوق تھا کہ انھوں نے جاہلی دور کے سرمایۂ شعر و شاعری میں سے سات بہترین قصیدوں کو چھانٹ کر انھیں سونے کے پانی سے قباطی[1] پر لکھوا کر خانہ کعبہ کے پردے سے لٹکا دیا تھا۔ اسی وجہ سے ان کے نام کے ساتھ" مذہبہ" یعنی سونے کے پانی سے لکھے ہوئے قصیدے لگ گیا ہے۔ چنانچہ کہتے تھے " مذہبۃ امری القیس، مذہبۃ زہیر" یہ مذہبات سات ہیں۔ اور انھیں کو معلقات بھی کہتے ہیں۔" ان معلقات کو مذہبات اس لئے کہتے تھے کہ بہترین قصیدے کو سونے کے پانی سے پہلے قباطی پر لکھا جاتا پھر خانہ کعبہ پر لٹکایا جاتا۔ اور یہی قرین قیاس بھی ہے۔ کیونکہ عربوں کے یہاں دستور تھا کہ اس قسم کے عوامی فیصلوں کو کسی نہ کسی نہج سے خانہ کعبہ سے متعلق ضرور کرتے تھے۔ چنانچہ لڑائی جھگڑے میں اپنے فیصلے، ثالثی یا وساطت کے سارے کام خانہ کعبہ میں بیٹھ کر کرتے تاکہ ہر فریق خانہ کعبہ کے تقدس کی وجہ سے ان کا پابند رہے۔ بنی ہاشم کا قریش نے جب مقاطعہ کیا ہے تو اس فیصلے کو بھی لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا تھا تاکہ سند رہے[2]۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ عربوں نے اپنے شعری سرمایہ کا بہترین حصہ خانہ کعبہ میں لٹکا دیا ہو۔ ان میں سے اکثر قصیدے سوق عکاظ کے ہیں۔

اصحاب معلقات کی تعداد پر بھی علما میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ ان کی تعداد سات ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ان کی تعداد دس ہے۔ مگر متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ وہ شعرا جن کے قصیدے خانہ کعبہ میں لٹکائے گئے تھے، ان کی تعداد سات ہے۔ ویسے سب لمبے اور مشہور قصیدے کہنے والوں کو شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد دس ہو جاتی ہے۔ جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ القباطی ـــ کتان کا کپڑا۔

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے:۔ سیرۃ ابن ہشام، جلد اول، خبر الصحیفہ، اور سیرت کی دوسری کتابیں۔

۱۔ اِمرؤُالقَیس
۲۔ النّابغۃُالذُبیانی
۳۔ زُہیرُبن اَبی سُلمٰی
۴۔ الاَعشیٰ قَیس
۵۔ عَنتَرۃُبن شَدّادالعَبسِیُ
۶۔ طَرَفۃُبن العَبد
۷۔ عَمرُوبن کُلثوم
۸۔ الحارث بن حِلّزہ الیَشکُری
۹۔ لَبِید بن رَبیعہ [1]
۱۰۔ عُروَۃ بن الوَرد

بعض لوگوں نے دُرَیدُبن الصِمَّہ اور مُرَقِّش الاَکبر اور اُمَیّہ بن اَبی الصَّلت کو بھی اصحاب معلّقات میں شامل کیا ہے۔

ان شعرا کو پھر ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے تین طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے:۔

پہلا طبقہ : امرؤالقیس، زہیر بن ابی سلمٰی اور النابغہ الذبیانی
دوسرا طبقہ : الاعشیٰ قیس، لبید بن ربیعہ اور طرفہ بن العبد
تیسرا طبقہ : عنترہ بن شداد العبسی، عروۃ بن الورد، درید بن الصمہ اور مرقش الاکبر۔

جاہلی شعرا کی طبقات میں یہ تقسیم تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ادب کی تاریخ کی ساری کتابوں میں اسی طرح آتی ہے، لیکن محمد بن سلام الجُمَحِیُ نے اپنی کتاب "طَبَقَات فُحول الشعراء" میں دس طبقے قائم کئے ہیں اور ہر طبقہ میں چار شعرا شامل کئے ہیں، لیکن اس کی یہ تقسیم عام ہے۔ اس میں تمام اصناف سخن میں کہنے والے شعرا آگئے ہیں۔

۱۔ لبید بن ربیعہ کو اکثر تذکرہ نگاروں نے دورِ جاہلی کے شعرا میں اس وجہ سے شمار کیا ہے کہ اس نے مسلمان ہونے کے بعد شعروشاعری بالکل ترک کر دی تھی، لیکن جدید تحقیق کے مطابق اسے مخضرمین میں شمار کیا جاتا ہے، اسی لئے ہم نے اس کا ذکر دورِ جاہلی میں نہیں کیا ہے۔ اس کے متعلق ملاحظہ کیجئے، جلد دوم

پھر نقادوں میں اس بات میں اختلاف ہے کہ اصحاب المعلقات میں کون سب سے بہتر شاعر ہے۔ خود اسلامی دور کے مشہور شعرا کی بھی اس معاملہ میں بالکل جداگانہ رائیں ہیں۔ چنانچہ اس دور کے چوٹی کے شعرا مثلاً فرزدق، جریر اور اخطل وغیرہ سے جب ان کی رائے پوچھی گئی تو ہر ایک نے ایک دوسرے سے بالکل مختلف رائے دی۔ مگر عام طور سے نقادوں میں اس پر اتفاق ہے کہ جاہلی شعرا میں سے ہر ایک کسی نہ کسی فن میں امتیازی شان رکھتا ہے اور اس اعتبار سے ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ کسی نے غزل میں امتیاز پیدا کیا ہے، کسی نے فخر میں، کسی نے مدح میں تو کسی نے وصف میں۔ اس اعتبار سے جاہلی شعرا میں سے حسب ذیل کو مندرجہ ذیل اصناف میں ممتاز اور اشعر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ "أشعر الشعراء أربعة ـــــ زهير إذا رغب، والنابغة إذا رهب، والأعشى إذا طرب، وعنترة إذا غضب، وامرؤ القيس إذا ركب ـــــ یعنی تمام جاہلی شعرا میں حسب ذیل شعرا امتیازی شان رکھتے ہیں۔ زہیر جب اسے کچھ ملنے کی امید ہو یعنی مدح اور حکمت و فلسفہ میں، نابغہ ذبیانی جب ڈرا ہوا ہو یعنی معذرت خواہی میں، اعشیٰ جب مست ہو یعنی مدح یا ہجو میں، اور امرؤ القیس جب سواری پر ہو یعنی گھوڑے اور اونٹنی کی تعریف میں۔

آگے ہم اصحاب المعلقات میں سے ۵ شعرا کے حالات زندگی اور ان کے کلام کا تفصیلی مطالعہ کریں گے اور باقی ماندہ جاہلی شعرا میں سے چند کا سرسری جائزہ لیں گے۔

نوٹ، شجرہ نسب شعرائے معلقات کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے۔

اصحاب المعلقات

۱۔ امرؤ القیس

(۵۰۰ء — ۵۴۰ء)

امرؤ القیس کا پورا نام "ابو الحارث حندج بن حجر الکندی تھا[1] یہ نسلاً قحطانی یمنی تھا اور تمام جاہلی شعرا میں سب سے زیادہ ممتاز، نامور، پرگو اور امام فن سمجھا جاتا ہے۔ اس نے شاعری میں بعض ایسے اصناف ایجاد کئے اور ایسے مضامین باندھے کہ جنھیں اس سے پہلے کسی جاہلی شاعر نے نہیں باندھا تھا اور نہ ان پر طبع آزمائی کی تھی۔

اسے 'الملک الضلیل' یعنی گمراہ بادشاہ اور 'ذو القروح' زخموں والا[2] بھی کہتے ہیں۔ اس کی کنیت ابو وہب تھی اور لقب امرؤ القیس تھا۔ امرؤ القیس، ماں اور باپ دونوں طرف سے بادشاہوں کے خاندان کا نہ صرف فرد تھا، بلکہ شہزادہ بھی تھا کیونکہ اس کا باپ حُجر بنو اَسد کا آخری بادشاہ تھا اور اس کے آبا و اجداد قبیلہ کندہ کے شریف ترین اور نامور بزرگ تھے۔ اس کی ماں فاطمہ ربیعہ سردار کی لڑکی اور قبیلہ تغلب کے نامور شاعر اور شہسوار مہلہل اور کلیب کی بہن تھی۔

امرؤ القیس نے اپنے باپ کی عملداری نجد میں جو بنو اسد کا مسکن تھا، پرورش پائی اور رئیسوں کے لڑکوں کی طرح بہت ناز و نعم میں پروان چڑھا۔ جب جوان ہوا تو شہزادوں کی طرح سیر و شکار، کھیل کود، شراب نوشی اور شاہد بازی میں پڑ گیا۔ لڑکیوں سے عشق بازی اور عورتوں سے

۱۔ پورا سلسلۂ نسب یوں ہے: امرؤ القیس بن حجر بن الحارث بن عمرو بن حجر آکل المرار بن عمرو بن معاویہ بن الحارث بن یعرب بن ثور بن مرتع بن معاویہ بن کندہ (طبقات فحول الشعراء ابن سلام۔ سلسلۂ نسب میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ دیکھئے جمہرۃ اشعار العرب: ابو زید القرشی۔ ۲۔ کہتے ہیں کہ اس لقب کا سبب یہ شعر تھا: فبدلت قرحا داميا بعد صحة لعل منايانا تحولن ابؤسا
ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے فی الادب الجاہلی میں 'الملک الضلیل' کی یہ تشریح کی ہے کہ وہ بادشاہ جس کے حالات ہمیں معلوم نہیں۔ یعنی مجہول الاسم اور مجہول الحال، جیسے ضل بن قل۔

معاملہ بندی کے واقعات کو بصراحت نظم کرنا اور ان سے فحاشی کی حد تک اظہار تغزل کرنا رات دن کا مشغلہ ہو گیا۔ رعیت اور حکومت کے کاموں سے نہ دلچسپی لیتا اور نہ اپنی حرکات وسکنات میں اس وقار اور تمکنت کو ملحوظ رکھتا جو ایک شہزادہ اور بڑے گھرانے کے نوجوان کے شایان شان تھی۔ چنانچہ اس کی ان نازیبا حرکات کی وجہ سے باپ اس سے خفا رہتا تھا۔ اس نے کئی دفعہ اسے سمجھا بجھا کر ان حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر ڈانٹ ڈپٹ اور سختی سے بھی بگڑا نوجوان راہِ راست پر نہ آسکا، تو اسے گھر سے نکال دیا۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ جب گھر بار، خاندان اور اس کے وقار کے بندھنوں سے آزادی مل گئی، تو یہ نوجوان اور کھل کھیلا۔ اس کے اردگرد اس زمانے کے بگڑے دل نوجوان، چور اچکے قسم کے بدمعاش اور آوارہ لڑکے جمع ہو گئے اور دن رات تالابوں اور جھرنوں کے کنارے پڑاؤ ڈالے، داد عیش وعشرت دیتے، شراب پیتے، عیاشی کرتے اور لونڈیوں کے ناچ گانے کا لطف اٹھاتے۔ جب ایک تالاب کا پانی خشک ہو جاتا اور اردگرد کی گھاس ختم ہو جاتی، تو دوسرے تالاب پر پہنچ جاتے اور وہاں داد عیش دیتے، اور اس طرح یہ لوگ رات دن عیش کوشی ومستی میں گزار رہے تھے کہ ایک دن جبکہ بے فکروں اور متوالوں کا یہ قافلہ حضرموت کے قریب ایک گاؤں 'دمون' میں تھا کہ اس کے باپ کے قتل ہونے کی خبر ملی۔ اس کے باپ حجر کی سختیوں اور ٹیکس وصول کرنے میں اس کی زیادتیوں کی وجہ سے بنو اسد کے لوگ اس سے تنگ آگئے تھے اور اس کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یورش کر کے اسے قتل کر ڈالا تھا۔ عین محفل شراب میں جب کہ ساغر ومینا کھنک رہے تھے، امرؤ القیس کو باپ کے مرنے کی خبر ملی تو اس کے دل پر سخت چوٹ لگی، لیکن اس نے اس خیال سے کہ محفل کے رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے، اپنے دوستوں سے اس خبر کو چھپائے رکھا اور کہا تو صرف اتنا کہا: "ضَيَّعني صغيرا، وحَمَّلني دمَه كبيرًا، لا صَحْوَ اليوم ولا سُكرَ غدًا، اليوم خمرٌ وغدًا أمرٌ" یعنی بچپنے میں میرے باپ نے مجھے گنوا دیا اور جوانی میں اپنا خون میرے سر منڈھ دیا۔ آج ہوشمندی نہیں ہوگی، اور کل بدمستی نہیں ہوگی، آج شراب لنڈھے گی اور کل کام کی بات ہوگی[1]

چنانچہ دوسرے دن اس نے مقابلہ کی تیاری شروع کر دی اور قبائل عرب میں پھر کر

---

[1] اغانی نے بروایت ابن کلبی لکھا ہے لیکن اس میں ایک دوسری روایت بھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ امرؤ القیس باپ کے قتل کے وقت موجود تھا۔ ڈاکٹر شوقی ضیف نے بھی اس کو زیادہ صحیح بتایا ہے۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، جرجی زیدان، ۱/۸۰ مطبوعہ دار الکتاب العربیۃ۔ لیکن اکثر مورخین اور تذکرہ نگاروں نے یہی لکھا ہے کہ امرؤ القیس باپ کے قتل کے وقت موجود نہ تھا۔

اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لئے مدد مانگتا رہا۔ بعض قبیلے اس کا ساتھ دیتے اور بعض قبیلے معذرت کر لیتے تھے چنانچہ اپنے ساتھی براقی اور قبیلہ بکر و تغلب کے اپنے رشتہ داروں کو لے کر اس نے بنو اسد سے جنگ کی اور ان میں سے بہتوں کو قتل کر ڈالا۔ پھر بھی دل کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی کیونکہ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک وہ ایک سو آدمیوں کو موت کے گھاٹ نہ اتار دے گا اور سو آدمیوں کی پیشانیوں کو چکنا چور نہ کر دے گا[1] اس وقت تک نہ گوشت کھائے گا نہ شراب پیئے گا چنانچہ وہ مزید فوج جمع کرنے کے خیال سے قبائل میں مدد کے لئے گشت کرنے لگا۔ اسی درمیان میں منذر نے جو حیرہ کا بادشاہ تھا اور جس کی امرؤالقیس کے خاندان سے پرانی دشمنی چلی آرہی تھی بعض عرب قبائل کو جن میں ایاد، بہرا اور تنوخ شامل تھے، امرؤالقیس کے خلاف اکسا دیا، پھر کسریٰ انوشیروان بن قباذ نے بھی جو اس وقت منذر کے خاندان سے خوش تھا ایک بھاری فوج مخالف قبائل کی مدد اور امرؤالقیس سے برد آزمائی کے لئے بھیج دی۔ ظاہر ہے کہ امرؤالقیس اور اس کے آدمیوں میں اتنا دم کہاں تھا کہ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ کر سکتے۔ چنانچہ اس کے ساتھی ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑتے چلے گئے اور آخر میں امرؤالقیس تنہا رہ گیا۔ اب اس نے پھر سے قبائل عرب میں گشت کرنا شروع کیا کہ مقابلہ کے لئے پھر سے اپنی فوج ترتیب دے۔ لیکن اس میں اس کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ گھومتے پھرتے وہ سَمَوْأَل بن عادیا کے پاس پہنچا اور اس سے پناہ مانگی۔ اور اپنی زرہیں اور اپنے ہتھیار اور اپنی بیٹی کو اس کی امانت میں رکھا اور اس سے کہا کہ شام کے بادشاہ حارث بن شمر الغسانی کو ایک تعارفی خط لکھ دو کہ وہ مجھے قیصر روم کے پاس پہنچا دے۔ اور مدد کرنے کی سفارش کر دے۔ چنانچہ حارث نے امرؤالقیس کو قیصر روم کے پاس پہنچا یا اور امرؤالقیس نے اس کی شان میں زوردار مدحیہ قصیدہ پڑھا اور اپنے دشمنوں کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ قیصر روم منذر اور اس کے ساتھیوں سے اس لئے جلتا تھا کہ وہ لوگ ایرانیوں کے ماتحت تھے، جو رومیوں کے دشمن تھے۔ چنانچہ قیصر نے ایک بڑی فوج اس کے ساتھ کر دی لیکن اس فوج کو لے کر ابھی امرؤالقیس تھوڑی دور بھی نہیں گیا تھا کہ قیصر نے اسے مع اپنی فوج کے واپس بلوا بھیجا، کیونکہ اس درمیان میں بنو اسد کے ایک شخص الطماح الاسدی نے قیصر سے یہ

(۱) بعض نقادوں نے اسی قسم کا انکار کیا ہے۔

(۲) اس قصہ کے لیے امرؤالقیس کے اس شعر سے استدلال کیا جاتا ہے۔ لقد طمح الطماح من نحو أرضه لیلبسنی من دائہ ما تلبسا۔ اس قصہ کی پوری تفصیل مع حوالہ جات شرح المعلقات السبع للزوزنی ص۲۰ تحقیق محمد علی حمالیہ، المکتبۃ الاموية دمشق میں ہے۔

شکایت کردی تھی کہ امرؤالقیس تو تھیں گالیاں دیتا پھرتا تھا۔ بعض راویوں کا کہنا ہے کہ خود امرؤالقیس کے ساتھیوں میں سے بعض نے قیصر" یوستنیانوس" سے کہا کہ امرؤالقیس نے اپنی قوم سے کہا ہے کہ وہ قیصر کی لڑکی سے خط وکتابت کرتا ہے، اس پر قیصر کو غصہ آیا اور بلطائف الحیل اسے ختم کرنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اس نے امرؤالقیس کو انعام کے طور پر ایک خلعت عطا کی جو زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ جب امرؤالقیس اسے پہن کر چلا تو اس کے سارے جسم میں چھالے پڑ گئے اور کھال اتر گئی۔ اسی وجہ سے اسے ذوالقروح، زخموں والا کہتے ہیں۔ اور قسطنطنیہ سے واپس ہوتے ہوئے انقرہ کے پاس مرگیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ اس کی وفات ہجرت سے ایک صدی قبل یعنی ۵۴۰ء میں ہوئی، لیکن یہ کوئی یقینی بات نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی نہ کوئی تحریری سند ہے اور نہ کسی مستند اور ثقہ راوی کی روایت۔[1]

کلام کی امتیازی خصوصیات

جاہلی شعرا میں امرؤالقیس سب سے مشہور اور پُرگو شاعر گزرا ہے۔ اس لئے اسے عصر جاہلی کے شعرا میں طبقہ اوّل میں شامل کیا جاتا ہے۔ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ اگرچہ اس سے پہلے ابودُؤادالأیادی اور امرؤالقیس کا ماموں مہلہل بن ربیعہ نے شعروشاعری کی ابتدا کردی تھی، لیکن امرؤالقیس کو کثرت اشعار، تنوع مضامین، حسن وصف، منظرکشی، ندرت معانی، حسن بیان اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرنے میں سارے جاہلی شعرا پر تفوق حاصل ہے پھر اس کا کلام اس کی زندگی کا پورا آئینہ دار ہے۔ یونس بن حبیب کہتے ہیں کہ بصرہ کے علماء امرؤالقیس کو تمام شعرا پر فوقیت دیتے تھے۔ فرزدق سے پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ تو اس نے کہا کہ ذوالقروح یعنی امرؤالقیس۔ اسی طرح لبید سے پوچھا گیا کہ تمھارے خیال میں سب سے بڑا شاعر کون ہے، تو اس نے جواب دیا کہ الملک الضلیل یعنی گمراہ بادشاہ۔

امرؤالقیس جاہلی زمانہ کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے سب سے پہلے دوستوں سے محبوبہ کے اجڑے دیار پر ٹھہرنے اور تھوڑی دیر یاد میں رونے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس نے سب سے

۱۔ امرؤالقیس کی تاریخ وفات میں بہت اختلاف ہے۔ ۵۳۰ء سے لے کر ۵۶۵ء تک کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔

پہلے عورتوں کو ہرنیوں، نیل گایوں سے اور گودے رنگ کو شتر مرغ کے انڈے کے رنگ سے تشبیہ دی۔ گھوڑے کا وصف بیان کرتے وقت اسے جنگلی جانوروں کو قید کرنے والا سے تشبیہ دی۔ (یعنی اس کا گھوڑا اتنا تیز رفتار ہے کہ جنگلی جانوروں کو دوڑا کر پکڑ لیتا ہے) اسی طرح غزل میں نزاکت خیالی اور ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے، جس کے معانی و مطالب فوراً ذہن میں آجائیں۔ اس کے علاوہ اس نے استعارہ اور تشبیہ کے برمحل اور پر تاثیر استعمال میں بھی سارے جاہلی شعرا کے مقابلہ میں خاص امتیازی شان پیدا کی ہے۔ اور وصف میں تو اس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ اس نے محبوبہ کا، گھوڑے کا، رات کا اور بادو باراں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا جواب بھی پوری جاہلی شاعری میں نہیں ملتا۔ زمانے کا شکوہ اور دوستوں، یاروں کا ساتھ چھوڑنے سے متعلق جو اشعار اس نے کہے ہیں وہ بھی بہت پر تاثیر اور اچھوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والے شعرا نے بہت سے مضامین میں اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی لیکن اس کے مقام کو نہ پا سکے۔

امرؤ القیس کے کلام میں ان خوبیوں کے ساتھ پوری بدوی شان بھی نمایاں ہے۔ خیالات میں بدویت کے علاوہ بہت ثقیل اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتا ہے۔ کہیں کہیں پیرایۂ بیان خاصا گنجلک اور مشکل بھی ملتا ہے۔ عورتوں سے گفتگو اور معاملہ بندی کے وقت عریانی اور فحاشی کی حد تک اتر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے اپنی چچازاد بہن عُنَیزَہ سے عشق تھا۔ اس سے ملاقات اور سفر میں ساتھ ہونے کے جو نقشے اس نے کھینچے ہیں وہ انتہائی عریاں، جنسیت سے بھرپور اور معاملہ بندی کی آخری حد ہیں۔ مگر انداز بہت دل آویز ہے۔ اور چونکہ وہ شہزادہ تھا اس لئے کلام میں بڑی شان و شکوہ اور بلند خیالی بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جب اس نے ایک تالاب کے کنارے لڑکیوں کے لئے اپنی اونٹنی ذبح کر دی تو اس کے گوشت کو لڑکیوں نے ایک دوسرے پر جس طرح پھینکنا شروع کیا، اس کا نقشہ بڑی شان سے کھینچتا ہے[1]

فظل العذاری یرتمین بلحمها — وشحم کهداب الدمقس المفتل

یعنی نا کتخدا لڑکیاں اس اونٹنی کا گوشت اور بٹے ہوئے ریشم جیسے چربی کو ایک دوسرے پر پھینک کر اٹھکیلیاں کرنے لگیں۔

جنگلوں، بیابانوں میں مارے مارے پھرنے کے باوجود عزائم بہت بلند اور نگاہ بہت اونچی

۱۔ اس معلقہ کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

رکھتا تھا۔ حقیر اور کمتر چیز پر نظر نہیں جمتی تھی۔ کہتا ہے :-

فلو أن ما أسعى لأدنى معيشة ‏ ‏ ‏ ‏ کفانی ولم أطلب قليل من المال

ولكنما أسعى لمجد مؤثل ‏ ‏ ‏ ‏ وقد يدرك المجد المؤثل أمثالی

یعنی اگر میری کوششیں محض گھٹیا قسم کی زندگی کے لئے ہوتیں تو جو کچھ میرے پاس ہے، وہی میرے لئے کافی ہوتا اور میں تھوڑے سے مال کے لیے تگ و دو نہ کرتا۔

لیکن میں تو خاندانی عز و جاہ کی تگ و دو میں لگا ہوا ہوں اور اس قسم کی عزت میرے ہی جیسے لوگ حاصل کر پاتے ہیں۔

سراپا (وصف) اور منظر نگاری میں امرؤالقیس نے جاہلی شعرا کے درمیان کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اپنی محبوبہ عُنیزہ کا سراپا کتنے حسین لیکن کھلے الفاظ میں کھینچا ہے۔

مهفهفة بيضاء غير مفاضة ‏ ‏ ‏ ‏ ترائبها مصقولة كالسجنجل

یعنی وہ گوری چٹی ہے۔ اس کی کمر پتلی ہے۔ اس کا پیٹ ڈھیلا ڈھالا یا ہر کو نکلا ہوا نہیں ہے۔ اور ہار پہننے کی جگہ (یعنی حلق کے نیچے والا حصہ سینہ سے قریب) آئینہ کی طرح چمکدار اور چکنا ہے۔

گردن کی تعریف یوں کرتا ہے :-

وجيد كجيد الرئم ليس بفاحش ‏ ‏ ‏ ‏ اذا هي نصته ولا بمعطل

اور اس کی گردن (تناسب اور خوبصورتی میں) ہرنی کی گردن کی طرح ہے۔ جب وہ گردن اٹھا کر دیکھتی ہے تو نہ بُری لگتی ہے اور نہ زیور سے خالی معلوم ہوتی ہے، یعنی گردن سونی نہیں دکھائی دیتی۔

پنڈلیوں اور کمر کا نقشہ یوں کھینچا ہے :-

وكشح لطيف كالجديل مخصر ‏ ‏ ‏ ‏ وساق كانبوب السقي المذلل

اور اس کی کمر اتنی پتلی ہے کہ جیسے چمڑے کی بنی ہوئی مہار اور اس کی پنڈلی اتنی چمکتی اور صاف ستھری ہے، جیسے کہ خوب سیراب کئے ہوتے شاداب اور جھکے ہوتے بانس کا پور ہو۔

گھوڑے کے وصف میں بھی امرؤالقیس نے ایسی چابکدستی دکھائی ہے کہ جس کی مثال جاہلی شاعری میں بہت کم ملتی ہے۔ کہتا ہے :-

وقد أغتدي والطير في وكناتها — بمنجرد قيد الأوابد هيكل

مكر مفر مقبل مدبر معا — كجلمود صخر حطه السيل من عل

كميت يزل اللبد عن حال متنه — كما زلت الصفواء بالمتنزل

یعنی میں صبح تڑکے جبکہ چڑیاں بھی اپنے گھونسلوں میں ہوتی ہیں، ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہوکر باہر نکل پڑتا ہوں جو بہت تنومند ہے اور جس کے بال بہت کم ہیں اور جو اتنا تیز رفتار ہے کہ جنگلی جانوروں کو بھی پکڑ لیتا ہے۔

(جو شہسواروں کی مرضی کے مطابق) حملہ کے موقع پر ٹوٹ پڑتا ہے، بھاگنے کا موقع ہوتا ہے تو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ پیش قدمی کی ضرورت ہو تو آگے بڑھ جاتا ہے۔ پیچھے ہٹنے کی ضرورت ہو تو پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اس سخت پتھر کی طرح ہے، جسے سیلاب نے اونچائی سے نیچے پھینک دیا ہو۔

یہ گھوڑا کمیت ہے اور اس قدر فربہ اور چکنا کہ زین بھی اس کی پیٹھ سے پھسل کر گر پڑتی ہے جس طرح بارش کی وجہ سے سخت، چکنا اور صاف ستھرا پتھر پھسل کر گر پڑے۔

اسی طرح سے امرؤ القیس نے رات، بارش اور درندوں وغیرہ کے وصف میں بھی کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے[1]

غزل میں اس کے یہ اشعار نمونہ سمجھے جاتے ہیں:-

أفاطم مهلا بعض هذا التدلل — وإن كنت قد أزمعت هجري فأجملي

أغرك مني أن حبك قاتلي — وأنك مهما تأمري القلب يفعل

وإنك قسمت الفؤاد فنصفه — قتيل ونصف في حديد مكبل

وما ذرفت عيناك إلا لتضربي — بسهميك في أعشار قلب مقتل

تسلت عمايات الرجال عن الصبا — وليس فؤادي عن هواها بمنسل

یعنی اے فاطمہ، ذرا اپنے ناز و انداز کو روک کے رکھو اور اگر تم نے جدائی کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو اس کو بھی اچھے ڈھنگ سے کرو۔

کہیں تم اس دھوکہ میں تو نہیں ہو کہ تمہاری محبت مجھے مار ڈالے گی اور یہ کہ تم جو حکم دو گی اسے دل بسر و چشم بجا لائے گا

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ’امرؤ القیس‘ سلسلۃ فنون الادب، مطبوعہ قاہرہ۔ ۲۔ بعض روایتوں میں ’صرمی‘ منقول ہے

تم نے میرے دل کے دو حصے کر دیے ہیں، ایک حصہ کشتہ ہوچکا ہے اور دوسرا حصہ لوہے کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

تمہاری آنکھوں نے آنسوؤں کی لڑیاں صرف اس لئے پرونی شروع کی ہیں کہ تم اپنے دونوں نینوں کے بانوں سے میرے شکستہ اور تمہاری محبت میں ہارے ہوئے دل پر سخت چوٹ لگاؤ۔

لوگوں کی راہِ محبت میں کوربینی ختم ہوچکی ہے لیکن میرے دل سے اس کا خیال نہیں جانے والا ہے۔

میدانی نے کتاب الامثال میں قبیلہ طے کی ایک عورت سے اس کی شادی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جن دنوں امرؤالقیس قبیلہ طے میں رہا کرتا تھا۔ علقمہ الفحل سبھی وہاں آکر اتفاق سے ٹھہرا۔ دونوں میں بحث چل گئی کہ ہم میں سے کون بڑا شاعر ہے، چنانچہ اسی عورت کو حکم بنانے پر فیصلہ ہوا۔ امرؤالقیس نے اس کے سامنے اپنا وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے۔

خلیلی مرا بی علیٰ اُم جندب — نقض لبانات الفؤاد المعذب

یہاں تک اس نے یہ شعر پڑھا۔

فللسوط الهوب وللساق درة — وللجزر منه وقع اهوج منعب

اس کے بعد علقمہ نے اپنا قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے

ذهبت من الهجران فی غیر مذهب — ولم یك حقا كل هذا التجنب

یہاں تک کہ جب اس شعر پر پہنچا کر

فادركهن ثانیاً من عنانه — یمر كغیث رائح متحلب

تو اس عورت نے امرؤالقیس سے کہا کہ علقمہ تم سے بڑا شاعر ہے۔ امرؤالقیس نے کہا کہ وہ کیسے تو اس نے اس کی وجہ یہ بتاتی کہ تمھیں اپنے گھوڑے کو ایڑ لگانے، ڈانٹنے اور مارنے کی ضرورت پیش آئی، مگر علقمہ کا گھوڑا اتنا اچھا تھا کہ صرف لگام ہی کے اشارے سے اس نے شکار کو قبضہ میں کر لیا۔ امرؤالقیس اس فیصلہ سے خفا ہوگیا۔ جس کے بعد اس نے اس کو طلاق دیدی، اور علقمہ نے اس سے شادی کر لی۔ اسی جیت کے بعد سے علقمہ کو الفحل یعنی نر کہا جانے لگا۔ مگر اس قصہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے[1]

---

[1]۔ اس مقابلہ کا تفصیلی حال علقمہ کے حالات زندگی میں۔ اس کتاب کے ص ۲۴۰ پر لاحظہ کیجیے۔

اسی طرح کہتے ہیں کہ امرؤ القیس نے قسم کھا رکھی تھی کہ میں صرف اس لڑکی سے شادی کروں گا جو یہ پہیلی بوجھ لے، کہ آٹھ، چار، اور دو کیا ہیں۔ چنانچہ اس نے کتنی لڑکیوں سے یہ سوال کیا۔ سب نے کہا کہ چودہ۔ وہ ایسی لڑکی کی تلاش میں چلا جا رہا تھا کہ اسے ایک آدمی ملا جس کے ساتھ ایک کمسن اور نہایت ہی حسین لڑکی تھی۔ امرؤ القیس نے اس سے کہا کہ یہ بتاؤ کہ آٹھ، چار، اور دو کیا ہیں؟ لڑکی نے برجستہ جواب دیا کہ آٹھ تو کتیا کے تھن ہیں، اور چار اونٹنی کے اور دو عورت کے دودھ۔ یہ جواب سن کر امرؤ القیس بہت خوش ہوا اور اس نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔ پھر اس لڑکی نے بھی بہت سی شرائط اس سے رکھیں۔

امرؤ القیس کا معلقہ

جاہلی شعر و شاعری اور امرؤ القیس کے کلام کا سب سے اچھا اور بھرپور نمونہ اس کا وہ شہرۂ آفاق معلقہ ہے جس میں اس نے ساری قوت بیان اور حسنِ تغزل و وصف و تشبیہ صرف کر دی ہے اور شاید اس کے کلام میں سے معلقہ ہی کے اکثر اشعار ایسے ہیں جن پر ادب جاہلی کے موافقین اور مخالفین سب کا تقریباً اتفاق ہے کہ وہ صحیح ہیں ورنہ اس کے بیشتر کلام کو موضوع اور عباسی دور کی اختراع بتایا گیا ہے[1]

بہر حال چونکہ یہ معلقہ نہ صرف امرؤ القیس کی زندگی کا آئینہ دار ہے بلکہ اس کے کمال فن کا بھی شاندار مظہر ہے۔ اسی لئے عربی ادب میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ اس معلقہ کو کہنے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسے اپنی چچازاد بہن عُنیزہ بنت شرجیل سے محبت تھی۔ خاندان کے لوگ اس سے ملنے میں اس وجہ سے مانع ہوتے تھے کہ وہ کہیں اس کا نام لے کر شعر و شاعری نہ شروع کر دے۔ اور یہ بات بدوی معاشرہ میں معیوب تھی۔ چنانچہ وہ چوری چھپے اس سے ملا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب قبیلہ نے کوچ کیا تو یہ چپکے سے مردوں سے الگ ہو گیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ قافلہ کے آگے مرد ہوتے اور پیچھے عورتیں۔ چنانچہ امرؤ القیس مردوں سے الگ ہو کر عورتوں کے پیچھے لگ گیا۔ راستے میں ایک تالاب دَارَةُ جُلْجُل کے نام سے پڑتا تھا۔ امرؤ القیس نظریں بچا کر عورتوں سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور ایک جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب عورتیں تالاب پر پہنچیں تو انھوں نے کپڑے

۱۔ تفصیل طٰہٰ حسین فی الادب الجاہلی میں دیکھئے اور اس کا جواب النقد التحلیلی، محمد احمد الغمراوی میں پڑھئے۔ طٰہٰ حسین کا جواب محمد علی حمد اللہ نے بھی "شرح المعلقات للزوزنی" کے مقدمہ پر دیا ہے۔

اتار کر تالاب میں نہانا شروع کر دیا۔ اس میں اس کی محبوبہ عُنیزہ بھی تھی۔ ادھر امرؤالقیس نے یہ کیا کہ سب کے کپڑے جمع کر کے ان پر بیٹھ گیا اور عورتوں سے کہا کہ جب تک ننگی میرے سامنے نہ نکلو گی، کپڑے نہیں دوں گا۔ عورتوں نے بہت خوشامد کی لیکن وہ نہ مانا۔ جب بہت دیر ہو گئی تو مجبوراً ایک ایک کر کے سب نکلتی گئیں اور سب کو ان کے کپڑے دیتا گیا۔ عنیزہ نے نکلنے میں بہت حیل، حجت کی اور کپڑوں کے لئے بہت خوشامد درآمد کی لیکن امرؤالقیس نے ایک کی نہ سنی، چنانچہ وہ بھی ننگی باہر نکلی اور کپڑے لے کر پہنے۔ ان اٹھکھیلیوں میں ظاہر ہے بہت دیر ہو گئی۔ لڑکیوں نے کہنا شروع کیا کہ خدا تجھے غارت کرے، تو نے اتنی دیر کرا دی۔ قافلہ کہاں نکل گیا ہو گا۔ اور اب ہمیں بھوک بھی لگ رہی ہے۔ امرؤالقیس نے فوراً اپنی اونٹنی ذبح کی۔ لڑکیوں نے گوشت بھونا، خوب کھایا پیا۔ جب چلنے کا وقت ہوا تو سب نے امرؤالقیس کا سامان بانٹ کر اپنے اونٹوں پر لاد دیا، سامان تو لد گیا لیکن خود امرؤالقیس کے لئے سوال تھا کہ وہ کس طرح جائے۔ چنانچہ اس نے عنیزہ سے کہا کہ تم مجھے اپنے اونٹ پر بٹھا لو اور دوسری سب لڑکیاں بھی پیچھے پڑ گئیں۔ مجبوراً عنیزہ نے اسے اونٹ کے اگلے حصہ پر بٹھا لیا، اور اس طرح یہ قافلہ حسیناں چل پڑا۔ راستہ میں امرؤالقیس عنیزہ کے ہودہ میں سر ڈال کر اس سے پیار و محبت کی باتیں کرتا اور اس طرح یہ دلچسپ سفر ختم ہوا۔ اس واقعہ کے بعد اس نے اپنا یہ مشہور معلقہ کہا۔ جس میں نہ صرف اس واقعہ کا ذکر ہے، بلکہ مختلف موضوعات، مناظر اور مضامین اس میں آئے ہیں۔ مطلع یہ ہے:۔

قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزل   بِسَقْطِ اللِوىٰ بين الدَخُولِ فَحَوْمَلِ

یعنی اے میرے دونوں دوستو! ذرا ٹھہرنا تاکہ ہم تھوڑی دیر اپنے محبوب اور اس کی منزل کو یاد کر کے جو دخول اور حومل کے درمیان سقط اللوی میں ہے رو لیں۔ اس معلقہ میں ۸۱ شعر ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ معلقہ ایک نشست کی کاوشِ فکر کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس نے اسے اپنے زمانہ شباب و شاہد بازی کے مختلف اَدوار میں پورا کیا ہے۔ اس کا مرکزی خیال غزل ہے۔

اس کے بعد محبوبہ کے ٹھہرنے کی جگہوں کی نشانیوں (اطلال یا دیار) کو یاد کر کے نالہ و شیون اور سوزشِ غم کا اظہار یوں کرتا ہے:۔

وقوفا بها صحبي على مطيهم   يقولون لا تهلك أسى وتجمل

وإن شفائي عبرة مهراقة   فهل عند رسم دارس من معول

یعنی میرے دوستوں نے ان اطلال یا دیار کے پاس اپنی سواریاں روک کر مجھ سے کہا کہ

شدت غم میں اپنے کو ہلکان نہ کرو، بلکہ صبر و تحمل سے کام لو۔ مگر میری بیماری کا علاج تو بہتے آنسو میں ہے لیکن کیا مٹتے ہوئے نشانات پر بھلا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی میں لاکھ روؤں، دھوؤں محبوبہ کے یہ نشانات جو امتداد زمانہ سے اب مٹنے لگے ہیں میری باتوں کا جواب کہاں دے سکتے ہیں یا مجھے کیا سکون پہنچا سکتے ہیں۔

اس کے بعد غزل شروع کرتا ہے اور ام الحویرث اور ام الرباب، دو عورتوں سے اظہار تشبیب[1] کرتا ہے، پھر اپنی جوانی کے زمانے کی رنگ رلیوں اور خاص طور سے تالاب دارۃ جلجل کا ذکر بڑے والہانہ انداز سے کرتا ہے۔ غزل میں انداز بیان بڑا شوخ اور حرف و حکایت اور معاملہ بندی بڑی عریاں اور وصف و منظر کشی میں بڑی بیباکی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کے ہر ہر عضو کا حتی کہ مفاتن کا بھی نقشہ یوں کھینچ دیتا ہے کہ عورت ایک مرمریں مجسمہ کی طرح سامنے کھڑی نظر آتی ہے۔ اور معاملہ بندی میں تو وہ اخلاق و ادب کے سارے حدود کو پار کر گیا ہے۔ اس نے ناکتخدا دوشیزاؤں کے علاوہ حاملہ اور دودھ پلاتی عورتوں کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ پھر ایک دوسری لڑکی سے اپنی ہوسناکی کی داستان بڑے کھلے الفاظ میں بیان کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے اس کے اشعار:۔

کدأبك من أمّ الحويرث قبلها ۔۔۔ وجارتها أمّ الرّباب بمأسل

سے اس کے شعر تسلت عمایات الرجال عن الصبا تک۔ اس کے بعد شب ہجران کا اور وہ بھی صحرا و بیاباں کی، مہیب نقشہ کھینچتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

ولیل کموج البحر أرخی سدوله ۔۔۔ علی بأنواع الهموم لیبتلی

فقلت له لما تمطی بصلبه ۔۔۔ وأردف أعجازا وناء بكلكل

ألا أيها الليل الطويل ألا انجلی ۔۔۔ بصبح وما الإصباح منك بأمثل

یعنی سمندر کی طوفانی موجوں جیسی مہیب رات نے مختلف قسم کے رنج و غم کی چادر میرے

1۔ ام الحویرث: ھرۃ الحارث بن حصین بن ضمضم الکلبی کی ماں کی کنیت ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ الحارث کی ماں نہیں بلکہ بہن تھی اور اس سے امرؤ القیس کے والد نے شادی کی تھی۔ اسی لئے اس نے جب اس سے اظہار تشبیب کیا تو باپ نے اسے نہ صرف گھر سے نکال دیا بلکہ اسے قتل کرنے کی تدبیر بھی کر رہا تھا۔

ام الرباب: قبیلہ کلب کی ایک عورت کا نام تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے:

المعلقات العشر و اخبار قائلیها: احمد بن الامین الشنقیطی، مطبوعہ المطبعۃ الرحمانیہ، مصر ۱۳۴۸ھ

اور محض میری آزمائش کے لئے پھیلا دی۔ چنانچہ جب رات خوب بھیگ گئی اور چاروں طرف اس کا ڈنکا بجنے لگا، اور درازی بہت تکلیف دہ ہوگئی تو میں نے کہا کہ اے لمبی رات کیا تیرے دامن سے کبھی صبح طلوع ہوگی یا نہیں؟ لیکن اگر صبح ہوتی بھی تو کیا ہے؟ میرے لئے وہ تجھ سے کچھ زیادہ اچھی تھوڑی ہی ثابت ہوگی۔ یعنی دن کو بھی مجھے چین نصیب نہ ہوگا۔

اس کے بعد ایک سنسان اور خوفناک وادی کا ذکر کرتا ہے۔

وواد کجوف العیر قفر قطعتہ　　　بہ الذئب یعوی کالخلیع المعیل

یعنی میں نے ایک ایسی ویران اور سنسان وادی کو طے کیا جو گدھے کے پیٹ کی طرح ہر سبزی و شادابی سے خالی تھی اور اس میں بھیڑیا بھوک سے بیتاب ہو کر اس جواری کی طرح چیختا چلاتا تھا، جس کے بال بچے بہت ہوں (اور وہ بازی ہار چکا ہو اور ان کا خرچ چلانے کے لئے کچھ نہ رہ گیا ہو)۔

پھر اپنے گھوڑے کی تعریف کرتا ہے۔ (یہ اشعار اور ان کا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے)

اس کے بعد شکار کا ذکر کرتا ہے،

فعن لنا سرب کأن نعاجہ　　　عذاری دوار فی ملاء مذیل

یعنی ہمارے سامنے نیل گایوں یا ہرنیوں کا ایک ایسا غول آیا جس کی مادائیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے کہ دوار۔ دبت کا نام، کا طواف کرنے کے لئے حسین دوشیزائیں لمبی لمبی چادریں اوڑھ کر آئی ہوں۔ سیر و شکار کے بعد بجلی کی چمک اور کڑک کا ذکر کرتا ہے۔ کہتا ہے:۔

أصاح تری برقا أریک ومیضہ　　　کلمع الیدین فی حبی مکلل

یضیئ سناہ أو مصابیح راھب　　　أھان السلیط بالذبال المفتل

یعنی میرے دوست تم بجلی کو دیکھ رہے ہو۔ آؤ میں تمھیں اس کی چمک دکھاؤں جو چمکدار تاج نما گھٹا میں ہے اور جس کی چمک اور لپک ایسی ہے جیسے کہ محبوب کے دونوں ہاتھوں کی چمک ہو۔

پھر بطور تجاہل عارفانہ کہتا ہے کہ واقعی یہ اس بجلی کی ہی چمک ہے یا ایسے سادھو یا راہب کے چراغ کی روشنی دکھائی دے رہی ہے، جس نے خوب بٹا ہوا فتیلہ تیل کی طرف جھکایا ہو تاکہ خوب روشنی ہو جائے۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کے بعد بارش کا ذکر کرتا ہے۔ صحرائے عرب جیسے علاقہ میں پانی برس جاتے اور ٹھنڈی اور خنک ہوائیں چلنے لگیں، تو چرند و پرند سب

مست ہوکر گانے لگتے ہیں۔ چنانچہ امرؤالقیس نے اپنا یہ معلقہ چڑیوں کے اسی موسم خوشگوار سے خوش ہوکر گانے پر ختم کیا ہے:۔

کأنّ مکاکی الجواء غدیۃ ۔۔۔ صبحن سلافا من رحیق مفلفل

یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحرا کے پرندوں کو صبح تڑکے عمدہ قسم کی مرچ پڑی ہوئی شراب پلا دی گئی ہے، جس کی وجہ سے وہ مست ہوکر نغمہ سرا ہیں۔

امرؤالقیس کی طرف دوسرے بہت سے لمبے قصیدے منسوب کئے جاتے ہیں مگر جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، بہت سے علمار اور مورخین ان کو امرؤالقیس کا نہیں مانتے، اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ ثقہ راویوں نے ان کی روایت نہیں کی ہے۔ پھر ان میں سے بعض امرؤالقیس کی زندگی اور اس کے انداز بیان سے میل نہیں کھاتے، جیسے کہ یہ شعر:۔

وقربۃ أقوام جعلت عصامها ۔۔۔ علی کاھل منی ذلول مرحل

کیونکہ اس شعر میں وہ یہ کہتا ہے کہ میں مشکیزہ لئے سنسان وادیوں میں مارا مارا پھرتا ہوں اور میرے ساتھی براتی سب مجھ سے بچھڑ گئے ہیں اور یہ سب کچھ میں انتہائی تنگدستی اور فقر و فاقہ کی حالت میں کرتا ہوں۔ مگر یہ سب باتیں امرؤالقیس کی شاہانہ زندگی کے بالکل خلاف ہیں۔ اس قسم کی زندگی عرب کے خانماں برباد اور آنادمنش شاعر جیسے الشنفری اور تأبط شرا گزارتے تھے، یا اس کا یہ قصیدہ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قیصر کے پاس اپنے ایک شاعر دوست عمرو بن قمیئۃ الضبعی کے ساتھ قسطنطنیہ جاتے ہوئے کہا تھا۔

سمالك شوق بعد ما كان أقصرا ۔۔۔ وحلت سُلَیمیٰ بطن ظَبْیٍ فعَرعَرا

یعنی محبوبہ سے شوق ملاقات کم ہونے کے بعد اب پھر سے بڑھ گیا اور اس وقت جب کہ سلیمی (محبوبہ) بطن ظبی میں جانے کے بعد مقام عرعر میں پہنچ چکی ہے۔

کیونکہ اس کا انداز بیان، اس کی روانی، اس کا سبک پن بالکل جاہلی نہیں ہے بلکہ انداز بتاتا ہے کہ اس کو اسلامی زمانہ میں وضع کرکے اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔

تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ امرؤالقیس کے تابع ایک جن تھا، جس کا نام "لافظ بن لاحظ" تھا اور یہی جن اس کے ذہن میں قصیدوں کے مضامین ڈالتا تھا یا خود ہی اشعار کہہ کر اس کی طرف منسوب کر دیتا تھا۔ تابع جنوں کے اس قسم کے قصے بہت مشہور ہیں، جو بالکل غلط اور من گھڑت اور محض خیالی ہیں۔ الاغانی وغیرہ میں شعرا جاہلیہ کے جنوں کے نام اور کام سب کی تفصیل

درج ہے۔ احمد بن الامین الشنقیطی نے بھی بعض شعرا کے جنوں کا تذکرہ المعلقات العشر کی شرح میں کیا ہے جو بہت دلچسپ ہیں۔

حوالہ جات:۔

۱۔ الاغانی — لابی الفرج الاصفہانی۔

۲۔ کتاب الشعر والشعراء — لابن قتیبہ

۳۔ طبقات فحول الشعراء — لابن سلام الجمحی

۴۔ جمہرۃ اشعار العرب — لابی زید القرشی

۵۔ نہایۃ الارب — للنویری

۶۔ شعراء النصرانیہ — للاب شیخو الیسوعی

۷۔ العقد الفرید — لابن عبد ربہ

۸۔ معاہد التنصیص — للعباسی

۹۔ فی الادب الجاہلی — لطٰہٰ حسین

۱۰۔ تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام : الدکتور شکری فیصل۔

۱۱۔ الملک الضلیل — محمد فرید ابو حدید

۱۲۔ النقد التحلیلی — محمد احمد الغمراوی

۱۳۔ الوصف — سلسلۃ فنون الادب

۱۴۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۱۔ جرجی زیدان

۱۵۔ الوسیط — احمد الاسکندری و مصطفی عنانی

ان کے علاوہ تاریخ ادب کی دیگر کتب اور شروح معلقات

۲۔ النابغہ الذُبیانی

(م ۱۸ قبل ہجری، مطابق ۶۰۴ عیسوی)

نابغہ قبیلہ مضر کی ایک شاخ قبیلہ ذبیان کا مشہور اور برگو شاعر تھا۔ اس کا پورا نام زیاد بن معاویہ ہے اور کنیت ابو امامہ اور لقب نابغہ۔ وہ دورِ جاہلی کے شعرا میں طبقہ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے۔ اپنے طبقہ کے شعرا میں معذرت خواہی میں اسے مقامِ اوّل حاصل ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ "أشعر الشعراء امرؤ القیس إذا رکب والنابغۃ إذا رھب" یعنی شاعروں میں سب سے بڑا شاعر امرؤ القیس ہے جب وہ سوار ہو اور نابغہ ہے جب وہ ڈر جاتے یعنی ڈر کر معذرت کرے۔ یہ عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔

نابغہ کی زندگی کا سب سے عجیب و غریب واقعہ یہ ہے کہ شعر کہنے کی کوشش میں اس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ بتا دیا، جوانی گزر گئی، بڑھاپا آ گیا لیکن زمامِ شعر قابو میں نہ آیا۔ پھر نہ اس کا کوئی استاد تھا اور نہ موزوں طبع کوئی مربی۔ مگر دھن کا پکا تھا، ریاض نہ چھوڑا۔ آخر کار عمر ڈھلے یک بیک اس کی طبیعت موزوں ہو گئی اور شعر خود بخود اس کی زبان سے چشمہ کی طرح پھوٹ کر نکلنے لگے، اور ایسی بے پناہ آمد ہو گئی کہ دنیا محوِ حیرت رہ گئی۔ کلام اتنا حسین، دل آویز، معیاری اور بلند تھا کہ ہر طرف اس کا چرچا پھیل گیا۔ اور وہ ہر بزمِ طرب میں جانِ محفل بن گیا۔ اسی وجہ سے لوگوں نے اس کا لقب نابغہ یعنی چشمہ کی طرح پھوٹ کر نکلنے والا رکھ دیا[1]

---

[1] نبغ الماء: پانی کا چشمہ سے پھوٹ کر نکلنا ———— (باقی ص ۱۸۷ پر)

نابغہ اپنے قبیلہ ذبیان میں بڑا محترم معزز اور محبوب سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہوں کی مدح کرنے اور ان سے انعام و اکرام لینے کی وجہ سے اس کی شخصیت لوگوں کی نظر میں کچھ مجروح تو ہو گئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نے اس کی وجہ سے اپنے آپ کو گرایا نہیں، اور نہ ہی انعام و اکرام کے لالچ میں اعشیٰ کی طرح ہر کس و ناکس اور ہر امیر و رئیس کی مدح کی۔

حیرہ کا بادشاہ ابو قابوس نعمان بن المنذر جس نے ۵۸۰ء سے ۶۰۲ء تک حیرہ پر حکومت کی، اس کا ممدوح تھا۔ نابغہ کے اکثر مدحیہ قصیدے اس کی تعریف میں ہیں۔ نعمان بڑا شاعر نواز اور باذوق بادشاہ تھا۔ حضرت حسان بھی اس کے دربار میں دور جاہلیت میں آیا جایا کرتے تھے اور شاہان غسان کی شان میں بھی مدحیہ قصیدے کہتے تھے[1]۔ لیکن نعمان کو نابغہ سے جو تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا وہ حسان یا کسی اور شاعر سے نہ ہو سکا[2]۔

نابغہ نعمان بن المنذر کی دل کھول کر تعریف کرتا تھا اور نعمان بھی دل کھول کر اسے انعام و اکرام دیتا تھا۔ چنانچہ اس کی داد دہش سے نابغہ کی مالداری کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا۔ لیکن جیسا کہ دستور ہے ہر صاحب کمال اور بادشاہ سے زیادہ قریب رہنے والے آدمی کے بہت سے دشمن اور حاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔ نابغہ کے بھی بہت سے حاسد اور دشمن پیدا ہو گئے۔ ان حاسدوں نے نابغہ کی طرف سے نعمان کے کان بھر دیئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نعمان اس سے اس قدر خفا ہو گیا کہ اسے قتل کرانے کی دھمکی دیدی۔

نابغہ سے نعمان کی خفگی کے بارے میں مختلف روایتیں اور مختلف قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حاسدوں نے نابغہ کی زبانی ایک قصیدہ کہا جس میں نعمان کی شان میں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۹) ابو زید محمد القرشی نے جمہرۃ اشعار العرب میں مظعون بن مظعون الاعرابی سے روایت کی ہے کہ نابغہ کے تابع ایک جن تھا جس کا نام ہاذر تھا۔ اس کی قوت سے نابغہ میں یک بیک شاعری کا ملکہ پیدا ہو گیا۔ مگر اس قصہ اور خیال کی کوئی اصلیت نہیں۔

نابغہ کا پورا سلسلۂ نسب یہ ہے: زیاد بن معاویہ بن جناب بن جابر بن یربوع بن غیظ بن مرۃ بن عوف بن سعد بن ذبیان بن بغیض بن ریث بن غطفان بن سعد بن قیس عیلان

(جمہرۃ اشعار العرب)

۱۔ شاہان غسان کی وصف میں حضرت حسان نے وہ شاندار قصیدہ کہا ہے جس کا (باقی صفحہ ۱۸۱ پر)

گستاخی کی گئی تھی اور اس پر یہ عیب لگایا گیا تھا کہ اس کی ماں فدک کے ایک سنار کی لڑکی ہے¹ اور وہ خود جاہل اور بزدل ہے۔ قریب کے لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے اور دور والوں کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا، اور اپنے دوست کے ساتھ بے وفائی کرتا ہے۔ جمع کرنے کو ہزاروں فوجیوں کا لشکر جمع کر لیتا ہے، لیکن دشمن کا بال بھی بیکا نہیں کر پاتا۔ کہتے ہیں کہ نعمان کو جب اس قصیدہ کی خبر ہوئی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے نابغہ کو قتل کرانے کی دھمکی دی۔

خفگی سے متعلق دوسرا واقعہ تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ نعمان نے ایک دفعہ رات کو کھانے کے بعد ترنگ میں نابغہ سے کہا کہ میری بیوی مُتَجَرِّدَہ کا سراپا کھینچو۔ اتفاق سے نابغہ کی نظر بھی اس پر پڑ چکی تھی، اور وہ اس پر اس طرح شرمائی تھی کہ جلدی سے اپنے گورے اور مہندی لگے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ یہ اندازِ حیا نابغہ کو غالباً بہت بھایا ہو گا اور اس کے جذبات شاعری بھی بھڑک اٹھے ہوں گے۔ اور ادھر اس کے ولی نعمت سے سراپا کھینچنے کا حکم بھی مل چکا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کا سراپا کھینچا۔ اور حسین الفاظ اور دلکش و دلنواز پیرایۂ بیان کے قالب میں اس کی جیتی جاگتی مورت بنا کر رکھ دی۔ جس میں اس کے تمام اعضاء و جوارح کا ایسا بھرپور اور دلکش مرقع کھینچا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اس کی تصویر پھر جاتی تھی۔ جب سراپا کہہ کر اس نے بادشاہ کو سنایا تو اس نے اسے بہت پسند کیا، لیکن بعد میں مُنَخَّل الیشکری مشہور شاعر نے جو دربار میں موجود تھا اور جو بقول رواۃ متجردہ سے ملتا جلتا رہتا تھا اور بقول

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۰) مطلع ہے: بِلْهِ دَرُّ عصابۃ نادمتھم
یوماً بجلق فی الزمان الأوّل

۲۔ جمہرۃ اشعار العرب میں حضرت حسان کی زبانی اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ نقل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ باوجود میری کوشش کے نابغہ کے مقابلہ میں انھیں دربار میں رسائی نہ ہو سکی (ص ۳۷)۔

۱۔ فدک مدینہ کے قریب ایک مشہور گاؤں تھا۔ اس کی ماں سے متعلق جو اشعار نابغہ کی طرف سے منسوب کئے گئے تھے، وہ یہ تھے۔

قبح اللہ ثم ثنی بلعن وارث الصائغ الجبان الجهولا
من یضر الادنی ویعجز عن ضر الاقا صی ومن یخون الخلیلا
تم یجمع الجیش ذا الألوف ویغزو ثم لا یرزأ العدو فتیلا

بعض اس سے محبت بھی کرتا تھا۔ نعمان سے کہا کہ حضور اعضا و جوارح کا ایسا نقشہ اور دلنوازی اور دلداری کی ایسی باتیں تو وہی کہہ سکتا ہے جس نے خود تجربہ کیا ہو۔ کہتے ہیں کہ یہ بات نعمان کے دل میں تیر کی طرح لگ گئی چنانچہ وہ نابغہ سے خفا ہو گیا اور اسے مروانے کی دھمکی دی اور نابغہ اس سے ڈر کر شام میں شاہان غسان کے پاس بھاگ کر چلا گیا۔

خفگی کا تیسرا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نابغہ کے پاس ایک بیش قیمت تلوار تھی۔ نعمان کی نظر اس پر پڑ گئی اور اسے بھا گئی۔ چنانچہ وہ نابغہ سے اسے مانگ بیٹھا۔ لیکن نابغہ نے اسے دینے سے انکار کر دیا۔ لوگوں نے نعمان سے چغلی کھائی کہ اس کے دل میں آپ کی اتنی بھی قدر نہیں کہ وہ ایک تلوار آپ کی خاطر قربان کر سکے۔ اس پر نعمان اس سے خفا ہو گیا اور مروانے کی دھمکی دی۔ چنانچہ جان بچانے کے لئے نابغہ شاہان غسان کے پاس بھاگ گیا۔

یہ ہیں تین مختلف قصے جو نابغہ سے نعمان کی خفگی کے بارے میں بیان کئے جاتے ہیں، مگر ان میں سے کسی قصے کے بارے میں ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ روایت و درایت کے اصولوں کے پیش نظر یہ صحیح ہے۔ کیونکہ ان میں سے کسی قصہ کی مستند تاریخی روایتوں سے تصدیق نہیں ہوتی۔ پھر یہ واقعات اتنے سطحی اور ناقابلِ فہم و یقین ہیں کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی تھوڑے سے غور کرنے کے بعد ان کی، اگر تکذیب نہیں کرے گا تو شک و شبہہ کی نظر سے ضرور دیکھنے لگے گا۔

نعمان کی خفگی کی وجہ بقول ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہمیں ان قصوں میں نہیں بلکہ خود نابغہ کے کلام میں ڈھونڈنا چاہئے۔ چنانچہ جب ہم نابغہ کا وہ کلام پڑھتے ہیں جس میں اس نے نعمان سے معذرت کی ہے، تو ہمیں اس کے اس قسم کے کلام میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو مذکورہ بالا واقعات میں سے کسی کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ کرتی ہو۔ پھر آخر خفگی کی اصل وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب ڈاکٹر طٰہٰ حسین یہ دیتے ہیں کہ "دراصل اس قصہ (خفگی کے قصہ) کی بنیاد سیاسی ہے۔ کیونکہ دور جاہلی کے آخری زمانے میں رومیوں اور ایرانیوں میں بڑی شدید رقابت پیدا ہو گئی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

۱۔ تذکرہ نگاروں نے متجردہ اور منخل یشکری کی داستانِ عشق و محبت سے متعلق ایک بہت ہی خوبصورت قصیدہ نقل کیا ہے۔ جس میں اس نے کہا ہے:

ولقد دخلت علی الفتاۃ   الخدر فی الیوم المطیر
الکاعب الحسناء تر   فل فی الد مقس فی الحریر

پورا قصیدہ حماسہ، حاشیہ مولانا محمد اعزاز علی مرحوم ص ۷۳، مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند۔
اور حماسہ شرح تبریزی، مطبعہ السعادہ مصر ص ۲۲ پر ملاحظہ کیجئے۔
مطلع ہے:

ان کنت عاذلتی فسیری   نحو العراق ولا تحوری

حیری اور غسانی بادشاہوں کے درمیان بھی رقابت و رنجش پیدا ہو گئی۔ اور ان میں سے ہر ایک اپنے آقاؤں یعنی ایرانیوں اور رومیوں کی ہر طرح مدد کرنے کے لئے اپنا پورا زور صرف کرتا تھا۔ اور اس مقصد کی خاطر یہ باج گزار شاہان ہر قسم کی تدبیریں بھی کرتے تھے۔ غسانیوں کو نابغہ کی عظمت اور اپنے قبیلہ اور نجد میں جو قدر و منزلت حاصل تھی۔ اس کا اندازہ تھا۔ اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ نابغہ نعمان بن المنذر کے دربار سے منسلک ہے اور اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے اس کی وجہ سے خود نعمان کی اور اس کے واسطے سے اس کے ولی نعمت ایرانیوں کی بھی عزت بڑھتی ہے اور قبائل نجد میں اس کا بول بالا اور توقیر ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اس شاعر کو اس دربار سے الگ کر کے اپنے دربار سے منسلک کر لیا جائے تو یہ حیرہ کے بادشاہ کی شکست کے علاوہ اسکی بے عزتی کی بات بھی ہوگی کہ اس کا درباری شاعر حریف کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ اور ان کی مدح سرائی کر رہا ہے۔ چنانچہ غسانیوں نے نابغہ کو بھڑ کا کر اپنی طرف کر لیا۔ نابغہ باوجود نعمان کے درباری شاعر ہونے کے، ان کے پاس چلا گیا۔ اور ان کی تعریف و توصیف کرنے لگا۔ یہ بات نعمان کو بہت کھلی اور وہ اس سے خفا ہو گیا۔ اور اسے سخت سزا دینے کا اس نے فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا اندازہ اس کے اس قصیدہ سے ہوتا ہے جس میں اس نے نعمان سے معذرت کی ہے اور جس کا مطلع ہے:۔

اتانی ابیت اللعن انک لمتنی

وتلک التی اہتم منہا وأنصب

یعنی خدا آپ کو لعنت سے بچائے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے مجھے برا بھلا کہا ہے اور اس بات سے مجھے سخت تکلیف اور بہت زیادہ رنج و غم ہے[1]

مگر یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نابغہ کو نعمان کے دربار سے اتنا انعام واکرام ملتا تھا کہ وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا تو آخر اسے غسانیوں کے پاس جانے کی کیا ضرورت پیش آگئی، کیونکہ جو بادشاہ اتنا قدر دان ہو وہ عزت اور قدر و منزلت بھی اسی اعتبار سے کرے گا۔ جب عزت، قدر و منزلت، روپیہ پیسہ سب، اسے اس دربار سے مل رہا تھا تو وہ پھر غسانیوں کے پاس کس لالچ میں گیا۔ اس کا جواب ڈاکٹر طہٰ حسین نے نہیں دیا بلکہ نابغہ کے کلام

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے:۔ فی الادب الجاہلی ـــــــ ڈاکٹر طہٰ حسین، ص ۲۷۰۔

کا حوالہ دے کر مذکورہ بالا قصیدہ کا وہ شعر نقل کیا ہے، جس میں نابغہ نعمان سے کٹ کر غسانی دربار سے منسلک ہونے کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ "میں تو ایک شاعر ہوں۔ میرے لئے زمین تنگ نہیں ہے۔ میں جہاں چاہوں اور جس کے پاس چاہوں، جاؤں گا اور وہاں قدر و منزلت کے ہاتھوں لیا جاؤں گا۔ ایسے لوگوں میں بعض بادشاہ اور بھائی بھی ہیں کہ جب میں ان کے پاس جاتا ہوں تو ان کے مال کا مختار اور مقرب بن جاتا ہوں"۔

ولکنني کنت إمرأ لي جانب — من الارض فيه مستراد ومذهب

ملوك وإخوان إذا ما أتيتهم — احكم في أموالهم واقرب

مگر مذکورہ بالا مراعات اور یہ قدر دانی تو اسے نعمان کے دربار میں بھی حاصل تھی۔ جب یہی رعایتیں وہاں بھی ملتی ہیں تو خواہ مخواہ اسے اپنے پہلے محسن سے جس سے ملنے کے لئے وہ ہمیشہ بیتاب بھی رہا، کیوں کٹ جاتا؟ رہی یہ بات کہ ممکن ہے کہ ملوک غسان کے پاس اسے ملوک حیرہ کے مقابلہ میں زیادہ قدر و منزلت اور زیادہ عزت و احترام اور پیسہ ملا ہو، صحیح نہیں ہے کیونکہ اول تو کسی تذکرہ نگار نے اس کی نشاندہی نہیں کی ہے پھر اس کا ثبوت اس کے کلام سے بھی نہیں ملتا، کیونکہ اس نے اپنے مختلف قصیدوں میں سے کسی میں بھی اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے کہ وہ غسانی دربار میں نعمانی دربار سے زیادہ باحیثیت، زیادہ معزز اور زیادہ مقبول ہے اور یہ کہ وہ یہاں زیادہ مطمئن اور خوش ہے۔ اس کے برعکس اس کے مذکورہ بالا قصیدہ ہی میں کئی ایسے اشعار ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ غسانی بادشاہ کے مقابلے میں وہ حیرہ کے بادشاہ کی نہ صرف تعریف و توصیف کرتا ہے بلکہ اس کا درجہ اس سے کہیں زیادہ اونچا بتاتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

ألم تر أن الله أعطاك سورة — ترى كل ملك دونها يتذبذب

بأنك شمس والملوك كواكب — إذا طلعت لم يبد منهن كوكب

یعنی کیا آپ (نعمان بن المنذر) نہیں دیکھتے کہ خدا نے آپ کو ایسی قوت و سطوت اور جاہ و جلال دیا ہے کہ دوسرے بادشاہ آپ کے مقابلے میں آتے ہچکچاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ سورج ہیں اور دوسرے بادشاہ ستارے ہیں (اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ) جب سورج نکل آتا ہے تو ستارے ڈوب جاتے ہیں۔

ان اشعار میں صاف صاف کہتا ہے کہ آپ کا اور دوسرے بادشاہوں کا کیا مقابلہ

آپ سورج ہیں اور دوسرے ستارے۔ جب دونوں درباروں میں سورج اور ستارے کا فرق ہے تو پھر وہ سورج کو چھوڑ کر ستارے کے پاس کیوں جاتا؟۔ اس میں تو خود اس کی بھی بے عزتی ہے اور یہ بات محقق ہے کہ اس نے یہ اشعار غسانی دربار میں رہ کر اور وہاں کے طور طریقے دیکھ کر اور ذاتی تجربہ کرنے کے بعد کہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسے وہ داد و دہش اور انعام و اکرام غسانی دربار میں نہیں ملا ہوگا جو اسے یہاں ملتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ غسانیوں نے اسے چونکہ نعمان کے پاس سے بلا لیا تھا اور نابغہ نے پھر ان کی تعریف و توصیف بھی کی، اس لئے نعمان خفا ہوگیا، دل لگتی بات نہیں معلوم ہوتی۔

غالب گمان یہ ہے کہ یہ سارا قصہ اور اس سے متعلق تمام باتیں عباسی زمانے کے مغلوں کی ذہنی عیاشی کا نتیجہ ہیں، اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ ان مغلوں میں چند بہترین دماغ کے مالک اور شعر و ادب کے مسلم استاد و راوی اور مرجع بھی تھے۔ ممکن ہے ان میں سے کسی نے لطف زبان اور لطف محفل کے لئے یہ افسانے اور ان سے متعلق یہ اشعار خود ہی کہے ہوں اور انھیں نابغہ سے منسوب کر دیا ہو اور ایسا کرنے میں انھوں نے کہانی اور قصیدے کے تانے بانے کو پوری چابکدستی اور ہوشیاری سے ملانے کی کوشش کی ہو جس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں چنانچہ مشکل سے اندازہ ہو پاتا ہے کہ یہ کلام گڑھا ہوا ہے۔ اور اس قسم کی حرکتیں اس زمانے میں بہت ہوئی ہیں۔ جس کا اعتراف تمام نقاد اور تذکرہ نگاروں کو ہی نہیں بلکہ جن لوگوں نے یہ حرکتیں کی ہیں ان میں سے بعض نے خود بھی اعتراف کیا ہے۔ ہمارے خیال میں اگر ان میں سے کوئی قصہ صحیح ہو سکتا ہے تو نعمان کی ہجو والا قصہ ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ غسانیوں نے کسی شاعر کو کچھ دے دلا کر نعمان کی ہجو کرا دی ہو اور اسے نابغہ سے منسوب کرا دیا ہو تاکہ نعمان اس سے خفا ہو کر اسے مارنے کی دھمکی دے اور جب جان بچانے کے لئے بھاگے تو ہم اس کے لئے اپنی گود پھیلا دیں۔ چنانچہ رواۃ کہتے ہیں کہ جب یہ ہجویہ قصیدہ نعمان نے سنا تو اس نے نابغہ کو مروانے کی دھمکی دی۔ نعمان کا افسر حفاظت بان عصام نابغہ کا دوست تھا۔ اس نے آکر نابغہ سے کہا کہ فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ، ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ بادشاہ تم کو مروا دے گا۔ چنانچہ وہ بھاگ کر شاہان غسان کے پاس شام چلا گیا۔

عمرو بن حارث الغسانی نے نابغہ کو نہ صرف پناہ دی بلکہ بڑے عزت و احترام سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے دربار سے منسلک کر لیا۔ نابغہ نے بھی جی کھول کر اس کی اور اس کے بھائی

نعمان کی تعریف و توصیف میں کئی قصیدے کہے۔ مگر نابغہ کو عمرو بن الحارث الغسانی، اپنے نئے ولی نعمت سے قلبی لگاؤ نہ پیدا ہو سکا اور اس کا دل اپنے پرانے محسن نعمان بن المنذر ہی سے اٹکا رہا اور کئی معذرتی قصیدے کہہ کر اس کی غلط فہمی کو دور کرنے اور اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر نعمان کا دل صاف نہ ہوا اور نابغہ کو ایک زمانے تک شام ہی میں رہنا پڑا۔ یہاں تک کہ عمرو بن الحارث الغسانی کا انتقال ہو گیا اور نعمان نے بھی نابغہ کی مسلسل معذرت خواہی اور اس کے قلبی لگاؤ اور ایک عرصہ تک اس کی ہم نشینی اور ہمدمی کا خیال کر کے اس کی غلطی معاف کر دی اور پھر سے اسے اپنے پاس حیرہ بلا لیا۔

کہتے ہیں کہ نعمان کو جب مُتجرّدہ اور مُنَخَّل الیشکری کے تعلق کا علم ہوا تو اس نے ان دونوں کو قتل کرا دیا اور نابغہ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے اپنی غلط فہمی کے دور ہونے کا ذکر کر کے اسے اپنے پاس دوبارہ بلا لیا، اور یہ لکھا کہ تم نے ان لوگوں سے منسلک ہو کر جنھوں نے میرے باپ دادا کو قتل کیا تھا مجھے بڑی تکلیف پہنچائی ہے۔ حالانکہ تمھارے لئے تو تمھاری ہی قوم میں بڑی اچھی جائے پناہ اور مضبوط قلعہ تھا۔ چنانچہ نابغہ جب واپس آیا ہے تو دیکھا کہ نعمان سخت بیمار ہے اور لوگ اسے چارپائی پر اٹھائے ہوئے ہیں تو اس نے اس سے متاثر ہو کر وہ قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:۔

ألم اقسم علیك لتخبرنی　　　أمحمول علی النعش الهمام

یعنی کیا میں نے آپ کو قسم نہیں دھرا دی تھی کہ آپ مجھے اس کی اطلاع ضرور دیں کہ کیا آپ کو چارپائی پر اٹھایا گیا۔

بعض نے یہ بھی کہا کہ نابغہ قبیلہ فزارہ کے دو آدمیوں کی حفاظت میں خود ہی نعمان کے پاس آیا۔ ان دونوں کے نعمان سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ چنانچہ ایک دن نابغہ کی نظر نعمان کی ایک گانے والی لونڈی پر پڑ گئی۔ اس نے اس لونڈی کو اپنا وہ معذرتی قصیدہ یاد کرا دیا۔ جس کا مطلع ہے:۔

یا دار میّةَ بالعلیاء فالسند　　　أقوت وطال علیها سالف الأبد

یعنی علیا اور السند میں واقع میۃ کا اے وہ مسکن جواب ویران و سنسان پڑا ہے، اور جس پر ایک زمانہ بیت گیا ہے۔

چنانچہ ایک رات جب نعمان بادۂ شبانہ کی سرمستیوں میں سرشار تھا لونڈی نے

یہ راگ چھیڑ دیا۔ نعمان قصیدہ سن کر پھڑک اٹھا اور بول پڑا کہ یہ تو ابو امامہ کے اشعار ہیں۔ اور پھر اس سے خوش ہو گیا اور اسے اپنے پاس بلا لیا۔ بہر حال قصہ جو بھی ہو، یہ بات صحیح ہے کہ نابغہ دوبارہ نعمان کے پاس آ گیا۔ اور اس طرح نابغہ پھر سے عیش و عشرت کے شادیانے بجانے لگا اور ایک طویل عمر پا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل انتقال کر گیا۔ تاریخ وفات کے متعلق کوئی صحیح بات کہنا بہت مشکل ہے کیونکہ اس کی کسی ثقہ راوی سے نہ روایت ملتی ہے اور نہ کوئی تحریری ثبوت ہمارے پاس ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا انتقال ۱۸ھ قبل ہجری، مطابق ۶۰۴ء میں ہوا۔

امتیازی خصوصیات

نابغہ ذبیانی سارے جاہلی شعرا میں معذرت خواہی کے فن میں امتیازی شان کا مالک ہے۔ نقادوں کا خیال ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عرصہ تک وہ اپنے محسن اور ولی نعمت نعمان بن المنذر سے اپنی غلطیوں کی معذرت ناموں کے ذریعہ معافی مانگتا رہا اور چونکہ اس کے دل سے یہ بات لگی تھی کہ وہ کسی طرح خوش ہو جائے۔ اس لئے اس قسم کے اشعار اپنی دل کی انتہائی گہرائیوں سے کہتا تھا۔ ان کا اتنا اثر ہوتا تھا کہ سامع کے دل میں اتر جاتے تھے۔ ان کے اس جذب و تاثر کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ عربی شاعری میں نابغہ سے پہلے اتنی موثر معذرت خواہی کبھی نہیں پائی گئی۔ معذرت خواہی کو صحیح معنوں میں ایک صنف کا درجہ دینے میں نابغہ کے کلام کو بڑا دخل ہے۔ اس نے اس صنف میں ایسی زینت نکالی کہ اس کے معذرتی قصیدوں کے اچھوتے انداز کی وجہ سے اس کا نام ہی اعتذاریات نابغہ پڑ گیا۔

نابغہ جاہلی شعرا کے طبقۂ اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس طبقہ میں تین شاعروں کے نام لئے جاتے ہیں۔ امرؤ القیس، زہیر بن ابی سلمیٰ، اور نابغہ ذبیانی۔ اس کے کلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے الفاظ بہت سبک اور خوبصورت، بندش بہت چست، معانی و مطالب صاف و واضح، اسلوب بیان بہت دلکش اور موثر ہوتا ہے۔ اس کے یہاں تکلف یا آورد نام کو نہیں۔ اسی وجہ سے جریر جیسے استاد زمانہ شاعر نے اسے تمام جاہلی شعرا میں سب سے بڑا اور ممتاز شاعر مانا ہے۔

نابغہ اپنے ہم طبقہ دونوں شاعروں میں یعنی امرؤ القیس اور زہیر بن ابی سلمیٰ کے مقابلہ میں لطیف کنایہ، بلکہ اشارہ، حسن معانی و مطالب اور دلکش و موثر انداز بیان میں امتیازی شان رکھتا ہے۔ ان دونوں کے مقابلہ میں اس کے کلام میں تکلف یا آورد خال خال نظر آتی ہے۔ اپنے

کلام میں احساسات و جذبات کو پوری وضاحت سے بیان کرنے اور اپنی بات سامع کے دل میں اتار دینے میں اسے بڑا ملکہ حاصل ہے۔ اس کے کلام کی انھیں خصوصیات کی وجہ سے دوسرے جاہلی شعراء کے مقابلہ میں نابغہ کا کلام سب سے زیادہ گایا گیا۔ رات کی ہولناکی کا منظر کھینچنے میں، معذرت میں موثر اور دل لگتی بات کہنے میں، ممدوح کی مبالغہ یا کذب بیانی سے پاک تعریف کرنے میں نابغہ کو ایسا کمال حاصل ہے جس کی مثال دیگر جاہلی شعرا میں کم نظر آتی ہے۔ نابغہ کے کلام کی انھیں خصوصیات کی وجہ سے بعض نقاد اس کو امرؤالقیس کے بعد جاہلی شعرا میں دوسرے نمبر کا شاعر سمجھتے ہیں۔ بعض نقادوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ "نابغہ کا کلام دل آویزی، خوبصورتی اور کشش میں دور جاہلیت کی شاعری کی معراج ہے"۔ اور اسی لئے اس کو بہت سے ادباء نے اصحاب المعلقات میں بھی شامل کیا ہے۔

اخطل عہد عباسی کا وہ نامور اور خود پسند شاعر تھا جو اپنے مقابلہ میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ مگر وہ بھی نابغہ کے فضل و کمال کا معترف تھا۔ اسکے حریف جریر کی رائے اوپر گزر چکی ہے۔ ابوزید القرشی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب کے پاس غطفان کا وفد آیا تو آپ نے ان کے سامنے چند اشعار پڑھے، اور ان سے پوچھا کہ یہ اشعار کس کے ہیں اور جب انھوں نے بتایا کہ یہ اشعار نابغہ ذبیانی کے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ "ھو اشعر شعراءکم" یعنی تمھارے شاعروں میں وہ سب سے بڑا شاعر ہے[1]

مذکورہ بالا خوبیوں کے باوجود نابغہ کے کلام میں "إقواء" کا عیب پایا جاتا ہے۔ اقواء کا مطلب یہ ہے کہ ایک شعر کے قافیہ میں زبر ہو اور دوسرے شعر کے قافیہ میں پیش یا کوئی دوسرا اعراب آجائے، جیسے نابغہ کے یہ دو شعر:-

سقط النصيف ولم ترد إسقاطه	فتناولته واتقتنا باليدِ
بمخضب رخص كأن بنانه	عنم يكاد من اللطافة يعقد

یہاں پہلے شعر کے قافیہ میں "زیر" ہے اور دوسرے شعر کے قافیہ میں "پیش" اور یہ ایک عیب ہے۔ لوگوں کو اس کا احساس تھا۔ لیکن ہمت کسی کی نہیں پڑتی تھی کہ نابغہ کو اس کی طرف متوجہ کرسکیں۔ اتفاق سے ایک دفعہ نابغہ مدینہ گیا اور وہاں ایک محفل موسیقی میں

۱۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: جمہرۃ اشعار العرب۔ ابوزید القرشی اور طبقات فحول الشعراء، لابن سلام الجمحی۔

جس میں نابغہ بھی مدعو تھا۔ منتظمین نے مغنیہ سے فرمائش کی کہ نابغہ کا وہ قصیدہ سناؤ جو اس نے نعمان کی بیوی متجردہ کا سراپا کھینچتے ہوئے کہا ہے۔ اور جس کا مطلع ہے:۔

أمن آل میة رائح او مغتد   عجلان ذازاد وغیر مزود

اور پہلے ہی سے مغنیہ کو بتا دیا تھا کہ "اقواء" والے اشعار کو ذرا کھینچ کر پڑھنا۔ چنانچہ جب گاتے گاتے اقواء والے اشعار پر آئی تو اس نے "بالیہ" کو اتنا کھینچ دیا کہ دال کا زیر "ی" ہوگیا اور "یعقد" کے دال کے پیش کو اتنا لمبا کر دیا کہ پیش "واؤ" بن گیا۔ نابغہ یک بیک چونک پڑا۔ آدمی زیرک اور ذہین تھا، فوراً غلطی کا احساس ہوگیا۔ اور اس نے اس کی اصلاح کر دی اور کہا کہ دخلت یثرب وفی شعری بعض العاھة وخرجت منھا وأنا أشعرُ " یعنی جب میں مدینہ آیا تھا تو میرے شعر میں کچھ خامی تھی مگر جب میں وہاں سے نکلا، تو میں سب سے بڑا شاعر تھا۔

نابغہ کی جلالت قدر اور فن شاعری میں اس کے استادانہ کمال کے اعتراف کی ایک زندہ مثال یہ ہے کہ عکاظ کے میلے میں جب شعر و شاعری کا مقابلہ ہوتا تھا تو اسی کو حَکَم بنایا جاتا تھا۔ اس کے لئے الگ چمڑے کا خیمہ لگا جاتا اور شعری مقابلہ کی محفل سجائی جاتی۔ شعرا اپنا کلام پڑھتے اور جس شاعر کے کلام کے حق میں نابغہ فیصلہ دے دیتا، اس کا سارے جزیرۂ عرب میں شہرہ ہو جاتا اور ہر خاص وعام کی زبان پر شاعر اور اس کے اشعار چڑھ جاتے۔ کہتے ہیں کہ اس میلہ میں سب سے پہلے اعشیٰ قیس نے، پھر حضرت حسان بن ثابت نے اور ان کے بعد تماضر خنساء مشہور صحابیہ اور مرثیہ گو شاعرہ نے اپنا کلام سنایا۔

کہتے ہیں کہ خنساء نے اس موقعہ پر اپنا وہ قصیدہ سنایا جس میں انھوں نے اپنے بھائی صخر کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا:۔

وان صخرا لتأتم الھداة بہ   کأنہ علم فی رأسہ نار

یعنی صخر وہ روشن اور تابناک شخصیت ہے جس سے راستہ بتانے والے بھی روشنی حاصل کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بلند پہاڑ ہے جس کی بلندی پر آگ روشن ہے۔ تو نابغہ نے کہا کہ اگر ابو بَصِیر یعنی اعشیٰ نے اپنا کلام ابھی نہ سنا دیا ہوتا تو میں کہتا کہ انسانوں اور جنات میں سب سے بڑی شاعرہ تم ہو۔ یہ سن کر حضرت حسان بن ثابت کو تاؤ آگیا اور انھوں نے کہا کہ " خدا کی قسم، میں تم سے، تمھارے باپ سے اور خنساء سے بھی بڑا شاعر ہوں۔" اس پر نابغہ نے کہا کہ آخر اپنے کس شعر پر یہ دعویٰ تم کو ہے۔ تو انھوں نے اپنا وہ مشہور شعر پڑھا جس میں اپنی

(۱) اس کا مطلع ہے: قذی بعینک أم بالعین عُوّار و أم اقفرت من أھلھا الدار۔

قوم پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :۔

لنا الجفنات الغر یلمعن بالضحی   وأسیافنا یقطرن من نجدۃ دما

یعنی ہمارے یہاں چمکتے دمکتے پتیلے ہیں جو دن کو چمکتے رہتے ہیں (یعنی ہم اتنے مہمان نواز ہیں کہ مہمانوں کو کھلانے کے لئے پتیلے آگ پر چڑھے رہتے ہیں جن میں ان کے لئے کھانا پکتا رہتا ہے) اور ہماری تلواریں لوگوں کی مدد کرنے کی وجہ سے خون کے قطرے ٹپکاتی رہتی ہیں۔ اس شعر پر نابغہ نے کچھ اعتراضات کئے اور آخر میں اپنا تفوق ثابت کرنے کے لئے اپنا وہ مشہور شعر پڑھا جو اس نے نعمان بن المنذر سے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا :۔

فانک کاللیل الذی ھو مدرکی   وإن خلت أن المنتأی عنک واسع [1]

مگر بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ نوک جھونک فرضی ہے اور محض لطف محفل کے لئے بڑھا دیا گیا ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

بہر حال عکاظ کے میلے میں شعرا کے درمیان حکم بننا بہت بڑی عزت سمجھی جاتی تھی۔ اور یہ عزت نابغہ کو حاصل ہوئی۔ اس سے اس کی مسلم حیثیت اور عربوں میں اس کی قدر و منزلت اور دنیائے شعر و شاعری میں اس کے امتیاز اور تفوق کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

عربی ادب میں معذرتی کلام کی کمی نہیں۔ لیکن معذرت خواہی میں نابغہ نے بالکل ایک اچھوتا رنگ اختیار کیا ہے۔ کبھی کبھی وہ ممدوح کی تعریف ایک چیز سے کرتا ہے اور پھر اسی چیز کی ضد سے بھی اس کی تعریف کا پہلو نکال لیتا ہے۔ جیسے اس کا یہ شعر جو اس نے نعمان سے معذرت کرتے ہوئے کہا ہے :۔

فانک شمس والملوک کواکب   اذا طلعت لم یبد منھن کوکب

یعنی آپ تو سورج ہیں اور (دوسرے) بادشاہ آپ کے مقابلے میں ستارے۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جب سورج نکل آتا ہے تو ان ستاروں میں سے ایک ستارہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ تقابل کا یہ انداز اور ندرت کسی اور شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ معذرت کرتے ہوئے کتنے خوب صورت انداز میں دو متضاد چیزوں کو جمع کر کے کہتا ہے کہ :۔

فانک کاللیل الذی ھو مدرکی   وإن خلت أن المنتأی عنک واسع

۱۔ اس قصہ کی تفصیل کے لئے الاغانی اور شرح المعلقات العشر ــ احمد بن الامین شنقیطی ملاحظہ فرمایئے۔

یعنی آپ اس رات کی طرح ہیں جو مجھے ضرور پالے گی، چاہے میں یہ سمجھتا رہوں کہ آپ سے بچ کر نکل جانے کی راہیں بہت وسیع ہیں۔

معذرت خواہی اس کا خاص فن ہے۔ چنانچہ اس نے اس میں نت نئے معنی پیدا کئے ہیں۔ اپنی بات بہت ہی حسین اور خوبصورت انداز میں کہتا ہے۔ جب نعمان بن المنذر سے اس کی چغلی کھا کر اسے بدظن کر دیا گیا تو اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

أنانی أبیت اللعن أنك لمتنی	وتلك التی تستك منها المسامع
فبت كأنی ساورتنی ضئیلة	من الرقش فی أنیابها السم ناقع
یُسهّد من لیل التمام سلیمها	لحلی النساء فی یدیه قعاقع
تناذرها الراقون من سوء سمها	تطلقه طورًا وطورًا تراجع
فانك كاللیل الذی هو مدركی	وإن خلت أن المنتأی عنك واسع

تذکرہ نگاروں کے درمیان اس قصیدہ کے اشعار میں بڑا اختلاف ہے۔ میں نے ان اشعار کے نقل کرنے میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تحقیق پر اعتماد کیا ہے[1]

ترجمہ:-

(۱) مجھے یہ اطلاع ملی ہے ــــ خدا آپ کو لعنت سے بچائے رکھے۔ کہ آپ نے مجھے لعنت ملامت کی ہے اور یہ بات ایسی ہے جس سے میرے کان پھٹے جاتے ہیں۔

(۲) (یہ بات سن کر) میں نے اپنی رات اتنی بے چینی میں کاٹی کہ جیسے مجھے ایسی چت کبری پتلی ناگن نے ڈس لیا ہو، جس کے دانتوں میں زہر قاتل بھرا ہوا ہو۔

(۳) اس ناگن کے ڈسے ہوئے آدمی کو پوری رات جگایا جاتا ہے اور عورتوں کے زیورات کی آواز اس کے دونوں ہاتھوں میں سے آتی ہے۔

(۴) جھاڑ پھونک کرنے والے اس کے زہر کی تیزی سے ایک دوسرے کو ڈراتے رہتے ہیں، اور ــ کبھی اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی واپس آجاتے ہیں۔

(۵) پس بیشک آپ اس رات کی طرح ہیں جو مجھے ضرور پالے گی، چاہے میں یہ سمجھتا رہوں کہ آپ سے بچ کر نکل جانے کی راہیں بہت وسیع ہیں۔

۱۔ فی الادب الجاہلی، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ص ۳۸۴۔

جب نابغہ نعمان سے ذکر کر عمرو بن الحارث الغسانی کے پاس شام گیا ہے تو اس کی شان میں جو مدحیہ قصیدہ کہا ہے وہ بھی بہت شاندار ہے۔ کہتا ہے :۔

کلینی لھم یا اُمیمۃُ ناصب	ولیل اقاسیہ بطئی الکواکب۔
تطاول حتی قلت لیس بمنقض	ولیس الذی یرعی النجوم بآیب
وصدر أراح اللیلُ عازبَ ھمہ	تضاعف فیہ الحزن من کل جانب
علی لعمرو نعمۃ بعد نعمۃ	لوالدہ لیست بذات عقارب
حلفت یمیناً غیر ذی مثنویہ	ولا علم الا حسن ظن بصاحب

ترجمہ :

(۱) اے امیمہ مجھے اس تکلیف دہ غم میں اپنے حال پر چھوڑ دو، اور اس تکلیف دہ رات میں جس کے ستارے بہت سست رفتار ہیں، میرے حال پر مجھے اکیلا رہنے دو۔

(۲) یہ رات اتنی لمبی ہوگئی کہ میرے منہ سے نکل گیا کہ اب یہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ اور یہ کہ جو (ستارہ) سب ستاروں کی نگہداشت کرتا ہے وہ کبھی نہ ڈوبے گا۔ یعنی جو ستارہ سب سے پہلے طلوع ہوا تھا، اور جسے سب سے پہلے ڈوبنا چاہئے تھا، وہی نہ ڈوبے گا، تو دوسرے ستاروں کا کیا ذکر، جو اس کے بعد نکلے ہیں۔ یہ سب رات کی درازی کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) اور مجھے اور میرے اس سینہ کو جس کے بھولے بسرے غموں کو اس رات نے تازہ کر دیا ہے اور جس میں ہر طرف سے میرے اوپر رنج و غم کی یلغار ہے، اپنے حال پر چھوڑ دو۔

(۴) میرے اوپر عمرو (بن الحارث الغسانی) نے نئے سرے سے مہربانی کی ہے۔ اس کرم اور مہربانی کے بعد جو ان کے والد بغیر احسان جتائے پہلے میرے اوپر کر چکے ہیں۔

(۵) میں نے بڑی پختہ قسم کھائی ہے۔ ایسی قسم جس کی صحت کے بارے میں سوائے اپنے اس بھروسہ اور حسنِ ظن کو جو مجھے اپنے ممدوح سے ہے، دوسری چیز ثبوت کے طور پر نہیں پیش کر سکتا۔

جب نابغہ نے عمرو بن الحارث کی شان میں مذکورہ قصیدہ کہا جس میں نعمان کے حریف کی تعریف تھی تو نعمان کو اس سے بہت زیادہ تکلیف ہوئی اور اس کا پارہ بہت چڑھ گیا۔ اور اس نے اس کی احسان فراموشی اور ناسپاسی پر اسے بہت برا بھلا کہا۔ جب نابغہ کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے بہت ہی حسین انداز میں اس سے معذرت کی :۔

أتانی أبیت اللعن أنک لمتنی	وتلک التی أھتم منھا وأنصب

فبت کأن العائدات فرشنني	هراسا به يعلى فراشي ويقشب
حلفت فلم أترك لنفسك ريبة	وليس وراء الله للمرء مذهب
لئن كنت قد بلغت عني خيانة	لمبلغك الواشي أغش وأكذب
ولكنني كنت امرأ لي جانب	من الأرض فيه مستراد ومذهب
ملوك وإخوان إذا ما أتيتهم	أحكم في أموالهم وأقرب
كفعلك في قوم أراك اصطنعتهم	فلم ترهم في شكر ذلك أذنبوا
فلا تتركني بالوعيد كأنني	إلى الناس مطلي به القار أجرب
ألم تر أن الله أعطاك سورة	ترى كل ملك دونها يتذبذب

یہاں تک کہ ایک بڑی حکمت کی بات کہتا ہے۔

ولست بمستبق أخا لا تلمه	على شعث أي الرجال المهذب
فإن أك مظلوما فعبد ظلمته	وإن تك ذا عتبى فمثلك يعتب

ترجمہ۔

(۱) خدا آپ کو لعنت سے محفوظ رکھے۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ آپ نے مجھے بُرا بھلا کہا ہے اور اس بات سے مجھے سخت تکلیف اور بہت رنج وغم ہوا ہے۔

(۲) اس تکلیف کی وجہ سے میں نے رات اس طرح بتائی گویا کہ میری تیمارداری کرنے والی عورتوں نے میرے لئے کانٹوں کی سیج بچھا دی ہے، جس سے میرا بستر اونچا اور نیا ہوتا رہتا ہے۔

(۳) میں نے ایسی قسم کھائی ہے جس میں آپ کے لئے شک کی گنجائش نہیں چھوڑی اور آدمی کے لئے اللہ کے سوا اور کسی کے پاس جانے کی جگہ نہیں ہے۔

(۴) اگر آپ کو میری طرف سے کسی خیانت کی اطلاع ملی ہے تو (یقین کیجئے) خبر دینے والا چغلخور بہت بڑا دھوکہ باز اور بہت جھوٹا ہے۔

(۵) لیکن میں ایسا آدمی ہوں جس کے لئے زمین کا ایک ایسا گوشہ ہے جہاں میں طلب رزق کی خاطر آجا سکتا ہوں۔

(۶) (جہاں) بہت سے بادشاہ اور بھائی ہیں کہ اگر میں ان کے پاس چلا جاؤں گا تو ان کے مالوں کا مختار کل بنا لیا جاؤں گا اور مجھ سے بالکل اپنائیت کا سلوک کیا جائے گا۔

(۷) جس طرح آپ جب ک ـــــ نعمان کریں، اور وہ لوگ اس پر آپ کا شکریہ ادا کریں، تو میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ انھیں ایسا کرنے میں گنہگار نہیں سمجھتے (اسی طرح سے میں نے بھی غسانیوں کی ان کی مہربانیوں اور حسنِ سلوک کی وجہ سے ان کا شکریہ ادا کیا ہے)

(۸) اس لئے آپ مجھے اپنی دھمکی کے ذریعہ لوگوں میں اس خارشی اونٹ کی طرح بنا کر نہ چھوڑئیے، جس پر تارکول مل دیا گیا ہو۔

(۹) کیا آپ نے ملاحظہ نہیں فرمایا کہ خدا نے آپ کو ایسی قوت اور جاہ و جلال دیا ہے کہ دوسرے بادشاہ اس کی وجہ سے آپ کے سامنے آتے ہچکچاتے ہیں۔

(۱۰) آپ کوئی ایسا بھائی نہ رکھ پائیں گے جسے اس کی لغزش پر آپ کو سرزنش کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ پورے مہذب لوگ کہاں ملتے ہیں۔

(۱۱) اس لئے اگر آپ نے میرے اوپر ظلم کیا ہے تو (درحقیقت) اپنے ایک غلام پر ظلم کیا ہے اور اگر آپ مجھ سے خوش ہیں تو آپ جیسی شخصیت ہی خوش رکھنے کے لائق ہے۔

موشحہ میں بھی اس کے چند اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ ایک شعر میں کتنی پتہ کی بات کہتا ہے۔

حسب الخليلين نأى الأرض بينهما   هذا عليها وهذا تحتها بالى

دو دوستوں کے لئے یہ بات (تعلقات کو استوار رکھنے کے لئے) کافی ہے کہ ان دونوں کے درمیان زمین ہی دوری کا باعث بن جائے۔ (اس طرح کہ) ان میں سے ایک زمین کے اوپر (زندہ) اور دوسرا اس کے نیچے سڑگل رہا ہے۔

نابغہ کے بعض اشعار اتنے معنی خیز اور اچھوتے ہیں کہ ان کو بہت سے شعرا نے اپنایا ہے چنانچہ اس کا یہ مشہور شعر، جسے اس نے نعمان کی خفگی کی خبر ملنے پر کہا تھا۔

نُبِّئتُ أن أبا قابوس أوعدني   ولا قرار على زأر من الأسد

مجھے خبر دی گئی ہے کہ ابو قابوس نے مجھے دھمکی دی ہے، اور شیر کے دھاڑنے پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔

اس کو حجاج بن یوسف نے عبدالملک بن مروان کی خفگی کے موقعہ پر پڑھا تھا۔

اسی طرح اس کے یہ دونوں اشعار جو اس نے متجردہ کے وصف میں کہے تھے۔

ولو أنها عرضت لأشمط راهب   عبد الإله صرورة المتعبد

لرنا لبهجتها وحسن حديثها   ولخاله رشداً وإن لم يرشد

یعنی اگر متجرّدہ ایک ادھیڑ عمر، غیر شادی شدہ راہب کے سامنے آجائے، جس نے اپنی ساری عمر اللہ کی عبادت میں گزار دی ہو تو وہ اس کے حُسنِ برق پاش کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہ جائے اور اس کی خوش گفتاری پر فریفتہ ہو جائے۔ اور اپنے اس عمل کو سب سے بڑی عقلمندی سمجھنے لگے۔ چاہے اسے یہ عقلمندی میسّر نہ آسکے

ربیعہ بن مقروم نے اس خیال کو لے کر یوں کہا ہے:۔

ولو أنها عرضت لأشمط راهب — فی رأس مشرفة الذری یتبتل

لرنا لبهجتها وحسن حدیثها — ولهم من ناموسه یتنزل

اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت کے سراپا کھینچنے میں بھی اس نے وہ کمال فن دکھایا ہے جو کسی جاہلی شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ اس قصیدہ کے بعض اشعار نابغہ کی غزل کے بھی بہترین نمونہ ہیں۔

نظرت بمقلة شادن متربب — أحوی أحم المقلتین مقلد

صفراء کالسیراء أکمل خلقها — کالغصن فی غلوائه المتأود

قامت تراءی بین سجفی کلة — کالشمس یوم طلوعها بالاسعد.

أو درة صدفیة غواصها — بهج متی یرها یهل ویسجد

أو دمیة من مرمر مرفوعة — بنیت بآجر یشاد وقرمد

سقط النصیف ولم ترد إسقاطه — فتناولته واتقتنا بالید

بمخضب رخص کأن بنانه — عنم علی أغصانه لم یعقد

لو أنها عرضت لأشمط راهب — یخشی الإله صرورة المتعهد

لرنا لبهجتها وحسن حدیثها — ولخاله رشداً وإن لم یرشد

ترجمہ:۔

(۱) اس نے (متجردہ) ایسے سدھائے ہرن کی آنکھوں سے دیکھا جسکے ہونٹ سیاہی مائل سُرخ ہیں جس کی آنکھیں کالی کجراری ہیں اور جو گردن میں ہار پہنے ہے۔

(۲) اس کا رنگ سیرا (ایک ریشمی کپڑا جس میں پیلی دھاریاں ہوتی ہیں) کی طرح نظر افروز پیلا ہے، اور اپنی بناوٹ میں وہ ہر طرح سے مکمل ہے۔ اور (اس کا قد) لچکیلی اور تروتازہ اور نازک شاخ کی طرح ہے۔

(۳) جب وہ اپنا شفاف ریشمی دوپٹہ اوڑھے کھڑی ہوتی ہے تو اس کا مکھڑا ایسا دمکتا ہے

جیسے کہ سورج، جب کہ وہ منزل اسعد میں داخل ہو (اسعد وہ منزل ہے جس میں پہنچنے کے بعد سورج بہت ہی خوبصورت دکھائی دیتا ہے)۔

(۴) یا وہ سیپی کا وہ موتی ہے کہ غوطہ خور جب اسے دیکھ لیتا ہے تو خوشی کے مارے اس کی چیخ نکل جاتی ہے اور وہ سربسجود ہو جاتا ہے۔

(۵) یا سنگ مرمر کا ایسا بلند مجسمہ ہے جس کی تخلیق میں اینٹ اور پکائی ہوئی چینی (خزف) استعمال کی گئی ہے۔

(۶) (ایک دن) اس کے سر سے دوپٹہ سرک گیا، حالانکہ اس نے گرانے کا ارادہ نہیں کیا تھا (تو شرم کے مارے) اس نے ایک ہاتھ سے اسے سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے ہم سے اپنے چہرہ کو اوٹ میں کر لیا۔

(۷) یہ ہاتھ مہندی رچا، بڑا نرم و نازک تھا۔ اور انگلیاں ایسی حسین اور سرخی لیے ہوئے گویا وہ عنم کا درخت ہے جس کی شاخیں گتھی نہیں تھیں ۔ (عنم ایک درخت کا نام ہے جس کے پھل سرخ ہوتے ہیں اور شاخیں بہت نرم اور لچکیلی)۔

(۸) اگر وہ، ایک ادھیڑ عمر، غیر شادی شدہ، راہب کے سامنے آجائے، جس نے اپنی ساری عمر اللہ کی عبادت میں گزار دی ہو تو

(۹) وہ اس کے حسن برق پاش کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہ جائے، اور اس کی خوش گفتاری پر فریفتہ ہو جاتے اور اپنے اس عمل کو سب سے بڑی عقلمندی یا رشد و ہدایت تصور کرنے لگے، چاہے اسے یہ عقلمندی یا رشد و ہدایت میسر نہ آسکے۔

اس وصفیہ قصیدہ کے علاوہ غزل کے اشعار اس کے دوسرے قصیدوں میں بھی جابجا ملتے ہیں۔ ان میں سب سے مثالی وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے:۔

غراء اکمل من یعیش علی قدم حسنا و أصلع من حادرته الکلما

اعتذاریات کے علاوہ اس کے کلام کا بہترین نمونہ اس کے اس قصیدہ میں بھی ملتا ہے جس کی وجہ سے بعض نقادوں نے اسے اصحاب المعلقات کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔ اس کا مطلع ہے:۔

عوجوا فحیوا لنعم دمنة الدار ماذا تحیون من نوی وأحجار[1]

۱۔ احمد الاسکندری وغیرہ نے المفصل ج ۱، ص ۸۲ میں اس کا والیہ قصیدہ جس کا مطلع ہے: اگلا صفحہ

اس معلقہ میں ساٹھ شعر ہیں اور اس میں مختلف مضامین سے بحث کی گئی ہے، جن میں

سے اہم یہ ہیں۔

"شروع میں وہ اپنی محبوبہ نعم اور اس کے دیار کا ذکر کرتا ہے، پھر اس کے حسن وجمال کی تعریف کرتا ہے، پھر سیر وشکار کا ذکر کرتا ہے پھر اپنی قوم کی بہادری پر فخر کرنے کے ساتھ معلقہ ختم کرتا ہے:"

بعض نقادوں نے اس کے اس قصیدہ کو جس کا مطلع ہے۔

یادارمیۃ بالعلیا فالسند   أقوت وطال علیہا سالف الدھر

معلقہ کے زمرہ میں شامل کیا ہے مگر ثقہ تذکرہ نگاروں نے سب سے پہلے جس قصیدہ کا ذکر ہوا ہے اس کو معلقہ نابغہ شمار کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ الاغانی ــــــــــ ابو الفرج الاصفہانی

۲۔ جمہرۃ اشعار العرب ــــــــــ ابو زید القرشی۔

۳۔ طبقات فحول الشعراء ــــــــــ ابن سلام الجمحی

۴۔ البیان والتبیین ــــــــــ جاحظ ج ۱۔۲۔۳۔۴۔

۵۔ شرح المعلقات السبع ــــــــــ لابی عبد اللہ الحسین الزوزنی۔

۶۔ المعلقات العشر واخبار قائلیہا ــــــــــ امین الشنقیطی

۷۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ــــــــــ جرجی زیدان /ج/۱

۸۔ تاریخ الادب العربی ــــــــــ احمد حسن الزیات

۹۔ الوسیط فی الادب العربی وتاریخہ ــــــــــ احمد الاسکندری

۱۰۔ المفصل فی تاریخ الادب العربی ــــــــــ مصطفیٰ عنانی

۱۱۔ المنتخب من ادب العرب ــــــــــ طٰہٰ حسین

۱۲۔ فی الادب الجاہلی ــــــــــ طٰہٰ حسین

(باقی حاشیہ ص ۲۰۱) یا دار میۃ بالعلیا فالسند ۔ ا أقوت وطال علیہا سالف الابد کو اس کا معلقہ بتایا ہے۔ لیکن اصح وہی قصیدہ ہے جس کا ذکر ہم نے کیا ہے۔

۳۔ زُہَیر بن اُبی سُلمیٰ

(م ۶۱۵ء یا ۶۳۱ء، بعثت نبوی سے ایک سال قبل)

زہیر کا پورا نام زہیر بن ابی سُلمیٰ ربیعہ بن ریاح المزنی ہے۔[1] یہ دورِ جاہلی کے ان تین ممتاز شعرا میں شمار کیا جاتا ہے جنھیں طبقۂ اوّل میں گنا جاتا ہے۔ مگر اپنے ہم طبقہ دونوں شعرا کے مقابلہ میں بڑا پاکباز اور پاک گفتار تھا۔ کلام میں اختصار پسندی، حکمت و فلسفہ کی گہرائی اور اپنے اشعار کو مستقل طور سے کانٹ چھانٹ، اصلاح و ترمیم اور نظرِ ثانی کر کے صرف عمدہ اور معیاری اشعار کو باقی رکھنے میں اپنے دونوں ساتھیوں یعنی امرؤ القیس اور نابغہ الذبیانی پر فوقیت رکھتا ہے۔

زُہَیر قبیلہ مُزَینہ سے تعلق رکھتا تھا، جو قبیلہ مضر کی ایک شاخ تھا۔ زہیر اور اس کے ماں باپ اور اس کے خاندان کے لوگ نجد میں غَطَفان کے علاقے میں رہتے تھے۔

قبیلہ غطفان کا یہ علاقہ وہی سرزمین ہے جہاں عرب کے دو قبیلوں عبس اور ذبیان میں ایک مدت دراز تک وہ خونیں معرکے ہوتے رہے جنھیں تاریخ میں حرب داحس و غبراء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔[2] ان جنگوں میں جہاں ایک طرف سیکڑوں لوگوں کی جانیں گئیں، بیشمار بچے یتیم اور متعدد عورتیں بیوہ ہوئیں، وہاں ان کی بدولت دورِ جاہلی میں شعر و ادب کے بہت سے نئے اصناف بھی پیدا ہوئے۔ چنانچہ شاعری کے نئے اصناف میں فخر، ہجو، حماسہ اور "ثأر" یعنی خون کا بدلہ لینے کا جذبہ، انھیں جنگوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا۔ اسی طرح ان معرکوں اور ان سے متعلق قصوں اور

۱۔ پورا سلسلۂ نسب یوں ہے: ـــــــ زہیر بن ابی سلمیٰ (واسم ابی سلمیٰ ربیعہ) بن ریاح بن قرط بن الحارث بن مازن بن ثعلبہ بن ثور بن ہدمہ بن لاطم بن عثمان بن مزینہ۔ (سن وفات میں خاصا اختلاف ہے) (طبقات فحول الشعراء: ابن سلام الجمحی)

۲۔ حرب داحس و غبراء کے متعلق ص ۱۴۳ پر گذر چکا ہے۔

واقعات کو ایک حد تک منظوم کر کے محفوظ رکھنے کا طریقہ بھی اکثر انھیں لڑائیوں کی دین ہے۔ چنانچہ عنترہ بن شداد العبسی کے کلام میں اس جنگ کے آخری مرحلوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور سب سے بڑا فائدہ ان جنگوں کی ہولناکیوں کا یہ ہوا کہ پہلی دفعہ جزیرہ نمائے عرب میں صلح و آشتی اور امن و چین سے رہنے کی دعوت اور جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑوں سے نفرت کرنے کا نعرہ اسی سرزمین سے بلند ہوا، اور یہ نعرہ لگانے والا ہمارا شاعر زہیر بن ابی سلمٰی تھا۔

زہیر کی نشو و نما قبیلہ غطفان کے اسی علاقہ میں ہوئی، لیکن ایسے گھرانے میں جس کے تمام افراد مرد اور عورت سب شاعر تھے چنانچہ اس کا باپ، اس کا خالو اس کی دو بہنیں سلمٰی اور خنسا، اور زہیر کے دونوں لڑکے کعب اور بُجَیر سب شاعر تھے۔ ان کے علاوہ اس کے باپ کا خالو بشامہ بن الغدیر بھی اپنے زمانے کا سب سے بڑا شاعر، فلسفی، دانا اور مالدار آدمی تھا۔ قبیلہ غطفان میں اس کی ذہانت، سمجھ بوجھ اور دور اندیشی کا ایسا شہرہ تھا کہ مشکل مسائل کی گتھیاں سلجھانے کے لئے لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ اپنے معاملات میں اس سے مشورہ لیتے تھے اور اس کے کہنے کے مطابق چلتے تھے۔ اس کی عزت اور قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ مالِ غنیمت میں سے سب سے پہلے اس کا حصہ نکال کر رکھ دیتے تھے۔ زہیر نے اسی کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی۔ اور اس کے کلام اور اس کی حکمت و فلسفہ اور طرزِ فکر و نظر سے بہت متاثر ہوا۔ جس کی جھلک اس کے کلام میں بھی ملتی ہے۔ بشامہ کے علاوہ زہیر نے اپنے سوتیلے باپ اوس بن حجر سے بھی جو اپنے زمانہ میں مضر کا شاعر تھا استفادہ کیا۔ اور اس کے اشعار کی روایت کی۔ اور آخر میں اس سے بھی سبقت لے گیا۔ ظاہر ہے جس شخص کو ایسا شعری ماحول اور ایسے بلند پایہ شاعر میسّر آجائیں تو اس کے کلام میں سحر آفرینی کیسے نہیں پیدا ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ زہیر بن ابی سلمٰی جاہلی عہد میں آسمان شعر و ادب پر روشن ستارہ بن کر چمکا جس کی دعوت کی روشنی سے سارا جزیرہ عرب جگمگا اٹھا۔

زہیر بن ابی سلمٰی نے عرب کے اس صحرائے بے آب و گیاہ میں سب سے پہلے صلح و آشتی، محبت اور میل جول کے لافانی نغمے اپنے اشعار میں گائے۔ عبس اور ذبیان کے قبیلے داحس و غبراء کی جنگ میں لڑ کر کٹے مرے جا رہے تھے۔ اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ چالیس سال تک کشت و خون ہونے کے بعد بھی اس کی ہولناکی کا سلسلہ ختم ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ قبیلہ ذبیان کے دو سرداروں ہرم بن سنان اور الحارث بن عوف کے دل میں رحم آیا اور انھوں نے کوشش کر کے آپس میں صلح کرائی۔ اور مقتولین کے خون بہا کے طور پر

اپنے پاس سے تین ہزار اونٹ دیئے اور اس طرح یہ منحوس لڑائی ختم ہوئی۔ اور دونوں قبیلوں کو چین سے سونا نصیب ہوا۔ زہیر بن ابی سلمیٰ کے دل پر جو فطرتاً بہت صلح جو، نیک اور اخلاق فاضلہ کا مالک تھا، اس واقعہ کا بہت گہرا اثر ہوا اور ان دونوں سرداروں کی عزت و وقعت بہت بڑھ گئی چنانچہ اس نے ان دونوں کی شان میں ایک شاندار مدحیہ قصیدہ کہا جس میں دل کھول کر ان کے اس نیک کام کی تعریف کی، جنگ و جدال کی ہولناکی کے انجام سے ڈرایا۔ اور صلح و صفائی سے رہنے کی ترغیب دی۔ اور یہ سب اتنے حسین انداز، دلکش پیرایہ بیان عبرت و موعظت کے موثر طریقہ پر کہ بات دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ اس کا یہ مدحیہ قصیدہ وہ معلقہ ہے جس کا مشہور مطلع ہے:-

أمن أمّ أوفى دمنة لم تكلم

بحومانة الدراج فالمتثلم

کیا ام اوفیٰ (زہیر کی بیوی کا نام) کے رہنے کی جگہ کے یہ نشانات جو حومانۃ الدراج و متثلم میں ہیں، بولتے نہیں۔ یعنی میرے سوالوں کے جوابات نہیں دیتے؟۔

اس معلقہ میں ۵۹ شعر ہیں اور اس کا موضوع جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہرم بن سنان اور حارث بن عوف کے صلح و صفائی اور قربانی کے کارناموں کی تعریف ہے۔ اور اس کے ضمن میں میل محبت، صلح و آشتی سے رہنے کی تلقین ہے۔ پہلے شعر سے لے کر پندرہویں شعر تک اپنی بیوی ام آوفی سے جاہلی دور کے طریقے کے مطابق اظہار عشق ہے۔ ام اوفی سے کسی بات پر خفا ہو کر زہیر نے اسے طلاق دے دی تھی۔ لیکن جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو پھر اسے اپنے گھر بلانے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا۔ اس کا اثر زہیر کے دل پر بہت ہوا۔ اور وہ اس کو اور اس کی نگری کو یاد کر کے رو دیا۔

ودار لها بالرقمتين كأنها   مراجع وشم في نواشر معصم

یعنی ام اوفی کے مکانوں میں سے ایک مکان وہ بھی ہے جو دو سنگلاخ زمینوں کے درمیان واقع ہے، اور جس کے نشانات ہوا اور پانی سے دھل کر اس طرح نکھر گئے ہیں جیسے کہ کسی عورت کی کلائی کی رگوں پر گدنوں کو دوبارہ گود کر نکھار دیا گیا ہو۔

شاعر اس جگہ بیس سال گزرنے کے بعد آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جگہ کے پہچاننے میں دشواری ہوتی ہے:— وقفت بها من بعد عشرين حجة

فلأيا عرفت الدار بعد توهم

اس کے بعد دستور کے مطابق ان جگہوں سے محبوبہ کے قافلہ کے کوچ کا نقشہ کھینچتا ہے۔

اور یہ بتاتا ہے کہ یہ بڑے سکون اور بے خوفی سے سفر کرتی ہیں، اور جب منزل پر اترتی ہیں اور پڑاؤ پڑتا ہے تب بھی اسی طرح اطمینان و سکون سے رہتی ہیں، جیسے کہ اپنے گھر میں ہوں۔ اس کے بعد ان کے حسن و جمال اور ان کی دل آویزی و دلداری کا نقشہ کھینچتا ہے۔

وفیھن ملھی للطیف ومنظر　　　أنیق لعین الناظر المتوسم

یعنی ان عورتوں میں باریک بین آدمی کے لئے دل بہلانے کے سارے انداز موجود ہیں، اور صاحب نظر اور پرکھ رکھنے والے آدمی کے لئے بہت جاذب آگیں نظارہ ہے۔

ع　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جا ست

تشبیب کے بعد حسب دستور گریز کرتا ہے اور اصل مطلب یا موضوع پر آتا ہے۔ چنانچہ سولہویں شعر سے لے کر ۲۵ ویں شعر تک ھرم اور الحارث کی تعریف کرتا ہے، اور صلح و صفائی کے لئے جو کوشش ان دونوں نے کی ہیں ان کو جی کھول کر سراہتا ہے، اور بہت ہی دلنشیں انداز سے کہتا ہے:۔

فاقسمت بالبیت الذی طاف حولہ　　　رجال بنوہ من قریش وجرھم

تو میں اس خانہ کعبہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ارد گرد قریش اور جرہم کے وہ لوگ طواف کرتے ہیں جنھوں نے اس کو بنایا ہے کہ

یمینا لنعم السیدان وجدتما　　　علیٰ کل حال من سحیل ومبرم

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم دونوں روئے زمین پر سختی و نرمی دونوں حالتوں میں بہترین سردار ثابت ہوتے ہو۔ (یعنی مصیبت اور فارغ البالی)

اس کے بعد ان دونوں کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے:۔

تدارکتما عبسا وذبیان بعدما　　　تفانوا ودقوا بینھم عطر منشم

تم دونوں نے عبس اور ذُبیان کو ان کے مٹنے اور منشم[1] کے عطر پر قسم کھانے کے بعد بچا لیا۔

۱۔ عطرِ مَنشم: منشم کا عطر۔ یہ ایک عربی کہاوت ہے جو منحوسیت کے موقعہ پر بولی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے رائج ہونے کے بارے میں دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں ______ ایک تو یہ ہے کہ منشم ایک عطر فروش عورت تھی جس سے کچھ لوگوں نے عطر خرید کر اس میں ہاتھ ڈال کر یہ عہد کیا کہ یا تو دشمن کو زیر کر دیں گے یا لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔ چنانچہ یہ لوگ دشمن سے نبرد آزما ہوئے اور لڑائی میں سب کے سب مارے گئے۔ اس لئے

(باقی ص ۲۰۸ پر)

اس کے بعد اس صلح و صفائی سے اور خون بہا کے اونٹوں سے جو خیر و برکت اور مال و دولت کی فراوانی دونوں قبیلوں میں ہوئی اس کا ذکر کرتا ہے اور پھر ۲۹ ویں شعر سے ۳۲ ویں شعر تک سارے عرب کو مخاطب کر کے جنگ اور اس کی ہولناکی کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کے مہیب انجام سے ان کو ڈراتا ہے۔

وما الحرب إلا ما علمتم وذقتم   وما هو عنها بالحديث المرجم

(سے فتنغلل لکم تک)

تم لوگ جنگ کا مزہ چکھ کر خوب اچھی طرح اب اسے سمجھ چکے ہو۔ اب یہ تمہارے لئے کوئی انکل پچو بات نہیں رہ گئی ہے۔

اس لئے جب بھی تم لوگ جنگ چھیڑو گے تو وہ بُری ہی ثابت ہوگی اور اگر تم لوگوں نے اسے بھڑکایا تو خوب زور و شور سے بھڑک اٹھے گی۔

پھر تمہیں اس طرح پیس کر رکھ دے گی جس طرح چکی کے پاٹ دانے کو پیس دیتے ہیں پھر یہ جنگ سال میں دو مرتبہ حاملہ ہوگی اور ہر دفعہ جڑواں بچے دے گی یعنی دن بدن اس کی شدت اور ہولناکی بڑھتی ہی جائے گی۔ اور احمر عاد کی طرح کا ہی منحوس بچے جنے گی (یعنی قدار بن سالف جیسے منحوس بچے، جس نے صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ذبح کر دیا تھا، جس کی وجہ سے قوم ثمود پر سخت عذاب نازل ہوا۔) پھر انہیں دودھ پلائے گی، اور اس کے بعد ان کا دودھ چھڑائے گی، اور اس کے بعد اتنے کثیر قفیز و درہم (پیمانے) غلہ پیدا کرے گی جتنا کہ عراق کے گاؤں بھی پیدا نہیں کر پاتے۔ یعنی یہ جنگ جتنا طول کھینچے گی اتنی ہی پریشانی مصیبت، ہولناکی اور تباہی بڑھے گی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اسے ختم کر دو اور سب مل جُل کر زندگی گزارو، ورنہ سب تباہ ہو جاؤ گے۔

اس کے بعد حُصَین بن ضَمضَم اور اس کی نازیبا حرکتوں کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

لعمری لنعم الحی جر علیهم   بما لا یؤاتیهم حصین بن ضمضم

(باقی صفحہ پر دیکھو) یہ عطر نحوست میں ضرب المثل ہو گیا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ منشم ایک عطر فروش تھا جس سے مردوں پر ملنے کے لئے لوگ ایک خاص قسم کا مسالہ خریدا کرتے تھے، اور اس طرح یہ نحوست میں ضرب المثل ہو گیا۔

(مجمع الامثال للمیدانی)

میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ قبیلہ ہی اچھا ہے جس پر حصین نے زیادتی کی تھی۔
اگرچہ اس قبیلے نے اس کی عہد شکنی اور دھوکہ دہی پر اس کی موافقت نہیں کی تھی!

اس کے بعد ۴۷ ویں شعر سے معلقہ کے آخر تک حکمت و فلسفہ کی باتیں کرتا ہے اور اپنی لمبی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ جس میں اپنی مثال دے کر بتاتا ہے کہ انسان جتنی لمبی زندگی پاتا ہے اتنا ہی اس زندگی سے اکتا جاتا ہے کہ دنیا کی زندگی بڑی تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔

سئمت تکالیف الحیاۃ ومن یعش ثمانین حولاً لا أبالک[2] یسأم

میں زندگی کی تکلیفوں سے اکتا چکا ہوں، مایوس ہو گیا ہوں۔ اور جو شخص اسی سال تک
زندہ رہے گا تمہارے باپ کی جان کی قسم اس زندگی سے اکتا ہی جائے گا۔

اس کے بعد صبر و تحمل اور دوسروں کی لغزشوں اور غلطیوں کو معاف کرنے کی تلقین کرتا ہے پھر سخاوت کی طرف مائل کرتا ہے۔ نیکی کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ بتاتا ہے کہ موت برحق ہے۔ کسی کو بھی اس سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ خواہ وہ سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ جائے۔ اس کے بعد اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ بُرا کام اور بُری عادت چاہے کتنی ہی چھپائی جائے ایک نہ ایک دن ظاہر ہو کر رہے گی پھر ایک بڑے پتہ کی بات بتاتا ہے کہ انسان درحقیقت نام ہے زبان اور دل کا۔ اگر یہی دونوں بگڑ جائیں تو پھر انسان نہیں بلکہ گوشت پوست کا صرف ایک جاندار شے رہ جائے گا۔ ان حکیمانہ باتوں کے بعد یہ معلقہ ختم ہو جاتا ہے۔

ومہما یکن عند امرئٍ من خلیقۃ وإن خالہا تخفی علی الناس تعلم

وکائن تری من صامت لک معجب زیادتہ اونقصہ فی التکلم

۱۔ قصہ کی تفصیل تاریخ ادب کی کتابوں میں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ورد بن حابس العبسی نے اس صلح سے پہلے ھرم بن ضمضم کو قتل کر دیا تھا۔ جب عبس اور ذبیان نے صلح کی تو حصین بن ضمضم کہیں چھپ گیا تاکہ وہ اس میں شریک نہ ہو اور ایک دن گھات لگا کر اس نے ایک عبسی کو قتل کر ڈالا جس سے دونوں قبیلوں میں پھر تلواریں نکل آئیں لیکن خون کے بدلے مال لینے پر معاملہ رفع دفع ہو گیا اس دھوکہ بازی کی طرف اس شعر میں اشارہ ہے۔

۲۔ لا ابالک ـــــ تیرا باپ نہ ہے۔ لیکن عرب اس کو دعا کے طور پر نہیں سمجھتے تھے بلکہ قسم کے معنی میں اور کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے بولتے تھے۔

لسان الفتی نصف ونصف فؤاده فلم یبق الا صورۃ اللحم والدم

یعنی اگر کسی شخص میں کوئی بُری عادت ہے، مدد وہ یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کو اس کا علم نہیں تو یہ غلط ہے کیونکہ ایسی عادتیں لاکھ چھپائی جائیں، ایک نہ ایک دن کھل کر رہتی ہیں۔ اکثر لوگ جب تک چپ رہتے ہیں، بڑے بھلے مانس دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کی حقیقت کا علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ بولتے ہیں۔ اس کو فارسی میں یوں کہا گیا ہے۔

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

اس کے بعد اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ آدمی درحقیقت عبارت ہے دل اور زبان سے یعنی جس کا دل اچھا ہو اور زبان پاک گو ہو وہ درحقیقت انسان ہے۔ اگر یہ نہیں تو یہ محض گوشت پوست کا لوتھڑا ہے۔ اس کے بعد ایک دوسری حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اگر بوڑھے آدمی میں بُری عادتیں پیدا ہو جائیں تو وہ کبھی نہیں جا سکتیں، مگر جوان آدمی چاہے تو اپنی بُری عادت چھوڑ سکتا ہے۔

اس کے بعد آخری شعر میں اپنے ممدوح ہرم بن سنان کی داد و دہش کا ذکر کر کے معلقہ کو ختم کر دیتا ہے۔

زہیر بن ابی سلمٰی کو اپنے ممدوح ہرم بن سنان سے اس کی سخاوت، صلح جوئی اور اخلاقِ فاضلہ کی وجہ سے بہت تعلق تھا۔ چنانچہ اپنے اکثر قصیدوں میں اس کی جی کھول کر تعریف کی ہے۔ ہرم کو بھی زہیر سے بڑا لگاؤ اور تعلقِ خاطر تھا۔ چنانچہ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ "جب بھی زہیر اس کی تعریف کرے گا، اس سے سوال کرے گا یا اس کو سلام کرے گا، وہ اسے ایک غلام یا ایک لونڈی یا ایک گھوڑا ضرور دے گا۔" ادھر زہیر اس کی داد و دہش سے اتنا گراں بار ہو چکا تھا کہ اس کی غیور طبیعت اب مزید احسان اٹھانے پر تیار نہیں تھی۔ چنانچہ جب وہ ہرم بن سنان کو کسی مجمع میں دیکھتا تو یوں سلام کرتا کہ "تم سب کی صبح بخیر ہو، سوائے ہرم کے۔ اور تم میں سے سب سے بہتر آدمی کو میں نے مستثنیٰ کیا ہے۔" انعموا صباحًا غیر ھرم وخیرکم استثنیتُ۔

ہرم بن سنان کی مدح میں جو قصیدے زہیر نے کہے ہیں، ان میں سب سے اچھا، معنی خیز، اور زہیر کے قدرتِ کلام، جدّت طرازی کا بہترین نمونہ ذیل کے اشعار ہیں۔

وأبیض فیاض یداہ غمامۃ علی معتفیہ ما تغب فواضلہ

أخی ثقۃ لا یھلک الخمر مالہ ولکنہ قد یھلک المال نائلہ

تراہ إذا ما جئتہ متھللا کأنک تعطیہ الذی أنت سائلہ

ہرم بن سنان عیوب سے پاک وصاف اور بڑا سخی داتا ہے۔ اس کے ہاتھ اس سے مدد مانگنے والے کے لئے مثل اس بادل کے ہیں جو نافہ نہیں کرتے، بلکہ مستقل برستے رہتے ہیں۔ وہ قابلِ بھروسہ شخص ہے۔ شراب اس کے مال کو ختم نہیں کر پاتی۔ البتہ اس کی سخاوت اسے ختم کر سکتی ہے۔

اس کے بعد اس کی سخاوت کے بارے میں ایسی نادر بات کہتا ہے، جو شاید اس سے پہلے کبھی کسی شاعر نے نہیں کہی۔ کہتا ہے:۔

جب تم اس کے پاس مانگنے کے لئے آؤ، تو وہ اتنا خوش ہوتا ہے اور اس کی باچھیں اس قدر کھل جاتی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم جو مانگ رہے ہو، درحقیقت مانگ نہیں رہے ہو بلکہ تم خود اس کو دے رہے ہو۔

زہیر کے ان مدحیہ قصائد نے ہرم بن سنان کی سخاوت، مروت، صلح وصفائی اور اعلیٰ اخلاق کی سارے عرب میں دھوم مچادی تھی۔ اور اس کے ان کارناموں کو ہمیشہ کے لئے زندہ و درخشندہ کر دیا۔

کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہرم بن سنان کے کسی لڑکے سے کہا کہ زہیر نے تمہارے باپ کی تعریف میں جو اشعار کہے ہیں ان میں سے چند مجھے بھی سناؤ۔ چنانچہ لڑکے نے آپ کو چند شعر سنائے۔ آپ نے فرمایا کہ" وہ واقعی تم لوگوں کے بارے میں بہت اچھے شعر کہتا تھا"۔ اس پر لڑکے نے جواب دیا" خدا کی قسم ہم لوگ بھی تو خوب دل کھول کر داد و دہش کرتے تھے" حضرت عمر نے کہا کہ ہاں، مگر جو کچھ تم نے اس کو دیا تھا وہ تو اب ختم ہو چکا۔ مگر اس نے جو کچھ تم کو دیا ہے وہ اب تک باقی ہے"۔ اسی طرح ایک دفعہ آپ نے زہیر کے لڑکے سے کہا کہ تمہارے باپ کو ہرم نے جو خلعتیں پہنائی تھیں ان کا کیا حشر ہوا" لڑکے نے جواب دیا" امیر المومنین، انھیں تو زمانہ نے خستہ کر دیا" آپ بولے کہ" لیکن تمہارے باپ نے ہرم بن سنان کو جو جوڑے پہناتے تھے، انھیں زمانہ پرانا اور خستہ نہ کر سکا" ہرم بن سنان کے مرنے پر زہیر نے اس کا زوردار مرثیہ بھی لکھا تھا۔

زہیر جاہلی شعرا میں پہلا شاعر ہے جو اپنے کلام کو معیار کے مطابق نوک پلک سے درست رکھنے، الفاظ ومعانی کے اعتبار سے بھرپور، اثر آفرینی اور دلکشی میں معیاری رکھنے کی طرف بڑی توجہ دیتا تھا۔ اسی لئے قصیدہ کہنے کے بعد فوراً اسے مشتہر نہیں کرتا تھا، بلکہ اس کا معمول تھا کہ اپنے لمبے قصیدے چار مہینے میں کہتا، اور ان کی اصلاح وترمیم چار مہینے تک کرتا،

پھر چار مہینے تک انھیں اپنے خاص دوستوں اور شاگردوں کو سناتا رہتا۔ اس کے بعد انھیں عوام میں مشہور کرنے کی اجازت دیتا۔ اسی لئے زہیر کے ان قصیدوں کو "حولیات" یعنی جن پر ایک سال گزر چکا ہو، کہتے ہیں۔

اس قسم کے لمبے قصیدے اس کے چار ہیں، جن کے مطلعے ہیں :۔

۱۔ قِفْ بالدیارِ التی لم یعفها القِدَمُ	بلیٰ وغیّرها الأرواح والدّیَمُ
۲۔ إنّ الخلیط اجدّ البین فانفرقا	وعلق القلب من أسماء ما علقا
۳۔ بان الخلیطُ ولم یأووا لمن ترکوا	وزوّدوك اشتیاقا ایّةً سلکوا
۴ لمن طلل برامة لا یریم	عفا وخلاله حُقبٌ قدیمُ

کلام کی امتیازی خصوصیات

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ زہیر باتفاق رائے جاہلی شعرا کے طبقہ اوّل میں شمار کیا جاتا ہے۔ بعض علماء اور نقادوں نے اسے اپنے دونوں ہم طبقہ شاعروں یعنی امرؤ القیس اور نابغہ الذبیانی پر بھی فوقیت دی ہے اور اس ترجیح کی دلیل یہ ہے کہ زہیر کے کلام میں مندرجہ ذیل امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ جو مذکورہ دونوں شاعروں میں نہیں پائی جاتی۔

زہیر کا کلام دور از کار اور فضول باتوں سے پاک ہے ۔ اور حسنِ ایجاز کا مرقع ہے۔ وہ اس خوبصورتی سے شعر کہتا ہے کہ تھوڑے سے الفاظ سے بہت سے معانی اور مطالب پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے اس کا یہ شعر :۔

مهما یك من خیر أتوه فانما ... توارثه آباء آبائهم قبلُ

یہ لوگ جو بھلائیاں اور اچھے کام کرتے ہیں، درحقیقت انھیں ان کے آباء اجداد کے آباء و اجداد نے ورثہ میں پایا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ خاندانی شریف لوگ ہیں اور بھلائی کرنا ان کے پرکھوں سے انھیں ورثہ میں ملا ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے احنف بن قیس سے پوچھا کہ شاعروں میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ زہیر۔ معاویہ نے کہا۔ وہ کیسے۔ تو بولے کہ اس نے مدح میں سے فضول اور بیکار باتوں کو نکال دیا ہے۔ معاویہ نے کہا مثلاً؟ تو احنف نے مذکورہ بالا شعر مثال میں پیش کیا۔

دوسرے یہ کہ اس کے مدحیہ قصائد بہت معیاری اور جھوٹ سے پاک وصاف ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی کی تعریف کرتا ہے تو اس کے سچے اور حقیقی اوصاف کو گنتا ہے۔ جھوٹے اوصاف یا جھوٹے اخلاق کی تعریف نہیں کرتا ہے۔ جیسے۔

علیٰ مکثریھم رزق من یعتریھم   وعند المقلین السماحة والبذل

یعنی ان میں جو لوگ مالدار ہیں ان کے ذمہ ان کے ناداروں کا رزق ہوتا ہے اور جو لوگ کم استطاعت والے ہوتے ہیں ان کے ساتھ فیاضی اور سخاوت کا برتاؤ کرتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ تعقید لفظی ومعنوی سے حتی الامکان پرہیز کرتا ہے۔ کلام میں نامانوس اور بھدّے بھونڈے الفاظ نہیں استعمال کرتا۔ معانی ومطالب کو بیان کرنے سے پہلے ان پر غور کرتا ہے اور ان کے لئے مناسب اور چیدہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جیسے :

لو أن حمداً یخلد الناس أخلدوا

ولکن حمد الناس لیس بمخلد

یعنی اگر تعریف سے لوگوں کو بقائے دوام حاصل ہو سکتا تو یہ لوگ ضرور بقائے دوام حاصل کر لیتے لیکن لوگوں کی تعریف کسی کو بقائے دوام نہیں بخش سکتی۔

حضرت بن عباس سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے کہا کہ کیا تم شاعروں کے شاعر کے کلام کی روایت کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ وہ کون؟ تو بولے کہ وہ جو کہتا ہے ــ ولو ان حمدا ــــــ الخ۔ میں نے کہا کہ وہ تو زہیر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، وہی شاعروں کا شاعر ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ تو فرمایا کہ چونکہ وہ کلام میں تعقید نہیں کرتا تھا اور نہ ایک مفہوم کو دوسرے میں گڈمڈ کرتا تھا۔ اور اس کے علاوہ نامانوس اور بھدّے الفاظ سے پرہیز کرتا تھا۔ اور آدمی کی سچی اور صحیح تعریف کرتا تھا[1] عکرمہ بن جریر نے کہا ہے کہ ایک دن میں نے اپنے والد (جریر) سے پوچھا کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ دورِ جاہلیت میں یا اسلامی عہد میں؟ میں نے کہا کہ دورِ جاہلیت میں۔ تو بولے کہ زہیر سب سے ممتاز شاعر ہے۔

چوتھے یہ کہ اس کے کلام میں گندے، گھٹیا اور معیار سے گرے ہوئے الفاظ بہت کم ملتے ہیں۔

---

(۱) العمدۃ اور البیان والتبیین ۱/۱۳۵ میں آیا ہے کہ حضرت عمر زہیر کو اس شعر کی وجہ سے شعراء کے قاضی کا خطاب دیا تھا ع فإن الحق مقطعه ثلاث ۔یمین أو نفار أو جلاءُ

جس کی وجہ سے اس کے کلام میں عفت اور تقدس کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے کبھی کسی کی ہجو نہیں کی۔ البتہ ایک مرتبہ ایک قبیلہ کی ہجو کی اور جب ان کو اس سے شدید تکلیف پہنچی تو اس پر اسے سخت ندامت ہوئی۔

اس کے کلام میں حکمت و فلسفہ اور ضرب الامثال کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ جو کسی دوسرے جاہلی شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عربی شاعری میں ضرب الامثال اور حکمت و فلسفہ کی آمیزش کی داغ بیل اسی نے ڈالی ہے۔ عہد عباسی کے ممتاز شعرا صالح بن عبد القدوس، ابو العتاہیہ، ابو تمام، المتنبی اور المعری نے اس نہج کو اس کی تقلید میں اپنایا ہے۔

رأیت المنایا خبط عشواء من تصب ۔۔۔ تمته، ومن تخطئ یعمر فیھرم

رأیتُ المنایا خبطَ عشواءَ من تُصب ۔۔۔ تُمِتهُ ومن تُخطِئ یُعمَّر فیَهرَم

ومن یجعل المعروف من دون عرضه ۔۔۔ یفره، ومن لا یتق الشتم یُشتم

ومن یکُ ذا فضلٍ فیبخل بفضله ۔۔۔ علی قومه، یُستغنَ عنه ویذمم

ومن ھابَ أسباب المنایا ینلنه ۔۔۔ وإن یرق أسباب السماء بسُلّم

ومن یوفِ لا یُذمم، ومن یهدِ قلبه ۔۔۔ إلی مطمئن البر، لا یتجمجم

ومن یجعل المعروفَ فی غیرِ أھلهِ ۔۔۔ یکن حمده ذمًا علیهِ ویندم

ترجمہ۔ میں نے موتوں کو اندھی اونٹنیوں کی طرح سے ٹاپک ٹوئیاں مارتے دیکھا کہ جو شخص ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو وہ ختم کر دیتی ہیں اور جس پر ان کا داؤں نہ چل سکا تو وہ بہت دنوں تک جیتا رہتا ہے پھر بوڑھا ہوتا ہے۔

۲۔ جو شخص بھلائی کو اپنی عزت کے لئے ڈھال لیتا ہے تو اسے وہ بڑھا لیتا ہے اور جو شخص گالی سے نہیں بچتا اسے گالی دی جاتی ہے۔

۳۔ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ مال ہوتا ہے پھر وہ اپنی قوم سے بخل کرتا ہے تو اس سے بے پرواہی برتی جاتی ہے اور اس کی برائی کی جاتی ہے۔

۴۔ جو شخص موتوں کے راستوں سے ڈرتا ہے تو موتیں اسے پا ضرور لیتی ہیں، چاہے وہ سیڑھی لگا کر آسمان کی بلندیوں پر کیوں نہ چڑھ جائے۔

۵۔ جو شخص ایفائے عہد و پیمان کرتا ہے اس کی برائی نہیں کی جاتی اور جس کے دل کو بھلائی کرنے کی ہدایت مل جائے۔ (یعنی دل سے بھلائی کا خیال کرتا ہے) تو وہ

پس و پیش نہیں کرتا۔

۶۔ (دگر) جو شخص نا اہلوں کے ساتھ بھلائی کرتا ہے تو بجائے شکریہ کے اسے بُرائی ملتی ہے اور آخر میں اسے شرمندگی اُٹھانی پڑتی ہے۔

عصر جاہلی میں یوں تو بعض دوسرے شعرا نے بھی حکمت و فلسفہ اور عقلمندی کی باتیں کہی ہیں لیکن زہیر اس صنف میں اس وجہ سے منفرد ہے کہ اس نے بعض ایسے حقائق کا اظہار کیا ہے جو عام طور سے جاہلی شعرا کے یہاں ناپید ہیں۔ مثلاً جنگ کی تباہ کاریاں، اخلاق فاضلہ اور اقدار عالیہ کی تعریف و توصیف، یا موت و زندگی کی حقیقت، انسان کا حال اور ان سب سے بڑھ کر اس حقیقت کا اظہار کہ اس کارگہ ہستی کو چلانے والی ایک ذات ہے جو دل کی باتوں کو بھی، چاہے لاکھ انھیں چھپانا چاہیں، جانتی ہے۔ اور یہ کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اسے ایک کتاب میں (نامہ اعمال) لکھ دیا جاتا ہے۔ اور قیامت کے دن آدمی کے سامنے اسے پیش کر کے ان پر اسے سزا دی جائے گی۔ یا اس کا بدلہ جلد ہی اس دنیا میں دے دیا جائے گا۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ زہیر اللہ پر بھی ایمان رکھتا تھا۔

فلا تکتمن اللہ ما فی نفوسکم   لیخفیٰ ومہما یکتم اللہ یعلم

یؤخر فیوضع فی کتاب فیدخر   لیوم حساب أو یعجل فینقم

اپنے ایک قصیدے میں اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ خدا کا وجود حق ہے۔ اور کہتا ہے کہ جب مجھے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوا تو اللہ کے ڈر نے مجھے اس حقیقت سے اور قریب کر دیا۔ مجھے اس بات کا بھی عرفان حاصل ہوا کہ گزری ہوئی چیز کو نہ میں واپس لا سکتا ہوں اور نہ جو آئندہ آنے والی ہے اسے اس کے وقت مقررہ سے پہلے حاصل کر سکتا ہوں اور یہ کہ موت کے چنگل سے میری جان نہیں بچ سکتی۔ چاہے اس کے بدلے میں، میں اپنا قیمتی مال دے دوں۔

بدا لی أن اللہ حق فزادنی   إلی الحق تقوی اللہ ما کان بادیا

بدا لی أنی لست مدرک ما مضیٰ   ولا سابق شیئاً إذا کان جائیا

وما إن أری نفسی تقیہا منیتی   وما إن تقی نفسی کرائم مالیا

اس قصیدہ میں ایک بہت پتے کی بات کہتا ہے۔

ألا لیت شعری، ہل یری الناس ما أری   من الأمر أو یبدو لہم ما بدا لیا

بدالی انّ الناس تفنی نفوسہم   وأموالهم ولا أری الدھر فانیا

ترجمہ:۔

کاش میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، لوگ بھی دیکھ لیتے، اور جس حقیقت کا انکشاف میرے اوپر ہوا ہے، ان کے اوپر بھی ہو جاتا۔ میرے اوپر یہ راز منکشف ہوا کہ لوگ اور ان کا مال ومتاع سب ایک دن فنا ہو جاتے گا۔ مگر زمانہ کو کبھی فنا نہیں التدلیس، باقی ہوس۔

کہتے ہیں کہ زہیر نے ایک سو سال سے بھی زیادہ عمر پائی۔ دلیل میں اس کا اپنا یہ شعر نقل کرتے ہیں:۔ ——— بدالی انی عشت تسعین حجۃ

تباغا دعشرا عشتها وثمانیا

اس سے ایک سو آٹھ سال عمر بنتی ہے۔ ہجرت نبوی سے ۱۱ سال پہلے وفات ہوئی۔ اس کے دونوں لڑکے کعب اور بجیر مسلمان ہوئے۔ ان کا تذکرہ مناسب موقع پر آئے گا۔

زہیر کا دیوان مع شرح ثعلب، م ۱۹۱۱، دار الکتب المصریۃ نے شائع کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ شعرائے جاہلی کے متعدد مجموعوں میں بھی اس کا دیوان چھپ چکا ہے۔

حوالہ جات:۔

۱۔ الاغانی — لابی الفرج الاصفہانی
۲۔ طبقات فحول الشعراء — لابن سلام الجمحی
۳۔ جمہرۃ اشعار العرب — لابی زید القرشی
۴۔ معاہد التنصیص — للعباسی
۵۔ شعراء النصرانیہ — للویس شیخو الیسوعی
۶۔ کتاب الشعر والشعراء — لابن قتیبہ
۷۔ فی الادب الجاہلی — لطٰہٰ حسین
۸۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ — لجرجی زیدان، الاوّل
۹۔ تاریخ الادب العربی — احمد حسن الزیات
۱۰۔ الوسیط — احمد الاسکندری
۱۱۔ المفصّل؛ — احمد الاسکندری وغیرہ
۱۲۔ العمدۃ فی صناعۃ الشعر ونقدہ لابن رشیق القیروانی
اور معلقات کی شروح

۴۔ عنترۃ بن شداد العبسی

م ۶۱۵ء

عنترہ نام، کنیت ابو المغلس تھی۔ وہ قبیلہ عبس کے ایک شخص شداد العبسی کا لونڈی زادہ تھا۔[1] اس کی ماں کا نام "زبیبہ" تھا۔ یہ ایک حبشی لونڈی تھی۔ جسے شداد نے اپنی کسی جنگ میں گرفتار کر کے لونڈی بنایا تھا، اور بعد میں اس کے پیٹ سے عنترہ پیدا ہوا۔ عربوں کا قاعدہ تھا کہ لونڈی کے پیٹ سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی اسے بھی غلام بنا لیتے تھے۔ اور اس سے بھی وہی کام لیتے اور وہی سلوک کرتے جو غلاموں کے ساتھ ان دنوں میں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس رواج کے مطابق عنترہ بھی اپنے باپ کے خاندان میں اچھوت کی طرح رہتا تھا۔ غلاموں کے دوسرے کاموں کے علاوہ اس کے ذمہ سب سے بڑا کام اونٹوں اور گھوڑوں کی گلہ بانی کرنا تھا۔ چنانچہ عنترہ دن بھر اپنے باپ کے جانور چراتا اور شام کو انھیں ان کے باڑے میں کر کے دودھ وغیرہ دوہتا، اور ان کی رکھوالی کرتا۔ عنترہ کی رگوں میں بھی چونکہ خالص عربی خون دوڑ رہا تھا، اس لئے اسے یہ برتاؤ اور اپنی حیثیت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ مگر رواج اور قانون سے مجبور تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے آپ کو کبھی دیگر غلاموں کی طرح گرنے نہیں دیا۔ اور نہ وہ غلامانہ ذہنیت پیدا ہونے دی جو عام طور سے ایسے حالات میں پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس نے اپنی عزتِ نفس، خودداری و خود نگری کو قائم رکھا اور دوسرے غلاموں کے برخلاف شہسواری اور فنونِ جنگ میں بڑی مہارت پیدا کی۔ یہاں تک کہ قبیلہ میں شہسوار، اولوالعزم اور باہمت نوجوان کی طرح اس کی شہرت ہو گئی۔ انھیں دنوں قبیلہ

۱۔ پورا سلسلۂ نسب یہ ہے: عنترہ بن شداد بن معاویہ بن قراد بن مخزوم بن مالک بن غالب بن قطیعہ بن عبس۔

طۓ کے بعض لوگوں نے عبس پر حملہ بول دیا، اور ان کے اونٹ و گھوڑے لے بھاگے۔ بنو عبس نے ان کا مقابلہ کیا، لیکن پیش نہ پا سکے۔ مجبوراً عنترہ کے باپ نے عنترہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ "کرَّ یا عنترۃ" یعنی عنترہ تم حملہ کرو۔ مگر عنترہ بولا کہ "العبد لا یحسن الکر، وانما یحسن الحلاب والصر" یعنی غلام حملہ کرنا کیا جانے، اسے تو صرف دودھ دوہنے اور اونٹنیوں کے تھنوں کو پینو سانے کا کام آتا ہے۔ اس چبھتے جملہ کو باپ سمجھ گیا۔ اس نے کہا کہ "کُرّ وانت حُرٌ" اچھا حملہ کرو تم آزاد ہو۔ عنترہ یہ سنتے ہی دشمنوں پر ٹوٹ پڑا، اور اس بہادری اور بے جگری سے لڑا کہ دشمنوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور وہ اونٹ اور گھوڑے چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، اور عنترہ اپنے جانور ان سے واپس لے آیا۔ اس کے اس کارنامے کے بعد اس کے باپ نے اسے اپنے نسب میں شامل کر لیا۔ اب عنترہ عام عبسیوں کے برابر ہو گیا۔ اور قبائل عرب میں عبس کے شہسوار اور سردار کی حیثیت سے اس کی شہرت پھیل گئی۔ عنترہ، شداد کے نسب میں داخل ہو جانے کے بعد قبیلہ عبس کے تمام معرکوں میں اور خاص طور سے داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں برابر شریک رہا۔ اور اپنی بہادری، بے خوفی اور فن سپہ گری میں مہارت کی بدولت سارے قبیلہ کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ اور لوگ اس کی بڑی عزت کرتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسے عزت و ناموس کا محافظ، جان و مال کا بچانے والا، شریف اور غیور سردار سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ عنترہ اپنے کارناموں کی بدولت بہادری اور شجاعت میں سارے عرب میں ضرب المثل بن گیا۔

عنترہ نے بڑی لمبی عمر پائی، بڑھاپے کی وجہ سے بہت ضعیف و لاغر ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں میں آخر میں اتنا دم نہیں رہا تھا کہ جنگ میں ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ قبیلہ طۓ پر ایک حملہ کے دوران گرفتار ہو گیا اور بعثت نبوی سے پہلے ہی ۶۱۵ء میں قتل کر دیا گیا۔

عنترہ اپنی ماں کی طرح کالا تھا۔ اس لئے اسے "أغْرِبَةُ العرب" یعنی عربوں کے کوؤں میں شمار کیا جاتا تھا[1]۔ اسے بھی اپنے اس عیب کا شدید احساس تھا۔ اور اسی عار کو دھونے کے لئے اس نے فن سپہ گری اور شجاعت و بہادری میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ چنانچہ اس نے خود کہا ہے کہ :-

---

۱۔ زمانۂ جاہلیت میں چار عرب کوے ہوئے ہیں ـــــ عنترہ ـــــ خفاف بن ندبہ ـــــ ابو عمیر بن الحباب ـــــ اور سلیک بن السلکہ جو صعالیک العرب یعنی خانماں برباد نوجوانوں میں شمار ہوتا تھا

إني امرؤ من خير عبس منصبا — شطري وأحمي سائري بالمنصل

وإذا الكتيبة أحجمت وتلاحظت — أُلفيت خيراً من معمّ مخول

اپنے نسب میں ایک طرف سے میں عبس کے بہترین افراد میں سے ہوں، اور اپنے پورے جسم کو میں تیز تلواروں کے ذریعہ بچاتا ہوں، اور جب فوج حملہ کرنے میں آنا کانی کرنے لگتی ہے تو میں نجیب الطرفین لوگوں سے بھی بہتر ثابت ہوتا ہوں۔

بہادری، اولوالعزمی اور فنون سپہ گری میں مہارت پیدا کر کے سارے عبسی نوجوانوں میں امتیاز حاصل کرنے کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اسے نوجوانی میں اپنی چچازاد بہن "عبلہ" سے محبت ہو گئی تھی، اس نے بڑی کوشش کی کہ اس سے اس کی شادی ہو جائے لیکن چچا نے صرف اس وجہ سے یہ رشتہ نامنظور کر دیا کہ وہ غلام تھا۔ اس ناکامی کا ردّ عمل اس پر یہ ہوا کہ ایک طرف تو اس نے ان فضائل اور اوصاف کی طرف اپنی توجہ مبذول کر دی، تو دوسری طرف اس ناکامی نے اس کے جذبات شاعری کو برانگیختہ کر دیا۔ چنانچہ دونوں میدانوں میں اس نے وہ نام اور کمال پیدا کیا کہ اپنے زمانے میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ آخر میں جب اس کے باپ نے اس کو آزاد کر کے اپنے نسب میں شامل کر لیا تو عبلہ سے اس کی شادی ہو گئی۔

امتیازی خصوصیات

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عنترہ جب تک غلام رہا، اس کی طبیعت بجھی بجھی اور جذبات شاعری خفتہ سے رہے، کیونکہ اس زمانے میں سوائے دو ایک شعر کے کوئی قابلِ ذکر قصیدہ یا غزل کا ذکر نہیں ملتا، البتہ جب وہ آزاد ہو گیا اور جنگ وجدل میں اس کی بہادری اور شجاعت کے جوہر کھلے تو اس کے جذبات شاعری بھی بھڑک اٹھے۔ اس کی یادگار اس کا وہ معلقہ ہے، جو ادب عربی میں فخر وحماسہ میں اپنی مثال آپ ہے۔

اس معلقہ کے کہنے کا سبب یہ ہوا کہ قبیلہ عبس کے ایک شخص نے اس کو اس کے کالے رنگ اور اس کی حبشی نژاد ماں کا طعنہ دیا اور بڑی بُری گالی دی۔ اس پر عنترہ نے کہا کہ تم ہمارے جیسا کیا مقابلہ کر سکتے ہو، میں تو جنگوں میں بے دھڑک کود پڑتا ہوں، مالِ غنیمت پورا پورا بانٹتا ہوں، اور دستِ سوال دراز کرنے سے پرہیز کرتا ہوں، لیکن اپنے مال میں سے بے دریغ سخاوت کرتا ہوں۔ عبسی نے کہا لیکن شعر تجھ سے اچھے میں کہہ لیتا ہوں۔ اس پر عنترہ نے کہا کہ اچھا تم کو یہ بعد

میں معلوم ہوگا کہ کون اچھے شعر کہتا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد اس نے اپنا یہ مشہور معلقہ کہا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے سونے کے پانی سے لکھا گیا۔ اس کا مطلع ہے:

هل غادر الشعراء من متردم　　　ام هل عرفت الدار بعد توهم[1]

اس معلقہ میں اس نے اپنی زبان دانی، شجاعت و بہادری اور اخلاقِ فاضلہ پر فخر کرنے کے علاوہ اپنی قوم کے کارناموں کو گنایا ہے اور ضمناً اس کی مدافعت میں جو کارہائے نمایاں اس نے انجام دیئے تھے، ان کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ اپنی سخاوت اور دریا دلی کا بھی اظہار کیا ہے۔ اس کا یہ معلقہ تمام معلقات میں سہل ترین الفاظ اور حسین ترین پیرایۂ بیان اور بہترین وصف اور شاندار فخر و حماسہ کا اعلیٰ نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

مطلع کے بعد اپنی محبوبہ عَبْلَہ کی نگری سے جاہلی شعرا کے دستور کے مطابق خطاب کرتا ہے اور اس کو سلام کرنے کے بعد بقائے دوام کی دعا دیتا ہے۔ اور پھر اپنی محبوبہ کی آنکھ، اس کی مسکراہٹ اور ہونٹوں کی تعریف کرنے کے بعد اپنی شدید محبت، سوزِ دروں اور پھر عالمِ یاس کی بہترین تصویر کھینچتا ہے۔

يا دار عبلة بالجواء تكلمي　　　وعمي صباحاً دار عبلة واسلمي

دار لآنسة غضيض طرفها　　　طوع العناق لذيذة المتبسم

حييت من طلل تقادم عهده　　　أقوى واقفر بعد ام الهيثم

حلت بارض الزائرين فاصبحت　　　عسراً علي طلابك ابنة مخرم

یہاں تک کہ کہتا ہے:

ولقد نزلت فلا تظني غيره　　　مني بمنزلة المحب المكرم

اس کے بعد اپنی محبوبہ کے ہونٹوں کی خوبصورتی اور مشامِ جان کو معطر کر دینے والے لعابِ دہن کا ذکر کرتا ہے اور اس کی مثال "فارۃ المسك" یعنی نافۂ مشک سے دیتا ہے اور یہ تصور دیتا ہے کہ جب تم اپنا منہ ایسے حسین ہونٹوں کو پیار کرنے کے لئے اس کی طرف بڑھاؤ گے، تو ہونٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی خوشبو کی ایک لپٹ محبوبہ کے منہ سے نکل کر تم کو سرمست و بے خود کر دے گی۔ پھر اس خوشبو کو اس سرسبز و شاداب باغ کی خوشبو سے تشبیہ دیتا ہے جو بارشوں سے سیراب

1۔ ترجمہ معلقات میں ملاحظہ فرمایئے۔

ہوا ہے۔اور جس میں چوپایوں وغیرہ نے پہنچ کر اس کی ہوا کو گندہ اور ملوث نہیں کیا ہے جس میں یکمیاں ایک طرف چینی وسکون سے خوشی کے نغمے اس سرمست شرابی کی طرح الاپتی رہتی ہے جو مستی و ترنگ میں گنگنا پڑتا ہے۔

وكأن فارة تاجر بقسيمة   سبقت عوارضها إليك من الفم

أو روضة أنفا تضمن نبتها   غيث قليل الدمن ليس بمعلم

اس کے بعد محبوبہ کے کوچ کرنے، اس کی ناقہ اور اس کی چال ڈھال اور قافلہ اور اس کی کیفیت کا مفصل ذکر کرتا ہے۔ پھر اپنی محبوبہ کو اپنے صفات گنا کر اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ میرا رنگ کالا ہے، میری ماں حبشی لونڈی ہے تو کیا ہوا۔ میرے اوصاف اور میرے کارنامے کسی نجیب الطرفین شریف نادے سے تو کم نہیں۔

إن تغدفي دوني القناع فإنني   طب بأخذ الفارس المستلئم

أثني علي بما علمت فإنني   سمح مخالطتي إذا لم أظلم

فإذا ظلمت فإن ظلمي باسل   مر مذاقته كطعم العلقم

یعنی تو مجھ سے پردہ کیوں کرتی ہے۔ میں تو اتنا نامور بہادر ہوں کہ موٹی زرہیں پہنے ہوئے بڑے بڑے بہادروں اور شہسواروں کو زیر کر دیتا ہوں۔ ایسے آدمی کی محبت کا جواب دینے میں تجھے کیا شرم محسوس ہوتی ہے۔ تجھے تو چاہئے کہ میرے ان اوصاف کی وجہ سے جنھیں تو جانتی ہے میری تعریف کرے اور مجھ سے قریب ہو جائے کیونکہ میں ایسا آدمی ہوں کہ اگر مجھ پر کوئی ظلم کرتا ہے تو میں اس ظلم کا ایسا بدلہ لیتا ہوں کہ اس کا مزہ ظالم کو اتنا کڑوا لگتا ہے کہ جیسے علقم کا مزہ ہوتا ہے۔ پھر اس سنگ دلی اور سخت خوئی کے ساتھ اس میں نرم دلی بھی ہے۔ چنانچہ معرکہ کا منظر میں تیروں کی بارش کی وجہ سے اس کے گھوڑے کو جو تکلیف پہنچ رہی ہے، اس کا احساس کر کے گھوڑے کی دل کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی زبان ہوتی تو اس پر جو بیت رہا ہے مجھ سے کھول کر بیان کرتا۔ لیکن وہ جانور ہے، اور صرف ہنہنا کر اور تیروں کی بارش سے منہ پھیر کر اور اپنے آنسو بہا کر اپنی تکلیف کا اظہار مجھ سے کرتا ہے۔

فازور من وقع القنا بلبانه   وشكا إلي بعبرة وتحمحم

لو كان يدري ما المحاورة اشتكى   ولكان لو علم الكلام مكلمي

پھر کہتا ہے کہ اگر تم کو معلوم نہیں ہے تو میری بہادری اور شجاعت کے کارناموں کو گھوڑوں

سے پوچھ لو۔ اور اس شخص سے پوچھ لو جس نے مجھے معرکۂ کارزار میں بے دریغ لڑتے دیکھا ہے اور جب مالِ غنیمت لوٹنے کا وقت آتا ہے تو میں بہت پاکباز اور پاکدامن بن جاتا ہوں۔

هلا سألت الخيل يا ابنة مالك   إن كنت جاهلة بما لم تعلمي

يخبرك من شهد الوقيعة أنني   أغشى الوغى وأعف عند المغنم

اپنی جود و سخا اور حریف سے نبرد آزمائی کا ذکر کرنے کے بعد اپنے جنگ کرنے کا اور بہادری کا نقشہ اس شاندار طریقہ سے کھینچتا ہے :۔

لما رأيت القوم أقبل جمعهم   يتذامرون كررت غير مذمم

يدعون عنتر والرماح كأنها   أشطان بئر في لبان الأدهم

ما زلت أرميهم بثغرة نحره   ولبانه حتى تسربل بالدم

فازور من وقع القنا بلبانه   فشكا إلي بعبرة وتحمحم[1]

لو كان يدري ما المحاورة اشتكى   ولكان لو علم الكلام مكلمي

ولقد شفى نفسي وأذهب سقمها   قيل الفوارس ويك عنتر أقدم

والخيل تقتحم الخبار عوابسا   من بين شيظمة وأجرد شيظم

ترجمہ : جب میں نے دیکھا کہ قوم کی فوج ایک دوسرے کو جنگ پر ابھارتی ہوئی آن پہنچی ہے تو میں نے بے دریغ حملہ بول دیا۔

وہ لوگ میرا نام لے کر مجھے ایسی حالت میں پکار رہے تھے جب کہ نیزے گھوڑے کے سینے پر اس شدت اور تیزی سے پڑ رہے تھے جیسے کہ کنوئیں میں تیزی سے پانی نکالنے کے رسّیاں ڈالی جا رہی ہوں۔

چنانچہ میں اس کی گردن کے بالائی حصے اور اس کے سینہ سے مستقل تیر اندازی کرتا رہا یہاں تک کہ گھوڑا خون میں نہا گیا۔

اپنے سینے پر مستقل نیزوں کے پڑنے سے وہ (گھوڑا) اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ اس نے جب منہ پھیر لیا تو میں نے اس کو ڈانٹا تو اس نے آنسو اور اپنی ہنہناہٹ سے مجھ سے اپنی تکلیف بیان کی۔

ا۔ بعض رواۃ نے اس شعر کو یوں بھی لکھا ہے :

فازور من وقع القنا بلبانه   وشكا إلي بعبرة وتحمحم

اگر وہ بول سکتا تو کھل کر اپنی تکلیف مجھ سے بیان کرتا اور اگر اسے بات کرنی آتی ہوتی تو مجھ سے زبان سے باتیں کرتا۔

مجھے اس بات سے بڑا سکون ہوا اور میرا سارا دکھ درد جاتا رہا جب میں نے شہسواروں کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ واہ عنترہ، بڑھے جاؤ۔

اور حالت یہ تھی کہ گھوڑے معرکۂ کارزار کی نرم زمین میں منہ بسورے ہوئے گھستے جا رہے تھے۔ ان میں بڑے ڈیل ڈول کے اور چھوٹے بالوں والے، دونوں طرح کے گھوڑے تھے۔

مذکورہ بالا اشعار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عنترہ کے کردار میں عربی شجاعت اور مردانگی، اور عربی اخلاق و عادات پوری طرح رچ بس گئی تھیں۔ وہ نرم دل ہے لیکن کمزور دل نہیں، وہ سخت کوش ہے لیکن تندخو نہیں، وہ صرف انسانوں ہی کا دکھ درد اور مصیبت کو نہیں سمجھتا بلکہ جانوروں کی تکلیفوں اور ان کے احساسات کو بھی خوب سمجھتا ہے۔

آگے چل کر وہ اپنی رندی و مستی کا بھی ذکر کرتا ہے لیکن اس میں عربی اعلیٰ اقدار اور اخلاق کو نہیں بھولتا۔ وہ مے خوار ہے لیکن بدکار نہیں، وہ شغل بادہ کرتا ہے لیکن اس طرح نہیں کہ عزت و آبرو، جود و سخا اور اعلیٰ اخلاق و کردار کو دخترِ رز کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ بلکہ اس انداز اور اس وضع سے کہ ایک شریف عربی نژاد بہادر نوجوان کو جو اعلیٰ کام کرنے چاہئیں انھیں بھول نہ جائے۔ کہتا ہے:۔

وإذا شربت فإنني مستهلك	مالي وعرضي وافر لم يكلم
وإذا صحوت فما أقصر عن ندى	وكما علمت شمائلي وتكرمي

آخر میں حُصَین بن ضَمضَم اور اس کے بھائی ہرم بن ضمضم کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اس کا ڈر ہے کہ میں کہیں ان دونوں کا بدتر انجام دیکھنے سے پہلے ہی نہ مر جاؤں۔ کیونکہ یہ لوگ مجھے برا بھلا کہتے ہیں اور میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ میں نے ان کے باپ کو قتل کرکے درندوں اور گدھوں کا کھانا بنا دیا تھا۔ یاد ہوگا جب ہرم بن سنان اور الحارث بن عوف نے عبس و ذبیان کے دونوں قبیلوں میں صلح کرائی تھی تو حصین بن ضمضم وہ ذبیانی تھا جو اس صلح میں شریک نہ ہوا تھا، اور اس نے پھر اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کی خاطر جنگ کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ جس کا ذکر زہیر نے بھی اپنے معلقہ میں کیا ہے۔

ڈاکٹر طہٰ حسین نے لبید بن ربیعہ اور عنترہ کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے بالکل صحیح

لکھا ہے کہ "۔۔۔۔۔۔۔لبید کے قصیدے کا لطف نوجوان طبقہ اسی وقت لے سکتا ہے، جب کہ اس کا ترجمہ اور صاف تشریح کر دی جائے اور اس میں جو بلند شاعرانہ محاکات اور منظر کشی ہے اسے ان کے سامنے سہل اور آسان زبان میں پیش کر دی جائے۔ لیکن عنترہ کا یہ قصیدہ اگر تم انھیں نوجوانوں کے سامنے پڑھو تو وہ بغیر ترجمہ و تشریح کے اس کے اکثر حصّہ کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں گے۔ کیونکہ عنترہ کا یہ قصیدہ واضح اور صاف ہے۔ اس کے الفاظ آسان، معانی و مطالب عام فہم ہیں اور باوجود (بعض جگہ) غرابتِ الفاظ و معانی کے بات بغیر پردے کے دل میں اتر جاتی ہے۔ ان سب خصوصیات کے باوجود اس شاعر نے بھی پرانے شاعروں کی ریت اختیار کی ہے۔ اور انھیں کے نقشِ قدم پر چلا ہے۔ چنانچہ اسی طرح اونٹنی اور محبوبہ کا ذکر کیا ہے جس طرح اس کے اگلوں نے کیا ہے اور بالکل اسی انداز میں جود و سخا اور شرافت پر فخر کیا ہے، جس طرح انھوں نے کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔جب میں یہ قصیدہ پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قصیدہ کیا ہے نغمہ و موسیقی کی مختلف دھنوں کو ایک ساتھ ملا کر ایک ایسا راگ ایجاد کیا گیا ہے جس میں مرکزی حیثیت صرف ایک ہی دُھن کو حاصل ہے، جو شروع قصیدہ سے لے کر آخر تک جاری و ساری رہتی ہے۔ یہ دُھن قصیدہ میں کہیں بہت واضح طریقے سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی ایسے دھیمے سُروں میں کہ صرف تم محسوس کر سکتے ہو، اور کبھی اتنی مخفی کہ قوت سامعہ کو بھی دھوکہ دے جائے۔ اور یہ دھن جو قصیدہ کا بالکل اسی طرح مرکزی خیال ہے جس طرح لبید کے قصیدہ میں ملتا ہے۔ دل کی وہ بات ہے جو شاعر اپنی محبوبہ سے کرتا ہے اور اس کا وہ سراپا ہے جو شاعر ابتدائے قصیدہ سے لے کر آخر قصیدہ تک اپنی جنت نگاہ بنائے رکھتا ہے۔ مگر لبید اور عنترہ کے قصیدوں میں مرکزی خیال کے اس اشتراک کے باوجود دونوں میں بڑا فرق ہے۔ چنانچہ عنترہ کے قصیدہ میں یہ مرکزی خیال اتنا شیریں اور لطیف ہے کہ دل و دماغ کی گہرائیوں سے ہوتا ہوا رُوح میں تحلیل ہو جاتا ہے کیونکہ عنترہ بڑا شیریں نفس، نرم دل مگر احساسات و عواطف میں بڑا قوی اور زکی تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک زمانہ تک ذلت کی زندگی گزارنے کے بعد اسے عزت ملی تھی۔ (کیونکہ) وہ غلامی کی زندگی گزارنے کے بعد آزاد ہوا تھا، اور اسی طرح اس نے اپنے بچپنے اور جوانی میں بھی سخت تکلیفیں اور ذلتیں برداشت کی تھیں اور اس ذلت و رسوائی نے جو اس کی روح میں گھس گئی تھی۔ اس کے خیالات کو جلا اور اس کے مزاج میں وہ نرمی بخشی تھی جو اور کسی طرح ممکن نہ تھی۔ اس کے مقابلہ میں لبید کے قصیدہ میں یہ خیال نسبتاً بہت گمبھیر ہے۔ اس میں بدویانہ تند خوئی اور وحشی پوری طرح نمایاں

ہے۔چنانچہ لبید اپنی محبوبہ کا ذکر شروع قصیدہ میں کرتا ہے اور قصیدہ کے درمیان بھی اس کا تذکرہ کرتا ہے اور کہیں بھی اسے نہیں بھولتا۔لیکن وہ اس پر جاں نثار نہیں کرتا، اس پر مرتا نہیں مٹتا۔اور نہ اس کے منہ پھیر لینے سے اسے کوئی تکلیف ہوتی ہے۔بلکہ اس کے اعراض کا بدلہ اعراض سے، اس کے قطع تعلق کا بدلہ قطع تعلق سے، اور اس کے دور ہونے کا بدلہ دور ہونے سے دیتا ہے۔برخلاف اس کے عنترہ کا یہ انداز ہے کہ :۔

ولقد نزلت فلا تظنی غیرہ

منی بمنزلۃ المحب المکرم

یعنی تو میرے دل کی گہرائیوں میں اس طرح جا بسی ہے کہ ایسا عزیز اور قابلِ احترام کوئی دوسری شخصیت ہو ہی نہیں سکتی۔

اسی طرح عنترہ کے فخر و مباہات کا عالم ہے۔یہ محبوبہ کے مقابلہ میں نہیں ہے۔بلکہ اس کی خاطر ہے کہ ایسے اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ فاضلہ کا آدمی تیرا عاشق ہے[1]

ایک دوسرے قصیدہ میں قبیلہ عبس کی تعریف کرنے کے بعد اپنے کالے رنگ کے عیب کو اپنی شجاعت و بہادری کے کارناموں سے دھوکر ان پر فخر کرتا ہے :۔

للہ در بنی عبس بقد نسلوا   من الأکارم ماقد تنسل العربُ

ترجمہ : اللہ بنو عبس کا بھلا کرے ان لوگوں نے ایسی اُولوالعزم اور بڑی شخصیتیں پیدا کی ہیں جو عرب قوم نہیں پیدا کر سکتی ہے۔میں گزشتہ زمانے میں ان کے اونٹ چرایا کرتا تھا مگر جب آج ان پر مصیبت پڑتی ہے تو میں ان کی عزت بچاتا ہوں۔اگر لوگ میرے کالے رنگ کا طعنہ مجھے دیتے ہیں تو یہ کالا رنگ جنگ کے دن جب حسب نسب کا مذکور نہیں ہوتا، میرا نسب بن جاتا ہے۔اس کے بعد نعمان بن المنذر کو مخاطب کر کے اپنی بہادری پر فخر کرتا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے قصیدے میں موت سے بے خوفی کا ذکر بڑے دلنشیں انداز میں کرتا ہے۔کہتا ہے :۔

بکرت تخوفنی الحتوف کأننی   أصبحت من غرض الحتوف بمعزل

۱۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ حدیث الاربعاء ۱/۱۳۵

یعنی صبح سویرے وہ مجھے موت سے ڈرانے لگی گویا کہ میں موت کے نشانے سے بچا ہوا ہوں۔

عنترہ کی طرف جو قصیدے منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں بعض بہت ہی معیاری ہیں۔ خاص طور سے قابلِ ذکر وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے :۔

الاقاتل اللہ الطلول البوالیا　　　وقاتل ذکراک السنین الخوالیا

ولایحمل الحقد من تعلوبہ الرتب　　　ولاینال العلی من طبعہ الغضب

غرض کہ عنترہ کا قصیدہ اور اس کا کلام، اس کی زندگی، اس کے حالات ایک شریف نفس، شریف دل اور شریف خیالات وعواطف والے بدوی کا آئینہ دار ہے۔ جس میں جاہلی زمانہ کی شاعری کی تمام صفات اور خصوصیات پوری طرح عیاں ہیں اور فضول، لغو اور بیکار باتوں سے پاک وصاف ہے۔ چنانچہ عنترہ کے بعض اشعار ضربُ المثل کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

عنترہ کا قصہ

عنترہ کی شخصیت اور اس کی بہادری، جوانمردی اور جنگوں میں جو کارہائے نمایاں اس نے انجام دیئے ہیں ان کے سہارے عربی میں "قصۃ عنترہ" کے نام سے ایک پوری لوک کہانی وجود میں آگئی ہے۔ جس کے متعلق نثر جاہلی کے باب میں تفصیل سے ذکر ہوچکا ہے۔ جیسا کہ دنیا کی تمام لوک کہانیوں کا حال ہے، اس قسم کی کہانیوں کے ایجاد کرنے والے کے نام کا پتہ نہیں چلتا، یہی حال عنترہ کے قصہ کا بھی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ عنترہ کی کہانی زمانۂ جاہلیت سے شروع ہوکر اسلامی زمانے میں پوری ہوئی ہے۔ اور ہر دور میں اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہا۔ اسلامی عہد میں عنترہ کے اشعار کو فوج میں جوش پیدا کرنے اور ہمت وبہادری کی صفات کو اجاگر کرنے کے لئے سب سے پہلے جمع کیا گیا، پھر ان کو ادبی حیثیت دی گئی۔ اسی طرح اس کی جنگوں اور بہادری کے قصوں کو مشہور عالم اور ناقد اصمعی کی روایت سے جمع کیا گیا۔ اس کے بعد اس میں حشو وزیادہ ہوتا رہا یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں مصر میں ان سب قصوں کو یکجا کرکے مدوّن کیا گیا، یہ زمانہ ہے خلیفہ العزیز باللہ الفاطمی کا۔ کہتے ہیں کہ اس کے محل میں کوئی نازیبا بات ہوگئی جس کا چرچا گلیوں اور بازاروں میں ہونے لگا چنانچہ خلیفہ نے اپنے ایک حاشیہ نشین اور قصہ گو الشیخ یوسف بن اسمٰعیل سے کہا کہ تم ایسی ترکیب کرو کہ لوگ اس بات کو بھول کر کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہوجائیں۔ شیخ یوسف علم وادب، نقل وروایت اور اخبارِ عرب میں اپنے زمانے میں یکتائے روزگار عالم سمجھے

جاتے تھے۔ انھوں نے مختلف روایتیں ابو عبیدہ، ابن ہشام اور اصمعی وغیرہ جیسے نقادوں اور علماء سے سیکھ رکھی تھیں، چنانچہ انھوں نے عنترہ کا قصہ لکھنا شروع کیا اور جستہ جستہ لوگوں میں اسے تقسیم کرنے لگے۔ اور اس طرح سلسلہ در سلسلہ کر کے انھوں نے اس قصہ کو مکمل کیا۔

مگر ثقہ رواۃ اور نقادوں کا اتفاق ہے کہ عنترہ کا یہ قصہ محض خیالی، جھوٹا اور من گھڑت ہے، نہ اس کی کوئی تاریخی حقیقت ہے اور نہ کوئی اس کا ثبوت۔ قصۂ عنترہ چھپ کر عام ہو چکا ہے۔ اسی طرح ثقہ علماء اور نقاد، عنترہ کے بہت سے قصیدوں کو بھی جعلی اور اسلامی دور کی پیداوار سمجھتے ہیں۔

حوالہ جات :

۱۔ الاغانی — لابی الفرج الاصفہانی، ج ۷

۲۔ کتاب الشعر والشعراء — لابن قتیبہ

۳۔ جمہرۃ اشعار العرب — لابی زید القرشی۔

۴۔ طبقات فحول الشعراء — لابن سلّام الجمحی

اس نے عنترہ کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے :۔

یا دار عبلۃ بالجواء تکلمی   وعمی صباحا دار عبلۃ واسلمی

اور لکھا ہے کہ اس کے علاوہ اس کے بہت سے اشعار منقول ہیں۔ طبع مصر ص ۱۲۸

۵۔ شعراء النصرانیہ — شیخو الیسوعی

۶۔ العقد الفرید — لابن عبد ربہ ج ۱

۷۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ — لجرجی زیدان

اور شروح معلقات۔

۵۔ اَعشیٰ قَیس

(م ۶۲۹ء، مطابق ۸ھ ہجری)

اس کا پورا نام مَیمُون بن قیس بن جُندُل بن شراحیل بن عوف بن سعد بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلب ہے۔ کنیت ابوبصیر تھی[1] اور لقب اعشیٰ تھا کیونکہ اس کو رتوندھی آتی تھی[2]۔ اسے "عربوں کی جھانجھ" بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ پہلا عربی شاعر ہے جس کا کلام گا کر پڑھا گیا۔ ادب کی کتابوں میں اسے اعشیٰ قیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، تاکہ دوسرے ہمنام شعرا سے اسے ممتاز رکھا جا سکے۔ اس کا سلسلۂ نسب بکر بن وائل تک پہنچتا ہے۔

اعشیٰ قیس زمانۂ جاہلیت کے آخری دور کا شاعر ہے اور طبقۂ جاہلی کے مشہور شعراء میں چوتھے نمبر کا شاعر سمجھا جاتا ہے۔ امرؤالقیس، نابغہ الذبیانی اور زہیر بن ابی سلمیٰ کے بعد اسی کو فنِ شاعری میں استاذِ کامل اور قوتِ بیان میں عدیم المثال سمجھا جاتا ہے۔ سارے جاہلی شعرا میں اعشیٰ کو مدح سرائی، شراب اور شراب کی تعریف اور اشعار میں گہرائی اور تنوع پیدا کرنے میں امتیاز حاصل ہے۔ اسی طرح شاید یہ پہلا شاعر ہے جس کے لمبے قصیدے جو اکثر مدحیہ ہوتے تھے، نوک پلک سے پوری طرح درست ہوتے تھے۔

اعشیٰ یمامہ کے ایک گاؤں مَنفُوحَہ کا رہنے والا تھا۔ لیکن اس نے پورے جزیرۃ عرب کا سفر کیا تھا اور وہاں کے مختلف بادشاہوں اور امراء کی شان میں مدحیہ قصیدے کہے تھے۔ اس نے خود اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ کہتا ہے :۔

قد جبتُ ما بین بانقیا إلی عدن   وطال فی العجم تردادی وتسیاری

۱۔ طبقات فحول الشعراء : ابن سلام الجمی۔

۲۔ عشی یعشی عشا، عام معنی : رات یا دن میں دکھائی نہ دینا۔ اکثر استعمال رتوندھی۔

میں بانقیا اور عدن کے درمیان خوب گھوما پھرا ہوں اور ایک زمانۂ دراز تک عجمیوں کے درمیان میرا آنا جانا رہا ہے۔

اعشیٰ اپنی ابتدائی زندگی میں اپنے خالو المُسَیّب بن عَلَس کے اشعار کا راوی تھا۔ المسیّب کم گو لیکن پُرگو شاعر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ چنانچہ اعشیٰ اس کے شعروں کی خوب تعریف و توصیف کر کے لوگوں میں سناتا تھا۔ اور خود بھی اس کے انداز میں مشق سخن کرتا تھا۔ جب کلام میں پختگی آ گئی اور لوگوں میں اس کی شہرت پھیل گئی تو اس نے بادشاہوں کے درباروں اور امیروں کے کاشانوں کا رُخ کیا اور اس کے لئے دور دراز کے سفر کئے۔ اور ان بادشاہوں اور امیروں کی شان میں مدحیہ قصیدے کہے اور ان سے انعام و اکرام حاصل کیا۔ غالباً اعشیٰ صرف جاہلی شعرا میں ہی نہیں بلکہ شاید پورے عربی شعرا میں پہلا شاعر ہے جس نے اپنے ممدوحوں سے منہ پھوڑ کر صلہ مانگا ہے۔ اس لئے عربوں کی نظر میں اس کی وقعت بہت کم ہو گئی تھی۔

یوں تو اعشیٰ نے ہر چھوٹے بڑے کی تعریف کی ہے، مگر خاص طور سے اس نے شاہانِ نجران بنو عبد المدان اور ان کے پادریوں اور حیرہ کے بادشاہوں میں سے الاسود کی شان میں جو شاہ النعمان بن المنذر کا بھائی تھا، بڑے شاندار مدحیہ قصیدے کہے ہیں۔ شاہانِ نجران کے یہاں مدتوں وہ ٹھہرتا، خوب شرابیں پیتا اور نغمہ و سرود کی محفلوں میں شریک ہوتا۔ مدتوں تک ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اس کے خیالات بھی متاثر ہو گئے۔ اس کے ثبوت میں اس کا ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔ جس میں اس نے کہا ہے:-

استأثر الله بالوفاء وبالـ　　　　عدل وولی الملامة الرجلا

جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہودیوں میں اعشیٰ کے تعلقات شریح بن السموئل سے بھی تھے جو تیماء کا والی تھا۔ اعشیٰ اس سے اس کے قلعہ "الابلق" تاجی میں ملا تھا۔

عرب حکمرانوں سے خوب انعام و اکرام پانے کے بعد بھی جب اس کی نیت نہ بھری تو اس نے کسریٰ انوشیرواں کے دربار کا رخ کیا اور اس کی شان میں ایک لمبا قصیدہ کہہ کر اسے سنایا۔ ایرانی حکمرانوں کے لئے ایک عرب نژاد کی یہ تعریف منہ مانگی مراد تھی۔ چنانچہ کسریٰ نے دل کھول

کر اعشیٰ کو انعام واکرام دیا۔ اگرچہ ترجمہ کی خرابی کی وجہ سے کسریٰ کو اعشیٰ کا یہ قصیدہ کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔

اعشیٰ نے بڑی لمبی عمر پائی۔ آخر عمر میں جب اسلام کا ظہور ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل عرب میں کامیابی حاصل ہونے لگی تو اعشیٰ نے آپ کی شان میں ایک بہت ہی خوبصورت اور پرشکوہ مدحیہ قصیدہ کہا اور اس نیت سے حجاز کی طرف روانہ ہوا کہ قصیدہ خدمت نبوی میں پیش کر کے مسلمان ہوجائے۔ یہ واقعہ فتح مکہ سے پہلے کا ہے۔ ادھر قریش کے لوگوں کو اس کی بھنک پڑگئی اور انھوں نے سوچا کہ اگر اعشیٰ نے اپنا مدحیہ قصیدہ پیش کر دیا تو سارے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دھوم مچ جائے گی۔ چاہے وہ خود مسلمان ہو یا نہ ہو۔ اس لئے اس سے راستے میں یہ لوگ ملے اور ابوسفیان نے اس سے کہا "ہمارے اور اس کے (محمدؐ) درمیان اس وقت لڑائی بند ہے۔ اس لئے تم ایک سو اونٹ لے لو اور اس سال اپنے وطن واپس چلے جاؤ اور انتظار کرو کہ ہمارے اور اس کے درمیان کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہم پر غالب آجاتا ہے تو تم بیشک اس کے پاس آجانا" چنانچہ اعشیٰ نے مکہ والوں سے یہ سو اونٹ لے لئے اور اپنے وطن یمامہ کو واپس لوٹ آیا۔ جب یمامہ سے تھوڑی دور رہ گیا تو اتفاقاً اونٹنی سے گر گیا جس کی وجہ سے اس کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ وہیں مر گیا۔ اور اپنے گاؤں منفوحہ میں دفن کیا گیا۔ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا، کہ وہ نجات پاتے پاتے رہ گیا!

امتیازی خصوصیات

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ اعشیٰ[1] کو جاہلی دور کے تینوں ممتاز شعرا کے بعد چوتھے نمبر کا شاعر سمجھا جاتا ہے اور یہ بہت بڑا اعزاز ہے جو کسی شاعر کو مل سکتا ہے۔ اعشیٰ کو اپنے پیش رو شاعروں میں کلام کی گہرائی اور بڑی تعداد میں لمبے اور اچھے قصیدے کہنے اور مروجہ اصناف شعر

۱۔ طبقات فحول الشعرا : ابن سلام الجمحی، ص ۴۳۔

۲۔ پورا سلسلۂ نسب یہ ہے :

میمون بن قیس بن جندل بن شراحیل بن عوف بن سعد بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ بن بن عکابہ بن صعب بن علی بن بکر بن وائل بن قاسط۔

میں سے اکثر پر طبع آزمائی کرنے اور ہر صنف میں نت نئی باتیں پیدا کرنے میں امتیاز حاصل تھا اور شراب
کی تعریف میں تو اس کا مقابلہ مشکل سے کوئی کر سکتا ہے۔ اس لئے یہ کہاوت مشہور ہوگئی تھی کہ "أشعر
الشعراء" أعشیٰ إذا طرب" یعنی جب اعشیٰ شراب پی کر مست ہو جائے، تو سب سے بڑا شاعر
ہوتا ہے۔ اعشیٰ کے کلام میں ایسی مٹھاس اور انداز بیان میں ایسا بانکپن ہے جو عام طور سے دور
جاہلی کے شعرا میں نہیں ملتا۔ اس کے اشعار میں اتنی موسیقیت اور غنائیت تھی کہ محفلوں میں اس
کے اشعار گائے جاتے تھے۔ اسی لئے اسے "صَنَّاجَةُ العَرب" یعنی عرب کی جھانجھ کہتے ہیں[1]
اعشیٰ کے کلام کے اثر کا یہ عالم تھا کہ قبائل عرب میں جس کو چاہتا، اپنی مدح کے ذریعہ اونچا اٹھا
دیتا اور جس کو چاہتا نیچا گرا دیتا۔ اس کے مدحیہ کلام کی بدولت بڑے بڑے شریف اور نامی
لوگ ذلیل اور خوار ہو گئے اور کئی نیچے درجے کے لوگ اونچے اور معزز ہو گئے۔ پہلے گزر چکا ہے
ہے کہ اعشیٰ کی تعریف کی بدولت مُحلّق نامی ایک معمولی شخص چشم زدن میں سادات عرب میں شمار
ہونے لگا تھا اور یہی نہیں بلکہ اس کی آٹھ بن بیاہی لڑکیاں جن کی شادی محلق کی غربت اور گمنامی
کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھی، صرف ایک سال کے اندر محض اس مدحیہ قصیدہ کی وجہ سے جسے اس
نے عکاظ کے میلے میں پڑھا تھا بڑے بڑے امراء کے محلوں کی زینت بن گئیں[2]

اعشیٰ اپنے کلام میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے فارسی کے بعض الفاظ اور ایرانی ساز و
سامان کا ذکر بھی کرتا تھا چنانچہ پھولوں میں 'گل' 'یاسمین' اور بعض سازوں کا ذکر اسکے کلام میں
ملتا ہے[3] اعشیٰ اس قسم کے شعر محض تفنن طبع کے طور پر ہی نہیں کرتا تھا، بلکہ اس سے یہ بھی دکھانا
چاہتا تھا کہ اس نے ملکوں کا سفر کیا ہے ان کے بادشاہوں اور ممتاز لوگوں سے گھلا ملا ہے اور
ان کے ساتھ اٹھا بیٹھا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ ان چیزوں کو جانتا اور سمجھتا ہے۔ اعشیٰ کی
جلالت قدر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عکاظ کے میلے میں اس کے لئے الگ چمڑے کا

۱۔ عمدہ کی روایت ہے کہ اسے 'صناجۃ العرب' اس لئے کہا گیا کہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے "الصنج" یعنی
جھانجھ کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔ ۲۔ قصہ کی تفصیل ص پر ملاحظہ فرمائیے۔ محلق نام پڑنے کی وجہ
"ایک گول دائرہ" جو گھوڑے کے کاٹنے سے بن گیا تھا۔

۳۔ جیسے :۔ شاهدنا الجلّ والياسمين والمسمعات بأقصابها
وبربطنا دائم معمل فأي الثلاثة أزرى بها

ایک خیمہ لگایا جاتا تھا جس میں شعرا آکر اپنا کلام اسے سناتے اور کلام کے بارے میں اس کی رائے معلوم کرتے، اور جس کے حق میں جو فیصلہ کر دیتا سب لوگ اسے مان لیتے۔

اعشیٰ کو بھی اکثر نقادوں نے اصحاب المعلقات میں شمار کیا ہے اور اس کے اس قصیدہ کو جس کے ذریعہ اس نے نعمان بن المنذر کے بھائی الاسود کی تعریف کی ہے، اس کا معلقہ بتاتے ہیں۔ اس معلقہ میں زوزنی کی روایت کے مطابق ۹۸ شعر ہیں۔ اس کا مطلع ہے:

ما بکاء الکبیر بالاطلال — وسؤالی وما ترد سوالی[1]

یعنی میرے ایسے عمر دراز آدمی کے لئے محبوبہ کی نگری کے نشانات کو دیکھ کر رونے سے اور اس سے سوالات کرنے سے کیا فائدہ ہے جب کہ میرے سوالات کے جوابات نہ دیئے جاتے ہوں۔

دستور کے مطابق اس نے اپنا یہ قصیدہ تشبیب سے شروع کیا ہے اور یہ سلسلہ ۲۶ ویں شعر تک چلا ہے جس میں غزل کے بعد سفر اور اونٹنی کا وصف ہے۔ ۲۷ ویں شعر سے گریز کیا ہے، اور اپنے ممدوح الاسود الکندی کی تعریف شروع کی ہے۔ اور اپنی اونٹنی کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:-

لا تشکی الیّ و انتجعی الاسود — د أهل الندی و أهل الفعال

یعنی مجھ سے اپنی تکلیفوں اور پریشانیوں کی شکایت نہ کرو۔ بلکہ اسود کے پاس جاؤ جو بڑا سخی داتا ہے اور ہمیشہ اچھے کام کرتا ہے۔

اس کے بعد اس کے صفات گناتا ہے۔ اس کے خاندان اور حسب نسب کی تعریف کرتا ہے اور اس کے کارناموں کا ذکر کرتا ہے۔ اور پھر غزل کی طرف آتا ہے۔ اس کے بعد شکار اور اس کا منظر کھینچتا ہے۔ اور آخر میں اسی پر قصیدہ کو ختم کر دیتا ہے۔

قصیدہ لفظی و معنوی اعتبار سے خاصا مشکل اور دقیق ہے اور اس میں جاہلی رنگ پورا جھلکتا نظر آتا ہے۔ اسی لئے عام خیال یہ ہے کہ یہ قصیدہ اعشیٰ کا فخر و رہے۔ علماء کا اس امر میں اتفاق ہے کہ اعشیٰ کا سب سے اچھا قصیدہ وہ ہے جسے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کہا تھا اور جسے اہلِ قریش کی سازش کی وجہ سے آپ کو سنا نہ سکا۔ اس کا مطلع ہے:-

الم تغتمض عیناک لیلة أرمدا

وبت کما بات السلیم مسهدا

---

[1] بعض رواۃ نے 'فی الاطلال' لکھا ہے۔ جمہرہ ۵۶۔

یعنی کیا آشوبِ چشم کی رات کو تمہاری آنکھوں نے پلک بھی نہیں جھپکائی۔ اور تم نے سانپ کے ڈسے آدمی کی طرح جاگ کر اپنی رات بتائی؟

آگے چل کر اپنی اونٹنی کے متعلق کہتا ہے کہ میں نے یہ قسم کھائی ہے کہ اس کے تھکنے اور پریشان ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کروں گا جب تک کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مل نہ لے گی۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ گھبراؤ نہیں، تم جب آپؐ کے دروازے پر بیٹھو گی، تو تم اپنی ساری تھکن اور سفر کی تکلیف بھول جاؤ گی۔ کیونکہ آپؐ بڑی فیاضی اور دریا دلی سے تمہارا خیر مقدم فرمائیں گے۔ اس کے بعد آپؐ کی تعریف شروع کرتا ہے کہ آپ ایسے نبی ہیں کہ وہ سب کچھ آپ پر منکشف اور عیاں رہتا ہے جو دوسرے نہیں دیکھ سکتے۔ اور آپ کی شہرت جزیرۂ عرب کے کونے کونے میں پھیل گئی ہے۔ آپؐ مستقل بھلائیاں کرتے رہتے ہیں اور بے انتہا داد و دہش فرماتے ہیں اور آپ کی آج کی جُود و سخا کل کی جُود و سخا کے لئے مانع نہیں ہوتی۔

فآلیت لا أرثی لہا من کلالۃ	ولا من حفی حتی تلاقی محمدًا
متی ما تناخی عند باب بن ہاشم	تراحی وتلقی من فواضلہ ندی
نبی یری ما لا یرون وذکرہ	أغار لعمری فی البلاد وأنجدا
لہ صدقات ما تغب ونائل	ولیس عطاء الیوم یمنعہ غدا

ایک دفعہ یونس بن حبیب نحوی سے پوچھا گیا کہ آپ کے خیال میں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟ تو اس نے کہا کہ اس سلسلہ میں کسی خاص شاعر کا نام تو نہیں لے سکتا، البتہ یہ کہتا ہوں کہ
"امرؤ القیس إذا رکب، والنابغۃ إذا رھب، وزھیر إذا رغب، والأعشیٰ إذا طرب"
یعنی سب سے بڑا شاعر امرؤالقیس ہے جب وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو، اور نابغہ اس وقت جب ڈرا ہوا ہو، اور زہیر جب اسے انعام و اکرام کا لالچ ہو، اور اعشیٰ اس وقت جب وہ مست ہو جائے۔ مستی و ترنگ میں بہترین شعر کہنے کی مثال وہ مدحیہ قصیدہ ہے جس میں اس نے محلق نامی بدو کی تعریف کی ہے۔ اس کا یہ قصیدہ اپنے طرز بیان اور جدت میں مثالی سمجھا جاتا ہے۔

بعض نقادوں نے اس کے اس مدحیہ قصیدہ کو معلقات میں شامل کیا ہے جس کا مطلع ہے

ودّع ھُرَیْرَۃَ إن الرکب مرتحل ۔۔۔ وھل تطیق وداعًا أیّھا الرجل

ھریرہ کو اب رخصت کر دو کہ قافلہ اب کوچ کرنے والا ہے۔ لیکن اے آدمی کیا تم رخصت کرنے پر قادر بھی ہو، یعنی یہ مشکل کام ہے۔

آگے چل کر اپنی قوم کی شجاعت وبہادری پر فخر کرتا ہے اور اپنے حریف یزید بن شیبان کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ تم ہماری بے عزتی کرنے اور گڑے مردے کھودنے سے باز نہیں آؤ گے۔ آخر اس سے فائدہ کیا ہے؟۔ تم لاکھ کوشش کرو، ہمیں رسوا اور ذلیل نہیں کرسکتے ہو۔ تمہاری اس کوشش کی مثال ایسی ہے کہ پہاڑی بکرا اگر کسی چٹان کو اپنی سینگ سے توڑنا چاہے تو چٹان پر کوئی اثر نہ پڑے گا، البتہ وہ خود اپنی سینگ توڑے گا۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ ہم تم سے نبرد آزمائی نہیں کرسکتے، تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ہم تم جیسے لوگوں کو بے دریغ تہ تیغ کردیتے ہیں اور اگر دل میں کوئی حسرت ہے تو پھر آجاؤ میدان جنگ میں، تم کو ہماری شجاعت اور بہادری کا اندازہ ہو جائے گا۔

أبلغ يزيد بن شيبان مالكة   أبا ثبيت أما تنفك تأتكل

ألست منتهيا عن نحت أثلتنا   ولست ضائرها ما أطت الابل

مذکورہ بالا قصیدہ کے بعض اشعار اور خاص طور سے مندرجہ ذیل اشعار محبوبہ کے سراپا کا بہترین نمونہ ہیں:۔

غراء فرعاء مصقول عوارضها   تمشي الهوينا كما يمشي الوجي الوحل

كأن مشيتها من بيت جارتها   مر السحابة لا ريث ولا عجل

تسمع للحلي وسواسا إذا انصرفت   كما استعان بريح عشرق زجل

إذا تقوم يضوع المسك أصورة   والزنبق الورد من أردانها شمل

یعنی میری محبوبہ سرو قد زہرہ جبیں ہے اور اس کے دانت سفید اور چمکیلے ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس کے پاؤں میں کوئی تکلیف ہے جس کی وجہ سے وہ ہولے ہولے قدم دھرتی ہے، یا اس آدمی کی طرح پگ دھرتی ہے جو کیچڑ میں چل رہا ہو، اور قدم سنبھال سنبھال کر رکھ رہا ہو۔ اور جب وہ اپنی پڑوسن کے گھر سے واپس جاتی ہے تو اس کی چال ایسی لگتی ہے جیسے کہ بدلی ہو، نہ بہت آہستہ اور نہ بہت تیز۔ اور چلنے میں اس کے زیورات کی کھنک اس طرح سنائی دیتی ہے جیسے کہ عشرق[1] کے پودے کی آواز ہو جسے باد نسیم ہلا جاتی ہے۔ اور جب وہ کھڑی ہوتی ہے تو ساری فضا اس کی خوشبو سے معطر اور معنبر ہو جاتی ہے۔

---

[1] عشرق ایک پودا ہے جس کے پھل جب ہوا سے ہلتے ہیں تو ان کی آواز بہت بھلی لگتی ہے۔

اسی طرح اعشیٰ نے شراب کے وصف میں بھی کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کے وہ اشعار مثال میں پیش کئے جاتے ہیں جن میں اس نے کہا ہے کہ صبح تڑکے جب کہ مرغِ سحر بھی بانگ نہیں دے چکے ہوتے، اور سب لوگ گہری نیند میں پڑے خرّاٹے لیتے ہوتے ہیں تو میں اٹھ کر شراب فروش کے پاس جاتا ہوں، جہاں ساقی گلفام اپنے دستِ حنائی سے بادہ لالہ گوں کو پیالوں میں بھرے ہمارے اوپر نچھاور کرتا ہے۔ جس کے جام ہم اس وقت تک لنڈھاتے رہتے ہیں جب تک جسم پرسکون اور اعضا ڈھیلے نہ پڑ جائیں۔

نقتنا دلما يصح ديكـنـا — إلى حونة عندحدادهـا

ایک دوسری جگہ شراب کا اتنا حسین وصف بیان کرتا ہے کہ جس کی مثال جاہلی شعراء میں کم ملتی ہے۔ کہتا ہے :-

وأدكن عاتق جحلٍ ربحُلٍ[1] — صبحت براحه شُرباً كراما

من اللائي حملن على المطـايا — كريح المسك تستل الزكاما

اور ایک ایسے کالے رنگ کے پرانے مٹکے کی شراب سے جو ایک بڑے مشکیزہ کی طرح تھا میں نے صبح سویرے شریف یاران میکدہ کی تواضع کی۔ یہ مٹکہ دور دراز کے ملکوں سے سواریوں پر لایا گیا ہے اور جن کے شراب کی خوشبو مشک جیسی تیز ہوتی ہے کہ جب وہ ناک میں پہنچتی ہے تو زکام کو ختم کر دیتی ہے۔

آغانی نے روایت کی ہے کہ شعبی کہا کرتے تھے کہ اعشیٰ کی غزل کا بہترین شعر یہ ہے :-

غراء فرعاء مصقول عوارضهـا — تمشي الهوينا كما يمشي الوجي الوحل

ور بہادری اور شجاعت میں اس کے اس شعر کا جواب نہیں۔

قالوا الطراد فقلنا تلك عادتنا — أو تنزلون فانا معشر نزل

دبے پاؤں نظریں بچا کر رات کی تاریکی میں محبوبہ سے ملنے کا جو نقشہ اس شعر میں ہے، مشکل سے کسی اور شاعر کے کلام میں اتنے حسین انداز سے ملے گا۔ کہتا ہے :-

فظللت أرعاها وظل يحوطهـا — حتى دنوت إذا الظلام دنا لها

فرميت غفلة عينه عن شاته — فأصبت حبة قلبها وطحا لـهـا[2]

(۱) بعض نسخوں میں "بجُحل" کا لفظ بھی آیا ہے۔ —

[2] اعشیٰ کے کلام کے متعلق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی رائے، ان کی کتاب "فی الادب الجاھلی" صفحہ ۲۹۱ اور اس کے بعد، اور طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی میں ملاحظہ فرمائیے۔

یعنی ایک طرف میں محبوبہ پر نظریں جمائے رہا تو دوسری طرف اس کا شوہر ہر طرح سے چوکس رہا۔ لیکن تاریکی پھیل گئی تو میں اس کے قریب پہنچ گیا، اور اس کی نظریں بچا کر محبوبہ پہ ایسا وار کیا کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں میری محبت کے تیر اتر گئے۔

یہ شعر اس نے ایک عورت کے بارے میں کہے تھے، جو شادی شدہ تھی۔ لیکن اعشیٰ کو بھی اس سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس کے شوہر کی یہ کوشش رہتی تھی کہ اعشیٰ اس سے نہ ملنے پائے۔ اور اعشیٰ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ کسی طرح اس کی نظریں بچا کر گھڑی دو گھڑی اس سے ہمکلام ہو لے۔

اعشیٰ کی انھیں امتیازی خصوصیات اور جدت طرازیوں کی وجہ سے ابو عمر بن العلا، لبید، اور اس کا موازنہ کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ "لبید رجل صالح و اعشیٰ رجل شاعر" یعنی لبید ایک نیک آدمی ہے مگر اعشیٰ شاعر ہے۔ کہتے ہیں کہ عبدالملک نے اپنے لڑکوں کے اتالیق سے کہا کہ "انھیں اعشیٰ کے اشعار کی روایت کی تربیت دینا، کیونکہ خدا اسے غارت کرے۔" ما کان أعذب بحرہ و أصلب صخرہ۔ یعنی وہ تو بہت ہی خوش گفتار اور عدیم المثال ناقابلِ تسخیر شاعر تھا۔

کہتے ہیں کہ اخطل ایک دفعہ کوفہ آیا، چنانچہ شعبی اس کے پاس آئے۔ تو اس نے پوچھا کہ کہیے کس غرض سے آنا ہوا۔ انھوں نے جب یہ کہا کہ آپ کے اشعار سننے کی غرض سے، تو اس نے اپنا وہ قصیدہ سنایا، جس کا مطلع ہے:۔—— صرمت أمامة حبلها و رعوم —— یعنی میری محبوبہ امامہ نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے اور جب اس شعر پر پہنچا کہ۔

وإذا تعاورت الأكف ختامها   نفحت، فنال رياحها المزكوم

یعنی وہ شراب اتنی اچھی اور تیز ہے کہ جب اس کے منکہ سے ڈھکن ہٹایا جاتا ہے، تو اس میں سے ایسی تیز خوشبو نکلتی ہے کہ زکام والے آدمی کے مشام کو بھی معطر کر جاتی ہے۔
(جسے زکام ہو اسے خوشبو اور بدبو کا احساس نہیں ہوتا)

تو اخطل بولا کہ میں نے اپنے اس شعر سے سارے شعرا کو چت کر دیا ہے۔ یہ سن کر شعبی بولے کہ نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ان معنوں میں تو اعشیٰ آپ سے بھی بازی لے گیا ہے۔ یہ سن کر اخطل چونکا اور کہا کہ وہ کیسے؟ اس پر شعبی نے کہا کہ اپنے اس شعر سے۔

ومن خمر حانة قد أنى لختامه   حول تسل غمامة المزكوم

یعنی عانہ کی وہ ایسی تیز شراب ہے، جس پر ایک سال بیت چکا ہے اور جس کی صرف خوشبو اتنی تیز ہے کہ زکام والے آدمی کے بھی چودہ طبق روشن کر دیتی ہے۔

یہ سُن کر اخطل نے شراب کا پیالہ زمین پر پٹک دیا اور بولا کہ حضرت مسیح کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ مجھ سے بڑا شاعر ہے اور واقعی اس نے سارے شعرا کو چت کر دیا ہے، سوائے میرے۔

عَلقَمہ بن عُلَاثہ العَامِری اور اَعشیٰ

اعشیٰ نے ذُو فَائش الحِمیَری کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا تھا، جس کا مطلع ہے:

الشعر قلدته سلامة ذا   فائش والشئ حيث ماجعلا

یعنی میں نے سلامہ ذو فائش کو شعر کا ہار پہنایا ہے اور کسی چیز کی اصلی قیمت اور قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ مناسب جگہ پر ہو۔

جب اعشیٰ نے یہ قصیدہ پڑھا تو ذو فائش بہت خوش ہوا اور اعشیٰ کو سو اونٹ اور خلعت دی۔ اور ایک تھیلے میں عنبر بھر کر دیا۔ اور کہا کہ خبردار اس سے غافل نہ رہنا۔ اس کے یہاں سے رخصت ہو کر وہ جب حیرہ آیا تو اس نے تین سو اونٹوں کے بدلے میں اسے بیچ دیا۔ جب اسے اس کا خطرہ ہوا کہ یہ سارا مال کہیں لٹ نہ جائے، تو علقمہ بن علاثہ العامری کے یہاں پناہ لینے کے لئے آیا۔ علقمہ نے کہا میں تمھیں کالے اور سُرخ سب سے پناہ دیتا ہوں۔ یعنی جن وانس سب سے تمھاری حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔ اس پر اعشیٰ نے کہا کہ "اور موت سے بھی" تو علقمہ نے کہا کہ نہیں۔ یہ سُن کر اعشیٰ عامر بن الطفیل العامری کے پاس آیا، اور اس سے بھی یہی بات کہی۔ اس نے جب موت سے بھی حفاظت کا ذمہ لیا تو اعشیٰ نے کہا کہ موت سے تم کیسے مجھے بچا سکتے ہو۔ تو اس نے کہا کہ اگر تم میری پناہ میں رہتے ہوئے مرگئے تو میں تمھارے ورثا کو تمھارا خون بہا ادا کر دوں گا۔ جب علقمہ کو اس بات کا علم ہوا تو بولا کہ مجھے کیا خبر تھی کہ "موت سے بچانے سے" اس کی یہ مراد تھی۔ ورنہ تو معاملہ مشکل نہ تھا۔ یہ واقعہ اس زمانے میں پیش آیا ہے جب علقمہ اور عامر کے درمیان سخت منافرت چل رہی تھی۔ چنانچہ اعشیٰ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر یہاں سے جب روانہ ہوا تو عامر کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ کہا جس میں اس کے بے لاگ فیصلہ اور رشوت نہ لینے اور عدل وانصاف کی یوں تعریف کی:-

حکمتموہ فقضی بینکم   أبلج مثل القمر الزاھر
لایأخذ الرشوۃ فی حکمہ   ولا یبالی غبن الخاسر

چنانچہ علقمہ کو جب اس قصیدہ کی خبر لگی، تو اس نے اعشیٰ کا خون مباح کر دیا اور اسے پکڑنے کے لئے آدمی چھوڑ دیئے۔ اتفاق سے ایک جگہ جاتے ہوئے راہبر کی غلطی سے اعشیٰ بنی عامر کی جائے سکونت میں بھٹک کر پہنچ گیا۔ اور اسے علقمہ کے آدمیوں نے پکڑ کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ علقمہ نے جب اپنے حریف کو اپنے سامنے پا بجولاں دیکھا تو کہا کہ " الحمد الله الذی امکننی منک " خدا کا شکر ہے کہ اس نے آج تمھیں میرے حوالہ کر دیا۔ اس پر اعشیٰ نے فی البدیہہ یہ شعر کہے:۔

اعلقم قد صیرتنی الامور إلیك ما أنت لی منتقص

فهب لی نفسی فد تلك النفو س ولا زلت تنمو ولا تنتقص

یعنی اے علقمہ آج حالات نے مجھے تمھارے سامنے لا کھڑا کیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم میری بے عزتی نہ کرو گے۔ میری جان بخشی کر دو، لوگ تم پر فدا ہوں۔ اور تم دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے رہو۔

علقمہ کے ساتھیوں نے کہا کہ " اقتله وأرحنا والعرب من شق لسانه " اس کی بکواس نہ سنو، اس کو قتل کر کے ہمیں اور تمام عرب کو اس کی زبان کے فساد سے نجات دلا دو۔ مگر علقمہ نے کہا کہ نہیں۔ اب ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ دشمن پر قابو پا لینے کے بعد اسے معاف کر دینا سب سے بڑی فخر کی بات اور بھلائی ہے۔ چنانچہ اس نے اس کے ہاتھ پاؤں کھلوا دیئے اور اسے نیا جوڑا پہنایا اور ایک اونٹنی دی۔ اور بنی کلاب میں سے کچھ لوگوں کو اس کی حفاظت اور رہبری کے لئے ساتھ کر دیا، اور کہا کہ اب جہاں تمھارا جی چاہے، چلے جاؤ۔ اس فراخ دلی اور بڑائی کا اعشیٰ کے دل پر یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد وہ ہمیشہ علقمہ کی تعریف کرتا رہا۔ بعد میں علقمہ مسلمان ہو گئے اور ان لوگوں میں شامل تھے جن کی دلداری کے لئے آنحضور ؐ خاص طور سے نظرِ کرم رکھتے تھے۔ چنانچہ اعشیٰ نے عامر کی تعریف کرتے ہوئے علقمہ کی ہجو میں جو اشعار کہے تھے، آنحضرت ؐ نے لوگوں کو ان کے پڑھنے سے منع کر دیا۔

قبیلہ کلب کے ایک آدمی اور اعشیٰ کا قصہ مہاجات:

کہتے ہیں کہ اعشیٰ نے قبیلہ کلب کے ایک آدمی کی ہجو کی تھی۔ ایک رات اس کلبی نے ایک عربی قبیلہ پر حملہ کیا اور مال و متاع پر قبضہ کرنے کے ساتھ اس قبیلہ کے لوگوں کو بھی قیدی بنا لیا تھا۔ اتفاق سے اس رات اعشیٰ ان کے یہاں مہمان ٹھہرا ہوا تھا، اور وہ بھی قیدیوں میں پکڑا گیا۔ مگر کلبی اس کو پہچانتا نہ تھا چنانچہ جب وہ قیدیوں کو لے کر تیماء سے گزرتے ہوئے

شُرَیح بن السَّمَوْءَل کے گھر کے پاس ٹھہرا تو شریح اتفاق سے وہاں سے گزرا۔ اعشٰی نے اسے دیکھ لیا اور اسے آواز دے کر فی البدیہہ ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا۔

شریح لا تترکنی بعد ما علقت　　　حبالک الیوم بعد القد اظفار

یعنی اے شریح اس ذلت و رسوائی کی حالت میں جبکہ میں نے تم سے اپنا تعلق جوڑ لیا ہے تو مجھے اب چھوڑ کر نہ چلے جاؤ، بلکہ ــــــــ

کن کالسموأل إذ طاف الھمام بہ　　　فی جحفل کسواد اللیل جرار

اپنے باپ سموأل کی طرح سلوک کرو جب کہ موت رات کی تاریکی جیسی ایک لشکر جرّار لے کر آئی، تو بھی اس کے قدم ایفائے عہد سے نہیں لڑکھڑائے، بلکہ اس نے اپنی زبان پوری کی ــــــــ"

یہ اشارہ تھا سَمُوْءَل بن عَادِیَا کے ایفائے عہد کے اس قصہ کی طرف جس میں سموأل نے امرؤ القیس کی لڑکی کو مخالفوں کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس کی وجہ سے اس کا بیٹا اس کے سامنے قتل کر دیا گیا تھا۔ لیکن وہ اپنی زبان سے نہیں پھرا۔ اس واقعہ کی وجہ سے ایفائے عہد میں وہ سارے عرب میں مشہور ہو گیا تھا۔[1]

یہ سن کر شریح کلبی کے پاس آیا اور بولا کہ اس بیچارے قیدی کو مجھے دے دو۔ کلبی نے اعشٰی کو اسے دے دیا۔ شریح نے اعشٰی سے کہا کہ کچھ دنوں میرے پاس مہمان رہو تاکہ میں تمہاری خاطر مدارات کر سکوں۔ اور انعام و اکرام دے سکوں۔ اس پر اعشٰی نے کہا کہ میرے ساتھ اس وقت سب سے بڑا احسان یہ ہوگا کہ مجھے ایک اچھی اونٹنی دے دو، اور مجھے جانے دو۔ چنانچہ شریح نے اسے ایک تیز رفتار اونٹنی دی اور اس پر بیٹھ کر اعشٰی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کے یہاں سے جانے کے بعد کلبی کو پتہ چلا کہ وہ تو اعشٰی تھا۔ تو اس نے شریح کے پاس اپنا آدمی بھیج کر یہ کہلایا کہ اس قیدی کو واپس میرے پاس بھیج دو تاکہ میں اس کی خاطر مدارات کروں، اور انعام و اکرام دوں۔ اور جب شریح نے یہ کہلا بھیجا کہ وہ تو جا چکا ہے، تو کلبی نے اس کے پیچھے اپنے آدمی دوڑا دیے، لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔

اعشٰی کو اس کی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے "فحل" یعنی سب سے بڑا نر کہتے تھے۔ اور عربوں کا دستور تھا کہ شعرا میں سے "فحل" اس کو کہتے تھے جس کے کسی شعر میں کوئی حکمت کی

1۔ اس قصہ کی تفصیل سموأل بن عادیا کے تذکرہ میں ملاحظہ کیجئے۔

بات ہو۔ چنانچہ اعشیٰ کو فحل اس کے اس شعر کی وجہ سے کہا جاتا ہے :۔

تــلدتك الشعر يا سلامة ذا ۔۔۔ فائش والشئ حيث ما جعلا

اس میں حکمت کی بات یہ کہی گئی ہے کہ کسی چیز کی قدر و قیمت مناسب جگہ اور مناسب موقع پر ہونے سے معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح میں نے ذو فائش کی تعریف اپنے اشعار میں کی ہے تو اس وجہ سے کہ وہی ایسی شخصیت ہے جسے مدحیہ قصیدہ زیب دیتا ہے۔ اور اس کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ گویا اس کی شخصیت اتنی مکرّم و محترم ہے کہ مدحیہ قصیدہ کی بھی عزّت اس کی گردن میں ہار بن کر پڑنے کی وجہ سے بڑھ گئی ہے۔

اعشیٰ نے، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، بڑی لمبی عمر پائی۔ اس طویل عرصہ میں اس نے اکثر اصناف شعر میں طبع آزمائی کی ہے۔ جن کی کچھ مثالیں اوپر پیش کی گئیں۔ ابو عمرو بن العلا نے ٹھیک کہا تھا کہ اسلامی دور میں اس کا ہمسر جَریر تھا۔ وہ بھی جریر کی طرح ہر صنف میں طبع آزمائی کرتا تھا: مثله مثل البازی يضرب كبير الطير وصغيره[1] یعنی اعشیٰ کی مثال اس باز کی طرح ہے جو چھوٹے بڑے سب پرندوں پر جھپٹتا ہے۔

۱۔ طبقات فحول الشعراء۔ ابن سلام الجمحی، ص ۵۵۔

اس روایت کو ابو زید القرشی نے، جمہرۃ اشعار العرب میں دوسرے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ ص ۴۳۔

ڈاکٹر شوقی ضیف نے لکھا ہے کہ گایر Geyer مشہور جرمن مستشرق نے اعشیٰ کا دیوان چھ مخطوطات کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور چالیس سال کی مسلسل تحقیق و تدقیق کے بعد سنہ ۱۹۲۸ء میں اسے شائع کیا تھا۔ اس میں اس نے دو ضمیمے شامل کئے تھے۔ ایک میں اس نے اعشیٰ کا وہ کلام جمع کیا ہے جو اسے ادب اور تاریخ کی مختلف کتابوں میں ملا ہے۔ اور دوسرے میں ان تمام کثیر التعداد شعراء کا کلام جمع کیا ہے جن کا نام اعشیٰ تھا۔ بعد میں محمد حسین نے اس نسخہ کی مدد سے مصر میں اس کا دیوان شائع کیا۔ حاشیہ، تاریخ آداب اللغۃ العربیہ۔ جرجی زیدان ج ۱، ص ۱۲۰۔

حوالہ جات:-

۱- الاغانی — لابی الفرج الاصفہانی ج ۸- و ۱۰ و ۱۶-

۲- جمہرۃ اشعار العرب — ابو زید القرشی

۳- البیان والتبیین — للجاحظ، جلد ۱، ۲، ۳ اور ۴

۴- طبقات فحول الشعراء — ابن سلام الجمحی

۵- الشعر والشعرا — ابن قتیبہ

۶- المعلقات الشعر واخبار قائلیہا — احمد بن امین الشنقیطی

۷- شرح المعلقات السبع — للزوزنی

۸- شعر النصرانیہ — لویس شیخو الیسوعی

۹- تاریخ آداب اللغۃ العربیہ — لجرجی زیدان اوّل

۱۰- فی الادب الجاہلی — ڈاکٹر طہٰ حسین

۱۱- الوسیط فی الادب العربی وتاریخہ، الشیخ الاسکندری

۱۲- تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام، الدکتور شکری فیصل

۱۳- الوصف — سلسلۃ فنون الادب، دار المعارف، مصر-

۱۴- تاریخ الادب العربی — احمد حسن الزیات-

۱۵- المفصل — احمد الاسکندری

۶۔ طَرَفہؔ بن العبد

(م۔ ۵۵۲ء/۵۵۰ء یعنی ۷۰ء قبل ہجرت)

طرفہ کا پورا نام عَمْرو طرفہ بن العبد ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب قبیلہ بکر بن وائل سے ملتا ہے جو قبیلہ ربیعہ کی ایک شاخ تھی۔ اس طرح سے طرفہ ربیعی شاعر ہے (۱) طرفہ مشہور جاہلی شاعر جریر بن عبد المسیح کا ___ جسے عام طور سے المتلمّس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ___ بھانجہ اور دوسرے مشہور جاہلی شاعر المرقش الاصغر کا بھتیجا تھا۔ طرفہ اپنی قوم کے ساتھ بحرین خلیج فارس میں رہا کرتا تھا۔ بچپنے ہی سے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ اس کے چچاؤں نے اس کے ساتھ بہت نازیبا سلوک کیا اور اس کی ماں "وَرْدَہ" کی جائداد وغیرہ بھی غصب کر لی۔ طرفہ کو یہ بات بہت بری لگی اور چڑھ کر ان کی ہجو میں مندرجہ ذیل اشعار کہدیئے۔

ماتنظرون بحق وردۃ فیکم	صغر البنون ورھط وردۃ غیّبُ
قد یبعث الأمر العظیم صغیرہ	حتی تظل لہ الدماء تصبّبُ
والظلم فرق بین حیّی وائل	بکر تساقیھا المنایا تغلِبُ
قد یورد الظلم المبیّن آجنا	ملحا یخالط بالذعاف ویقشبُ

چچا اور اپنے خاندان سے بگاڑ کر لینے کے بعد طرفہ گھر سے نکل پڑا اور شراب و کباب اور

۱۔ پورا سلسلہ نسب یوں ہے:۔ عمرو طرفہ بن العبد بن سعد بن مالک بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ بن عکابہ ابن صعب بن علی بن بکر بن وائل۔

رندی و بدمستی میں دن رات گذارتا اور بے دریغ پیسہ خرچ کرتا۔ جب پیسہ ختم ہوگیا تو پھر اپنے گھر واپس آیا اور اپنے بھائی سے مدد مانگی۔ بھائی نے اسے کچھ پیسے دے دیئے اور اس نے پھر اسے اپنی عیاشانہ زندگی کی نذر کردیئے۔ اب گھر جانے کی ہمت نہ تھی۔ چنانچہ اس نے حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ھند کے دربار کا رخ کیا۔ کہتے ہیں کہ اس سفر میں اس کا ماموں المتلمس بھی ساتھ تھا۔ عمرو بن ہند اپنے زمانے کا بہت بڑا شاعر نواز اور علم و ادب کا قدر دان بادشاہ گذرا ہے۔ چنانچہ اس نے ان دونوں کی بڑی آؤ بھگت کی اور اپنے بھائی قابوس کے حاشیہ نشینوں میں انھیں شامل کردیا۔ قابوس بہت خوش باش زندہ دل اور سیر و شکار کا رسیا نوجوان تھا۔ چنانچہ طرفہ اس کے سیر و شکار کی پارٹی کا ساتھی اور محفل شراب و کباب کا شریک و ندیم بن گیا۔ مگر اس مصاحبت اور یگانگت کے باوجود جتنی اپنائیت اور مراعات کی وہ توقع رکھتا تھا اسے نہ مل سکی کیونکہ اسے اب بھی حسب سابق شاہی محل کے دروازے پر ایک مدت تک کھڑے رہنے کے بعد اندر آنے کی اجازت ملتی تھی۔ اور بات چیت اور برتاؤ میں فرق مراتب کا پورا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ عرب کی آزاد فضا میں آزادی سے پلے بڑھے عرب نژاد نوجوان شاعر کے دل پر اس کا بہت برا اثر پڑا۔ اور جوں جوں دن گزرتے گئے، تعلقات میں اونچ نیچ اور برتاؤ میں بھید بھاؤ کا احساس بڑھتا گیا۔ طرفہ اس بجھی بجھی سی زندگی سے اوب گیا اور اس کے دل میں عمرو بن ہند اور اس کے بھائی کی طرف سے گرہ پڑگئی۔ اور اس نے عمرو بن ہند اور قابوس کی ہجو کہہ ڈالی۔ عمرو بن ہند کو اس کا علم ہوا تو اس نے بات دل میں رکھ لی اور موقع کی تلاش میں رہا۔

کچھ دنوں کے بعد عمرو بن ہند نے کہا کہ شاید اب تم دونوں اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہو گے۔ المتلمس اور طرفہ نے آمادگی ظاہر کی تو اس نے بحرین اور ہجر کے اپنے گورنر ربیعہ بن الحارث العبدی یا مُعَکبر کے نام ان دونوں کو ایک ایک خط دیا اور یہ ظاہر کیا کہ ان میں انھیں انعام و اکرام دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ دونوں یہ خطوط لے کر نکلے جب نجف یا حیرہ کے قریب ایک جگہ پہنچے تو متلمس کے جی میں آیا کہ وہ اس خط کو پڑھوا کر دیکھے تو کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک لڑکے سے اپنا خط پڑھوایا اس میں لکھا تھا کہ جب حامل خط تمہارے پاس پہونچے تو اس کا ایک ہاتھ ایک پاؤں کٹوا کر زندہ درگور کردینا۔ متلمس نے جب یہ مضمون سنا تو خط کو ایک دریا میں جس کا نام کافر تھا ڈال دیا اور یہ شعر کہا

القیتھا بالثنی من بطن کافر　　　کذلک اقنوا کل قط مضلل

یعنی میں نے اس خط کو دریائے کافر میں ڈال دیا اور میں اس قسم کے گمراہ کرنے والے خط کا یہی حشر کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ طرفہ کے پیچھے لپکا لیکن اسے نہ پا سکا۔ بعض روات کا خیال ہے کہ طرفہ

اسے مل گیا۔ اور جب متلمس نے اس سے کہا کہ تم بھی اپنے خط کا مضمون معلوم کر لو شاید اس میں بھی یہی حکم ہو تو طرفہ نے اس کا مذاق اڑایا اور بولا کہ میرے بارے میں ایسا حکم دینے کی ہمت عمرو بن ہند کو نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ وہ بدستور اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا اور بحرین کے گورنر کو جا کر خط دے دیا۔ اس نے خط پڑھ کر حسب ہدایت طرفہ کو قتل کرا دیا۔ اس وقت طرفہ کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی۔

اس قصے کے بارے میں رواۃ میں شدید اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ متلمس اور طرفہ نے عمرو بن ہند کے دربار میں جانے سے پہلے اس کی ہجو کہہ رکھی تھی اور اس کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

لیت لنا مکان الملك عمرو رغوثا حول قبتنا تخور

یعنی کاش عمرو بادشاہ کی جگہ ہمارے لیے ایک دودھ دینے والی گائے یا بکری ہوتی جو ہمارے گھروں کے ارد گرد ممیاتی رہتی۔

اس کی خبر عمرو بن ہند کو مل گئی تھی لیکن اس نے دل میں بات رکھ لی تھی۔ اور جب یہ دونوں آئے تو اس نے بڑی آؤ بھگت کی اور ان پر ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ ان سے انتقام لینے کی سوچ رہا ہے اور چلتے وقت مذکورہ بالا خط دیا۔ مگر متلمس نے اسے پڑھوا کر سن لیا اور وہاں سے بھاگ کر شاہان شام غسانیوں کے پاس چلا گیا۔ طرفہ نے اس کی بات نہ مانی اور بحرین کے گورنر کے پاس پہنچ گیا۔ اور اس نے طرفہ کے قبیلہ کے ڈر سے قتل کرنے کی جرأت نہیں کی تو عمرو بن ہند نے قبیلۂ بنو تغلب کے ایک شخص عبد ہند کو گورنر بنا کر بھیجا اور اس نے اسے قتل کرایا اور ہجر میں دفن کیا گیا۔

ابن قتیبہ نے الشعر والشعراء میں اس کے قتل کا سبب یہ بتایا ہے کہ طرفہ جن دنوں عمرو بن ہند کی حاشیہ نشینی میں تھا تو ایک دن عمرو کی بہن نے اوپر سے جھانک کر نیچے دیکھا تو اس کا عکس اس پیالہ میں پڑا جس میں طرفہ شراب پی رہا تھا چنانچہ اس نے اس کے حسن برق پاش کو دیکھ کر برجستہ یہ شعر کہا:

أَلا یا ثانی الظبی الذی یبرق شنفاہ ولولا الملك القاعد قد أَلثمنی فاہُ

یعنی۔ اے ہرنی کی ہمسر جس کے دونوں آویزے بجلی کی طرح چمک رہے ہیں اگر سامنے بادشاہ نہ بیٹھا ہوتا تو وہ مجھے اپنے ہونٹوں کا بوسہ دیدیتی۔

اس کی یہ جسارت عمرو بن ہند کو بہت بری لگی اور اس نے بات دل میں رکھ لی اور پھر خط دے کر اسے حاکم بحرین کے پاس بھیجا جہاں اسے قتل کرا دیا گیا۔ طرفہ کے قتل کے بعد اس کی بہن نے اس کا مرثیہ کہا۔

نعمنا به خمسا وعشرین حجة فلما توفاها استوی سیدا ضخما

فجعنا به لما استتم تمامه   علی خیر حال لا ولیداً ولا قحما

یعنی ہم اس کے ساتھ ۲۵ سال تک ہنسی خوشی رہے پس جب کہ اس نے ان برسوں کو پورا کر لیا تو جلیل القدر سردار بن گیا۔ لیکن جب طفلی کی منزل سے نکل کر اس طرح پروان چڑھا کہ نہ تو بچہ تھا نہ ہی سن رسیدہ بڈھا تو ہمیں اس کی موت کا دکھ اٹھانا پڑا۔ (۱)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طرفہ پچیس سال تک جیا۔ اس بیان میں اور دوسرے روات کے بیان میں بظاہر بہت تضاد ہے۔ اکثر نے اس کے مرنے کی عمر بیس سال ہی بتائی ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ بیس سال کی عمر میں اس نے عمرو بن ہند کی ہجو کی اور یہیں سے عمر بن ہند کی رنجش شروع ہوتی ہے۔ اور وہ موقع کی تلاش میں رہا۔ اور یہ موقع اس کو پچیسویں سال ہاتھ لگا اور اس نے اسے قتل کرا دیا۔ ہمارے اس بیان سے روات اور نقادوں کے سامنے اختلافات کی ایک ایسی تاویل ہو جاتی ہے جو بڑی حد تک قرین قیاس اور قابل قبول ہے کیونکہ راویوں یا تذکرہ نگاروں نے عمرو بن ہند سے اس کی رنجش کی تاریخ نہیں متعین کی ہے۔ البتہ یہ بات ثابت ہے کہ اس نے طرفہ کو قتل کرایا ہے۔ اپنی بہن کے واقعہ یا اپنی ہجو سننے کے بعد۔ اس میں سے جو بھی واقعہ رنجش کا سبب ہوا ہو۔ بہر حال قتل اس کے چند سال بعد ہوا۔ اور عین قرین قیاس ہے کہ چار پانچ سال اس میں گزر گئے ہوں تاکہ طرفہ کے دل سے یہ بات نکل جائے کہ عمرو بن ہند اس سے کینہ رکھتا ہے اور وہ اس سے بے تکلفی اور اعتماد کے ساتھ مل سکے اور اس طرح عمرو بن ہند کو انتقام لینے میں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عمرو بن ہند کا خط لے کر جب طرفہ چلا ہے تو باوجود متلمس کے کہنے کے اسے شبہ بھی نہیں ہوا کہ یہ خط درحقیقت اس کے قتل کا پروانہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمرو کی رنجش کی بات اتنی پرانی ہو چکی تھی کہ طرفہ اس کی طرف سے بالکل مطمئن ہو چکا تھا۔ اور اس کے لیے چار پانچ سال کا عرصہ کافی زمانہ ہے، اس طرح پچیس سال کی عمر میں قتل کیا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔

امتیازی خصوصیات

طرفہ کی مختصر سی زندگی کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے قدرت نے بلا کی

۱۔ جمہرۃ اشعار العرب میں صفحہ ۴۳ پر یہ شعر یوں بھی نقل کیا گیا ہے۔

عددنا له ستا وعشرين حجة   فلما توافاها استوى سيدا ضخما

فجعنا به لما رجونا إيابه   على خير حال لا وليدا ولا قحما

ابن قتیبہ نے بیس سال کی عمر میں مرنے کی روایت نقل کی ہے اور بعض شعراء نے بھی اسے ابن عشرین کہا ہے۔

ذہانت اور شاعری کا اعلیٰ فطری ذوق بخشا تھا۔ اگر اس کی عمر وفا کرتی، تو شاید وہ دورِ جاہلی کے ممتاز ترین طبقۂ اولیٰ کے شعراء میں شمار ہوتا۔ رواۃ کہتے ہیں کہ اس نے بچپنے سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور بیس سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے اس میں استادانہ مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس کی ذہانت اور زبان دانی میں استادانہ حیثیت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن عمرو بن ہند کے دربار میں اس کے ہمعصر شاعر المسیب بن علس نے قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے۔

وقد اتلافی الهم عند احتضاره بناج علیه الصعیریة مکدم

تو طرفہ نے کہا کہ کیا خوب اونٹ کو اونٹنی بنا دیا۔ یہ اس وجہ سے کہ صعیریہ اونٹنیوں کی نشانی ہے۔ اونٹ کی نہیں۔ اس پر مسیب اس سے بہت خفا ہوا اور بولا کہ اس کی زبان ایک دن اس کی جان لے کر رہے گی۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ ہوا بھی یہی۔

اس کے قدرت کلام کی بہترین مثال اس کا وہ شہرۂ آفاق معلقہ ہے جس میں ایک سو پانچ شعر ہیں۔ (۱) اور ان میں سے ۳۵ اشعار صرف اس کی اونٹنی کی تعریف میں ہیں۔ اس کا یہ معلقہ پرگوئی، دقت فکر و نظر اور رفعت تخیل اور ندرت تشبیہ اور نزاکت وصف کی ایسی مثال ہے جس کی نظیر کسی جاہلی شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ اس کے ساتھ معنی کی گہرائی، پیرایۂ بیان کی گیرائی اور حکمت و فلسفہ کی چاشنی نے اس کے معلقہ کو دورِ جاہلی کے معجز نما کلام کی حیثیت دے دی ہے اور جہاں تک وصف کا تعلق ہے تو طرفہ کا اس صنف میں مشکل سے کوئی ہمسر ملے گا۔ اس میں حقیقت کے ساتھ قابل فہم مبالغہ کی چاشنی اور معنی کو راز درون پردہ بنا کر پیش کرنے کی صنعت نے بڑی جان ڈال دی ہے۔ اس موقع پر بعض جگہ ترکیب میں تعقید اور الفاظ میں ثقل اور معانی میں گنجلک یا الجھاؤ کا احساس ہوتا ہے لیکن ندرت تخیل اور رفعت پرواز کا لطف اس بے مزگی کو دھو دیتا ہے۔

طرفہ کا معلقہ

طرفہ سے منسوب شاعری کا جتنا ذخیرہ ہم تک پہنچ سکا ہے اس میں سب سے زیادہ صحیح قابل اعتبار اور اس کی فنی مہارت کا آئینہ دار اس کا معلقہ ہے[2]۔ خیال یہ ہے کہ اس نے اپنا یہ معلقہ اس زمانہ میں کہا تھا جب باپ کے مرنے کے بعد عزیز و اقارب کے ظلم اور زیادتی سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ کر اس

۱۔ اشعار کی تعداد کے بارے میں رواۃ میں سخت اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک سو پانچ سے لے کر بروایت ابو زید محمد القرشی، جمہرۃ اشعار العرب۔ ۱۱۲ شعر ہیں۔ (۲) طرفہ کی طرف اس معلقہ کے علاوہ دوسرے قصیدے اور اشعار بھی منسوب کئے جاتے ہیں۔

نے ہر قید و بند سے آزاد زندگی گزارنی شروع کی ہے اور اس کے نتیجہ میں جب سب پیسے ختم ہوگئے تو پھر اپنی قوم کے پاس تلاش اور مفلس ہوکر واپس آیا ہے۔ اس زمانے میں غالباً یہ واقعہ پیش آیا کہ اس کے بھائی معبد کے کچھ اونٹ گم ہوگئے اور بہت تلاش و جستجو کے بعد بھی نہ ملے تو خیال ہوا کہ شاید کوئی قبیلہ انہیں ہنکالے گیا ہے۔ چنانچہ طرفہ اپنے چچازاد بھائی مالک کے پاس گیا کہ اونٹوں کی تلاش اور ان کے واپس لانے میں اس کے بھائی کی مدد کرے لیکن اس نے اسے جھڑک دیا اور یہ کہہ کر بھگا دیا کہ" فوطت فیھا ثم اتبلت تتعب فی طلبھا " پہلے تو تم نے ان کی طرف سے لاپرواہی برتی اور اب جب سب کھو گئے تو بلاوجہ ان کی تلاش اور جستجو میں پریشان ہونے کے لیے آگئے ہو۔ یہ بات اس کو بہت بری لگی اور جذبات میں ہیجان برپا ہوگیا۔ اور نتیجہ کے طور پر اس نے یہ معلقہ کہا۔

معلقہ کا موضوع اس کی اپنی ذات اور زندگی سے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے۔ اور نیکی بدی طنزت کوشی کے متعلق اس کا فلسفہ ہے۔ اس میں نہ کسی کی تعریف ہے اور نہ غزل بحیثیت فن۔ شروع میں جو غزلیہ اشعار ہیں وہ دستور کے مطابق محض تشبیب ہے۔ ورنہ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں چنانچہ اپنی محبوبہ خولہ کے دیار کے ذکر سے اس کا آغاز کرتا ہے۔ مطلع ہے:

لخولۃ أطلال ببرقۃ ثھمد　　　تلوح کباقی الوشم فی ظاھر الید

وقوفاً بھا صحبی علی مطیھم　　　یقولون لا تھلک أسی وتجلد

مطلع فراق سے شروع ہوتا ہے۔ کہتا ہے ـــــ شہمد کی کنکریلی زمین میں پائے جانے والے میری محبوبہ کے گھر کے نشانات باوجود زمانہ گزر جانے کے ابھی تک اس طرح چمک رہے ہیں جس طرح ہاتھ کے اوپر مٹتے ہوئے گدنے کے نشانات ہوں۔

اس جگہ میرے دوست میرے پاس اپنی سواریاں روک کر مجھ سے کہتے ہیں کہ ذرا صبر دھرو۔ اس طرح اپنے آپ کو ہلکان نہ کر ڈالو۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا وہ اپنی قوم کے ساتھ خلیج فارس کے علاقے میں جہاں موجیں مارتا سمندر اور اس میں تیرتی کشتیاں اور ان کے ناخدا اور ملاح تھے پلا بڑھا تھا۔ چنانچہ اس کے ماحول کا عکس اس کے معلقہ میں بھی پوری طرح ملتا ہے۔ اس نے اپنی محبوبہ خولہ کی سواری کی تشبیہ کشتی سے دی ہے اور اپنی اونٹنی کی چال اور کبھی کبھی بھٹک جانے کی مثال اس کشتی سے دی ہے جس کا ملاح راستہ بھول کر کبھی ادھر جائے اور کبھی ادھر۔ اور اس طرح وہ اس مضمون میں شعرائے جاہلیت میں منفرد ہے۔ کہتا ہے۔

كان حدوج المالكية غدوة[1] خلايا سفين بالنواصف من دد

عدولية أو من سفين ابن يامن يجور بها الملاح طورًا و يهتدي

يشق حباب الماء حيزومها بها كما قسم الترب المفايل[2] باليد

یعنی فراق کی صبح کو میری معشوقہ کی سواری جو قبیلہ بنو مالک سے تعلق رکھتی ہے وادی دد میں اس طرح دکھائی دے رہی تھی جیسے کہ بڑے بڑے جہاز ہوں یعنی جن اونٹوں پر بیٹھ کر محبوبہ جا رہی تھی وہ اتنے دیو پیکر ہیں کہ دیکھنے میں بڑے جہاز معلوم ہوتے ہیں۔

یہ جہاز یا تو قبیلہ عدولی کے یا ابن یامن کے معلوم ہوتے ہیں کہ جنھیں کبھی ملاح بھٹک کر اس سمت لے کر جاتا ہے اور کبھی دوسری طرف کو تاکہ راستہ مختصر ہو جائے۔

یہ ملاح ان جہازوں کے سینوں سے پانی کو اس طرح بیچ سے کاٹتا ہے جس طرح اس کھیل میں ریت کو نصف سے بانٹ دیتے ہیں جس میں کوئی چھلہ ریت میں چھپا دیتے ہیں پھر اس ریت کو دو حصہ کرکے چھلہ کو ڈھونڈھتے ہیں۔

خولہ کے ناقہ کے وصف کے بعد اپنے ناقہ کا وصف شروع کرتا ہے اور اس میں اس قدر تطویل سے کام لیتا ہے کہ اس کے ہر ہر عضو کی تفصیل سے تشریح کرتا ہے اور ایسی ایسی تشبیہیں لاتا ہے جن کی مثال مشکل سے ملے گی۔ چنانچہ اس کی چوڑی ہڈیوں کی تشبیہ اران کے تختوں سے دیتا ہے۔ اران وہ تابوت کہلاتا تھا جس میں عرب اپنے بزرگوں، سرداروں اور جلیل القدر ہستیوں کی لاشوں کو لے جاتے تھے۔ اسی طرح اس کی دم کے بالوں کی تشبیہ اس گدھ کے بازوؤں سے دیتا ہے جس کی سیاہی میں سفیدی جھلکتی ہے۔ اور اس کی رانوں اور رکھڑے ہونے پر محراب نما جو شکل بنتی ہے اس کی تشبیہ ایک عظیم الشان محل کے دروازے سے دیتا ہے۔ اس کے قد و قامت کی بلندی کی تشبیہ رومی پل سے دیتا ہے اور اٹھی ہوئی گردن کی اس کشتی کے مستول سے جو دریائے دجلہ میں چل رہی ہو۔ چنانچہ کہتا ہے کہ اس کی رانیں ایسی ہیں جیسے عظیم الشان محل کے دو دروازے۔

---

(۱) اشارہ خولہ کے قبیلہ بنو مالک کی طرف ہے جو قبیلہ کلب کی ایک شاخ ہے۔

(۲) فایل۔ یفایل ۔ یہ ایک کھیل تھا۔ اس میں ریت کے ایک ڈھیر میں کوئی چھلہ یا انگوٹھی چھپا دیتے تھے پھر اس ڈھیر کو دو برابر حصوں میں بانٹ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ بوجھو چھلہ یا انگوٹھی کس ڈھیر میں ہے۔ جو بتا دیتا سو وہ جیت جاتا (الزوزنی)

لها فخذان أكمل النحض فيهما كأنهما بابا منيف ممرد
اور لمبی گردن جیسے مستول۔

وأتلع نهاض إذا صعدت به كسكان بوصى بدجلة مصعد

اور اسی طرح ۲۸ اشعار میں اس کے انگ انگ کا سراپا بڑے دلکش انداز میں کھینچتا ہے۔[1] اس کے بعد اصل مطلب پر آتا ہے۔ اور اپنی ذات اور اپنی صفات پر فخر کرتا ہے اور اس کے ساتھ زندگی سے متعلق اپنا فلسفہ اور نظریہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب کوئی یہ آواز لگاتا ہے کہ ہے کوئی جیالا نوجوان تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ وہ مجھ ہی کو پکار رہا ہے۔ تو پھر میں نہ کاہلی کرتا ہوں اور نہ تذبذب کرتا ہوں۔ کیونکہ میں ایک شیر دل نوجوان ہوں۔

إذا القوم قالوا من فتى خلت أنني عنيت، فلم أكسل ولم أتبلد

شجاعت و بہادری کے اوصاف کے ساتھ وہ سخی داتا بھی ہے۔ اور ایسا زیرک و عقلمند کہ لوگ اس سے مشورہ لیتے ہیں۔ پھر حسب نسب میں بھی عالی مقام۔

ولست بحلال التلاع مخافة ولكن متى يسترفد القوم أرفد
وإن تبغني في حلقة القوم تلقني وإن تقتنصني في الحوانيت تصطد
متى تأتني أصبحك كأسا روية وإن كنت منها غانيا فاغن وازدد
وإن يلتق الحي الجميع تلاقني إلى ذروة البيت الرفيع المصمد

یعنی۔ اور میں کھلانے پلانے کے ڈر سے ٹیلوں پر نہیں بھاگ جاتا۔ بلکہ جب لوگ مصیبت میں مجھ مانگتے ہیں تو میں ان کی مدد کو دوڑتا ہوں۔
اگر تم (محترم اور معزز شخصیتوں) لوگوں کی انجمن میں مجھے ڈھونڈو گے تو میں تمہیں وہاں ملوں گا

---

(۱) ڈاکٹر طٰہ حسین نے اپنی کتاب ــــ حدیث الاربعاء۔ جلد اول۔ صفحہ ۵۹ پر ناقہ کے اس وصف کا جو اثر عام طور پر ہوتا ہے اس کا بہت دلکش منظر کھینچا ہے۔ اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کی غرابت الفاظ اور تعقید، غموض اور ابہام اس بات کی دلیل ہے کہ اس قصیدہ میں اس وصف کو بعد میں بڑھا دیا گیا ہے۔ درحقیقت اسے طرفہ نے کہا نہیں ہے کیونکہ طرفہ نے اپنے رائیہ قصیدہ میں بھی اپنی اونٹنی کی تعریف کی ہے لیکن دو تین شعر سے زیادہ نہیں کہا ہے۔ اور وہ بھی ایسا ہے کہ پڑھ کر لطف آتا ہے۔ اسی طرح اس معلقہ میں بھی صرف دو تین ہی شعر ناقہ کے وصف میں کہہ تھے

دیعنی میں اتنا معزز اور محترم ہوں اتنا سمجھدار اور معاملہ فہم ہوں کہ سرداران قوم کی محفلوں میں شریک ہوتا ہوں) (اور اتنا زندہ دل خوش باش نوجوان ہوں کہ) اگر تم شراب خانوں میں میری تلاش کرو تو میں تمہیں وہاں بھی مل جاؤں گا۔ اور جب تم مجھ سے ملنے کے لیے آؤ گے تو میں تمہارا استقبال ایک چھلکتے جام سے کروں گا۔ اور اگر تمہیں اس کی ضرورت نہ بھی ہوگی تو (کوئی حرج نہیں) تم اس سے مستغنی رہو بلکہ خدا تمہیں اور زیادہ دے۔

اور اگر مختلف قبیلے اپنے اپنے فضائل بیان کرنے کے لیے کسی جگہ جمع ہوں تو تم دیکھو گے کہ میں شریف اور لوگوں کو پناہ دینے والے گھرانے کی چوٹی سے تعلق رکھتا ہوں یعنی ایسے بلحاظ اخلاق قبیلوں میں بھی سب سے اونچے قبیلہ کا میں ایک فرد ہوں۔"(۱)

مذکورہ بالا اشعار میں طرفہ نے اپنا پورا تعارف بے کم وکاست کرایا ہے۔ یہ نقشہ اس بدوی نوجوان کا ہے جو صاف دل، پاک خیال، بلند اخلاق، بہادر جری اور سخی داتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ زندگی اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا جانتا ہے۔ لیکن اعتدال، وقار اور شرافت کے ساتھ اسے اپنے فرائض کا پورا احساس ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کی قوم اس پر بھروسہ کرتی ہے اسی لیے مصیبت کے وقت وہ اسے بلائے یا نہ بلائے اسے اس کے کام آنا ہے۔ لہذا وہ بغیر سستی اور کاہلی کیے ایسے موقعوں پر دوڑ پڑتا ہے۔ پھر جب امن وامان کا زمانہ آتا ہے تو محتاجوں اور فقیروں کو خوب کھلاتا پلاتا ہے۔ مانگنے والوں سے منہ چرا کر چھپ نہیں جاتا۔ اور اگر کوئی گمبھیر موقع ہوتا ہے اور سرداران قوم مل جل کر اس سلسلہ میں کوئی مشورہ کرتے ہوتے ہیں تو وہ بھی اس مجلس میں پورا شریک ہوتا ہے۔ اس سے اس کی اصابت رائے۔ معاملہ فہمی اور عزت ووقار کا اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود کم سن ہونے کے وہ بزرگوں اور سن رسیدہ لوگوں کے ساتھ مجلس مشاورت میں شریک ہوتا ہے جب وہ اپنی قوم اور غیروں کے حقوق پورے پورے ادا کرتا ہے تو پھر اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے نفس کا بھی حق ادا کرے۔ چنانچہ وہ شراب خانوں کی زینت بنتا ہے۔ لیکن تنہا خوری اس کی عادت نہیں۔ اس کے ساتھ اس کے ہمجولی، بے فکرے لیکن نکھرے نوجوان بھی ہیں۔ اگر کوئی اس مجلس رندان باصفا میں آجائے تو ایک چھلکتا جام اسے بھی پیش کرتا ہے، اور کہتا ہے۔ پیو! جام لنڈھا کر پینا ہی زندگی ہے۔ اپنے پائے جانے کی جگہوں کی نشاندہی کرنے کے بعد یہ بتاتا ہے کہ اگر تم لوگوں سے پوچھ کر میرے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہو تو تمہیں پتہ چلے گا کہ میں شریف خاندانوں میں سب سے چوٹی کے خاندان کا فرد ہوں۔

اس کے بعد شراب کے اپنے ساتھیوں اور اپنی مطرب دلنواز کا بڑے خوبصورت انداز سے ذکر کرتا ہے جس میں بتاتا ہے کہ اس کے ندیم کوئی گرے پڑے اوباش نوجوان نہیں ہیں۔ بلکہ شریف گھرانوں کے شریف نوجوان ہیں۔ جن کے چہرے ستاروں کی طرح دمکتے ہیں۔ یہ لوگ یہ شراب رندی و بدمستی کی خاطر نہیں پیتے بلکہ زندگی کو پرلطف بنانے کے لیے۔ اسی لیے شائستہ انداز سے پیتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مغنیہ سامعہ نواز بھی ہے جس کی آواز میں بڑا رس بڑی موسیقیت اور بڑا سوز ہے جس کا حسن بڑا نکھرا، جسم بڑا گداز اور اس پر بڑی دلنواز اور ہر وقت مائل بہ کرم ہوتی ہے۔ غرض بدیہی حسن وجمال کا دلفریب پیکر ہے۔

ندامای بیض کالنجوم وقینة	تروح علینا بین برد ومجسد
رحیب قطاب الجیب منها رقیقة	بجس الندامی بضة المتجرد
إذا نحن قلنا أسمعینا انبرت لنا	علی رسلها مطروفة لم تشدد
إذا رجعت فی صوتها خلت صوتها	تجاوب أظآر علی ربع ردی

اس کے بعد شراب و کباب اور عیش و مستی میں بے دریغ پیسہ خرچ کرنے کا ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ لوگوں نے بغیر سمجھے سمجھے صرف اس عادت کی وجہ سے کس طرح قطع تعلق کرکے خاندان سے اس طرح الگ کردیا جیسے خارش زدہ اونٹ کو گلے سے الگ کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ان لوگوں کو جواب دیتا ہے جو اس طرز زندگی کے مخالف ہیں۔ اور ان سے کہتا ہے کہ زندگی چند روزہ ہے۔ اس میں کھا پی لو، عیش و عشرت کرلو کہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

وما زال تشرابی الخمور ولذتی	وبیعی وإنفاقی طریفی ومتلدی
إلی أن تحامتنی العشیرة کلها	وأُفردتُ إفرادَ البعیر المعبد

اس کے بعد زندگی کے متعلق اپنا نظریہ اور فلسفہ بتاتا ہے کہ میرے لیے حاصل زندگی مندرجہ ذیل تین چیزیں ہیں۔

ایک شراب، دوسری کمزور بےکس اور ڈرے ہوئے آدمی کی مدد کرنا اور تیسری یہ کہ جب پانی برس رہا ہو موسم سہانا اور خوشگوار ہو تو پھر کسی شہ ناز لالہ رخ کے کاشانہ میں چل۔"

حاشیہ صفحہ گذشتہ

(۱) ان اشعار کا ڈاکٹر طہٰ حسین نے جو تجزیہ کیا ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے۔ ملاحظہ کیجیے: حدیث الاربعاء جلد اول۔ صفحہ ۶۰۔

ولولا ثلاث من من عيشة الفتی — وجدّك لم أحفل متی قام عوّدی

فمنهن سبقی العاذلات بشربة — كميت متی ما تعل بالماء تزبد

وكری إذا نادی المضاف مجنبا — كسيد الغضا نبهته المستورّد

وتقصير يوم الدجن والدجن معجب — ببهكنة تحت الخباء المعمّد

پھر دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بلا وجہ بخل سے کام لے کر لطف زندگی سے محروم رہتے ہو۔ موت تو بخیل اور سخی دونوں کو آنی ہے۔ پھر کیوں دو روزہ زندگی میں تکلیف اٹھایئے۔ پھر کتنے بلیغ انداز میں تشبیہ دیتا ہے کہ مرنے کے بعد بخیل اور سخی دونوں مٹی کے ڈھیر کے نیچے ہوں گے دیکھنے والے یہ نہ جان سکیں گے کہ ان میں سے بخیل کون تھا اور سخی کون۔ اس لیے کیوں بخل کیجیے۔

اری قبر نحّام بخيل بماله — كقبر غوی فی البطالة مفسد

تری جثوتين من تراب عليهما — صفائح صم من صفيح منضد

ألا أيها الزاجری أحضر الوغی — وأن أشهد اللذات هل أنت مخلدی

فان كنت لا تسطيع دفع منيتی — فدعنی أبادرها بما ملكت يدی

یعنی اے وہ شخص جو مجھے جنگ میں شریک ہونے اور زندگی کی لذتوں سے لطف لینے سے روکتا ہے کیا تو مجھے حیات جاوداں بخش سکتا ہے۔ تو جب یہ حالت ہے کہ تو میری موت کو دور نہیں کر سکتا تو پھر مجھے عیش و عشرت کی زندگی اپنے مال و دولت سے گزار لینے دے کہ اس خشک اور بے روح اور ظالم زندگی سے جب دنیا وی عیش و آرام اور لذائذ چھین لیے جائیں تو پھر جینے کا کیا مقصد؟

جام شراب اور جمال شباب دوست — یہ دور تا ابد نہ سہی عمر بھر تو ہو

اس کے بعد ایک بڑے پتے کی بات کہتا ہے۔ زندگی اس خزانہ کی طرح ہے جو ہر رات گھٹتا جاتا ہے۔ مگر زمانہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔ اس کو فنا نہیں۔ پھر قسم کھاتا ہے کہ اگر کوئی نوجوان موت سے بچا بھی رہتا ہے تو اس کی مثال اس رسی کی سی ہے جسے ڈھیل دے دی گئی ہو لیکن اس کے سرے موت کے ہاتھ میں ہوں۔ اور جب چاہے اسے گھسیٹ کر ختم کر دے۔ اور وہ چوں نہ کر سکے کہ جو موت کی رسی سے بندھا ہو وہ بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔

أری الموت يعتام الكرام ويصطفی — عقيلة مال الفاحش المتشدد

أری العيش كنزا ناقصا كل ليلة — وما تنقص الايام والدهر ينفد

لعمرك إن الموت ما أخطى الفتى ۔۔۔ لكالطِّوَل المُرخى وثِنياه باليد

متى ما يشأ يوماً يقده لحتفه ۔۔۔ ومن يك فى حبل المنية ينقد

اس کے بعد بڑے دکھ درد سے عزیز واقارب کی زیادتی کا شکوہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی ایذارسانیوں کی تکلیف تیز تلوار کی ضرب کاری سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور سخت ہوتی ہے۔ اس شعر میں اپنے چچازاد بھائی سے خفگی کا اظہار کرتا ہے جس نے اس کے بھائی معبد کے اونٹوں کو دشمنوں سے نہیں بچایا تھا۔

وظلم ذوی القربى أشد مضاضة ۔۔۔ على المرء من وقع الحسام المهند

لیکن وہ ان باتوں سے ہمت نہیں ہارتا اور نہ مایوس ہوتا ہے۔ بلکہ فخریہ کہتا ہے کہ میں بہت پھرتیلا تیز آدمی ہوں اور ہمیشہ اپنی تیز تلوار کو اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہوں یعنی اتنا بہادر ہوں کہ کبھی بھی تلوار کو اپنے سے جدا نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے اپنی اور دوسرے مدد مانگنے والوں کی مدد کرتا ہوں۔

اور زہیر ابن ابی سلمی کی طرح معلقہ کو حکمت و فلسفہ کی باتوں پر ختم کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ موت لوگوں کے لیے گھاٹ کی طرح سے ہے۔ ہر ایک کو اس پر جانا پڑتا ہے۔ آج ایک آدمی بچ گیا تو کل مر جائے گا۔ اور آج و کل کے درمیان فاصلہ ہی کتنا ہے۔ پھر زمانہ جن چیزوں کو تم نہیں جانتے ہو خود ہی تمہیں بتا دے گا۔ اور تمہیں خود بخود حقیقتوں کا علم ہو جائے گا۔

ستبدی لك الأيام ما كنت جاهلا ۔۔۔ ويأتيك بالاخبار من لم تزود

ويأتيك بالأنباء من لم تبع له ۔۔۔ بتاتاً ولم تضرب له وقت موعد

طرفہ کا مذکورہ بالا شعر عربی ادب میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم لاکھ چھپاؤ بات کھل کر رہے گی۔ حقیقت چھپائے نہیں چھپتی۔ "جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے"۔

طرفہ کا یہ قصیدہ عرب کے خوش باش و بے فکر اور عیش و عشرت اور شراب و کباب کے رسیا نوجوانوں کی زندگی کی پوری عکاسی کرتا ہے۔ جو مال و متاع کو عیش کوشی، شراب و کباب کی نذر کر دینے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتے کیونکہ موت سب کے لیے برحق ہے۔ جب یہ صورت ہے تو پھر رو رو کے جینے سے کیا فائدہ۔

لفظی اور معنوی اعتبار سے چونکہ اس میں ایسے نئے معانی اور ایسے نئے تجربوں کا ذکر ہے جو اس سے پہلے نہیں ملتے۔ اسی کے ساتھ اسلوب بیان کی دلکشی اور اثر آفرینی میں بھی اس کو امتیازی شان

حاصل ہے۔ اسی لیے اس قصیدہ کو بہترین قصائد میں شمار کیا جاتا ہے البتہ اپنی اونٹنی کی تعریف میں جس تطویل اور دقت نظری کا اظہار کیا ہے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس میں اکتا دینے والی طوالت کے علاوہ بڑا ابہام اور تعقید معنوی پیدا ہو گئی ہے۔

معلقہ کے علاوہ طرفہ کی طرف چند اور ایسے قصیدے منسوب کیے جاتے ہیں جن میں ایک کا مطلع ہے:

أصحوت اليوم أم شاقتك هر　　ومن الحب جنون مستعر

یعنی آج تم اپنے ہوش وحواس میں ہو یا اب بھی ہرہ نے تمہیں اپنا مشتاق بنا رکھا ہے سچ ہے محبت بھسم کر دینے والے جنون کا نام ہے۔

ایک دوسرا قصیدہ بھی جس کے متعلق بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس کا نہیں ہے۔ اس کا مطلع ہے:

سائلوعنا الذی یعرفنا　　بخزاز یوم تحلاق اللمم

ہماری بہادری اور شجاعت کے بارے میں ان لوگوں سے پوچھو جو ہمیں جانتے ہیں کہ خزازی کی جنگ میں لمبی زلفیں تک کاٹ دی گئی تھیں (اس جنگ میں اس کے قبیلہ بکر نے تغلب پر فتح پائی تھی اور وہ اسی پر فخر کرتا ہے)

طرفہ کے بہت سے اشعار ضرب المثل کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں جن کے ذکر کرنے کی یہاں گنجائش نہیں یہ تھا طرفہ اور اس کا کلام جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اپنی کم عمری کے باوجود اس نے شعر و شاعری میں اس کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے کہ بڑے شعراء بھی اس کا لوہا مانتے تھے۔ اسی لیے اس کو عربی ادب میں "ابن العشرین" یعنی بیس سال کی عمر کا نوجوان کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ اس کے اس شعر سے " بعیدا غدا ما اقرب الیوم من غد ۔ سے ایک موقع پر مثال پیش کی تھی۔ اس کا کلام اور اس کی شخصیت بڑی پر زور، فکر انگیز اور عربی فکر وذہن کی آئینہ دار ہے۔ بقول طہٰ حسین۔ "یہ شخصیت ایک ایسے انسان کا نقشہ اور تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس نے غور وفکر سے کام لیا ہو مگر اسے کامیابی نہ ہوئی ہو" اسی لیے وہ اپنے رنج اور مایوسی اور زندگی کی لذتوں کی طرف میلان رکھنے میں حق بجانب تھا۔ (1)

---

(1) (فی الادب الجاہلی) ڈاکٹر طہٰ حسین

حوالہجات :۔ (۱) طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی (اس نے طرفہ کے دو شعر ذکر کئے ہیں) صفحہ ۱۰۰-۱۱۰ ۔ (۲) الشعر والشعراء ۔ لابن قتیبہ ۔ (۳) البیان والتبیین للجاحظ جلد اول، دوم چہارم ۔ جاحظ نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں کہا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمرؓ کے سامنے طرفہ کا وہ شعر پڑھا جس میں کہتا ہے کہ :"فلولا ثلاث هن من عیشة الفتی۔ الخ تو آپ نے فرمایا کہ لولا أن أسیر فی سبیل الله ۔ وأضع جبهتی لله وأجالس أقواما ینتقون أطایب الحدیث الخ (صفحہ ۱۹۰ ج دوم) ۔ (۴) جمهرة اشعار العرب لابی زید محمد الخطاب القرشی ۔ (۵) المعلقات العشر وأخبار قائلیها لاحمد بن أمین الشنقیطی ۔ (۶) شرح المعلقات السبع للزوزنی ۔ (۷) دیوان طرفه ۔ (۸) تاریخ آداب اللغة العربیة ۔ جرجی زیدان جلد اول ۔ (۹) تاریخ الادب العربی ۔ احمد حسن الزیات ۔ (۱۰) الوسیط فی ادب العربی ۔ احمد الاسکندری ۔ (۱۱) المفصل فی تاریخ الادب العربی ۔ أحمد الاسکندری وغیرہ (۱۲) حدیث الأربعاء اول (۱۳) فی الأدب الجاهلی ۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین ۔ (۱۴) الوصف (سلسلة فنون الادب العربی) ۔ (۱۵) تطور الغزل بین الجاهلیة والاسلام ۔ الدکتور شکری فیصل (ڈاکٹر فیصل نے اپنی اس کتاب میں طرفہ بن العبد کے محبوبہ کے دیار پر وقوف ۔ محبوب کے سراپا اور وصف، کوچ اور سفر سے متعلق اشعار کا بڑا پر مغز اور جامع تجزیہ کیا ہے ۔ اور ساتھ ہی ان اصناف میں دوسروں کے ساتھ اس کا موازنہ بھی کیا ہے ۔ دیکھئے ۔ صفحہ ۲۱ - ۴۳ - ۱۳۳)

۷۔ عمرو بن کلثوم التغلبی

م ۵۲ قبل ہجرت ۵۷۰ء

عمرو نام۔ کنیت ابو الأسود۔ باپ کا نام کلثوم بن مالک تھا۔(۱) عمرو بن کلثوم قبیلہ تغلب کا شاعر، بہادر شہسوار اور نامور سردار تھا۔ اس کی طاقت اور عرب قبایل پر اس کی ہیبت اور رعب کا یہ عالم تھا کہ اسے "فَتَّاکُ العَرَب" یعنی شیر عرب" کہتے تھے۔ اس کا باپ بھی اپنی قوم کا سردار رہ چکا تھا اور قیادت و سیادت اور شان و شوکت میں ضرب المثل تھا۔ اسی طرح اس کی ماں لیلیٰ بھی بڑے باپ یعنی مُہَلہِل بن ربیعہ کی بیٹی اور کُلَیب وائل، عربوں میں سب سے معزز اور پرہیبت اور باوقار سردار کی بھتیجی اور کلثوم بن عتاب جیسے نامور شہسوار کی بیوی تھی۔ یہ وہی مہلہل ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے شاعری کی ابتدا کی تھی۔ غرض کہ عمرو بن کلثوم ماں اور باپ دونوں طرف سے عرب کے ممتاز مشہور طاقتور اور بااثر قبیلہ کا فرد تھا۔

قبیلۂ تغلب جزیرۂ عرب میں رہتا تھا۔ اور قبائل عرب میں اپنی طاقت و سطوت شان و شکوہ اور عزت و سیادت میں نہ صرف ممتاز و مشہور تھا بلکہ سارے قبایل پر اس کی اتنی دھاک جمی ہوئی تھی کہ لوگ کہتے تھے کہ "لو أبطأ الاسلام لأكلت بنو تغلب الناس" یعنی اگر اسلام آنے میں ذرا اور دیر کر دیتا تو بنو تغلب لوگوں کو ہڑپ کر جاتے۔(۲)

عمرو بن کلثوم نے اس شاہانہ اور شان و شکوہ کے ماحول میں پرورش پائی اور بہادری، اولوالعزمی، اور علم و فضل میں وہ کمال حاصل کیا کہ پندرہ برس کی عمر ہی میں قبیلہ کا سردار چن لیا گیا

---

(۱) پورا سلسلۂ نسب یوں ہے۔ عمرو بن کلثوم بن مالک بن عتاب بن سعد بن زہیر بن جشم بن بکر بن حبیب بن عمرو بن غنم بن تغلب بن وائل۔

(۲) یعنی سب پر چھا جاتے۔

عمرو نے مختلف جنگوں اور معرکوں میں اپنے قبیلہ کی قیادت کرکے، اپنی شجاعت ہمت اور سمجھ بوجھ کے سہارے مشکل ترین معرکوں کو سر کرکے اپنی اور اپنے قبیلہ کا سکہ سارے عرب میں بٹھا دیا۔ ان صفات کے ساتھ قدرت نے اسے ایسی قادر الکلامی اور ایسا ذہن رسا اور ایسی طبع موزوں عطا کی تھی کہ اپنے زمانہ کا نامور مقرر اور صرف ایک قصیدہ کی بدولت فخریہ شاعری کا امام بن کر چمکا۔

عمرو بن کلثوم کے اپنے قبیلہ تغلب اور اس کی دوسری شاخ بکر بن وائل کے درمیان مدتوں سے اس منحوس لڑائی کا سلسلہ چلا آرہا تھا جسے "حرب البسوس" کہتے ہیں۔(1) اس لڑائی میں دونوں طرف سے سینکڑوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ آخر میں حیرہ کے بادشاہ المنذر بن ماء السماء کی کوششوں سے دونوں قبیلوں میں صلح ہو گئی۔ المنذر نے دونوں قبیلوں میں سے کچھ غلام بطور ضمانت کے اپنے پاس رکھ لیے تھے کہ اگر کسی نے معاہدہ توڑا تو پہل کرنے والے قبیلے کے غلاموں کو مظلوم قبیلہ کو تاوان میں دے دیا جائے گا۔ المنذر بن ماء السماء کے بعد اس کا بیٹا عمرو بن ہند تخت پر بیٹھا اور اس نے بھی اپنے باپ کی ریت نباہی۔ ایک دفعہ عمرو بن ہند نے دونوں قبیلوں کے ان غلاموں کو کسی کام سے قبیلہ طئی کے پہاڑوں میں بھیجا۔ یہ غلام بنو شیبان کے — جو قبیلہ بکر کی ایک شاخ تھی۔ کنویں پر اترے اور انھوں نے مل کر بنو تغلب کے غلاموں کو بھگا دیا۔ یہ بیچارے صحرا میں پانی کے بغیر پیاسے مر گئے۔ اس خبر کا پھیلنا تھا کہ بنو تغلب میں آگ لگ گئی اور انھوں نے بکریوں سے خون بہا دینے کا مطالبہ کیا۔ اس پر بات بڑھ گئی اور معاملہ عمرو بن ہند کے سامنے پیش ہوا۔ چنانچہ بنو تغلب کی طرف سے عمرو بن کلثوم اور بنو بکر کی طرف سے ان کا مشہور شاعر الحارث بن حلزہ الیشکری نمائندہ بن کر گئے۔ اور دونوں نے اپنے اور اپنی قوم کے کارنامے گنا کر فخر کرنا شروع کیا۔ اس موقع پر الحارث بن حلزہ نے فی البدیہا پنا وہ فخریہ قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

آذنتنا ببينهــا اسمــاء　　　　رب ثاو يمل منه الثواء

یعنی اسماء نے اپنی جدائی کی خبر ہمیں سنا دی۔ بسا اوقات مقیم آدمی سے اقامت خود ہی اکتا جاتی ہے۔

جس میں اپنے اور اپنی قوم پر فخر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ الحارث بن حلزہ کے برص کے داغ تھے چنانچہ عمرو بن ہند

---

(1) حرب بسوس کے لیے ملاحظہ کیجیے اس کتاب کا صفحہ ۲۰۴

نے اسے دو رسات پردوں کے پیچھے بٹھادیا اور کہاکہ وہاں سے اپنا قصیدہ سناؤ۔ کیونکہ برص والے کو دیکھنا یا پاس بیٹھنے کو عرب مضر سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب حارث نے اپنا قصیدہ شروع کیا اور جوں جوں آگے بڑھتا گیا بادشاہ متاثر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ یکے بعد دیگرے پردے اٹھواتا گیا اور آخر میں قصیدہ اتنا پسند آیا کہ اس کو اپنے پاس بٹھالیا۔ اور جب پورا سن چکا تو اس کی ساری ہمدردیاں بکریوں کی طرف ہوگئیں۔ حالانکہ اس سے قبل وہ تغلبیوں کی طرف مائل رہتا تھا یہ بات عمرو بن کلثوم کو بہت بری لگی اور وہاں سے واپس آکر اس نے اپنا وہ شہرۂ آفاق معلقہ کہا جس کا مطلع ہے

أَلا هبى بصحنك فاصبحينا ولا تبقى خمور الأندرينا

اے محبوبہ اپنا جام شراب لے کر اٹھ اور صبح سویرے ہمیں شراب پلا اور اندرین کے بہترین شراب کو بچا کر مت رکھ۔

بعض تذکرہ نگاروں اور نقادوں کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا قصیدہ کی شان نزول یہ ہے کہ الحارث بن حلزہ کے واقعہ کے بعد عمرو بن کلثوم غصہ میں بھرا ہوا اپنے وطن واپس آیا ہے تو عمرو بن ہند نے اپنے ہمنشینوں سے پوچھا کہ عرب میں وہ کون شخص ہے جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنے سے انکار کر دے گی۔ درباریوں نے کہا کہ ہمیں اس کا تو علم نہیں البتہ عمرو بن کلثوم کی ماں لیلیٰ وہ عورت ضرور ہے جو آپ کی ماں کی خدمت کرنے سے صاف انکار کر دے گی۔ کیونکہ اس کا باپ مہلہل بن ربیعہ اور اس کا چچا کلیب وائل ہے جو عرب کی معزز ترین شخصیتیں تھیں پھر اس کا شوہر عرب کا مشہور شہسوار کلثوم بن عتاب تھا۔ اور اس کا بیٹا عمرو بن کلثوم ہے جو اپنی قوم کا سردار ہے۔[1]

چنانچہ عمرو بن ہند نے عمرو بن کلثوم کے پاس پیغام بھیجا کہ ایک دن میری ضیافت قبول کرو اور اپنی ماں کو میری ماں سے ملانے کے لیے ساتھ لاؤ۔ عمرو بن کلثوم نے حیرہ کے بادشاہ کی یہ دعوت قبول کر لی اور اپنا لاؤ لشکر لے کر اپنی ماں کی معیت میں ملنے کے لیے روانہ ہوا۔ ادھر عمرو بن ہند کو

1۔ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ "ولیلی بنت مہلہل ام عمرو بن کلثوم (وهی) بنت اخی فاطمہ بنت ربیعہ ام امری القیس" اور عمرو بن ہند کی ماں "ہند" کے بارے میں بیان کیا ہے کہ "وهند ام عمرو بن هند عمة امری القیس" (الشعر والشعراء صفحہ 118)

جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس کے اعزاز و اکرام کی خاطر حیرہ سے فرات تک زنانہ اور مردانہ
خیمے لگوا دیئے اور شاہانہ تکلف سے انھیں سجا دیا۔ اور اس کی پیشوائی کے لیے امراء رؤساء اور آس
پاس کے سرداروں اور شیوخ کو بھی جمع کر لیا۔ ادھر اپنی ماں سے کہہ دیا کہ اندر جب دسترخوان لگ جائے تو
نوکروں کو اشارہ سے ذرا دور ہٹا دینا اور پھر عمرو بن کلثوم کی ماں سے کسی کام کی فرمائش کرنا۔
چنانچہ جب عمرو بن کلثوم اپنے آدمیوں کی معیت میں اور اس کی ماں اپنے خواصوں کے ساتھ عمرو بن
ہند کے یہاں پہنچے ہیں تو اس نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور خود عمرو کو لے کر شاہی خیمہ میں لے گیا۔
اور اس کی ماں عمر کی ماں کو زنانہ خیمہ میں لے گئی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد دسترخوان چن دیا گیا۔
حسب پروگرام عین موقع پر سارے ملازمین غائب ہو گئے۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر عمرو بن ہند
کی ماں نے عمرو بن کلثوم کی ماں لیلا سے کہا کہ بہن ذرا وہ پلیٹ اٹھا دینا۔ لیلا نے کہا کہ جس کو ضرورت
ہے وہ خود ہی کیوں نہ لے لے۔ لیکن جب عمرو بن ہند کی ماں نے ذرا تیزی اور اصرار سے پلیٹ
اٹھانے کو کہا تو وہ برداشت نہ کر سکی اور زور سے چلائی۔ ہائے یہ ذلت . . . کہاں ہو اے
تغلبیو۔ یہ آواز جب عمرو بن کلثوم کے کان میں پڑی تو غصہ سے اس کا منہ لال ہو گیا۔ عمرو بن ہند
نے موقع کی نزاکتوں کو تاڑ لیا۔ لیکن جب تک وہ کچھ سوچ سکے عمرو بن کلثوم نے خیمہ میں ٹنگی عمرو بن
ہند کی تلوار اٹھا لی اور اسی سے اس کی گردن مار دی۔ اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ سب کچھ لوٹ
لو۔ چنانچہ ان لوگوں نے سارا قیمتی ساز و سامان لوٹ لیا اور خوشی کے شادیانے بجاتے اپنے جزیرہ کو
واپس آ گئے۔ وطن واپس آ کر عمرو بن کلثوم نے وہ قصیدہ کہا جو اس کے معلقہ کے نام سے مشہور ہے۔
جس کا مطلع اوپر بیان ہوا ــــ اس معلقہ میں اس نے عمرو بن ہند کے ساتھ اپنی بات چیت کا
ذکر کیا ہے۔ اس سے اپنے قبیلہ کی طرف سے بدگمان ہونے اور ذلیل سمجھنے کی وجہ پوچھی ہے۔ اور
اپنے قبیلہ کی جنگوں، ان کے کارناموں، اپنی بہادری، شجاعت اور اولوالعزمی کا ذکر کر کے بے انتہا
فخر کیا ہے۔ معلقہ کو مکمل کرنے کے بعد سوق عکاظ میں اس کو بڑے فخریہ انداز سے سنایا اور اس سال
حاصل شاعری سمجھا گیا۔ بنو تغلب نے اس قصیدے کو زبانی یاد کر لیا اور قومی ترانے کی طرح ہر گلی
کوچے میں اس کو گاتے پھرتے تھے۔ چنانچہ قبیلہ بکر کے ایک شاعر نے چڑھ کر اس کے متعلق یہ شعر کہہ ڈالے۔

الھی بنی تغلب عن جل أمرھم — قصیدة قالھا عمرو بن کلثوم

یفاخرون بھا مذ کان أولھم — یا للرجال لشعر غیر مسئوم

بنو تغلب کو عمرو بن کلثوم کے ایک قصیدہ نے اتنا مگن کر دیا ہے کہ اب وہ اپنے سارے کام کاج چھوڑ

اسی کے ہو کے رہ گئے ہیں (ہر وقت) اس قصیدے کی بدولت اب وہ اپنے پرکھوں پر فخر کرتے رہتے ہیں۔ ذرا لوگو دیکھنا اس شعر کو کہ جس سے جی ہی نہیں اکتاتا۔

معلقہ عمرو بن کلثوم

عمرو بن کلثوم دور جاہلی کے ان شعراء میں سے ہے جنہیں صرف ایک قصیدہ کی وجہ سے شہرت دوام حاصل ہو گئی۔ اس قصیدہ میں ۱۰۶ اشعار ہیں اور اس کا موضوع اپنے اور اپنے بزرگوں کے کارناموں پر فخر کرنا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ عمرو بن کلثوم کا یہ معلقہ درحقیقت دو مختلف زمانوں اور دو مختلف موقعوں پر کہا گیا ہے۔ اس کا ایک حصہ تو اس وقت کہا گیا ہے جب بنو تغلب اور بنو بکر عمرو بن ہند کے پاس غلاموں کے واقعہ کے بعد فیصلے کے لیے گئے ہیں۔ اور اس نے بظاہر بنو بکر کا ساتھ دیا ہے اور دوسرا حصہ اس واقعہ کی یادگار ہے جس میں عمرو بن ہند نے عمرو بن کلثوم کو ذلیل کرنے کے خیال سے اس کی ماں سے اپنی ماں کے ذریعہ کام کروانے کی ترکیب چلی تھی اور جس کے نتیجہ میں عمرو بن کلثوم نے اسے قتل کر دیا تھا۔

اس قصیدے کو اس نے دور جاہلی کے شعراء کی عادت اور رواج کے خلاف تشبیب کے بجائے ساغر و ساقی کے ذکر سے شروع کیا ہے۔ چنانچہ مطلع میں ساقی کو مخاطب کر کے جو اس کی محبوبہ بھی ہے کہتا ہے کہ اے ساقی گلفام صراحی اٹھا اور صبح کو اندرین کی بہترین شراب کے ساغر بھر بھر کے دے اور آج خست سے کام نہ لے۔ اس کے بعد اس شراب کی خوبیوں کا ذکر کرتا ہے کہ وہ اتنی تیز ہے کہ جب پانی ملایا جاتا ہے تو گرم ہو جاتی ہے اور اتنے مزے کی ہے کہ کنجوس مکھی چوس بھی اس کی خاطر اپنا مال بے دریغ خرچ کر دیتا ہے اور ایسی تیز کہ بڑے بڑے دل پھینک سخت خو لوگ بھی صرف اس کو چکھ کر ہی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ شراب و ساقی کے ذکر کے بعد غزل کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے کہ اے محبوبہ جدا ہونے سے پہلے ذرا ٹھہرنا ہم تمہیں یقینی بات بتا دیں اور تم ہمیں۔

قفی قبل التفرق یا ظعینا　　　نخبرک الیقین و تخبرینا

اس کے بعد اپنی محبوبہ کا سراپا اس طرح کھینچتا ہے کہ اس کے انگ انگ کی تصویر اتار کر رکھ دیتا ہے۔ اور محاسن جسمانی کی تشبیہ دینے میں نازک خیالی کے ساتھ بڑی حقیقت بینی سے کام لیتا ہے۔ اس کے بعد معلقہ کے اصل موضوع یعنی فخر کی طرف آتا ہے۔

معلقہ کے فخریہ حصہ کو غور سے پڑھا جائے تو صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ دو مختلف موقعوں پر کہا گیا ہے۔ چنانچہ شروع کا حصہ صاف بتاتا ہے کہ یہ عمرو بن ہند کے دربار میں الحارث بن حلزہ اور عمرو بن کلثوم کے درمیان منافرت کے بعد کی یادگار ہے۔ چنانچہ عمرو بن ہند کو مخاطب

کر کے کہتا ہے کہ۔

أبا هند فلا تعجل علینا — وانظرنا نخبرك الیقینا
بأنا نورد الرأیات بیضا — ونصدرهن حمرا قد روینا

یعنی اے ابو ہند ذرا دھیرج دھرو۔ جلد بازی سے کام نہ لو۔ ہمیں تھوڑی دیر مہلت دو تو ہم تمہیں صحیح بات بتادیں کہ ہم اپنے جھنڈوں کو جب میدان جنگ میں لے جاتے ہیں۔ تو وہ سفید ہوتے ہیں لیکن جب وہاں سے واپس لاتے ہیں تو وہ دشمنوں کے خون سے سیراب ہو کر لال ہوتے ہیں۔

اس کے بعد اپنے بزرگوں کے کارناموں اور جنگوں میں ان کی بہادری اور شجاعت اور بادشاہوں سے بھی نبرد آزمائی کرنے کے واقعات کو گنتا ہے پھر اپنے قبیلہ کی جود و سخا اور مہمان نوازی اور اپنی طاقت و سطوت کا بڑی تعلی سے اظہار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قبیلہ معد جانتا ہے کہ ہمیں یہ عزت و شرف اپنے پرکھوں سے ورثہ میں ملا ہے۔ اور اس کی خاطر ہم اپنے دشمنوں سے جنگ کرتے ہیں یہانتک کہ یہ عزت و شرف کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

ورثنا المجد قد علمت معد — نطاعن دونه حتی یبینا

پھر اپنے قبیلے کی قتل و غارت گری کی شدت کو بیان کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ خبردار اگر کسی نے ہم سے جہالت برتی تو ہم اس سے بھی بڑھ کر جہالت برتیں گے۔

ألا لا یجهلن أحد علینا — فنجهل فوق جهل الجاهلینا

اس کے بعد معلقہ کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصہ کا سیاق و سباق بتاتا ہے کہ اسے اس نے عمرو بن ہند کو قتل کرنے کے بعد کہا ہے۔

بأی مشیئة عمرو بن هند — تطیع بنا الوشاة وتزدرینا
بأی مشیئة عمرو بن هند — نکون لقیلکم فیها قطینا
تهددنا وتوعدنا رویدا — متی کنا لأمك مقتوینا
فإن قناتنا یا عمرو أعیت — علی الأعداء قبلك أن تلینا

یعنی آخر ہم نے وہ کون سا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے اے عمرو بن ہند تم چغل خوروں کی بات مان کر ہمیں ذلیل و خوار سمجھتے ہو۔ پھر ہم کس گناہ کی پاداش میں تمہارے ماتحت سرداروں کی چاکری کرتے رہا کریں۔ بلا وجہ ہمیں ڈراتے دھمکاتے ہو۔ ذرا نرمی سے کام لو۔ ہم کب تمہاری ماں کے نوکر رہے

ہیں۔ اے عمرو ہمارے نیزے اتنے مضبوط ہیں کہ تم سے قبل جو ہمارے دشمن تھے ان کے سامنے بھی وہ نرم نہ پڑے۔ (عرب نیزوں سے عزت مراد لیتے تھے) یعنی تم سے پہلے ہمارے کتنے دشمن گزرے ہیں جو ہمیں بے عزت نہ کرسکے تو تمہاری کیا حیثیت ہے۔

اس کے بعد اپنے آباد اجداد پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ علقمہ بن سیف، مہلہل اور زہیر، عتاب، کلثوم، کلیب وائل جیسے اولوالعزم شریف بہادر سرداروں کے ہم وارث ہیں۔ ہمارا مقابلہ کون کرسکتا ہے؟

ونحن غداة أوقد في خزاز　　رفدنا فوق رفد الرافدينا

وكنا الأيمنين إذا التقينا　　وكان الأيسرين بنو أبينا

فصالوا صولة فيمن يليهم　　وصلنا صولة فيمن يلينا

فآبوا بالنهاب وبالسبايا　　وابنا بالملوك مصفدينا

یعنی جب بنی نزار اور یمنیوں میں جنگ برپا ہوئی تو ہم نے بنی نزار کی دل وجان سے مدد کی اور جب دشمنوں کے مقابلہ میں ہم نکلے، تو میمنہ ہم نے سنبھالا اور ہمارے بھائی (یعنی بنو بکر) نے میسرہ سنبھالا تو وہ لوگ اپنے سے قریب غنیم پر حملہ آور ہوئے اور ہم اپنے سے قریب دشمن پر۔ وہ لوگ یعنی بنو بکر مال غنیمت اور لونڈیاں لے کر واپس آئے اور ہم بادشاہوں کو قید کر کے پابجولاں لائے ۔۔۔ اس کے بعد اپنے بھائیوں بنو بکر سے مخاطب ہو کر ان سے کہتا ہے کہ ہم سے خواہ مخواہ مت جھگڑو۔ تم تو ہماری بہادری اور جنگی کارناموں کو اچھی طرح سے جانتے ہو۔ پھر اپنی عورتوں کی بہادری، عفت اور حسن وجمال کی تعریف کرتا ہے۔ اور آخر میں فخر اور اپنی قوم کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتا ہے کہتا ہے کہ ہماری تعداد تو اتنی ہے کہ زمین میں ہمارے آدمی نہیں سما پاتے اور سمندروں میں ہمارے جہاز نہیں آپاتے۔ یہی نہیں بلکہ دنیا اور اس میں بسنے والے سب ہمارے مطیع اور فرماں بردار ہیں۔ اور جس پر جس وقت چاہتے ہیں ہم اپنا ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ اور آخری شعر میں تو فخر کی انتہا کر دی ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارے رعب ودبدبہ اور ہیبت کا یہ عالم ہے کہ ہمارے بچے جب ماں کا دودھ چھوڑتے ہیں تو اسی عمر سے ان کے سامنے بڑے بڑے جابر اور سرکش سبھی لوگ سجدے کرنے لگتے ہیں۔

ملأنا البر حتى ضاق عنا　　وماء البحر نملأه سفينا

لنا الدنيا ومن أمسى عليها　　ونبطش حين نبطش قادرينا

إذا بلغ الفطام لنا صبيٌّ　　　تخرّ له الجبابر ساجدينا

خصوصیات کلام

عمرو بن کلثوم۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ بسیار گو شاعروں میں سے نہیں ہے۔ اگرچہ راویوں نے اس کی طرف اس معلقہ کے علاوہ کچھ اور اشعار بھی منسوب کئے ہیں لیکن فن شاعری میں شہرت اور قادر الکلامی میں ناموری اور عزت اس کو صرف اس کے اس معلقہ سے ملی ہے۔ اس کے معلقہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عمرو بن کلثوم کو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب الفاظ کو انتخاب کر کے اس طرح نظم کرنے میں ملکہ تامہ حاصل تھا کہ معنی صاف اور واضح طریقہ سے ذہن میں آجائیں۔ اسلوب بیان بڑا پیارا اور طرز ادا بڑا دلنشیں اور موثر ہے۔ جہاں تک فخر، اپنی ادا، اپنی قوم کی تعریف اور ران پر ناز کرنے کا سوال ہے تو اس میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ ایسے موقعوں پر عام طور سے بڑے مبالغہ سے کام لیتا ہے اور زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ لیکن اندازِ اتنا دلکش ہوتا ہے اور کلام میں اتنی سلاست اور روانی ہوتی ہے کہ طبیعت پر نہ بار ہوتا ہے اور نہ ذوق پر گراں گذرتا ہے۔

اپنی قوم کی تعریف میں مندرجہ ذیل اشعار بھی عمرو بن کلثوم سے منسوب کئے جاتے ہیں۔[1]

معاذ الإله أن تنوح نساؤنا　　　على هالك أو أن نضج من القتل

قراع السيوف بالسيوف أحلنا　　　بأرض براح ذي إراك وذي أثل

فما أبقت الأيام مِلْمال[2] عندنا　　　سوى جِذْم أذواد محذّقة النسل

یعنی نہ ہماری عورتیں کسی مرنے والے کا نوحہ کرتی ہیں اور نہ ہم قتل کے خیال سے روتے دھوتے ہیں مستقل تلوار بازی کرتے رہنے کی وجہ سے ہمیں سنسان اور چٹیل زمینوں میں جہاں صرف اراک اور اثل کے درخت اگتے ہیں رہنا پڑتا ہے اور ہمارے پاس مال میں صرف چند اونٹ رہ گئے ہیں جن کے بڑھنے کی بھی امید نہیں رہ گئی ہے۔

ابو حجر الغسانی کو دھمکی دیتے ہوئے یوں کہتا ہے:

ألا فاعلم أبيت اللعن إنا　　　على عمد سنأتي ما نريد

تعلم أن محملنا ثقيل　　　وأن زياد كبتنا شديد

وإنا ليس حي من معد　　　يوازننا إذا لبس الحديد

---

1. حماسہ۔ ابو تمام صفحہ ۶۶۔ مطبوعہ قاسمی دیوبند۔ 2۔ ملمال یعنی من المال

یعنی تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہم جو کرنا چاہتے ہیں کر گزریں گے ، اور یہ بھی جان لو کہ ہماری سواریاں بہت بھاری ہیں اور یہ کہ ہماری جماعت کی مدافعت کرنا آسان نہیں ہے اور جب ہم ہتیاروں سے لیس ہو کر تیار ہو جائیں تو پھر معد کا کوئی قبیلہ بھی ہم سے ہمسری کا دعوی نہیں کر سکتا۔

کہتے ہیں کہ عمرو بن کلثوم نے بڑی لمبی عمر پائی اور ڈیڑھ سو سال کی عمر میں وفات پائی۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ " یا بنی قد بلغت من العمر مالم یبلغه أحد من آبائی۔ ولابد لی أن ینزل بی ما نزل بهم من الموت۔ الخ۔" یعنی اے میرے بیٹو۔ میری عمر اتنی لمبی ہوئی کہ میرے آبا و اجداد میں سے کسی کو اتنی نہ ملی۔ اور یہ ضرور ہے کہ جس طرح وہ موت سے نہ بچ سکے میں بھی نہ بچوں ...... " (1) اس کے بعد انھیں چند بہت ہی قیمتی اور مفید نصیحتیں کی ہیں جو خوشگوار اور بے داغ زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہیں۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک بات کی طرف اشارہ کر دیا جائے وہ یہ کہ بعض اہل نظر نقادوں نے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے کہ دیگر جاہلی شعراء کے کلام کی طرح عمرو بن کلثوم کے کلام میں بھی بہت زیادہ من گھڑت اور وضع کردہ اشعار بڑھا دیئے گئے ہیں۔ عمرو بن کلثوم کے مذکورہ معلقہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات کم از کم اس کے کلام کی حد تک قطعی طور پر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ معلقہ کا مطالعہ کرنے والا جسے ذرا سا بھی جاہلی شاعری، اس کے اسلوب بیان۔ اس کے الفاظ اور اس کی تراکیب استعمال کا اندازہ اور علم ہے خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے، کیونکہ بقول طہ حسین " اس کے اس قصیدے میں ایسے آسان اور ہلکے پھلکے الفاظ ہیں کہ ہمارے زمانہ میں اگر کسی کو تھوڑا بہت بھی عربی زبان کا علم ہے، اسے سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی مگر عرب تو چھٹی صدی عیسوی کے نصف اور اسلام کے ظاہر ہونے سے تقریباً نصف صدی پہلے تک ایسی زبان ہرگز نہیں بولتے تھے۔ اسی طرح (قبیلہ) ربیعہ بھی۔ اور خاص طور سے اس زمانہ میں جبکہ (قبیلہ) مضر کی زبان کو سیادت ابھی حاصل نہیں ہوئی تھی اور نہ وہ شعر کی زبان بن سکی تھی (معلقہ جیسی) زبان بولتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ الاخطل التغلبی بھی (اموی دور کا شہرہ آفاق شاعر) جو اموی دور میں گزرا ہے یعنی عمرو بن کلثوم کے تقریباً ایک صدی بعد، یہ زبان نہ بولتا تھا" واقعی عمرو کے اس معلقہ میں بعض حصے ایسے ہیں

1۔ پوری تفصیل کے لیے دیکھئے۔ المعلقات العشر و اخبار قائلیہا۔ احمد بن الامین الشنقیطی۔ الطبعة الثانیة مطبوعہ مصر۔ سنہ 1331ھ

جو کسی طرح بھی جاہلی شاعری کے انداز بیان پر نہیں ہیں وہ اتنے آسان، اتنے سیدھے سادے اور بعض جگہ اتنے رکیک اور بعض جگہ اس قدر مبالغہ آمیز ہیں کہ جاہلی شاعری کا ذوق انہیں ہرگز قبول نہیں کرتا۔ ایسے حصوں میں خاص طور سے یہ حصے قابل ذکر ہیں۔

ونحن التارکون لما سخطنا　　ونحن الآخذون لما رضینا

سے لے کر بعد کے چار پانچ شعر۔ اسی طرح اس حصہ میں یہ اشعار:

وقد علم القبائل من معد　　إذا قبب بأبطحها بنینا

سے۔ ونشرب إن وردنا الماء صفواً　　ویشرب غیرنا کدرا وطینا

تک۔ اور یہ حصہ ——

إذا ما الملك سام الناس خسفاً　　أبینا أن نقر الذل فینا

سے معلقہ کے آخری شعر یعنی۔

إذا بلغ الفطام لنا صبي　　تخر له الجبابر ساجدینا　　تک۔

معلقہ عمرو بن کلثوم کے ان ٹکڑوں کو پڑھ کر واقعی یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ اس زمانے کے اشعار نہیں ہو سکتے۔ جس زمانہ میں بھاری بھر کم موٹے اور ثقیل الفاظ استعمال کرنے کا رواج تھا۔ ان کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جاہلی دور کے نہیں بلکہ اسلامی دور کے کسی بہت ہی معمولی شاعر نے کہے ہیں اور اس کے نام سے منسوب کر دیئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جاہلی شعرا کے کلام میں حشو و زیادتی کا عمل ہوا ہے۔ بعض موقعوں پر سیاسی قبائلی اور معاشرتی اغراض کے ماتحت اور بعض موقعوں پر محض تفنن طبع اور قدرت زبان و بیان دکھانے کی خاطر ایسے اشعار کی گہرے مطالعہ اور تحقیق و جستجو کرنے کے بعد نشاندہی کی جاسکتی ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان شعرا کے کلام میں اسلامی دور میں بہت کچھ بڑھایا گیا ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

حوالہ جات —— ۱۔ الأغانی ج۔ ۱۹　　۲۔ طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی: اس نے عمرو کو شعرائے جاہلیہ کے چھٹے طبقہ میں شمار کیا ہے اور اس کے معلقہ کا صرف پہلا شعر نقل کیا ہے۔ صفحہ ۱۲۷۔

۳۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔

۴۔ جمهرة أشعار العرب: ابو زید محمد القرشی۔ محمد القرشی نے جمہرہ میں بروایت ابو عمرو بن العلا لکھا ہے کہ

بقیہ حاشیہ

عمرو بن کلثوم نے عمرو بن ہند کے دربار میں اپنا یہ شعر پڑھا۔

وإني لأمضي الهم عند احتضاره   بناج عليه الصيعرية مكدم

تو طرفہ نے کہا کہ۔ "اونٹ کو اونٹنی بنا دیا" حالانکہ یہ شعر " المسیب بن العلس " کا ہے عمرو کا نہیں کیونکہ صحیح معنوں میں طرفہ کا ہمعصر مسیب تھا عمرو بن کلثوم نہیں ۔ طرفہ عمرو بن کلثوم سے ۲۰ سال پہلے ہی مر چکا تھا اور اگرچہ زندگی کا ایک حصہ میں دونوں معاصر رہے لیکن کسی جگہ ایک ساتھ رہنے یا کسی موقع پر ایک ساتھ ہونے کا ذکر کسی تذکرہ نگار نے نہیں کیا ہے اور نہ ہی کسی نے مذکورہ شعر کو اس سے منسوب کیا ہے اس لیے جمہرہ کی مذکورہ روایت قابل اعتبار نہیں ہے۔ مزید تفصیل کے لیے طرفہ کے حالات ملاحظہ کیجیے۔

۵- المعلقات العشر واخبار قائليها۔ احمد بن الامين الشنقيطي۔

۶- شرح المعلقات السبع للزوزني تحقيق علی حمد اللہ مطبوعہ دمشق

۷- تطور الغزل بين الجاهلية والإسلام۔ دکتور شکری فیصل۔

۸- تاریخ آداب اللغة العربية ۔ جرجی زیدان ۔ جلد اول۔

۹- فی الأدب الجاهلی۔ ڈاکٹر طہ حسین ۔

۱۰- دیوان الحماسه ۔ ابو تمام

۱۱ تاریخ الأدب العربی۔ احمد حسن الزیات۔

۸۔ الحارث بن حِلِّزَہ الیَشکُری

م۔ ۵۲ قبل ہجرت ۔ ۶۵۶۰/۶۵۴۰ء (۱)

نام الحارث اور کنیت ابو ظُلَیم تھی۔(۱) حلزہ قبیلہ بکر کا شاعر تھا۔ اس کو بھی اصحاب معلقات میں شمار کیا جاتا ہے۔۔ اس نے بھی عمرو بن کلثوم اور طرفہ بن العبد کی طرح صرف ایک قصیدہ کی بدولت شہرت دوام حاصل کی۔ فی البدیہہ شعر کہنے اور فخر و حماسہ کے مضامین میں ممتاز شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اپنے قبیلہ بکر بن وائل میں اس کی وہی حیثیت تھی جو عمرو بن کلثوم کو قبیلہ تغلب میں حاصل تھی۔ معلقہ کے علاوہ اس کی طرف دوسرے بہت سے اشعار بھی منسوب کیے جاتے ہیں۔

معلقہ کہنے کا سبب

جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے بنو بکر اور بنو تغلب آپس میں بھائی بھائی تھے لیکن ان کے درمیان عرصہ سے دشمنی چلی آرہی تھی۔ اور اس کی وجہ سے دونوں قبیلوں میں اس منحوس لڑائی کا سلسلہ جاری تھا جسے "حرب البسوس" کہتے ہیں۔ حیرہ کے بادشاہ عمرو بن ہند کے باپ المنذر بن ماء السماء نے بڑی مشکل سے ان دونوں قبیلوں میں صلح کرائی تھی۔ اور ہر قبیلہ سے سو سو غلام بطور ضمانت کے لیے تھے۔ کہ اگر کسی قبیلہ نے ظلم و زیادتی کی تو مظلوم قبیلہ کو ظالم قبیلہ کے غلام دے دیئے جائیں گے۔ منذر کا بیٹا عمرو بن ہند جب تخت پر بیٹھا تو اس نے بھی باپ کے عہد و پیمان کو برقرار رکھا۔ یہ ضمانتی غلام عمرو بن ہند

---

(۱) سن وفات میں بہت اختلاف ہے۔ ۵۴۰ء سے لیکر ۵۸۰ء تک کی تاریخیں آتی ہیں۔

حِلِّزَة : ح مہملہ زیر کے ساتھ۔ اور "ل" مشددہ کے نیچے بھی زیر۔ لغوی معنی ایک کیڑا۔ اُلو کو بھی کہتے ہیں۔ مذکر بغیر "ۃ" کے آتا ہے۔ مثل ہے۔ امرأۃ حلزۃ یعنی پستہ قد عورت۔ رجل حلز۔ بد اخلاق آدمی۔ پورا سلسلۂ نسب یوں ہے: الحارث بن حلزہ بن مکروہ بن یزید بن عبداللہ بن مالک بن عبد بن سعد بن جشم بن عاصم بن ذبیان بن کنانہ بن یشکر بن بکر بن وائل۔

کے کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ عمرو نے ان غلاموں کو ایک مہم پر روانہ کیا۔ بنوشیبان کے ایک کنویں پر پہنچ کر تغلبی غلاموں کو بکری غلاموں نے مار بھگایا۔ بیچارے بھوک، پیاس اور لوسے صحرا میں مرگئے اور بکر کے غلام بچے رہے۔ اس پر تغلبیوں کو شبہ ہوا کہ بکریوں نے جان بوجھ کر ہمارے غلاموں کو ایسی جگہ ڈھکیل دیا کہ جہاں پانی نہ ملے اور یہ پیاسے مر جائیں۔ چنانچہ انھوں نے ان غلاموں کا خون بہا مانگا جسے دینے سے بکریوں نے انکار کردیا۔ معاملہ عمرو بن ہند تک گیا۔ اس مقدمہ میں تغلبیوں کا وکیل عمرو بن کلثوم اور بکریوں کا النعمان بن ہرم تھا جو بنو ثعلبہ بن (غنم) بن یشکر کا فرد تھا۔ بادشاہ کے سامنے جب مقدمہ پیش ہوا تو اس میں النعمان بن ہرم نے کچھ جملے تہذیب سے گرے ہوئے کہہ دیئے۔ جن کی وجہ سے عمرو بن ہند بہت خفا ہوا۔ وہ پہلے ہی سے بنو تغلب کی طرف مائل تھا۔ نعمان کی اس بدتمیزی نے معاملہ اور بھی خراب کردیا۔ اور اب اس کا پورا خطرہ تھا کہ فیصلہ بنو تغلب کے حق میں ہو جائیگا۔ اتنے میں الحارث بن حلزہ جو اس موقعہ پر دربار میں موجود تھا کھڑا ہوا اور اس نے فی البدیہہ اپنا مشہور معلقہ کہنا شروع کیا جس کا مطلع ہے:

آذنتنا ببینها أسماء　　　　رب ثاو یمل منه الثواء

جس میں اپنی اور اپنے قوم کی تعریف و توصیف اور ان کے کارناموں پر فخر کیا ہے اور عمرو بن ہند کی تعریف کے ساتھ عمرو بن کلثوم کے دعووں کو بھی جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اغانی نے ابن الکلبی سے روایت کی ہے کہ الحارث بن حلزہ کے جسم پر برص کے داغ تھے اس لیے جب وہ پڑھنے کھڑا ہوا تو عمرو بن ہند نے اپنے سامنے (سات) پردے ڈلوا دیئے کیوں کہ وہ اس قسم کے بیماروں کو عربوں کی ریت کے مطابق دیکھنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ جب الحارث نے اپنا معلقہ پڑھنا شروع کیا تو عمرو بن ہند اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ایک ایک کرکے ساتوں پردے اٹھوا دیئے اور اس کو اپنے پاس بلا کر اپنے برابر بٹھالیا۔ اور جب وہ معلقہ ختم کرچکا تو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ اور اس کی بڑی آؤ بھگت کی[1] عمرو بن ہند کے اس رویے سے عمرو بن کلثوم کے دل میں آگ لگ گئی اور وہ غصہ میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور اپنے معلقہ کا وہ حصہ کہا جس کی طرف اس کے تذکرہ میں اشارا کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ الحارث نے جس وقت یہ قصیدہ کہا ہے وہ بہت بوڑھا تھا اور بقول اصمعی

۱۔ اس قصہ کے سلسلہ میں اس کتاب کے صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ کیجئے۔

کے اس وقت اس کی عمر ۱۳۵ سال کی ہو چکی تھی۔ بہر حال الحارث کے اس قصیدہ سے سارے عرب میں بکریوں کی دھوم مچ گئی اور ایک زمانے تک تغلبی دبے رہے۔ لیکن جب عمرو بن کلثوم نے اپنا مشہور معلقہ کہا تو دونوں کا پلڑا تقریباً برابر ہو گیا۔ اگر چہ بعض رواۃ کا خیال ہے کہ فخر میں مبالغہ کی وجہ سے عمرو بن کلثوم کے معلقہ کا جو اثر ہوا وہ الحارث کے معلقہ کا نہیں ہو سکا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عمرو بن کلثوم نے اپنے معلقہ میں اپنی اور اپنے قبیلہ کی تعریف اور ان کے کارناموں پر فخر کرنے میں اتنا مبالغہ برتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے مقابلہ میں الحارث نے اپنے معلقہ میں اپنی بزرگی، اپنی بڑائی، وقار اور حلم کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ اس نے عمرو بن کلثوم کا جواب بڑے متین اور سنجیدہ انداز میں دیا ہے۔ چبھتی ہوئی بات بھی بہت شیریں انداز میں کہی ہے۔ قبیلہ تغلب کے برے کاموں اور ان کی بری عادتوں کا ذکر پورے اخلاقی دائرہ میں رہ کر کرنے کے بعد بادشاہ کی تعریف شروع کی ہے اور بڑی چالاکی سے بادشاہ کو غیر شعوری طور پر اپنے قبیلہ کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں پوری طرح کامیاب ہوا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں بادشاہ نے تغلبیوں کے خلاف بکریوں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

کلام کی خصوصیات

الحارث نے بھی جاہلی شعرا کے دستور کے مطابق اپنا معلقہ تشبیب سے شروع کیا ہے اور آگے چل کر بنو تغلب کی برائیاں گنانے کے سلسلہ میں بہت سے ایام عرب اور دور جاہلیت کے بہت سے واقعات کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس اعتبار سے اس کا معلقہ ان واقعات اور جنگوں کی ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ نقادوں کا اتفاق ہے کہ الحارث کا یہ معلقہ فنی نقطۂ نظر سے بندش کی چستی، پیرایہ بیان کی صفائی، اغراض و معانی کی وضاحت اور متعدد فنون پر مشتمل ہونے کی وجہ سے "منفرد قصیدوں" میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اور الحارث کی قادر الکلامی اور موزونی طبع کا لوہا اس لیے بھی مانا جاتا ہے کہ اس نے یہ معلقہ ایک مجلس میں فی البدیہہ اور ارتجالاً کہا ہے۔ جس کی مثال دور جاہلیت میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اس قصیدے میں فخر کا جو حصہ ہے وہ رواۃ کے قول کے مطابق اتنا اونچا ہے کہ جس کی وجہ سے فخر میں حارث ضرب المثل بن گیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ "افخر من الحارث بن حلزہ" یعنی الحارث سے بڑھ کر کوئی فخر گو نہیں ہو سکتا۔

الحارث کے اس معلقہ میں زوزنی کی روایت کے مطابق ۸۲ شعر ہیں۔ معلقات کے بعض مجموعوں میں ۸۵ اشعار تک نقل کیے گئے ہیں۔ معلقہ کا مطلع ہے:

آذنتنا ببینھا اسماء رب ثاؤ یمل منه الثواء

یعنی اسماء نے ہمیں اپنے جدا ہونے کی ارادہ کی اطلاع کرا دی ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پاس ٹھہرے ہوئے آدمی سے طبیعت اکتا جاتی ہے لیکن اسماء ان لوگوں میں سے نہیں ہے۔

اس کے بعد ذکر کرتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ کن کن جگہوں میں رہا ہے اور حسن و عشق کے کتنے حسین لمحات اس کے ساتھ گزارے ہیں۔ اور اب جبکہ فراق کی گھڑی آگئی ہے تو میں بھی اپنی تیز گام اونٹنی پر بیٹھ کر غم غلط کرنے کے لیے صحرا و بیاباں میں نکل جاؤں گا۔ اس اونٹنی کی چال اس تیز رو مادہ شتر مرغ کی سی ہے جس کے چھوٹے چھوٹے بچے گھونسلے میں اکیلے ہیں۔ یہ چگتے چگتے دور نکل آئی ہے اور اس کو یک بیک شکاری دکھائی دے پڑے ہیں۔ ادھر شام کا وقت قریب ہے۔ اس لیے وہ بہت تیزی سے اپنے بچوں کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔ ایسی ہی تیزی سے میری اونٹنی بھی دوڑ لی تی ہے۔

اس کے بعد جاہلی شعرا کی ریت کے مطابق اپنی اونٹنی کا وصف بیان کرنا شروع کرتا ہے:
غزل اور ناقہ کی تعریف کے بعد ۱۵ ویں شعر سے تغلب اور بنو بکر کے دعوی کا ذکر شروع کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارے پاس ایسی خبریں اور ایسے قصے پہنچے ہیں جن کو سن کر ہم کو بہت دکھ اور رنج ہوا ہے۔ ان سے پتہ چلا کہ بنو اُراقم نے جو تغلب کی ایک شاخ ہے ہمارے قبیلہ کے لوگوں پر بڑی زیادتی کی ہے اور ہمارے خلاف بہت بری اور تکلیف دہ باتیں کہی ہیں اور اپنی اس تہمت تراشی میں بے گناہوں کو بھی لپیٹے ہوئے ہیں۔

أتانا من الحوادث والأنباء خطب نعنی به و نساء

إن إخواننا الأراقم یغلو ن علینا فی قیلھم إحفاء

یخلطون البریئ منا بذی الذنـ ب ولا ینفع الخلی الخلاء

اس کے بعد عمرو بن کلثوم کو جواب دیتا ہے اور اسی ضمن میں اس کا اظہار کرتا ہے کہ جس بادشاہ سے تم ہماری برائی کرتے ہو وہ کان کا کچا نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے کہا اس کو بغیر سوچے سمجھے مان کر ہمیں ذلیل و خوار سمجھنے لگے گا۔ بلکہ وہ ان الزاموں کی تحقیق کرے گا اور جب وہ جھوٹے ثابت ہونگے تو سوچو کہ کیا انجام ہوگا؟ اس کے بعد اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ تم سے پہلے لوگوں نے بھی ہماری اس طرح شکایتیں کی تھیں لیکن اس سے ہمارا کچھ نہ بگڑا بلکہ ہماری عزت اور وقعت حسب سابق بدستور قائم رہی۔

ايها الناطق المرقش عنا	عند عمرو وهل لذاك بقاء
لا تخلنا على غراتك إنا	قبل ما قد وشى بنا الأعداء
فبقينا على الشناءة تنميـ	ـنا حصون وعزة قعساء

پھر عمرو بن ہند۔ شاہ حیرہ کی تعریف شروع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم نے اپنے شاندار کارناموں اور بہادری و شجاعت کی وجہ سے لوگوں پر حکومت کی یہاں تک کہ المنذر بن ماء السماء بادشاہ ہوئے۔ یہ ایسے بادشاہ تھے کہ انھوں نے ساری مخلوق کو تابع فرمان کر لیا تھا اور عزت و فضل اور کمال میں اتنی ترقی کی کہ ان جیسا صاحب کمال و فضل پھر لوگوں میں پیدا نہ ہو سکا۔

فملكنا بذالك الناس حتى	ملك المنذر بن ماء السماء[1]
يملك اضرع البرية لا يو	جد فيها لما لديه كفاء

اس کے بعد اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ ہم بکریوں نے ملوک حیرہ کی مصیبت کے وقت ساتھ دیا تھا اور تم تغلبیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور اس طرح غیر شعوری طور پر بڑی چابکدستی سے عمرو بن ہند کے دل میں پرانی کدورت کو جگانے میں کامیاب ہو گیا۔ کہتا ہے کہ ہم نے تین موقعوں پر اس کی مدد کی ہے۔ اور پھر ان موقعوں کو ۴۹ ویں شعر سے گناتا ہے۔

ايها الناطق المبلغ عنا	عند عمرو وهل لذاك إنتهاء
ملك مقسط وأفضل من يمـ	ـشي ومن دون ماالديه الثناء
من لنا عنده من الخير آيا	ت ثلاث في كلهن القضاء

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے الحارث کے اس معلقہ کی ایک تاریخی قیمت یہ ہے کہ اس میں عربوں کی بعض جنگوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جن سے ان کی واقعیت اور صحت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے ایک جگہ وہ ہے جہاں پر عمرو بن ہند کے باپ نے بنو بکر اور بنو تغلب کو جمع کر کے ان میں صلح کرائی تھی۔ اور ان سے ضمانت میں غلام لیے تھے۔ اس جگہ کا نام ذی المجاز ہے۔

واذكروا حلف ذى المجاز وما قد	م فيه العهود والكفلاء
حذر الجور والتعدى وهل ينقض	ما فى المهارق الأهواء

فخر و مباہات اور وصف کے علاوہ اس معلقہ میں قبیلہ کے سفر کی تیاری کا جو نقشہ

۱۔ زوزنی نے اس شعر کو نہیں نقل کیا ہے۔

کھینچا ہے وہ دوسرے شاعروں کے یہاں بہت کم ملتا ہے۔ رات کو سفر کی بات طے ہوئی۔ صبح ہوتے ہوتے تیاری کا شور وغل برپا ہوگیا۔ کوئی کسی کو پکار رہا ہے۔ کہیں گھوڑے منہنا رہے ہیں۔ اور انہیں کے درمیان کہیں اونٹ بلبلا رہے ہیں:

اجمعوا امرهم عشاء فلما　　اصبحوا اصبحت لهم ضوضاء

من مناد ومن مجيب ومن تصهال　　خيل خلال ذالك رغاء

المفضل (محمد بن الضبی) نے الحارث بن حلزہ کے دو مزید قصیدوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک کا مطلع ہے۔

لمن الديار عفون بالحبس　　آياتها كمهارق الفرس

یعنی "حبس" (جگہ کا نام) میں وہ گھر کس کے ہیں جو اب مٹ چکے ہیں۔ لیکن ان کی نشانیاں ابھی تک اسی طرح چمک رہی ہیں جیسے کہ ایرانیوں کے دبیز کاغذ پر تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔

یہ قصیدہ الحارث نے قیس بن شراحیل بن ہمام بن ذہل بن شیبان کی شان میں کہا تھا۔ اس میں ۱۴ شعر ہیں۔ مطلع سے لے کر تیسرے شعر تک جاہلی شعرا کی عادت کے مطابق "حبس" میں اپنی محبوبہ کی نگری کی ویرانی اور بربادی کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اب یہاں بجائے میرے محبوب دلنواز کے نیل گایوں کے غول رہتے ہیں اور یہ نقشہ آنکھوں کے سامنے آتے ہی گزشتہ دنوں کی محبت اور پیار کی زندگی جو یہاں گزری تھی یاد آجاتی ہے۔ چنانچہ جاہلی شعرا کی ریت کے مطابق [1] وہ دوستوں کے سمیت ٹھہر کر خوب غور سے دیار محبوبہ کو دیکھتا ہے اور تخیل و تصور کی آنکھوں سے بیتے ہوئے پُربہار دنوں سے لطف لیتا ہے اور خیالوں ہی خیالوں میں محبوبہ کا منتظر رہتا ہے۔

فحبست فيها الركب أحدس في　　كل الامور وكنت ذا حدس

مگر جب محبوبہ نہیں آتی، مایوسی چھا جاتی ہے تو اپنی تیز رفتار، قدآور اونٹنی کا سہارا لیتا ہے۔ مگر جاتا کہاں ہے، ممدوح کی طرف۔ اور یہاں سے گریز کرکے قیس بن شراحیل کی مدح شروع کرتا ہے۔

أفلا تعديها إلى ملك　　شهم المقادة ماجد النفس

یعنی کیا تم اس اونٹنی کو ایک ایسے بادشاہ کی طرف نہ موڑو گے جو بڑا ذی شان، پُررعب اور دل کا پاکیزہ اور شریف النفس ہے۔ اور نویں شعر سے قیس کی تعریف شروع کرتا ہے اور

۱۔ جیسے امرؤ القیس کا قول ہے: وقوفا بها صحبی علی مطيهم يقولون لا تهلك اسى وتجمل

(وطبہ ۲۰۰)

کہتا ہے کہ وہ بڑا سخی داتا ہے وہ صرف دو ہری بنی ہوئی زرہیں اور اصیل نسل کے تنومند گھوڑے ہی نہیں بخشتا بلکہ سونا چاندی اور خوبصورت لونڈیاں بھی انعام واکرام میں دیتا ہے۔ اور اس سے بالکل نہیں ڈرتا کہ اس طرح مال کو بے دریغ خرچ کرنے سے غریبی یا تنگ دستی آجائے گی اور یہیں پر قصیدہ ختم کر دیتا ہے۔

لا یرتجی للمال یھلکہ — سعد النجوم إلیہ کالنحس

فلہ ھنا لك لاعلیہ إذا — دنعت انوف القوم للتعس

مفضل نے ایک دوسرا قصیدہ بھی الحارث بن حلزہ کا نقل کیا ہے جس کا مطلع ہے۔

طرق الخیال ولا کلیلۃ مدلج — سدکا بأرحلنا ولم یتعرج

یعنی رات کی تنہائیوں میں محبوبہ کا خیال بغیر کسی روک ٹوک کے سیدھا میرے پاس پہنچ گیا اور مجھے اس پر سخت حیرت ہے کہ اس طرح اس کا خیال کیسے آگیا۔

اس کے بعد اپنی محبوبہ سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تم تو بہت کمزور نازک اندام تھیں۔ آخر تم اس اندھیری رات میں بھی جیسے دشوار گزار علاقوں کو طے کر کے میرے خیالوں میں کیسے آگئیں۔

أنیٰ اھتدیت وکنت غیر رجیلۃ — والقوم قد قطعوا متان السجسج

اس قصیدہ میں کل دس شعر ہیں آخری دو شعروں میں اپنی محبوبہ کو مخاطب کر کے اپنی سخاوت اور اپنی مہمان نوازی پر فخر کر کے کہتا ہے کہ جب شدید سردی کا زمانہ ہوتا ہے اور قحط پڑا ہوتا ہے اور سردی سے بچانے کے خیال سے اونٹوں کو شام کے وقت جلدی سے باڑے میں لے آتے ہیں کہ ان کو پیٹ بھر چارا تو ملا نہیں کہیں سردی بھی نہ لگ جائے۔ ایسی بھوک مری کی حالت میں جبکہ اونٹنیوں کے تھن سوکھ چکے ہوتے ہیں ہم لوگ مہمان کی خاطر ان اونٹنیوں پر تیر کے ذریعے قرعہ ڈالتے ہیں اور جس اونٹنی کا نام نکلتا ہے اسے ذبح کر کے مہمانوں کو کھلا دیتے ہیں۔

وإذا اللقاح تروحت بعشیۃ — رتك النعام الی کنیف العرفج

الفیتنا للضیف خیر عمارۃ — ان لم یکن لبن فعطف المدمج

الحارث کا یہ آخر الذکر قصیدہ اس کی غزل اور فخر کا بہترین نمونہ ہے۔ رات کی تاریکیوں میں دبے پاؤں محبوبہ کے خیال کے آنے کا ذکر اور پھر اس ذکر سے اپنی محبوبہ کا مختصر سا سراپا کھینچ

قصیدہ ۲۵۔ دیوان المفضلیات۔ صفحہ ۲۶۳

کا انداز بہت اچھوتا ہے۔ مہمان نوازی کی ریت عربوں کے یہاں عام ہے اور اپنے جانوروں کو ذبح کرکے مہمانوں کو کھلا دینا کوئی نئی بات نہیں لیکن الحارث اور اس کے قبیلہ کی مہمان نوازی کی شان بالکل نرالی ہے۔ یہ لوگ اپنی بہترین اونٹنیوں پر قرعہ ڈالتے ہیں اور جس کا نام نکل آتا ہے مہمانوں کے لیے ذبح کرکے ان کے گوشت سے ان کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اور یہ بڑی بات ہے کہ ان سخت حالات میں لے دے کے صرف اونٹ رہ گئے تھے مگر انھیں بھی مہمان پر قربان کردینے میں دریغ نہیں کرتے۔

ان اشعار کے علاوہ الحارث کی طرف کچھ اور شعر بھی منسوب کئے جاتے ہیں۔

الغرض الحارث بن حلزہ کا معلقہ جہاں اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ دشمن کو ایک بادشاہ کے سامنے کس طرح طلاقت لسانی، حکمت عملی اور شیریں زبانی سے زیر کیا جا سکتا ہے وہاں اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ الحارث نے اپنی لمبی عمر سے زندگی کے جو بہت سے سبق سیکھے تھے اور ان سے پورا فائدہ اٹھایا تھا انھیں بھی کھول کر بیان کیا ہے۔ عمرو بن کلثوم کے کلام میں زور بیان اور اعلا قسم کا فخر تو ہے لیکن حکمت عملی، موقع شناسی کی شان نہیں ہے۔ اس لیے اسے الحارث کے مقابلہ میں زک اٹھانی پڑی۔ اسی طرح الحارث کے مذکورہ دونوں قصیدوں میں فخر، ورغزل کے جو مضامین آئے ہیں اگرچہ وہ مختصر اور مجمل ہیں لیکن بڑے دل آویز اور موثر ہیں۔ اور اس کی قدرت زبان اور قادر الکلامی کی دلیل ہیں۔

کہتے ہیں کہ الحارث بن حلزہ نے ڈیڑھ سو سال کی عمر کو پہنچ کر انتقال کیا۔

حوالے :۔

۱۔ الاغانی للاصفہانی ۹/۱۷۷ ۲۔ شرح القصائد العشر للشنقیطی
۳۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ ۴۔ شعراء النصرانیہ للشیخ یسوعی
۵۔ طبقات الشعراء لابن سلام الجمحی ۶۔ المفضلیات رقم ۲۵، ۶۲
۷۔ المعجم للمرزبانی ۸۔ فی الادب الجاہلی لطہ حسین
۹۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان ۱/۱۲۴ ۔ ۱۰۔ الوسیط للاسکندری ص ۸۳
۱۱۔ تاریخ الادب العربی لاحمد حسن الزیات ص ۶۶ ۔ ۱۲۔ المفصل لاحمد الاسکندری وغیرہ ص ۶۶

اس کا دیوان عمرو بن کلثوم کے دیوان کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

اصحابُ المجمہرات

اصحاب المجمہرات میں عام طور سے چھ شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ عَبِیْد ابن الأبرص : م ۵۵۵ء
۲۔ بِشْر بن أبی خَازِم : م ۵۳۰ء
۳۔ أُمیۃ بن أبی الصَلْت : م ۶۲۴ء/ ۹ھ
۴۔ عَدِی بن زَیْد بن حَمَّاد : م ۶۰۴ء
۵۔ خِدَاش بن زُہیر : م ۵۷۰ء
۶۔ النَّمِر بن تَوْلب : ۶۴۵ء

ہم اس موقع پر ان میں سے صرف دو شاعروں کا ذکر کریں گے اور وہ ہیں :

۱۔ عبید بن الابرص
۲۔ أمیۃ بن أبی الصَلت

عَبُیْد بن الأبْرص

عبید بن الأبرص کو ابن سلام الجمحی نے "طبقات فحول الشعراء" میں جاہلی شعراء کے چوتھے طبقے میں شمار کیا ہے اور ابوزید القرشی نے "جمہرۃ اشعار العرب" میں اصحاب المجمہرات کے ضمن میں اسے پہلے نمبر پر ذکر کیا ہے اور یہیں سے ان لوگوں کی نظر میں اس کی جلالت قدر، اپنے ہمسر شعراء میں اس کی امتیازی شان اور شعر و شاعری کے اس خاص موضوع میں تفوق، مہارت اور بلند پایہ ہستی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ عبید کا سلسلۂ نسب بنو اسد بن خزیمہ بن مدرکہ سے جا ملتا ہے۔ (۱) جیساکہ

پورا سلسلہ نسب یوں ہے ۔۔ عبید بن الابرص بن جشم بن مالک بن الحرث بن سعد بن ثعلبہ بن دودان بن اسد بن خزیمہ بن مدرکہ۔

پہلے بیان ہو چکا ہے امرؤ القیس کے باپ حجر کی بنو اسد پر حکمرانی تھی۔ کہتے ہیں کہ حجر بہت سخت کوش اور ٹیکس وصول کرنے میں بڑا سخت اور برتاؤ کرنے میں بڑا سنگدل تھا۔ جس کی وجہ سے بنو اسد اس کے سخت مخالف اور اس کی جان کے دشمن تھے۔

عبید بن الابرص شروع میں حجر کے حاشیہ نشینوں میں تھا لیکن اس کی زیادتیوں کی وجہ سے وہ بھی آخر میں اس کا دشمن ہو گیا تھا۔ چنانچہ بنو اسد کی پہلی بغاوت میں جن قیدیوں کو حجر نے سیاسہ کے جیل میں قید کیا تھا ان میں عبید بن الابرص بھی تھا۔ جوں جوں حجر کی سختیاں بڑھتی گئیں اسی قدر بنو اسد کے غصہ، مخالفت اور ریشہ دوانیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور آخر کار ان لوگوں نے موقعہ پا کر اسے ایک دن قتل کر دیا۔

امرؤ القیس شروع سے آزاد اور بگڑا نوجوان تھا۔ چنانچہ وہ بنو اسد کی لڑکیوں پر بھی بری نظریں ڈالتا تھا۔ اس کی بدنگاہی، عیاشی اور آوارگی کی وجہ سے عبید بن الابرص شروع سے امرؤ القیس کا سخت مخالف رہا اور موقع پر اس کی کاٹ کرنے، اس کو رسوا و ذلیل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔[1]

کہتے ہیں کہ عبید کو بچپن میں شعر و شاعری سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ مگر اس کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے نتیجہ میں وہ باکمال شاعر بن گیا۔ ایک دفعہ وہ اپنی بہن ماویہ کے ساتھ اپنی بکریوں کا گلہ لے کر گھاٹ پر پانی پلانے کے لیے آیا۔ قبیلہ مالک کے ایک شخص نے اسے گھاٹ پر جانے سے روک دیا اور برا بھلا کہا۔ اس واقعہ سے ملول ہو کر وہ ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور اس کے قریب اس کی بہن بھی لیٹ گئی۔ اتنے میں مالک قبیلہ کا وہی آدمی وہاں سے گزرا اور اس نے ایک شعر پڑھا جس میں عبید کو اپنی بہن کے ساتھ تہمت لگائی۔ عبید نے اسے یہ شعر پڑھتے سن لیا۔ اسے اپنی بے کسی اور مظلومیت پر بڑا دکھ ہوا۔ چنانچہ اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ خداوندا اگر میں مظلوم ہوں تو اس مالکی کے مقابلہ میں میری مدد فرما اور مجھے غالب فرما۔ یہ کہہ کر پھر لیٹ گیا اور سو گیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک آدمی بالوں کا ایک گولا لے کر آیا اور اسے اس کے منہ میں ڈال کر کہا کہ اٹھو۔ چنانچہ عبید نیند سے بیدار ہوا تو اس کی زبان پر بنی مالک

1۔ عبید بن الابرص اور امرؤ القیس کی مخالفت کے قصوں کے لیے دیکھئے کتاب: الملک الضلیل، محمد فرید ابوحدید۔ مطبوعہ دار المعارف و مکتبہا۔ مصر۔

کے متعلق یہ شعر تھا۔

أیا بنی الزینة ماغرکو   فلکوالویل بسربال حجر

اور اس کے بعد اس میں شاعری کا ایسا ملکہ پیدا ہو گیا کہ بنو اسد کا سب سے بڑا اور مشہور شاعر بن کر چمکا۔ اس نے ایک لمبا قصیدہ بھی کہا جس میں ۴۸ شعر تھے اس کا مطلع ہے ۔ :

اقفر من أهله ملحوب   فالقطبیات فالذنوب

اس قصیدہ کو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ابو زید قرشی نے جمہرہ میں مجمہرات کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ اور صرف ۴۲ شعر دیئے ہیں اور مطلع کے طور پر اس شعر کو درج کیا ہے۔

عیناك دمعهما السروب   كأن شانيهما شعيب

تبریزی نے شرح القصائد العشر میں اور احمد بن الامین الشنقیطی نے المعلقات العشر و اخبار قائلیہا میں اسی معلقہ کے ۴۸ شعر نقل کئے ہیں۔ مگر ابن سلام الجمحی نے طبقات فحول الشعراء میں کہا ہے کہ مجھے عبید کے اس شعر کے علاوہ کسی اور شعر کا علم نہیں۔

اقفر من أهله ملحوب   فالقطبیات فالذنوب

آگے چل کر اس نے کہا ہے کہ راویوں نے طرفہ اور عبید کے بہت کم قصائد روایت کئے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے صحیح قصائد کی تعداد دس تک پہنچتی ہے (۱)

بہر حال تذکرہ نگاروں نے باتفاق رائے مذکورہ بالا قصیدہ کو اس کا معلقہ تسلیم کیا ہے۔ اس معلقہ میں کوئی خاص بات نہیں کہی گئی ہے۔ جاہلی شعرا کے دستور کے مطابق اس قصیدہ کو دیار محبوب کے ویران ہو جانے سے شروع کرتا ہے۔ اور کہتا ہے ـــــ جن وادیوں، پہاڑوں اور مرغزاروں ایک دن محبوبہ مست خرام تھی۔ اب وہاں ویرانی، تباہی اور موت کا ڈیرا ہے جنگلی جانوروں نے اسے اپنا مسکن اور بسیرا بنا رکھا ہے۔ یہ انجام دیکھ کر اس کی آنکھوں سے گنگا جمنی بہنے لگتی ہے۔ لیکن پھر اسے ہوش آتا ہے۔ کہتا ہے کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہر کمانے را زوالے اس کے بعد چند حکمت و فلسفہ کی باتیں بتاتا ہے جن میں اہم یہ حقیقت ہے کہ اللہ کے سہارے ہر بھلائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اور یہ کہ خدا کا کوئی شریک نہیں۔ اور وہ دلوں کی چھپی ڈھکی باتوں کو بھی جانتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ جو شخص زمانے کو دیکھ کر نصیحت حاصل نہیں کرتا اسے کسی آدمی کی نصیحت سے

۱۔ طبقات فحول الشعراء۔ صفحہ ۲۳

فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ پھر اپنی اونٹنی کی تعریف کرتا ہے اور اس کی تیز رفتاری، طاقت اور تحمل و برداشت کو بیان کر کے اس کی تشبیہ ایک ایسے عقاب سے دیتا ہے جو اتنا تیز، سبک، طاقتور اور تیز نگاہ ہے کہ دور سے ایک لومڑی کو دیکھتا ہے۔ اس پر جھپٹتا ہے۔ اسے پکڑ کر زمین پر کئی پٹخنیاں دیتا ہے۔ آخر کار اسے اس طرح اپنے چنگل میں دبوچ لیتا ہے کہ بیچاری لومڑی چیختی رہتی ہے اور اس کے ناخون اس کی پسلی اور سینے میں پیوستہ ہو جاتے ہیں۔

یضغو و مخلبها فی د فـــه   لا بد حیز ومه منقوب

فنی اعتبار سے یہ قصیدہ بہت کمزور ہے اور اس کے بہت سے اشعار وزن اور قافیہ کے اعتبار سے غیر موزوں بھی ہیں۔ اس کی اس خامی کی طرف ابوالعلا المعری نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

قد یخطی الرائی امرؤ و هو حـازم   کما اختل فی وزن القریض عبیـد

یعنی آدمی عقلمند اور دانا ہونے کے باوجود کبھی کبھی رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتا ہے جس طرح عبید نے شعر کے وزن میں غلطی کی تھی۔

کامل کیلانی نے اس کمزوری کی یہ توجیہہ کی ہے کہ ممکن ہے کہ عبید کسی مخصوص وزن یا لے پر اپنے اشعار کہتا ہو جس پر عام طور سے شعرائے جاہلیت طبع آزمائی نہ کرتے ہوں۔ اگر ہم اس کے منہ سے اس کے اشعار سنتے تو مجھے یقین ہے کہ اس کے وزن اور قافیہ میں کوئی نقص نہ محسوس کرتے لیکن یہ توجیہہ خود بہت کمزور ہے۔ آخر صرف عبید ہی کے کلام میں یہ خامی کیوں پائی جاتی ہے۔ حالانکہ اس کے علاوہ بہت سے کم گو جاہلی شعرا گذرے ہیں اور ان میں سے بیشتر ان پڑھ اور غیر مہذب تھے۔ لیکن ان کا جتنا کلام ہم تک پہنچا ہے وزن و قافیہ اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اس میں کوئی خامی نہیں نظر آتی۔ درحقیقت کامل کیلانی ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں قدما کے کلام سے خواہ وہ صحیح ہو یا غلط۔ معیار پر پورا اترتا ہو یا نہ اترتا ہو، بڑی وابستگی ہے اور ان کی فروگزاشتوں کیوں اور خامیوں کی کوئی نہ کوئی وجہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ چاہے وہ توجیہہ کتنی ہی کمزور اور لچر پوچ کیوں نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ عبید سے جتنا کلام منسوب کیا جاتا ہے اولاً تو وہ خود مشکوک ہے اور اسے امرؤالقیس کی کہانی میں یمنی اور مضری قبائلی عصبیت کی بنا پر رنگ دینے کے لیے وضع کیا گیا ہے پھر اس کے کلام میں اتنی فنی کمزوریاں ہیں جو کسی جاہلی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں۔ مثلاً اس کا وہ قصیدہ پڑھئے جسے عبید نے اس وقت کہا ہے جب اس کی قوم بنو اسد نے امرؤالقیس کے باپ حجر کو قتل کر دیا ہے اور امرؤالقیس نے اس کی دیت لینے سے انکار کر دیا ہے اور بنو اسد سے "ثار"[1] لینے کی

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دھمکی دی ہے۔ اس موقع پر عبید نے کہا ہے کہ

یاذ المخوفنا بقتل أبیہ ذلالا وحینا
وزعمت أنك قد قتلت سراتنا کذبا ومینا

اس پورے قصیدے میں اتنی فنی خامیاں، زبان اور بیان کی اتنی غلطیاں ہیں جو کسی شاعر کے متعلق تصور میں نہیں آسکتیں۔ کیونکہ جاہلی شعرا کا جو کلام ہم تک پہنچا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح ہے یا غلط اس میں زبان و بیان کی وہ غلطیاں نہیں ہیں جو عبید کے اشعار میں ملتی ہیں۔ اس لیے ہمارے خیال میں یہ سب اشعار من گڑھت ہیں اور انہیں گڑھا بھی ہے کسی گھٹیا اور ادنا درجے کے شاعر نے ورنہ ان میں وہ فاش غلطیاں نہ ہوتیں جو ہمیں اس قصیدے میں ملتی ہیں۔

روات نے اس کی شخصیت کو پر اسرار بنانے کے لیے اس کا رشتہ ایک جن سے جس کا نام "ہبید" بتایا گیا ہے جوڑا ہے اور اس کی بنیاد پر ایک مثل بھی بنالی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "لولا ہبید ماکان عبید" یعنی اگر ہبید جن نہ ہوتا تو عبید (شاعر) نہ پیدا ہو پاتا۔ چنانچہ اس کا قصہ ابو زید قرشی نے جمہرۃ اشعار العرب کے مقدمہ میں تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح یہ جن "ہبید" عبید کی طرف سے شاعری کر کے اس کے نام سے منسوب کر دیتا تھا اور اس کی زبان سے القا کرتا تھا۔ چنانچہ عبید کا وہ مشہور قصیدہ جسے اس نے امرؤ القیس کے باپ حجر کو اپنی مصاحبت کے زمانہ میں سنایا تھا جس میں وہ کہتا ہے۔

طاف الخیال علینا لیلۃ الوادی	من ام عمرو ولم یلمم بمیعاد
أنی اهتدیت الی من طال لیلهم	فی سبسب ذات وکداث واعقاد

ہبید نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ جب سامع (المروزی) نے یہ کہا کہ یہ اشعار تو عبید کے ہیں۔ تو ہبید نے کہا کہ میں نے ہی اس پر ان کا القا کیا تھا۔ (۱)

غرض عبید کی طرف جتنے قصیدے منسوب کیے جاتے ہیں ان میں سے اکثر من گڑھت ہیں اور یمنیوں پر مضریوں کے اور مضریوں پر یمنیوں کے تفوق کو ثابت کرنے کے لیے بعد میں وضع کئے گئے ہیں۔ کیونکہ امرؤ القیس کا باپ حجر یمنی نسل کا تھا اور بنواسد جن پر وہ حکومت کرتا تھا، مُضَری النسل تھے۔ اور دونوں قبائل بڑے نامور اور مشہور قبائل میں سے تھے اور ہر ایک کے افراد اپنوں کی فضیلت

۱۔ "ثار" خون کے بدلے میں خون۔
تفصیل کے لیے جمہرۃ اشعار العرب۔ ابوزید القرشی کا مقدمہ صفحہ ۳۲ اور اس کے آگے ملاحظہ کیجیے۔

ثابت کرنے کے لیے اشعار۔ قصے کہانیاں وضع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ روات نے نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ عبید کی ملاقات امرؤ القیس سے ہوگئی۔ عبید نے امرؤ القیس سے کہا کہ "الاوابد (جنگلی جانوروں) کے متعلق بھی کچھ جانتے ہو" امرؤ القیس نے جواب دیا کہ "جو چاہو پوچھو" چنانچہ عبید نے امرؤ القیس سے اشعار میں آٹھ پہیلیاں بجھائیں جن کا جواب امرؤ القیس نے بالکل صحیح صحیح دیا ہے۔ عبید نے کہا:

ماحیة میتة أحیت بمیتها　　　درداء ما أنبتت سنا و أدراسا؟[1]

یعنی وہ کون سی زندہ اور مردہ چیز ہے جو اپنے مردہ جسم کے سہارے زندہ رہتی ہے اور چھونے میں کھردری ہے۔ جس کے نہ دانت ہیں اور نہ ڈاڑھ۔؟

اس کی بوجھ امرؤ القیس نے یہ بتائی:

تلك الشعیرة تسقی فی سنابلها　　　فأخرجت بعد طول المکث أکداسا

یعنی وہ جو کا پودا ہے جس کی بالیوں کو مستقل سیراب کیا جاتا ہے تو ایک زمانے تک پڑے رہنے کے بعد بڑی مقدار میں پیداوار دیتا ہے:

پھر عبید نے کہا کہ اچھا:

ما السود والبیض والأسماء واحدة　　　لا یستطیع لهن الناس تمساسا

یعنی وہ کون سی چیز ہے جو کالی بھی ہے اور سفید بھی۔ پر اس کا نام ایک ہی ہے۔ اور انسان اسے چھو نہیں سکتا۔

اس کی بوجھ امرؤ القیس نے یہ بتائی:

تلك السحاب إذا الرحمان أرسلها　　　روّی بها من محول الأرض أیباسا

یعنی وہ کالی اور سفید چیز بادل ہے کہ جب خدا اسے بھیجتا ہے تو سوکھی اور چٹیل زمین کو اس سے سیراب کرتا ہے۔

ظاہر ہے یہ مقابلہ محض من گھڑت کہانی ہے۔ اس کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے

---

(1) سر چارلس لائل SIR CHARLES LYAL نے عبید بن الابرص اور عامر بن الطفیل الغنوی کا ایک مشترکہ دیوان شائع کیا ہے۔ اسے دار المعارف۔ مصر نے چھاپا ہے۔ اس میں فاضل مرتب کے قلم سے انگریزی میں ایک سیر حاصل مقدمہ بھی ہے۔ دیوان کے صفحہ ۳۴ پر مذکورہ شعر کے دوسرے مصرعہ میں "ادراسا" کی جگہ پر "اضراسا" لکھا ہے۔ "ادراسا" کو الامین الشنقیطی نے کتاب "بدائع البدائہ" مولفہ علی بن ظافر سے نقل کیا ہے۔

قصے صرف قبائلی تفوق کو ظاہر کرنے کے لیے وضع کئے گئے ہیں ۔ کیونکہ اندازِ بیان الفاظ اور بعض اصطلاحات ایسی ہیں جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھیں ہی نہیں ۔ ۴

خصوصیت کلام ۔

ہمارے سامنے عبید بن الابرص کا جو کلام ہے اور اس کی زندگی کے متعلق جو قصے بیان کئے گئے ہیں ان سے اس کی شخصیت اور کلام کا صحیح نقشہ نہیں بنتا ۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کے ردعمل کے طور پر اس میں یک بیک شاعری کا ملکہ پیدا ہو گیا اور اس نے اسی دن سے شعر کہنا شروع کیا ۔ ان اشعار میں ندرت خیال، رفعت معانی اور حسن الفاظ کی بڑی کمی ہے ۔ اسلوب بیان بھی جاہلی شعرا کے برخلاف بڑا ڈھیلا ڈھالا اور کمزور ہے ۔ البتہ اس کا وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے :

لمن دمنة أقوت بحوة مرغد تلوح كعنوان الكتاب المجدّد

جاہلی شعراء کے خیال، اسلوب بیان اور معانی کے مطابق ہے اور اس کو اس کے کلام کا بڑا اچھا نمونہ سمجھا جاتا ہے ۔ اس قصیدہ میں اس نے حکمت و فلسفہ، فخر و حماسہ کے مضامین بھی باندھے ہیں ۔

عبید کی موت کا قصہ

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ عبید نے بڑی لمبی عمر پائی ۔ یہاں تک کہ بعض نے تین سو سال تک کی عمر بتائی ہے ۔ اس کی موت کے بارے میں بھی ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ المنذر بن ماء السماء قبیلہ بنو اسد کے اپنے دو حاشیہ نشینوں سے ایک دن خفا ہو گیا اور غصہ میں انہیں قتل کرا دیا ۔ بعد میں جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے اپنے کئے پر افسوس ہوا ۔ چنانچہ تلافی کے خیال سے اس نے ان دونوں کی قبریں بنوائیں اور ان کا نام "غریین" رکھا ۔ اور سال میں دو دن ان قبروں کے پاس بیٹھتا تھا ان دونوں میں سے ایک کا نام "یوم نعیم" بخشش کا دن اور دوسرے کا نام "یوم بؤس" سزا کا دن رکھا چنانچہ بخشش کے دن جو اس کے پاس سب سے پہلے آتا اسے وہ ایک سو اونٹ انعام میں دیتا اور سزا والے دن کو جو سب سے پہلے اس سے ملتا اسے قتل کرا دیتا اور اس کے خون سے دونوں کی قبروں کو پتوا تا ۔ اتفاقاً عبید سزا والے دن کو اس سے ملنے کے لیے آ گیا ۔ چنانچہ اس نے حسب عہد اسے قتل کرا دیا اور اس طرح عبید ۵۵۵ء یا ۵۶۵ء میں اس دار فانی سے رخصت ہو گیا ۔

حوالے ۔

۱۔ عبید کے سلسلہ میں دیکھیے : الاغانی ۔ جلد ۱۹ ۔ صفحہ ۸۴ ۔ ۴ جیسے لفظ رحمٰن

۲۔ طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی۔ مطبوعہ دار المعارف۔ مصر

۳۔ جمہرۃ اشعار العرب۔ ابو زید محمد بن ابی الخطاب القرشی

۴۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔

۵۔ مجمع الامثال للہمدانی للمیدانی

۶۔ العمدۃ لابن رشیق القیروانی

۷۔ معجم الادباء لیاقوت الحموی، ج ۸

۸۔ معجم ما استعجم للبکری

۹۔ امالی علی القالی۔ جلد ۳

۱۰۔ فی الادب الجاہلی۔ طہٰ حسین

۱۱۔ حاشیہ رسالہ الغفران۔ تحقیق کامل کیلانی۔

۱۲۔ المعلقات العشر و اخبار قائلیہا۔ الشیخ احمد بن الامین الشنقیطی۔

۱۳۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ لجرجی زیدان۔ ج/ اوّل

اُمیۃُ بن أبی الصَلت

م ۔ ۶۲۴ء مطابق ۹ ہجری

اصحاب المجمہرات میں دوسرا قابل ذکر شاعر امیہ بن ابی الصلت ہے۔ یہ قبیلہ ثقیف کا شاعر اور اس کی عظمت و عزت کا نشان تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں جن لوگوں کو حق کی تلاش تھی ان میں امیہ کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے۔[1] اس کی کنیت ابو عثمان تھی۔ پورا سلسلہ نسب یوں ہے۔ ابوعثمان امیہ بن ابی الصلت بن عبداللہ بن ابی ربیعہ بن عوف الثقفی۔

ابن سلام الجمحی نے اسے طائف کے شعراء میں شمار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس کے کلام میں ایسی بہت سی عجیب و غریب باتیں ملتی ہیں جو اس سے پہلے کے شعراء نے نہیں کہی ہیں۔ جیسے زمین و آسمان کی پیدائش یا ملائکہ وغیرہ کا ذکر یا مرنے کے بعد حشر یا جنت و دوزخ وغیرہ کا تصور۔ اس نے تورات وغیرہ کے مطالعہ سے پچھلی قوموں کے بہت سے واقعات کا علم حاصل کیا تھا اور ان کو اپنے کلام میں اپنے خاص رنگ میں بیان کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے کلام میں سدوم کے کھنڈرات اور حضرت ابراہیم و اسحٰق علیہما السلام کے قصے بھی ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امیہ فطرتاً حق پسند و حق جو تھا۔ چنانچہ جب اس نے گوش و ہوش کی آنکھیں کھولیں اور کائنات اور اس کا نظام، زندگی اور اس کی بوقلمونی دیکھی تو اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے۔ کون کر رہا ہے اور اس کا مقصد اور حاصل کیا ہے۔ اس نے اس کا جواب مختلف مذاہب میں تلاش کیا اور اہل کتاب کے علماء سے پوچھا اور سمجھنے کی کوشش

۱۔ جیسے ورقہ بن نوفل اور زید بن عمرو بن نفیل : زید نے بت پرستی چھوڑ رکھی تھی اور بت پرستوں کا ذبیحہ بھی نہیں کھاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے عقائد بالکل مسلمانوں جیسے تھے۔ اور عین ممکن تھا کہ وہ اسلام لے آتا لیکن بعثت نبوی سے ۵، سال پہلے ہی مرگیا۔ اس کا بیٹا سعید بن زید ان دس صحابیوں میں سے ہے جنہیں رسول اللہ نے جنت کی بشارت دی تھی اور جنہیں "عشرہ مبشرہ" کہا جاتا ہے۔

کی۔ مذہب عیسوی اور یہودیت کا مطالعہ کیا اور یہودیوں اور عیسائیوں کے بہت سے قصوں اور اسفار کی روایت بھی کی۔ ملت ابراہیمی اور سنت اسماعیل میں سے جو کچھ اس زمانے کے بڑے بوڑھوں کو یاد تھا ان سے علوم کیا۔ پھر اپنی سمجھ بوجھ، غور وفکر اور مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں ان سوالات کے جواب تلاش کئے اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس آسمان اور زمین کا کوئی نہ کوئی خالق ضرور ہے۔ یہ نظام کائنات یوں ہی اپنے آپ ہی نہیں چل رہا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک کارساز کا ہاتھ کار فرما ہے۔ اس کارساز نے نظام کائنات اور زمین پر انسانوں کے رہنے کے لیے ایک ضابطۂ حیات بخشا ہے جس کے ذریعہ انسان نے ایک صالح اور پاک زندگی گزارنے کے اصول بنائے ہیں تاکہ جس طرح نظام کائنات بغیر کسی رکاوٹ اور اکھاڑ پچھاڑ کے سکون اور اطمینان کے ساتھ چل رہا ہے۔ انسانوں کی زندگی بھی سکون اور اطمینان کے ساتھ چل سکے۔ اور اس مقصد کو حاصل کر سکے جس کی خاطر اس کی آفرینش ہوتی ہے۔ یہ اصول اور زندگی گزارنے کا یہ طریقہ انبیا اور رسول لے کر آئے جنھوں نے اس کارساز کی نشاندہی کی اور لوگوں کو بتایا کہ وہ ایک ہے اور مرکر ہر ایک کو اس کے پاس واپس جانا ہے۔ ان مسائل میں غور وفکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ امیہ کی زندگی کا ڈھنگ بدل گیا۔ اس نے کملی اوڑھنی شروع کر دی۔ بتوں کی کار فرمائی اور طاقت پر یقین نہیں رہا۔ اور راگ و رنگ کی محفلوں سے دل اچاٹ ہو گیا۔ شراب و کباب اپنے اوپر حرام کر لی اور تلاش حق و حقیقت میں کھو گیا۔

تذکرہ نگاروں نے روایت کی ہے کہ مختلف مذاہب کے مطالعہ سے امیہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ایک نبی عنقریب پیدا ہونے والا ہے اور اسے امید تھی کہ وہ نبی میں ہی ہوں گا۔ مگر جب آنحضرت نبی ہو گئے تو اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور آپ کی طرف سے اس کے دل میں حسد و کینہ بیٹھ گیا چنانچہ اس نے نہ صرف آپ کا اور آپ کے دین کا انکار کیا بلکہ اہل مکہ کو بھی آپ کی مخالفت پر ابھارنے لگا۔ اور جب غزوہ بدر ہوا تو اس نے مقتولین قریش کا مرثیہ بھی کہا۔ آپ کو جب ان اشعار کی خبر ہوئی تو آپ نے ان کی روایت کرنے اور پڑھنے کو منع فرما دیا۔ کہتے ہیں کہ یہ آیت ـــ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيْ آتَيْنَاهُ اٰيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِيْنَ ـــ اس کے بارے میں اتری تھی۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ آنحضرت جب امیہ کے ایمان و یقین اور توحید و رسالت سے بھرے اشعار کو

۱۔ یعنی اس شخص کی خبر ان لوگوں کو تلاوت کر کے سنا دیجئے جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں مگر اس نے ان سے روگردانی کی تو شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا اور یہ نتیجہ ہوا کہ وہ گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا۔

(سورہ الاعراف۔ پارہ نہم۔ آیت۔ ۱۷۴)

سنتے تھے تو فرماتے تھے کہ "اس کی زبان تو ایمان لے آئی مگر اس کا دل منکر رہا"

مگر یہ خیال غالباً صحیح نہیں ہے کہ امیہ آخر تک اپنے آپ کو نبی موعود سمجھتا رہا اور یہ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوگئے تو وہ محض کینہ اور حسد کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اسلام نہیں لایا۔ بلکہ آپ کی مخالفت کرتا رہا اور قریش کو بھی آپکے خلاف ابھارتا رہا۔ ہمارے اس خیال کی بنیاد مفسرین کا وہ اختلاف ہے جو اس آیت سے مراد شخصیت کے بارے میں ان کے یہاں ملتا ہے۔ اور وہ عقلی اور نقلی دلائل ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آیت مذکورہ امیہ کے بارے میں نہیں اتری تھی بلکہ کسی اور شخصیت کے بارے میں۔

مفسرین نے اس آیت کی شان نزول بتاتے ہوئے اس آیت سے متعلق مختلف نام بتائے ہیں اور انہیں میں سے ایک امیہ بن ابی الصلت کا نام بھی ہے۔ ان مفسرین نے اپنے اس خیال کی تائید میں چند روایتیں بھی نقل کی ہیں جن کے راویوں میں بعض بہت ہی اہم اور جلیل القدر شخصیتوں کا نام آتا ہے جیسے عبداللہ بن عمر اور سعید بن المسیب وغیرہ۔ مگر یہ بات معرض بحث ہے کہ ان جلیل القدر شخصیتوں کے بعد جو روات ہیں وہ کس پائے کے ہیں۔ کہیں اس سلسلہ روایت میں غیر ثقہ اور وضع سے متہم روات تو نہیں شامل ہوگئے ہیں۔

حضرات مفسرین نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے اس آیت سے مراد جس شخصیت کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے وہ بلعم بن باعورا ہیں۔ اس کے بعد بعض نے امیہ بن ابی الصلت کا اور بعض نے ابو عامر راہب اور بعض نے اہل کتاب کے منافقین اور بعض نے بغیر نام بتائے "بنی اسرائیل کے ایک عالم" کا ذکر کیا ہے۔ اگر آپ ان ناموں پر غور کیجئے تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی کوئی وجہ مشابہت نہیں ہے۔ نہ نسلی اعتبار سے نہ ہی وطنی، تہذیبی اور فکری اعتبار سے چنانچہ ان میں سے ایک کنعانی ہے اور ایک عرب، ایک یہودی اور کچھ منافقین اہل کتاب، جن سے مراد یہودی اور عیسائی دونوں ہو سکتے ہیں کیونکہ دونوں ہی اہل کتاب ہیں۔ اور جو جزیرہ نمائے عرب کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اگر آپ ان شخصیتوں کے پائے جانے کے زمانے پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں سے بعض کے درمیان سینکڑوں سال کا فرق ہے۔ چنانچہ انہی مفسرین کے قول کے مطابق بلعم بن باعورا حضرت موسیٰ کے زمانے میں تھے اور امیہ بن الصلت آنحضور کے زمانے میں۔ اور ان دونوں رسولوں کے درمیان ہزاروں سال کا فرق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسی ان مل بے جوڑ شخصیتوں کو جن کے پائے جانے کے زمانے میں کئی ہزار

سال کا فرق ہے کس طرح ایک ہی آیت سے متعلق کہا جا سکتا ہے اور پھر جب ایک خاص خبر کی نسبت ان سے کی گئی ہو؟

اس رائے کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قدیم تذکرہ نگاروں میں سے نثر نگار ادبا اور نقادوں نے اس آیت کا ذکر نہیں کیا ہے جیسے ابن سلام الجمحی، جاحظ اور ثعالبی وغیرہ نے۔ ابن سلام الجمحی نے امیہ کا وہ شعر ضرور نقل کیا ہے جو اس نے مقتولین بدر کے مرثیہ میں کہا ہے۔ مگر اس شعر کے علاوہ اور کوئی شعر اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ ابوالفرج اصفہانی نے اپنی کتاب الاغانی میں اس آیت اور اس کی شان نزول کے طور پر امیہ کا ایک پورا واقعہ نقل کیا ہے لیکن اصفہانی کی روایت پر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں رطب و یابس ہر قسم کی روایات جمع ہیں کہ وہ نہ تو مستند سیرت کی کتاب ہے اور نہ تاریخ کی۔ پھر اب یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ اغانی میں بہت سی روایات اور بہت سے قصے محض من گھڑت اور جھوٹے ہیں۔ خود ابوالفرج نے اس بات کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے جو کچھ لوگوں کو کہتے سنا ہے بغیر تحقیق و تدقیق کے نقل کر دیا ہے۔[1] عرب تذکرہ نگاروں نے اپنی کتابیں عام طور سے اغانی کی روایات سے مرتب کی ہیں چنانچہ بعد کے جتنے تذکرہ نگار آئے انہوں نے بغیر تحقیق و تدقیق کے اغانی کے بیان کو نقل کر دیا اور اس کی مطلق پرواہ نہیں کی کہ قرائن اور عقل سلیم کی روشنی میں یہ باتیں صحیح ہو سکتی ہیں یا نہیں۔ متاخرین میں اس کی ابتدا جرجی زیدان نے اپنی کتاب۔ تاریخ ادب اللغۃ العربیہ میں کی ہے اور انہیں کے نقش قدم پر چل کر دوسرے مصنفین نے بھی ان باتوں کو جوں کا توں نقل کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے یہ غلط فہمی بلکہ غلط بیانی آج تک ہماری عربی ادب کی تاریخ میں چلی آ رہی ہے۔[2]

۱۔ اغانی کی روایات کے بارے میں ملاحظہ کیجئے۔ ڈاکٹر محمد احمد خلف اللہ کی کتاب " صاحب الاغانی۔ ابوالفرج الاصفہانی الراویۃ ۔ ۲۔ علی العیر کا مضمون۔ مع ابی الفرج الاصفہانی فی کتاب الاغانی۔ مطبوعہ مجلۃ العرب۔ الریاض۔ ماہ رجب ۱۳۸۹۔ جو/اکتوبر ۱۹۶۹ء

۳۔ دراسۃ الاغانی؛ ڈاکٹر داؤد سلوم،، مطبوعہ بغداد

۴۔ منہج الاغانی، شفیق جبری، مطبوعہ لبنان

۲۔ آیت کی شان نزول کے بارے میں تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو مصنف کا مضمون: " امیہ بن ابی الصلت۔ ایک حکیم شاعر" مطبوعہ رسالہ معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء

امیہ بن ابی الصلت نے عبداللہ بن جدعان کی شان میں بڑے شاندار مدحیہ قصیدے کہے ہیں۔ عبداللہ سرداران قریش میں ایک نامور سردار اور بہت ہی سخی داتا امیر تھا۔ کہتے ہیں کہ امیہ نے اس کی اسی طرح مدح کی ہے جس طرح زہیر بن ابی سلمیٰ ہرم بن سنان کی تعریف کیا کرتا تھا۔

امیہ کی پیدائش طائف میں ہوئی تھی۔ یہیں اس کے باپ نے جو خود بھی بہت بڑا شاعر تھا اس کی تعلیم و تربیت کی۔ بڑا ہو کر اس نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور کبھی شام اور کبھی یمن مال تجارت بیچنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ انھیں سفروں میں اس کی راہبوں اور پروہتوں سے ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ اور وہ ان سے دین و ایمان کی باتیں کرتا جنہوں نے آگے چل کر اس کی زندگی کا نقشہ بدل دیا۔ مختلف ادیان کے مطالعہ نے اسے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ تمام ادیان باطل ہیں۔ صرف دین ابراہیمی ہی صحیح ہے۔

كل دين يوم القيامة عند الله إلا دين الحنيفة زور

یعنی اللہ کے نزدیک قیامت کے دن تمام دین جھوٹے ثابت ہوں گے سوائے دین حنیف (ابراہیمی) کے۔ اس دین ابراہیمی کی طرف اس طرح اشارہ کرتا ہے۔

رب الحنيفة لم تنفد خزائنه مملوة طبق الآفاق سلطانا

یعنی وہ دین حنیف کا مالک ہے اس کے خزانے کبھی خالی نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ بھرے رہتے ہیں۔ اور جس نے اپنی بادشاہی اور کار فرمائی سے سارے آفاق کو گھیر رکھا ہے۔

امیہ کی امتیازی خصوصیات

امیہ بن ابی الصلت جزیرۂ عرب کے قصبات کے شعرا میں سب سے ممتاز اور مشہور شاعر شمار کیا جاتا ہے۔ زبان اسلوب بیان اور معانی و مطالب میں ندرت، دلکشی اور فنی اعتبار سے کسوٹی پر پورے اترنے کے باوجود بعض علمائے لغت اس کو زبان میں سند نہیں مانتے اگرچہ وہ خالص عرب تھا۔ اور اس کے کلام سے مثال نہیں پیش کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کلام میں عبرانی اور سریانی زبان کے الفاظ بھی ملتے ہیں جن کا تعلق عربی زبان سے نہیں۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ امیہ پہلے تو تجارت کی غرض سے اور بعد میں حق کی تلاش کی راہ میں عجمیوں اور دوسری غیر عرب اقوام سے اکثر ملتا جلتا رہتا۔ ان کی کتابیں پڑھتا رہتا اور ان کی باتیں سنتا۔ چنانچہ ان کی زبان کے بعض الفاظ اس کی زبان پر چڑھ گئے اور پھر اس کے کلام میں بھی غیر شعوری طور پر در پا گئے۔ چنانچہ وہ آسمان کو ساقورہ کہا کرتا تھا۔ اور چاند کو الساہور۔ اس کا خیال تھا کہ جب چاند گرہن پڑتا

ہے تو درحقیقت چاند ایک غلاف کے اندر چھپ جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا خیال تھا کہ سورج جب ڈوب جاتا ہے تو پھر دوبارہ طلوع ہونے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایسے لوگوں پر طلوع نہیں ہوں گا جو اللہ کو چھوڑ کر مجھے پوجتے ہیں۔ اس پر اس کے کوڑے لگتے ہیں، دھکے دیئے جاتے ہیں۔ تب وہ دوبارہ طلوع ہوتا ہے۔ چنانچہ امیہ کہتا ہے۔

یست بطالعة لهم فی رسلها الا معذبة والا تجلد

اسی طرح اس نے اپنے اشعار میں اللہ کو "السلطیط" اور "التغرور" کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کے علاوہ امیہ ایسی انوکھی باتیں بھی کہتا تھا جنہیں عام طور سے عرب نہیں جانتے تھے۔ ان باتوں کو وہ گذشتہ مقدس کتابوں سے اخذ کر کے عربی میں بیان کرتا تھا۔ اس کی مثال اس کا یہ شعر ہے۔

بآیة قام ینطق کل شئی وخان أمانة الدیک الغراب

کہتے ہیں کہ ایک مرغ ایک کوے کا جگری دوست اور یار غار تھا۔ مگر کوئے نے شراب کی خاطر ایک شراب بیچنے والے کے یہاں اسے گروی رکھ دیا۔ پھر اسے چھڑانے کے لیے لوٹ کر کبھی نہیں آیا۔ شراب بیچنے والا جب انتظار کر کے تھک گیا تو اپنی رقم کے عوض اس نے مرغ کو اپنی دوکان کا چوکیدار بنا دیا۔ اسی طرح ہد ہد کے بارے میں بھی اس کے چند اشعار مروی ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ ہد ہد کے سر پر جو کلغی ہے درحقیقت اس کی ماں کی لاش ہے جسے اس نے مرنے کے بعد اپنے سر پر رکھ لیا تھا اور دفن کرنے کے لیے مناسب جگہ نہ ملی تو اس کی لاش مستقل طور سے اس کے سر پر جم کر رہ گئی۔ اور جب لاش سڑی تو اس کی بدبو اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی یہی وجہ ہے کہ ہد ہد کے جسم سے ایک خاص قسم کی بو آیا کرتی ہے۔[1]

امیہ کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کلام تعقید معنوی اور تعقید لفظی دونوں سے ایک حد تک پاک ہے۔ البتہ ابتدائی زمانے کی شاعری میں جاہلی رنگ پورا پورا جھلکتا ہے۔ یعنی الفاظ تو وہی شان و شکوہ اور گمبھیر پن ہے جو امرؤ القیس کے یہاں ملتا ہے۔ مگر معانی میں وہ رفعت اور ندرت نہیں جو ایسے الفاظ کا تقاضہ ہے۔ بلکہ معانی و مطالب بالکل سادہ اور معمولی ہیں جیسے اس کے یہ اشعار۔

---

1. تفصیل کے لیے دیکھیئے۔ کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔ صفحہ ۲۰۹ اور اس کے آگے اور "الاصابة فی تمیز الصحابة لابن حجر العسقلانی" رسول اللہ کی امیہ کے بارے میں رائے کے لیے جس میں آنحضرت نے خود اس کا شعر نقل فرما کر اپنی رائے دی ہے کہ اس کا شعر ایمان لے آیا مگر اس کا دل کافر ہے۔

ومایبقی علی الحدثان غفر　　بشاهقة له ام رؤم
تبیت اللیل حانیة علیه　　مایجزمس الارخ الأطوم

تصدی کلما طلعت لنشز　　وردت انها منه عقیم

یعنی مصائب زمانہ (یعنی موت) سے پہاڑی بکری کا وہ بچہ بھی نہیں بچ سکتا جو پہاڑی کی چوٹی پر ہو اور اس کے پاس اس کی شدید محبت کرنے والی ماں ہو جو اس کی نگہداشت اور دیکھ ریکھ میں راتوں کو جاگ کر اس طرح گزار دیتی ہو جس طرح کہ ایک نیل گائے جو اپنے بچے پر جان دیتی ہے۔ چپ چاپ دائیں بائیں اس خیال سے بار بار مڑکر دیکھتی ہے کہ اس کے بچے کو نقصان پہنچانے والا کوئی جانور تو کہیں آس پاس نہیں ہے۔ چنانچہ اپنے بچے کو بری طرح چاہنے والی یہ گائے جب بھی کسی بلند ٹیلے پر چڑھتی ہے تو سب سے پہلے کان لگا کر سنتی ہے کہ کہیں اس کے بچے کو مار کر داغ جدائی دینے والا کوئی جانور ادھر ادھر تو نہیں ہے اور اس طرح بچے کی خاطر بے چین اور پریشانی کی تکلیف سے عاجز آکر یہ چاہتی ہے کہ کاش اس نے اسے جنم ہی نہ دیا ہوتا۔

مذکورہ بالا اشعار میں ایسے بھاری بھر کم اور غریب الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو عام طور سے شعراء کے یہاں نہیں ملتے۔ اسی طرح اس کے یہ اشعار بھی جو اس نے مقتولین بدر کے مرثیہ کے لیے کہے تھے۔ موٹے موٹے الفاظ لیکن سطحی معنی کے مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ماذا ببدر فالعقنقـ　　ـل من مرازبة جحاجح
هلا بکیت علی الکرا　　م بنی الکرام اولی الممادح

یعنی بدر اور اس کے ریت کے ٹیلے پر بڑے بڑے بہادروں، سرداروں اور شہسواروں پر کیا کچھ نہ گزری۔ تم شریف اور شریف زادوں اور اخلاق و عادات میں بلند ترین اشخاص پر روئے نہیں۔
لیکن اس کا کچھ کلام ایسا بھی ہے جس میں سہل الفاظ اور دلکش اسلوب بیان پایا جاتا ہے۔ غالباً یہ اس دور کا کلام ہے جب اس کا دل معرفت حقیقت سے معمور ہو چکا تھا اور اس میں جلا پیدا ہو گئی تھی۔ اس قسم کے اشعار میں اس نے مابعد الطبیعیات اور عام ڈگر سے ہٹی ہوئی باتیں کہی ہیں۔ جیسے دنیا کی پیدائش اور اس کا ایک دن فنا ہو جانا۔ یا قیامت کے حالات، خالق اور اس کی صفات اور شان اور پھر اس سے تعلق جوڑنے کی وہ باتیں جو اس سے پہلے کسی شاعر نے نہیں کہیں جیسے اس کے یہ اشعار۔

الحمد للہ ممسانا و مصبحنا　　بالخیر صبحنا ربی و مسانا
رب الحنیفة لم تنفد خزائنهُ　　مملوءة طبق الآفاق سلطانا

وقد علمنا لو أن العلم ينفعنا   أن سوف تلحق أخرانا بأولانا

یعنی شکر اس خدا کے لیے سزاوار ہے جو ہماری شامیں اور صبحیں لاتا ہے۔ اے میرے رب خیر اور بھلائی سے ہماری صبحیں اور شامیں لا۔

وہ ملت ابراہیمی کا رب ہے اس کے خزانے ہمیشہ بھرے رہتے ہیں کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اس نے ساری کائنات کو اپنی طاقت اور کارفرمائی سے گھیر رکھا ہے۔

اگر ہمیں علم سے کوئی فائدہ پہنچ سکے تو ہمیں یہ خوب معلوم ہے کہ ہمارے پچھڑے لوگ آگے جانے والوں سے عنقریب مل جائیں گے یعنی "بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں"

یا اپنے بیٹے سے ناراض ہو کر اس کو ڈانٹتے ہوئے جو شعر اس نے کہے ہیں۔

غذوتك مولودا وعلتك يافعا   تعل بما أجني عليك وتنهل

إذا ليلة نابتك بالشجو لم أبت   لشكواك إلا ساهرا أتململ

كأني أنا المطروق دونك بالذي   طرقت به دوني فعيني تهمل

تخاف الردى نفسي عليك وإنني   لأعلم أن الموت حتم موجل

فلما بلغت السن والغاية التي   إليها مدى ما كنت فيك أومل

جعلت جزائي غلظة وفظاظة   كأنك أنت المنعم المتفضل

تیری پیدائش کے وقت تجھے میں نے کھلایا پلایا اور پالا پوسا اور جب تو سیانا ہوا تو تیری جملہ ضرورتیں پوری کیں۔ چنانچہ تو میری کمائی سے گل چھرے اڑاتا رہا اور جی بھر کر مزے کرتا رہا۔

(۲) اگر کسی رات کو تجھے کوئی تکلیف ہوئی تو میں پوری رات تیری تکلیف کی وجہ سے بے کل ہو کر آنکھوں میں کاٹ دیتا۔

(۳) گویا کہ جو تکلیف تجھے ہو رہی ہے وہ تجھے نہیں بلکہ مجھے ہو رہی ہے۔ اور اس وجہ سے میری آنکھیں گنگا جمنی بہاتی تھیں۔

(۴) میرے دل کو ہر وقت تیری موت کا دھڑکا لگا رہتا تھا حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ موت کا ایک دن معین ہے اور وہ اس دن آ کر رہے گی۔

(۵) مگر جب تو اس عمر اور اس منزل کو پہنچ گیا جس سے میں اپنی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھا تو

(۶) تو نے اس کا صلہ سنگدلی اور درشتی سے دیا گویا کہ تم ہی میرے کرم فرما اور محسن تھے۔

عبداللہ بن جدعان جو زمانہ جاہلیت میں اپنی جود و سخا میں بہت مشہور تھا امیہ کا ممدوح

تھا۔ اس کی تعریف میں اس نے وہ مدحیہ قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع ہے:

أأذکر حاجتی أم قد کفانی حیاؤک إنّ شیمتک الحیاء

یعنی کیا میں اپنی ضرورت کو کھول کر آپ سے بیان کروں (تب مجھے اپنے انعام و اکرام سے نوازیں گے) یا میرے لیے آپ کی خوئے شرم ہی کافی ہے۔ آپ کی صفت ہی لحاظ و شرم کرنا ہے۔ قصیدے کے دوسرے اشعار اس کے دیوان میں ہیں۔

اغانی نے روایت کی ہے کہ جب اس نے عبداللہ بن جدعان کی تعریف میں وہ قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

عطاؤک زین لامرئ ان حبوته بخیر وما کل العطاء یزین

یعنی آپ کی بخشش مانگنے والے کے حق میں زیب و زینت بن جاتی ہے حالانکہ تمام قسم کے عطیات آدمی کے لیے زیب و زینت نہیں بنتے ہیں۔ یعنی جس کو آپ دیتے ہیں تو اتنے اعزاز و اکرام سے دیتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ اس کو اپنے لیے عزتی سمجھے عزت کا تمغہ سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن جدعان اتنا خوش ہوا کہ اپنی دو پسندیدہ لونڈیاں جن کا نام جرادتان تھا، اسے انعام میں دے دیں۔

امیہ بن ابی الصلت کے اس قصیدہ کا جسے مجمہرات میں شمار کیا جاتا ہے، مطلع ہے:

عرفت الدار قد اقوت سنینا لزینب إذ تحل بھا قطینا

یعنی میں نے زینب کی وہ جائے رہائش پہچان لی جس میں وہ رہا کرتی تھی اور جو اب ویران و سنسان پڑی ہوئی ہے۔

اس کے بعد اپنے آبا و اجداد پر فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم لوگ اتنے طاقتور اور رعب و دبدبے کے مالک ہیں کہ جس جگہ چاہتے ہیں اتر پڑتے ہیں اور اتنے بہادر ہیں کہ جب دشمنوں سے مقابلہ ہوتا ہے تو خوب تلوار کے جوہر دکھاتے ہیں اور جس وقت ہم چاہتے ہیں لوگوں کو روک دیتے ہیں اور اگر ہمیں مدد کے لیے بلایا جائے تو ہم مہربانی کا سلوک کرتے ہیں اور جب آزمانے کے لیے خاندان پر مصیبتیں آن پڑتی ہیں تو ہم لوگ بڑھ کر ان مصیبتوں کو اٹھا لیتے ہیں۔

بأنا النازلون بکل ثغر وإنا الضاربون إذا التقینا
وإنا المانعون إذا أردنا وإنا العاطفون إذا دعینا
وإنا الحاملون إذا أناخت خطوب فی العشیرۃ تبتلینا

اس کے بعد لڑائی میں اپنی قوم کی بہادری کے کارناموں کو بیان کرنے کے بعد اس قصیدہ کو ختم کر دیتا ہے۔ امیہ کے اس قصیدہ کے بہت سے اشعار معنی اور وزن دونوں میں عمرو بن کلثوم کے مشہور معلقہ سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

اوپر کی مثالوں سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ امیہ بن ابی الصلت بلاشبہ قادر الکلام شاعر ہے۔ لیکن اسلوب بیان اور معانی و مطالب کے اعتبار سے اس کو کوئی امتیازی شان نہیں حاصل ہے کیونکہ مابعد الطبیعیاتی تصورات کو چھوڑ کر عام معانی و مطالب پٹے ہوئے ہیں۔ بعض علماء نے اسے جاہلی شعراء کے طبقہ اولیٰ تک میں شمار کیا ہے لیکن اس کے کلام کو دیکھ کر اس میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آتی کہ ہم اسے طبقہ اولیٰ میں شامل کر سکیں۔ امیہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے اس زمانہ میں مذہب اور مابعد الطبیعیاتی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جو جاہلی شاعری میں ناپید تھے۔ اس لیے بعض علماء کا خیال ہے کہ امیہ نے ان مسائل پر خود تو کم کہا ہے لیکن بعد میں آنے والوں نے ان مسائل سے متعلق اشعار کہہ کر اس کے نام سے مشہور کر دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے اکثر اشعار ناموزوں رکیک اور معنی مطالب کے اعتبار سے بہت گھٹیا ہیں۔ بعض علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ اس قسم کے نامانوس اور جاہلی معاشرہ میں غیر معروف خیالات و افکار کو اس نے دوسرے مذاہب کی کتابوں سے اخذ کر کے عربی کا جامہ پہنا دیا تھا اور چونکہ یہ خیالات عام رجحانات اور سماجی حالات سے میل نہیں کھاتے تھے اور شاید ان سے متعلق خود اس کا ذہن بھی صاف نہیں تھا اس لیے ان اشعار میں تعقید، ژولیدہ بیانی اور ابہام پیدا ہو گیا ہے اور اس ژولیدگی اور ابہام کو بڑھانے میں ان تعبیرات، اصطلاحات اور ناموں کو بھی دخل ہے جنہیں وہ دوسری کتابوں سے اخذ کر کے عربی میں بیان کرتا تھا۔ اور لوگ انہیں نہ اچھی طرح سمجھتے تھے اور نہ ان کے صحیح معنے اور مفہوم کو جانتے تھے۔

کہتے ہیں کہ جب امیہ پر نزع کی کیفیت طاری ہوئی اور مرنے سے تھوڑی دیر پہلے اسے ہوش آیا تو وہ فضا میں دیکھ کر کہنے لگا کہ "یہ لو میں تم دونوں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ تم دونوں کی خدمت میں حاضر ہوں۔ یہ دیکھو تمہارے پاس ہی یہ میں ہوں۔ اب تو مال نہ مجھے چھٹکارا دلا سکتا ہے اور نہ خاندان مجھے بچا سکتا ہے۔ خداوندا اگر تو بخشندہ ہے تو میرے تمام گناہوں کو بخش دینا کیونکہ تیرا کون سا بندہ ایسا ہے جس سے گناہ سرزد نہ ہوئے ہوں۔ پھر اس نے اپنے پاس کے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور یہ شعر اس کی زبان سے رواں ہو گئے۔

کل عیش وإن تطاول دھرا ۔۔۔ منتھی أمرہ إلی أن یزولا

لیتنی کنت قبل ما قد بدا لی ۔۔۔ فی رؤس الجبال أرعی الوعولا

اجعل الموت نصب عینیک واحذر ۔۔۔ غولۃ الدھر إن للدھر غولا

ہر زندگی خواہ اس کی مدت کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو اس کا انجام یہ ہے کہ ایک دن اسے زوال آکر رہے گا۔ کاش کہ اس حقیقت کے منکشف ہونے سے پہلے میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر جنگلی بکروں کو چرایا کرتا۔ تو موت کو اپنا مقصد اور مرکز بنائے رکھ اور آفات زمانہ سے ہمیشہ ہوشیار رہا کر کیونکہ زمانہ کی مصیبتیں یکایک آجاتی ہیں۔

اس کے بعد اس نے آنکھیں موند لیں اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی وفات ۶۲۴ء مطابق ۹ ہجری میں ہوئی۔

حوالے :-

۱۔ الاغانی، جلد ۳ و ۱۶ ۔۔۔ ۲۔ طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی

۳۔ سیرت ابن ہشام ۔۔۔ ۴۔ الہلال السنۃ التاسعہ۔

۵۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان ۱۵۲/۱

۶۔ الوسیط ۔ احمد الاسکندری

۷۔ تاریخ الأدب العربی ۔۔ احمد حسن الزیات

۸۔ تاریخ العرب قبل الاسلام۔ جواد علی جلد ۵

۹۔ البیان والتبیین ۔ جلد اول صفحہ ۲۴، ۲۹۱۔

۱۰۔ حاشیہ الدر المنثور للسیوطی ۔۔۔ ۱۱۔ تفسیر امام رازی

۱۲۔ تفسیر امام بیضاوی ۔۔۔ ۱۳۔ مفردات القرآن۔ امام راغب اصفہانی

۱۴۔ کتاب الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔

۱۵۔ جمہرۃ اشعار العرب : ابو زید القرشی۔ ۱۶۔ سیرت النبی علامہ سید سلیمان

۱۷۔ صاحب الاغانی ابو الفرج الاصفہانی : دکتور محمد احمد خلف اللہ۔

۱۸۔ مع ابی الفرج الاصفہانی فی کتاب الاغانی : علی العمیر

۱۹۔ فی الادب الجاہلی : ڈاکٹر طہ حسین۔

۲۰۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ لابن حجر العسقلانی

أصحاب المنتقيات (۱)

المُرَقَّش الاکبر: م ۵۵۲ء

نام عمرو بن سعد بن مالک تھا اور المرقش الاکبر کے لقب سے مشہور ہوا۔[۲] اس کی ماں کا نام قلابہ بنت الحارث بن قیس بن الحارث بن ذہل الیشکری تھا۔ المفضل الضبی نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں کہا ہے کہ "المرقش الاکبر" کا نام عوف تھا۔ اور عوف اس کے چچا کا بھی نام تھا۔ جس کی کنیت "ابو اسماء" تھی۔[۳] جاہلی شعراء میں مرقش نام کے دو شاعر گزرے ہیں۔ ایک ہمارا یہ شاعر جس کا تذکرہ ہم لکھ رہے ہیں۔ اسے المرقش الاکبر (بڑا مرقش) کہتے تھے۔ اور دوسرا "المرقش الاصغر" (چھوٹا مرقش)۔ المرقش الاصغر، المرقش الاکبر کا بھتیجہ اور مشہور جاہلی شاعر طرفہ العبد کا چچا تھا۔[۴] مرقش کے نام سے مشہور ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا۔

هل بالديار ان تجيب صمم   لو كان رسما ناطقا كلم

یعنی کیا محبوبہ کے دیار بہرے آدمی کے سوالات کے جوابات دے سکتے ہیں (ظاہر ہے کہ نہیں) اگر دیار کی نشانی بول سکتی تو یقیناً میرے محبوبہ کے دیار کی نشانی بھی بولتی۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ:

الديار قفر والرسوم كما   رَقَّشَ في ظهر الأديم قلم

یعنی محبوبہ کی نگری ایسی اجاڑ پڑی ہوتی ہے اور اس کے نشانات اس طرح دکھائی دے رہے ہیں جیسے

---

(۱) اس طبقہ میں حسب ذیل کو شمار کیا جاتا ہے: المسیب بن علس (۲) المرقش الاکبر (۳) المتلمس (۴) عروۃ بن الورد (۵) المہلہل (۶) دُرَید بن الصمۃ (۷) المُتَنَخِّل

۲۔ پورا سلسلہ نسب یوں ہے۔ عمرو بن سعد بن مالک بن ضبیعہ بن قیس بن ثعلبہ بن عکابہ بن عدنان

۳۔ المفضلیات صف۔ ۴۵۷ تحقیق کارلوس یعقوب لائل۔ مطبوعہ بیروت ۱۹۲۰ء

۴۔ تفصیل طرفہ بن العبد کے تذکرہ میں ملاحظہ کیجئے۔   اَلمُرَقِّش۔ م پر پیش، "ر" پر زبر، "ق" پر تشدید

کہ زمین پر قلم سے حسین نقش و نگار بنا دیئے گئے ہوں۔[1]

جاہلی شعراء میں مرقش کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ بنیادی طور پر اسے غزل گو شاعر سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی واردات قلبی کا مرکز اور اس کے دنیائے دل کی ملکہ اس کی چچازاد بہن اسماء تھی۔ جو اس کے چچا عوف بن مالک کی لڑکی تھی جس کے نام پر کہتے ہیں کہ مرقش نے بھی اپنا نام عوف رکھ لیا تھا: بچپن میں دونوں ساتھ پلے بڑھے ساتھ کھیلے اور جب جوان ہوئے تو مرقش نے دیکھا کہ کھیل ہی کھیل میں وہ اپنا دل اسماء سے ہار بیٹھا ہے۔ عربوں کو اور خاص طور سے غزل گو شعراء کو ایسی محبت کم ہی راس آتی تھی چنانچہ مرقش کو بھی راس نہ آئی۔ اور آخر ہجر و فراق کے ہاتھوں اسماء کا غم لئے اس کو بغیر اپنی بنائے اس دنیا سے چل بسا۔

مرقش کو جاہلی شعراء میں دوسرا امتیاز یہ حاصل ہے کہ اسے لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ اس کے باپ سعد بن مالک نے اسے اور اس کے بھائی حرملہ کو حیرہ کے ایک عالم کے پاس بٹھا دیا تھا کہ وہ دونوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ چنانچہ اس طرح دونوں بھائیوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ یہ بات اس زمانے میں بہت اہم سمجھی جاتی تھی کیونکہ عام طور سے شعراء اور شرفائے عرب اپنے حافظہ اور راویوں پر ہی بھروسہ رکھتے تھے۔ لکھ کر کسی چیز کو یاد رکھنا یا لکھائی پر بھروسہ کرنا بہت عام بات نہ تھی۔

مرقش الاکبر مشہور جاہلی شعراء کے مقابلہ میں نسبتاً کم گو شاعر ہے۔ المفضل بن محمد الضبی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "المفضلیات" میں چھوٹے بڑے ملا کر مرقش کے ۱۴ قصیدوں کا ذکر کیا ہے۔ بعض مقطوعے الاغانی نے بھی نقل کئے ہیں۔

کلام کی امتیازی خصوصیات

ہمارے سامنے المرقش کا جو کلام موجود ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ مرقش نے فخر و حماسہ اور مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ہر جگہ اس میں غزل کا رنگ غالب ہے۔ جاہلی شعراء کی ریت پر اس نے بھی اپنے تمام قصیدوں کو تشبیب سے شروع کیا ہے۔ جن کی ابتدا عام طور سے اس کی محبوبہ اسماء کے حقیقی یا مجازی نام اور اس سے ہمکلامی سے ہوتی ہے۔ چونکہ وہ محبت میں ناکام رہا تھا، دل زخم خوردہ تھا اس لیے اس کی غزل میں بڑا سوز درد اور اثر پایا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ پوری موسیقیت اور نغمگی بھی موجود ہے۔ مرقش کے کلام میں عام طور سے بھاری بھر کم الفاظ ملتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے کلام کی سلاست و روانی اور موسیقیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ جہاں تک معانی و مطالب کا تعلق ہے وہ بہت واضح صاف اور

۱۔ البیان والتبیین۔ الجاحظ۔ ج ۱ ص ۲۰۵۔ پورا قصیدہ مفضلیات صفحہ ۲۰۸ پر ملاحظہ کیجئے۔

دل لگتے ہیں۔ افکار و خیالات میں ندرت اور گہرائی نہیں ہے۔ لیکن سچائی اور واقعیت ضرور ہے۔ چونکہ اس نے اپنے کلام میں اپنا درد دل بیان کیا ہے اس لیے قدرتی طور پر دل پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ پھر جب یہ احساس بھی قاری کو رہے کہ یہ سب کچھ شاعر کی اپنی آپ بیتی ہے۔ جگ بیتی نہیں تو قدرتی طور پر تاثر دو بالا ہو جاتا ہے۔ مرقش کے ندرت کلام کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنا وہ قصیدہ جس کی وجہ سے اس کا لقب "مرقش" پڑ گیا۔ خلیل بن احمد کی بحروں سے ہٹ کر کہا تھا اور نقادوں کی رائے میں اس میں کہیں جھول یا غیر موزونیت نہیں ہے۔ غالباً اس کی انہیں امتیازی خصوصیات کی وجہ سے لبید نے کہا تھا کہ

والشاعرون الناطقون أراهم　　سلكوا طريق مُرَقِّش ومهلهل

یعنی جتنے پرگو شاعر ہیں انھیں میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے مرقش اور مہلہل کے راستے کی پیروی کی ہے۔

البرخت ایک فارسی نژاد شاعر نے اپنے ایک حریف کا جس کی عادت تھی کہ وہ شعراء کی زبان کی غلطیاں پکڑا کرتا تھا یہ کہہ کر مذاق اڑایا ہے کہ تمہاری بے وقوفی کا تو یہ عالم ہے کہ تم مرقش جیسے شاعر کے کلام میں زبان کی غلطیاں ڈھونڈا کرتے ہو۔ حالانکہ تمہارا اپنا وجود سرتا پا تمام غلطی ہے۔

تتبع لحنا فی کلام مرقش　　وخلقک مبنی علی اللحن أجمع

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرقش کو زبان پر اتنی قدرت حاصل تھی کہ وہ دوسرے شعراء کے لیے نہ صرف مشعل راہ تھا بلکہ اگر کوئی اس کے کلام پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت کرتا تو لوگ اسے صرف خام خیال ہی نہیں بلکہ سرتاپا غلطی سمجھتے تھے۔

المرقش الاکبر کو اپنی چچازاد بہن اسماء بنت عوف بن مالک بن ضبیعہ سے عشق تھا ایک تو یہ اس کی چچازاد بہن تھی دوسرے بچپن میں اس کے ساتھ کھیلنے کی وجہ سے اس کو اس سے بڑا قلبی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اور آخر اس کی راہ میں اس نے اپنی جان بھی دے دی۔

مرقش اور اسماء

رواۃ نے بیان کیا ہے کہ جب دونوں جوان ہو گئے تو مرقش نے اپنے چچا سے اسماء کا رشتہ مانگا۔ چچا اس سے انکار تو نہ کر سکا لیکن جانتا تھا کہ آزاد منش شاعر مزاج نوجوان نہ جانے اس کی لڑکی کے ساتھ کیا کرے۔ اس لیے عوف نے شاید بات ٹالنے کے لیے مرقش سے کہا کہ ہاں شادی کر دوں گا لیکن تم پہلے اپنی حیثیت تو بناؤ۔ کچھ اپنا رعب داب جماؤ۔ کچھ شہرت حاصل کرو۔ چنانچہ مرقش یمن کے

ایک بادشاہ کے دربار میں آیا اور اس کی شان میں مدحیہ قصیدہ کہا۔ بادشاہ اپنی شان میں مدحیہ قصیدہ سن کر بہت خوش ہوا اور بہت عزت و احترام سے مرقش کو اپنے پاس رکھ لیا اور خوب انعام و اکرام سے اسے نوازا۔ ادھر اسماء کے باپ عوف بن مالک کی مالی حالت قحط اور خشک سالی کی وجہ سے بہت خراب ہو گئی تھی چنانچہ اس کے پاس قبیلہ مراد کا ایک آدمی آیا اور اس نے اسماء کا رشتہ مانگا۔ اور کہا کہ اس کے بدلے میں ایک سو اونٹ دوں گا۔ ایک سو اونٹ اس زمانے میں بڑی مالیت کا سودا تھا چنانچہ اسماء کے باپ نے سو اونٹ لے کر اس کی شادی مرادی سے کر دی۔ جب مرقش دربار میں سے واپس آیا تو اس کے بھائیوں کو یہ خطرہ ہوا کہ اگر مرقش کو اسماء کی شادی کا علم ہو گا تو اسے بہت دکھ ہو گا اور عین ممکن ہے کہ وہ مرادی سے بدلہ لے اور اس طرح ان کے قبیلہ اور مراد کے قبیلہ کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔ اس لیے انہوں نے اس خبر کو اس سے چھپانے کے لیے یہ ترکیب کی کہ ایک بکرا لے کر اسے ذبح کیا اس کا گوشت تو کھا گئے لیکن ہڈیاں وغیرہ لے کر ایک کپڑے میں باندھ کر ایک جگہ دفن کر دیں۔ اور اس پر قبر بنا دی۔ جب مرقش قبیلہ میں واپس پہنچا اور اس نے اسماء کے متعلق پوچھا تو بھائیوں نے کہا کہ وہ تو مر گئی۔ جب مرقش کو یقین کرنے میں تامل ہوا تو اسے اس بکرے کی قبر پر لے گئے اور کہا کہ یہ دیکھو اس کی قبر ہے۔ یہ سن کر مرقش کو بہت رنج ہوا اور اس نے اپنا معمول بنا لیا کہ روز قبر پر جاتا اور گھنٹوں وہیں بیٹھا رہتا۔

ایک دن اسماء کی قبر کے پاس چادر اوڑھے لیٹا تھا کہ اس کے دو بھتیجے آپس میں ایک ہڈی پر لڑنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ یہ ہڈی تو میری ہے۔ اسے تو میرے باپ نے مجھے اس وقت دیا تھا جب وہ بکرا ذبح ہوا تھا جس کی یہ قبر ہے اور جس کے متعلق یہ طے کیا گیا تھا کہ مرقش کو اس کی قبر دکھا کر یہ کہہ دیں گے کہ اسماء مر گئی ہے اور یہ اس کی قبر ہے۔ یہ سن کر مرقش اٹھ بیٹھا۔ ان لڑکوں کو بلایا اور پوچھا کہ کیا قصہ ہے۔ لڑکے نے سارا ماجرا بتا دیا اور یہ کہا کہ مرادی اسماء کو لے کر اپنے قبیلہ میں چلا گیا ہے۔ اب مرقش کو غصہ کے مارے تاب نہ رہی۔ اور اس نے طے کر لیا کہ مرادی کو قتل کر دے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے چرواہے (جو عقیلہ[1] قبیلہ کا ایک فرد تھا) اور اس کی بیوی کو ساتھ لیا (جو اس کی لونڈی تھی) اور اسماء کے شوہر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے جب نجران کے پاس جنان[2]

۱۔ اصفہانی نے الاغانی ج۔ ۵ صفحہ ۱۹۰ میں "غفیلہ" نام لکھا ہے۔ المفضل نے المفضلیات صفحہ ۴۶۸ میں قبیلہ کا نام "غفیلہ" ذکر کیا ہے۔

۲۔ اس غار کا نام خبان، خیان اور جنان بھی ذکر کیا گیا ہے۔

نامی غار کے پاس پہنچے تو مرقش سخت بیمار ہوگیا۔ یہ غار قبیلہ مراد کے علاقہ میں واقع تھا۔ مرقش کے چرواہے نے اسے اس غار میں ڈال دیا اور دو ایک دن تک اس کی تیمار داری کرتا رہا۔ جب دیکھا کہ اس کی حالت گرتی جا رہی ہے تو اپنی بیوی سے کہا۔ "یہ تو اب بچے گا نہیں۔ آؤ اسے یہیں چھوڑ دیں اور واپس اپنے گھر چلیں۔" لونڈی یہ سن کر رونے لگی اور بولی کہ اسے اس حال میں یہاں چھوڑ کر میں نہیں جا سکتی۔ اس پر چرواہا بولا کہ اچھا تم یہیں رہو میں بھوکا پیاسا مرا جا رہا ہوں۔ مجھ سے اب نہیں ٹھہرا جاتا۔ مجبوراً اس کی بیوی بھی چلنے پر تیار ہوگئی۔ مرقش اس کی یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ چنانچہ اس نے موقع پاکر چرواہے کے کجاوے کی پچھلی لکڑی پر مندرجہ ذیل شعر لکھ دیئے

یا صاحبی تلوما لا تعجلا ۔۔۔ إن الرحیل رهین ان لا تعذلا

فلعل بطأ کما یفرط سیئاً ۔۔۔ أو یسبق الإسراع سیبا مقبلا

یا راکباً[1] اما عرضت فبلغن ۔۔۔ أنس بن سعد إن لقیت وحرملا

للّٰہ درکما و در أبیکما ۔۔۔ ان أفلت الغفلی حتی یقتلا

من مبلغ الأقوام ان مرقشا ۔۔۔ أمسی علی الأصحاب عبأ مثقلا

ذهب السباع بأنفه فترکنه ۔۔۔ اعغی علیه بالجبال وجیئلا

وکأنما ترد السباع بشلوه ۔۔۔ اذ غاب جمع بنی ضبیعة منهلا

یعنی۔ اے میرے دونوں ساتھیو! ذرا ادر انتظار کر لو۔ اتنی جلدی نہ کرو کیونکہ اگر اس سفر میں تم نے کامیابی حاصل کر لی تو پھر تم لعنت ملامت سے بچے رہو گے۔ ممکن ہے کہ تم پر کوئی مصیبت آنے والی ہو تو وہ اس انتظار کی وجہ سے ٹل جائے۔ یا کوئی نفع بخش چیز حاصل ہونے والی ہو تو تمہارے جلدی جانے کی وجہ سے تمہارے ہاتھوں سے نکل جائے۔ اے دونوں سوارو جب تم قبیلہ میں پہنچ جاؤ تو انس بن سعد سے اور حرملہ سے ملاقات ہو (یہ دونوں مرقش کے بھائی تھے) تو ان سے کہنا کہ خدا تمہارا اور تمہارے باپ کا بھلا کرے کیا "غفلی" (چرواہا) بغیر قتل ہوئے بچ رہے گا۔ کون ہے جو میری قوم کو یہ بتلا دے کہ مرقش دوستوں کے لیے ایک بھاری بوجھ بن گیا تھا اور یہ کہ درندوں نے اس کی ناک کھالی ہے اور اسے پہاڑوں

---

[1] بعض روایتوں میں راکبا (واحد) بھی آیا ہے مگر تثنیہ اس موقع پر زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ مخاطب دو تھے۔ چرواہا اور اس کی بیوی

میں بجوؤں کے حوالے کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنو ضبیعہ نے جب اس کی کوئی خیر خبر نہ لی، تو درندوں نے اس کی بچی کھچی ہڈیوں کو اپنا گھاٹ بنا لیا۔

چرواہا اپنی بیوی کو لے کر مرقش کو اسی حالت میں چھوڑ کر گھر کو واپس ہو گیا۔ جب یہ دونوں مرقش کے قبیلے میں پہنچے اور لوگوں نے مرقش کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ مرقش مر گیا۔ اتفاقاً مرقش کے بھائی حرملہ کی نظر چرواہے کے کجاوے پر پڑ گئی۔ اس پر اسے کچھ لکھا نظر آیا۔ چنانچہ اس نے جو غور کیا تو مذکورہ بالا اشعار اس کی سمجھ میں آ گئے۔ اس نے بلا کر چرواہے اور اس کی بیوی کو ڈرایا دھمکایا کہ صحیح بات بتا دو۔ چنانچہ اس نے پورا قصہ بتا دیا کہ فلاں غار میں ہم اسے انتہائی خراب حالت میں چھوڑ آئے تھے۔ یہ سن کر حرملہ کو طیش آ گیا اور اس نے چرواہے کو فوراً قتل کر دیا اور خود بھائی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

ادھر مرقش بے یار و مددگار اس غار میں پڑا رہا۔ اتفاق سے ایک چرواہا ادھر سے گزرا۔ اس کی نظر غار میں پڑی تو اس نے مرقش سے پوچھا کہ بھئی تم کون ہو اور یہاں کیسے پڑے ہو۔ مرقش نے کہا کہ میں قبیلہ مراد کا ایک فرد ہوں اور بیمار ہو کر یہاں پھنس گیا ہوں۔ اچھا تم کون ہو۔ تو چرواہا بولا کہ فلاں شخص کا چرواہا ہوں۔ اتفاق سے یہ اسماء کے شوہر کا نام تھا۔ مرقش نے کہا کہ کیا تم مالک کی بیوی اسماء سے کچھ کہہ سکتے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ نا صاحب یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ اس سے بات کرنا تو دور رہا آج تک اس کو کسی نے دیکھا بھی نہیں۔ مرقش نے کہا کہ اس سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی طریقہ ہے۔ جی ہاں، چرواہا بولا۔ جب شام کو میں ریوڑ لے کر گھر جاتا ہوں تو اسماء کی لونڈی ایک برتن لے کر آتی ہے اس میں بکری کا دودھ دوہ کر دے دیتا ہوں وہ اسماء کو لے جا کر پلاتی ہے۔ اچھا تو ایک کام کرو۔ مرقش نے کہا آج شام کو بکری کا دودھ دینا تو برتن میں چپکے سے میری یہ انگوٹھی ڈال دینا۔ اس کے بدلے میں تم کو اتنا انعام ملے گا جتنا آج تک کسی چرواہے کو نہ ملا ہوگا۔ چنانچہ چرواہے نے ایسا ہی کیا۔ جب اسماء نے دودھ پینا شروع کیا تو انگوٹھی اس کے دانت سے لگی۔ وہ چونکی۔ اس نے روشنی میں دیکھا تو انگوٹھی نکلی۔ اب اس نے لونڈی کو بلا کر پوچھا کہ یہ انگوٹھی اس برتن میں کیسے پڑ گئی؟ اور یہ کس کی ہے؟ لونڈی نے جب لاعلمی ظاہر کی تو اسماء نے اپنے شوہر کو جو اس وقت قبیلہ سے باہر تھا بلوا بھیجا اور کہا کہ مجھے دودھ کے برتن میں یہ انگوٹھی ملی ہے۔ اپنے چرواہے کو بلا کر پوچھو کہ یہ دودھ میں کیسے آ گئی اور یہ کس کی ہے۔ چنانچہ جب اس کے شوہر نے چرواہے سے انگوٹھی کا قصہ پوچھا تو اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا اور کہا کہ وہ نوجوان غار میں پڑا دم توڑ رہا ہے۔ یہ سن کر اسماء بولی ہو نہ ہو یہ مرقش

ہی ہے۔ جلدی کرو۔ فوراً چلو اس کی خبر لیں۔ چنانچہ میاں بیوی دونوں فوراً نکل کھڑے ہوئے جب غار پر پہنچے تو دیکھا کہ مرقش بری حالت میں پڑا ہے اور اس کی ناک درندوں نے کھالی ہے چنانچہ دونوں نے اسے نکالا اور اپنے قبیلہ میں لے آئے یہاں پہنچ کر مرقش نے دم توڑ دیا اور وہیں دفن کر دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ مرقش کا بھائی جب غار کے پاس پہنچا اور پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ مرقش کو اسمار اور اس کا شوہر آ کر لے گئے ہیں اور وہ وہاں جا کر مرگیا ہے یہ خبر سن کر حرملہ اپنے گھر واپس آگیا اور قبیلہ مراد میں نہیں گیا۔ راویوں نے کہا ہے کہ مرنے سے پہلے غار کے اندر مرقش نے ایک بڑا خوبصورت اور پرسوز قصیدہ کہا تھا جس کے اشعار تھے۔

سری لیلاً خیال من سلیمیٰ	فأرقنی وأصحابی هجود
فبت أدیر أمری کل حال	وأرقب أهلها وهو بعید
علی أن قد سما طرفی لنار	یشب لها بذی الارطی وقود
حوالیها مها جم التراقی	وآرام وغزلان رقود
نواعم لاتعالج بؤس عیش	اوانس لاتراح ولا ترود
یرحن معًا بطاءً المشی بُدًا	علیهن المجاسد والبرود
سکن ببلدة وسکنت اخریٰ	وقطّعت الوثائق والعهود
فمابالی أفی ویخان عهدی	ومابالی اصاد ولا أصید
ورب اسیلة الخدین بکر	منعمة لها فرع وجید
وذو أشر شتیت النبت عذب	نقی اللون بَرّاق بَرود
لهوت بها زمانا من شبابی	وزارتها النجائب والقصید
أناس کلما اخلقت وصلا	عنانی منهم وصل جدید[1]

یعنی رات کے سناٹے میں جب میرے دوست خراٹے لے رہے تھے تو مجھے یکایک سلیمیٰ کی یاد تڑپا گئی اور ہر پہلو سے اپنے معاملہ پر غور کرنے لگا۔ اور خیالوں ہی میں اس کے گھر والوں کو دیکھتا رہا حالانکہ وہ لوگ مجھ سے بہت دور تھے۔ اتنے میں میری نگاہ ایک

---

(۱) المفضلیات — للضبی۔ صفحہ ۲۶۰ قصیدہ نمبر ۴۹۔ تحقیق لائل۔

آگ پر پڑی جیسے لکڑیاں ڈال کر خوب روشن کیا جارہا تھا۔ اس کے ارد گرد خوب پرگوشت نیل گائیں اور ہرنیاں لیٹی ہوئی تھیں (یعنی اس آگ کے ارد گرد خوب گدرائی اور حسین وجمیل دوشیزائیں لیٹی ہوئی تھیں) یہ بڑی ناز پروردہ تھیں۔ انہیں زندگی کی مشقتوں کی کوئی فکر نہ تھی۔ اور نہ انہیں تلاش معاش میں ادھر ادھر مارے مارے پھرنے کی ضرورت تھی۔ اور جب یہ سب ایک ساتھ چلتی تھیں تو اپنی رانوں کے پرگوشت ہونے کی وجہ سے ہولے ہولے قدم دھرتی تھیں۔ یہ دوشیزائیں زعفرانی رنگ کے کپڑوں اور چادروں میں ملبوس تھیں۔ یہ مجھ سے الگ ہو کر دور ایک شہر میں جا بسیں اور میں دوسرے ہی شہر میں رہ گیا۔ اور ان سے ملنے کے سارے عہد و پیمان ٹوٹ کر رہ گئے۔ (یعنی عوف شادی کرنے کا وعدہ کر کے پھر مکر گیا) تو جب مجھ سے وعدہ خلافی کی گئی ہے تو میں ہی کیوں وعدہ وفا کروں۔ اور کیوں میں شکار بن جاؤں۔ اور خود شکار نہ کروں۔ اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک چکنے رخساروں والی کنواری دوشیزہ کے ساتھ جس کے بال بڑے نرم وچمکدار تھے اور جس کے دانت چھدرے موزوں اور حسین تھے اور جس کا لعاب دہن بڑا شیریں صاف ستھرا چمکیلا اور ٹھنڈا تھا میں نے اپنی جوانی کے دنوں میں خوب دل کھول کھول کے داد عیش وعشرت دی ہے۔ اور اس سے ملنے کی خاطر موٹی تازی اور خالص نسل کی اونٹنیاں جاتی تھیں (یعنی ایسی اونٹنیوں پر بیٹھ کر میں اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ اس دوشیزہ سے یا اس کے گھر والوں سے جب تعلقات بگڑ جاتے تھے تو مجھے نئے سرے سے تعلقات جوڑنے میں بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

یہ قصیدہ مرقش کے کلام کا بہترین نمونہ ہے اور سلاست و روانی۔ اثر و سوز اور نغمگی و موسیقیت میں مرقش کے سارے کلام پر بھاری ہے۔

اسمار سے رشتہ مانگنے کے سلسلہ میں ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبیلہ مراد کے قرن الغزال نامی ایک شخص نے بھی اس کا رشتہ مانگا تھا۔ آدمی مالدار تھا۔ چنانچہ عوف نے چپکے سے اسمار کی شادی اس سے کر دی اور اس ڈر سے کہ اگر مرقش اس کا علم ہو گیا تو وہ قرن الغزال کو مار ڈالے گا، رخصتی نہیں کی۔ اتفاق سے مرقش اپنے اونٹ چرانے چلا گیا اور باپ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسمار کو مرادی کے ساتھ رخصت کر دیا۔ جب مرقش چراگاہ سے واپس آیا اور ایک لڑکے کے ذریعہ اسے اسمار کی شادی اور رخصتی کا علم ہوا تو اسے بہت غصہ آیا اور وہ تلوار لگا کر قرن الغزال کو مارنے کے لیے چل نکلا۔ جب پاس پہنچا اور لوگوں نے اسے آتے دیکھا تو قرن الغزال سے کہا کہ دیکھو یہ مرقش آگیا۔ یہ تم سے انتقام ضرور لے گا اس لیے تم تو یہاں سے آگے

بٹھ جاؤ اور اسماء سے کہا کہ جب وہ تیرے پاس پہنچے تو تم ہودہ سے منہ نکال کر اسے بلا لینا اور باتوں میں لگا لینا۔ اتنے میں اس کے بھائی آجائیں گے اور وہ مرقش کو واپس لے جائیں گے۔ اور اس طرح تمہارا شوہر بچ جائے گا۔ چنانچہ یہ ترکیب چل گئی۔ اسماء اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی اتنے میں مرقش کے بھائی انس اور حرملہ آگئے اور اسے خوب برا بھلا کہا اور زبردستی واپس لے گئے۔ مرقش کو اب اسماء کے ملنے سے پوری ناامیدی ہوگئی۔ اور اس نے ایک بڑا موثر قصیدہ کہا جس کا مطلع تھا۔

أمن آل اسماء الرسوم الدوارس　　يخطط فيها الطير قفر بسابس

ذكرت بها اسماء لو أن وليها　　قريب ولكن حبستني الحوابس[1]

یعنی یہ مٹتے نشانات منزل اسماء کے گھر والوں کے ہیں۔ لیکن اب یہاں ایسی ویرانی پھیلی ہے کہ چڑیوں نے اسے اپنی آماجگاہ بنالی ہے۔ مجھے یہ نشانات دیکھ کر اسماء بے اختیار یاد آگئی اور باوجودیکہ اس کی منزل یہاں سے قریب ہی تھی لیکن میں وہاں تک بعض رکاوٹوں کی وجہ سے نہ جاسکا۔

مرقش نے ایک اور قصیدہ کہا ہے جس میں اسماء سے دوری اور مہجوری کا بڑے دکھ درد سے تذکرہ کیا ہے۔ کہتا ہے:

یہ دل اسماء کی محبت میں ایسا سرشار اور بے خود ہے کہ کسی چیز کی سدھ بدھ ہی نہ رہی۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ محبت اور عشق کا یہی انجام ہے۔

مرقش کے دل و دماغ پر اسماء اس طرح چھائی تھی کہ ہر جگہ اور ہر چیز میں اسی کا جلوہ دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے اس کا سارا کلام اس کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ ایک جگہ اسما کا بہت ہی حسین سراپا کھینچتا ہے۔ کہتا ہے:

ألا بان جيراني ولست بعائف　　أدان بهم صرف النوى أم مخالفي

وفي الحيّ ابكار سبين فؤاده　　علالة ما زوّدنه والحب شاعفي

دقاق الخصور لم تعفر قرونها　　لشجو ولم يحضرن حمّى المزالف[2]

نواعم ابكار سرائر بُدّنٌ　　حسان الوجوه ليّنات السوالف

يهدّلن في الآذان من كل مذهب　　له هذيعيا به كل واصف

---

(۱)۔ المفضلیات۔ قصیدہ نمبر ۴۷۔ صفحہ ۴۹۲

(۲)۔ حمی بخار۔ المزالف۔ بڑے قصبے جیسے قادسیہ اور انبار۔

ترجمہ ـــــ یعنی میرے پڑوسی مجھ سے بچھڑ گئے تو میں چڑیوں کو اڑا کر یہ فال نہیں نکالوں گا کہ دوری و مجبوری کی مصیبتیں مجھے ان سے قریب کریں گی یا دور ہی رکھیں گی۔
اور قبیلہ میں ایسی دوشیزائیں ہیں جنھوں نے میرے دل کو پوری طرح اپنا قیدی بنالیا ہے اور بغیر کچھ لیے دیئے اپنے بس میں کرلیا ہے اور میری یہ حالت ہے کہ ان کی محبت رگ و پے میں سرایت کرگئی ہے
ان دوشیزاؤں کی کمر پتلی ہے اور ایسی ناز پروردہ ہیں کہ وہ رنج و غم اور بیماری و آزاری کو جانتی بھی نہیں۔
یہ بڑی نرم و نازک اور گدرائی کنواریاں ہیں۔ جن کے چہرے حسن سے دمکتے اور جن کی گردنیں نرمی سے لچکتی ہیں۔
یہ اپنے کانوں میں سونے کے حسین آویزے پہنے ہیں اور ان میں ایسی دلکش جنبش ہوتی ہے کہ جن کا بیان کرنا ممکن نہیں۔
آگے چل کر ان کے انداز دلربائی کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

نصُرن شتیًا لا یبالین غیّہ   یعوّجن من أعناقھا بالمواقف

یعنی ـــــ یہ دوشیزائیں اپنے اونٹوں کو پھیر کر آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور پھر اس کے چھیڑ چھاڑ کو برا نہیں مانتیں۔ (بلکہ لطف لیتی ہیں) اور چپکے چپکے بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہیں اس انداز سے کہ ہر کس و ناکس انھیں سن نہ سکے۔

نثرن حدیثاً آنسا فوضعنہ   خفیفاً فلا یلغی بہ کل طائف"[1]

مرقش نے بعض اشعار فخریہ بھی کہے ہیں۔ ان میں سے نمونے کے یہ اشعار ہیں۔

ھلا سألت بنا فوارس وائل   فلنحن أسرعھا الی أعدائھا

ولنحن أکثرھا إذا عُدّ الحصی   ولنا فواضلھا وجد لوائھا

ترجمہ   ہماری شجاعت اور بہادری کے متعلق وائل کے شہسواروں سے پوچھو وہ تمہیں بتائیں گے کہ ہم اس کے دشمنوں کی طرف اس سے بھی زیادہ تیزی سے جاتے ہیں اور اگر ہماری تعداد گنی جائے تو ہم سنگریزوں سے بھی زیادہ نکلیں گے اور ہمارے لیے

1۔ المفضلیات ۔ ص۲۲۴

ساری فضیلتیں اور ان کے بھنڈے کی عزت و آبرو ہے۔
کچھ فخریہ اشعار اس کے اس مشہور قصیدہ میں بھی ہیں جس کا مطلع ہے :

هل بالديار ان تجيب صمو — لو كان رسو منا طقا كلمو[1]

مرثیہ میں بھی اس نے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اس فن میں اس کا رنگ جم نہ سکا۔ مرقش الاکبر نے جیسا کہ اوپر بیان ہوا مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن جاہلی شعراء میں صنف غزل میں جو امتیاز اسے حاصل ہے اور جو درد و کسک اس کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے عشق میں زندگی گزاری۔ اور اس کی خاطر اپنی جان دیدی۔ اس کی غزل در حقیقت اس کی زندگی کے المیہ کی کہانی ہے۔ جو شعر میں ڈھل کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔

---

(۱) پورے قصیدے کے لیے دیکھئے المفضلیات صفو ۴۸۵

حوالے

۱۔ المفضلیات لمحمد الضبی تحقیق چارلس جیمس لائل
۲ الاغانی۔ جلد ۵
۳۔ البیان والتبیین۔ جلد اول تحقیق عبدالسلام محمد ہارون
۴۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔
۵۔ خزانۃ الادب للالوسی
۶۔ معجم المرزبانی
۷۔ دائرۃ المعارف الاسلامیہ۔
۸۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ۔ جرجی زیدان
۹۔ المفضلیات للضبی تحقیق : احمد محمد شاکر اور عبدالسلام محمد ہارون

عَلقَمَۃ الفَحل

م ۶۲۵ء یا ۵۹۸ء

علقمہ الفحل (نر علقمہ) جاہلی شعراء میں اصحاب المنتقیات کے زمرہ میں شمار کیا جاتا ہے جن کا درجہ اصحاب المجمہرات کے بعد آتا ہے۔ عبدالسلام الجمعی نے شعرائے جاہلیت کے چوتھے طبقہ میں عبید بن الابرص کے بعد اس کا ذکر کیا ہے۔ علقمہ قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا پورا نام علقمہ بن عبدہ تھا۔(۱)

کہتے ہیں کہ جاہلی شعراء میں علقمہ وہ شاعر ہے جس نے امرؤ القیس جیسے پرگو شاعر کو میدان شعر و سخن میں شکست فاش دی تھی اور اسی جیت کے نتیجے میں اس کا لقب "الفحل" یعنی "نر" ہو گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ امرؤ القیس نے قبیلہ طے کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی جس کا نام اُمِ جُنْدُبْ تھا۔ ام جندب امرؤ القیس کو کچھ بہت زیادہ اس وجہ سے پسند نہیں کرتی تھی کہ اس کے پسینے سے بو آتی تھی۔ اور شاید کچھ فطری کمزوریاں بھی تھیں جن کا ذکر امرؤ القیس کے سلسلہ میں ہو چکا ہے۔ علقمہ امرؤ القیس کا دوست تھا۔ اور اپنے زمانے کا نامور شاعر۔ ایک دن علقمہ بھی قبیلہ طے میں آن پہونچا اور امرؤ القیس کی سسرال میں ٹھہرا۔ باتوں باتوں میں معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ دونوں نے ایک دوسرے سے بڑا شاعر ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ آخر میں بات اس پر ٹھہری کہ دونوں ایک ہی قافیہ اور ردیف میں اپنی شاعری کے جوہر دکھائیں۔ پاس ہی ام جندب بھی کھڑی تھی۔ علقمہ نے کہا کہ اور ہمارے تمہارے درمیان تمہاری بیوی ثالث ہوگی۔ جس کے حق میں یہ فیصلہ دیدے وہ بڑا شاعر۔ اس پر دونوں راضی ہو گئے۔ ام جندب نے کہا کہ اچھا تم دونوں اپنے گھوڑے سے شکار کرنے

---

(۱) پورا سلسلہ نسب یوں ہے: علقمہ بن عبدہ بن النعمان بن قیس احد بن عبید بن ربیعہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم بن مرو بن ادبن طابخہ بن الیاس بن مضر بن نزار۔ طبقات فحول الشعراء ص ۱۲۹

کا منظر کھینچو مگر ردیف اور قافیہ ایک ہی ہو۔ چنانچہ امرؤ القیس نے اپنا وہ مشہور قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے :

خلیلی مرّا بی علی اُم جندب　　　لنقضی حاجات الفوأد المعذب[1]

یعنی اے میرے دونوں دوستو! ذرا مجھے ام جندب کے پاس لے کر چلو تاکہ ہم اپنے غم کے مارے دل کی (ضرورتیں) دکھ درد تو ختم کریں۔

اس کے بعد محبوبہ کے قافلہ کی روانگی، ہجر و فراق کا نقشہ کھینچتا ہے۔ پھر اپنی اونٹنی کی تعریف شروع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میری اونٹنی بڑی گرانڈیل لمبی چوڑی اور سفید رنگ کی ہے اور اتنی تیز رفتار کہ لگتا ہے کہ اس کا کجاوا اس پر نہیں بلکہ ایک خوبصورت تنومند زبرے کی پیٹھ پر کسا ہوا ہے۔

اس کے بعد اپنی مہم جوئی کا ذکر کرتا ہے اور یہ سفر اپنے اس کم بال والے گھوڑے پر بیٹھ کر کرتا ہے جو جنگلی جانوروں کو اپنی برق رفتاری کی وجہ سے بھاگنے نہیں دیتا اور مدتوں شکار کو بھگا کر پکڑنے کی وجہ بہت دبلا پتلا ہو گیا ہے۔ اور یہاں سے اپنے اس نامی گھوڑے کا وصف شروع کر دیتا ہے اور اس کے انگ انگ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اس کی چال ڈھال بتاتا ہے۔ گھوڑے کے اوصاف بیان کرنے کے بعد اس کے ذریعہ سے ایک جانور کے شکار کرنے کا منظر کھینچتا ہے۔ اور یہی وہ شعر ہے جو اس شعری مقابلہ میں ہار جیت کی بنیاد بنا۔ چنانچہ کہتا ہے کہ "جب اسے ایڑ لگاؤ تو وہ اتنی تیزی سے بھاگتا ہے جتنی تیزی سے آگ لگتی ہے۔ اور جب کوڑا مارو تو تیر کی طرح گردن کو آگے کر کے ہوا ہو جاتا ہے اور جب ڈانٹو تو تیز رفتار سفید رنگ کے نر شتر مرغ کی طرح سرپٹ ہو جاتا ہے۔ میرے ان اوصاف کے گھوڑے نے لٹو کی طرح تاکر ایک ہی از قند میں شکار کو بغیر موڑے ہوئے اور بغیر تھکے ہارے قابو میں کر لیا۔

فللساق الهوب وللسوط درة　　　وللزجر منه وقع أهوج مهذب

فادرك لم يجهد ولم يثن شأوه　　　يمر كخذروف الوليد المثقب

اس کے بعد اس شکار کو کس طرح پکایا گیا اور یاران خوش باش و سرمست کے ساتھ کس طرح کھایا گیا اس کا ذکر کرتا ہے اور اس پر یہ قصیدہ ختم ہو جاتا ہے جس میں بروایت لویس شیخو ۵۲ شعر ہیں[2]۔

۱۔ دوسرا مصرعہ اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے۔ نقضّ لبانات الفؤاد المعذب

۲۔ ملاحظہ کیجیے۔ شعراء النصرانیۃ للیسوعی صفحہ ۲۲ اس کتاب میں امرؤ القیس کے مذکورہ شعر کا دوسرا مصرعہ یوں آیا ہے۔ وللزجر منه وقع اهوج منعب

جب امرؤالقیس اپنا قصیدہ پڑھ چکا تو ہمارے شاعر علقمہ کی باری آئی۔ چنانچہ اس نے بھی اسی ردیف اور قافیہ میں اپنا قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے۔

ذھبت من الھجران فی غیر مذھب ولم یکن حقا کل ھذا التجنب[1]

تم تو ہجر و فراق سے اتنے دل برداشتہ اور کبیدہ خاطر ہو گئے کہ رہ و رسم عاشقی کو بھلا کر دوسری ڈگر پر ہو لیے حالانکہ اس طرح بالکل ترک محبت راہ وفا کے خلاف ہے۔

اس کے بعد امرؤالقیس کے جواب میں اس نے بھی پہلے اپنی اونٹنی پھر اپنے گھوڑے کا وصف بیان کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ میرا گھوڑا تن و توش میں صحرائی نر شتر مرغ کی طرح ہے۔ امرؤالقیس کے گھوڑے کا رنگ اگر سفید ہے تو میرے گھوڑے کا رنگ حنائی ہے۔ اس کے اگلے پاؤں میں بہت کم بال ہیں اور منہ جیسے غنچہ۔ اس کا سینہ خمیدہ، سر اور گردن بہت دبلے پتلے، جنگلی جانوروں کو مستقل دوڑاتے رہنے سے جسم بڑا چھریرا اور چال ایسی متوالی ہوا بردوش کہ صبا کو بھی پیچھے چھوڑے جائے۔ ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر میں صبح سویرے جب کہ چڑیاں بھی اپنے گھونسلوں میں سے نہیں نکلی ہوتی ہیں نکل کھڑا ہوتا ہوں۔

وقد اغتدی والطیر فی وکناتھا وماء الندی یجری علی کل مذنب

بمنجرد قید الأوابد لاحہ طراد الھوادی کل شاؤ مغرب

کمیت کلون الارجوان نشرتہ لبیع الرداء فی الصوان المکعب

ان کے بعد سیر و شکار کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اپنے مذکورہ اوصاف والے گھوڑے پر اپنی مہم پر چلا جا رہا تھا کہ ہم نے ... اور نیل گایوں کی ڈاروں اس شان سے اٹھلاتی، اتراتی جھاڑیوں کو چیرتی دکھائی دیں جیسے وہ بھاری بھرکم زرق برق عبائیں پہنے دوشیزائیں ہوں۔ اور جب وہ سامنے آئیں تو میرا یہ ... گھوڑا ان پر ٹوٹ پڑا۔ اور محض اپنی لگام کی رسی کے اشارے سے ہی تیزی سے جھپٹ کر اس نے ان کو پکڑ لیا۔ (یعنی اسے نہ ایڑ لگانے کی ضرورت پیش آئی اور نہ ڈانٹنے کی۔ بلکہ صرف اشارے پر ہی اس نے شکار کو دبوچ لیا۔)

رأینا شیاھا یرتعین خمیلۃ کمشی العذاری فی الملاء المھدب

---

[1] المفضل الضبی نے "المفضلیات" میں دوسرا مصرعہ یوں لکھا ہے:

ولم یکن حقا طول ھذا التجنب

نبیت تماریۃ وعقد عہد اسائہ   خرجن علینا کالجمان المثقب
واقبل یھوی ثانیا من عنانہ   یمر کمر الرائح المتحلب[1]

آخر الذکر یہی شعر تھا جس کی وجہ سے اسے امرؤالقیس کے مقابلہ میں جیت ہوئی۔ اس کے بعد پھر اپنے گھوڑے کی تعریف کرتا ہے۔ اور شکار کرنے کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد امرؤالقیس ہی کی طرح اس شکار کو کھانے اور اس کی بڈی گنڈی کے اپنے خیمے کے ارد گرد پھیلے رہنے کا ذکر کرتا ہے۔ علقمہ کے اس قصیدہ میں ۴۴ شعر ہیں۔

جب دونوں شاعر اپنا اپنا قصیدہ سنا چکے تو ام جندب نے امرؤالقیس کو مخاطب کر کے کہا۔ " علقمہ کا گھوڑا تمہارے گھوڑے سے اچھا ہے"۔ اس پر امرؤالقیس بولا کہ وہ کیسے۔ تو عورت نے جواب دیا کہ " تمہیں اپنے گھوڑے کو ایڑ لگانے، کوڑا مارنے اور ڈانٹنے ڈپٹنے کی ضرورت پڑی۔ برخلاف اس کے علقمہ کے گھوڑے نے محض لگام کے اشارے سے ہی اپنے شکار کو دبوچ لیا۔" امرؤالقیس نے کہا کہ نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ تمہارا دل علقمہ پر آگیا ہے۔ اس لیے اس کی تعریف کر رہی ہو اور اس سے خفا ہو گیا۔ اور فوراً طلاق دیدی۔ چنانچہ علقمہ نے اس سے شادی کر لی اور اسی دن سے اس کا لقب " نر" (الفحل) ہو گیا۔

بعض رواۃ نے یہ بھی کہا ہے کہ علقمہ کو " الفحل" (نر) اس لیے کہتے تھے کہ اس کے قبیلہ کا ایک اور شاعر بھی علقمہ کے نام سے اسی زمانہ میں پایا جاتا تھا۔ چنانچہ موخرالذکر علقمہ کو " الخصی" کہتے تھے۔ اس لقب کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ایک دفعہ یہ علقمہ یمن میں اپنے دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا مگر موقع پاکر قید سے نکل بھاگا۔ لیکن اس کے دشمنوں نے پتہ لگا کر اسے پکڑ لیا۔ علقمہ پھر قید سے بھاگ نکلا مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا اور پھر پکڑا گیا۔ اب کی دفعہ اس کے دشمنوں نے اس جرم کی سزا میں اسے بدھیا کر دیا اور اسی دن سے اس کا لقب علقمہ الخصی یعنی " بدھیا علقمہ" پڑ گیا۔[2] تاکہ اس میں اور

۱۔ تذکرہ کی کتابوں میں اس شعر کے بارے میں جس سے علقمہ کو جیت ہوئی اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بعض نے یہ شعر لکھا ہے۔

اذا ما اقتنصنا لم نقد ۲ بجنبۃ   ولکن ننادی من بعید الا ارکب

اس قصہ میں بھی تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے " المفضلیات"۔ صفحہ ۹۴،

۲۔ " علقمہ الخصی" کا پورا سلسلۂ نسب یہ ہے ـــ علقمہ بن سہیل بن ربیعہ بن مالک (باقی صفحہ ۳۱۰ پر)

ہمارے شاعر علقمۃ الفحل میں امتیاز کیا جا سکے۔

مذکورہ بالا قصہ کی حیثیت

نقادوں نے علقمۃ الفحل اور امرؤ القیس کے درمیان اس مقابلہ کی صحت کے بارے میں خاصے شکوک کا اظہار کیا ہے چنانچہ ڈاکٹر شوقی ضیف نے لکھا ہے "خیال یہ ہے کہ یہ قصہ اور اس سے متعلق دونوں شاعروں کے دونوں قصیدے بعد کی ایجاد ہیں۔ اور اصلیت سے ان کا تعلق نہیں"۔ قدماء میں سے جن نقادوں نے ان کے بارے میں شک کا اظہار کیا ہے ان میں قابل ذکر ابن المعتز ہے[1] اور المرزبانی نے اپنی کتاب الموشح میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

جدید علماء میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بھی یہی رائے قائم کی ہے یہ قصہ اور اس سے متعلق اشعار من گھڑت کہانیاں ہیں کیونکہ دونوں قصیدوں میں ایسی سلاست و روانی معانی میں ایسی نزاکت اور باریک بینی ہے جو اسلامی عہد کی غمازی کرتی ہے۔ پھر ان دونوں قصیدوں میں صرف معانی میں ہی توارد نہیں ہے بلکہ الفاظ اور بعض اشعار میں بھی توارد پایا جاتا ہے[2] اور سب سے بڑی وجہ اس قصہ اور ان قصیدوں کی صحت کے بارے میں شک کرنے کی یہ ہے کہ ان دونوں شاعروں کے وہ اشعار جن کی بدولت ایک کو فتح اور دوسرے کو شکست ہوئی علماء میں ان کے بارے میں بھی اتفاق نہیں ہے۔ چنانچہ علقمۃ الفحل کے اس شعر کو جس کی بنا پر ام جندب نے اسے امرؤ القیس سے بڑا شاعر ہونے

(بقیہ) بن زید مناۃ بن تمیم۔ اس کی کنیت ابو الوضاح تھی اور عمان کے علاقہ میں رہتا تھا۔ (تفصیل کتاب الشعر والشعراء۔ لابن قتیبہ)

(1) ابن قتیبہ نے تیسری دفعہ بھاگنے پر غصی کیے جانے کا ذکر کیا ہے۔ ابن المعتز نے ایک کتاب تذکرہ شعرائے عرب پر لکھی تھی۔ تفصیل امیر المومنین ابن المعتز کے حالات زندگی میں ملے گی۔ دیکھئے حاشیہ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ، جرجی زیدان، جلد اول۔ صفحہ ۱۴۹

(2) جیسے امرؤ القیس کے قصیدہ کا تیرھواں، چودھواں اور بیسواں شعر کہ علقمہ کے آٹھویں، نویں اور پانچویں شعر سے لفظا بلفظ ملتے ہیں۔ چنانچہ امرؤ القیس نے کہا ہے۔

وقد اغتدی والطیر فی وکناتہا ۔۔۔ وماء الندی یجری علی کل مذنب

بمنجرد قید الأوابد لاحہ

طراد الهوادی کل شاؤ مغرب

اور بالکل انہیں الفاظ کے ساتھ یہی اشعار علقمہ کے قصیدہ میں بھی ملتے ہیں۔

کا فتویٰ دیا۔ اور جس میں کہتا ہے کہ

فأدركهن ثانيا من عنانه　　　يمر كمر الرائح المتحلب

امرؤ القیس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح امرؤ القیس کے اس شعر کو جس کی بنا پر اسے علقمہ کے مقابلے میں شکست ہوئی اسے علقمہ سے منسوب کیا گیا ہے اور وہ شعر ہے۔

فللسوط الهوب وللساق درة　　　وللزجر منه وقع اهوج منعب[1]

اس کے علاوہ دونوں قصیدوں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی شاعر کی بھی کوئی شخصیت ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ بلکہ جو چیز واضح اور کھل کر سامنے آتی ہے وہ ہے گھوڑے کی تعریف اور اس کے انگ، چال ڈھال اور حرکات وسکنات کی تصویر۔ اور یہیں سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قصیدے اسلامی دور میں ان لوگوں نے وضع کئے ہیں جو اپنی زبان دانی اور گھوڑے کے اوصاف میں مہارت رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس قسم کے دعویٰ داروں میں ابو عبیدہ اور اصمعی کا نام خاص طور سے لیا جاتا ہے جو گھوڑے کے علم کے بارے میں اور عربوں نے جس جس طرح ان کا وصف بیان کیا ہے اس کے بارے میں آپس میں مقابلہ کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے ان ہی لوگوں نے اپنی زبان دانی کا سکہ جمانے کے لیے یہ قصائد یہ قصیدے وضع کیے ہوں اور ان شاعروں کے نام سے منسوب کر دیئے ہوں اور یہی بات قرین قیاس ہے۔

علقمہ سے یوں تو بہت سے چھوٹے بڑے قصیدے منسوب ہیں لیکن ان میں سے دو قصیدے ایسے ہیں جن پر تقریباً سارے تذکرہ نگاروں اور راویوں کا اتفاق ہے ان میں سے ایک تو وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے (۲)؛

طحابك قلب فى الحسان طروب　　　بعيد الشباب عصر حان مشيب

اور دوسرا وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع یوں ہے:

هل ما علمت وما استودعت مكتوم　　　أم حبلها إذ نأتك اليوم مصروم

یعنی کیا اس راز درون پردہ کو جسے محبوبہ نے تمہارے پاس بطور امانت رکھا تھا اس امید میں کہ تم اس سے وفا کرتے رہو گے آج محبوبہ کے دور ہو جانے کے بعد فاش کر کے رکھ دو گے؟

۱۔ فی الادب الجاہلی۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔

۲۔ لویس شیخو الیسوعی نے "شعراء النصرانیہ" میں علقمہ کے چھوٹے بڑے ۱۶ قصیدے نقل کیے ہیں۔

ابن سلام الجمحی نے مذکورہ بالا دونوں قصیدوں کے علاوہ اس قصیدہ کو علقمہ کے بہترین قصائد میں شمار کیا ہے جس کی بدولت اسے امرؤ القیس کے مقابلہ میں جیت ہوئی تھی اور جس کا مطلع ہے۔

ذہبت من الهجوان فی کل مذہب　　ولم یك حقا کل هذا التجنب[1]

مگر جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ قصیدہ اور اس سے متعلق قصہ بعد کی ایجاد ہے اس لیے ہم علقمہ کے ان دونوں قصیدوں کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیں گے جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ پہلا قصیدہ جس کا مطلع اوپر لکھا گیا ہے علقمہ کے کلام کا ہر اعتبار سے بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ مطلع کا مطلب بزبان حافظ شیرازی یہ ہے۔

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو　　رندی و ہوسناکی در عہد شباب اولی

اس قصیدہ میں بروایت مفضل الضبی ۲۷ شعر ہیں۔[2] اور اس کا موضوع شام کے بادشاہ الحارث بن جبلة بن ابی شمر الغسانی کی مدح اور اس سے اپنے بھائی شاس بن عبدہ کی رہائی کی درخواست ہے۔ حارث نے اس کے بھائی شاس کو ایک معرکہ میں قبیلہ بنو تمیم کے ستر آدمیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا تھا۔[3] جب علقمہ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اس کی شان میں یہ مدحیہ قصیدہ کہا اور اس کے دربار میں حاضر ہو کر اسے پڑھ کر سنایا۔ بادشاہ اپنی مدح سن کر اتنا خوش ہوا کہ اس نے نہ صرف علقمہ کے بھائی کو آزاد کر دیا بلکہ دوسرے قیدیوں کو بھی رہا کر دیا۔ علقمہ نے اس قصیدہ کو حسب دستور تشبیب سے شروع کیا ہے اور کہتا ہے کہ اس وقت بھی جب کہ صبح زندگی شام زندگی سے ملنے لگی ہے تمہارا بے قرار دل مہوشوں کے لیے بے تاب ہے۔ اس کے بعد اپنی محبوبہ کا وصف بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ناز و نعم کی پالی بڑی امین، باوفا، طرحدار اور دلدار ہے۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ اب اس کا

۱۔ طبقات فحول الشعراء ۔ ص ۔ ۱۱۶

۲۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ۲۹ شعر نقل کئے ہیں۔ دیکھئے شعراء النصرانیة للیسوعی

۳۔ اس جنگ کا قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ حارث نے المنذر کی بیٹی ہند کا پیام دیا تھا اور المنذر نے اس سے وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن ہند شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے جسم پر برص کے داغ بنا لیے اور کہا کہ میں اس عیب کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتی چنانچہ المنذر نے رخصتی نہیں کی۔ اس پر الحارث خفا ہو گیا اور چڑھائی کر دی۔ جنگ میں المنذر کے بہت سے آدمی قید ہوئے ان میں علقمہ کا بھائی شاس بھی تھا۔ (الکامل لابن الاثیر)

ذکر چھوڑ دو بھی۔ وہ تم سے بہت دور جا چکی ہے۔ اب اس سے ملنے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ وہ ربیعہ (بن مالک) قبیلہ کی لڑکی ہے جہاں اس کے پینے کے لیے ایک کنواں خاص کر کھودا گیا ہے۔ یعنی وہ بہت بڑے گھرانے کی لڑکی ہے۔ جس کا قبیلہ تمہاری پہنچ سے بہت دور ہے۔

اس کے بعد عورتوں سے متعلق اپنا تجربہ بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں عورتوں کی کمزوریوں اور ان کے نقائص کو خوب جانتا ہوں۔ چنانچہ جب آدمی بوڑھا ہو جائے یا غریب ہو جائے تو پھر انھیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ ان کی محبت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک آدمی جوان اور مالدار ہے۔

فان تسئلونی بالنساء فاننی بصیر بأدواء النساء طبیب

إذا شاب رأس المرأ وقل مالہ فلیس لہ من ودھن نصیب

یردن ثراء المال حیث علمنہ وشرخ الشباب عندھن عجیب

اور یہاں سے گریز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا ذکر چھوڑ دو۔ اور ایک تنومند اور تیز رفتار اونٹنی پر بیٹھ کر لمبے سفر پر چل نکلو۔ اور اس طرح ہجر و فراق کے اس رنج و غم اور کرب و الم کو دور کرو۔ پھر اپنی اس اونٹنی کا وصف بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس قسم کی اونٹنی پر بیٹھ کر میں نے اپنے ممدوح الحارث (بن جبلہ) کا رخ کیا۔

الی الحارث الوھاب اعملت ناقتی بکلکلھا والقصریین وجیب

اس کے بعد الحارث کی تعریف کرتا ہے۔ اس کی بہادری اور شجاعت کی داد دیتا ہے۔ معرکہ کارزار میں اس کی تلوار کے جوہر دکھانے کا نقشہ کھینچتا ہے اور آخر میں اپنے بھائی شاس کی رہائی کی درخواست کرتا ہے لیکن بڑے بلیغانہ انداز میں۔

وانت الذی آثارہ فی عدوہ من البؤس والنعمی لھن ندوب

وفی کل حیٔ قد خبطت بنعمۃ فحق لشاس من نداک ذنوب

کہتے ہیں کہ جب الحارث نے یہ آخری شعر سنا تو بے اختیار بول پڑا "نعم، واذنبۃ واذنبۃ" یعنی صرف "حصہ" ہی نہیں حصے ملیں گے حصے۔ اور اس کے بعد علقمہ کے بھائی شاس اور بنو تمیم کے تمام قیدیوں کی رہائی کا حکم دیدیا۔

علقمہ کے اس قصیدہ کے مذکورہ بالا مختصر تجزیہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ قصیدہ اس کے کلام، اسلوب بیان اور انداز فکر و نظر کا بہترین نمونہ ہے۔ چونکہ بھائی کو رہا کرانے کی لگن دل سے لگی تھی اس لیے کلام میں بڑا زور اور اثر پایا جاتا ہے۔ تشبیب کے اشعار میں اس قصیدہ کا

مطلع بڑا بولتا ہوا اور لاجواب ہے ۔ ایسا لگتا ہے کہ جس انداز سے حضرت غالب نے اپنی طرف اشارہ کرکے کہا تھا کہ

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو　　　　میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہو۔

اسی انداز سے علقمہ نے حسن و شباب کی زوال پذیری اور ناپائداری کی طرف اشارہ کرکے اس بات کی طرف ذہن کو منتقل کیا ہے کہ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ بقا و دوام آدمی کے اخلاق۔ اس کی عفو درگزر اور نیک کام کو ہے۔ اس تمہید کے بعد جس خوبصورتی اور فنی باریکی سے الحارث سے اپنے بھائی کی رہائی کی درخواست کی ہے اس کا اثر آپ نے خود دیکھ لیا کہ وہ شدت تاثر میں بے اختیار بول پڑا کہ ۔کیوں نہیں۔ صرف ایک حصہ نہیں بلکہ بہت سے حصے ملیں گے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جبکہ الفاظ، اسلوب بیان اور جذبات و خیالات میں ایسی ہم آہنگی پیدا ہوجائے کہ بات اثر انگیزی کے اعتبار سے معجز نما بن جائے اور یہ بات اس کے اس قصیدہ میں پوری طرح موجود ہے۔

ایک دوسری خوبی اس قصیدہ کی یہ ہے کہ بدوی معاشرہ میں جہاں عورت کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور اسے انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا وہیں تصویر کا دوسرا رخ بھی اس کے ذریعہ سامنے آجاتا ہے اور وہ ہے عورت کے متعلق علقمہ کی رائے کہ اسے مرد سے اسی وقت تک تعلق رہتا ہے جب تک کہ اس کے پاس مال و دولت اور جوش و جوانی رہتی ہے ۔عورت سے متعلق یہ تصور شاید پہلی مرتبہ ایک بدوی شاعر نے کھل کر دیا ہے اور عجیب بات ہے کہ عربی عورتوں کے متعلق شاید اب بھی یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے جو ان کے ماحول، مخصوص حالات اور معاشرتی و معاشی حالات کی دین ہے۔

علقمہ کے دوسرے قصیدہ میں بروایت مفضل ضبی ۷۰ شعر ہیں۔ مگر بعض تذکرہ نگاروں نے صرف ۵۵ شعر نقل کئے ہیں۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے۔

هل ما علمت وما استودعت مكتوم　　　　أم حبلها إذ نأتك اليوم مصروم

یعنی کیا تم اب تک اس راز محبت کو اور وفا کرنے کے اس عہد و پیمان کو جسے اس نے تمہیں دیا تھا ابھی تک اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہو اور اس کی محبت پر قائم ہو یا اس کے دور ہوجانے کی وجہ سے تم نے اب اس سے قطع تعلق کرلیا ہے۔ (۱)

۱۔　پورا قصیدہ شعراء النصرانیہ ۔ الاب شیخو الیسوعی میں ملاحظہ کیجیے

علقمہ کے مذکورہ بالا قصیدہ کے مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ بدوی شاعر جس کے سینے میں ایک دھڑکتا دل ہے۔ جس میں محبت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ آخر دم تک باوجود ہجر و فراق اور وصال سے مایوسی کے، اسی کوشش میں رہتا ہے کہ محبوب کے دیدار قرب اور وصال سے متمتع ہوتا رہے۔ اور اگر قافلہ دور نکل گیا ہے تو کوئی ہرج نہیں اس کے پاس ایک تومند اونٹنی ہے جو دیو پیکر ہے۔ جو برق رفتار ہے۔ وہ اسے محبوب کے پاس پہنچا دے گی۔ اور جب وہ محبوب کے پاس پہنچ جائے گا تو وہ اس کی پذیرائی کرے گی۔ اپنا عہد و پیمان نباہے گی کیونکہ اس نے چپکے سے سب کی نظریں بچا کر اس سے پیمان وفا باندھا تھا۔ اور کیوں نہ باندھے۔ میں کوئی بیٹا آدمی نہیں، بزدل نہیں۔ بخیل نہیں۔ مجھ میں شرافت و نجابت کے سارے جوہر موجود ہیں۔ میں اتنا سخی ہوں کہ قحط کے زمانے میں بہترین گھوڑے اور اونٹ غریبوں کو کھلانے کے لیے داؤ پر لگا دیتا ہوں عالی نسبی کے علاوہ میں اتنا عقلمند اور سمجھدار ہوں کہ دنیا کی ریت، زندگی اور اس کے مآل عزت و ذلت کے رموز۔ بقا و فنا کے اسرار کو سمجھتا ہوں۔ جب یہ سب صفات مجھ میں موجود ہیں تو بجا طور پر میں ایک قابل فخر عاشق ہوں۔ اور بجا طور پر میری محبوبہ مجھے اپنے من مندر کا دیوتا سمجھتی ہے اس لیے مجھے اس سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے بلکہ محبت کی اس ریت کو تازیست نباہتے رہنا چاہیئے اس کا یہی خیال تھا جس نے اس سے یہ کہلایا تھا کہ:

طحا بِکَ قلبٌ فی الحسان طروب   بعید الشباب عصر حان مشیب

جو بظاہر ہے تو حافظ شیرازی کے خیال کے مطابق۔ چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو۔ لیکن درحقیقت تفسیر ہے اس شعر کی کہ:

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے۔ زندگی کہاں گزرے

علقمہ کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل گو شاعر ہے۔ اس کے یہاں مدح فخر وصف ضرور ہے لیکن بھرپور نہیں۔ مدح المنذر بن ماء السماء کی ہے لیکن اپنے بھائی شاس کو قید سے چھڑانے کے لیے ہے۔ اس لیے اس میں وہ جان اور وہ سوز نہیں ہے جو اس کی غزل میں ہے۔ کیونکہ غزل کے جو شعر ہیں وہ بہت خوبصورت اور دل لگتے ہیں۔ ایک جگہ کتنے خوبصورت انداز سے محبوبہ کے دلربایانہ انداز کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ذرا یہ انداز تو دیکھو کہ پردہ کی اوٹ سے، دیکھنے والوں کی نگاہیں بچا کر نیل گائے جیسی بڑی اور کجراری آنکھوں میں آنسو بھرے، ہرنی کی

جیسی خوبصورت گردن کو نکالے، جس میں موتیوں اور زبرجد کا ہار جگمگا رہا تھا مجھے تڑپانے کے لیے ایک لمحہ کے لیے کوند کر رہ گئی۔

تراءت واستتارمن البیت دونها إلینا وحانت غفلة المتفقد

بعینی مهاة یحدر الدمع منهما بریمین شتی من دموع واثمد

وجید غزال شادن نوردت لہ من الحلی سمطی لولو وزبرجد

یعنی —— خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

علقمہ الفحل بسیار گو شاعر نہیں ہے۔ مگر جو کچھ اس نے کہا ہے اس میں بڑی جان ہے۔ اور جاہلی شاعری کے احساسات و خیالات اور جاہلی زندگی کی بولتی تصویر ہے۔

حوالہ جات :-

١۔ طبقات فحول الشعراء للجمحی
٢۔ خزانة الأدب ١/٥٦٥
٣۔ الاغانی للاصفہانی ٧/١٢٨
٤۔ شعراء النصرانیہ للاب شیخو
٥۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ
٦۔ العمدة لابن رشیق القیروانی
٧۔ المفضلیات رقم ١٠٩، ١٢٠
٨۔ کتاب "الاشتقاق" لابن درید
٩۔ شرح الانباری ٧٧٠
١٠۔ تاریخ آداب اللغة العربیة لجرجی زیدان، اول

اور دوسری کتابیں۔

اس کا دیوان سوسین نے "لیبسک" میں ١٨٦٧ء میں شائع کیا، اس کے علاوہ "العقد الثمین" لاورد کے مجموعہ میں بھی اس کا دیوان موجود ہے۔ جزایر میں بھی اس کا دیوان چھپ چکا ہے۔

صعالیک" یا خانماں برباد شعراء"

اب تک ہم نے جن شعراء کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے اکثر وہ ہیں جو عام طور سے اپنے خاندان قبیلہ اور سماج سے نہ صرف متعلق رہے تھے بلکہ ان کے قابلِ ذکر فرد بھی تھے۔ اور ان کے رسم و رواج، قوانین اور ریت کو مانتے، ان پر فخر کرتے اور ان کے گن گاتے تھے۔ جس کی وجہ سے یہ شعراء اپنے قبیلوں اور خاندان کی آنکھ کا تارا اور اپنے معاشرہ کے معزز و محترم اور بھاری بھرکم اشخاص بن کر چکے، اور اس کی وجہ سے باہر کی دنیا میں بھی بڑی وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن اب ہم شعرائے جاہلیت کے ایسے طبقہ کا ذکر کرتے ہیں جو مذکورہ بالا شعرا کے طبقوں سے بالکل مختلف، نرالا اور اپنے انداز و اطوار میں بالکل اچھوتا ہے۔ اور شاید عربی زبان وہ واحد سامی زبان ہے جس میں اس قماش کے شعرا کا طبقہ پایا جاتا ہے اور یہ طبقہ ہے "صعالیک الشعراء" یا خانماں برباد شعرا کا طبقہ

صعالیک کون تھے؟

"صعلوک" کے لغوی معنی ہیں "مفلس و قلاش" کے[1] ادبی اصطلاح میں صعلوک اس مفلس کو کہتے ہیں جو ایک طرف اپنی غربت و افلاس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا اور دوسری طرف اپنی عزتِ نفس و شرفِ ذات کو برقرار رکھنے اور اپنی حیثیت اور وجود کو ثابت کرنے اور اپنی قوت کو حاصل کرنے میں لگا رہتا ہو۔[2]

۱۔ "الصعلوک" الفقیر الذی لا مال لہ وقد تصعلک الرجل۔ اذا کان کذالک،
لسان العرب طبع بولاق سنہ ۱۳۰۳ ہجری۔

۲۔ تفصیل کے لئے دیکھئے؛ "الشعراء الصعالیک" للدکتور حسین عطوان شائع شدہ مجلہ العربی، ماہ اکتوبر ۱۹۷۱ء۔
عبدالمعین الملوحی نے "اشعار اللصوص و اخبارہم" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات عربی میں رسالہ مجمع اللغۃ العربیہ، دمشق ماہ آب (اگست) ۱۹۸۲ء میں صـ ۳۸۳ شروع کیا ہے۔ اس میں الاحمر السعدی کا ذکر ہے۔ مضمون بہت فاضلانہ ہے۔

صعالیک الشعراء" یا خانماں برباد شعراء وہ منچلے، آزاد منش، سخت جان وسخت کوش نوجوان شعراء تھے جن میں سے اکثر کے عزیز واقارب خاندان، قبیلہ سب کچھ تھا لیکن انھوں نے ان سب سے یا تو از خود یا مجبور ہو کر رشتہ توڑ لیا تھا اور صحرا نوردی اور قتل وغارت گری اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ اور تن بتقدیر و جان بہ تدبیر زندگی گزارتے تھے، اور اس طرح ساری زندگی فاقہ مست اور خانماں برباد رہے۔ اس دنیا میں سوائے ان کے اپنے ہم جنسوں کے نہ ان کا کوئی یار تھا نہ مددگار، نہ دوست نہ غمگسار اور اسی کس مپرسی اور خانماں بربادی کی حالت میں مر گئے۔

صعلوک بننے کی وجہ

یہ نوجوان صعالیک کیسے بن گئے۔ اس کے مختلف اسباب تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے بدوی عرب معاشرہ میں اقتصادی بدحالی اور معاشی تنگدستی کی وجہ سے قتل وغارت گری اور لوٹ مار کی وبا عام تھی۔ ہمارے ان شعراء میں سے بعض کو قدرت نے بڑی طاقت و توانائی اور بڑا عزم وحوصلہ دے رکھا تھا۔ اس عزم وحوصلہ اور طاقت وتوانائی کی جولان گاہ، بالکل اسی طرح محدود تھی جس طرح ان کا معاشرہ۔ چنانچہ ان کو قدرت کی بخشی ہوئی ان طاقتوں کو صالح اور پاک مقصد حیات پر لگانے کا موقع نہ مل سکا۔ پھر معاشرہ میں جرم وسزا کا نہ کوئی واضح ضابطہ اور مقرر قانون تھا اور نہ انھیں نافذ کرنے کا کوئی ایسا فعال ادارہ جو انھیں خوف سزا یا پاداش عمل کے تازیانے سے اپنی توانائیوں کو غلط راستے پر لگانے سے روک سکتا۔ چنانچہ ان کے یہ بلند حوصلے اور ابھرتی ہوئی توانائیاں غلط راستے پر لگ گئیں اور انھوں نے اپنا پیشہ قتل وغارت گری ورہزنی اور لوٹ مار بنا لیا۔ جب ان کے جرائم اتنے بڑھ گئے کہ ان کے خاندانوں کی عزت وآبرو پر حرف آنے لگا اور وہ ان کے جرائم کا تاوان دیتے دیتے تھک گئے اور اب اس کی سکت نہیں رہ گئی کہ ان کی ناعاقبت اندیشیوں کی مزید سزا بھگت سکیں اور اسی کے ساتھ ان کی جان کی بھی حفاظت کر سکیں، تو انھوں نے عاجز آکر ایسے نوجوانوں

۱۔ "الشعراء الصعالیک" الدکتور خلیف، مطبوعہ مصر۔

۲۔ دراسات فی الشعر العربی تحلیل لظواہر ادبیۃ وشعراء، دکتور محمد مصطفیٰ ہدارۃ۔ کلیۃ الآداب، جامعۃ الاسکندریہ۔ مطبوعہ منشأۃ معارف بالاسکندریہ۔ دار المعہد سعید للطباعۃ سنہ ۱۹۷۰ء

کو برادری سے باہر کو دیا۔ ایسے شخص کو اصطلاح میں خلیع یا "طرید" کہتے تھے۔ جب کسی کے متعلق خلیع یا طرید ہونے کا اعلان کر دیا جاتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب یہ شخص اس خاندان یا قبیلہ کا فرد نہیں رہا۔ اس لئے اس کے کسی فعل یا عمل کا ذمہ دار اس کا خاندان یا قبیلہ نہیں۔ اب اگر کوئی اسے کسی جرم کی سزا میں مار ڈالے تو خاندان اس کے خون کا مطالبہ نہیں کرے گا اور قاتل سے " ثأر " یعنی خون کے بدلے خون کی مانگ۔ نہیں کرے گا۔ اور اس طرح ایسے آدمی کا خون "ہدر" یعنی مباح ہو جاتا۔ ظاہر ہے جب کوئی اس طرح برادری سے باہر ہو جاتا تو اس کو ہر وقت اپنی جان کا خطرہ رہتا اور کوئی قبیلہ یا شخص اس کو اپنے یہاں پناہ دینے پر تیار نہ ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ایسا شخص مجبور ہو کر صحراؤں اور پہاڑوں کے دامنوں میں پناہ لیتا۔ جہاں اس کے ساتھی جنگلی جانور یا اس کے ہم جنس خلعاء یعنی برادری باہر نوجوان ہوتے اور قتل و غارت گری اور رہ زنی سے اپنی زندگی چلاتا۔

ان میں سے بعض کے صعلوک ہونے کا سبب یہ ہوا کہ باپ کے مر جانے یا خاندان کی سخت معاشی تنگدستی کی وجہ سے قبیلہ نے ان سے آنکھیں پھیر لیں اور سخت تکلیف و پریشانی کے عالم میں بچپنے کے دن گزرے یا کسی معرکہ میں گرفتار ہو کر فاتح قبیلہ کے یہاں غلامی اور ذلت کی زندگی گزاری اور جب جوان ہوتے اور عزتِ نفس، خودداری اور خودی نے گوش و ہوش کی آنکھیں کھولیں اور اپنے انجام کو دیکھا تو اس قبیلہ اور خود اپنے قبیلہ کے خلاف نفرت و حقارت کا سخت جذبہ پیدا ہو گیا اور غلامی و ذلت کی ساری زنجیریں توڑ کر صحراؤں اور بیابانوں کی راہ لی، اور یہاں فطرت کی آغوش میں خودداری و خود مختاری اور خودی کی زندگی گزارنے لگے، کیونکہ خود بقول شنفری ؛

وفی الارض منأی للکریم عن الاذی — وفیہا لمن خاف القلی متحول

یعنی " چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا "

ان صعالیک کا خیال تھا کہ اس معاشرہ کے لوگ بڑے خود غرض مطلب پرست اور چھوٹے دل و دماغ کے لوگ ہیں۔ ہمارے ایسے اولوالعزم، حوصلہ مند نوجوان ان کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ہم نے جنگلی جانوروں اور درندوں کو اپنا خاندان بنا لیا ہے کیونکہ یہ

۱۔ خلیع : برادری یا ناٹ باہر شخص جسے سب نے چھوڑ دیا ہو۔
طرید : دیس نکالا دیا ہوا شخص۔ بھگایا ہوا شخص۔

انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ قابل بھروسہ ہیں، وہ دوسروں کے راز افشا نہیں کرتے اور اگر ان کا کوئی فرد جرم کر بیٹھے تو اسے دوسروں کے حوالے نہیں کرتے۔ اور یہ قابل اعتماد افراد خاندان۔ ایک سید عملس یعنی بڑا خوفناک بھیڑیا، دوسرا ارقط زہلول یعنی دھاری دار چکنا چیتا، اور تیسرا عرفاء جیئل یعنی بدبودار بجو، یہ ہیں ہمارے خاندان کے افراد اور ہم انھیں کے ساتھ خوش ہیں شنفری ان کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے:

ولی دونکم أهلون سِیْدٌ عَمَلَّس　　وأرقط زُهلول وعَرفاء جیئل

هم الرهط لا مستودع السر ذائع　　لدیهم ولا الجانی بما جر یخذل

مگر یہ افراد خاندان اپنی فطری مجبوریوں کی وجہ سے ہم دم و دمساز اور مرنے جینے کے ساتھی نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے ہم نے ہر حال میں ساتھ دینے والے اپنے تین جگری دوست بھی پیدا کئے ہیں اور وہ ہیں ایک ـــ بیباک اور نڈر دل، دوسرے ـــ سفید چمکتی ہوئی تیز تلوار اور تیسرے ـــ پیلے رنگ کی ایک لمبی کمان:

ثلاثة أصحاب فؤاد مشیع　　وأبیض إصلیت وصفراء عیطل

یہ صعالیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر آدمی صرف اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھ لے تو پھر اس کے لئے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے، جیسے شنفری نے اپنی زبان میں یوں کہا ہے:

لعمرك ما فی الأرض ضیق علی إمرئ　　سری راغبا أو راهبا وهو یعقل

پائے مرا لنگ نیست، ملک خدا تنگ نیست۔

اور اس خاندان اور اپنے ان تین جگری دوستوں کے ساتھ یہ نوجوان صحراؤں میں آسمان کی چھت کے نیچے زندگی گزارنے لگتے اور لوٹ مار اور راہ زنی سے اپنا پیٹ بھرتے۔ جہاں رات ہوئی وہیں بستر جما دیا اور سوختہ سامانی کا عالم تھا کہ بستر کی جگہ صرف زمین کا بچھونا ہوتا اور اس پر اپنی سوکھی اور دھری ہوئی پسلیوں کے بل لیٹ جاتے اور تکیہ کی جگہ اپنے کھردرے سوکھے اور ہڈیاں بھرے ہوئے ہاتھ رکھ لیتے۔

وآلف وجه الأرض عند افتراشها　　بأهدأ تنبیه سناسن قحل

کیونکہ یہ صعالیک زندگی کو حریر و پرنیاں یا اطلس و کمخواب نہیں سمجھتے تھے۔ زندگی میں انسان کو ہر قسم کی نرم گرم جھیلنے کی عادت ڈالنی چاہئے۔ مصیبتوں میں رونا دھونا نہیں چاہئے اور جب فارغ البالی ہو تو اترانا نہیں چاہئے۔ شنفری کہتا ہے:

فلا جزع من خلة متکشف　　ولا مرح تحت الغنی أتخیل

اور کسی درخت کے نیچے کہیں بیاباں میں
گزر ہی جائے گی ہم خانماں خرابوں کی

دوست احباب اگر بیوفائی کریں تو بھی ہم کو غم نہیں۔ ہم اس پر افسوس نہیں کرتے۔ ان کے غم میں روتے دھوتے نہیں یا ان کی بے وفائی و سرد مہری کا گلا نہیں کرتے۔ بقول تابط شرا۔

ولا أقول إذا ما خلة صرمت یا ویح نفسی من شوق وإشفاق

اس طرح اپنی عزت و شرف، خودی و خود داری اور اعلیٰ اقدار کو حرزِ جان بنائے ہوئے موت آجاتے۔ اور ہمیں رونے والا کوئی بھی نہ ہو تو ہمیں مطلق بھی غم نہ ہوگا، کیونکہ ہمارا اس دنیا میں سوائے اپنی ذات اور اپنی قوت بازو کے ہے کون؟ نہ خالائیں، نہ چچیاں اور نہ عیادت و غمگساری کرنے والے دوست۔ اپنا سب کچھ میں ہوں اور میری تیغ و دو۔ بقول شنفری!

اذا ما اتتنی میتتی لم ابالها ولم تذر خالاتی الدموع وعمتی
ألا لا تعد فی إن تشکیت خلتی شفانی بأعلی ذی البریقین عدوتی

یعنی پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی آکے شمع جلائے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں، میں وہ بےکسی کا مزار ہوں

جب ان کی مہموں اور آزاد کوششوں کے قصے ان آبادیوں میں آتے تو ان کے منچلے نوجوانوں کے دلوں میں بھی آزاد زندگی گزارنے کی امنگیں انگڑائیاں لینے لگتیں اور ان میں سے بعض ان سے جا ملتے اور اس طرح؛ ع

ہم سفر آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

عام طور سے یہ نوجوان بڑے طاقتور، بڑے بہادر اور بڑے سخت جان تھے۔ صحرا کی چلچلاتی سخت دھوپ میں یا خون جما دینے والی سخت سرد یا تاریک راتوں میں میلوں اور مدتوں سفر کرنا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ خطرے کے موقعوں پر ہرنوں سے زیادہ میلوں تیز بھاگنا، مدتوں بغیر کھائے پئے چلتے رہنا، اور ہر وقت جان کو ہتھیلی پر لئے رہنا۔ ان کی زندگی کے معمولات میں داخل ہوچکا تھا۔ یہ لوگ غریب، مفلس اور قلاش تھے۔ لیکن ان میں غربت و فلاکت سے پیدا شدہ بیماریاں، جیسے ٹچاپن، خودی اور ضمیر کا فقدان اپنی بے وقعتی یا احساس کمتری ذرہ برابر نہ تھا۔ اپنی تہی مائیگی و سوختہ سامانی کے باوجود یہ لوگ بڑے غیرت مند، فیاض، ایک دوسرے کے غمگسار، دوست نواز، صلح جو، دل کے جیالے اور عزم و ارادہ کے پختہ نوجوان تھے۔

(۱) شعر مولانا نجم الدین شکیب ندوی

أبی لما أبی سریع مبادقی | إلی کل نفس تنتحی فی مسرّقی

حالات نے انھیں مادی وسائل سے محروم کر دیا تھا لیکن قدرت نے ان میں سے بعض کو ایسا ذہن رسا اور ایسا ذوق سلیم اور ایسا حسن لطیف اور باریک نظر عطا کی تھی کہ باوجود اپنی سخت کوشی و بے راہ روی کے دنیائے شعر و شاعری میں روشن ستارے بن کر چمکے۔

ان صعالیک نے اپنی شاعری میں ایک طرف اپنی مخصوص زندگی سے حاصل شدہ تجربات کی روشنی میں، زندگی کے بعض لافانی حقائق کی نشان دہی کی ہے، اور ازلی قدروں کے گیت گائے ہیں۔ فقر و غنا کے رمز کو سمجھانے اور موت و حیات کے چہرے سے نقاب ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ تو دوسری طرف دکھ درد کی ماری زندگی اور اپنے پیاروں اور اعزہ و اقارب سے دوری و مہجوری کے جاں گسل لمحات نے ان کے دل کے تاروں کو جب جھنجھنایا ہے تو اس کی صدائے بازگشت ہجر و فراق کے ان دل خراش اشعار میں سنائی ہے جن کی کسک اب بھی دل والوں کے رگ جان پر نشتر کا کام کرتی ہے اور یہ سب کچھ ان کے ان لمبے قصیدوں میں ملتا ہے جو اب بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں اور اپنی سلاست و روانی، شگفتہ بیانی اور فصاحت و بلاغت میں نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔

دور جاہلی کے طبقۂ صعالیک میں پانچ نوجوان بہت مشہور ہوئے۔ الشنفری، تأبط شرا، سُلَیک بن السلکہ، عمرو بن براق اور اُسَید بن جابر[1]۔ ان میں سے ذیل کے تین صعالیک نے میدان شعر و شاعری میں بھی بڑا نام پیدا کیا۔ ایک الشنفری، اور دوسرے تابط شرا، اور تیسرے سُلَیک بن السلکہ۔ ذیل میں ان میں سے صرف دو پر تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے اور وہ ہیں الشنفری۔ اور دوسرا تابط شرا

۱۔ یہ اپنی قوم کا سردار بھی تھا۔

۱- الشَّنفَریٰ

(م ۵۱۰ عیسوی)

الشنفریٰ خالص عرب قحطانی یمنی اور قبیلہ ازد کا فرد اور صعالیک الشعرا میں ایک ممتاز برگوشاعر ہے[1]۔ تذکرہ کی کتابوں میں جابجا متفرق طور پر اس کے زندگی کے جو حالات ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا باپ بچپنے ہی میں مار ڈالا گیا تھا۔ اور اس کے خاندان والوں نے نہ صرف یہ کہ اس کے خون کا بدلہ نہیں لیا بلکہ باپ کے مرتے ہی آنکھیں بھی پھیر لیں۔ ماں نے جب یہ دیکھا کہ مصیبت کے یہ دن سسرال میں نہ بیت سکیں گے تو الشنفریٰ اور اس کے ایک چھوٹے بھائی کو لے کر اپنے میکہ قبیلہ فہم میں چلی آئی۔ لیکن یہاں بھی اسے وہ سکون چین اور عزت نہ نصیب ہو سکی جس کی اسے توقع تھی۔ چنانچہ جب شنفریٰ بڑا ہوا تو اسے اپنے ددھیالی اور ننہالی دونوں خاندانوں سے سخت نفرت اور عداوت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے نہ صرف اس نے ان سب سے رشتہ توڑ لیا بلکہ بعد میں انھیں قبیلوں پر سخت حملے کرتا رہا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ الشنفریٰ کے قبیلہ ازد نے اس کے ننہالی قبیلہ فہم کے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا جب ان لوگوں نے خون بہا کا مطالبہ کیا تو ازدیوں نے الشنفری، اس کی ماں اور اس کے چھوٹے بھائی کو بطور رہن ان کے حوالے کر دیا اور ان کی کس مپرسی اور بے چارگی کی وجہ سے خون بہا ادا کر کے ان کو آزاد نہیں کرایا چنانچہ شنفریٰ انھیں کے یہاں بڑی ذلت و خواری کی حالت میں پلا بڑھا اور جب جوان ہوا تو ان لوگوں کی طرف سے سخت نفرت و عداوت کے جذبات

۱- سلسلۂ نسب یوں ہے : الشنفری بن ربیعہ بن الاواس بن الحجر بن الہنو بن الازد۔
آگے جا کر سلسلۂ نسب بنو الحارث سے جا ملتا ہے۔

اس دوران میں قید ہی میں تھے۔ جس کی وجہ سے اپنا انتقام نہ لے سکی اور وہ کہا کرتا تھا جن لوگوں کا تو ناطہ اور
ان میں سے جو بھی مل جاتا اسے جان سے مار ڈالتا۔ بعض قبیلے کی روایت کی ہے کہ شنفری کے
ننھیالی قبیلہ فہم بن عمرو بن قیس بن عیلان کی ایک شاخ بنو شبابہ نے اسے بچپن میں قید کر لیا چنانچہ
شنفری ان کے یہاں رہنے لگا۔ ایک دفعہ بنو سلامان بن مفرج نے جو بنو ازد (شنفری کا ددیہالی
خاندان) کا ایک بڑا خاندان تھا۔ بنو شبابہ کے ایک آدمی کو جو بنو فہم (شنفری کا ننھیالی خاندان)
کا ایک فرد تھا کہیں گرفتار کر لیا۔ جب بنو شبابہ نے اپنے آدمی کو واپس مانگا تو بنو سلامان نے
اس کے بدلے میں دو سو اونٹ مانگے۔ چنانچہ انھوں نے شنفری کو بدلے میں دے کر اپنا آدمی
چھڑا لیا، اور شنفری اب ان کے یہاں رہنے سہنے لگا۔ لیکن ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس سے
اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا اور اسے اپنی ذلت و خواری کا ایسا احساس ہوا جو اسے ہمیشہ
انتقام کی آگ میں جلاتا رہا۔ ہوا یہ کہ ایک دفعہ اس نے اپنے خیالی باپ کی لڑکی سے یہ کہا کہ
"اے بہن ذرا میرا سر تو دھو دو" تو اس نے چٹاخ سے اس کے سر پر ایک طمانچہ رسید کر دیا، اور
بولی کہ تو مجھے اپنی بہن کہتا ہے۔ تیری یہ مجال؟ اس پر وہ غصہ میں بھرا ہوا اپنے خیالی باپ کے
پاس گیا اور بولا کہ یہ بتاؤ کہ میں کون ہوں، کس کا بیٹا ہوں؟ تو اس نے کہا کہ تم دراصل "اواس
بن حجر" کے خاندان کے فرد ہو۔ میرے بیٹے نہیں۔ یہ سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور
اس نے اس کو مخاطب کر کے کہا کہ تم نے مجھے غلام بنا کر جس طرح ذلیل و خوار کیا ہے، اس کے بدلے
میں میں تمہارے سو آدمی جب تک جان سے نہ مار ڈالوں گا اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا۔

یہ بھی روایت ہے کہ اس کے باپ کو ازدیوں کے قبیلے کے ایک آدمی حرام بن جابر نے قتل
کیا تھا جس کی وجہ سے اسے ساری ذلتیں اٹھانی پڑیں اور در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔
چنانچہ اس نے سب سے پہلے منی کے مقام پر موقع پا کر جابر بن حرام کو قتل کیا اور اس کے
بعد جو بھی ازدی اس کے ہاتھ لگ جاتا اسے زندہ نہ چھوڑتا۔

غرضیکہ شنفری کی خانماں بربادی اور صعلوکیت اختیار کرنے کے مختلف اسباب راویوں
نے بیان کئے ہیں۔ ان کو غور سے پڑھ کر ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ
شنفری کے ساتھ نہ تو اس کے ننھیالی رشتہ داروں نے اور نہ ہی اس کے اپنے خاندان ازد
نے محبت خلوص اور اپنائیت کا سلوک کیا، بلکہ اسے ہر جگہ ذلیل سمجھا گیا اسے غلام بنایا گیا
اسے یتیمی اور کس مپرسی کی زندگی پر مجبور کیا گیا اور ان حالات کا ردعمل شنفری پر یہ ہوا کہ وہ

جوں جوں بڑا ہوتا گیا اسے عزیز و اقارب، خاندان حتیٰ کہ اس معاشرہ سے بھی نفرت پیدا ہو گئی جس نے اسے اس طرح تباہ و برباد ہوتے دیکھا۔ لیکن اس کی داد رسی نہیں کی۔ ظالموں کو سزا نہ دی۔ اور مظلوموں کی فریاد نہ سنی۔ اور اس طرح اس کے دل میں اس ظالم سماج کے خلاف بھی جذبات پرورش پانے لگے جس کی وجہ سے اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اس سماج کی ہر ریت اور رسم و رواج کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔

قدرت نے اسے بڑے اچھے ہاتھ پاؤں دیئے تھے۔ بڑا ہو کر بڑا اگرانڈیل، تنومند اور طاقتور جوان نکلا اور دوڑنے میں اتنا برق رفتار تھا کہ بڑے سے بڑا صبا رفتار گھوڑا بھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تابط شرا کی نگاہ دور بین نے جو خود بھی ایک صعلوک تھا، اور رشتہ میں اس کا ماموں لگتا تھا، اس نوجوان کی تیکھی نگاہوں اور دل و دماغ میں ابلتے جذبات کو تاڑ لیا چنانچہ اس نے اس کو اپنی جمعیت 'خانماں برباداں' میں شامل کر لیا۔ اور ساری عمر بڑی محبت اور خلوص کا سلوک کرتا رہا۔ شنفری بھی اپنے قبیلہ ازد کی ریت کے مطابق اسے اپنی 'ماں' یعنی گرد کہا کرتا تھا۔ (ازدی اپنے سردار کو "الام" یعنی ماں کے لقب سے پکارتے تھے) اور مرتے دم تک اس کا ہمدم و دمساز رہا اور رزم و بزم ہر جگہ اس کا شریک و سہیم۔

الشنفری اپنی جسمانی طاقت و توانائی کے ساتھ عرب قوم کا سب سے تیز دوڑنے والا شخص بھی تھا۔ ان صعالیک میں تین یعنی الشنفری، تابط شرا اور سلیک بن السلکہ ایسے تیز دوڑنے والے مشہور تھے کہ ان کو گھوڑے بھی نہیں پکڑ سکتے تھے۔ چنانچہ بسا اوقات وہ لوٹ مار کر کے اتنی تیزی سے بھاگ جاتے کہ گھوڑ سوار ان کی گرد راہ ہی میں الجھ کر رہ جاتے۔ روایتوں میں یہاں تک آتا ہے کہ یہ لوگ ہرنوں کے غول کو جب دیکھتے تو اس میں سب سے موٹے ہرن کو چن لیتے اور اور پھر غول کو دوڑانا شروع کرتے اور آخر کار اسی موٹے ہرن کو پکڑ کر دم لیتے۔ اسے ذبح کرتے اور خوب سیر ہو کر کھاتے۔

کہتے ہیں کہ قدرت کسی کے ساتھ ظلم یا زیادتی نہیں کرتی۔ اگر کسی کو کسی چیز سے محروم کرتی ہے تو کوئی دوسری نعمت بے بہا ایسی عطا کر دیتی ہے کہ ساری محرومیوں کی نہ صرف تلافی ہو جاتی ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی مل جاتا ہے۔ شنفری کو قدرت نے بچپنے ہی سے باپ سے محروم کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس نے جگہ جگہ کی ٹھوکریں کھائیں، ذلت و خواری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا۔ لیکن دوسری طرف قدرت نے اسے تنومند و توانا جسم کے ساتھ بلا کا ذہن رسا عطا کیا تھا۔ بھلی

پوری طرح نوجوان بھی نہیں ہوا تھا کہ اس نے شعر کہنا شروع کر دیا اور سب سے پہلا شعر جو اس نے کہا اس کی تقریب یہ ہوئی کہ اس کا چھوٹا بھائی مر گیا، اس حادثے پر اس کی ماں رونے دھونے لگی، تو اس نے کہا :

لیبن لوالدة همها ولاتیلها لابنها دع دع
تطوف وتحذر أحوالها وغبیرك أسلك بالمصرع

شنفری جب جوان ہوا تو اس نے ذلت و نکبت، غلامی و خواری کی یہ زندگی چھوڑ کر صحراؤں اور پہاڑوں کی راہ لی۔ اپنے اس عزم کا اظہار اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی مہم کے سلسلے میں اس نے ایک لمبا قصیدہ بھی کہا ہے جس میں اپنے ننھیال والوں کو مخاطب کر کے اس عزم و ارادہ کے اسباب بتاتے ہیں اور زندگی سے متعلق اپنا فلسفہ واضح کیا ہے۔ قصیدہ کا مطلع ہے:

"اقیموا بنی عمی صدور مطیکم"

اس نئی دنیا میں شنفری تنہا نہ تھا بلکہ اس جیسے کچھ اور بھی دل جلے، جیسے تابط شرا، سلیک بن السلکہ اور دوسرے منچلے اور چھیچھورے نوجوان اسے مل گئے تھے اور اس طرح یہ فطرت کی آغوش میں آزاد اور قید و بند سے دور زندگی گزارنے لگا۔

خاندان اور اس کی چیرہ دستیوں سے آزاد ہونے کے بعد اس نے انھیں کو اپنا نخچیر بنایا اور جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اس نے اپنے منہ بولے باپ، قبیلہ بنو سلامان کے اس آدمی سے اسی وقت کہہ دیا تھا جب اس کی لڑکی نے طمانچہ مار کر اس کی ہتک عزت کی تھی کہ جب تک میں تم میں سے سو آدمی نہ ماروں گا، چین و سکون سے نہ بیٹھوں گا۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان پر مختلف اوقات میں سخت حملے کئے جن میں بہتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بنو سلامان پر اس قسم کے حملوں کے دوران ہی وہ واقعہ پیش آیا جس میں ایک سلامی ان کے ڈر سے بھیڑیا کے شکار کرنے کے گڈھے میں کود پڑا تھا اور جسے ان لوگوں نے تیروں کی بارش کر کے بھیڑیئے کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور جس کے بعد سلامیوں سے بہت سخت معرکہ ہوا۔ اس معرکہ کی یاد شنفری کا وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے :

ألا أم عمرو أجمعت فاستقلت

وما ودعت جیران إذ تولت

ادھر سلامی بھی شنفری کے آئے دن کے حملوں سے تنگ آکر اس کی جان کے درپے ہو گئے

بچھاڑ یا ہوا لیے ہوتے ملتا تھا مگر اب لوگ انہیں قتل کرنے کی فکر میں ہیں کہ تب جب تک شنفری کی
زندگی ہیں ان کے بال نہ بکل جائیں گے الخ یہ ہے کہ بچھڑے بال

مفضل ضبی نے مورج سے روایت کی ہے کہ شنفری نے بنو سلامان کے علاوہ ۹۹
آدمی قتل کر دیئے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ کسی سلامی کو زندہ پکڑ لیتا تھا تو اس سے کہتا
تھا کہ بول اب تیری آنکھیں پھوڑ دوں یا اور اس کے بعد تاک کر اس کی آنکھ میں تیر مارتا
اور اس کے بعد اسے قتل کر دیتا۔ سلامی جب خود اس کو پکڑنے میں ناکام ہو گئے تو انہوں
نے ایک دوسرے قبیلہ بنو الرمد کو اس کام پر مامور کیا چنانچہ جب شنفری ایک دن ان
پر حملہ کرنے کے لئے آیا تو وہ سب اس پر ٹوٹ پڑے لیکن وہ ان سے پیچھا چھڑا کر ایسا بھاگا
کہ یہ لوگ اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اس کے تعاقب میں حبش نامی
ایک کتے کو چھوڑ دیا لیکن وہ بھی اس کو نہ پا سکا اور شنفری صاف بچ کر نکل گیا۔

شنفری کے اس قسم کے معرکوں میں ایک اور بہت نامی معرکہ کا ذکر آتا ہے شنفری
کے باپ کو حرام بن جابر نے جو خود شنفری کے قبیلہ ازد کا ایک فرد تھا قتل کر دیا تھا۔ اس
کا باپ غریب آدمی تھا اس لئے کسی نے اس کے خون کا مطالبہ نہیں کیا۔ باپ کے اس
طرح بے دردی سے قتل ہو جانے اور پھر بدلہ نہ لینے پر اس کا دل بہت دکھا اور اس
نے اس سلسلہ میں کچھ شعر بھی کہے جس میں اس کی بے کسی اور کس مپرسی کا ذکر کر کے اس وقت
اپنی غیر موجودگی پر اظہار افسوس کیا ہے اور اپنے خاندان والوں کو غیرت دلائی ہے[1] اتفاق
سے حرام بن جابر حج کے دوران اسے منیٰ کے مقام پر مل گیا اور اس نے وہیں اسے قتل کر دیا۔
لوگ جب اس پر جھپٹے تو سر پٹ بھاگ کھڑا ہوا اور کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ اس موقع پر اس
نے فخریہ ایک شعر بھی کہا :

قتلت حراماً مهديا بملبد
ببطن منى وسط الحجيج المصوت

یعنی حرام کو میں نے عین حالت احرام میں ہماری منیٰ میں لبیک کہنے والے حاجیوں کے

۱۔ اشعار مفضلیات بن ضبی کے صفحہ ۱۹۸ پر ملاحظہ فرمایئے۔

درمیان ایک دوسرے نے احرام باندھے ہوئے شخص (اس کے والد) کے بدلے میں قتل کر دیا تھا۔ اس واقعہ کی خبر حرام کے بھائی اسید بن جابر کو ہوئی جو بھی بہت تاک انداز تھا اور حرام کا ساتھی تھا ایک آدمی نے انسانی اور دیکھی کیا کہ نہیں مجھے اسی بات سے جاننے کے بارے میں پوچھا ہے۔ اسید نے اس سے پوچھا کہ تم نے کیسی طرح اطمینان کر لیا ہے کہ وہ شنفری ہی تھا۔ اس پر اس آدمی نے کہا کہ خدا کی قسم وہی تھا۔ یہ سن کر اسید بولا کہ خدا کی قسم وہ جب تک اپنے گروہ والوں کا مزہ نہ چکھ لے گا پھر نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنے مقتول بھائی حرام کے دو لڑکوں کو ساتھ لیا اور جب رات کی تاریکی میں شنفری کے راستے میں گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ جب رات بھیگ گئی تو شنفری کے آنے کی آہٹ ہوئی مگر اس طرح کہ اس کے ایک پاؤں میں جوتا تھا اور دوسرے پاؤں سے ننگا تھا۔ یہ چال اس نے اس لئے چلی تھی کہ کسی کو آدمی کی چال کا شک نہ ہونے پائے۔ چنانچہ آہٹ جب اور قریب ہوئی تو اسید کے بھتیجوں نے کہا کہ بخدا یہ انسان کی چاپ نہیں یہ تو بجو کی چال ہے۔ مگر اسید نے کہا کہ ہرگز نہیں، خدا کی قسم یہ وہی کمبخت ہے۔ اس لئے تم لوگ اب تیار ہو جاؤ۔ ادھر شنفری کو جب ان کے سائے دکھائی دیئے تو وہ الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ اس پر لڑکے نے کہا بخدا بڑا چالاک ہے ہماری موجودگی کو بھانپ گیا اور بھاگ گیا۔ اسید نے کہا ہرگز نہیں، وہ اپنی اس حرکت سے ہمیں اچھل پھاند کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ وہ پھر واپس آئے گا تم دیکھ لینا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شنفری تھوڑی دیر کے بعد پھر واپس آیا۔ اب کی دفعہ بھی جب اسی جگہ پر آئے ان لوگوں کی موجودگی کا شبہ ہوا تو اس نے تاک کر اس اندھیرے میں ایسا تیر مارا جو اسید کی دونوں پنڈلیوں کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ مگر موقعے کی نزاکت کی وجہ سے اسید نے کوئی حرکت نہیں کی بلکہ دم سادھے بیٹھا رہا۔ اب شنفری کو اطمینان ہو گیا کہ راستے میں کوئی ہے نہیں۔ چنانچہ وہ بے دھڑک آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جب ان لوگوں کے برابر پہنچا تو وہ سب اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کو پکڑ کر رسی سے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور گھسیٹتے ہوئے اپنے قبیلے میں لائے اور وہاں لے جا کر زمین پر ڈال دیا۔ جب یہ خبر قبیلے میں پہنچی تو بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اور شنفری کے انجام کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ بعض کا خیال تھا کہ اس کی گردن مار دی جائے مگر غالباً بڑے بوڑھوں کی رائے یہ ہو رہی تھی کہ ہمارے ہی خاندان کا آدمی ہے۔ طاقتور بہادر

دوڑنے میں برق رفتار اور ان سب خصوصیات سے بڑھ کر اچھا شاعر بھی ہے۔ اس لئے اس سے صلح کرکے اسے اپنالیا جائے تاکہ یہ قوت اور اپنی خداداد صلاحیتیں جو یہ پہلے ہمارے خلاف استعمال کرتا تھا، ہماری طرف سے مدافعت میں استعمال کرنے لگے۔ یہ گفتگو ایک نوخیز لڑکا بھی سن رہا تھا جس کے باپ کو شنفری نے قتل کر دیا تھا۔ اسے یہ خطرہ ہوا کہ یہ بڑے بوڑھے اسے کہیں معاف نہ کر دیں اور اس طرح میرے باپ کے خون کا بدلہ رہ جائے۔ اس نے بغیر کسی کو بتائے خنجر کے ایک وار سے اس کا ہاتھ کاٹ کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ اس ہاتھ کی ہتھیلی میں ایک کالا تل بھی تھا جسے دیکھ کر شنفری نے چند شعر بھی کہے!

لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ پکھوڑے سے اس کا ہاتھ کٹ گیا ہے تو سمجھ گئے کہ اب اس کا بچنا مشکل ہے۔ چنانچہ اسید بن جابر نے اعلان کیا کہ اگر شنفری پر کسی کا کوئی مطالبہ ہو تو آکر اپنا مطالبہ مانگ لے۔ چنانچہ لوگ جمع ہوئے اور سب کے سامنے اسے ایک درخت سے باندھ دیا گیا اور اسی حالت میں مر گیا۔

ابن ضبی نے ایک دوسری روایت میں بیان کیا ہے کہ اسید بن جابر وغیرہ اسے رسیوں سے باندھ کر اپنے قبیلہ میں لائے اور ایک درخت سے باندھ دیا۔ جب صبح ہوئی تو اس سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ اس پر شنفری نے جواب دیا کہ "انما النشید علی المسرة" شعر خوشی کے موقع پر اچھا لگتا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ جملہ ضرب المثل بن گیا۔ اس کے بعد ایک لڑکے نے اس کا ہاتھ پکھوڑوں سے کاٹ کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ اپنی ہتھیلی کے کالے تل پر جب شنفری کی نظر پڑی تو اس نے ایک شعر پڑھا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس سے پوچھا کہ سولی پر چڑھانے کے بعد تم کو کہاں دفن کریں، تو جواب میں اس نے یہ شعر پڑھے:۔

لاتقبروني إنّ قبري محرّم   عليكم ولكن أبشري أمّ عامر

إذا احتملوا رأسي وفي الرأس أكثري   وغودر عند الملتقى ثمّ سائري

هنالك لاأرجو حياة تسرّني   سجيس الليالي مبسلا بالجرائر

تم لوگ مجھے دفن نہ کرنا۔ تم لوگوں پر میرا دفن کرنا حرام ہے۔ البتہ بجو کو بشارت

۱۔ شعر مفضلیات ابن ضبی، تحقیق کارلوس یعقوب لائل کے صفحہ ۱۹۹ پر ملاحظہ کیجئے۔

ہو کہ جب لوگ میرا سر کاٹ لے جائیں گے اور باقی دھڑ ڈال جائیں گے تو اسے کھانے کا موقع مل جائے گا۔ ایسی حالت میں کہ میں لمبی لمبی راتوں میں بے یار و مددگار جرائم کا بوجھ اٹھائے پڑا رہوں، مجھے کسی خوش کن زندگی کی تمنا نہیں ہے۔

کہتے ہیں کہ جب شعر پڑھ چکا تو ایک سلامی نے سامنے آکر اس سے کہا کہ بول اب تیری آنکھیں پھوڑ دوں! پھر اس نے اسکی آنکھوں میں ایک نیزہ مارا اور اس طرح اسے قتل کر دیا۔ مرنے سے پہلے شنفری نے اس سے کہا کہ "ایسا ہی میں تم لوگوں کے ساتھ بھی کرتا تھا"۔ جیسا کہ معلوم ہے شنفری نے قسم کھائی تھی کہ قبیلہ ازد کے اس شاخ بنو سلامان میں سے سو آدمی جان سے مارے گا۔ اب تک وہ ننانوے آدمی مار چکا تھا۔ اس کو قتل کرنے کے بعد سلامیوں نے اس کے سر کو قبیلہ میں ڈال دیا تھا۔ اتفاق سے ادھر سے ایک سلامی گزرا۔ اور اس نے اس کے سر کو ٹھوکر ماری کھوپڑی کی ایک ہڈی اس کے پیر میں چبھ گئی اور اس سے زہرباد ہو گیا اور وہ مرگیا اور اس طرح سو آدمی مارنے کی شنفری کی قسم پوری ہو گئی۔

شنفری کے مرنے کے بعد اس کے مربی اور دکھ درد کے ساتھی تابط شرا نے اس طرح اس کا مرثیہ کہا :-

علی الشنفری ساری الغمام ورائح غزیر الکلی وصیب الماء باکر

علیک جزاء مثل یومک بالجبا وقد رعفت منک السیوف البواتر

ویومک یوم العیکتین وعطفۃ عطفت وقد مس القلوب الحناجر

تجول ببز الموت فیہ کأنہ لشوکتک الحذی ضئین نوافر

فانک لو لاقیتنی بعد ما تری وھل یلقین من غیبتہ المقابر

کہتے ہیں کہ شنفری کا ڈگ (دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ) جب ناپا گیا تو معلوم ہوا کہ پہلا ڈگ ۲۱ قدم کا، دوسرا ۱۰ قدم کا، اور تیسرا ڈگ ۱۵ قدم کا تھا۔ اور اس سے اس کی ہرنوں سے بھی تیز دوڑنے کا راز معلوم ہو جاتا ہے۔

شنفری کا قصیدہ

ألا أم عمرو أجمعت فاستقلت وما ودعت جیرانها إذ تولت

شنفری کے اس قصیدہ کی شان نزول میں مختلف واقعات بیان کئے گئے ہیں، جن میں سب

سے معتبر اور اشعار کے مضمون کے مطابق وہ شان نزول ہے جسے ابن عبدالقادر کے ساتھ ابو محمد القاسم الانباری نے
اپنا مرتب کی ہوئی دیوان المفضلیات کی شرح میں بیان کیا ہے چنانچہ الانباری نے ابو عبیدہ وغیرہ سے
روایت کی ہے کہ اس قصیدہ کے کہنے کا سبب یہ ہوا کہ شنفری اپنے تیس ساتھیوں کے ساتھ جن میں
تابط شرا بھی تھا، بنوسلامان بن مفرج پر، جو قبیلہ ازد (شنفری کا قبیلہ تھا) کی ایک شاخ تھا، حملہ کرنے
کی نیت سے نکلا۔ یہ لوگ بنوسلامان کی بہادری کے قریب مشعل نامی ایک وادی میں رات
گزارنے کی نیت سے ٹھہرے۔ تھوڑی دیر میں انھوں نے بکری کے ممیانے کی آواز سنی اور سمجھ گئے کہ
آس پاس کوئی آدمی بھی ضرور ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی آنکھیں اس طرف لگا دیں۔ اتنے میں ایک
بھیڑیا، بکری کی آواز سن کر ادھر آیا اور اس کو شکار کرنے کی غرض سے اس نے جو جست لگائی تو اس
گڑھے میں گر پڑا جسے اس کو شکار کرنے کے لیے کھودا گیا تھا۔ یہ دیکھ کر یہ سب لوگ ادھر دوڑ
پڑے۔ گڑھے کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی بھی اس طرف دبکا ہوا بیٹھا ہے۔ آدمی نے
جب ان لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ڈر اور گھبراہٹ میں اس نے اسی گڑھے میں چھلانگ لگا دی
جس میں بھیڑیا گرا تھا۔ ان صعالیک نے جو یہ منظر دیکھا تو گڑھے کے اندر تیروں کی بارش شروع
کر دی۔ جس سے بھیڑیا اور آدمی دونوں مر گئے۔ جب گڑھے میں سے اس آدمی کو باہر نکالا تو معلوم
ہوا کہ یہ ابن الافطس، ایک دوسرے قبیلہ کا آدمی ہے۔ چنانچہ یہ لوگ قبیلہ کے ڈر سے وہاں سے
بھاگ کھڑے ہوئے، اور ایک پہاڑ کے دامن میں جا کر پناہ لی۔ ادھر مقتول کے قبیلہ والے اس
کی چیخ سن کر اس طرف کو چل پڑے تھے اور سن گن پا کر وہ بھی پہاڑ کے دامن تک آ لیے۔ اور
چاروں طرف سے ان سب کو گھیر لیا۔ جب شنفری اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ اب بھاگنے
کی کوئی راہ نہیں ہے تو وہ بھی خم ٹھونک کر سامنے آ گئے۔ اب کیا تھا دونوں پارٹیوں میں معرکہ
گرم ہو گیا اور خاصی دیر تک گرم مقابلہ ہوتا رہا، جس کے نتیجے میں دونوں فریقوں کو سخت زخم
آئے اور بغیر ہار جیت کے فیصلہ کے دونوں فریقوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

ان صعالیک کے یہاں یہ رواج تھا کہ جب یہ لوگ غارت گری کرنے کے لیے نکلتے تو تابط شرا
کو کھانے پینے کی چیزوں کا ذمہ دار بنا دیتے تھے۔ چنانچہ اس معرکہ میں بھی حسب روایت تابط شرا یہ
ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھا۔ تابط شرا کی یہ عادت تھی کہ لڑائی کے موقعوں پر کھانا بہت ناپ تول
کے دیتا تھا، اور کہتا تھا کہ میں یہ حرکت بخل کی وجہ سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ صرف اس خیال سے کہ کہیں
لڑائی طول کھینچ گئی اور سامان ختم ہو گیا تو ہم لوگ بھوکوں

مرجائے گے۔ چنانچہ اسی موقع پر شنفری نے یہ قصیدہ کہا جس میں تأبط شرا کی اسی مصلحت بینی اور دور اندیشی کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

شنفری نے یہ قصیدہ جاہلی شعراء کی ریت کے مطابق (ا) نہایت ہی پیام محبوبہ امیمہ کی تشبیب کے ساتھ شروع کیا ہے۔ اور حسین و چیدہ الفاظ اور بڑے ہی دلنشین انداز، اور خوبصورت اسلوب بیان سے اس کا ایسا حسین اور دل آویز مرقع کھینچا ہے کہ شمع حسن و ایمان بنا دیا ہے۔ خود کہتا ہے کہ " لو جُنَّ انسان من الحسن جنت " یعنی اگر کوئی آدمی اپنے حسن کی وجہ سے دیوانہ ہو سکتا تو وہ بھی دیوانی ہوجاتی ۔ آگے جب اس کی شرم و حیا و عفت و عصمت کا ذکر کرتا ہے تو ایک بدوی دوشیزہ اپنی تمام رعنائیوں اور سحر طرازیوں کے ساتھ سامنے کھڑی ہوجاتی ہے ۔ اور جب وہ مست خرام ہوتی ہے تو ایسے ہوئے ہوئے، نظریں نیچے گڑو سے کہ جیسے کوئی قیمتی شئے کھو گئی ہو اور وہ اسے پگ پگ ڈھونڈ رہی ہو پھر اپنی تعریف میں چند اشعار کہتا ہے، اور اس کے بعد تأبط شرا کی تعریف شروع کرتا ہے، اور اس کو " ام عیال " (بچوں کی ماں) سے تعبیر کرتا ہے یہ اس وجہ سے کہ جس طرح ماں اپنے بچوں کے کھانے پینے، آرام و آسایش کا خیال رکھتی ہے۔ تأبط شرا بھی ان لوگوں کا ایسا ہی خیال رکھتا تھا۔ قصیدہ کے آخر میں شنفری نے اپنی عادات و اطوار اور خوبیاں بتائی ہے اور اسی پر قصیدہ ختم کر دیا ہے۔ اس قصیدہ میں الانباری کی روایت کے مطابق ۳۴ شعر ہیں ۔

شنفری کا قصیدہ لامیۃ العرب (۲)

شنفری کا دوسرا مشہور قصیدہ وہ ہے جو عربی ادب میں لامیۃ العرب کے نام سے موسوم ہے۔ اس قصیدہ میں باتفاق رواۃ ۶۸ شعر ہیں۔ (۱) اس قصیدہ میں شنفری نے نہ صرف اپنی بلکہ اپنے جیسے تمام صعالیک الشعراء کی زندگی کا حقیقی نقشہ بڑے اچھوتے انداز سے کھینچا ہے۔ ایک بے گھر بے در، بے یار و غمگسار مگر غیور خود دار، اور بہادر بدوی کس طرح اپنی زندگی صحرا و بن بیابانوں میں درندوں اور جنگلی جانوروں کے درمیان گزارتا ہے بھوک پیاس اور گرمی کی شدت، راتوں کی ہوشربا وحشت اور تاریکی، صحرا

---

(۱) خزانۃ الادب و لب لباب لسان العرب ۔ عبدالقادر بن عمر البغدادی ج ۲ ص ۱۵

(۲) طغرائی نے اس کے مقابلہ میں " لامیۃ العجم " لکھی تھی۔ جو ایک قسم کا شہر آشوب ہے۔

کی ہولناکی، میں کس طرح صرف اپنی اونٹنی کے سہارے ایک منزل موہوم کی طرف چلتا رہتا ہے۔ اور اس طرح زندگی صرف اپنے سہارے بغیر کسی کا احسان لیے، بغیر دست سوال دراز کئے بیت جائے کہ صعلوک کے لیے کسی کے سامنے دست سوال پھیلانا ننگ ہے چاہے اسے اس پیٹ کی خاطر اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے، کیونکہ ان سرپھروں کا نظریہ تھا کہ

ہے کبھی جان اور کبھی تسلیم جان ہے زندگی

اور "کبھی جان" اور "کبھی تسلیم جان" کے اس پاٹ کے بیچ میں آکر عام طور سے یہ لوگ ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے بہادرانہ ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

اس قصیدہ کا مطلع ہے ؎

أقیموا بنی امی صدور مطیکم　　فانی إلی قوم سواکم لأمیل

یعنی اے میرے ننہیال والو کان کھول کر سن لو۔ تم نے میری بڑی بے عزتی کی ہے، اب میں تم لوگوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔

شنفری کا یہ قصیدہ محض ان آزاد منش سرپھرے نوجوانوں کی داستان حیات اور نظریہ موت وزیست ہی نہیں ہے بلکہ دور جاہلی کے شاعرانہ کلام کا بہترین نمونہ، اور ایک بدوی نوجوان کی صحیح زندگی کا مرقع بھی ہے۔ اس قصیدے کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صرف اسی کو "لامیۃ العرب" کا خطاب دیا گیا۔ اس کی شہرت اور حسنِ قبول کی وجہ سے اس کی مختلف شرحیں لکھی گئی ہیں۔ اور اب تک اہلِ ذوق اسے فردوس گوش بنائے ہوتے ہیں۔ (۱)

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ شنفری کا قصیدہ لامیۃ العرب اس کا کہا ہوا نہیں ہے بلکہ عباسی دور میں اسے گڑھ کر اس کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ (۲)

۱۔ لامیۃ العرب کی شرحوں میں مشہور یہ ہیں: (۱) شرح لامیۃ العرب لمحمود بن عمر الزمخشری م ۵۳۸ھ ۔ (۲) "شہامۃ الادب فی شرح لامیۃ العرب" لعطاء الشریف احمد عطاء الشہیر بن احمد المصری ثم المکی ۔ (۳) "تفریج الکرب عن قلوب اہل الارب فی معرفۃ لامیۃ العرب" لمحمد بن قاسم بن زاکور المغربی۔

۲۔ الشنفری کے دونوں قصیدوں کا تجزیہ وتحلیل ملاحظہ کیجئے، رسالہ برہان، دہلی ماہ دسمبر ۱۹۵۸ء و فروری ۱۹۵۹ء۔ بقلم مصنف

شنفری کے بعض چیدہ اشعار

شنفری نے مدح، فخر اور حماسہ کے علاوہ غزل میں بھی طبع آزمائی کی ہے، اس کے غزلیہ اشعار اس کی محبوبہ امیمہ کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ اس کی غزلیہ شاعری کی مثال اس کے تائیہ قصیدہ میں ملتی ہے جو بہت دل آویز اور موثر ہے۔ اس قصیدہ میں اپنی محبوبہ کا سراپا کھینچتے ہوئے صرف ایک شعر میں اس کے سارے خد و خال کو ابھار کے رکھ دیا ہے۔ کہتا ہے: فدقت وجلت واسبکرت واکملت فلو جن انسان من الحسن جنت

یعنی اس کا ناک نقشہ بڑا تیکھا ہے۔ اعضا بڑے سبک، اخلاق و عادات بہت ہی پیارے اور انداز و اطوار بڑے بانکے اور قد، قد رعنا۔ بس یوں سمجھو کہ قدرت نے اسے ہر طرح سے ایسا مکمل پیدا کیا ہے کہ اگر کوئی آدمی حسن کی وجہ سے دیوانہ ہو سکتا تو وہ بھی دیوانی ہو جاتی۔

شنفری جیسے صحرانورد، آزاد منش اور خون کی ہولی کھیلنے والے نوجوان کے دل میں بھی جب محبت اپنی جوت جگاتی تھی تو اس کی لپٹ سے اس کا پتھر جیسا دل بھی سلگ اٹھتا تھا اور جب ہجر و فراق کے جاں گسل لمحات زندگی کی لذتوں اور بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کو دکھ درد کی کہانی بنا دیتے تو وہ بھی دل پر ہاتھ رکھ کر آہ سرد بھرتا:۔

فواکبداً علی امیمة بعد ما طمعت، فهبها نعمة العيش زلت

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔

زندگی نے اور خود تو نے مجھے بڑے دکھ دیے، مگر میں تجھ کو برا بھلا نہ کہہ سکا۔ تجھ کو بھلا نہ سکا، اور جب بھی تیری یاد آ گئی، تڑپا گئی۔

شنفری نے باوجود اپنی جہالت اور صعلوکیت کے حکمت و فلسفہ کی باتیں بھی کہی ہیں اس قسم کے اشعار میں اس کا وہ شعر بہت مشہور ہے جس میں کہتا ہے کہ جب آدمی کو ایک جگہ عزت و آبرو سے رہنا نصیب نہ ہو تو اسے وہ جگہ چھوڑ کر اپنی دنیا الگ بسانی چاہیئے۔

وفی الأرض منأی للكريم عن الأذى۔ وفيها لمن خاف القلى متحول

شنفری نے اپنی غربت و فلاکت کے باوجود جوہر خودی کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کہتا ہے: ولكن نفسا حرة لا تقيم بی على الذم الا ريثما اتحول

صعالیک الشعراء میں تابط شرا، سلیک بن السلکہ کا بھی یہی انداز زندگی اور طرز کلام تھا۔

تأبّط شرّا : م [illegible]

صعالیک یا خانماں برباد شعرا میں "تأبّط شرّا" بڑا جیالا، طاقتور، دوڑنے میں صبا رفتار، اور معاملات کو سمجھنے، خطرات کو بروقت اپنی چھٹی حس کے ذریعہ بھانپ لینے، اور ہر موقع تدبیر نکال کر اس پر عمل کر کے اپنا مقصد حاصل کرنے میں طاق تھا۔ اسی کے ساتھ اپنے ساتھیوں کا انتہائی مخلص، بر وقت ضرورت ان کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ اسی لیے اس کو جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، سب صعالیک "ام العیال" بچوں کی ماں یعنی سرپرست و گروکے نام سے یاد کرتے تھے، اور بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ شنفری نے اپنے قصیدے میں اس کی دل کھول کر تعریف و توصیف کی ہے۔ بدوی امتیازی خصوصیات کے ساتھ میدانِ شعر و شاعری میں بھی اس کو کمال فن حاصل تھا۔ اس کا کلام فکر و فن کا اچھا مرقع اور زبان و بیان میں مثالی نمونہ ہے۔ اس لیے اب تک ذوق و شوق سے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے۔

اس کا نام ثابت اور لقب تأبّط شرّا تھا۔ باپ کا نام جابر اور ماں کا نام اُمیمہ تھا۔ جو قبیلہ فہم کی ایک شاخ بنو القَین کے ایک فرد کی لڑکی تھی۔ اس طرح تأبّط شرا نجیب الطرفین (یعنی ماں اور باپ دونوں کی طرف سے) عرب ہے (۱)

نام تو اس کا ثابت تھا لیکن تأبّط شرا کا لقب اس کے ساتھ ایسا چپکا کہ اس کا اصلی نام تو غائب ہو گیا اور وہ صرف "تأبّط شرا" ہو کر رہ گیا۔ "تأبّط" کے معنی ہیں بغل میں رکھنا، اور "شر" کے معنی ہیں برائی۔ اس طرح "تأبّط شرا" کے معنی ہوئے "برائی کو بغل میں رکھا" یا "بری چیز کو بغل میں مار کر چلا"

ثابت بن جابر کے نام کے ساتھ اس لقب کے چپکنے کے سلسلے میں کئی قصے بیان کیے جاتے ہیں:

(۱) کہتے ہیں کہ ثابت بن جابر ایک دفعہ صحرا میں چلا جا رہا تھا۔ اتفاقاً اسے ایک مینڈھا نظر پڑا، وہ اس مینڈھے کو اپنے بغل میں دبا اپنے قبیلہ میں واپس آنے لگا، راستہ بھر مینڈھا پیشاب کرتا رہا، جس سے اس کے سارے کپڑے خراب ہو گئے، لیکن اس کو اتارا نہیں، لیکن جب گاؤں کے قریب پہونچا تو مینڈھا اتنا بھاری لگنے لگا کہ اس کو لادنا دشوار ہو گیا، چنانچہ ثابت نے اسے زمین پر پٹک دیا۔ اب جو اسے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ "غول" یعنی بھوت ہے۔ قبیلہ کے لوگوں نے جب پوچھا کہ بھئی تم یہ بغل میں کیا دبائے لا رہے تھے؟ تو بولا کہ بھوت۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ "لقد تأبط شراً" بری چیز بغل میں لایا۔ اور اسی کے بعد اس کا یہ لقب پڑ گیا۔

بھوت سے متعلق ایک قصہ اور بھی بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تأبط شرا ایک بہت ہی تاریک اور مہیب رات میں قبیلہ ھُذیل کے علاقہ حی بطان سے گزر رہا تھا کہ اسے "الغول" بھوت یا جن مل گیا، اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، تأبط شرا اس سے رات بھر لڑتا رہا اور آخر کار اسے قتل کر ڈالا، اور اس کی لاش سے ٹیک لگا کر سو گیا تا کہ صبح اس کو اچھی طرح دیکھے۔ جب صبح کو اس کا اچھی طرح معاینہ کیا تو دیکھا کہ وہ ایک بدہیئت، بدقوارہ اور بھیانک مخلوق ہے، سر ایسا جیسے کسی بڑے بلّے کا اور زبان پھٹی ہوئی تھی...... اس کے بعد اس کو بغل میں دبا کر اپنے قبیلہ میں لایا۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو بولا بھوت۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ "تأبط شراً" بری چیز بغل میں دبا کر لایا۔

بھوت سے اپنے معرکہ کا ذکر اور اس کے انجام کے بارے میں اس نے چند اشعار بھی کہے جس میں اس نے بھوت کا سراپا کھینچا ہے۔ کہتا ہے ؏

ألا من مبلغ فتیان فهم	بما لاقیتُ عند رحی بطان
وانّی قد لقیتُ الغول تهوی	بسهب کالصحیفة صحصحان

مارنے کے بعد ٹیک لگا کر سونے اور صبح کو اسے دیکھ کر اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے ؏

فلم انفک متکئاً علیها	لانظر مصبحا ماذا أتانی
اذا عینان فی رأسٍ قبیحٍ	کرأس الهر مشقوق اللسان (۱)

(حاشیہ گزشتہ صفحہ)

(۱) پورا سلسلہ نسب بروایت مفضل ابن الضبی یوں ہے: ثابت جابر بن سفیان بن عدی بن کعب بن حرب بن تمیم بن سعد بن فہم بن عمرو بن قیس ابن عیلان بن مضر بن نزار (دیوان المفضلیات لابن الضبی) الاغانی ج۱۸/۲۱۰

(۲) دوسری روایت یہ ہے کہ اس کی ماں نے ایک دفعہ اس سے کہا تو بڑا نکھٹو ہے، تیرے سب بھائی باہر جاکر کچھ کماکر لاتے ہیں مگر تو بیٹھا بیٹھا روٹیاں توڑتا رہتا ہے۔ اس پر ثابت نے کہا کہ اچھا ماں میں بھی آج شام کو کچھ کما کر لاؤں گا۔ تو مجھے اپنا تھیلا دے دے۔
ثابت تھیلا لے کر جنگل گیا۔ اور وہاں بہت سے سانپ پکڑے اور انہیں جھولے میں بھر، بغل میں دباکر شام کو گھر پہونچا اور جھولا ماں کے سامنے ڈال دیا۔ ماں نے جب شوق میں جھولا کھولا تو سارے سانپ نکل کر گھر بھر میں رینگنے لگے، بیچاری ڈر کے مارے چیخنے چلانے لگی اور گھر چھوڑ باہر بھاگ گئی۔ پڑوسیوں نے پوچھا کہ بہن ثابت آج کیا لایا ہے؟ تو بولی کہ "تھیلے میں سانپ بھر کر لایا تھا" اس پر عورتوں نے کہا کہ آخر سانپ بھرے تھیلے کو لایا کیسے؟ ماں نے کہا کہ "بغل میں دبا کر" اچھا عورتیں بولیں۔ تو یوں کہو کہ "تأبط شرا" "بغل میں بری چیز کو دبا کر لایا۔ اور اسی دن سے اس کا یہی لقب پڑ گیا۔
ایک روایت یہ بھی ہے کہ "تأبط شرا" لقب پڑنے کی وجہ اس کا یہ شعر تھا۔

تأبط شرا ثم راح أو اغتدی
یوائم غنما أو یسیف علی ذحل

ان دونوں قصوں میں سے بھوت والا قصہ بالکل مہمل اور خرافاتی ہے، اس قصے کی وجہ شاید اس خیال کو تقویت دینا ہے کہ صحرائے عرب میں بھوت یا جن پائے جاتے تھے اور یہی بھوت یا جن شعرا پر خیالات وافکار اور مضامین شاعری کا الہام کرتے تھے (۱)
تأبط شراً، دبلا پتلا پستہ قد اور چھریرے بدن کا بدصورت اور آزاد منش نوجوان تھا۔ سماج کی پابندیوں اور خاندان کی ذمہ داریوں سے ہمیشہ گھبراتا رہا اسی لیے سب سے رشتہ توڑ کر صعلوک بن گیا۔ قدرت نے بھی اسے صحرا کی بے رحم زندگی گزارنے کے لیے ساری صلاحیتیں عطا کر دی تھیں بہادر اور نڈر ہونے کے علاوہ کہتے ہیں کہ وہ دو پیروں والی مخلوقات میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا، اور سب سے زیادہ مضبوط پنڈلی کا اور سب سے زیادہ تیز نگاہ کا آدمی تھا، چنانچہ جب بھوک اسے بہت ستاتی تو وہ دور سے ہرنوں کی ڈار کو دیکھ کر ان میں سب سے زیادہ موٹے ہرن کو اپنی نگاہ سے کوت لیتا، اور اس کے بعد پوری ڈار کو دوڑانا شروع کرتا یہاں تک کہ اسی موٹے ہرن کو پکڑ کر دم لیتا اور اپنی تلوار سے ذبح کر کے کھال کھینچ کر کھاجاتا، اسی لیے اسے عربوں میں "اعدی عداء العرب" یعنی عربوں میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا آدمی" کا

(۱) اس خیال کے بطلان کے سلسلہ میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔

خطاب بھی دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ تأبط شرا الشنفری اور سلیک ابن السلکہ ایسے برق رفتار تھے کہ گھوڑے بھی ان کی گرد راہ کو نہ پہنچ پاتے تھے ان خوبیوں کے ساتھ تأبط شرا میں اپنے دوسرے صعالیک ساتھیوں کے مقابلہ میں ایک ایسی خوبی بھی تھی جس کی وجہ سے یہ صعالیک اسے اپنا سردار مانتے تھے۔ اور وہ تھی اس کی دور رسی اور عاقبت اندیشی اور دوربینی۔ اسی لیے معرکوں میں تأبط شرا ہی ال صعالیک کا سردار ہوتا تھا۔ اور سامان رسد اور کھانے پینے کی چیزوں کا انچارج۔ چنانچہ اسے یہ صعالیک "ام عیال" بچوں کی ماں کہا کرتے تھے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ "شنفری" نے اس کی تعریف میں جو اشعار کہے ہیں ان میں اپنے قبیلہ کی ریت کے مطابق اسے "ام عیال" ہی کے لقب سے یاد کیا ہے۔ دوربینی، عاقبت اندیشی کے علاوہ تأبط شرا خطرے کا احساس کرنے میں بھی بڑا زود حس تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر سے نیچے دشمنوں کے دل کی دھڑکنیں تک محسوس کر لیتا اپنی اس خوبی کی وجہ سے وہ اکثر موقعوں پر اپنے دشمنوں کو جل دے کر نکل بھاگتا یا گھات لگا کر وار کر کے انھیں شکست دے دیتا تھا۔

تأبط شرا کی ان صفات بے مثال بہادری، اور مصیبتوں پریشانیوں میں صبر و سکون اور سوجھ بوجھ سے کام کرنے کی وجہ سے سارے عرب میں اس کی بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی قبائل اس کے نام سے گھبراتے تھے۔ اور اس کو اپنے سامنے دیکھ کر تھرا جاتے تھے۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ قبیلہ ثقیف کا ایک آدمی ابو دھب نامی، جو بڑا بزدل اور بے وقوف اور خبط الحواس سا آدمی تھا نیا جوڑا پہنے ہوئے تأبط شرا سے ملا اور اس سے کہا کہ ثابت تم دیکھنے میں تو اتنے دبلے پتلے، اور بد صورت آدمی ہو، پھر تم کس ترکیب سے لوگوں پر غلبہ پا لیتے ہو؟ تأبط شرا نے کہا کہ صرف اپنے نام کی وجہ سے۔ چنانچہ جب میں اپنے مقابل سے ملتا ہوں تو کہتا ہوں کہ دیکھو لو میں تأبط شرا ہوں، یہ سنتے ہی اس کا دل سینے سے نکل جاتا ہے، پھر میں جو چاہتا ہوں اس کے ساتھ کرتا ہوں۔ ابو دھب نے کہا کہ ہمیشہ یہی ترکیب کرتے ہو؟ تأبط شرا نے کہا کہ ہاں۔ تب ثقفی بولا اچھا اپنا نام بیچو گے؟ ہاں کیوں نہیں؟ تأبط شرا نے جواب دیا مگر یہ تو بتاؤ کہ تم میرا نام خریدو گے کس چیز سے؟ ابو دھب نے کہا کہ اپنے اس نئے جوڑے اور اپنی کینت سے... چلو منظور۔ تأبط شرا بولا۔ آج سے تأبط شرا تمہارا نام اور ابو دھب میرا۔ اس کے بعد ثقفی سے اس کا نیا جوڑا لے لیا اور اسے اپنے

پھٹے پرانے کپڑے دے دیے، اور وہاں سے چل دیا۔ بعد میں ابووھب ثقفی کی بیوی کو مخاطب کر کے چند اشعار کہے جن میں کہا ہے کہ:

ألا هل أتى الحسناء أن حليلها | تأبط شراً واكتنيت ابا وهب
فمهبه تسمى اسمى وسميت باسمه | فاين له صبري على معظم الخطب
واين له باس كباسى | واين لي كل فارحة قلبى

یعنی کیا گوری کو یہ خبر مل چکی ہے کہ اب اس کا شوہر تابط شراً بن گیا ہے اور میں نے ابووھب کی کینت اختیار کر لی ہے مگر یہ مان بھی لو کہ اس نے میرا نام رکھ لیا ہے اور میں نے اس کا تو کیا وہ اس طرح مصیبتوں اور پریشانیوں میں میرا جیسا صبر و سکون بھی کہیں سے لا سکتا ہے؟ پھر میری جیسی طاقت و توانائی رعب و دبدبہ اور مصیبت و آفت سے مقابلہ کرنے کے لیے میرا جیسا جری دل کہاں سے لائے گا؟

یہ صعالیک اپنی زندگی گزارنے اور اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے عام طور سے بڑے اور متمول قبائل پر حملے کرتے رہتے تھے، ان حملوں میں ان کی اپنی بہادری، معرکہ میں حکمت عملی اور بھاگنے میں اپنی برق رفتاری کے علاوہ ان کی تدبیر اور حاضر دماغی سوجھ بوجھ اور خطرے کے وقت چھٹی حس کی بیداری بہت بڑا ہتھیار تھی۔ تابط شراً بہادر دوراندیش ہونے کے علاوہ خطرات کو بھانپ لینے غنیم کی حرکتوں کو بر وقت سمجھ کر اس کی کاٹ کرنے میں بڑا ماہر تھا اپنی انھیں صفات کی وجہ سے وہ اکثر معرکوں سے کامیاب و کامران ہو کر نکلتا تھا اگرچہ اس کے ساتھیوں کی تعداد حریف کے مقابلہ میں بہت کم ہوتی تھی۔ تابط شراً کی ان صفات کی بہترین مثال اس کی وہ چال ہے جس کی بدولت وہ خود اور اس کا ایک ساتھی دشمنوں کی قید سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ تابط شراً اپنے دوسرے صعلوک ساتھی الشنفری اور ابن براق الفہمی کے ساتھ قبیلہ بجیلہ کے اونٹ ہنکالایا۔ بجیلہ والوں کو جب خبر لگی تو وہ ان دونوں کے پیچھے ہو لیے، یہ دونوں بھاگ کر سراۃ کے پہاڑوں سے ہوتے ہوئے نیچے اتر لیے تاکہ پہاڑ کی اوٹ لے کر بھاگ نکلیں۔ بجیلہ والے ان کی چال سمجھ گئے، انہوں نے ... بجائے ان کا پیچھا کرنے کے آگے جا کر ایک تالاب وھط نامی پر گھات لگالی۔ تابط شراً اور ابن براق بھاگتے بھاگتے تھک گئے تھے اور پیاس سے ان کا برا حال ہو رہا تھا۔ چنانچہ تالاب پر پیاس بجھانے اور سستانے کے لیے اترے۔ تابط شراً نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنی چھٹی حس سے معلوم کر لیا کہ یہاں خطرہ

ہے چنانچہ اس نے ابن براق الفہمی سے کہا کہ دیکھو جلدی سے پانی پی لو، تم تو جانتے ہی ہو کہ ہمارے پیچھے لوگ لگے ہوئے ہیں یہاں خطرہ ہے۔ ابن براق نے کہا کہ ارے کیا خطرہ؟ تم کو کیسے معلوم ہوا؟ اس پر تابط شراً نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کی مدد سے میں بھاگتا ہوں۔ مجھے اپنے پاؤں کے نیچے سے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ ابن براق بولا کہ اماں جاؤ، یہ تو تمہارے ہی دل کی دھڑکن ہے۔ اماں نہیں، تابط شراً بولا میرا دل ایسا بودا کبھی نہیں تھا، پھر اس نے زمین پر اپنے کان لگا دئے، اور بولا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کی مدد سے میں بھاگتا ہوں، میں حریف کے دلوں کی دھڑکنیں سن رہا ہوں۔ "اچھا بھئی" ابن براق نے کہا، ایسا ہی ہے تو میں پہلے تالاب میں اتر کر پانی پیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے تالاب میں اتر کر پانی پیا اور نکل آیا اور کوئی حادثہ نہیں پیش آیا۔ تابط کو کچھ اطمینان ہوا اور وہ بھی تالاب میں گھسا، جونہی بیچ میں پہونچا بجیلی چاروں طرف سے اس پر ٹوٹ پڑے، اور اسے پکڑ اس کی مشکیں کس لیں اور گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔ قریب ہی ابن براق بھی تھا، لیکن اس نے کچھ تعرض نہ کیا، کیوں کہ جانتے تھے کہ وہ ابھی ہوا ہو جائے گا۔ اب تابط شراً جو اس طرح گرفتار ہو گیا تو اسے اپنے کئے پر بڑا پچھتاوا ہوا، اور سوچنے لگا کہ اس مصیبت سے کس طرح چھٹکارا حاصل کروں چنانچہ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے بجیلیوں سے کہا کہ دیکھتے کیا ہو، یہ ابن براق سامنے ہی تو ہے، اسے بھی پکڑ لو۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ میں اس سے کہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ اپنے آپ کو بجیلیوں کے حوالے کر دو، لیکن تم جانتے ہو کہ اسے اپنی دوڑ پر بڑا ناز ہے۔ اور وہ یہ سنتے ہی بھاگ کھڑا ہوگا، لیکن تم لوگ گھبرانا نہیں وہ پہلی دوڑ میں بیشک ہوا سے بھی تیز بھاگتا ہے لیکن دو چار کھیت جا کر اس کی رفتار دھیمی ہو جاتی ہے اور دوسرے مرحلہ میں تیز گھوڑے کی رفتار سے بھاگتا ہے، لیکن دو چار کھیت کے بعد ہانپنے لگتا ہے اور پھر قدم قدم لڑکھڑانے لگتا ہے، اور ٹھوکر کھا کر گرنے لگتا ہے، تم لوگ اس کے پیچھے لگے رہو، جب دیکھنا کہ اس کا دم پھول گیا ہے، اور وہ لڑکھڑا کر گرنے لگا ہے تو دبوچ لینا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی میری طرح تمہاری قید میں آجائے۔ یہ بات بجیلیوں کے سمجھ میں آگئی، پر انھوں نے کہا کہ اس کی ابتدا کیسے کی جائے۔ یونہی دوڑانے میں تو کوئی فائدہ نہیں۔ تابط بولا کہ دیکھو میں ابھی اس کی بھی ترکیب نکالے دیتا ہوں۔ چنانچہ اس نے ابن براق کو مخاطب کر کے کہا کہ ارے یہ کیا بیوفائی ہے، اچھے دنوں میں تو تم میرے ہم دم و دمساز تھے، اور اب مصیبت کے وقت ساتھ چھوڑ دو گے ارے تم بھی میرے ساتھ اپنے کو ان لوگوں کے حوالے کر دو ورنہ خواہ مخواہ گھیر کر کے پکڑے جاؤ

گے۔ ان لوگوں نے وعدہ کیا ہے کہ ہم دونوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔ یہ سن کر ابن براق بڑے زور سے ہنسا اور سمجھ گیا کہ تابط شراً نے ان لوگوں کے ساتھ کوئی چال چلی ہے، پھر بولا کہ ارے جاؤ ثابت یہ چکمہ کسی اور کو دینا، جب تک میری ٹانگیں سلامت ہیں۔ کون مجھ کو پکڑ سکتا ہے؟ یہ کہہ کر اس نے ایک زقند بھری، اور یہ جا وہ جا، بجیلی بھی اس کے پیچھے ہو لیے۔ ابن براق پہلی دوڑ میں چھلاوے کی طرح بھاگتا رہا اور دو چار کھیت جا کر اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی، اور تیز گھوڑے کی رفتار سے بھاگتا رہا۔ تھوڑی دور جا کر اس نے اپنی چال اور دھیمی کر دی، اور لڑکھڑانے لگا۔ بجیلیوں نے جب یہ دیکھا تو سرپٹ اس کی طرف دوڑ پڑے اور سمجھے کہ بس اب دھر لیا۔ ادھر تابط شراً نے جو یہ دیکھا کہ بجیلی خاصے دور نکل گئے ہیں تو مع اپنی مشکوں کے بھاگ نکلا، اور دوسری طرف سے ابن براق کے پاس پہونچ گیا، ابن براق نے جلدی سے اس کے ہاتھ کھولے، اور دونوں سر پر پانوں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور بجیلی منہ دیکھتے رہ گئے۔ موت کے منہ سے اس طرح نکلنے کے بعد تابط شراً نے ایک زور دار قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

یا عیدُ مالک من شوق و ایراق ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ومرِّ طیفٍ علی الأھوال طرّاقِ

مُفضّل ضبّی نے مذکورہ بالا قصیدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس حادثہ میں تابط شراً نہیں گرفتار ہوا تھا بلکہ عمرو بن براق گرفتار ہوا تھا، ان کے ساتھ شنفری بھی تھا، چنانچہ تابط شراً نے ابن براق کے آزاد کرانے کی یہ ترکیب نکال کر شنفری سے کہا کہ تم ابن براق کے قریب کہیں چھپے رہو، اور میں بجیلیوں کے سامنے سے کچھ لنگڑاتا سا، تھکا سا بھاگتا ہوں وہ میرے پیچھے ہو لیں گے ان کو، میں اس طرح خاصی دور لے جاؤں گا، تم اتنے میں ابن براق کے ہاتھ پانوں کھول دینا، چنانچہ اس کی یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور شنفری نے ابن براق کے ہاتھ پانوں کھول دئے اور تینوں وہاں سے بھاگ لیے، اور اس کے بعد تابط شراً نے یہ قصیدہ کہا۔ اصمعی نے ان دونوں واقعات کے علاوہ ایک تیسرا واقعہ بھی بیان کیا ہے (۱)

تابط شراً کی تیز نگاہی کے سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا گیا ہے، کہتے ہیں کہ تابط شراً اپنے بیوی کے چچازاد بھائی کو لے کر قبیلہ بجیلہ پر حملہ کی غرض سے نکلا، دور سے دیکھا کہ بکریوں کا ریوڑ چر رہا ہے، چنانچہ وہ دبے پانوں آیا اور چرواہے کو قتل کر کے ساری بکریاں ہنکا لے گیا۔ بجیلہ والوں کو جب خبر ہوئی تو وہ گھوڑوں پر، اور پیدل ایک جم غفیر کو لے کر انھیں پکڑنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے تابط شراً کی نگاہ اتنی تیز تھی کہ اس نے بجیلیوں کو دور سے دیکھ کر سمجھ لیا کہ وہ پیچھا کر رہے

ہیں، اس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ دیکھو بجیلی ہمارا پیچھا کر رہے ہیں جلدی سے بھاگ نکلو، اس نے ادھر ادھر دیکھا اور کہا کہ مجھے تو کچھ نہیں دکھائی دیتا، ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بجیلی آ گئے، تابطا نے اس سے کہا کہ تم اب سرپٹ بھاگ جاؤ، میں آخری تیر تک ان لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکے رکھوں گا۔ چنانچہ وہ آدمی بھاگ کھڑا ہوا، اور تابط شرأ اپنی تیر کمان سنبھال کر بجیلیوں کے سامنے آگیا اور ان پر تیروں کی بارش شروع کر دی جب آخری تیر بھی ختم ہو گیا تو تابط شرأ بھاگا اور جب اپنے ساتھی کے پاس پہونچا تو دیکھا کہ ابھی وہ محفوظ جگہ سے بہت دور ہے اور بجیلی اسے پکڑ لیں گے چنانچہ اسے اس نے وہیں قتل کر دیا، اور وہاں سے بھاگ لیا، بجیلیوں نے لاکھ کوشش کی مگر اسے پکڑ نہ پائے۔ دوسرے دن جب اپنے قبیلہ پہونچا اور اس کی بیوی کا چچازاد بھائی اس کے ساتھ نہ تھا تو لوگوں نے سمجھ لیا کہ وہ مارا گیا، اس پر اس کی بیوی نے طعنہ دیا کہ خود تو بچ کر آ گئے، اور میرے بھائی کو مروا آئے۔ یہ سن کر تابط شرأ نے ایک قصیدہ کہا، جس میں کہا ہے کہ:

تقول تركت صاحباً لك ضائعاً　　　وجئتَ إلينا فارقاً متباطنا

مذکورہ بالا قصیدہ کہنے کے سلسلہ میں ایک دوسرا واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے جس میں تابط شرأ اپنے دو ساتھیوں کو گنوا کر جب قبیلہ پہونچا تو اس کی بیوی نے اسے لعنت ملامت کی اور طعنہ دیا تو اس نے مذکورہ بالا قصیدہ کہا (۱) کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس نے دونوں کا مرثیہ بھی کہا جس کا مطلع ہے:-

أبعد قتيل العوص آسى على فتى　　　وصاحبه أو يأمل الزاد طارق

ہر وقت خطرات میں رہنے، لوگوں سے دھوکے اٹھانے، اور اپنے خون کے مباح ہونے کی وجہ سے ... تابط شرأ ہر وقت چوکس رہتا تھا۔ اس طرح زندگی نے اس کے اندر یہ ملکہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ خوف کے حرکات و سکنات اور ان کی غیر ... کو دیکھ کر ان کے دل کی بات بھانپ لیتا تھا۔ اور حسب موقعہ احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتا تھا۔ اس ضمن میں اغانی نے ایک دلچسپ قصہ نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تابط شرأ قبیلہ ہذیل پر حملہ کرنے کی نیت سے اپنے چند ساتھیوں کو لے کر نکلا، اور اپنے ایک حلیف اجل بن فنضل کے یہاں جو قبیلہ بجیلہ کا فرد تھا، رات گزارنے کے لیے پہونچا، اس نے ان

(۱) تفصیل الأغانی ج ۱۸ ص ۲۱۳ پر ملاحظہ کیجیے۔

سب کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور غیر معمولی عزت و اکرام سے اپنے یہاں اتارا۔ اور چوں کہ تابط شراً اور اس کے ساتھی عام طور سے بجیلیوں پر حملہ کیا کرتے تھے، اس لیے اجل نے سوچا کہ آج موقعہ اچھا ہے، سب کو ختم کر دو تاکہ بدلہ بھی ہو جائے اور ان سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے، چنانچہ اس نے ان کے پینے کے لیے زہر ملا شربت منگایا۔ تابط شراً اس کی اس غیر معمولی آؤ بھگت اور احترام و اکرام کو دیکھ کر ٹھنک گیا، اور سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے، چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں سے اپنا شبہ بتا کر چپکے سے کہا کہ دیکھو اسے یہ شبہ نہ ہونے پائے کہ ہم اس کی چال سمجھ گئے ہیں، اور جب شربت یا کھانا آئے تو تم سب قسم کھا لینا کہ ہم آج کھانا نہ کھائیں گے، ہمارا پیٹ بھرا ہے، پھر میں موقع دیکھ کر اسے قتل کر ڈالوں گا۔ تابط شراً کو اجل بن نفضل کو قتل کرنے کا موقع تو نہ ملا، لیکن خطرے کو اس طرح بھانپ لینے کی عادت کی بدولت وہ اور اس کے سارے ساتھی بچ گئے، یہاں سے بچ نکلنے کے بعد اور سب ساتھی تو شکار میں لگ گئے، تابط شراً نے تنہا قبیلہ ھذیل پر حملہ کر کے انھیں شکست دی، اور مال غنیمت حاصل کیا۔ اس واقعہ کی یاد میں بھی اس نے ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے:۔

اقسمت أن لا أنسی وان طال عیشنا   صنیع بکز والاجل بن نفضل

جان جوکھوں میں ڈال کر جان بچانے کی ایک ایسی مثال تابط شراً کی زندگی میں ملتی ہے جس کی نظیر مشکل سے ملے گی، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صعالیک عزت آبرو کے ساتھ مرجانے کو ذلت و رسوائی سے زندہ رہنے پر کتنا ترجیح دیتے تھے۔

کہتے ہیں کہ قبیلہ ھذیل کے پہاڑوں کے اندر ایک غار میں شہد کی مکھیاں اپنا چھتا لگاتی تھیں، اور جب شہد تیار ہو جاتا تو تابط شراً اپنے چند ساتھیوں کو لے کر آتا اور سارا شہد نکال کر ایک مشکیزہ میں بھر کر چل دیتا۔ ھذلی اس کی اس حرکت سے بہت پریشان تھے۔ ایک سال انھوں نے طے کر لیا کہ اب کی دفعہ تابط شراً کو گرفتار کر کے اس کی اس حرکت کا مزہ چکھائیں گے۔ چنانچہ جب چھتا پک گیا تو تابط شراً حسب عادت اپنے چند ساتھیوں کو لے کر غار پر پہونچا اور ایک رسّی کے ذریعہ غار کے اندر گھس گیا، ہذلی تاک میں چھپے بیٹھے تھے۔ وہ دوڑ پڑے۔ تابط شراً کے ساتھی جو باہر تھے وہ بھاگ لیے، اور تابط شراً غار ہی کے اندر رہ گیا۔ ہذلیوں نے آکر رسی پکڑ کر ہلائی، تابط شراً نے غار سے منہ نکال کر جھانکا تو ہذلیوں کو دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی، سوچا برے

پھنسے۔ ہذیلیوں نے کہاکہ اب خیریت اسی میں ہے چپ چاپ باہر آجاؤ۔ تابط شراً نے کہاکہ آؤں تو کس شرط پر۔ یاتو بغیر لیے دئے مجھے چھوڑ دینے کا وعدہ کرد یا فدیہ لے کر چھوڑنے کا وعدہ کرو ورنہ تو میں نہیں نکلوں گا۔ ہذیلیوں نے کہاکہ شرط ورط کوئی نہیں بس بلاشرط باہر آجاؤ، ورنہ دیکھو اب بچ کر نہیں جاسکتے ہو۔ تابط بولا: جی ہاں اپنی بوٹیاں کروانے کے لیے نکل آؤں یہ مجھ سے نہ ہوگا میں ہرگز نہ نکلوں گا۔ اور اندر گھس گیا، غار کے اندر اس نے پہلے ہی سے دوسری طرف ایک سوراخ کر رکھا تھا کہ اگر کہیں پھنس گیا تو اس سے نکل بھاگوں گا۔ چنانچہ اس نے اس سوراخ کے ذریعہ غار کے دوسری طرف خوب شہد بہایا، پھر اپنے سینہ پر اپنا چمڑے کا مشکیزہ چپکا کر اور سوراخ سے نکل کر ٹانگیں اوپر منہ نیچے کر کے شہد کی روانی پر پھسلنا شروع کردیا۔ اور آناً فاناً پہاڑ کی دوسری طرف پر آگیا۔ اور اس کے ذرہ برابر خراش بھی کہیں جسم پر نہیں آئی۔ یہ جگہ جہاں یہ اترا تھا، غار کے منہ سے تین دن کی مسافت پر تھا، اس لیے اسے اطمینان تھا کہ اب ہذیلی مجھ کو قیامت تک نہیں پکڑ سکتے۔ چنانچہ اطمینان سے اٹھا، اپنی حالت درست کی اور بلاخوف وخطر اپنے قبیلہ پہونچ گیا۔ اس واقعہ کی یادگار میں بھی اس نے ایک بہت زوردار قصیدہ کہا ہے، جس کا مطلع ہے:۔

اقول للحیان وقد صفرت لہم ۔۔۔ وطابی ویومی ضیق الجحر معور

جس میں مذکورۂ بالا قصہ کی طرف اشارہ کر کے ایک بڑے پتہ کی بات کہتا ہے، کہتا ہے کہ آدمی جب کسی مصیبت میں پھنس جائے اور اس سے نکلنے کی تدبیر نہ کر سکے تو پھر اس کی خیر نہیں یا تو وہ ختم ہی ہوجاتا ہے یا پھر شدید تکلیف اور پریشانی اٹھا کر اس کی جان بچ پاتی ہے لیکن عقل مند آدمی پر جب کوئی آفت آن پڑتی ہے اور وہ حکمت عملی سے کام لے کر اس سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے تو ایسا آدمی دنیا میں کامیاب ترین رہتا ہے، اور جب بھی اس کے سامنے ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو وہ اپنی کوشش سے دوسرا دروازہ کھول لیتا ہے:۔

اذا المرء لم یحتل وقد جد جدہ ۔۔۔ اضاع وقاسی أمرہ وھو مدبر

ولکن اخوالحزم الذی لیس نازلاً ۔۔۔ بہ الأمر الا وھو للحزم مبصر

فذاک قریع الدھر ماکان حولا ۔۔۔ اذا سد منہ منخر جاش منخر

تابط شراً کے اس قسم کے قصے تمام تذکرے کتابوں میں بھرے پڑے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اور اس کے ساتھی ہر موقعہ پر اپنی بہادری، عاقبت اندیشی، چالاکی، اور حکمت عملی سے بڑی بڑی مصیبتوں اور پریشانیوں سے ہمیشہ بچ کر نکل جاتے تھے۔

تحلیل وتجزیہ قصیدہ:

یاعید مالک من شوق و ایراق — ومر طیف علی الأهوال طراق

زیر نظر قصیدہ صعالیک عرب یعنی خانماں برباد شاعروں کی زندگی کے دونوں رخ کا صحیح عکس ہے۔ ایک طرف تو یہ لوگ بڑے سفاک اور سنگدل تھے، مگر دوسری طرف ان کے سینہ میں ایک بڑا گداز اور محبت سے لبریز دھڑکتا دل تھا، جو اپنی محبوبۂ دلنواز سے بچھڑنے کے بعد اس کی یاد میں، صحرا کی بے پناہ وسعتوں میں چپکے چپکے روتا تھا۔ اور جب کوئی ہم دم وغمگسار نہ ملتا تو یہ غم جاناں شعر و نغمہ میں ڈھل کر ساری فضا اور ماحول ہی کو اپنا ہم دم و دمساز بنا لیتا، اور پھر خیال حبیب، مجسم حبیب بن کر شاعر کے سامنے کھڑا ہو جاتا، پھر کیا تھا، نقشہ بدل جاتا اور اب "خلوت میں ان سے ہونے لگیں ملاقاتیں" کا سماں بندھ جاتا۔ مگر ایسے دل جلوں کی قسمت میں ایسے سماں کا دوام کہاں، سپیدہ صبح نمودار ہوتے ہی، پھر وہی تگ و دو، جان بچانے کے لیے وہی صحرا پیمائی، اور روزی ورزق کے لیے وہی جاں کاہی، اور یوں ہی غم دوراں کے ساتھ غم جاناں کو سینے سے لگائے، آخر میں اپنی زندگی کو ہی مداوائے غم بنا دیتے۔

چنانچہ تابط شرا نے اس قصیدہ میں سب سے پہلے محبوبہ کے ہجر و فراق کا ذکر کیا ہے، پھر بجیلہ والوں کے ہاتھوں اپنے قید ہونے کے واقعہ کا ذکر کر کے عمرو بن براق اور الشنفری کی مدد سے اس تدبیر کا ذکر کرتا ہے، جس کی وجہ سے اس قید سے اس کو نجات ملی۔ اس ضمن میں اپنی برق رفتاری کا ذکر کرتا ہے، اس کے بعد اپنے اس مثالی آدمی کے صفات گناتا ہے جس کے آگے وہ جھک سکتا ہے، پھر اپنی بہادری کا ذکر کر کے، خطرات میں بے خوف و خطر کود پڑنے کی عادت اور اپنی فیاضی و سخاوت پر فخر کرتا ہے اور آخر میں ان لوگوں کو لعنت و ملامت کرتا ہے، جو اسے اپنا مال خرچ کرنے پر لعنت و ملامت کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا تابط شرا کا یہ قصیدہ یادگار ہے اس واقعہ کا جس میں پانی پیتے وقت وہ قبیلہ بجیلہ کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا، اور ابن براق اور شنفری کی مدد سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بھاگتے بھاگتے تھک کے چور ہو کر، جب وہ ایک محفوظ مقام پر ٹھہرتا ہے تو تو سورج بھی اس کا ساتھ دیتے دیتے تھک کر پہاڑوں کی اوٹ میں چلا جاتا ہے اور رات کی

تاریکی آہستہ آہستہ صحرا پر چھانے لگتی ہے اور تھوڑی ہی دیر میں ہر طرف سناٹا اور موت کا سکوت طاری ہو جاتا ہے، عمرو بن براق اور شنفری نہ جانے کس طرف نکل گئے اور اب یہ ہے اور یہ صحرا اور اس میں سائیں سائیں کرتی ہوائیں، اتنے میں خیال محبوب آجاتا ہے، جو "اک تیز چھری ہے جو اترتی چلی جائے"۔ اور چند لمحوں کے بعد یہ خیال محبوبہ کی شکل میں مجسم ہو کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے ؎

یا عیدُ مالکَ من شوقٍ وایراقِ   ومَرِّ طیفٍ علی الأھوالِ طرّاقِ

راستہ پرخطر ہے، سانپ بچھوؤں سے بھرا پڑا ہے، پھر بھی خیال حبیب براہ دلنوازی و دلداری پیدل چل کر آئے تو دیدہ و دل کیسے نہ فرش راہ کیجیے؟ کہتا ہے ؎

یسری علی الأین والحیّات محتفیا   نفسی فداؤک من سارٍ علی ساقِ

تشبیب کے ان دونوں شعروں کے بعد اپنی اس دیت کا اظہار کرتا ہے کہ جب دوست احباب ساتھ چھوڑ دیں اور مصیبت و پریشانی میں کوئی سہارا و مددگار نہ رہ جائے تو میں اپنے اوپر اور اپنی دوڑ پر بھروسا کرتا ہوں اور اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہوں اس ضمن میں اس قصہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں وہ پانی پیتے وقت قبیلۂ بجیلہ کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا، اور ابن براق سے سانٹھ گانٹھ کر کے اس مصیبت سے بچ سکا تھا اور بجیلہ والے منہ دیکھتے رہ گئے تھے (۱)

کہتا ہے کہ جب میں قبیلۂ بجیلہ کے ہاتھوں، پانی پیتے وقت رات میں مقام الرھط میں گرفتار ہو گیا تو پھر اپنی دوڑ کے سہارے ہی بچ سکا۔ ان لوگوں نے میرے پیچھے اپنے تیز دوڑنے والے گھوڑے اور آدمی بھی دوڑائے جنھوں نے میرا پیچھا ابن براق کے دوڑنے کی جگہ تک کیا مگر مجھے پا نہ سکے۔

نجوتُ منہا، نجائی من بُجَیلۃ إذ   أُلقیتُ لیلۃ خبت الرھط أوراقی

لیلۃ ماحوا وأغروا بی سَرَاعَہُم   بالعَیکتین لدی معدی ابن براق

پھر اپنی اس تیز دوڑ کا نقشہ کھینچتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اتنی تیزی اور برق رفتاری سے بھاگا کہ جیسے انھوں نے مجھے نہیں بلکہ کسی صبا رفتار شتر مرغ یا برق رفتار ہرنی کو دیا ہو اور وہ جی جان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے ہوں، کیوں کہ چوپایوں اور پرندوں میں کوئی بھی ایسی قسم نہیں ہے جو مجھ سے تیز دوڑ سکے یہاں تک کہ آخر کار میں ان لوگوں کے چنگل سے بچ گیا حالانکہ

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے المفضلیات لابن جنی شرح الأنباری تحقیق کارلوس یعقوب لائل

میں ایسا پھنس گیا تھا کہ بجیلہ والے میرا کام ہی تمام کر دیتے۔ اپنے اوپر بھروسا اور مصیبت کے وقت ہوش وحواس قائم رکھنے اور عقل مندی سے کام لینے کی وجہ سے اب میں دوستوں کا محتاج نہیں رہ گیا ہوں، اگر ایسے وقت میں کوئی ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو میں آہ وبکا نہیں کرتا، خوف اور ڈر سے واویلا نہیں مچاتا کہ یہ صعلوک کی ریت کے خلاف بات ہے۔

کأنما حثحثوا حُصّاً قوادمه — أو أم خشف بذي شث وطباق

لا شيء أسرع مني ليس ذا عذرٍ — وذا جناح بجنب الريد خفاق

حتى نجوتُ، ولمّا ينزعوا سلبي — بوالهٍ من قبيض الشد غيداق

ولا أقول إذا ما خلّة صرمت — يا ويح نفسي من شوقٍ وإشفاق

نویں شعر میں پھر تیسرے شعر سے ملتی جلتی بات کہتا ہے جس میں درست احباب جب قطع تعلق کرلیں تو پرواہ نہ کرنے اور اپنے اوپر صرف بھروسہ کرنے کی بات کہی ہے۔ دسویں شعر سے ۱۴ویں شعر تک تابط شراً اپنی اس مثالی شخصیت کا مرقع پیش کرتا ہے جس پر وہ بھروسہ کر سکتا ہے، جس سے مصیبت کے وقت مدد مانگ سکتا ہے اور جس کے سامنے سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر میں کسی سے مدد لے سکتا ہوں اور اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتا ہوں تو صرف اس شخص کی طرف جو آزمودہ کار، دور بین، اور شکر اور تعریف کو حاصل کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہو، جو اپنے قبیلہ کا سردار ہو، اور ہر چھوٹا بڑا اس کے احکامات کو بے چوں چرا مان لیتا ہو اور راستا جری، نڈر، اور پختہ عزم و ارادہ کا آدمی کہ گھٹاٹوپ اندھیاری رات میں جب کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہو بلا خوف وخطر اپنی منزل کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہو، اور معرکوں میں جس کے ہاتھوں میں جھنڈا رہتا ہو، جو مجلسوں کی جان، بے لاگ فیصلہ کرنے والا اور جہاں پیما، گشت ہو جس آدمی میں یہ صفات جمع ہوں وہ میرا مثالی گروہ ہے اور صرف ایسے ہی آدمی سے اگر وقت پڑ جائے تو میں اپنا ہاتھ مدد کے لیے بڑھا سکتا ہوں۔

فذاك همّي وغزوي استغيث به — إذا استغثتُ بضافي الرأس نغّاق

۱۶ویں شعر سے ۱۹ویں شعر تک دشمنوں سے بھاگ کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر اپنے ساتھیوں سے پہلے پہونچ جانے کا ذکر کرتا ہے اور اس طرح کہ جوتا اس بری طرح سے پھٹ چکا ہے کہ صرف انگلیاں چھپ پاتی ہیں تلا بھی اکھڑ چکا ہے اور اسے پاؤں سے اٹکائے رکھنے کے لیے ایک تسمہ سے باندھ رکھا ہے۔ اس غربت وافلاس کے باوجود اگر کوئی اسے سخاوت اور دریادلی سے روکتا ہے اور بخل کی تلقین کرتا ہے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ چنانچہ ۲۲ویں شعر میں کہتا ہے کہ اے

مجھے ملامت کرنے والے اتنی سختی سے کیوں لعنت ملامت کرتا ہے یہ سب روپیہ پیسہ دھن دولت آنی جانی ہے بھلا تو بخل کر کے اسے روکنا چاہے گا تو وہ تیرے پاس رک جائے گی؟

عاذلتی إنّ بعض اللوم معنفۃ — وھل متاع وإن أبقیتہ باق؟

آخر کے اشعار میں اپنے اخلاق حمیدہ اور پاکیزہ کردار کا ذکر کر کے لعنت ملامت کرنے والوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ "جب تم میرے ان اخلاق حمیدہ اور صفات عالیہ کو یاد کرو گے تو اپنے کیے پر شرم سے پانی پانی ہو جاؤ گے"

إذا تذکرت یوماً بعض أخلاقی — لتقرعنّ ال سنّ من ندم

یہ تھا تابط شراً کا وہ مشہور قصیدہ جو نہ صرف اس کی بلکہ اس جیسے تمام صعالیک عرب کی زندگی اور اس سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا عکاس اور ان کی زندگی کا آئینہ دار ہے۔ اس میں حکایت غم دوراں بھی ہے اور شکایت غم جاناں بھی۔ ایک سخت کوش تندخو آزاد منش نوجوان کے جذبات کی تصویرکشی بھی ہے اور ان خانماں برباد شاعروں کی فلاکت زدہ انتہائی عسرت و غربت کی ماری زندگی کا نقشہ بھی اور اس کے ساتھ اس زندگی سے حاصل شدہ تجربات کی روشنی میں اخذ کی ہوئی حکمت و فلسفہ کی باتیں بھی۔ جن میں اگرچہ آج کل کے اعتبار سے بظاہر کوئی ندرت یا رفعت تخیل نہیں ہے لیکن اس معاشرہ اور ان حالات میں بہت وقیع اور اہم سمجھی جاتی تھیں۔

یہ تھا صعالیک الشعراء کے ایک دوسرے نمائندہ کی زندگی اور اس کے کلام کا نمونہ جس سے ہم کو یہ اندازہ ہوا کہ اس کے کلام میں بھی وہ جاہلی اور بدوی گمبھیرپن، خیالات میں سطحیت لیکن صفائی، الفاظ میں ثقل لیکن معانی کے لیے مناسب ہیں، اور انداز گفتار اور اسلوب گھٹا ہوا ہے جس میں جھول یا کمزوری نہیں ہے۔

موازنہ: تابط شراً کے کلام کا شنفری کے کلام سے موازنہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ تابط شراً اور شنفری میں مضامین کے اعتبار سے بڑی مشابہت ہے، اور انداز بیان میں بھی دونوں جاہلی انداز کے پابند ہیں مگر تنوع اور سلاست و روانی اور نغمگی میں شنفری تابط شراً سے بڑھا ہوا ہے، خاص طور سے غزل میں شنفری تابط سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ وصف اور سراپا میں بھی شنفری تابط سے ممتاز نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہم نے شنفری کے قصیدہ جس کا مطلع ہے "الا ام عمرو اجمعت ...." میں غزل اور وصف میں جو بانکپن اور اثر دیکھا وہ تابط کے کلام میں نہیں ملتی۔ اسی طرح اظہار محبت اور ہجر و فراق کی کہانی میں جو درد اور اثر ہے، وہ تابط سے زیادہ موثر اور جاندار ہے جبکہ شنفری نے اس جاہلی دور میں "لامیۃ العرب" کہہ کر ہمیشہ کے

یے اپنے کو ان صعالیک میں ممتاز کرلیا ہے۔

تابط کی طرف بعض حکیمانہ اور فلسفیانہ اشعار بھی منسوب ہیں، جیسے اس معنی کا شعر کہ آدمی جب مصیبت میں پھنس جائے اور حکمت و تدبیر سے کام نہ لے تو وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو شخص حواس قائم رکھ کر تدبیر سے کام لے تو وہی عقل مند کہلاتا ہے اور وہ زندگی بھر خوش و خرم رہتا ہے، اور ایک دروازہ جب بند ہوتا ہے تو دوسرا کھول لیتا ہے۔

إذا المرء لم یحتل وقد جد جدہ — اضاع وقاسی أمرہ وھو مدبرُ
ولکن أخو الحزم الذی لیس نازلا — بہ الخطب إلّا وھو للقصد مبصرُ
فذاک قریع الدھر ما عاش حوّل — اذا سُدّ منہ منخرٌ جاش منخرُ

اپنے مثالی نوجوان کے بارے میں کہتا ہے (اپنے چچازاد بھائی شمش بن مالک کو مثال بنا کر)

قلیل التشکی للمھمّ یصیبہ — کثیر الھوی شتّی النوی والمسالکِ
یظل بموماۃٍ ویمسی بغیرھا — جحیشا ویعرورِی ظھور المھالکِ

یعنی وہ مصیبتوں اور پریشانیوں میں شکوہ و شکایت نہیں کرتا، اس کے عزائم بلند اور اسفار کا خوگر ہے، جو اپنا دن ایک صحرا میں اور شام دوسرے میں گزارتا ہے اور تن تنہا ہلاکتوں اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اس کا آخری شعر ہے:

یری الوحشۃ الأنس الأنیس ویھتدی — بحیث اھتدت ام النجوم الشوابکِ

یعنی تنہائی و کس پرسی کو ہی وہ مونس و غم خوار سمجھتا ہے، اور عزائم کا اتنا بلند کہ ستاروں پر کمندیں ڈالتا ہے۔

جو دوڑنے میں ہوا سے بھی بازی لے جائے اور سونے کی حالت میں بھی جس کا دل جاگتا رہے اور جس کی آنکھیں دل پر پہرا بٹھائے رکھیں اور بڑے بڑے سورماؤں سے مقابلہ میں جم جائے اور جب اپنے نیزے کی انی یا تلوار کی دھار اس کی ہڈیوں میں پیوست کر دے تو موتیں کھل کھلا کر ہنس پڑیں

ویسبق وفد الریح من حیث ینتحی — بمنخرقٍ من شدّۃ المتدارکِ
إذا خاط عینیہ کری النوم لم یزل — لہ کالیٌ من قلب شیحان فاتکِ
ویجعل عینیہ ربیئۃ قلبہ — إلی سلّۃ من حد أخلق صائکِ
إذا ھزّہ فی عظم قرن تھلّلت — نواجذ أفواہ المنایا الضواحکِ

اشاریہ

ابن الشجری نے اپنے حماسہ میں تابط شراً کا ایک اور قصیدہ نقل کیا ہے جس کا مطلع ہے کہ

تقول سلیمی لجاراتہا　　　اُری ثابتاً یفنا حوقلا

آخر میں کہتا ہے:

وکنتُ اذا ما ھممتُ اعتزمتُ　　　واحر اذا قلت أن أفعلا

حوالہ جات:

۱۔ لسان العرب لابن منظور ۷/۱۷۹، ۱۴/۲۶۷، ۹/۱۲۱

۲۔ الأغانی الاصفہانی ۱۸/۲۰۹

۳۔ المفضلیات لابن ضبی شرح الأنباری تحقیق کارلوس یعقوب لایل

۴۔ شرح شواھد المغنی للسیوطی /۱۹، ۴۳، ۸۲

۵۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ ۱۷۴، ۱۷۷، ۴۲۲، ۴۲۵ اور آگے

۶۔ خزانۃ الأدب ولب لباب لسان العرب للبغدادی ۱/۶۶، ۲/۱۶، ۱۷

۷۔ مروج الذہب للمسعودی ۸۔ دائرۃ المعارف الإسلامیۃ

۹۔ التذکرۃ السعدیۃ: عبداللہ الجبوری/۴۴

۱۰۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان ۱/۱۶۲

۱۱۔ حماسہ ابوتمام مختلف مقامات پر

۱۲۔ حماسہ ابن الشجری/ ۴۷

۱۳۔ الشعراء الفرسان للبستانی

صدرِ اسلام

آنحضرت (حضرت محمد صلعم) اور خلفائے راشدین کا زمانہ

(سنہ ۱ھ سے سنہ ۴۰ھ مطابق سنہ ۶۲۲ء سے سنہ ۶۶۱ء تک)

سعودی عرب میں مکہ شہر کے خانہ کعبہ اور اس شہر میں رہنے والے قبیلوں میں قریش کو اسلام سے پہلے سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ خانہ کعبہ کو تو اس لئے کہ زمین پر وہ پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لئے اس کے ایک مخلص بندے اور نبی حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کی مدد سے بنایا تھا۔ زمانے کے ساتھ اس گھر کا وقار، احترام اور دینی تقدس اتنا بڑھ گیا کہ سارے جزیرہ نمائے عرب کا دینی مرکز اور روحانی آماجگاہ بن گیا اور اس معاملہ میں سارے عرب میں کوئی دوسری عبادت گاہ اس کی کبھی ہم سر نہ ہو سکی۔ یہاں ہر سال خاص مہینوں میں، جن میں جھگڑا لڑائی اور قبائلی جنگ و جدال حرام کر دی جاتی تھی، عرب کے دور و نزدیک کے علاقوں سے لوگ کھنچ کر آتے اور خدا کے اس گھر کا طواف کرتے اور دوسرے دینی اعمال اور رسمیں پوری کرتے جسے "حج" کہتے تھے۔ اس حج کے بعد اپنی ضرورت کی چیزیں، جو مختلف ملکوں سے قافلے لے کر آتے تھے اور جس کی وجہ سے مکہ ایک تجارتی منڈی بھی بن گیا تھا۔ خرید کر اپنے علاقوں، شہروں اور آبادیوں میں واپس چلے جاتے تھے۔

مکہ کے باسیوں میں قبیلہ قریش کو اس وجہ سے سارے عرب میں بہت اہمیت اور ساتھ ہی ساتھ تقدس بھی حاصل تھا کہ وہ خدا کے اس گھر کے پروہت، رکھوالے اور حج کے متعلق مختلف کاموں کے کرنے کے ذمہ دار تھے اور اسی کے ساتھ امن عامہ، سیاست اور فلاح و بہبود کے دوسرے اجتماعی کام بھی قریش ہی کا کوئی بزرگ کرتا تھا۔

آنحضرتؐ کی پیدائش کے وقت ان سب کاموں کی ذمہ داری آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب پر تھی۔ جن کے دس بیٹے اور دس بیٹیاں تھیں۔ آنحضرت کے والد حضرت عبداللہ، حضرت عبدالمطلب کی اولاد میں سب سے چھوٹے اور آپ کو بہت پیارے

تھے۔ کیوں کہ ایک سو اونٹوں کی قربانی دے کر عبدالمطلب نے ان کی جان بچائی تھی اور اپنی قسم پوری کی تھی (۱)

مکہ کے ان قریشیوں کے ہاتھ میں تجارت بھی تھی، جن کے قافلے وہ گرمیوں میں شام لے کر جاتے اور سردیوں میں یمن میں۔ ان تجارتی سفروں کا ذکر قرآن میں سورۃ ایلاف پارہ عن۳۰ میں آیا ہے، (۲)

چنانچہ تجارت میں دستگاہ اور خانہ کعبہ کی ذمہ داری کی وجہ سے قریش اور اہل مکہ کی عزت و تقدس اور احترام کے علاوہ سارے ملک عرب میں فارغ البالی اور دولت و ثروت میں بھی ان کو امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ اور یہ بات آس پاس کے دوسرے حکمرانوں اور خاص طور سے یمنیوں کو بہت کھلتی تھی، کیوں کہ یمن اس وقت تجارت کا مرکز تھا اور قریشیوں کے اس طرح ابھرنے کی وجہ سے ان کی تجارت متاثر ہونے لگی تھی۔

— اسی زمانے میں حبشہ (اتھیوپیا) کی طرف سے یمن کا بادشاہ یا گورنر "ابرہۃ الأشرم" مقرر ہوا۔ اس نے کعبہ کی یہ مرکزیت اور قریش کا یہ احترام اور دبدبہ دیکھا تو اس نے مکہ کی مرکزیت ختم کرنے کے ساتھ پورے جزیرہ نمائے عرب پر قبضہ کرنے کی مہم بنائی۔ اور سب سے پہلے کعبہ کو گرا کر عربوں کے مذہبی مرکز کو ختم کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ اس نے ایک بڑی فوج لے کر ۵۷۰ء میں مکہ پر چڑھائی کر کے مکہ کا محاصرہ کر لیا۔ اور مکہ والوں کے اونٹ اور جانور ہنکوا لئے۔ جن میں دو سو اونٹ عبدالمطلبؓ کے بھی تھے۔ اور جنگ کرنے سے پہلے گفتگو کرنے کے لئے حضرت عبدالمطلبؓ کو بلوا بھیجا۔ جب صلح صفائی کی بات ناکام ہوتی نظر آئی تو عبدالمطلب نے پہلے کوشش کی کہ تہامہ کی زمینوں کی آمدنی کا ایک تہائی دے کر کعبہ کو گرانے کے ارادہ سے ابرہہ کو باز رکھیں۔ لیکن جب وہ نہ مانا تو بولے کہ اچھا میرے

---

(۱) اس کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں اور خاص طور سے سیرت النبیؐ میں ملاحظہ کیجئے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب علی ھامش السیرہ میں اس واقعہ اور اس قربانی کا بہت دلچسپ ڈرامائی اور ادیبانہ انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔

(۲) لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ۔۔۔۔ الخ۔

اونٹ واپس کردو اور جو جی چاہے کرو۔ اس پر ابرھہ نے کہا کہ مجھے حیرت ہے کہ میں تمہارے دینی مرکز کو ختم کرنے آیا ہوں اور تم کو اپنے اونٹوں کی فکر پڑی ہے اور اس کو بچانے کی نہیں۔ عبدالمطلب بولے کہ اونٹوں کا مالک میں ہوں، مجھے میرے اونٹ واپس کردو۔ اس گھر کا مالک خدا ہے، وہ اپنے گھر کی حفاظت خود کرے گا۔ یہ کہہ کر اپنے اونٹ واپس لئے اور مکہ آکر اعلان کرا دیا کہ سب لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر پہاڑوں میں چلے جائیں۔ چنانچہ مکہ والوں نے مکہ خالی کر دیا۔

ادھر ابرھہ نے کعبہ کو گرانے کے لئے اپنے ہاتھی محمود نامی پر بیٹھ کر پیش قدمی کی۔ مگر مورخین کا کہنا ہے کہ کعبہ کے قریب آکر ہاتھی بیٹھ گیا اور باوجود بہت مارے جانے کے نہ اٹھا۔ اتنے میں سمندر کی طرف سے چڑیوں کے غول آنے شروع ہوئے، جن کے پنجوں اور چونچوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں تھیں اور انھوں نے ان کو بارش کی طرح فوج پر برسانا شروع کر دیا۔ جس سے فوج سراسیمہ ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ابرھہ کا ہاتھی محمود بھی اس بلائے ناگہانی سے اتنا بوکھلایا کہ چیختا چنگھاڑتا یمن کی طرف جو بھاگا تو پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ ابرھہ کی اس پسپائی کا ذکر قرآن میں سورۃ الفیل میں ہے۔ (۱)

عربوں نے اس سے پہلے ہاتھی کبھی نہ دیکھا تھا کعبہ پر چڑھائی کے اس واقعہ کی یادگار کے طور پر اس سال کا نام انھوں نے "عام الفیل" یعنی "سنہ ہاتھی" رکھ دیا اور اسی تاریخ سے اپنے اہم واقعات اور حوادث کو قلم بند کرنے لگے۔

پیدائش آنحضرتؐ اسی "سنہ ہاتھی" میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بروز دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول(۲) مطابق اپریل ۵۷۱ء کو مکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم اور ماں کا نام حضرت آمنہ بنت وھب تھا۔ دادا نے محمد نام رکھا۔ آپ کی پیدائش سے پہلے ہی آپ کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ مکہ کے رئیسوں کے رواج کے مطابق آپ کو دائی حلیمہ سعدیہ

---

(۱) اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ۔۔۔۔ الخ تیسواں پارہ۔

(۲) تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے اکثریت نے ۱۲ ربیع الاول ہی تسلیم کی ہے تفصیل سیرت النبیؐ اول علامہ شبلی نعمانی

کے حوالہ کر دیا گیا جنھوں نے اپنے گاؤں "بادیہ بنی سعد" میں اپنے ساتھ رکھ کر آپ کی پرورش کی (۱)، اور رضاعت کے فرائض انجام دیئے۔ جب آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور عبدالمطلب کی وصیت کے مطابق آپ کی پرورش آپ کے چچا حضرت ابوطالب نے کی۔ ۲۵ سال کی عمر میں آپ کی شادی مکہ کی مشہور اور مالدار تاجر خاتون خدیجہ بنت خویلد سے ہوئی (۲) جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو اللہ نے آپ کو نبی اور پیغمبر بنا کر تمام دنیا کی ہدایت کے لئے مامور کیا۔ اور دینی و دنیاوی ضابطہ حیات کے طور پر اپنی کتاب قرآن آپ پر نازل کی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، نبی ہونے کے بعد ۱۳ سال تک مکہ میں رہ کر لوگوں کو اسلام کی طرف بلاتے رہے، مگر اس عرصہ میں ستر آدمیوں سے زیادہ آدمی مکہ میں مسلمان نہ ہو سکے۔ مکہ والوں نے اس عرصہ میں آپ کو اور آپ کے ساتھی مسلمانوں کو ہر قسم کی سخت تکلیفیں پہونچائیں اور نئے مسلمان ہونے والوں کو دردناک سزائیں دیں، جس کی وجہ سے مکہ میں مسلمانوں کی زندگی ضیق میں تھی اور اطمینان و سکون سے زندہ رہنا دوبھر ہو گیا تھا۔ جب حالات بہت خراب ہو گئے اور تکلیفیں برداشت سے باہر ہو گئیں تو اللہ نے آپ کو مکہ چھوڑ کر یثرب (مدینہ منورہ) جانے کا حکم دیا، چنانچہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ ۶۲۲ء کی رات کو مکہ کو خیرباد کہا اور چپکے سے مدینہ کو ہجرت کر گئے۔ مکہ والوں کو، جنھوں نے اسی رات آپ کو قتل کر دینے کی ایک سازش مکمل کر رکھی تھی، جب صبح کو آپ کے اس طرح نکل جانے کی خبر ہوئی تو انھوں نے آپ کا پیچھا کیا۔ لیکن آپ کو نہ پا سکے۔ اور آپ اپنی منزل کی طرف ایک راہ نما کی رہبری میں بڑھتے رہے یہاں تک کہ مدینہ پہونچ گئے۔ آنحضرت قبا میں چار دن ٹھہرنے کے بعد ۱۶ ربیع الاوّل مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء کو مدینہ میں داخل ہوئے اور ابوایوب خالد بن یزید کے گھر میں اترے (۳) مدینہ والے ایک عرصہ سے آپ کا

---

(۱) ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے آنحضرت کے حلیمہ سعدیہ کی رضاعت اور پرورش میں دئے جانے کا بہت ہی خوبصورت نقشہ اپنی کتاب "علی ہامش السیرۃ" میں کھینچا ہے۔

(۲) آنحضرت سے شادی ہونے سے پہلے خدیجہ کی ۲ شادیاں ہو چکی تھیں۔ پہلی شادی النباش بن ابوزرارہ سے اور دوسری عتیق بن عائذ المخزومی سے۔ (تاریخ العرب) ڈاکٹر محمد اسعد طلس ص ۱۲۶ بحوالہ المواہب اللدنیۃ

(۳) تاریخ العرب ج ۱/ ۴۸، ڈاکٹر محمد اسعد طلس۔

شدید انتظار کر رہے تھے، چنانچہ انھوں نے آپ کا شاندار استقبال کیا اور سب مسلمان ہو گئے (یہودیوں کو چھوڑ کر) انھوں نے اپنے شہر "یثرب" کا نام بدل کر "مدینۃ الرسول" یعنی رسول کا شہر کر دیا۔ جو کثرتِ استعمال اور زمانے کے ساتھ صرف "مدینہ" رہ گیا۔ المدینۃ المنورہ

آنحضرتؐ کی ہجرت کے بعد سے اسلام کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، جہاں سے اسے مذاہب عالم میں ایک ممتاز مقام اور حکومتوں میں ایک نمایاں اور بے مثال حیثیت حاصل ہوئی۔ کیوں کہ مدینہ پہونچ کر آنحضرت نے اسلام کے رہنما اصولوں کے مطابق ایک مثالی دینی رفاہی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اور مسلمانوں نے ایک ابھرتی ہوئی منفرد ممتاز با مقصد اور اولوالعزم قوم و ملت کی شکل اختیار کی۔ اور اسلامی اصولوں کے مطابق ایک نئے صالح معاشرہ کی تشکیل شروع کی۔ اس صورت حال سے مکہ والوں کو سخت تکلیف پہونچی اور انھوں نے مدینہ کے یہودیوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں سے کئی جنگیں کیں۔ لیکن دو ایک کو چھوڑ کر ساری جنگوں میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ ان جنگوں میں سب سے مشہور اور اسلام اور مسلمانوں کی بقاء کے نقطۂ نظر سے سب سے پہلی اہم جنگ غزوۂ بدر ہے[1] جو ۲ھ مطابق ۶۲۴ء میں مکہ والوں سے ہوئی۔ اس کے بعد غزوہ خندق ۵ھ میں اور غزوہ حنین ۸ھ میں ہوا۔ اسی سال لیکن غزوہ حنین سے پہلے آنحضرتؐ نے مکہ فتح کر لیا اور یہ فتح کسوٹی تھی عربوں کی نظر میں نہ صرف آپ کی سچائی اور اسلام کی حقانیت کی بلکہ آپ کی قوت، سیاست اور عزم و حوصلہ اور اثر و رسوخ کے لئے بھی۔ اس فتح کے بعد عرب سمجھ گئے کہ اب آنحضرتؐ اور اسلام ایک طاقت بن کر ابھر رہے ہیں اس لئے اب خیر اسی میں ہے کہ ان کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ تمام علاقوں سے وفود نے آ کر مسلمان ہونا شروع کیا۔ اور عام لوگوں نے آنحضرتؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنی شروع کی چنانچہ مکہ کے وہ رؤسا اور سردار جو آپ کی اور اسلام کی سخت مخالفت کرتے رہے تھے، فتح مکہ کے بعد مسلمان ہو گئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں سارے عرب میں اسلام پھیل گیا اور اس طرح ۲۳ سال تک اسلام کی نشر و اشاعت کرنے ایک جاندار، پاک باز، تابندہ اور پائندہ قوم پیدا کرنے اور اسلام کے اصول و عقائد کے مطابق ایک صالح اور پاک و صاف سماج کی مضبوط بنیاد ڈالی

---

(۱) اصطلاح میں "غزوہ" اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں آنحضرتؐ بھی بنفس نفیس شریک ہوتے ہوں۔

تشکیل کرنے کے بعد ۱۱ھ مطابق ۲۹ / مارچ ۶۳۲ء کو اپنے خالق سے جا ملے۔ (۱)

اسلام کیا ہے؟

اسلام ایک آسمانی مذہب ہے، جس کو خدا نے آخری دین کے طور پر اپنے آخری نبی اور پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر دنیا میں بھیجا تھا۔ اسلام چند عقیدوں، کچھ عبادتوں اور ایک ایسے ضابطۂ حیات سے عبارت ہے، جس میں آداب و اخلاق کی نشان دہی کے ساتھ اسلامی عقائد و عبادات کو عملی طور پر زندگی میں جاری و ساری کرنے اور دین و دنیا سے متعلق ہر چیز اور معاملہ کے لیے ایک ضابطہ اور کچھ رہنما اصول مقرر کیے گئے ہیں۔ ان سب باتوں کا سرچشمہ اور بنیاد خدا کی ایک کتاب ہے جسے "قرآن" کہا جاتا ہے۔ یہ قرآن شریف کچھ سورتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ سورتیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں منقسم ہوئی ہیں۔ ہر جملہ کو اصطلاح میں آیت کہتے ہیں۔

قرآن شریف، آنحضرتؐ پر عربی زبان میں، رفتہ رفتہ، تھوڑا تھوڑا سا، ۲۳ برس کی مدت میں حسب ضرورت خدا کے فرشتے حضرت جبرئیل کے ذریعے نازل ہوتا رہا۔ آنحضرتؐ جس طرح اور جن الفاظ میں قرآن کو سنتے تھے، لکھنے والوں سے اسی طرح لکھا کر محفوظ کر دیتے تھے۔ قرآن کی ان سورتوں اور آیتوں کی حسب ضرورت اور حسب طلب آپ تشریح و توضیح کرتے تھے اور عمل کر کے بھی دکھاتے تھے۔ اور اس طرح آپ قرآن کا عملی نمونہ تھے۔

حدیث کیا ہے؟

اس طرح آپ کا ان عقائد، عبادات اور اسلام کے دوسرے احکامات کی تشریح و توضیح، اپنے الفاظ، اعمال، تقریر (اظہار پسندیدگی) اور کردار کے ذریعہ کرنے کو اصطلاح میں حدیث کہتے ہیں اور یہی قرآن اور حدیث (حدیث بحیثیت توضیح و تشریح) دینِ اسلام کی بنیاد اور سرچشمہ ہیں۔ یہ دونوں ایسی اعلیٰ معجز نما اور معیاری عربی زبان میں ہیں کہ عربی زبان و ادب کی کسوٹی اور ہر اعتبار سے اس کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اسی لیے ان پر الگ سے گفتگو ہوگی، کیوں کہ ان جیسی سحر آفرینی اور اثر اندازی کسی ادبی شہ پارہ

---

(۱) قمری مہینوں کی وجہ سے سنہ وفات میں تھوڑا اختلاف پایا جاتا ہے اس سلسلہ میں سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی نعمانی ملاحظہ کیجیے۔

میں نہیں ملتی ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا مدینہ میں آکر آنحضرتؐ کی حیثیت پیغمبر اسلام کے علاوہ ایک سپہ سالار اور ایک صدر مملکت کی بھی تھی۔ کیوں کہ یہاں اسلام صرف ایک مذہب کی حیثیت سے نہیں پروان چڑھ رہا تھا بلکہ ایک اسلامی مثالی حکومت کی حیثیت سے بھی ابھر رہا تھا۔ اس لئے آپ کے وصال کے بعد اس سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے مسلمانوں نے یکے بعد دیگرے آپ کے چار جانشین یا خلیفہ مقرر کئے۔ جنھیں اصطلاح میں "خلفائے راشدین" کہتے ہیں۔

خلفائے راشدین

آنحضرتؐ کے پہلے جانشین یا خلیفہ آپ کے غار کے ساتھی اور ہجرت میں ہمراہی حضرت ابوبکر صدیق بن ابو قحافہ کو ۱۲ھ مطابق ۲۹ مارچ ۶۳۲ء کو منتخب کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ دو سال تک خلیفہ رہے، جس میں اسلام کے سب سے بڑے اور پہلے فتنہ "فتنہ ارتداد" کو آپ نے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ یہ فتنہ آنحضرتؐ کے وصال کے فوراً بعد اٹھ کھڑا ہوا جس میں عرب کے بعض قبیلوں نے اسلام کو چھوڑ دیا اور اس سے مرتد یعنی پھر گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے بعض صحابہ کی رائے کے خلاف اس خطرناک اور اسلام اور مسلمان دشمن تحریک کو مزید پھیلنے اور طاقتور بننے سے پہلے ہی بذریعہ طاقت کچل کے رکھ دیا، اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس قسم کی تخریبی تحریکوں کا دروازہ بند کر دیا۔ عراق و شام میں جو عرب ایرانیوں اور رومیوں کی ماتحتی میں ذلت و خواری کی زندگی گزار رہے تھے ان کو ان کے چنگل سے آزاد کرایا۔ اور قرآن شریف جو اب تک پاروں میں متفرق تھا، جمع کرا کے ایک جلد میں مرتب کرایا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد حضرت عمرؓ ۱۳ھ مطابق، مارچ ۶۳۴ء کو دوسرے خلیفہ ہوئے۔ آپ دس سال تک اپنے عہدہ پر فائز رہے۔ آپ کے زمانے میں مسلمانوں نے عراق، شام، مصر اور ایران کو فتح کر لیا۔ چوں کہ ایران اور روم کی حکومتوں کا تختہ آپ کے زمانے میں پلٹا تھا۔ جس کی چوٹ ان طاقت ور حکومتوں پر ایسی بڑی تھی کہ وہ اس کو برداشت نہ کر سکیں اسلئے سازش کر کے ایک ایرانی مجوسی ابو لولو فیروز کو آپ کے قتل کرنے کے لئے مقرر کیا، چنانچہ اس نے آپ کو عین نماز کی حالت میں خنجر

مار کر ۲۳ھ مطابق ۶۴۳ء شہید کر دیا۔

حضرت عمر کے بعد مسند خلافت پر حضرت عثمان بن عفان ۲۳ھ مطابق ۱۹ نومبر ۶۴۳ء کو بیٹھے۔ آپ خاندان بنوامیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے زمانے میں فتوحات کا سلسلہ مصر سے بڑھ کر لیبیا تک پھیل گیا۔

حضرت عثمان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو اب تک حضرت ابوبکر کے ترتیب دئے ہوئے انداز پر ام المؤمنین حضرت حفصہ (حضرت عمر کی صاحبزادی) کے پاس محفوظ تھا، اس طرح دوبارہ کاتبین وحی کے ذریعہ جمع و ترتیب کرائی جس طرح آجکل ہم اس کو پڑھتے ہیں اور اس کی کاپیاں بنوا کر تمام ممالک اسلامیہ میں بھجوادیں اور حکم دے دیا کہ اب ان ہی نسخوں کے مطابق قرآن کریم کو رکھا جائے اور اس کی تلاوت کی جائے اور دوسرے تمام نسخے منسوخ کر دئے۔ کچھ عرصہ کے بعد لوگوں کو آپ سے اس وجہ سے شکایت پیدا ہوگئی کہ اکثر بڑے عہدوں پر اموی لوگ متعین تھے۔ جن میں سے اکثر آپ کے رشتہ دار تھے۔ چنانچہ لوگوں نے اور خاص طور سے مصریوں نے آپ کے خلاف ہنگامہ کر دیا اور مدینہ میں آپ کو اپنے گھر میں بند کر کے کھانا پینا سب بند کر دیا۔ حضرت عثمان نے صورت حال کو سنبھالنے اور باغیوں کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ باغیوں نے آپ کو ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ مطابق ۱۷ جون ۶۵۵ء کو قرآن پڑھنے کی حالت میں شہید کر دیا۔ آپ کی مدت خلافت ۱۲ سال رہی۔

حضرت عثمان کے بعد آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی اور داماد حضرت علی کرم اللہ وجہہ چوتھے خلیفہ منتخب ہوئے۔ آپ نے ۳۵ھ مطابق ۱۱ جولائی ۶۵۶ء کو مسند خلافت سنبھالا۔(۱) لیکن خلافت سے متعلق جو ہنگامے حضرت عثمان کے عہد میں شروع ہو گئے تھے وہ بجائے ختم ہونے کے بڑھتے ہی چلے گئے، اور ان میں شدت اس وجہ سے اور پیدا ہو گئی کہ لوگوں نے حضرت علی سے حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص لینے کا مطالبہ شروع کیا حضرت علی کہتے تھے کہ پہلے آپ لوگ میرے ہاتھ پر بیعت کر کے مجھے اپنا بھی خلیفہ تسلیم کیجئے۔ پھر قاتلوں کے پکڑنے اور ان سے قانون کے مطابق قصاص لینے میں میری مدد کیجئے۔ لیکن ایک خاص طبقہ اور خاص طور سے شامیوں نے ان کی بات نہ مانی اور یہ اختلاف

(۱) یہ ساری تاریخیں فجر الاسلام احمد آمین سے لی گئی ہیں۔ اردو میں تاریخ اسلام مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔

انتہا بڑھا کہ حضرت معاویہؓ جو شام کے گورنر تھے، اور قصاص کا مطالبہ کرنے والوں میں پیش پیش تھے، حضرت علیؓ سے بہت بددل اور ان کے سخت مخالف ہو گئے جس کے نتیجے میں کئی جنگیں ہوئیں، جن میں جنگ جمل اور جنگ صفین بہت مشہور اور اہم ہیں۔ جن کے بعد مسلمانوں کے درمیان جنگ کا جو دروازہ کھلا تو وہ مدتوں تک بند نہ ہوا۔ اور امت مسلمہ کا شیرازہ بکھر گیا۔

جنگ صفین کے بعد حضرت علی کے پیرو دو گروہوں میں بٹ گئے، ایک گروہ شیعان علی کہلایا، جنھوں نے حضرت علی کی آخر دم تک مدد کی اور ساتھ دیا۔ دوسرا گروہ خوارج کہلایا۔ یہ لوگ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ کو دینی نہیں بلکہ سیاسی جنگ سمجھتے تھے، انھوں نے حضرت علی کی فوج سے نکل کر الگ اپنی فوج تیار کی اور اس طرح دونوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے ان کے دشمن بن گئے۔ چنانچہ ان خارجیوں نے حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ تینوں کو قتل کرنے کی کوشش کی کیونکہ یہی تینوں انکے خیال میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور تفرقہ کا سبب بنے تھے۔ یہ لوگ سب کو تو نہیں البتہ حضرت علی کو قتل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ (۱) چنانچہ ابن ملجم نے آپ کو ۱۷ رمضان سنہ ۴۰ھ مطابق ۲۴ دسمبر سنہ ۶۶۱ء کو شہید کر دیا۔ اور اس طرح خلفائے راشدین کا یہ سلسلہ جو چار خلفاء پر مشتمل تھا ختم ہو گیا۔

حضرت علی کی شہادت کے بعد حضرت حسن (حضرت علی کے بڑے صاحبزادے) کو خلیفہ بنایا گیا لیکن حضرت معاویہ نے ان کو خلافت سے دست بردار کرا کے سنہ ۴۱ھ میں خود زمام خلافت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور اس طرح بنو امیہ کی خلافت کی بنیاد رکھی جو سنہ ۴۱ھ میں شروع ہو کر سنہ ۱۳۲ھ میں ختم ہوئی۔ بنو امیہ کی مدت خلافت ۹۰ سال گیارہ ماہ تیرہ دن ہوئی۔ (۲) بنو امیہ کے زمانہ میں عربی زبان و ادب کی جو حالت رہی اس کا تفصیلی مطالعہ بعد میں کیا جائے گا۔ ذیل میں آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے زمانہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ پہلے نثر کا اس کے بعد نظم کا

---

(۱) قتل کی سازش میں البرک بن عبد اللہ التیمی، عمرو بن بکر التیمی اور عبد الرحمٰن بن ملجم شریک تھے۔ تاریخ العرب: اسعد طلس /۳۰۸ اردو میں تفصیل کے لیے تاریخ اسلام حصہ اول، مطبوعہ دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

(۲) خلافت امویہ اور ہندوستان: قاضی اطہر مبارک پوری بحوالہ مروج الذہب للمسعودی ۲۴۹/۳۔

پہلا باب

صدر اسلام میں نثر

۱۔ قرآن شریف

جاہلی دور کے اخیر زمانے میں اور اسلام کے آنے سے تھوڑے عرصہ پہلے تک عرب قوم بدستور اپنی فطری بدوی زندگی گزارتی رہی تھی۔ چنانچہ اس خانہ بدوشانہ معاشرہ میں نہ علوم وفنون کا رواج تھا اور نہ کوئی بندھا ٹکا ملکی اور سماجی قانون، نہ صنعت نہ حرفت، نہ تجارت نہ زراعت۔ آئے دن کی قتل وغارت گری، ثار (خون کے بدلے خون) وانتقام، بدمعاملگی اور لاقانونیت نے ایک طرف نراج کا سا عالم طاری کر رکھا تھا تو دوسری طرف حد درجہ کا علمی وادبی فقر کا دور دورہ تھا۔

اس حالت میں اسلام کا ظہور ہوا۔ جسے خدا نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ صرف عربوں ہی کے لئے نہیں، بلکہ پوری انسانی برادری کے لئے ایک صاف ستھرے مذہب اور زندگی کے کارواں کے لئے سیدھے سچے اور بے خطر راستہ کے طور پر زمین کے باسیوں کے لئے بھیجا۔ چنانچہ اسلام نے تھوڑے ہی عرصہ میں عربوں کی ایسی کایا پلٹ کر دی کہ صحرانشین اونٹ اور بھیڑ بکریاں چرانے والے، فقر وفاقہ کے مارے بدوی علم وفن سے ناآشنا قوم، ایک عظیم الشان سلطنت کی مالک بن گئی۔ جس نے قیصر وکسریٰ کے تخت کو بھی اپنے پاؤں تلے روند ڈالا۔ اور دوسری طرف ایمان ویقین کی ایسی دولت بخش دی، جس کے سہارے انھوں نے ایسا صالح پاکیزہ اور مثالی سماج تعمیر کیا، جس میں دل ودماغ کی غذا کے ساتھ مادی وسائل کی ایسی فراوانی ہوئی جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے اور علم وفضل میں وہ پیش رفت دکھائی کہ دنیا کے لئے مشعل راہ بن گئے۔

اسی کے ساتھ ان عربوں نے اپنی زندگی کی نئے سرے سے تشکیل کی، چنانچہ انہوں نے خاندانی اور قبائلی تعلقات کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نئے سرے سے استوار کیا۔

جس کی وجہ سے عورت کو سماج اور خاندان میں اس کا جائز حق ملا، ماں باپ، عزیز واقارب اور پاس پڑوس کے لوگوں کے تعلقات، ان کے حقوق اور فرائض کا تعین ہوا۔ اور اس طرح خاندان، اور قبیلہ سماج کا ایک گٹھا ہوا اور اٹوٹ حصّہ قرار پایا، پرانی جاہلی قبائلی عصبیت ختم ہوئی اور اس کی جگہ ایک ایسا مضبوط گٹھا ہوا اور مضبوط بنیادوں پر قائم سماجی اور ملکی نظام وجود میں آیا جس کے اصول ونظریات کو ماننے اور جس کے بتائے ہوئے طور طریقوں پر چلنے کے بعد افراد اور جاہلی سماج کو جو برائیاں ورثہ میں ملی تھیں وہ دور ہو گئیں، اور اب سماج کا ہر فرد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس اور اپنے حقوق و فرائض کو سمجھنے لگا اور اس طرح وحدت یگانگت اتفاق واتحاد کی وہ فضا قائم ہو گئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں، قبائل، خاندانوں اور کنبوں میں بٹی ہوئی یہ قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ٹھوس، جاندار اولوالعزم اور ناقابل تسخیر قوم بن گئی ۔ جس نے بڑے بڑے کج کلاہوں کے تاج وتخت کو اپنے پیروں تلے روند دیا۔

اس نئے نظام کے سربراہ خود آنحضرتؐ تھے، اور اصول ونظریات اور قواعد وضوابط کا سرچشمہ ذات الٰہی، جس سے آپ کا بذریعہ وحی والہام براہ راست تعلق تھا اور اس تعلق کا سرشتہ جبرئیل امین تھے۔ جن کے ذریعہ خدا حسب ضرورت اپنے احکامات بھیجتا رہتا تھا۔ جسے قرآن کہتے ہیں اور یہی کتاب اسلام کی بنیاد اور مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے اور سماجی معاشی اور ملکی دستور، جس میں ایک نقطہ کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہونے کا امکان ہے۔

قرآن کریم : قرآن شریف اللہ کی وہ مقدس کتاب ہے جسے اس نے اپنے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے فرشتہ جبرئیل کے ذریعہ عربی زبان کے قریشی لہجہ میں نازل فرمائی۔ یہ کتاب عرب کے دو مشہور شہروں میں آپ پر نازل ہوئی ان میں سے ایک مکہ معظمہ ہے جہاں آپ پیدا ہوئے اور نبوت ملنے کے بعد تیرہ برس تک رہے، اور اسلام کی دعوت دیتے رہے، اور دوسرا مدینہ منورہ ہے، جہاں آپ مکہ چھوڑ کر جا بسے تھے اور عمر کے باقی دس سال آپ نے وہاں بتائے اور وہیں آپ کا انتقال بھی ہوا۔ قرآن شریف کی بعض آیتیں آپ کے بعض سفروں کے درمیان بھی نازل ہوئیں۔

قرآن کریم آپ پر تیئیس ۲۳ سال کی مدت میں ٹھہر ٹھہر کر حسب ضرورت نازل ہوا۔

اس کی مصلحت یہ تھی کہ مسلمان رفتہ رفتہ نئے دین، اور اس کی بنیاد پر قائم نئی زندگی اور اس سے متعلق اصول، قواعد و ضوابط اور اس کے تقاضوں کے عادی ہوتے جائیں، تاکہ بیک وقت پرانی ڈگر سے ہٹنے میں جو شدید تکلیف ہوتی ہے اس کا احساس کم سے کم تر رہے۔ اور دھیرے دھیرے اسلام اور اس کی تعلیمات ان کے دلوں میں گھر کرتی جائیں اور ان کے مطابق اپنی زندگی ڈھالتے جائیں، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے کہ (وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۔) قرآن کے اترنے کی ابتدا رمضان کی شب قدر سے ہوئی۔ (اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ) اور صاف ستھری اور واضح عربی زبان میں روح امین (جبرئیل فرشتہ) کے ذریعہ آپ کے قلب پر اس کا نزول ہوا تاکہ آپ لوگوں کو ان کے انجام اور عاقبت سے ڈرا سکیں (وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ، عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ، بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ) اسے فرشتہ جبرئیل آپ کے پاس خدا کی طرف سے لے کر آئے۔ (نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ)۔

مکہ کی سب سے پہلی سورت :

قرآن کے اترنے کی ابتدا ۱۱ سنہ ء سے ہوئی اور سب سے پہلی سورت جو آپ پر مکہ میں نازل ہوئی وہ سورت "العلق" کا حصہ تھا (اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ، اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ) یہ آیتیں آپ پر ان دنوں اتریں جب آپ مکہ کے قریب "غار حرا" میں تنہا بیٹھ کر خدا کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اور اس کی ذات و صفات اور نظام کائنات وغیرہ پر غور فرمایا کرتے تھے۔

مدینہ کی سب سے پہلی سورت :

سنہ ۶۲۲ء میں آپ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ میں آپ پر سب سے پہلے سورۃ "المطففین" کی یہ آیتیں نازل ہوئیں (وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ ، اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ، یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ) کیوں کہ یہاں کے لوگ ناپ تول میں بہت ڈنڈی مارتے تھے۔

آخری آیت :-

قرآن کریم کی آخری آیت جو آپ پر اتری وہ یہ تھی " اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ہ یعنی آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اسلام کو تمہارے لئے بطور مذہب کے پسند کیا اور اس اعلان کے بعد اس نے اسلام کو ساری نسل انسانی کے لئے آخری مذہب قرار دیا کیوں کہ یہ تمام مذاہب کا نچوڑ اور ان کی آخری شکل ہے ۔ یہ آیتیں آپ کے آخری حج کے موقعہ پر اتری تھیں، جسے حجۃ الوداع کہتے ہیں ۔

چوں کہ اب آنحضرتؐ کا مشن مکمل ہو چکا تھا اسلام اور اس کی تعلیمات جزیرہ نمائے عرب کے ہر خطہ میں پھیل چکی تھیں اور سچے مخلص اور اللہ پر کامل یقین اور بھروسہ رکھنے والی مسلمانوں کی ایک جماعت پیدا ہو چکی تھی جو آپ کی خاص تربیت کردہ تھی، اس لئے اب خدا کے نزدیک آنحضرتؐ کی ضرورت دنیا میں باقی نہیں رہ گئی تھی، چنانچہ اس آخری حج کے چند مہینوں کے بعد آپ اپنے خدا سے جا ملے ۔

قرآن کی سورتوں اور آیات کی تعداد :-

قرآن شریف میں ایک سو چودہ (۱۱۴) چھوٹی بڑی سورتیں ہیں ، ان میں سے اکیانوے (۹۱) مکہ میں اور تیئیس (۲۳) مدینہ میں نازل ہوئیں ۔ ہر سورت میں مختلف چھوٹی بڑی آیتیں ہیں ۔ جن کی تعداد بسم اللہ کو چھوڑ کر چھ ہزار دو سو چودہ ہے، تلاوت کرنے میں آسانی کے خیال سے پورے قرآن کو تیس پاروں یا حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے، پھر ہر پارہ یا حصہ کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے، پھر ان دونوں کو بھی مزید چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے ان حصوں کو رکوع کہتے ہیں ۔ اس طرح ایک پارہ مختلف چھوٹے حصوں یعنی رکوع میں بنٹا ہوا ہے تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی رہے ۔

—X—X—X—X—X—

قرآن کریم کے موضوعات اور اس کی تعلیمات :

مکی سورتیں :- مکی سورتیں مدنی سورتوں کے مقابلہ میں چھوٹی ہیں اور چونکہ آنحضرت نے اسلام کی دعوت دینے کی ابتدا مکہ سے کی تھی، اس لئے ان سورتوں میں سب سے پہلے خدا کا واضح اور صاف تصور دیا گیا ہے اور اس کے بعد صرف اسی کی عبادت اور پرستش کرنے کا حکم ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا بلا شرکت غیر کے ایک ہے، بے نیاز ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہ قادر مطلق ہے یعنی وہ جو چاہے کرے اس پر روک ٹوک لگانے والا یا منع کرنے والا کوئی نہیں، زمین و آسمان، چرند پرند انسان اور سارے جاندار اس کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور پوری کائنات میں اسی کا حکم چلتا ہے، اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا، ہر آدمی کو مرنے کے بعد حساب کتاب دینا ہے اور اس کے مطابق اچھے کام پر انعام پانا ہے، جسے جنت کہتے ہیں، اور برے کام پر سزا بھگتنی ہے، جسے دوزخ کہتے ہیں، وہ معاف کرنے والا ہے۔ لیکن بہت سخت سزا دینے والا بھی ہے، وہ بہت مہربان اور بڑا رحم والا ہے مگر جبار و قہار بھی، وہ علام الغیوب ہے اور ہمارے دلوں کی باتوں کو بھی جانتا ہے، اس کے سامنے ہر چیز کا ظاہر و باطن کھلا ہوا ہے۔ خدا کے واضح تصور اور اس کی وحدانیت کی تعلیم کے بعد قرآن نے اخلاق فاضلہ کی تعلیم دی ہے جیسے عدل، احسان، وعدہ کا پورا کرنا، غلطی کرنے والے کو معاف کر دینا اور برائیوں سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ جیسے زنا، قتل کرنا، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، ناپ تول میں کمی کرنا اور ان تمام باتوں سے روکا ہے جن سے خدا کا انکار لازم آتا ہے۔

جہاں تک عبادات کا تعلق ہے تو نماز اور زکوٰۃ جیسے ارکان دین کا صرف اصولی تذکرہ مکی سورتوں میں ہے، ان کی تفصیل یا موجودہ شکل مدینہ میں پیدا ہوئی۔ مثلاً زکوٰۃ کا مفہوم مکہ میں صرف یہ تھا کہ خدا کے راستے اور بھلائی کے کام میں خرچ کیا جائے، لیکن اس کے لئے زر نقد کی تعیین تعداد، اور مال کی خاص مقدار مقرر نہیں تھی، اور نہ اس کا کوئی خاص نظام تھا۔ یہ سب مدینہ میں ہوا۔ اسی طرح نماز کا عام حکم تھا، لیکن پانچ وقت کی تعداد مکہ میں مقرر نہیں ہوئی تھی (۱) اس قسم کے احکام کی غالباً بہترین مثال سورت الانعام ہے جو مکہ میں نازل ہوئی تھی۔

---

(۱) — احمد امین : فجر الاسلام ، ص ۲۶۷ تا ۲۶۸ -

مکی سورتوں میں گزشتہ نبیوں اور پرانی قوموں کے قصّے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جن قوموں نے خدا کے احکام کی تعمیل کی خدا نے ان کو ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا اور جب انھوں نے نافرمانی کی تو ان کو تہس نہس کر دیا، ان کو بندر، خنزیر اور دوسرے جانوروں کی شکلوں میں مسخ کیا ان کی بستیاں الٹ دیں، آندھی طوفان اور زلزلوں کی سخت لرزہ براندام سزاؤں کے بعد آسمان سے خون کی بارش بطور سزا برسائی۔ ان میں سے بعض کو صفحۂ ہستی سے اس طرح مٹا دیا کہ آج ان کا نام لینے والا بھی کوئی نہیں[1] دوسری طرف مکی سورتیں مظاہر قدرت کی طرف اشارہ کر کے عقل انسانی کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں کہ یہ سارا نظام کائنات یوں ہی بغیر کسی چلانے والے کے نہیں چل رہا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک قوت محرکہ ہے، جس کے ابرو اشارہ کا یہ سب کرشمہ ہے۔ قرآن تو یہاں تک کہتا ہے کہ دور کیوں جاؤ تم، خود اپنے وجود اور اس کی ابتدا، اور ماں کے پیٹ میں صرف ایک قطرے سے تمام اعضا کے بننے پھر ان کے مختلف فرائض اور زندگی کے لیے ان کی ناگزیری پر غور کرو تو سمجھ میں آجائیگا کہ یہ صرف فطرت کی کاری گری نہیں ہے بلکہ ایک خاص ہستی کی۔ جو درحقیقت خالق اور مدبر ہے جس نے ہر چیز بڑی باریک بینی اور جزرسی سے بنائی ہے اور وہ ہے اللہ رب العالمین سارے جہانوں کا پالن ہار، مالک مختار اور جزا و سزا کے دن کا تنہا حاکم اور جج۔

مدنی سورتیں: مدنی سورتوں میں جو نسبتاً لمبی ہیں، اسلام کے ارکان دینی کا بیان ہے مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے متعلق تفصیلی احکامات ہیں۔ اور چوں کہ یہاں سے ایک نئے معاشرے کی ابتداء ہو رہی تھی اور ایک نئی اسلامی مملکت کی داغ بیل پڑ رہی تھی اس لیے سماج سے متعلق احکامات، فرد اور سماج کے تعلقات اور حقوق و فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پاس پڑوس خاندان، عزیز و اقارب، ماں باپ اور دوسرے متعلقین کے حقوق و فرائض گنائے گئے ہیں اور خاص طور سے شادی بیاہ اور طلاق کے معاملات اور ان کے احکام، وراثت کے قوانین اور حرام و حلال کی تفصیل گنائی گئی ہے، ملکی اور سیاسی و معاشی معاملات سے متعلق اصول اور قواعد و ضوابط اور بنیادی باتوں کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ نظام جماعت نظام حکومت اور طریقۂ حکومت، نظام عدالت، نظام معیشت اور لین دین، تجارت، صنعت حرفت وغیرہ سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر اور طور طریقوں کی تفصیل ہے

---

(1) اس قسم کے قصوں سے عربی اور اردو کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ قرآنی قصوں پر مشتمل بہترین کتاب "القصة القرآنية والصورة الفنية" بقلم نقیمی رضوان ہے مطبوعہ قاہرہ۔

ان کے علاوہ اسلام میں دشمن عناصر سے معاملہ کرنے، ان سے جنگ وصلح کرنے کے اصول اور ضابطے متعین کیے گئے ہیں، دوسری قوموں سے تعلقات قائم کرنے انھیں استوار رکھنے ان سے جنگ وصلح اور امن کے سلسلے میں معاہدے کرنے، ذمیوں(۱) کے ساتھ سلوک اور ان کے حقوق و فرائض کے رہنما اصول بتائے گئے ہیں، اس قسم کی بہترین مثال دو مدنی سورتیں یعنی سورۃ بقرہ اور النساء ہیں۔ غرض کہ مدنی سورتوں میں اسلام کی دینی اور دنیاوی زندگی کا مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اس خاکہ اور اس کے اصولوں کے مطابق زندگی گذارنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ چنانچہ خود رسولؐ نے ان کے مطابق زندگی گذار کر ان کا عملی ثبوت دیدیا

قرآن کریم کی جمع وتدوین : ــــ قرآن کریم چوں کہ کلام الٰہی ہے اور نسل انسانی کے لیے دائمی ضابطۂ حیات کے طور پر نازل ہوا ہے، اس لیے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے، ارشاد خداوندی ہے (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ) ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔ روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی حفاظت کی اتنی فکر رہتی تھی کہ آپ اکثر اوقات اس کی تلاوت کرتے اور اسے دہرانے میں لگے رہتے، کبھی ایک ساتھ کوئی لمبی سورت نازل ہو جاتی تو آپ بھولنے کے ڈر سے جلدی جلدی اسے دہراتے اور گھنٹوں اس میں لگا دیتے۔ چنانچہ اللہ نے آں حضرتؐ کی یہ فکر یہ کہہ کر دور کر دی کہ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ، اس کے جمع کرنے اور تلاوت کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے، آپ پریشان نہ ہوں اس کی حفاظت اور بقاء کا کام ہمارا ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن اترتا تھا تو آپ کاتبین وحی سے جن کی تعداد سات سے نو تک بتائی جاتی ہے، بہ ترتیب لکھوا دیتے تھے، اس زمانے میں عرب میں کاغذ کا وجود نہ تھا، اس لیے چمڑے کے ٹکڑوں، کھجور کے پتوں، ہڈی اور چکنے پتھروں پر آیتیں لکھ لی جاتی تھیں، اسی کے ساتھ تمام صحابہ انہیں زبانی یاد کر لیتے تھے، اس طرح لکھنے کے علاوہ بیک وقت سینکڑوں سینوں میں بھی قرآن محفوظ ہوتا رہتا تھا، چنانچہ آپ کی زندگی ہی میں پورا قرآن، آپ کے حکم سے اور آپ کی دی ہوئی ترتیب کے مطابق بجنسہ مرتب ہو چکا تھا اور جب آپ کا انتقال ہوا تو یہ مرتب قرآن آپ کے بعد آپ کے خلیفہ حضرت ابو بکر کو ملا۔ جنگ یمامہ میں جب سات سو سے زائد حفاظ قرآن شہید ہو گئے، تو حضرت عمرؓ کو

---

(۱) یعنی اسلامی حکومت میں غیر مسلم اقوام۔

فکر ہوئی کہ اگر اس طرح قرآن کے حفاظ جنگوں میں شہید ہوتے رہیں گے تو ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے کہ گنے چنے چند ہی حفاظ رہ جائیں اور پھر ایک دن سینوں سے قرآن بالکل ہی مٹ جائے چنانچہ آپ حضرت ابو بکر کے پاس آئے اور اس خطرہ کا اظہار کرنے کے بعد کہا کہ آپ قرآن شریف کو یکجا جمع کیوں نہیں کرا دیتے؟ حضرت ابو بکر کو شروع میں تردد ہوا لیکن آخر میں بات آپ کی سمجھ میں آگئی اور آپ نے حضرت زید بن ثابت، کو جو خاص کاتبین وحی میں سے تھے، حکم دیا کہ اسے ایک جگہ جمع کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے چمڑوں کے ان ٹکڑوں، کھجور کے پتوں، چکنے پتھروں اور ہڈیوں سے قرآن شریف کو ایک جگہ جمع کیا، اس کے بعد بڑے صحابہ کے سامنے جنھیں پورا قرآن زبانی یاد تھا، جیسے ابی بن کعب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب عبداللہ بن مسعود، طلحہ، حذیفۃ الایمان، ابوہریرہ، ابوالدرداء ابو موسیٰ الاشعری پیش کر کے اس کی تصدیق کرائی، اس طرح جب یہ نسخہ مکمل ہوگیا تو حضرت ابو بکرؓ کے پاس رکھ دیا گیا۔ جب آپ کا انتقال ہوگیا اور حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو یہ قرآن آپ کے پاس رہا، آپ کی وفات کے بعد یہ قرآن آپ کی صاحبزادی اور ام المومنین حضرت حفصہ کے پاس منتقل ہوگیا۔

حضرت عمر کے بعد جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے اور فتوحات کا سلسلہ خاصا بڑھنے لگا، اور دوسری قوموں کے لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے اور انھوں نے قرآن کو اپنے لہجوں میں اور غلط اعراب کے ساتھ پڑھنا شروع کیا تو قرآن میں اختلاف پیدا ہونے کا ڈر پیدا ہوا، چنانچہ حذیفۃ الایمان صحابی نے جو خود بھی وحی لکھنے والوں میں تھے آرمینیہ اور آذربیجان کی فتح کے موقع پر مسلمانوں کو مختلف لہجوں اور مختلف اعراب سے قرآن پڑھتے سنا تو انہیں قرآن میں اختلاف پیدا ہونے کا خطرہ محسوس ہوا، چنانچہ وہ فوراً حضرت عثمان کے پاس آئے اور بولے کہ امیر المومنین مسلمانوں میں قرآن کے معاملے میں اتنا اختلاف پیدا ہونا شروع ہوگیا ہے کہ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں ان کی حالت بھی یہود و نصاریٰ کی طرح نہ ہو جائے، حضرت عثمان کو معاملہ کی نزاکت کا احساس ہوا، چنانچہ حضرت حفصہ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس جو قرآن ہے اسے ہمارے پاس بھیج دیجئے۔ ہم اس سے کئی نسخے تیار کرانے کے بعد آپ کے پاس دوبارہ بھیج دیں گے، حضرت حفصہ نے وہ قرآن آپ کے پاس بھیج دیا، اور آپ نے زید بن ثابت عبداللہ بن الزبیر، سعید بن العاص، عبدالرحمان بن الحارث بن ہشام کو حکم دیا کہ اسکی نقلیں کریں، چنانچہ ان لوگوں نے اس نسخہ سے ۳۰ھ میں پورا قرآن نقل کیا، اور

اس کا نام "امام" رکھا گیا (۱) اس کے بعد حضرت حفصہ کو ان کا قرآن واپس کر دیا گیا۔ حضرت عثمان نے اپنے اس نسخہ سے جس کا نام "امام" تھا، مزید نسخے بنوائے اور انہیں مکہ، کوفہ، بصرہ، اور دمشق کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھجوایا (۲) اور حکم دیا کہ اب صرف انہیں نسخوں کے مطابق قرآن کی تلاوت کی جائے۔ باقی تمام نسخوں کو آپ نے جلوا دیا (۳) اور اس طرح ایک متفقہ قرآن سارے ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا اور حفاظ صحابہ نے اس کے مطابق مفتوحہ علاقوں میں قرآن کی تعلیم دینا شروع کی چنانچہ لہجوں اور اعراب کی غلطیوں کا امکان ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، حضرت عثمان کے ارسال کردہ نسخوں سے مسلمانوں نے اپنے ذاتی نسخے بھی بڑی تعداد میں لکھے، چنانچہ مسعودی نے مروج الذہب میں حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان ہوئی جنگ صفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کا پلہ بھاری ہوا اور عمرو بن العاصؓ نے قرآن کو حکم بنانے کا نعرہ لگایا تو معاویہ کے لشکر نے تقریبًا پانچ سو قرآن نیزوں پر بلند کر کے قرآن کی ثالثی کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔" اور یہ سب جانتے ہیں کہ حضرت عثمان کے ارسال کردہ قرآن پر صرف سات سال کی مدت گذری تھی، کیوں کہ جنگ صفین ۳۷ھ میں ہوئی ہے (۴)

حافظ صحابہ میں مختلف قبائل کے لوگ تھے، چنانچہ ان میں سے بعض حافظ صحابہ بعض حروف کو یا الفاظ کو اپنے قبیلہ میں رائج طریقہ سے ادا کرتے تھے، جس کی وجہ سے "قرآت" کے کئی طریقے نکلے، جن کی وجہ سے بعد میں ایک مستقل فن وجود میں آگیا، جسے "فن تجوید" یا "قرآۃ" کہتے ہیں اس فن کے سات امام تھے، ابن عامر، ابن کثیر، عاصم، ابو عمرو بن العلاء، حمزہ، نافع اور الکسائی۔

اس طرح یہ بات پوری طرح واضح ہو گئی کہ قرآن کریم جس طرح آں حضرت پر نازل ہوا تھا، بالکل اس طرح آج تک محفوظ ہے، کیوں کہ جیسے ہی کوئی آیت اترتی، آں حضرت فورًا ترتیب کے مطابق اسے لکھوا دیتے، پھر تمام صحابہ اسے زبانی یاد کر کے پانچوں وقت نماز میں پڑھنا شروع کر دیتے، اس کے علاوہ خدا کی طرف سے قرآن کی حفاظت کے لئے یہ احتیاط برتی گئی کہ ہر سال حضرت جبرئیل خود آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مکمل قرآن ترتیب کے ساتھ تلاوت کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ "حضرت جبرئیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن کو ترتیب سے پڑھتے تھے" تاکہ آپ بھی اسی

۱۔ الفہرست لابن ندیم ۲۴ ۳۔ مختصر ابی الفداء ۱/۱۷۶
۲۔ نفح الطیب المقری ۱/ ۲۰۰ ۴۔ مروج الذہب ۲/ ۲۰

ترتیب سے اس کی تلاوت فرمائیں، جس سال آپ کا وصال ہوا ہے، حضرت جبریئل نے دو مرتبہ آپ کے سامنے قرآن دہرایا۔ خلفاء اور صحابہ نے حفاظت قرآن کے سلسلہ میں جو کچھ کیا اس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو نازل ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ گزر رہا ہے، اس کے باوجود اس کے ایک لفظ میں بھی ردّ و بدل نہیں ہوئی ہے اور آج تک وہی قرآن دنیا میں رائج ہے۔

چوں کہ یہ صحیفہ خداوندی اسلام کا دستور اور مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے، اس لئے اس کو زبانی یاد کرنے کا رواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک چلا آرہا ہے اور جب تک مسلمان روئے زمین پر ہیں، یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ آج بھی دنیا میں لاکھوں، کروڑوں مسلمانوں کو پورا قرآن زبانی یاد ہے اور ہر سال رمضان کے مہینے میں پورا قرآن تراویح کی نماز میں دہرایا جاتا ہے۔ اس طرح خدا کا وہ وعدہ کہ "ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں" پوری طرح حقیقت بن کر رہا اور قرآن آج تک اسی طرح باقی ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا۔

مسلمانوں نے اس معاملہ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ جن کے ہجے اس زمانے میں مختلف تھے، انھیں بھی قرآن میں اس طرح رہنے دیا ہے اور ان کی اصلاح نہیں کی ہے، تاکہ اس کے کسی لفظ یا نقطہ میں بھی تبدیلی یا ترمیم کا شبہ بھی نہ ہونے پائے۔

قرآن کا اعجاز، انداز بیان اور اس کا عربی زبان و ادب پر اثر:

قرآن کے مذہبی تقدس اور اہمیت سے قطع نظر کر کے خالص زبان اور ادب کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو شاید یہ پہلا صحیفہ ہے جو عربی زبان و ادب میں کتابی شکل، ابواب، فصول، و فنون، اور فل اسٹاپ کے ساتھ مدوّن و مرتب ہوا۔ یمنیوں اور حمیریوں نے بلاشبہ اپنے کارنامے اور بعض اہم واقعات مرتب کئے تھے، لیکن کتابی شکل میں ان کو مرتب کرنے کا ذکر نہیں ملتا، اگر ملتا بھی ہے تو ان کا وجود نہیں، البتہ ان کی یہ چیزیں پتھروں اور دیواروں پر کندہ ملی ہیں۔ جن سے ان کی تاریخ کے بعض اہم واقعات پر ایک ہلکی سی روشنی پڑتی ہے[1]

۱۔ احمد امین = فجر الاسلام صفحہ ۱۹۶

اور بس تمام علماء، منکرین اور نقادوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم اپنی فصاحت و بلاغت اور زبان و بیان کے اعتبار سے عربوں کا سرمایہ فخر و مباہات ہے، کیوں کہ اگر قرآن کا نزول نہ ہوا ہوتا تو عربوں کا نہ ادب محفوظ رہ پاتا اور نہ ان کی کوئی شریعت (۱) ہوتی۔" "کیوں کہ نہ تو وہ نظم ہے اور نہ ایسی مسجع نثر جس کے ہر جملہ کا آخری لفظ اس کے پہلے والے جملے کے آخری لفظ کے ہم وزن اور ہم آواز ہوتا ہے، نہ ہی ایسی نثر مرسل ہے جس میں عبارت سیدھی سادی بغیر قافیہ بندی کے لکھی جاتی ہے، اور نہ ہی اس کا انداز اور اسلوب تقریر یا خطبہ کے انداز و اسلوب سے ملتا ہے، بلکہ وہ نثر کی ایک ایسی منفرد قسم ہے جس میں نظم اور اعلیٰ معیار کے نثر فنی کے امتزاج سے ایسا اچھوتا اور بے مثال اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے جس میں بعض جگہ مسلسل خوبصورت اور دل آویز مسجع عبارتیں بھی ہیں اور بعض جگہ رواں عبارتیں بھی، مگر کچھ اس انداز سے کہ جس میں پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ پوری موسیقیت اور پوری شعری نغمگی بھی پائی جاتی ہے اور پوری نثری سلاست و روانی بھی، اسی لیے کوئی انسان قرآن جیسا اسلوب نہ بنا سکا اور نہ اس جیسی ایک سورۃ ہی لکھ سکا اور اس لئے تخلیق آدم سے لے کر آج تک نسل انسانی کو کوئی دینی یا دنیوی کتاب ایسی میسر نہ آسکی جو قرآن کے اسلوب بیان، اس کے معانی و مطالب کی گہرائی و گیرائی، اور اس کی اثراندازی اور دلوں میں گھر کر لینے کی امتیازی خصوصیت میں اس کا مقابلہ کر سکے۔ اور یہی امتیاز قرآن کا سب سے بڑا اعجاز اور اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ اس نے انسان کو تخلیق کائنات، مظاہر قدرت اور ان کی رنگا رنگی کی طرف اشارہ کر کے جس مادی اور محسوس طریقہ استدلال سے ان کے خالق اور مدبر کے وجود کی طرف سوچنے کی دعوت دی ہے۔ اس کی مثال دوسری کتابوں میں نہیں ملتی

أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ (۲)

کیا انھوں نے آسمانوں اور زمینوں کی پہنائیوں پر اور اللہ نے جو چیزیں پیدا کیں۔ ان پر غور نہیں کیا۔ یا قرآن کا یہ قول کہ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۔ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا ۔ سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔

۱۔ کرد علی ۔ الاسلام والحضارۃ العربیۃ صفحہ ۴۹، ج ۲)

۱۳۱ آل عمران ۔

یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے آنے جانے میں ان عقل مندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ جو کھڑے اور بیٹھے اللہ کو یاد کرتے ہیں کہ اے رب تو نے یہ سب بیکار نہیں پیدا کیا۔ تیری ذات پاک ہے۔ یا اس کا یہ قول کہ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ (1) لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (2) اور اس کی نشانیوں میں زمین اور آسمانوں کی پیدائش اور تمہارے رنگوں اور زبانوں کا اختلاف ہے۔ (اگر آپ ان سے پوچھیں کہ زمینوں اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ جھٹ بول اٹھیں گے کہ اللہ نے) پھر اس نے جس انداز سے انسان کو اپنی تخلیق اپنے اعضاء و جوارح اور نظام جسمانی میں ان کے نازک اور اہم کاموں کو سامنے رکھ کر ان پر غور و فکر کر کے خالق تک پہونچنے کی دعوت دی ہے۔ وہ قرآن کا منفرد طریقۂ استدلال ہے' وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ اور کیا وہ لوگ خود اپنی تخلیق پر غور نہیں کرتے یا" فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ''۔ یعنی انسان کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے یا جس طریقہ سے وہ عدم سے وجود میں اشیاء کو لاتا ہے، جس طرح جانداروں کو پیدا کرتا ہے اور جس طرح مارتا ہے کیا وہ ذات ان کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے؟... قَالَ مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ (3) اور جب قادر ہے تو کیا ان سے ان کے اعمال و افعال کے متعلق باز پرس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا؟ اگر رکھتا ہے تو کیا اس ذات کے علاوہ کوئی دوسری ذات عبادت و بندگی کے لائق ہے؟ پھر اس نے نسل انسانی کو روئے زمین پر ایک با مقصد، مفید اور موثر زندگی گزارنے کے جن طور طریقوں کی نشان دہی کی ہے اور جن پر عمل کرنے کے بعد دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی و کامرانی سکون و اطمینان اور راحت ابدی حاصل ہونے کی ضمانت لیتا ہے اسی کا خاصہ ہے۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے طریقہ استدلال کے ذریعہ جس طرح قرآن نے خالق حقیقی اور معبود اصلی تک پہنچنے کی راہیں ہموار کی ہیں' وہ قرآن کے معجزنما انداز بیان اور اسلوب کا طرہ امتیاز ہے۔

قرآن کریم کی یہی امتیازی خصوصیات تھیں کہ جب آں حضرت اس کی تلاوت کرتے تھے، تو اس کا ہر ہر لفظ اور ہر ہر آیت' سننے والے کے دل و دماغ میں خواہ آپ کا دشمن ہو یا دوست اس طرح اترتی چلی جاتی تھی کہ وہ مسحور ہو جاتا تھا

(1) سورۃ الروم/21 ، (2) سورۃ العنکبوت/40 ، (3) سورۃ یٰسین ،

اوراس کی معجزنما قوت بیانی سحر طراز، طرز استدلال اور بے پناہ اثر اندازی کے سامنے سپر ڈال دیتا تھا، چنانچہ روایت ہے کہ ولید بن مغیرہ نے جو آپ کا بد ترین دشمن تھا، آپ کو قرآن شریف کی بعض آیتیں تلاوت کرتے سنیں تو اتنا متاثر ہوا کہ وہ بھاگا ہوا قریش کے بعض ممتاز سرداروں کے پاس آیا اور بولا کہ " واللہ لقد سمعتُ من محمد کلاماً ما ھو من کلامِ الانس ولا من کلام الجن، وإنّ له لحلاوة" وإنّ علیه لطلاوة إنّ أعلاه لمثمرٌ وإنّ أسفله لمغدق (۱)

یعنی خدا کی قسم میں نے محمدؐ کو ایسا کلام پڑھتے سنا ہے جو نہ تو انسانوں کا کلام ہو سکتا ہے اور نہ جنات کا، اس میں تو بڑی مٹھاس اور بڑا بانکپن اور دل کشی ہے، اس کا اوپری حصہ (یعنی ظاہری الفاظ) بڑا پھلدار، (بڑا سامعہ نواز اور حسین) اور اس کا نچلا حصہ بہت زیادہ پانی والا ہے، (یعنی معانی و مطالب کے اعتبار سے بہت دقیق اور گہرا ہے)

اسی طرح معلقات کے مشہور شاعر اعشیٰ قیس (م ۶۲۹ء مطابق ۸ھ) کے متعلق روایت ہے کہ فتح مکہ سے پہلے جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھ کر آپ سے ملنے کے لئے حجاز روانہ ہوا تو قریش کے بعض سردار اس سے راستے میں ملے، اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ قرآن کی سحر آفرینی سے متاثر ہو کر مسلمان نہ ہو جائے انھوں نے اسے ایک سو اونٹ دے کر اس کے وطن یمامہ میں واپس بھیج دیا۔ اسی طرح مغیرہ بن شیبہ اپنے کان میں روئی ڈال کر کعبہ کے سامنے سے گزرتا تھا کہ مبادا اس کے کان میں قرآن کی آواز نہ پڑ جائے اور وہ اس سے متاثر ہو کر مسلمان نہ ہو جائے۔

حضرت عمرؓ جو اسلام، مسلمانوں اور آں حضرتؐ کے اتنے سخت دشمن تھے کہ ایک دن گھر سے نکلے آج آں حضرتؐ کا خاتمہ کر کے رہیں گے، کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری تو اتفاق سے راستے میں ہی کسی نے کہہ دیا کہ محمدؐ کو تو بعد میں ختم کرنا، پہلے اپنی بہن اور بہنوئی کی خبر لو، وہ بھی مسلمان ہو چکے ہیں، چنانچہ اسی شدید غصہ میں بہن کے گھر پہونچے، تو قرآن پڑھنے کی آواز آئی، اب پارہ اتنا چڑھا کہ بہن اور بہنوئی دونوں کو مارتے مارتے لہولہان کر دیا، اور جب خون میں لت پت، بہن نے ان کی

---

(۱) تفسیر زمخشری، بتفسیر سورۃ المدثر الطلاوۃ: الحسن والبہجۃ یعنی دلفریب، خوبصورت، من موہنا۔

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہا کہ عمر چاہے جان سے مار ڈالو، یہ خمار اب اتر نہیں سکتا، تو عمر سنانے میں آگئے؛ اٹھا ہوا ہاتھ ایک دم سے رک گیا، جیسے فالج پڑ گئی ہو، پھر زچ ہوکر بولے کہ اچھا تم کیا پڑھ رہی تھیں، مجھے سناؤ، چنانچہ انھوں نے سورۃ طٰہٰ کی چند آیتیں پڑھ کر انھیں سنائیں اور جب اس آیت پر پہنچیں کہ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ...... اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ تو عمر سے ضبط نہ ہو سکا اور بے اختیار پکار اٹھے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اور اس کے بعد رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوکر باقاعدہ مسلمان ہو گئے (۱) اور یہیں سے خطاب کے اونٹ چرانے والے نوجوان کی قسمت، محض قرآن کی اثر اندازی کے بدولت بدل گئی، بقول اقبال ع: تو می دانی کہ سوزِ قراتِ تو ــــ دگرگوں کرد تقدیر عمر را۔

ان واقعات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ قرآن کریم کا اسلوب بیان، طرزِ تخاطب طریق استدلال اتنا موثر سحر طراز اور معجزنما تھا کہ جو کوئی سن لیتا اس کے آگے سپر ڈال دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ان خصوصیات میں بالکل منفرد اور یگانہ تھا، نہ وہ زمانے کے ممتاز ادباء اور فصحا کے کلام سے ملتا جلتا تھا اور نہ جنوں کی ان بولیوں سے مشابہ تھا جس کو پروہت اور بوجھ بجھکڑ لوگ اپنے منتروں میں استعمال کرتے تھے، نہ وہ ان اشعار سے ملتا جلتا تھا جو اس زمانے کے شعراء سناتے تھے اور نہ ہی کاہنوں اور مقرروں کی زبان سے اسے کوئی مشابہت تھی، بلکہ وہ ان سب سے جدا، منفرد، اور ممتاز چیز تھی جس کی مثال وہ آپ خود تھا۔ (۲) اس کا انداز بیان اتنا اچھوتا اور ممتاز تھا کہ قرآن نے عربوں کو چیلنج دیا کہ تم اپنی زبان دانی، اپنی فصاحت و بلاغت پر اپنے نازاں ہو تو قرآن جیسی کتاب لاکر دکھا دو، خود نہ کر سکو تو اپنے ساتھ جنوں کو بھی شریک کر لو، مگر یاد رکھو تمہیں اس میں کامیابی نہ ہوگی چاہے اس سلسلہ میں تم ایک دوسرے سے مدد ہی کیوں لو۔ تب بھی نہیں لا سکتے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔ (یعنی آپ (محمد صلعم) ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ انسان اور جنات مل کر بھی قرآن جیسی کتاب لانا چاہیں گے تب بھی انھیں اس میں کامیابی نہ ہوگی، چاہے ان میں سے بعض بعض کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں) یہی نہیں بلکہ اگر تمہیں اس

۱۔ حضرت عمر کے اسلام لانے کی پوری تفصیل سیرۃ النبی علامہ شبلی نعمانی میں ملاحظہ ہو اور تاریخ خلفاء سیوطی ص ۱۱۲ قلمی اس کے علاوہ اردو کی مختلف کتابوں میں۔ (۲) شوقی ضیف: تاریخ الادب العربی ۲/ ۳۰۔

قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے اور اگر تم سچے ہو تو اس جیسی ایک ہی سورۃ لا کر دکھا دو، اور اس کام میں خدا کے سوا اپنے ساتھیوں کو بھی شامل کر لو" وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ؕ

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ عرب کے بڑے سے بڑے ادیب، اور ممتاز سے ممتاز شاعر نے اس چیلنج کے آگے گھٹنے ٹیک دئے، ان میں سے بعض نے کوشش بھی کی، لیکن ان کی کوشش خود ان کی نگاہ میں مضحکہ خیز اور مہمل دکھائی دینے لگی۔

اس طرح کی کوشش کرنے والوں میں مورخین نے سات آٹھ اشخاص کا ذکر کیا ہے، جن میں مسیلمہ کذاب کا جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور سجاح بنت الحارث بن السوید کا جو عورتوں میں پہلی مدعیہ نبوت تھی، اور جس نے بعد میں مسیلمہ سے شادی کرلی خاص طور سے ذکر کیا ہے اور ان کے بقول ان پر نازل شدہ آیات بھی لکھی ہیں، جو مہمل اور بے معنی اور انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ مدعیان نبوت کے علاوہ ادبا اور شعراء میں متنبّی مشہور شاعر ادیب اور فلسفی ابوالعلاء المعری کا بھی ذکر کیا ہے، کہ انھوں نے قرآن جیسی عبارت لکھنے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہے، (۱) اور اس طرح عربوں کو قرآن کا تحریری مقابلہ کرنے میں ذلت آمیز ناکامی ہوئی تو انھوں نے اب اپنی زبانیں بند کرلیں، اور تلواریں میان سے نکال لیں، لیکن یہ قرآن ہی کا اعجاز تھا کہ باوجود سخت مخالفت اور متعدد خوں ریز لڑائیوں کے اسلام کے سیل رواں کو کوئی روک نہ لگا سکا اور اس کا ڈنکا آنحضرتؐ ہی کے زمانے میں نہ صرف جزیرہ نمائے عرب میں بجنے لگا بلکہ اس کے اثرات دور دور تک پھیل گئے، اور بعد میں تو قرآن کا غلغلہ مشرق میں ہندوستان تک، مغرب میں بحر اٹلانٹک کے ساحلوں تک، شمال میں دریائے وراکے کنارول تک اور جنوب میں وسطی افریقہ تک بلند ہونے لگا" (۲)

جیسا کہ معلوم ہے عرب قبائل عام طور سے معمولی باتوں پر آپس میں لڑمرتے تھے اور ان لڑائیوں کے سلسلے ایک مدت دراز تک چلا کرتے تھے، قرآن نے نازل ہو کر سب سے بڑا کام یہ کیا کہ ان کے اختلافات کو ختم کر کے ان سب کو بھائی چارگی کے رشتہ میں پرو دیا اور

۱۔ ایسے لوگوں کی پوری فہرست اور تفصیل کے لئے دیکھئے :- الکامل للمبرد ۲۰/۱۱۱ اور صادق الرافعی • تاریخ ادب العرب مطبوعہ الاستقامۃ القاہرۃ ۲/۱۰۱۔

۲۔ جرجی زیدان تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ۲/۲۱۵ مطبوعہ دار الہلال • مصر مراجعۃ و تعلیق د[illegible] شوقی ضیف

اس طرح آں حضرتؐ کے قول کے مطابق المسلمون اخوۃ سب بھائی بن گئے، اسی طرح یہ قبائل مختلف لہجوں میں گفتگو کرتے تھے۔ بلکہ یمنیوں کی زبان تو حجازیوں کی زبان سے اتنی مختلف تھی کہ کہیں سے تال میل معلوم ہی نہیں ہوتا تھا، قرآن نے لہجہ قریش میں نازل ہوکر یہ نازکی کارنامہ انجام دیا کہ تمام لہجوں کو ختم کرکے زبان کے معاملے میں بھی لہجہ قریش پر سب کو اس طرح متحد و متفق کر دیا کہ اب سارا عرب اسی لہجہ میں تلاوت کرنے لگا، اور اسی لہجہ میں زبانی یاد کرنے لگا، نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سارے لہجے ختم ہونے گئے، اور شعر و ادب کی زبان بھی قریشی لہجہ بن گیا، اور یہ قرآن کا وہ اعجاز ہے جس کی مثال کسی دوسری آسمانی کتاب میں نہیں ملتی۔ زبان و ادب کے اس اتحاد کے بعد قرآن نے ان عربوں کو جو سیاسی وحدت اور ملی یگانگت کے مفہوم تک کو نہیں سمجھتے تھے بقول "وون کریمر" مختلف قبیلوں کو ایک مشترک دین کے شعور کے ساتھ ساتھ ایک واحد قیادت کے سہارے ایک ہی سیاسی نظام میں پرو دیا، اور اس طرح وہ قبائلی نظام جو بالکل تو نہ ختم ہو سکا، لیکن پہلی مرتبہ اس کو دینی وحدت کے مقابلے میں ثانوی حیثیت ملی (سر تھومس آرنلڈ کی انگریزی کتاب کا عربی ترجمہ، الدعوۃ الی الاسلام ص ۵۳)

قرآن اور اس کے انداز بیان کا زبان و لغت پر یہ خاص اثر ہوا کہ اس نے عربی زبان میں ایک خاص قسم کا انفرادی تقدس پیدا کر دیا جس کی مثال کسی دوسری زبان میں مشکل سے ملے گی، اور وہ اس طرح کہ اس نے نہ صرف نئے الفاظ وضع کئے اور ان کے معنی متعین کئے، بلکہ بعض پرانے الفاظ کے معانی و مطالب کو وسعت و گہرائی دی اور بعض کے معنی بدل کر نئے معنی پہنائے، جیسے فرقان، کفر، ایمان، شرک، نفاق اسلام کہ ان الفاظ کو مخصوص معنوں میں استعمال کرنے کا سہرہ قرآن ہی کے سر ہے، اور اسی طرح یہ الفاظ جو پہلے سے عربی میں موجود تھے، لیکن نئے اور مخصوص معنوں میں عربی زبان میں بالکل نئے الفاظ کی طرح شامل ہوئے، اور ان کے معنی پہلے سے رائج اور مستعمل معنوں سے بالکل مختلف ہو گئے، مثلاً لفظ "صلوٰۃ" جس کے معنی عربی میں صرف "دعا" کے ہیں، لیکن قرآن کریم نے اسے مسلمانوں کے مخصوص طریقۂ عبادت کے لئے متعین کر دیا، اب لفظ صلوٰۃ کسی دوسرے مذہب کی عبادت کو نہیں کہہ سکتے۔ یا لفظ "صوم" کہ جس کے لغوی معنی "کسی کام سے رک جانا" کے ہیں لیکن قرآن نے اسے مخصوص طریقہ اور چند قیود و شرائط کے ساتھ کھانے پینے اور بعض دیگر انسانی

ضروریات سے صبح صادق سے لے کر سورج ڈوبنے تک رکے رہنے کے لئے مخصوص کر دیا ہے، جسے ہم روزہ کہتے ہیں، یا لفظ "زکوٰۃ" جس کے لغوی معنی صرف "پاک وصاف" کرنے کے ہیں مگر قرآن نے اسے انکم ٹیکس کے لئے مخصوص کر دیا ہے، جسے مسلمانوں کو اپنے مال و دولت پر ہر سال دینا پڑتا ہے، اسی طرح مومن، کافر، فاسق وغیرہ کے الفاظ ہیں، جن کے معنی قرآن نے متعین کر کے ان کے معنی میں وسعت و گہرائی کے علاوہ ایک دینی رنگ دے دیا۔ چنانچہ اب ان کے مخصوص اصطلاحی معنی متعین ہو گئے، جو کسی دوسرے معنی میں استعمال نہیں ہو سکتے۔

قرآن کریم کی بدولت، عربی زبان میں بہت سے نئے علوم کا وجود ہوا جیسے اس کی تشریح و توضیح کے لئے علم تفسیر اور اصول تفسیر پیدا ہوا" اس کے معنی و مطالب کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے علم نحو و صرف، پھر علم بیان و بلاغت و بدیع اور اس سے مسائل استنباط کرنے کی غرض سے علم فقہ، علم فرائض یا وراثت اور اس کے مختلف مباحث کے اثبات و تحقیق کے لئے علم کلام، اور دوسرے فنون ایجاد کئے گئے۔

قرآن کو خوبصورتی سے لکھنے کی غرض سے فن کتابت پیدا ہوا اور اس کے اتنے نمونے نکلے کہ کسی دوسری زبان میں کتابت یا طرز تحریر کے اتنے نمونے نہیں مل سکتے، مسلمان خطاطوں نے اس فن کو اتنی بلندی بخشی اور اس میں اتنا تنوع، اتنا حسن اور اتنا بانکپن پیدا کیا جس نے فنون لطیفہ کے دوسرے اصناف میں ان کی کوتاہ دستی کو پورا کر دیا۔

قرآن کی بکثرت تلاوت کرنے، پانچوں وقت کی نمازوں میں اس کی آیات پڑھنے اور ان سے مسئلے مسائل اور احکام استنباط کرنے کی وجہ سے اس کا اسلوب بیان اس کے تشبیہ و استعارے، اس کا انداز تخاطب، انداز تذکیر و تحذیر، ادباء، شعراء، علماء اور متکلمین کی زبانوں پر چڑھ گیا اور بعد میں ان کی انشاء و ادب کا جزء بن گیا، چنانچہ اصحاب علم و فن اس کی تقلید کر کے اس کی آیتوں کو بطور استدلال پیش کر کے اپنی تحریر، تقریر اور شعر و شاعری کو ادب کا مرقع اور فن کا شہ پارہ بنانے لگے اور آج تک قرآن کی یہ امتیازی شان بدستور باقی ہے اور آخر میں قرآن ہی کی زبان عربی تمام مفتوحہ اسلامی ملکوں کی سرکاری زبان بھی بن گئی۔

زبان و ادب پر قرآن کے ان اثرات کے علاوہ اس کی بدولت زمانہ ماقبل تاریخ کی بعض گتھیاں سلجھانے میں بڑی مدد ملی، اور ایک ایسا علم وجود میں آیا جو شاید پہلے نہ تھا اور وہ تھا علم آثار قدیمہ، تورات اور انجیل میں بعض پرانے ملکوں اور پرانی بھولی بسری قوموں

کے واقعات اور ان کے قصوں کا ذکر بہت اجمال کے ساتھ آیا ہے جنھیں بعد کے لوگوں نے اور بھی مسخ کر دیا تھا' ان میں سے بعض قصوں کو علمائے یہود اور نصاریٰ سطحی اور مسخ شدہ حالت میں جانتے تھے' لیکن کوئی قطعی اور واضح بات ان کے ذہن میں ان کے متعلق نہ تھی' قرآن نے پہلی بار بعض جگہ تفصیلی اور بعض جگہ اشارۃً ان پر روشنی ڈالی۔ ان قوموں میں عاد و ثمود، اصحاب کہف و رقیم، فراعنہ مصر' اہل بابل و نینویٰ اور وہ دوسری قومیں ہیں جن کا ذکر پچھلی کتابوں میں تھا' لیکن اس طرح تھا کہ ان کی کوئی واضح شکل سامنے ابھر کر نہ آئی تھی' کہ کہاں تھیں' کیسی زندگی گزاری اور پھر ان کا انجام کیا ہوا؟ قرآن نے نازل ہو کر عبرت و موعظت کے خیال سے ان کی زندگی پر پڑے دبیز پردوں کو اٹھایا اور ان کی اصلی شکل دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ پیش کی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کے شروع میں جب آثارِ قدیمہ کے علماء نے تاریخ کے ان اہم ابواب کی تلاش و جستجو میں زمین کے سینے سے حقائق نکالنے کی کوشش شروع کی تو قرآن کی ان آیات سے بڑی مدد ملی' اور انھوں نے مختلف عرب ممالک میں کھدائیاں کر کے بہت سا قیمتی ذخیرہ جمع کر لیا ہے' جن سے ان قوموں کی زندگی کے بعض بھولے بسرے گوشے' اجاگر ہو کر سامنے آگئے ہیں' اور تاریخ کے بہت سے کٹے ہوئے سلسلے اور ٹوٹی ہوئی کڑیاں پھر سے جڑ گئی ہیں۔ (۱)

غرض کہ قرآن نے اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے نہ صرف عربی زبان کو دوسری سامی زبانوں کی طرح مٹنے سے بچا لیا' بلکہ مختلف لہجوں اور بولیوں کو ختم کر کے ایک ایسی خوبصورت' میٹھی' دل نشین' موثر اور گتھی ہوئی زبان کو جنم دیا' جو سب عربوں کی متحد اور متفقہ زبان بن گئی اور بعد میں جس کا دامن اتنا وسیع ہوا' کہ علم و فن کے لیے بحرِ بیکراں بن گئی' پھر بھی قرآن ہی اس کی کسوٹی بنا' اور آج تک اس کا یہ امتیاز باقی ہے اور جب تک عربی زبان زندہ' اور روئے زمین پر ایک مسلمان بھی باقی ہے' ہمیشہ رہے گا۔

نیچے نمونہ کی چند آیتیں درج کی جاتی ہیں' جو نہ صرف فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہیں بلکہ حکمت و فلسفہ میں بھی مثالی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۔ ان کھدائیوں اور ان کے نتیجہ میں برآمد شدہ آثار کا ذکر اس کتاب کی پہلی جلد کے ص ۲۳ سے [illegible] تک حاشیہ پر ملاحظہ فرمائیے۔ اور بھولی بسری قوموں کی تاریخ کے لیے دیکھیے "ارض القرآن" از حضرۃ الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔

۱ ۔ أتأمرون الناس بالبر وتنسون أنفسكم.

۲ ۔ عسىٰ أن تكرهوا شيئاً وهو خير لكم، وعسىٰ أن تحبوا شيئاً وهو شر لكم.

۳ ۔ قول معروف ومغفرة خير من صدقة يتبعها أذىً.

۴ ۔ لا يكلف الله نفساً إلا وسعها.

۵ ۔ لن تنالوا البر حتىٰ تنفقوا مما تحبون.

۶ ۔ من يعمل سوءً يجز به ولا يجد له من دون الله ولياً ولا نصيراً.

۷ ۔ فمن يعمل مثقال ذرة خيراً يره. ومن يعمل مثقال ذرة شراً يره.

۸ ۔ إن الله لا يغير ما بقوم حتىٰ يغيروا ما بأنفسهم.

۹ ۔ ولا يحيق المكر السيئ إلا بأهله.

۱۰ ۔ هل جزاء الإحسان إلا الإحسان.

۱۱ ۔ وإن يسلبهم الذباب شيئاً لا يستنقذوه منه ضعف الطالب والمطلوب.

۱۲ ۔ وعباد الرحمٰن الذين يمشون على الأرض هوناً وإذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاماً.

۱۳ ۔ والذين يبيتون لربهم سجداً وقياماً، ولا يقتلون النفس التي حرم الله إلا بالحق ولا يزنون، ومن يفعل ذالك يلق أثاماً،

۱۴ ۔ والذين إذا أنفقوا لم يسرفوا ولم يقتروا وكان بين ذالك قواماً.

۱۵ ۔ إنما مثل الحياة الدنيا كماء أنزلناه من السماء فاختلط به نبات الأرض فأصبح هشيماً تذروه الرياح، وكان الله على كل شيء مقتدراً.

۱۶ ۔ يا أيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيراً من الظن. إن بعض الظن إثم، ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضاً، أيحب أحدكم أن يأكل لحم أخيه ميتاً فكرهتموه،

۱۷ ۔ ووصينا الإنسان بوالديه حملته أمه وهناً على وهن وفصاله في عامين.

۱۸ ۔ وهو الله في السموات وفي الأرض يعلم سركم وجهركم ويعلم ما تكسبون.

۱۹ ۔ قل هو الله أحد، الله الصمد، لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفواً أحد.

۲۰ ۔ ذالكم الله ربكم لا إله إلا هو لا تدركه الأبصار وهو يدرك الأبصار وهو اللطيف الخبير

مذکورہ آیات کا ترجمہ: یہ ترجمے حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رح کی تفسیر بیان القرآن سے نقل کئے گئے ہیں، جو قرآن شریف مترجم میں چھپے ہیں۔

آیت ۱: کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو (نیک کام سے مراد رسول اللہ پر ایمان لانا ہے) اور اپنی خبر نہیں لیتے، حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی۔

۲: اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں باعث خرابی ہو۔

۳: ناداری کے وقت مناسب بات کہہ دینا اور درگزر کرنا (ہزار درجہ) بہتر ہے ایسی خیرات (دینے) سے، جس کے بعد آزار پہنچایا جائے۔

۴: اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا، مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور (اختیار) میں ہو۔

۵: تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکوگے، یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کروگے۔

۶: اور جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض سزا دیا جائے گا اور اس شخص کو خدا کے سوا نہ کوئی یار ملے گا نہ مددگار ملے گا۔

۷: سو جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا، وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا۔

۸: واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا، جب تک وہ لوگ خود اپنی (صلاحیت کی) حالت کو نہیں بدل دیتے۔

۹: اور بری تدبیروں کا وبال (حقیقی) ان تدبیروں والوں پر ہی پڑتا ہے۔

۱۰: بھلا غایت (زیادہ، حد درجہ) اطاعت کا بدلہ بجز عنایت کے اور کچھ ہو سکتا ہے؟

۱۱: وہ تو (خدا کے ماسوا) ایسے عاجز ہیں کہ اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو اس کو تو اس سے چھڑا ہی نہیں سکتے، ایسا عابد بھی لچر اور ایسا

معبود بھی سچا۔

۱۲ : اور رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں، جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب جہلاء ان سے جہالت کی بات کرتے ہیں تو وہ رفع شر کی بات کرتے ہیں

۱۳ : (رحمٰن کے خاص بندے وہ ہیں) جو راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام، (یعنی نماز) میں لگے رہتے ہیں۔ اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے، اس کو قتل نہیں کرتے، مگر حق پر اور نہیں زنا کرتے جو ایسا کام کرے گا تو سزا سے اس کو سابقہ پڑے گا۔

۱۴ : اور وہ ہیں جو جب خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں، اور ان کا خرچ کرنا اس (افراط و تفریط) کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

۱۵ : آپ ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان فرمایئے کہ وہ ایسی ہے۔ جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا ہو، پھر اس کے ذریعہ سے زمین کی نباتات خوب گنجان ہو گئی ہوں، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جاوے اس کو ہوا لیے پھرتی ہو۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۱۶ : اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو، کیوں کہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں اور سراغ مت لگایا کرو، اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو۔

۱۷۔ اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو برس میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گذاری کیا کر۔

۱۸ : اور وہی ہے اللہ معبود برحق آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی وہ تمہارے پوشیدہ احوال کو بھی اور تمہارے ظاہری احوال کو بھی جانتے ہیں اور تم جو کچھ عمل کرتے ہو اس کو جانتے ہیں۔

۱۹ : آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ وہ یعنی اللہ اپنے کمال ذات و صفات میں ایک ہے۔ اللہ ایسا بے نیاز ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور اس کے سب

محتاج ہیں۔ اس کے کوئی اولاد نہیں اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔

۳۰ : یہ ہے اللہ تمہارا رب، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، سازہے۔ اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی (یعنی اس کو کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ لیکن وہ آنکھوں کو دیکھ لیتا ہے) اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے۔

۲- حدیث شریف

حدیث کی تعریف :

اسلام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور تقریر کو حدیث کہتے ہیں تقریر ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے کسی کو کوئی عمل یا فعل کرتے خود دیکھا اور اس کو منع نہیں کیا، اسی طرح کسی کے کام پر سکوت یا پسندیدگی سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ یا کسی صحابی نے کسی شخص کے قول یا فعل کو آپ سے نقل کیا اور آپ سن کر خاموش رہے تو یہ بھی تقریر ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث صرف آپ کے اقوال یا احکامات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ حدیث میں آثار بھی شامل ہیں۔ جس میں آپ کے اخلاق و عادات، افعال، اعمال اور روزمرہ کی زندگی کے معمولات بھی آتے ہیں۔ حدیث کا ایک دوسرا اصطلاحی نام سنّت بھی ہے۔ مگر حدیث اور سنّت میں یہ فرق ہے کہ حدیث صرف رسول اللہ صلعم کے اقوال وافعال اور تقریر کے لئے مخصوص ہے۔ لیکن سنّت میں صحابہ کے اقوال و افعال کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں میں بعض ممتاز صاحب علم و فضل وزہد وتقویٰ نے جو کچھ کہا یا جو کچھ کیا وہ آں حضرت کی پیروی میں کہا یا کیا۔ کیوں کہ قرآن میں آیا ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"۔ "تمہارے لئے رسول اللہؐ کی زندگی میں اچھا قابل تقلید نمونہ ہے۔ چنانچہ یہ صحابہ اپنے قول وفعل میں آپ ہی کی پیروی اور نقل کرتے تھے اسی لئے ان کے ان افعال واقوال کو بھی سنّت میں شامل کیا جاتا ہے جو "مدرک بالقیاس" یعنی عقل کے خلاف نہ ہوں یا اسرائیلیات سے متاثر نہ ہوں اور دینی معاملات میں ان کو بطور دلیل سند اور مثال کے تسلیم کیا گیا ہے کیوں کہ رسول اللہؐ نے خود فرمایا ہے کہ "اَصْحَابِيْ كَالنُّجُوْمِ بِأَيِّهِمْ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ" یعنی میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں جن کی بھی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے۔ مگر صحابہ اپنے افعال واقوال کو اپنی سنّت کہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس لفظ کو آں حضرت کے لئے ہی مخصوص رکھتے تھے۔ جاحظ نے لکھا ہے کہ "صحابہ ابوبکر یا عمر کی سنت کہنا ناپسند کرتے تھے

(بلکہ اس کے مقابلہ میں) کہتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول کی سنت" (۱)

سنت کے لغوی معنی عادت یا طریقہ کے ہیں اور اس سے اصطلاح میں وہ مقدس طریقہ یا عادت مراد لی جاتی ہے جس کی آنحضرتؐ اور صحابہ سے روایت کی گئی ہو۔

حدیث کی اہمیت :

اسلام میں حدیث قرآن کے بعد سب سے زیادہ مقدس اہم اور صحیح ترین دستاویز ہے۔ حدیث کو صرف دینی معاملات میں ہی نہیں بلکہ زبان و ادب میں بھی بطور دلیل، سند اور کسوٹی کے جو مقام حاصل ہے وہ کسی اور انسان کے کلام، بات چیت یا عمل و فعل کو حاصل نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں اسلام کے عقائد و ارکان اور تعلیمات کا صرف اصولی اور اکثر جگہ اجمالی ذکر ہے۔ لیکن ان کی تشریح و توضیح اور تفسیر آں حضرت نے اپنی حدیثوں کے ذریعہ کی ہے۔ مثلاً قرآن کریم نے نماز زکوٰۃ، روزہ یا حج کا تفصیلی ذکر نہیں کیا حالاں کہ یہ اعمال ارکان اسلام میں سے ہیں چنانچہ نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں قرآن نے صرف اتنا کہا ہے وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ یعنی نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو مگر نماز کس طرح پڑھی جائے اور کتنی رکعتیں اور کن کن اوقات میں پڑھی جائیں کی پوری تفصیل قرآن میں نہیں ملتی۔ اس کی تفصیل حدیث میں ملتی ہے۔ چنانچہ آں حضرتؐ نے نہ صرف نماز کے اوقات ان میں پڑھی جانے والی رکعتیں اور جو کچھ ان میں پڑھا جائے گا اور جس ترتیب سے پڑھا جائے گا ان سب باتوں کی تفصیل بیان کی بلکہ خود پڑھ کر لوگوں کو دکھایا اور ساری زندگی اس طریقے پر مسلمانوں کو عمل کرا کے نماز سے متعلق تمام باتوں کی تشریح و توضیح عملی طور پر خود کر دی اور صحابہ کو ہدایت کی "صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي" یعنی تم اسی طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرتؐ کے زمانے سے لے کر آج تک مسلمان دنیا کے کسی کونے میں رہتے ہوں، کسی نسل، کسی زبان اور کسی تہذیب سے تعلق رکھتے ہوں آپ ہی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نماز پڑھتے ہیں۔

اسی طرح زکوٰۃ، روزہ اور حج کے بارے میں آپ نے تفصیلات مسلمانوں کو بتائیں اور

۱۔ کتاب الحیوان للجاحظ (طبعہ حلبی) ۱/۳۳۶ بحوالہ تاریخ الادب العربی شوقی ضیف۔

خود بھی اپنے عمل سے ان کے سامنے نمونہ پیش کر دیا۔ غرض کہ قرآن نے بنی نوع انسان کے لئے جو ضابطۂ حیات مقرر کیا اور جن اخلاقی اجتماعی اور عام انسانی قدروں کی نشان دہی کی اور ملک اور سماج کی فلاح وبہبود کے لیے جو اصول بتائے ہیں حدیث ان کی توضیح اور تفسیر کرتی ہے اور اس نقطۂ نظر سے درحقیقت حدیث اور سنت رسول صلعم قرآن کریم کی عملی تفسیر تشریح اور توضیح ہے۔ جس کو نظر انداز کر دیا جائے تو قرآن کریم کے احکام کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے گا صحابہ کرام اگرچہ عربی زبان کے ماہر تھے مگر اکثر آں حضرتؐ سے آیات کے معنی ومفہوم کو سمجھا کرتے تھے (۱)

روایت حدیث: صحابہ آں حضرتؐ کی زندگی میں آپ کی حدیثوں کو آپ سے سن کر دوسرے لوگوں کو سنانے لگے تھے اور اس طرح روایت حدیث کا سلسلہ آپ ہی کی زندگی میں اور آپ کے علم ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ آں حضرتؐ نے نہ صرف یہ کہ صحابہ کو ایسا کرنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ آپ خود اس کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ چنانچہ ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "اے اللہ میرے خلفاء پر رحم فرما" لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ "اے رسول اللہ آپ کے خلفاء کون لوگ ہیں؟" تو آپ نے فرمایا "وہ لوگ ہیں جو میری حدیثوں کی روایت کرتے ہیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دیتے ہیں"۔

اس کے علاوہ آپ کی خدمت میں مختلف قبائل اور علاقوں سے وفود آتے تھے آپ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ میری حدیثوں کو زبانی یاد کر لو اور تمہارے پیچھے جو لوگ ہیں انھیں جا کر سناؤ یہی نہیں بلکہ آپ نے ہر صحابی کو تاکید کی تھی کہ "بلغوا عنی ولو آیۃ" "میری باتیں دوسروں تک پہونچاؤ چاہے وہ ایک ہی آیۃ/جملہ کیوں نہ ہو آپ نے آخری حج کے خطبے کے

(۱) اس کی ایک دلچسپ مثال وہ آیت ہے جس میں قرآن کہتا ہے کہ "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ" اب سوال یہ تھا کہ "خیط ابیض" اور خیط اسود" سے کیا مراد ہے؟ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت عدی بن حاتم اور دوسرے متعدد صحابہ نے اس کو سمجھنے میں غلطی کی، اور تکیہ پر کالا اور سفید دھاگا رکھ کر سوئے یا پیر کے انگوٹھوں میں کالا اور سفید دھاگا باندھ لیا اور جب تک ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہو گیا کھاتے پیتے رہے۔ جب آنحضرتؐ سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ "خیط ابیض" اور "خیط اسود" سے دن اور رات کا کنارا مراد ہے۔ تفصیل کیلئے بخاری پر قسطلانی کا مقدمہ ملاحظہ کیجئے۔

دوران بار بار یہ فرمایا کہ "جو لوگ اس وقت یہاں موجود ہیں وہ میری باتوں کو ان لوگوں تک ضرور پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں ہیں"

آپ کا یہ بھی دستور تھا کہ مختلف قبیلوں میں اپنے پیامبر بھیج کر انھیں قرآن اور اپنی سنّت کی تعلیم دلاتے تھے۔ چنانچہ جب آپ نے معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو ان سے پوچھا کہ تم فیصلہ کس چیز سے کروگے تو وہ بولے کہ "اللہ کی کتاب (قرآن) سے"۔ تو آپ نے پوچھا کہ "اگر اس میں نہ ملے تو؟" معاذ نے جواب دیا کہ "اللہ کے رسول کی سنّت سے"۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اگر اس میں نہ پاؤ تو؟ معاذ نے جواب دیا کہ پھر میں اپنے اجتہاد اور رائے سے فیصلہ کروں گا۔ یہ سن کر آپ نے مسرت کا اظہار فرمایا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ غرض کہ حدیث کی نشر و اشاعت اور روایت کا طریقہ آں حضرتؐ کی زندگی میں ہی رواج پا گیا تھا۔ آں حضرتؐ خود بھی حدیثوں کی نشر و اشاعت کا اہتمام فرماتے تھے تاکہ لوگوں کو نئے دین کے مسائل حلال و حرام اور دوسرے سماجی اور ملکی معاملات میں اسلامی تعلیمات اور احکامات کا علم بخوبی ہو جائے۔

جب آں حضرتؐ کا وصال ہوا۔ اور صحابہ اسلامی ممالک کے مختلف شہروں اور ملکوں میں پھیل گئے تو انھوں نے اپنا یہ مشن بنالیا تھا کہ جہاں جاتے وہاں قرآن اور حدیث کی تعلیم کا اہتمام کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کی ہر چھوٹی بڑی بات آپ کے اخلاق و عادات رہن سہن کے طور طریقوں رفتار و گفتار اور اس کے انداز و اطوار سب باتوں کو پوری تفصیل سے روایت کرتے تھے (۱) اس طرح صحابہ کی ایک بڑی تعداد اس کام میں لگ گئی جن میں خاص طور سے قابل ذکر ابوہریرہؓ، حضرت عائشہؓ، عبداللہؓ بن عمرؓ و عبداللہ عمرو، عبداللہ بن عباس اور انس ابن مالک ہیں۔(۲)

جب صحابہ کی نسل ختم ہوگئی تو اس کام کا بیڑہ ان کے تربیت یافتہ شاگردوں نے اٹھایا جنھیں تابعین کہا جاتا ہے۔ تابعی حضرات جب حدیث کی روایت کرتے تو کہتے تھے کہ میں نے فلاں صحابی سے سنا کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا (اس کے بعد آں حضرت کا جملہ)

۱۔ شمائل ترمذی: آپ کے حلیہ آپ کی زندگی اور اس سے متعلق تمام تفصیلات کی قابل اعتماد اور صحیح دستاویز ہے۔

۲۔ ان صحابہ میں جابر ابن عبداللہؓ، سعید الخدری اور عبداللہ بن مسعود کا نام بھی آتا ہے۔

تابعین کی نسل کے گذرنے کے بعد ان کے شاگردوں کا دور آیا جنھیں اصطلاح میں تبع تابعین کہتے ہیں۔ چنانچہ جب یہ تبع تابعین حدیث کی روایت کرتے تو وہ بھی اسی طرح شروع کرتے تھے کہ میں نے فلاں تابعی سے سنا۔ انھوں نے فلاں صحابی سے سنا، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا (اس کے بعد آں حضرت کا جملہ) اس طرح حدیث کی روایت کا سلسلہ ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک ترتیب کے ساتھ مع راوی کے نام کے سینہ بسینہ منتقل ہوتا رہا۔ اس طرح راویوں کے نام لے کر حدیث کے سلسلے کو آنحضرتؐ تک پہنچانے کا اصطلاحی نام سند حدیث ہے (۱) سند بیان کرنے کا طریقہ عربی میں یہ ہے۔ "حدثنا علی بن الجعد، قال: اخبرنا شعبہ قال! اخبرلی منصور قال۔ سمعت ربعی بن حراش یقول: سمعت علیاً یقول قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاتکذبوا علیّ فانہ من کذب علیّ فلیلج النار" یعنی علی بن الجعد نے مجھ سے حدیث کی روایت کرتے ہوئے کہا مجھے شعبہ نے بتایا ہے کہ مجھے منصور نے خبر دی کہ میں نے ربعی بن حراش کو یہ کہتے سنا کہ انھوں نے حضرت علی کو یہ کہتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری طرف جھوٹ بات منسوب نہ کرو پس جس شخص نے میری طرف جھوٹی بات منسوب کی وہ آگ میں ضرور جائے گا (۲) حدیث کی روایت کا ایک دوسرا طریقہ بھی ہے جس میں راوی اپنے استاد سے روایت کرتے وقت بجائے قال (کہا) کے عن (سے) کا لفظ استعمال کرتا ہے جیسے۔

حدثنا مسدد۔ قال: حدثنا یحیی عن شعبہ عن قتادہ عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعن الحسین المعلم قال: حدثنا قتادہ عن انس

۱۔ صحابہ کے آخری عہد میں جب اہل البدع، یعنی خوارج، روافض اور نواصب وغیرہ کا ظہور ہوا اور ان میں سے بعض اپنے مسلک کے مطابق روایتیں بیان کرنے لگے تو اہل علم صحابہ اور ان کے معتقدین کسی روایت کو بلا سند اور بلا تحقیق قبول نہیں کرتے تھے، پھر ہر حدیث کے لئے سند کا بتانا ضروری ہوگیا۔

۲۔ صحیح بخاری کتاب العلم باب من کذب علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ص۹۴ مطبوعہ لجنۃ احیاء کتب السنۃ مصر۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ قال "لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ" (۱) یعنی مسدود نے ہم سے حدیث بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم سے یحیٰ نے اور ان سے شعبہ نے اور ان سے قتادہ نے اور ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
اسی حدیث کو ایک دوسرے سلسلۂ روایت سے بھی بخاری نے بیان کیا ہے، وہ اس طرح ہے "الحسین المعلم نے کہا" کہ ان سے قتادہ نے اور ان سے انس نے اور ان سے رسول اللہ صلعم نے فرمایا "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز نہ پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے"۔

امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اسناد حدیث بھی لمبی ہوتی گئیں چنانچہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ایک حدیث کی سند آٹھ آٹھ اور دس دس راویوں تک پہنچ جاتی تھی یعنی اسے رسول اللہؐ تک پہنچانے میں آٹھ آٹھ اور دس دس آدمیوں کے نام آتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی حدیث مختلف سلسلۂ اسناد سے روایت کی جاتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ جن صحابہ نے وہ حدیث رسول اللہؐ سے سنی تھی وہ مختلف شہروں میں چلے گئے اور وہاں انھوں نے اپنی مند درس بچھائی اور وہاں ان کے شاگردوں نے اسے سن کر اپنے شاگردوں کو سنایا اور انھوں نے اپنے شاگردوں کو اور اس طرح سلسلہ دراز ہوتا ہوا رسول اللہ صلعم تک پہنچا! اسی طرح کسی دوسرے صحابی نے اپنے شہر میں یہی طریقہ اختیار کیا اور اس طرح ایک ہی حدیث دو مختلف صحابی کے ذریعے جو دو مختلف شہروں میں رہتے تھے، مختلف راویوں کے ذریعہ یعنی مختلف اسناد سے مشہور ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی حدیث کے مختلف سلسلہ اسناد بن گئے۔ جیسے مختلف راوی روایت کرتے تھے جن میں بعض کا سلسلہ سند (سافل) چھوٹا اور بعض کا (عالی) لمبا ہوتا تھا۔ جیسا کہ حدیث کی مذکورہ بالا سند سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

تدوین حدیث: جب تک قرآن نازل ہوتا رہا آں حضرتؐ کو اس کی آیات اس کے احکامات، مسائل اور دوسری مشکل چیزوں کی تشریح و توضیح اور

۱۔ بخاری کتاب الایمان صہ ۲۲۔

تغییر کرنی پڑتی تھی۔ اس لیے آپ نے اس خطرہ سے کہ کہیں آپ کی حدیثیں قرآن کی آیتوں میں نہ مل جائیں۔ یعنی حدیث اور قرآن میں خلط ملط ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ لوگوں کو اپنی حدیثیں لکھنے سے سختی سے منع فرمادیا تھا۔ کیوں کہ اس وقت تک صرف قرآن کو لکھ کر محفوظ رکھنے کا حکم دے رکھا تھا۔ چنانچہ آپ کا ارشاد تھا " لا تکتبوا عنی شیئًا إلّا القرآن فمن کتب شیئًا فلیمحہ " (۱) یعنی مجھ سے سوائے قرآن کے کوئی دوسری چیز نہ لکھو۔ اگر کسی نے کوئی چیز لکھ لی ہے تو اسے ضرور مٹا دے "۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ نے ہر حال میں اپنی احادیث کو لکھنے سے منع فرمادیا تھا۔ ہمیں ایسی روایات ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کی حیات میں اور بعض اوقات آپ کے حکم سے بھی آپ کی بعض حدیثوں کو لکھا گیا۔ اس قسم کی حدیثوں میں اکثر ارکان اسلام کی تشریح یا توضیح ہوتی تھی مثلاً آپ نے زکوٰۃ سے متعلق مسائل کو لکھوا کر متعلقہ لوگوں کے پاس اپنے خطوط کے ہمراہ بھجوایا (۲) تاکہ انھیں زکوٰۃ سے متعلق فرائض اور واجبات کا بخوبی علم ہو جائے۔

اسی طرح آپ نے مخصوص حالات میں بعض صحابہ کو اپنی حدیثیں لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی چنانچہ بغدادی نے لکھا ہے کہ " آنحضرت ؐ نے ایک انصاری صحابی ابن خدیج کو جنھیں سہو لینے کی شکایت تھی اس کی اجازت دی کہ وہ اپنی زبانی یاد کی ہوئی حدیثوں کو پوری طرح محفوظ کرنے کے لیے لکھ کر بھی مدد لیں (۳) یعنی زبانی یاد رکھنے کے علاوہ غلطی سے بچنے کی خاطر انھیں لکھ بھی لیا کریں۔

بعض حالات میں آپ نے کسی مخصوص صحابی کو اپنی حدیثیں لکھنے کی مطلق اجازت بھی مرحمت فرمائی ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ عن رافع بن خدیج قال قلتُ یارسول اللہ انا نسمع منک اشیاء أ فنکتبھا؟ " قال ؐ اکتبوا ذلک ولا حرج " یعنی رافع

---

(۱) رواہ مسلم عن ابی سعید الخدری۔

(۲) حمید اللہ : مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ مطبوعہ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر۔

(۳) الخطیب البغدادی ؛ تقیید العلم۔ طبعہ یوسف العش ص ۲۹ اور اس کے بعد۔ بحوالہ ڈاکٹر شوقی ضیف تاریخ الادب العربی العصر الاسلامی مطبوعہ دارالمعارف۔ مصر ۴۲/۲

بن خدیج سے روایت ہے کہ "میں نے کہا اے رسول اللہ ہم آپ سے بہت سی چیزیں سنتے ہیں کیا ہم انھیں لکھ لیا کریں؟" تو آپ نے فرمایا کہ لکھ لیا کرو اس میں کوئی حرج نہیں ہے"۔ ایک دوسری روایت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی ہے جس میں ہے کہ " انہ إستأذن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ' ان یکتب ما یسمع من حدیث فاذن لہ"۔ یعنی عبداللہ بن عمرو بن العاص نے آپ سے اس کی اجازت مانگی کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں اسے لکھ لیا کریں تو آپ نے اجازت دے دی (۱) چنانچہ حضرت عبداللہ نے آپ کی حدیثیں جمع کرلی تھیں اور اس کا نام الصادقہ' رکھا تھا۔ بعض حدیثوں سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے سال اپنا ایک خطبہ جس میں بعض دینی مسائل تھے لکھوا کر ایک یمنی ابو شاہ کو دلایا تھا حالانکہ اس نے اس خطبہ کو آپ کی زبان مبارک سے خود بھی سنا تھا (۲)

حدیثیں لکھنے کے یہ واقعات مخصوص حالات میں اور مخصوص افراد کے لئے تھے۔ ویسے عام طور سے آپ اور خود صحابہ بھی آپ کی حدیثوں کو لکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا آپ نے اپنی حدیثوں کو لکھنے سے سختی سے منع فرما دیا تھا۔ یہاں تک جن لوگوں نے لکھ لی تھیں انھیں حکم دیا کہ انھیں مٹا دیں۔ یہ بھی روایت ہے کہ بعض رواۃ حدیثیں لکھ کر یاد کرنے کے بعد انھیں مٹا دیتے تھے۔

چنانچہ رسول اللہ کے زمانہ سے لے کر خلفائے راشدین کے زمانے تک حدیثوں کو لکھ کر مدون نہیں کیا گیا۔ زہری نے عروۃ بن الزبیر سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر کو اپنے عہد خلافت میں ایک دفعہ حدیثوں کو مدون کرانے کا خیال آیا تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا چنانچہ اکثر صحابہ نے انھیں مدون کرنے کی رائے دی۔ لیکن حضرت عمر مطمئن

---

(۱) عن ابن عمرو قال: قلت یارسول اللہ اسمع منک الشئی، أ فاکتبہا؟ قال: نعم قال: فی الغضب والرضی؟ قال: نعم، فإنی لا اقول فیہما إلا حقاً (عبدالہادی فی توضیح مقدمۃ القسطلانی)

أخرج البخاری عن أبی ھریرۃ یقول "ما من اصحاب النبی احد اکثر حدیثاً منی، الا ما کان من عبد اللہ بن عمرو، فإنہ کان یکتب ولا أکتب۔ (بخاری کتابۃ العلم)

(۲) مرجع سابق۔

نہیں ہوئے اور خود بھی ایک ہفتہ تک استخارہ کرتے رہے آخر ایک دن آپ نے فرمایا کہ "انی کنتُ اردتُ أن اکتبَ السننَ وانّی ذکرت قوماً کانوا قبلکم۔ کتبوا کتبا فاکبّوا علیھا وترکوا کتاب اللہ تعالیٰ وانّی واللہ لا البس کتاب اللہ بشئی ابداً[1]
یعنی میں نے چاہا تھا کہ سنتوں کو لکھ لوں (مگر) میں نے ان قوموں کو یاد کیا جو تم سے پہلے تھیں جنھوں نے کتابیں لکھیں اور پھر انھیں کے ہو کر رہ گئے اور انھوں نے اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا اس لئے خدا کی قسم میں اللہ کی کتاب میں کسی دوسری چیز کو کبھی نہ ملاؤں گا"۔
چنانچہ آپ نے حدیث کو لکھ کر مدوّن کرنے کا خیال چھوڑ دیا۔ آپ کے اس عمل کی تائید اور تقلید دوسرے محدث صحابہ نے بھی کی۔ اور حدیثوں کو لکھ کر محفوظ کرنے سے باز رہے۔
ان میں خاص طور سے قابل ذکر زید بن ثابت، ابوہریرہ، ابوسعید الخدری اور ابوموسیٰ الأشعری ہیں۔ یہ صحابہ جلیل القدر محدثین اور بکثرت حدیث کی روایت میں مشہور تھے لیکن یہ سب اپنے شاگردوں کو یا جو ان سے روایت کرتے تھے۔ حدیث لکھنے سے منع کیا کرتے تھے۔ صحابہ کے بعد اکثر تابعین کا بھی یہی طرز عمل رہا۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری میں تدوین حدیث عام طور سے نہیں ہوئی۔

حدیث کو مدوّن نہ کرنے کا یہ عمل ایک عرصہ تک جاری رہا۔ البتہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی خلیفہ تخت نشین ہوئے۔ (۹۹ ــ ۱۰۱ھ) تو انھوں نے حدیث کو باضابطہ مدون کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ الزرقانی نے موطا امام مالک کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ "صحابہ اور تابعین حضرات حدیثوں کو لکھتے نہیں تھے۔ بلکہ وہ آنحضرتؐ کے الفاظ میں ان کی روایت کرتے تھے اور صحابہ زبانی حفظ کر لیتے تھے سوائے کتاب الصدقات اور تھوڑی بہت دوسری چیزوں کے، یہاں تک کہ جب ان کے مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہوا اور ان کے علماء جلدی جلدی انتقال کرنے لگے تو عمر بن عبدالعزیز نے اپنے خط میں ابوبکر (ابوبکر ابن حزم انصاری) "گورنر مدینہ" کو حکم دیا کہ دیکھو حدیث اور سنّت میں سے جو مل سکے اسے لکھ لو[2]۔ امام مالک نے موطا میں محمد بن الحسن سے روایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ہمیں یحیی بن سعید نے بتایا کہ عمر

(۱) الخطیب البغدادی؛ تقیید العلم ص۴۹ اور اس کے بعد۔

(۲) حاشیہ زرقانی ۱/۱۰

بن عبد العزیز نے ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم کو اپنے خط میں لکھا کہ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں، سنت اور ان جیسی چیزوں میں سے جو مل سکے۔ انھیں لکھ لو۔ کیوں کہ مجھے علم کے مٹ جانے اور علماء کے گزر جانے کا ڈر ہے۔ اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے کہ عمر نے تمام ممالک اسلامیہ میں یہ حکم بھیجا کہ "دیکھو رسول اللہ کی جو حدیثیں مل سکیں انھیں جمع کر لو" مگر اس قسم کے کسی مجموعہ کے مرتب ہونے سے پہلے ہی حضرت عمر بن عبد العزیز کا انتقال ہو گیا۔

اسلام میں حدیث کی سب سے بڑی پہلی کتاب جو اکثر علماء کے نزدیک صحیح معنوں میں کتاب کہلانے کی مستحق ہے وہ ابن شہاب الزہری (۱) م ۱۲۴ کی کتاب ہے (۲) اس کے بعد حدیث میں تصنیف و تالیف کا کام تیزی سے شروع ہوا اور اس فن کی باقاعدہ کتاب مؤطا امام مالک م ۱۷۹ھ وجود میں آئی۔ اس کے بعد تیسری صدی ہجری میں امام حنبل نے اپنی مسند لکھی۔ اس کے بعد حدیث کی وہ کتابیں مرتب ہوئیں جنھیں صحاح یعنی صحیح حدیثوں کا مجموعہ کہا جاتا ہے اس قسم کی کتابیں چھ ہیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور النسائی (۳) ان کتابوں کا اور فن حدیث میں تصنیف و تالیف کا تفصیلی ذکر اس کتاب کی چوتھی جلد میں آئے گا۔ جس میں عہد عباسی کا تذکرہ ہے۔

حدیث کا اثر عربی زبان و ادب پر

تمام نقادوں اور علمائے ادب و لغت کا اتفاق ہے کہ عربی زبان میں قرآن کے بعد فصاحت و بلاغت اعجاز و ایجاز اثر اندازی اور اسلوب بیان کے حسن و دلکشی میں حدیث

---

(۱) زہری اور ان کی کتاب کے بارے میں دیکھئے۔ کتاب الانساب للسمعانی ۲۸۱ و وفیات الاعیان لابن خلکان ۱/ ۵۷۱ تہذیب التہذیب لابن حجر ۹/ ۴۴۵ تذکرۃ الحفاظ للذہبی ۱/ ۱۰۲، کتاب المعارف ۲۳۹ اور صفوۃ الصفوۃ ۲/ ۷۷۔

(۲) بعض علمائے حدیث نے محمد ابن حزم کو پہلا مدون قرار دیا ہے۔ اسی کو علامہ قسطلانی نے اختیار کیا ہے۔

(۳) بعض محدثین کے نزدیک مؤطا بعض کے نزدیک طحاوی یا مسند احمد بھی صحاح میں شامل ہیں۔

کو جو امتیازی شان اور خصوصی حیثیت حاصل ہے وہ کسی فرد کے کلام کو حاصل نہیں۔
حدیث کی اس امتیازی شان کی ایک وجہ تو یہ ہے جیسا کہ خود آنحضرتؐ نے فرمایا تھا
کہ " انا افصح العرب بید انی من قریش ونشأت فی سعد بن بکر " یعنی میں عربوں
میں سب سے زیادہ فصیح ہوں کیوں کہ میں قریشی ہوں اور قبیلہ بنو سعد میں میں نے تربیت
پائی ہے " یعنی آپ نے آنکھ کھولی تھی ایک ایسے قبیلہ میں جو اس وقت زبان اور تہذیب و
تمدن میں سارے شہر اتی عربوں میں امتیازی شان رکھتا تھا۔ اور بچپن کے دن قبیلہ بنو سعد
میں حلیمہ سعدیہ کے آغوش عاطفت میں گزارے جو بدوی قبائل میں زبان دانی اور فصاحت
و بلاغت میں ضرب المثل تھا جس کی وجہ سے بچپن ہی میں آپ کی زبان تمام عیوب و نقائص
سے پاک و صاف ہو کر پروان چڑھی۔

نبوت ملنے کے بعد آپ کی زبان مبارک سے قرآن کریم کا اجراء ہوا جو بلا اختلاف
عربی زبان و ادب کا وہ شہ پارہ ہے جس کی مثال آج تک دنیا نہ لا سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ آپ کی زبان اور اسلوب بیان میں وہ آب و تاب وہ حسن و دل کشی اور وہ سحر
طرازی پیدا ہو گئی جس نے خود آپ کے فرمودہ " إنّ من البیان لسحراً " کو حقیقت
بنا دیا اور جس کے سامنے تمام ادباء اور یکتائے روزگار فصحاء و بلغاء کی زبانیں گنگ
ہو گئیں۔

آپ کی اس معجز بیانی کو دیکھ کر ایک مرتبہ حضرت ابو بکرؓ نے آپ سے کہا کہ
میں تمام سرزمین عرب میں گھومتا پھرا ہوں اور ان کے فصحاء کے کلام کو سنا ہے لیکن
آپ جیسا معجز بیان شیریں مقال مجھے آج تک نہ ملا۔ آخر آپ کو یہ فن کس نے سکھایا؟
تو آپ نے جواب دیا کہ " ادبنی ربی فاحسن تادیبی " یعنی مجھے میرے رب نے
تعلیم دی اور بہترین تعلیم دی۔

آنحضرتؐ کے کلام کی امتیازی خصوصیات:

آپ کا کلام مہمل لغو اور فضول باتوں سے پاک و صاف ہے بے تکلف مجلسوں
اور مذاق کے موقعوں کو چھوڑ کر آپ کا بیشتر کلام یا تو قرآن کی آیتوں کی تفسیر و
توضیح ہے یا دینی و عصری مسائل اور معاملات کے بارے میں احکامات اور ان کی

تشریح یا بھلائی اور نیک کاموں کی ترغیب اور برائی اور برے کاموں سے بچنے کی تلقین ہے۔ یا ایسی دانشمندی و حکمت اور حقیقت و معرفت کا انمول سحر طراز موثر اور جذب آگیں مجموعہ ہے جو آج تک انسانی فلاح و بہبود اور سماجی عدل و انصاف کے لئے دستور، نظام حکومت اور تنظیم مملکت کے لئے مشعل راہ اور دل ودماغ کے لئے سرمایہ ایمان و یقین اور فکر و عمل کے لئے نشان منزل ہے اسی لئے حدیث کو بلا اختلاف عربی زبان و ادب میں قرآن کے بعد دوسرا ادبی اور امتیازی شہ پارہ سمجھا جاتا ہے۔ جیسے آج تک علماء و ادبا قابل تقلید نمونہ سمجھے ہیں اور اس کی ادبی اور امتیازی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لئے مستقل تحقیق و تدقیق میں لگے رہتے ہیں اور تحریر و تقریر میں آپ کی تقلید کرنے اور آپ کے طرز بیان کو کامیابی سے اپنانے کو سرمایہ فخر و افتخار اور حاصل ادب و لغت سمجھتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ بقول جاحظ

" ولم يسمع الناس بكلام قط أعم نفعا ولا أقصد لفظاً ولا أعدل وزنا ولا أجمل مذهبا ولا أكرم مطلبا ولا أحسن موقعا ولا أسهل مخرجا ولا أفصح معنى ولا أبين في فحوى من كلامه صلى الله عليه وسلم "(۱)

یا بقول میور رسول اللہ اور آپ کے کلام کی امتیازی شان یہ ہے کہ " آپ کا کلام واضح اور آپ کا دین آسان ہے اور آپ نے وہ کام سرانجام دئے جنھیں دیکھ کر عقلیں حیران رہ جاتی ہیں۔ تاریخ نے کبھی بھی ایسا مصلح نہیں دیکھا جس نے لوگوں کو اتنی تھوڑی سی مدت میں (خواب سے) بیدار کر دیا۔ اخلاق کو زندہ کر دیا اور فضیلت (اخلاق عالیہ) کی شان دوبالا کر دی جس طرح محمد ؐ نے کیا۔ (۲)

حدیث سے پیدا شدہ علوم :

حدیث سے علماء اور ادباء کے اس شغف کی وجہ سے اور دینی ضرورتوں کے پیش نظر اس سے بہت سے نئے علوم و فنون عربی زبان میں پیدا ہوئے جن میں سب سے اہم فن

۱۔ البیان والتبیین ۲/۷؛ (جاحظ کے یہ جملے اتنے خوبصورت اور جنچے تلے ہیں کہ خود اس کی زبان دانی اور اس میں اس کی عظمت اور قدرت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ترجمہ سے ان کا لطف جاتا رہے گا)۔

۲۔ [illegible] OF [illegible]

اسماء رجال' ہے جس کا موضوع بحث حدیث کے ہزاروں راویوں کے حالات زندگی کی جمع و تدوین اور ان کی چھان بین کرنا اس کی روشنی میں ان کے ثقاہت اور حدیث کی روایت میں قابل اعتبار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس ضمن میں علماء نے ایسی کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں ضعیف اور صحیح حدیثوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور انھیں یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ جیسے ابن حبان کی کتاب اسی طرح موضوع اور جھوٹی حدیثوں کے بارے میں بھی علمائے کتابیں لکھیں۔ جیسے السیوطی کی کتاب "اللآلي المصنوعة"
حدیث ہی کی بدولت عام تاریخ اور سیرت نگاری کا وجود ہوا جس نے بعد میں اتنی ترقی کی کہ ایک مستقل فن بن گیا۔ اور جس کی وجہ سے عربی زبان میں "طبقات ابن سعد"
"أسد الغابة في معرفة الصحابة" لعز الدين ابن الاثير الاصابة في احوال الصحابة لابن حجر العسقلاني الاستيعاب لابن عبد البر اور ميزان الاعتدال للذهبي وغیرہ جیسی قابل قدر کتابیں وجود میں آئیں اس کے علاوہ حدیث میں وارد بعض غریب اور شاذ الفاظ کی تحقیق تشریح اور توضیح کی خاطر علماء نے مخصوص کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سب سے اہم کتاب "غريب الحديث" مولفہ القاسم بن سلام ہے (۱)

۱۔ ڈاکٹر شوقی ضیف : تاریخ الادب العربی ج ۲ ۔ العصر الاسلامی مطبوعہ دار المعارف مصر صا۱۶

رسول اللہ کے پاس مختلف قبائل کے وفود جب آتے تھے تو آپ ان سے انھیں کے لہجہ اور انھیں کی زبان میں گفتگو فرماتے تھے بعض ایسے الفاظ اور ایسے جملے آجاتے تھے جو دوسرے قبائل کی زبان میں خاص طور سے قریش کی زبان میں مستعمل نہ تھے اس لیے عربوں کو انھیں سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی۔ جیسے ایک دفعہ حمیر کے وفد کے ساتھ گفتگو میں آپ نے 'ال' کو 'ام' سے بدل کر ان سے گفتگو کی کیوں کہ وہ لوگ اسی طرح بولتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ان سے فرمایا "ليس من امبر امصيام في امسفر" یعنی "ليس من البر الصيام في السفر" اس قسم کی باتوں کو دیکھ کر حضرت علی نے ایک دفعہ آپ سے کہا کہ رسول اللہ ہم سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں لیکن آپ وفود سے ایسی زبان میں گفتگو فرماتے ہیں جنھیں ہم نہیں سمجھتے ہیں۔ تو آپ نے ان کو وہی جواب دیا جو حضرت ابوبکر کو دے چکے تھے۔ مختلف وفود سے ان کی زبان میں گفتگو کے انداز کے لیے دیکھیے۔ العقد الفرید ۱۸۱/۹ لابن عبد ربہ جس میں طهفة بن ابی زہیر النہدی اور لقيط بن عامر بن المنتفق سے آپ کی گفتگو نقل کی گئی ہے۔

ان خاص علوم و فنون کے علاوہ حدیث کی بدولت علم تفسیر فقہ اور دوسرے اسلامی علوم میں بھی بہت مدد ملی۔ غرض کہ حدیث کی بدولت عربی زبان میں نئے الفاظ اچھوتے اسلوب بیان اور منفرد و ممیز انداز تخاطب و کلام کے علاوہ ایسے علوم و فنون پیدا ہوئے جو اس سے پہلے موجود نہ تھے۔

نمونہ کلام؛

جاحظ نے اپنی کتاب البیان والتبیین میں اور العسکری اور المیدانی نے کتاب الامثال کی کتابوں میں وہ حدیثیں جمع کر دی ہیں جو عربی ادب میں زبان و بیان کا نمونہ اور فصاحت و بلاغت کا شہ پارہ سمجھی جاتی ہیں۔ (۱) ان میں سے بعض درج ذیل ہیں۔

۱۔ لا یُلدغ یالا یُلسع المومن من جحر واحد مرتین؛ یعنی مسلمان ایک ہی آدمی سے دو مرتبہ دھوکہ نہیں کھاتا (۲)

۲۔ مات حتف أنفہ؛ ضرب المثل ہے جس کا مطلب ہے اپنے بستر پر مرنا۔

۳۔ الآن حمیَ الوطیس: اس مثل کو آپ نے غزوہ حنین کے موقعہ پر فرمایا تھا جس کا مطلب ہے گھمسان کا رن پڑنا۔

۴۔ عورت کی نفسیات اور اس کی طبیعت کی عکاسی اس طرح فرمائی" المراۃ کا الضلع ان رمت قوامھا کسرتھا۔ یعنی عورت پسلی کی طرح خشک اور سخت ہوتی ہے اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو توڑ دوگے۔

۵۔ ایاکم وخضراء الدّمن: یعنی اس خوب صورت عورت سے بچو جس کی پرورش برے ماحول میں ہوئی ہو۔

۱۔ ملاحظہ کیجئے: الجاحظ۔ البیان والتبیین ۲/ ۱۵ المیدانی کتاب الامثال العسکری: جمھرۃ امثال العرب اور الجرجانی کتاب الکنایات۔

۲۔ یہ ضرب المثل آپ نے ابو عزۃ شاعر سے کہی تھی۔ غزوۂ بدر میں جب یہ گرفتار ہوا تو آپ سے رحم کی درخواست کی اور آپ نے اسے رہا کر دیا۔ جنگ احد میں یہ پھر مشرکوں کی طرف سے لڑنے آیا اور پکڑا گیا۔ اب کی دفعہ بھی اس نے اپنے رحم کی درخواست کی اس پر آپ نے اس سے مذکورہ مثل کہی کہ اب میں تم سے دھوکہ نہیں کھا سکتا مومن صرف ایک دفعہ دھوکا کھاتا ہے۔

۶۔ ماھلک إمرؤعرف قدرنفسہ۔ جس آدمی نے اپنی قدر پہچان لی وہ کبھی برباد نہ ہوگا۔

۷۔ اُلناس کلھم سواسیة کاسنان المشط: یعنی تمام لوگ کنگھے کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔

۸۔ لاخیرفی صحبة من لایری للک مایری لنفسہ ایسے شخص کے ساتھ رہنے میں کوئی فائدہ نہیں جو اپنے لیے جو کچھ پسند کرتا ہو وہی تمہارے لیے بھی پسند نہ کرے۔

۹۔ اَلمسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

۱۰۔ اُلید العلیا خیر من اُلید السفلی۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ یعنی دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

۱۱۔ ید اللہ مع الجماعة: اللہ کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے یعنی جہاں اتحاد و اتفاق ہوگا۔ وہاں اللہ کی مدد شامل حال ہوگی۔

۱۲۔ اسلام نے لوگوں کو برائی سے روکنے پر بہت زور دیا ہے اس کی مثال رسول اللہ صلعم نے اتنے بلیغ اور مؤثر انداز میں دی ہے کہ یہ مثال اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے تشبیہ کی بہترین مثال بن گئی ہے۔ آپ نے فرمایا "اِنّ قوماً رکبوا فی سفینةٍ فاِقتسموا فصار لکل رجل منھم موضع۔ فنقر رجل منھم موضعہ بفائس فقالوالہ' ماتصنع؟ قال ھو مکانی أصنع فیہ ماشئت۔ فإن أخذوا علی یدہ نجا و نجوا وإن ترکوہ ھلک وھلکوا۔

یعنی کچھ لوگ ایک کشتی میں بیٹھے اور سب نے مل کر کشتی میں اپنی اپنی جگہ بانٹ لی چنانچہ ہر ایک کے حصہ میں کشتی کا ایک حصہ آ گیا ان میں سے ایک آدمی نے کلہاڑی سے اپنی جگہ پر سوراخ کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا کرتے ہو؟ اس پر وہ بولا کہ یہ میری جگہ ہے میرا جو جی چاہے کروں گا۔ اب اگر لوگ اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں تو وہ آدمی اور سب لوگ بچ جائیں گے اور اگر چھوڑ دیتے ہیں تو وہ آدمی اور سب لوگ (ڈوب کر) ہلاک ہو جائیں گے۔

۱۳۔ زندگی کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ اس کی نشان دہی آپ نے اس فرینے اور بلیغانہ انداز میں نہایت جامع اور مانع الفاظ میں اس طرح فرمائی کہ سہل ممتنع بن کر رہ گیا فرمایا " أوصانی ربی بتسع! أوصانی بالإخلاص فی السر والعلانیۃ وبالعدل فی الرضاء والغضب، وبالقصد فی الغنی والفقر، وأن أعفو عمن ظلمنی وأعطی من حرمنی وأصل من قطعنی وأن یکون صمتی فکراً ونطقی ذکراً ونظری عبراً " یعنی میرے رب نے مجھے نو باتوں کی ہدایت کی ہے (پہلی بات) یہ کہ میں ظاہری اور پوشیدہ طور پر خلوص کو اپنا شعار بناؤں۔ (دوسری بات) یہ کہ غصہ اور خوشی دونوں حالتوں میں انصاف سے کام لوں۔ (تیسری بات) یہ کہ غریبی اور امیری دونوں حالتوں میں میانہ روی سے کام لوں (چوتھی بات) یہ کہ جس شخص نے مجھ پر ظلم کیا اس کو معاف کر دوں۔ (پانچویں بات) جو مجھے محروم رکھے اسے دوں (چھٹی بات) یہ کہ جو رشتہ دار مجھ سے قطع تعلق کرے اس سے میں اپنا رشتہ جوڑوں۔ (ساتویں بات) یہ کہ میری خاموشی غور و فکر کے لئے ہو (آٹھویں بات) یہ کہ میری زبان پر ہر وقت اللہ کا ذکر ہو اور (نویں بات) یہ کہ جو کچھ دیکھوں اس سے عبرت حاصل کروں "

۱۴۔ دنیا کی بے ثباتی اور مال و دولت کی بے وقعتی کا اس سے زیادہ صحیح اور مؤثر نقشہ کوئی ادیب آج تک نہ کھینچ سکا فرماتے ہیں "یقول ابن آدم مالی مالی۔ وَ إِنَّمَا لَكَ مِنْ مَالِكَ مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ أَوْ وَهَبْتَ فَأَمْضَيْتَ" یعنی آدمی ہر وقت مال مال کی رٹ لگائے رہتا ہے حالانکہ تمہارے مال میں سے تمہارا حصہ تو صرف وہ ہے جسے تم نے کھا کر ختم کر دیا یا پہن کر پرانا کر دیا۔ یا داد و بخشش دے کر ٹھکانے لگا دیا۔

۳۔ عربی زبان پر اسلام کا اثر

جیسا کہ معلوم ہے، عرب اسلام کے آنے سے پہلے اپنے بادیوں میں ایک آزاد اور خود مختار زندگی گزارتے تھے، کم و بیش یہی حالت شہروں میں تھی۔ دونوں جگہ شیوخ قبائل کی حکمرانی تھی اور برسوں سے چلی آرہی رسم و رواج کی پیروی۔ یہی حال، زبان کا بھی تھا۔ عام طور سے ہر قبیلہ کی اپنی زبان تھی اور اس کا اپنا لہجہ اور بولنے کا ڈھنگ۔

اسلام کے آنے کے بعد، جب عرب آنحضرتؐ کی دعوت پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء اور ان کے بعد آنے والے حکام اور امراء کا ساتھ دیکر اسلامی جھنڈے تلے انھوں نے ایک عظیم الشان اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جس کے ڈانڈے جزیرہ عرب سے ہوتے ہوئے ہندوستان و چین سے ملتے تھے، تو فطری بات ہے کہ مفتوحہ قوموں سے شادی بیاہ کے ناتے، دوستی و تعلقات کے راستے، ان عربوں کے انداز فکر و نظر کے ساتھ زبان و بیان کے طور طریقوں میں بھی فرق آیا اور اس کی وجہ سے پہلے عربی زبان کو بھی بہت پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ لیکن بعد میں عجمی اثرات نے برا اثر ڈالا۔ یہ فرق کس قسم کا تھا، ذیل میں مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ قریش کی زبان کا غلبہ اور اس کا رواج۔ اسلام کے بعد زبان کے معاملہ میں یہ انقلاب آیا کہ قرآن کے لہجہ قریش میں نازل ہونے کی وجہ سے، تمام دوسری زبانیں اور لہجے اسی میں ضم ہو گئے۔ اور ایک مربوط مستحکم اور شیریں زبان وجود میں آگئی جس کی کسوٹی اور نمونہ قرآن اور آنحضرتؐ کی احادیث تھیں، کیوں کہ آپ تمام عربوں میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ تھے اور آپ لہجہ قریش میں ہی بولتے تھے۔ اور چوں کہ اسلامی مملکت اور اسلامی معاشرہ کے روح رواں بھی عرب تھے (خاص طور سے پہلی صدی ہجری تک) اس لیے اس زبان کو زیادہ پھلنے مستحکم و مضبوط ہونے کا بہت اچھا موقعہ مل گیا۔ پھر قریشی لہجہ کو اولیت و فوقیت اس وجہ سے بھی ملی کہ اس وقت

تک مملکت کے سربراہ اور سلطنت کے ذمہ داروں کی اکثریت مضری قبائل کے افراد پر مشتمل تھی، جو قریش کے چچا کی اولاد تھی، اس لیے انھوں نے اس زبان کو اپنانے میں کوئی سبکی نہیں محسوس کی بلکہ ایک طرح سے فخر محسوس کیا کہ ہمارے ہی آباواجداد کی زبان کو سارے عرب میں سیادت واولیت حاصل ہے۔ اور اسی میں کلام الٰہی قرآن نازل ہوا ہے، جس سے بڑھ کر فخر کی کوئی اور بات نہیں ہوسکتی۔

۲۔ فتوحات اور جنگوں کی وجہ سے عربی زبان روم وایران اور دوسرے مفتوحہ ممالک میں پھیلی۔ پھر فتوحات کے بعد بدوی قبائل ان شہروں اور علاقوں میں ہجرت کر کے رہنے لگے جس کی وجہ سے وہاں کی قوموں سے میل جول بڑھا، تعلقات پیدا ہوئے، رشتے ناطے ہوئے اور ان سب باتوں کی وجہ سے ان عجمی قوموں نے عربی زبان سیکھی اور اکثریت مسلمان ہوگئی، اور پھر بعد میں انھیں میں سے عربی زبان وادب کے ماسبان اور ماہرین لغت پیدا ہوئے۔

۳۔ بعد میں (خاص طور سے عباسی زمانہ میں) لحن یعنی غلط تلفظ اور غلط اعراب سے عربی بولنے کی بیماری پہلی مرتبہ پیدا ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فتوحات میں آئی لونڈیوں سے بچے پیدا ہوئے۔ پھر عرب بھی عجمیوں کے ساتھ بکثرت رہنے اور اکثر ملنے جلنے لگے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی ماؤں کی وجہ سے ان بچوں کی زبان پر عجمی اثرات ہوئے۔ اور عجمیوں کے ساتھ زیادہ اختلاط سے ان عربوں کی زبان پر بھی برا اثر پڑا اور ان کا تلفظ اور اعراب دونوں بگڑ گئے۔

۴۔ عربی زبان اب ایک دینی زبان کی حیثیت سے فروغ پارہی تھی۔ اس لیے اس کے معانی مطالب میں وسعت کے ساتھ تنوع و تجدد پیدا ہوا۔ یعنی اسلام سے پہلے ایک لفظ کے معنی کچھ اور تھے لیکن اسلام نے اس لفظ کو ایک دوسرے معنی میں جس کی بنیاد دینی ضرورت پر تھی استعمال کر کے اس کو اس معنی کے لیے ہی مخصوص کردیا جیسے نماز، روزہ کے الفاظ، اللہ کی وحدت وصفات کے الفاظ، ایمان بالغیب، قیامت، مرکر زندہ ہونا، عذاب وثواب، کہ ان کے معنی میں اسلام نے خاص الفاظ استعمال کر کے ان میں وسعت کے علاوہ خصوصیت پیدا کردی۔ شریعت اور امور مملکت میں استعمال ہونے والے اصطلاحی الفاظ اور ان کے مفہوم اور مراد کا تعین جیسے مومن

کافر، فاسق اور منافق وغیرہ۔ اموی دور میں بعض علوم کے مبادی واصول کی ایجاد، اور ریاضی، طبی اور تاریخی فنون میں ابتدائی ترجمہ کا کام۔

۶۔ صدر اسلام اور اس کے بعد بعض ایسے الفاظ جن کا عہد جاہلیت میں بڑا رواج اور ان کے مفہوم اور مراد متعین تھے، استعمال بالکل چھوٹ گیا اور اس طرح رفتہ رفتہ وہ زبان کے دائرے ہی سے تقریباً نکل گئے، اس لئے کہ ان کے مخصوص معنوں میں اب استعمال کی ضرورت بالکل باقی نہیں رہی تھی، کیوں کہ اسلام نے ان کی جگہ اپنی مخصوص اصطلاحات اپنالی تھیں اور حالات کے تقاضے سے ان ہی کا استعمال موزوں ومناسب تھا۔ جیسے لفظ "المرباع" مال غنیمت کا چوتھائی حصہ جو جنگ کے سپہ سالار اور شہسوار کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ اسلام میں مال غنیمت کے حصوں کی تعیین اور تقسیم کے مقررہ اصول ہیں، اس لئے یہ لفظ بے معنی اور اس طرح غیر مستعمل ہو کر نکل گیا۔ یہی حال "النشیطة" لفظ کا ہوا۔ جو اس مال کو کہتے تھے جو بغیر لڑے بھڑے حملہ کرنے کے لئے جاتے ہوئے راستہ میں ہاتھ لگ جائے۔ اسلام میں اس قسم کا کوئی مال غنیمت نہیں اس لئے یہ متروک ہو گیا۔ یا جیسے "الفضول" یعنی وہ مال جو تقسیم کے بعد بچ رہے، جیسے ایک گھوڑا، یا اونٹ وغیرہ جس کے حصے نہیں بن سکتے، اس قسم کا مال شہسوار یا پہلے حملہ آور کو دیا جاتا تھا، یہ بھی متروک ہو گیا، یا اسلام کا جاہلی طریقہ جیسے "عم صباحًا" یا "عم ظلامًا" یعنی تمہاری صبح خوش آیند ہو یا تمہاری شام خوش آیند ہو۔ اس کی جگہ پر اسلام نے استقبال کرنیکا مخصوص طریقہ اور الفاظ ایجاد کیے۔ جیسے "السلام علیکم" یا "اہلا وسہلاً" ظاہر ہے انکے رواج کے بعد جاہلی طریقہ استقبال آہستہ آہستہ خود بخود ختم ہو گیا۔

۷۔ اس عہد ہی سے بعض عجمی الفاظ عربی زبان میں داخل ہونے لگے، اور استعمال ہونے لگے، جس کی وجہ سے ان کے معنوں اور استعمال دونوں پر عربی اور اسلامی رنگ چڑھ گیا۔ اور چوں کہ یہ سب انقلابات اور زبان وبیان میں یہ تغیرات اور ان کی نشوونما اور فروغ صرف قرآن اور حدیث نبوی کی مرہون منت تھی، اس لئے ان دونوں کا بھی مختصر جائزہ لیا گیا۔

———x———x———x———x———

دوسرا باب

گفتگو یا بول چال صدر اسلام میں

اسلام کے ابتدائی زمانے میں عربوں اور موالیوں (یہ وہ عجمی تھے جو مسلمان ہونے کے بعد کسی نہ کسی عرب خاندان سے منسوب ہو گئے) کے درمیان گفتگو کا ذریعہ فصیح عربی زبان رہی۔ یہ غیر عرب موالی مختلف عجمی ملکوں کے باشندے تھے اس لئے باوجود اس کے کہ وہ عرصہ سے عرب خاندان میں رہے اور انھیں کے درمیان پلے بڑھے ان کی زبان سے عجمی اثرات پوری طرح دور نہیں ہو پائے، چنانچہ الفاظ کے ادا کرنے کے طریقہ اور بولنے کا لہجہ عام طور سے وہی رہا جو ان کی اپنی مادری زبان کا تھا۔ مگر وہ لوگ عربی غلط نہیں بولتے تھے، جیسے حضرت بلال[1] کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی عربی زبان پر ان کی مادری زبان حبشی کا اثر نمایاں تھا۔ اسی طرح حضرت سلمان کی زبان پر فارسی زبان کا اور حضرت صہیب کی زبان پر رومی زبان اور لہجہ کا اثر آخر تک باقی رہا۔ اس قسم کے لوگ آنحضرت کے سامنے اگر غلط عربی بولتے تھے تو آپ لوگوں سے کہتے کہ "اپنے بھائی کی اصلاح کرو اس نے غلطی کی ہے"

آنحضرت کے بعد جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھنے لگا اور مختلف قوموں کے لوگ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہونے لگے اور اس طرح عربوں کے دینی بھائی بن گئے اور شادی بیاہ کے رشتوں نے اس تعلق کو اور مضبوط کر دیا تو ان عجمی لڑکیوں سے جو نسل پیدا ہوئی اس کی عربی زبان ناقص رہی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے باپوں سے توضیح اور فصیح عربی زبان سنتے تھے لیکن ان کی مائیں ان سے ٹوٹی ہوئی اور غلط سلط عربی بولتی تھیں، اور ظاہر ہے بچہ پر ماں کی زبان کا اثر زیادہ ہوتا ہے اس وجہ سے نئی پود کی زبان، باوجود احتیاط کے اتنی فصیح نہ تھی جتنی کہ ہونی

(1) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد نبوی (مدینہ منورہ) کے مؤذن ابتدائی دور کے مسلمان اور آنحضرتؐ کے فیض صحبت سے مستفید صحابی۔

چاہیئے تھی۔ یہی حال ان عجمیوں کا رہا جنھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح عربوں کے رنگ میں رنگ لیا تھا لیکن بول چال میں، اپنی مادری زبان کے اثرات کی وجہ سے اکثر الفاظ کے استعمال جملوں کی ساخت نحو وصرف کی رعایت میں غلطی کر جاتے تھے۔ اور بسا اوقات عربی الفاظ کے مقابلہ میں اپنی زبان کے الفاظ یا عربی تعبیر واسلوب کی جگہ اپنی زبان میں رائج تعبیر اور اسلوب اضطراری طور پر اختیار کر لیتے تھے، جس کی وجہ سے ان کی زبان بھی پوری طرح صحیح سالم اور غلطیوں سے پاک صاف نہ رہ گئی تھی۔

جہاں تک خود عربوں کی بول چال اور گفتگو کا تعلق ہے تو اس زمانے میں ان کی جائے سکونت اور ماحول کے مطابق اس میں بھی تھوڑا بہت فرق آیا۔ چنانچہ وہ عرب جو بادیہ میں رہتے تھے اور شہری اثرات سے محفوظ تھے ان کی بول چال کی زبان حسب سابق زمانہ جاہلی کی طرح فصیح اور معیاری رہی۔ البتہ شہروں میں رہنے والے عربوں کی گفتگو اور بول چال کے انداز میں خاص فرق آیا۔ چنانچہ ان عام عربوں اور ان کی عرب بیویوں سے پیدا شدہ اولاد کی بھی زبان بگڑی جن کا واسطہ عجمیوں سے کاروبار اور معاملات کی وجہ سے زیادہ رہا۔ عام طور سے یہ لوگ بھی وہی غلطیاں کرنے لگے جو عجمی کرتے تھے۔ البتہ خواص اور اونچے طبقہ کے عربوں نے اس کا خاص دھیان رکھا کہ اس میل میلاپ اور نئی صورت حال سے ان کی اور ان کے اولاد کی زبان نہ بگڑنے پائے، چنانچہ ایک طرف انھوں نے عجمی لڑکیوں سے شادی بیاہ کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا شروع کیا اور دوسری طرف اس کا خاص اہتمام رکھا، کہ ان کی اولاد کی تعلیم و تربیت خالص عربی انداز اور عربی ماحول میں ہو تا کہ ان کی زبان بگڑنے نہ پائے، چنانچہ وہ فصاحت و بلاغت کی تعلیم کے لئے اپنے بچوں کو بادیہ میں بھیج دیتے تھے۔ یا نامور اور فصیح و بلیغ اساتذہ اور ٹیوٹر رکھ کر اپنے گھروں میں ہی ان کی صحیح عربی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتے تھے۔ اس کام کی ابتدا حضرت معاویہ نے کی، انھوں نے اپنے لڑکے یزید کی تعلیم و تربیت کے لئے گھر پر ٹیوٹر رکھا اور ان کی پیروی میں دوسرے امرا، اور شرفا نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ بنوامیہ کے زمانہ میں اگر کوئی عرب زبان کی غلطی کرتا تو اس کی بڑی بے عزتی ہو جاتی اور ایسا داغ لگ جاتا جو مشکل سے دھلتا، اسی لئے اموی خلفاء نے اس کا خاص اہتمام رکھا کہ ان کے خاندان میں فصیح اور صحیح عربی زبان کا رواج رہے اور جہاں تک ممکن ہو حکومت کے افسران اور ذمہ داران بول چال میں بھی غلطیاں نہ کریں

جن میں عوام اور عجمی مبتلا ہیں پھر بھی ایسے افسران اور بعض خلفاء گزرے ہیں جن کی زبان پر عجمی اثرات پڑ گئے تھے اور وہ بولنے میں غلطی کرتے تھے، ان میں سے قابل ذکر عبید اللہ بن زیاد ہے اس کی ماں ایرانی تھی اور یہ حضرت معاویہ اور یزید کے عہد خلافت میں عراق کا گورنر تھا۔ اور خالد القسری ہے جس کی ماں عیسائی تھی، یہ ہشام کی طرف سے عراق کا گورنر تھا، بہت پڑھا لکھا اور شعلہ بیان مقرر تھا، لیکن اس کے باوجود اس کی زبان پر عجمی اثرات تھے۔ خلفاء میں ولید بن عبد الملک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زبان کی غلطیاں کرتا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے باپ نے اسے تعلیم و تربیت کے لیے بادیہ میں نہیں بھیجا تھا بلکہ اس نے مصر میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور اسکی وجہ سے زبان و بیان میں وہ پختگی اور عربی ذوق نہ پیدا ہو سکا جس کا تقاضا تھا۔

بعد میں زبان و بیان کی انہیں غلطیوں کو قابو میں کرنے اور ایک اصول کے مطابق زبان کو پروان چڑھانے، اور اسلامی تعلیمات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے نحو و صرف کے قواعد وضع ہوئے۔ اعراب کا وجود ہوا، جو بعد میں ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر گیا، جسے ہم علم نحو کہتے ہیں۔

صدر اسلام میں خطابت یا تقریر

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جب بھی کسی ملک یا قوم میں کوئی تحریک یا مشن ابھرتی ہے، خواہ وہ سیاسی ہو یا مذہبی یا سماجی یا معاشرتی، اس کو روشناس کرانے، ملک یا قوم میں اس کا تعارف کرانے کے لیے، سب سے پہلے خطابت یا تقریر ہی کو اس کا ذریعہ اور وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس ذریعہ سے اپنی بات پڑھے لکھے لوگوں، اصحاب فکر ونظر اور سوجھ بوجھ رکھنے والے طبقہ سے لے کر ان پڑھ اور معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والے طبقہ تک آسانی سے پہونچائی جاسکتی ہے۔ اور اسی ذریعہ سے اس بات کا بھی بڑی حد تک فوری طور پر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کہی ہوئی بات کا کتنا اثر سننے والوں پر ہوا۔ یہ اس وجہ سے کہ مخاطب سامنے ہوتا ہے اور پورا ماحول اپنی نظر و بیں چنانچہ عمل اور ردِ عمل اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ آپ کی نگاہ کے سامنے ایک حقیقت عریاں بن کر آجاتی ہے جسے ہم اصطلاح میں اثر کہتے ہیں۔ اس اثر کے پیدا ہونے کا انحصار مقرر کے اپنی تحریک یا مشن سے قلبی لگاؤ، اس سے خلوص اور اسی کو ہی حق وحقیقت سمجھ کر سامعین کے سامنے عقلی ونقلی دلائل کے ساتھ پورے جوش وخروش اپنی زبان وبیان کی پوری توانائیوں اور انداز گفتار کی پوری رعنائیوں اور یقین واعتقاد کی پوری طاقت اور قوت کے ساتھ پیش کرنے پر ہے کہ دل سے جو بات نکلتی اثر رکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ کے ہر موڑ پر جب بھی کوئی تحریک ابھری، خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، اس کی دعوت دینے والے خطابت اور تقریر کے ماہر اور یکتائے روزگار خطیب رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ خدا نے ہر زمانے اور ہر قوم میں اپنے پیغمبروں کو اس حربہ سے پوری طرح مسلح کر کے اور اثر اندازی کے اس ذریعہ کو پوری طرح استعمال کرنے کی صلاحیت سے متصف کر کے مبعوث کیا۔ جنھوں نے اس کے سہارے ملک وقوم کے قوائے ذہنیہ وفکریہ میں ایک نمایاں تغیر اور ان کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

حضرت عیسیٰ کے ذریعہ دین مسیحی کے آنے کے بعد، تاریخ کا سب سے اہم واقعہ آنحضرتؐ کے ذریعہ اسلام کی دعوت کا ظہور ہے۔ جو ایسے مذہبی، سیاسی اور سماجی ومعاشرتی

حالات میں ظاہر ہوئی جنھوں نے سب سے پہلے جزیرہ نمائے عرب اور اس کے بعد ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی، کیوں کہ اس نے عہد پارینہ کے کھنڈروں پر ایک ایسی نئی دنیا تعمیر کرنے کی دعوت دی جس میں انسان کی مادی ضروریات کو عدل وانصاف کے ساتھ پوری ہونے کی یقین دہانی کے ساتھ اس کے دل و دماغ کی غذا فراہم کرنے کی بھی ضمانت دی گئی تھی۔ اور اس کی بنیاد، مرکز اور محور قرآن کو قرار دیا گیا جسے خدا نے اپنے نئے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں تک پہونچایا۔

اسلام کی دعوت بڑی حد تک نئی، اچھوتی اور بڑی دوررس نتائج کی حامل تھی، اس لئے اس کے داعی حضرت محمدؐ کو اللہ نے اس کو فروغ دینے کے لئے ہر قسم کے اوصاف سے متصف اور ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح کر کے بھیجا اور ان میں سب سے بڑا موثر حربہ اور ذریعہ زبان تھی اور اس کا مظہر خطابت یا تقریر۔

چنانچہ تمام نقادوں اور علمار کا اتفاق ہے کہ آپ اپنے عہد کے سب سے بڑے فصیح و بلیغ مقرر، اور مؤثر خطیب تھے۔ جس کا تفصیلی ذکر آپ کے حالات میں آیا ہے آپ کے بعد آپ کے خلفار کا نمبر آتا ہے اور ان میں سب سے اچھے مقرر حضرت علی تھے جو بحیثیت ادیب نہ صرف خلفائے راشدین میں بلکہ صدر اسلام کے پورے دور میں ممتاز تھے۔ حضرت علی پر تفصیلی گفتگو خلفائے راشدین کے ساتھ آئے گی عہد اموی کے مقررین میں سرفہرست حضرت معاویہ کا نام ہے۔ اور جیسا کہ ہم نے کسی جگہ ذکر کیا ہے ان کے زمانے میں مسلمانوں میں بہت سے دینی و سیاسی فرقے پیدا ہوئے۔ جیسے شیعہ، خوارج اور بنوامیہ اور دوسرے دعویداران خلافت کے گروہ۔ ان سب میں نامی گرامی مقررین پیدا ہوئے جن کی تفصیل مناسب موقعوں پر اس کتاب میں آئی ہے۔ جنھوں نے خطابت کے جوہر دکھا کر اپنے فرقہ، پارٹی، اور جماعت کا پرچار کیا اور مسلمانوں کو اپنی طرف کرنے کی کوشش کی۔ اور اس طرح ضمناً زبان و بیان کی بھی خدمت کی اور فن خطابت کو ترقی دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

صدر اسلام یعنی آنحضرتؐ کے زمانے سے لے کر خلفائے راشدین کے زمانے تک میں خطابت کی امتیازی خصوصیات:

صدر اسلام کی خطابت کا اگر زمانہ جاہلیت کی خطابت سے موازنہ کریا

تو ہمیں مندرجہ ذیل خصوصیات نظر آئیں گی :-

۱۔ صدر اسلام میں پہلی مرتبہ جمعہ اور عیدین میں اور حج کے موقعہ پر خالص دینی تقریر کا رواج ہوا۔ ان کے علاوہ آنحضرتؐ اور خلفاء نے حسب موقعہ وعظ و ارشاد کی تقریریں بھی کیں۔

۲۔ دینی و سیاسی پارٹیوں کے قیام، اور حکومت و خلافت کے افتتاح کے موقعہ کی تقریریں، جیسے حضرت ابو بکر کا وہ خطبہ جو آپ نے خلیفہ ہوتے وقت سقیفہ بنی ساعدہ میں دیا تھا، جس کے بعد خلافت کے مسئلہ میں اختلاف ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

۳۔ تقریروں میں اثر اندازی کی ایسی قوت کا پایا جانا جس سے بعض وقت سخت دل بھی پگھل کر موم ہو جاتے تھے اور غصہ سے سرخ آنکھیں آنسوؤں کی لڑیاں پرونے لگتی تھیں۔ جیسے آنحضرت کی وہ تقریر جو آپ نے انصار کے سامنے اس وقت کی تھی جب آپ کو مال غنیمت کے تقسیم کے سلسلہ میں انصار کی شکایت پہونچی تھی اور جسے سن کر سب زار و قطار رونے لگے تھے اور ایک زبان ہو کر بول پڑے تھے کہ نہیں آپ کا فیصلہ دل و جان سے قبول، اور آپ کی ذات گرامی سب سے زیادہ محبوب و مقبول ہے۔

۴۔ کاہنوں اور پروہتوں کی بانیوں اور مسجع و مقفیٰ جملوں کے بجائے، خوبصورت چیدہ اور موزوں الفاظ کے سہارے ایسے فصیح و بلیغ جملوں کا استعمال جن کے ذریعہ معانی و مطالب واضح طریقے سے سامع کے دل و دماغ میں اتر جاتے تھے جن کا انداز اتنا گٹھا اور اسلوب اتنا پسندیدہ ہوتا تھا کہ تقریر شہ پارہ بن جاتی تھی۔

۵۔ اس زمانے میں پہلی دفعہ اللہ کی حمد و ثنا سے تقریر کی ابتدا۔

۶۔ لوگوں کو اپنی بات سمجھانے اور مختلف مسائل میں انہیں قائل کرنے کیلئے قرآن کریم کے انداز سے مدد اور طریقہ استدلال کا استعمال اور بر موقعہ محل کے لحاظ سے کبھی لمبی اور کبھی اتنی مختصر تقریر کرنا کہ چند جملوں پر ختم ہو جائے۔

اس طرح صدر اسلام میں عربی خطابت کو اتنی ترقی حاصل ہوئی اور اس کے ایسے نمونے سامنے آئے جو بعد میں آنے والوں کے لئے مشعل راہ اور عربی ادب میں عدیم المثال شہ پارے بن گئے، جو آج تک پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔

آنحضرتؐ کے بعد آپ کے چاروں خلفاء فن خطابت میں اس زمانے میں ممتاز رہے

یہ حضرات سربراہ مملکت ہونے کے اعتبار سے زبان و بیان و اثر اندازی میں مثالی مقررین سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں بحیثیت ادیب اور مثالی مقرر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اس زمانے میں سب سے ممتاز تھے۔ ذیل میں خلفائے راشدین میں سے پہلے تین پر مختصر اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی جاتی ہے۔

پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیق رضؓ

پیدائش: ۵۵ ق ھ / مطابق ۵۶۸ء، وفات: جمادی الثانیہ ۱۳ھ

کسی خاص ماحول، یا خاص حالات میں وقت کے تقاضوں کے مطابق، کسی دعوے کے ثابت ہو جانے، یا حق وحقیقت کو دلائل و براہین کی روشنی میں دیکھ لینے، اور عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھ لینے، یا دعویٰ کرنے والے کی شخصیت اور کردار کے متعلق ہر طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد اسے مان لینا تو رسم دنیا اور دستور بھی ہے کہ اب آدمی مجبور ہے۔ لیکن بغیر ان سب چیزوں کو دیکھے یا ان پر غور کیے، محض ایک آدمی کے کہنے سے، جس کے پاس دنیا میں بڑائی کی کوئی چیز نہیں ہے۔ مان لینا اور صرف اس لئے کہ کہنے والے نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور ہمیشہ صادق و امین کے لقب سے مشہور رہا، بڑی بات اور تاریخ کا ایک ان ہونا واقعہ تصور کیا جائے گا اور اس صورت میں خاص طور سے کہ اس کی بات مان لینے کے بعد ساری دنیا سے لڑائی اور عزیز و اقربا سے جدائی کا خطرہ بھی ہو۔ لیکن یہ تاریخی واقعہ پیش آیا، اور زیر تذکرہ خلیفہ اول، حضرت ابو بکر صدیق کی ذات گرامی سے، اور وہ یوں کہ جب آنحضرت نے وقت کے تقاضوں کے خلاف، اور مصلحتوں سے بالکل بے پرواہ ہو کر، مکہ کی وادی میں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ محمد رسول اللہ کی انوکھی اور غیر مانوس صدا بلند کی تو مردوں میں سب سے پہلے، بغیر سوچے سمجھے اور بغیر جرح و تعدیل کئے، جس شخص نے اس صدا پر لبیک کہا اور آمنا و صدقنا کا نعرہ بلند کیا وہ حضرت ابو بکر کی ذات تھی اور جب آنحضرت نے ہجرت سے ایک سال قبل معراج (آسمان پر جانے) کا قصہ بیان کیا تو بھی حضرت ابو بکر پہلے شخص تھے جنھوں نے بغیر کچھ سوال و جواب کئے اس کی تصدیق کر دی، جس کی وجہ سے آنحضرتؐ نے آپ کو "صدیق" یعنی تصدیق کرنے والے کے خطاب سے نوازا۔ اور جب آنحضرتؐ نے مکہ کو خیر باد کہہ کے مدینہ کے لئے ہجرت کی تو بھی "صدیق" رفیق غار تھے، اور غار ثور میں تین دن تک آپ کے ساتھ، عزت و آبرو اور جان تک کو خطرے میں ڈال کر سخت تکلیف اور پریشانی کو راحت جاں اور سکون قلب سمجھتے رہے اور جب مکہ والے آنحضرتؐ کا پیچھا کرتے ہوئے

غار کے قریب آگئے، اور راز کے کھل جانے کے خیال سے حضرت ابو بکر کو فطری تقاضے کے پیش نظر خطرہ محسوس ہوا تو آنحضرت کے صرف اتنا کہہ دینے سے کہ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" یعنی ڈرو مت اللہ ہمارے ساتھ ہے تو صبر و سکون کی ایسی دولت مل گئی جس نے پہاڑ جیسی استقامت اور عزم و حوصلہ بخش دیا۔ اور اس بے مثال استقامت کا انعام قرآن نے آپ کو "ثانی اثنین"(۱) کا خطاب دے کر ہمیشہ کے لئے "یارِ غار" کے نام سے آپ کو زندہ جاوید کر دیا۔ پھر آنحضرت کے وصال کے بعد مسند خلافت پر پہلے خلیفہ کی حیثیت سے بیٹھنے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کو وقت کے ایک مشکل ترین امتحان اور آزمائش سے آسان نکال لے جانا بھی تاریخ کا وہ واقعہ ہے۔ جو حضرت ابو بکر کے ناخن تدبیر اور آہنی عزم کا کھلا ثبوت ہے۔ جس میں وہ منفرد اور یکتائے روزگار ہستی ہیں اور وہ ہے فتنۂ ارتداد کا قصہ۔ جس نے تھوڑے دنوں کے لئے مسلمانوں کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ مگر حضرت ابو بکر نے بغیر نتائج کی پرواہ کئے ایک فیصلہ کیا اور پوری سختی سے اس کو نافذ کیا، اور اس فتنہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ مگر کیسے؟ اس کی تفصیل مناسب موقع پر آئے گی

اسلام سے پہلے حضرت ابو بکر کا نام "عبد الکعبۃ" تھا۔ یعنی کعبہ کا بندہ۔ مگر آنحضرت ؐ نے آپ کا نام عبد اللہ یعنی خدا کا بندہ کر دیا۔ کنیت ابو بکر تھی سلسلہ نسب یوں ہے۔

ابو بکر عبد اللہ عتیق بن أبی قحافہ بن عامر بن کعب بن سعد بن تیم بن مُرّہ بن کعب بن لؤی۔ جن کا سلسلہ قبیلہ فہر سے ہو کر قریش سے جا ملتا ہے حضرت ابو بکر کی والدہ کا نام ام الخیر سلمی بنت صخر بن عامر تھا، جن کا سلسلہ نسب بھی قریش سے آگے جا کر مل جاتا ہے۔

حضرت ابو بکر ۵۵ھ قبل ہجرت / مطابق ۵۷۳ء مکہ میں پیدا ہوئے اور بہت کھاتے پیتے گھرانے میں فارغ البالی کے ساتھ پرورش ہوئی۔ آپ آنحضرت سے دو سال چھوٹے تھے۔ لیکن دونوں کی طبیعت اور مزاج میں ایسی یکسانی تھی کہ

---

(۱) یعنی دو میں سے ایک۔

دونوں گہرے دوست تھے اور یہ دوستی ہر حال اور ہر زمانہ میں پورے اخلاص اور جذبہ جاں نثاری کے ساتھ ہمیشہ قائم رہی۔ چنانچہ نبوت سے پہلے دونوں ایک ساتھ تجارت کی غرض سے شام جاتے تھے۔ تجارت کی وجہ سے حضرت ابو بکر کا خوش حال لوگوں میں شمار تھا۔ اور نسبی تعلق اور اچھے اخلاق وعادات کی وجہ سے خاصے معزز ومکرم سمجھے جاتے تھے۔ قد لمبا تھا جس کی وجہ سے کمر کچھ خمیدہ تھی، دبلے پتلے، ناک نقشہ تیکھا اور پیشانی ابھری تھی۔ حضرت ابو بکر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ مکہ کے نوجوانوں میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

جب آنحضرت ؐ نے اسلام کی دعوت دی تو حضرت خدیجہ اور حضرت علی کے بعد آپ تیسرے شخص تھے جو آنحضرت ؐ پر ایمان لائے۔ اور پھر ایسے پکے مسلمان ہوئے کہ خود بھی اسلام کی دعوت دینی شروع کی۔ چنانچہ آپ کے ہاتھ پر عثمان بن عفان (بعد میں تیسرے خلیفہ ہوئے)، طلحہ بن عبید اللہ، الزبیر بن العوام، سعد بن ابی وقاص، اور عبدالرحمٰن بن عوف اسلام لائے (۱) جنھیں لے کر وہ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

مکہ والوں نے آنحضرت اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ حضرت ابو بکر کو بھی مسلمان ہونے پر سخت تکلیفیں دیں، اور یہاں تک کہ آنحضرت کی حمایت کے جرم میں کعبہ میں ان کو بری طرح مارا پیٹا، اس کے بعد بھی اتنی سخت تکلیفیں پہونچائیں کہ آنحضرت ؐ سے بھی یہ تکلیفیں نہیں دیکھی جاتی تھیں، چنانچہ آپ نے ان سے کہا کہ تم اب مکہ چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ۔ حضرت ابو بکر کو پہلے تو تردد ہوا، لیکن تکلیفیں جب حد سے بڑھ گئیں تو حبشہ (اتھیوپیا) کی طرف ہجرت کے خیال سے مکہ سے نکل پڑے۔ جب "برک الغماد" مقام پر پہونچے تو وہاں کے سردار ابن الدغنہ ان سے ملے اور پوچھا کہ کہاں چلے؟ تو بولے کہ میری قوم نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے، چنانچہ زمین میں گھوم پھر کر اپنے رب کی عبادت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر ابن الدغنہ نے کہا کہ نہیں تم جیسا شریف، مہمان نواز، دکھیاروں بے سہاروں کا مددگار، گھر سے نہیں نکالا جا سکتا

۱۔ تاریخ العرب: ڈاکٹر محمد اسعد طلس ۲/۸، تاریخ الادب العربی: ڈاکٹر عمر فروخ ۲۶۴۔

آؤ میرے ساتھ مکہ واپس چلو۔ چنانچہ ابن الدغنہ انھیں لے کر مکہ واپس آئے اور مکہ والوں کو ان کی ان حرکتوں پر بہت ڈانٹا پھٹکارا، اور کہا کہ ان کو میری ذمّہ داری پر یہاں رہنے دو، اس پر مکہ والے اس شرط کے ساتھ تیار ہوئے کہ ابوبکر نماز اور قرآن اپنے گھر ہی میں پڑھیں گے۔ اس طرح حضرت ابوبکر پھر سے اپنے گھر میں رہنے لگے اور قرآن اور نماز بھی اپنے گھر میں ہی پڑھنے لگے۔ مگر یہ بات بہت دنوں تک نہ چلی۔ کیوں کہ ان کی نماز اور قرآن کی آواز اور عبادت و ریاضت سے مکہ والوں کی عورتیں اور بچے متأثر ہونے لگے۔ پھر مکہ والوں نے ابن الدغنہ کو بلا کر اپنی ذمہ داری واپس لینے کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے اس کا ذکر حضرت ابوبکر سے کیا۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ ہاں میں اللہ اور اس کے رسول کی پناہ میں رہوں گا۔ آپ اپنی ذمہ داری واپس لے لیجئے۔ چنانچہ ابن الدغنہ نے اپنی پناہ واپس لے لی۔ اب قریشی خوب کھل کھیلے اور خوب جی بھر ابوبکر کو تکلیفیں پہونچانے لگے۔ یہاں تک کہ ابوبکر نے پھر پریشان ہو کر آنحضرت سے ہجرت کی اجازت مانگی۔ آپ نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ گھبراؤ نہیں مجھے بھی اب ہجرت کی اجازت خدا کی طرف سے ملنے والی ہے تو دونوں ساتھ ہی کوچ کریں گے۔ چنانچہ اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں کے بعد آنحضرت کو اللہ کی طرف سے ہجرت کی اجازت مل گئی۔ اور دونوں ایک شب رات کو مکہ چھوڑ کر مدینہ کے لئے نکل پڑے، اسی کو "ہجرتِ نبوی" کہتے ہیں اور اسی واقعہ سے عربی سن شروع ہوتا ہے۔ جس کو اصطلاح میں "سنہ ہجری" کہتے ہیں۔ مدینہ پہونچ کر حضرت ابوبکر نے ساری عمر آنحضرت کی خدمت میں گزار دی اور پھر آپ کے وصال کے بعد آنحضرت کے پہلے خلیفہ مقرر ہوئے۔

خلیفہ مقرر ہونے کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ رسول اللہ صلعم کا وصال کیا ہوا سب مسلمانوں پر ایک بجلی سی گر پڑی۔ سب کے ہوش وحواس جاتے رہے۔ شاید آنحضرت ؐ سے شدید محبت اور بے پناہ دلی تعلق کی وجہ سے لوگ، اور خاص طور سے آپ کے قریبی صحابہ، جن میں حضرت عمر بھی تھے، یہ سمجھتے نہ تھے کہ آنحضرت ؐ اس طرح سب کو چھوڑ کر رخصت ہو جائیں گے۔ چنانچہ سب پر بدحواسی کی کیفیت طاری تھی۔ حضرت عمرؓ کا تو یہ حال تھا کہ وصال کی خبر سن کر، بعض روایتوں کے مطابق اپنی تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے، اور بولے کہ جو کوئی کہے گا کہ محمدؐ کا انتقال ہو گیا، اس کا سر اس تلوار سے

سے قلم کر دوں گا۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت ابو بکر کی عقل، بصیرت اور معاملہ فہمی اور موقع کی نزاکت کا اندازہ کرنے کی صلاحیت نے وہ کام کیا جس نے تاریخ اسلام کے اس نازک اور خطرناک موڑ پر، امت مسلمہ اور اسلام کی کشتی کو صحیح رخ دیا اور حقیقی راہ دکھائی۔ حضرت ابو بکر فوراً آنحضرت کے جسد خاکی کے پاس پہونچے اور چہرہ مبارک سے چادر ہٹا کر دو تین ایسے بلیغ جملے کہے جنھوں نے نہ صرف حالات کو معمول پر کر دیا بلکہ بہت سے لوگوں کی آنکھوں سے پردے ہٹا دے۔ چہرۂ مبارک کو کھول کر بوسہ دیا اور بولے "میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ زندگی میں بھی من موہنار ہے اور مرنے کے بعد بھی من بسیا۔ (بابی أنت و أمی طبتَ حیا وطبتَ میتاً) اس کے بعد یہاں سے نکل کر لوگوں میں آئے، اور ایک مختصر جامع لیکن مؤثر تقریر کی۔ جو عربی ادب میں مختصر، بلیغ اور مثالی خطبوں میں شمار ہوتی ہے۔ چنانچہ اعلان کیا کہ "اگر کوئی محمدؐ کو پوجتا تھا تو محمدؐ مر چکے اور اگر کوئی اللہ کو پوجتا تھا تو اللہ زندہ ہے وہ کبھی نہیں مر سکتا" راویوں کا بیان ہے کہ یہ جملے بجلی کے کڑکے کی طرح سب پر گرے۔ سب کی آنکھیں کھل گئیں اور امر واقعہ حقیقت عریاں بن کر سب کے سامنے آگئی، اس کے بعد حضرت ابو بکر نے قرآن کی یہ آیت پڑھی " وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَاِئْنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ" ؟ یعنی محمد بھی دوسرے رسولوں کی طرح ایک رسول تھے، جو آئے اور چلے گئے۔ تو اگر محمدؐ کا انتقال ہو گیا یا وہ قتل ہو گئے تو تم لوگ دین سے پھر جاؤ گے کیا؟ ہر گز نہیں، پھر یہ بدحواسی کیوں، یہ سراسیمگی کیوں؟ ارے قرآن کا ازلی فیصلہ بھول گئے " كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ" یعنی ہر چیز فانی، اللہ باقی، اس کے بعد قانونِ قدرت یاد دلایا کہ ہر ایک کو موت آنی ہے کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔

" كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ"

روایتوں میں آتا ہے کہ لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ بعض صحابہ کے منہ سے یہ سُنا گیا کہ ان آیات کو تو ہم ہمیشہ پڑھتے تھے لیکن ان کا مفہوم صحیح صرف آج سمجھ میں آیا چنانچہ سب نے صبر و سکون اختیار کیا، امنڈا ہوا طوفان ایک دم تھم گیا۔

اتنے میں معلوم ہوا کہ انصار بنو ساعدہ کی چوپال میں، جمع ہو کر آنحضرتؐ کے خلیفہ کا انتخاب کر رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو بکر، حضرت عمر، ابو عبیدہ اور دوسرے مہاجرین کو

لے کر یہاں پہونچے تو دیکھا کہ انصاری اپنے بزرگ اور لیڈر حضرت سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنانے کے سلسلہ میں بڑی گرم جوشی سے باتیں کر رہے ہیں، مہاجرین کے آنے سے معاملہ میں جب زیادہ گرمی پیدا ہوئی تو انصاریوں میں جو لوگ اعتدال پسند اور حقیقت بین تھے انھوں نے اس اختلافی مسئلہ کو زیادہ عملی شکل دینے کے لئے یہ فیصلہ کرانا چاہا کہ ایک دفعہ قریشی خلیفہ ہو اور ایک دفعہ انصاری۔ مگر حضرت ابوبکر کی دور بین نگاہوں اور معاملہ فہم ذہن نے دیکھ لیا کہ اگر کہیں خلافت انصاریوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ کیوں کہ عرب کے دوسرے ممتاز قبائل اور خاص طور سے قریشی جواب تک سارے عرب میں معزز و محترم سمجھے جاتے تھے اور جن کے دل سے شاید قبائلی تفوق اور عصبیت کا شعور پوری طرح نہ مٹا ہو، کیوں کہ اکثریت فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئی تھی، اس فیصلہ کو نہ مانیں گے۔ اس لئے کہ انصاری بہرحال عربوں کی نگاہ میں وہ حیثیت نہیں رکھتے تھے جو قریشی یا دیگر ممتاز قبائل عرب رکھتے تھے، اس لئے اگر ان کو سربراہ مملکت بنا یا جائے گا تو ممکن ہے کہ اسلامی حکومت اور معاشرہ میں شروع ہی سے رخنہ پڑ جائے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر نے مختصر سی تقریر کی، جس میں انصاریوں کی فضیلت اور احترام، اور آنحضرت اور مہاجرین کے لئے انکی قربانیوں کا ذکر کر کے ان کو سراہا، ان کا اعتراف کیا اور یہ بتایا کہ موجودہ حالات میں اگر وہ مزید وسعت قلب اور وسیع ظرفی کا ثبوت دیں تو امتِ مسلمہ ایک شدید خلفشار اور خطرناک و مہلک اختلاف اور تفرقہ سے بچ جائے گی کہ اگر امت سازی اور مملکت کے نئے سرے سے قیام کے روز اول ہی ہم میں اختلافات اور رنجشیں شروع ہو جائیں گی تو تا ثریا می رود دیوار کج، اس لئے اگر آپ لوگ اس موقع پر، حالات کے پیش نظر اپنے موقف پر نظر ثانی کر کے خلیفہ قریش ہی میں سے منتخب کریں تو یہ سب کے لئے بہتر ہوگا، اور تمام امتِ بشمول تمام قبائل عرب اس فیصلہ کا خیر مقدم کرے گی۔ البتہ وزرا اور امراء حضرات انصار میں سے مقرر کئے جائیں گے۔ اس لئے آپ لوگ حضرت عمر بن الخطاب یا ابو عبیدہ بن الجراح کے ہاتھ پر بیعت کر لیجئے۔ لیکن حضرت عمر کی تجویز پر سب لوگوں نے بشمول انصار کے قبائل اوس و خزرج، حضرت ابوبکر کے ہی ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی اور اس طرح حضرت ابوبکر متفقہ طور سے پہلے خلیفہ منتخب ہوئے۔ (۱) (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور اختلافات و مخالفت کا وہ طوفان جو چوپال میں اُٹھ سکتا تھا ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حضرت ابوبکر نے ایک تقریر کی جس میں اپنی حکومت کی پالیسی کی وضاحت کی، اور آگے کس انداز سے معاشرہ اور مملکت کا انتظام و انصرام چلائیں گے اس کے اصول اور ضوابط بتائے، یہ تقریر فن خطابت کے اعتبار سے اس زمانے کی مثالی تقریر ہے، حمد و ثنا (اللہ کی تعریف و توصیف) کے بعد فرمایا۔

"ایها الناس إنّی قد وُلّیتُ علیکم ولستُ بخیرکم، فإن رأیتمونی علی حق، فأعینونی، و إن رأیتمونی علی باطل، فسَدِّدونی، أطیعونی ما أطعتُ اللہ فیکم، فإذا عصَیتُه فلا طاعة لی علیکم، ألا إنّ أقواکم عندی الضعیف حتی آخذ الحقَّ له، و أضعفکم عندی القوی حتی آخذ الحق منه، أقول قولی هذا و استغفر الله لی ولکم:

یعنی:" اے لوگو! مجھے آپ کا والی (سربراہ) بنا دیا گیا ہے، حالانکہ میں آپ لوگوں میں بہتر نہیں ہوں۔ اس لیے اگر آپ مجھے حق پر دیکھیں تو میری مدد کریں اور اگر مجھے ناحق (باطل) پر دیکھیں تو مجھے سیدھے راستے پر لگا دیں۔ میری فرمانبرداری صرف اسی وقت تک کیجئے جب تک میں آپ لوگوں کے درمیان اللہ کی اطاعت کرتا رہوں اور اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو پھر آپ لوگوں پر میری اطاعت واجب نہیں۔ یاد رکھئے آپ میں سے سب سے زیادہ طاقت ور آدمی میرے نزدیک محض کمزور ہے، جب تک میں اس کا حق اس کو نہ دلا دوں اور آپ میں سب سے زیادہ کمزور میرے نزدیک طاقتور ہے جب تک کہ اس سے حق لے نہ لوں۔ اپنی یہ بات کہنے کے بعد اپنے لیے اور آپ کے لیے اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں"۔

تفصیل کے لیے (۱) تاریخ العرب ڈاکٹر محمد اسعد طلس ۱/۱۴۳، عیون الاخبار لابن قتیبہ ۲/۲۳۴، تاریخ الطبری ۲/۴۵۰، تاریخ الادب العربی ڈاکٹر شوقی ضیف۔ العصر الاسلامی/۱۱۲، یہاں پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حضرت ابوبکر کی مذکورہ بالا تقریر کا ترجمہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ اپنی زبان میں صرف اس کا مطلب واضح کیا گیا ہے۔

خلیفہ بننے کے بعد آپ نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ اسامہ بن زید کی سرکردگی میں جس فوج کو آنحضرت نے شام اور ملحقہ علاقوں کو فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا، اور جو مدینہ سے باہر آپ کی وفات کی خبر سن کر نئے خلیفہ کے حکم کی منتظر تھی، اس کو اپنی مہم پر بلا دھڑک روانہ کر دیا۔ اور مدینہ میں اعلان کرا دیا کہ اسامہ کی فوج کا ہر سپاہی کل اپنی ڈیوٹی پر چلا جائے، حالانکہ بعض صحابہ نے منع بھی کیا کہ ان حالات میں مدینہ کو سپاہیوں اور نوجوانوں سے خالی کر دینا مناسب نہیں ہے۔ لیکن حضرت ابو بکرؓ نے کہا کہ جس کام کو آنحضرت ؐ نے شروع کیا تھا اس کو مکمل کرنا میرا فرض ہے۔

اس کے بعد حضرت ابو بکر کے عہد خلافت اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایک ایسا موڑ آیا کہ اگر حضرت ابو بکر انجام سے بے پرواہ ہو کر اپنی فہم و فراست، دور بینی و دور اندیشی اور عزم و حوصلہ سے کام لے کر قطعی اور بے لچک فیصلہ نہ کرتے تو شاید اسلام اور اس کے ارکان اور اس کی عبادات کی وہ شکل نہ رہتی جو آج ہے اور جو ہمیشہ چلے گی۔

ہوا یہ کہ عرب کے بعض ممتاز اور بڑے بدوی قبیلوں نے آنحضرت کے انتقال کے بعد زکاۃ دینی بند کر دی جو اسلام کا ایک اہم رکن ہے اور سرکاری خزانہ کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اور اعلان کر دیا کہ نماز تو ہم لوگ پڑھ لیں گے لیکن زکاۃ نہ دیں گے کیوں کہ یہ صرف آنحضرت کی زندگی تک تھی۔ ابو بکر کون ہوتے ہیں لینے والے۔ (۱) یہ سن کر اور حالات کو دیکھ کر مہاجرین اور انصار میں سے بہت سے لوگ حضرت ابو بکر کے پاس آئے کہ آپ زکاۃ کے معاملہ میں سختی نہ کیجئے، صرف نماز پر معاملہ کر لیجئے، اس وقت عرب قبائل سے جنگ کرنے کا نہ موقع ہے اور نہ طاقت۔

---

(۱) اس فتنہ میں اسلام مخالف عناصر اور منافقوں نے لوگوں کو اکسانے اور گمراہ کرنے میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ چنانچہ جو قبائل مرتد ہوئے ان میں قابل ذکر وہ قبائل ہیں جن میں مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کا قبیلہ بنو اسد، اور عبس و ذبیان اور غطفان وغیرہ تھے۔

فتنۂ ارتداد کے اسباب و محرکات اور اس کی تفصیل کے لیے تاریخ طبری جلد سوم، تاریخ العرب محمد اسعد طلس، اور تاریخ اسلام، خلافت راشدہ، دار المصنفین اعظم گڈھ ملاحظہ کیجئے۔

لیکن حضرت ابو بکر نے اس موقع پر ایک ایسا جملہ کہا جو نہ صرف ان کے تدبر اور پختہ سیاسی رائے کا عکاس تھا بلکہ ادب اور سیاست دونوں میں ایک تاریخی جملہ بن گیا۔ آپ نے کہا!

" واللہ لأُقاتلن مَن فرّق بین الصّلاۃ والزکاۃ، واللہ لو منعونی عناقاً، او عقالاً بعیر کانوا لیؤدونہ إلی رسول اللہ لقاتلتھم علی منعھا"

یعنی خدا کی قسم میں ہر اس شخص سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکاۃ میں فرق کریگا۔ خدا کی قسم اگر ان لوگوں نے ان اونٹوں کو یا اونٹ باندھنے کی رسی کو بھی دینے سے انکار کیا جو وہ آں حضرتؐ کو دیا کرتے تھے تب بھی میں ان لوگوں سے لڑوں گا' اس کے بعد ممتاز صحابہ اور تجربہ کار سپہ سالاروں کی سرکردگی میں ان کا قلع قمع کرنے کے لئے فوجیں روانہ کیں، جن میں قابلِ ذکر حضرت خالد بن الولید، عکرمہ بن ابی جہل، المہاجر بن ابی امیہ ہیں۔ جنھوں نے چند ہی دنوں میں باغیوں اور مرتدوں کا قلع قمع کر کے باقی ماندہ افراد اور قبائل کو دوبارہ اسلام میں داخل کیا اور اس طرح اس خطرناک فتنہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

امتیازی خصوصیات :-

حضرت ابو بکر کی خلافت کا زیادہ حصہ مدینہ اور اطراف عرب میں' حالات کو قابو میں لانے' امن و سکون کو مستحکم کرنے اور مرتدین کے خلاف معرکہ آرائیوں میں گزرا، اور ہر موقعہ پر آپ سپہ سالاروں اور فوجیوں کے سامنے تقریریں کرتے جن میں ان کو اسلام کے اصول اور آنحضرت کے اسوہ کے مطابق جنگ کرنے کی تلقین کرتے' اور سختی و پریشانی کے موقعہ پر صبر و سکون سے کام لینے پر ابھارتے' یہ ساری تقریریں تاریخ اور ادب کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ جن کے نقل کرنے کا یہاں موقع نہیں۔

حضرت ابو بکر کو صحابہ میں سب سے پہلے قرآن وحدیث کے سننے اور اس ماحول اور فضا میں عملاً زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ جس کی وجہ سے ان کی زبان و بیان دونوں شہ پاروں کے اثر سے اتنی منجھ گئی تھی کہ آنحضرتؐ کی طرح بات جامع، مانع، اور مختصر لیکن بہت سے معانی و مطالب کو لئے ہوئے کہتے تھے۔ ان کے بیان میں مسجع

یا مقفیٰ عبارت یا ابہام یا تعقید اور غموض نہ ہوتا تھا۔ آپ کی ان امتیازی خصوصیات کی حامل آپ کی وہ نصیحتیں ہیں جو آپ فوجوں کو کسی مہم پر روانہ کرتے وقت کرتے تھے۔ جیسے ان کی وہ مختصر تقریر یا نصیحت جو آپ نے اسامہ بن زید کی فوج کو رومیوں سے نبرد آزمائی کرنے کے لئے شام کی مہم پر بھیجتے وقت کی تھی جس میں ایسی باتیں کہی ہیں جو اسلامی فوج کے لئے لائحہ عمل اور جنگ کو اسلامی طریقے پر لڑنے کیلئے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"أيها الناس قفوا أوصيكم بعشر، فاحفظوها عني : لا تخونوا ولا تغلوا، ولا تغدروا ولا تمثلوا، ولا تقتلوا طفلا صغيراً، ولا شيخاً كبيرًا، ولا إمرأة، ولا تقعروا نخلاً، ولا تحرقوه، ولا تقطعوا شجرة مثمرة، ولا تذبحوا شاة ولا بقرة ولا بعيراً إلا لمأكله، وسوف تمرون بأقوام قد فرغوا أنفسهم في الصوامع فدعوهم وما فرغوا أنفسهم له"

"یعنی اے لوگو! ذرا ٹھہرو، میں تمہیں دس باتوں کی نصیحت کرتا ہوں، جنھیں میری طرف سے اچھی طرح یاد کر لو۔ دیکھو کبھی نہ خیانت کرنا، اور نہ جو مال بغیر لڑے بھڑے ملے اس میں غتر بود کرنا۔ کبھی بھی (دشمن) کے ساتھ دھوکہ دھڑی نہ کرنا۔ اور نہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنا نہ ان کا حلیہ بگاڑنا۔ اور نہ کسی چھوٹے بچہ کو یا عمر دراز بوڑھے کو اور نہ کسی عورت کو قتل کرنا۔ اور نہ کسی کھجور کے درخت کو کھود پھینکنا۔
اور نہ اس کو جلانا اور نہ کسی پھل دار درخت کو کاٹنا، اور نہ کسی بکری، گائے یا اونٹ کو بلا وجہ ذبح کرنا سوائے (جائز طریقے سے) کھانے کے لئے۔ تمہارا گزر ایسے لوگوں سے ہوگا جنھوں نے اپنے آپ کو گرجوں میں اللہ کی یاد کے لئے وقف کر رکھا ہوگا، ان سے ہرگز تعرض نہ کرنا، بلکہ ان کو ان کی حالت میں، اور جس کے لئے انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے چھوڑ دینا"۔

مذکورہ بالا نصیحتیں نصیحتی ادب میں نمونہ کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں قرآن و حدیث کے اسلوب بیان کی جھلک اور اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصول پوری طرح اجاگر ہیں۔ جن میں ایمان کی حرارت، اسلامی تعلیمات پر یقین کامل اور لائحہ عمل اور طریق کار کی نشاندہی بڑے بلیغ اور موثر انداز سے ملتی ہے۔

چنانچہ جاحظ نے روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکر کے پاس ایک آدمی کپڑا لے کر آیا۔ تو آپ نے اس سے پوچھا کہ أتبيع الثوب؟ یعنی تم اس کپڑے کو بیچنا چاہتے ہو؟ تو اس آدمی نے جواب دیا کہ "لا عافاك الله" یعنی نہیں، اللہ آپ کو معاف فرمائے۔ اس جملہ میں اس نے نحوی اعتبار سے ایک ایسی غلطی کر دی تھی جس کی وجہ سے اللہ کے معاف کرنے کی نفی ہو رہی تھی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ یوں نہیں بلکہ یوں کہو "لا، وعافاك الله" یعنی؛ لا: نہیں، اس کے بعد "و" بڑھا کر کہ بیچوں گا نہیں، اس حال میں کہ اللہ آپ کو معاف کرے (۱)

اس طرح حضرت ابوبکر نے ایک تجربہ کار مدبر، عادل حاکم، ایک متقی پرہیزگار مسلمان ایک باعلم وعمل صحابی وخلیفہ اور ایک مؤثر مقرر کی حیثیت سے اپنی زندگی گزاری اور دوسروں کے لیے ایک روشن اور قابل تقلید نمونہ چھوڑ گئے۔

روایت ہے کہ جمادی الثانیہ ۱۳ھ میں آپ کو شدید بخار ہوا۔ آپ نے تمام بڑے صحابہ کو بلایا۔ اور ان سے حضرت عمر کو خلیفہ بنانے کے سلسلہ میں مشورہ کیا۔ اکثر لوگوں نے آپ کی رائے کی تائید کی۔ مگر بعض نے یہ بھی کہا کہ حضرت عمر بہت سخت کوش آدمی ہیں کہیں نتیجہ غلط نہ نکل آئے۔ چنانچہ آپ نے لوگوں سے کہا کہ مجھے سہارا دے کر بٹھاؤ۔ اس کے بعد حضرت عثمان بن عفان کو بلا کر وثیقہ خلافت لکھوایا۔ جو اپنی جگہ خود ادب کا ایک شہ پارہ ہے۔ (۲) اس کے بعد حضرت عمر کو بلا کر اپنے بعد خلیفہ بنانے کی خبر سنائی اور بہت ہی قیمتی نصیحتیں کیں، جو حکومت وسیاست میں اسلامی لائحہ عمل کی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر عبدالرحمن عوف کے سامنے اعلان کیا کہ میں نے اپنی دانست میں تم میں سے سب سے بہتر آدمی کو خلیفہ بنایا ہے۔ اس لیے تم ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرو، آخری وقت میں حضرت عائشہ آئیں (ابوبکر کی صاحبزادی اور آنحضرت کی رفیق زندگی) تو ان سے مخاطب ہو کر یہ آیت پڑھی "وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذَٰلِكَ مَا كُنتَ مِنْهُ تَحِيدُ" یعنی آخری وقت آن پہونچا جس سے تم بھاگتے رہے تھے۔ پھر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔

۱۔ البیان والتبیین ۱/۲۹۱، اور تاریخ الأدب العربي شوقی ضیف ۲/۱۲۴

۲۔ طبری کے علاوہ اس دستاویز کو شوقی ضیف نے بھی تاریخ الأدب العربي ۲/۱۲۳ میں نقل کیا ہے۔

وفات کے وقت آپ کی عمر ۶۳ سال تھی، آپ کی مدت خلافت ۲ سال ۲ ماہ اور ۲۵ دن رہی۔ آپ کی وفات پر نظم ونثر میں بہت ہی دردناک مرثیے کہے گئے جن سے تاریخ اور ادب کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ تاریخ الطبری
۲۔ فتوح البلدان للبلاذری
۳۔ الاصابۃ فی تراجم الصحابۃ
۴۔ تاریخ الأدب العربی ۲/ڈاکٹر شوقی ضیف
۵۔ " " " ڈاکٹر عمر فروخ
۶۔ تاریخ العرب، ڈاکٹر محمد اسعد طلس۔ (نئے مورخین میں ڈاکٹر طلس نے حضرت ابوبکر کی سیرت، نظام خلافت اور سیادت سیاست میں ان کی حکمت عملی، اخلاق وعادات ان کی ادبی خوبیوں اور زبان دانی پر سیر حاصل بحث کی ہے جو پڑھنے کے لائق ہے)۔
۷۔ ابوبکر الصدیق، محمد حسین ہیکل
۸۔ عبقریۃ الصدیق، عباس محمود العقاد
۹۔ ابوبکر، الشبراوی المرسی عبداللہ
۱۰۔ تاریخ اسلام، خلافت راشدہ، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ فاروقؓ

پیدائش ۴۰ قبل ہجری/ ۵۸۳ء ——— وفات ۲۳ھ/ ۶۴۴ء

قرآن کریم کے معجز نما اثر کی مثالیں تاریخ اسلام میں بہت ملتی ہیں۔ مگر ایسی مثال نہیں ملتی کہ ایک آدمی غصہ میں بھرا ہوا تلوار لگا کر گھر سے نکلے کہ آج محمدؐ کی جان ہی لے کر چھوڑے گا، تاکہ اس نئے دین اور اس کے پیغمبر کا قصہ ہی تمام ہو جائے ہمیشہ کے لئے، تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ مگر جب آنحضرتؐ کے سامنے پہونچتا ہے تو ان کی جان لینا تو رہی دور کی بات، خود اپنی جان اور دل دونوں آپ کے حوالہ کر دیتا ہے، اور یہ واقعہ ہے عمر بن الخطاب کا، مکہ کے تند مزاج، سنگ دل لیکن باکردار، نڈر اور بہادر نوجوان کا۔ جن کی دنیائے دل ہی نہیں بلکہ تقدیر بھی بدل گئی، محض قرآن کو سوز دروں اور جذب و کیف کے عالم میں پڑھتے ہوئے سن لینے سے، جس کے بعد یہ سنگ خارا پگھل کر موم بن گیا اور پھر۔

چو کہ میں حاضر ہوا ہوں سر جھکانے کو   خدا پر اور رسولِ پاک پر ایمان لانے کو۔

اور اسی دن عمر کی تقدیر بدل گئی، یہ تھا قرآن کا اثر عمر کے دل پر۔ اسی کو علامہ اقبال نے اپنے فلسفیانہ انداز میں یوں کہا ہے ؎

تو می دانی کہ سوز قرأتِ تو   دگرگوں کرد تقدیر عمر را

اور پھر خطاب کے اونٹوں کا یہ چرواہا (یہ جملہ حضرت عمرؓ ہی کا ہے) آنحضرتؐ کا دوسرا خلیفہ بن کر قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کا مالک اور ایسا مثالی حاکم، مدبر، منتظم اور اسی کے ساتھ زاہد و متقی اور پرہیزگار بنا کہ گاندھی جی بھی ان کی جیسی حکومت ہند میں قائم ہونے کی تمنا لئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ اس کی ایک بہت دل چسپ کہانی ہے، جو بعد میں آئیگی ابھی ذرا عمر کی ذات کے بارے میں کچھ مزید باتیں درج ہیں۔

نام عمر، کنیت ابو حفص اور لقب الفاروق تھا۔ پورا سلسلہ نسب یوں ہے:۔

عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن رباح (۱) بن عبداللہ بن قرط زراح بن عدی بن کعب بن لوی العدوی القرشی۔

عمر کی ماں کا نام حنتمہ بنت ہاشم بن المغیرہ تھا، جن کا تعلق قریش کے مخزوم خاندان سے تھا۔

حضرت عمر ہجرت سے لگ بھگ چالیس سال پہلے پیدا ہوئے یعنی تقریباً ۵۸۳ء میں (۲) جواں ہو کر بڑے سرخ سفید، تنومند، دراز قد نکلے، ڈاڑھی بڑی گھنی تھی اور آنکھیں بہت سرخ، بعد میں "أقرع" یعنی گنجے ہو گئے تھے۔

ان کے والد قریش میں صاحب حیثیت آدمی تھے اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے عمر کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال رکھا، چنانچہ شریف زادوں کی طرح ان کو بھی لکھنا پڑھنا سکھایا اور عربوں کے اشعار اور ان کی تاریخ یاد کرائی۔ اور شہ سواری کی بھی اچھی مشق کرائی۔ چنانچہ عمر جب بڑے ہوئے تو ان میں بھی فضل و کمال، عقل و حکمت اور شجاعت و بہادری کے ساتھ انساب، تاریخ قبائل، اور شعر و شاعری کے ذوق میں بھی نوجوانوں میں ممتاز تھے۔ اس لئے قریش نے ان کے ذمے اس زمانے کا اہم ترین منصب کیا۔ اور وہ تھا سفارت۔ یعنی قبائل کے درمیان جھگڑا لڑائی میں صلح صفائی کرانے کا کام، اور اگر قریش سے کوئی قبیلہ "منافرہ" یعنی اپنی خوبیاں گنانے میں، یا "مفاخرہ" یعنی اپنے کارنامے (جنگی مہم جوئی وغیرہ) گنا کر فخر کرنے میں مقابلہ کرتا تھا تو اس کیلئے عمر ہی کا انتخاب ہوتا کیونکہ انھیں عربوں کے انساب سے لے کر جاہلی تاریخ کے علاوہ شعر بھی یاد تھے۔ (۳)

عمر کا خاص ذریعہ معاش تجارت تھا۔ چنانچہ قریش کے قافلہ کے ساتھ وہ بھی گرمیوں

---

(۱) صحیح نام ہماری تحقیق میں "رباح" ہے۔ محمد اسعد طلس نے اپنی کتاب "تاریخ العرب" میں 'ریاح' یعنی 'ب' کے بجائے 'ی' لکھا ہے ص ۹۲ (۲) محمد اسعد طلس نے اسد الغابہ ۴/۵۳ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سنہ فیل کے ۱۳ سال بعد پیدا ہوئے۔ پیدائش کی تفصیلات کے لئے دیکھئے الاستیعاب لابن عبدالبر جلد دوم اور تاریخ الطبری جلد ۵۔

(۳) پوری تفصیل کے لئے دیکھئے "الاستیعاب لابن عبدالبر ۲

میں شام اور سردیوں میں یمن سامان تجارت لے کر جاتے تھے (۱) اس پیشہ سے بس آسانی سے گزر بسر ہو جاتی تھی، بہت زیادہ فارغ البالی نہ تھی۔

عمر بیس سال کے تقریباً تھے کہ آنحضرتؐ نے نبوت کا دعویٰ اور اسلام کا اعلان کیا۔ ظاہر ہے یہ دین عمر کے اور ان کے پرکھوں کے معتقدات کا نہ صرف مخالف تھا بلکہ ان کو ختم کر کے ایک نئے دین کی ابتدا اور اس کے اصولوں پر ایک نئے سماج کی بنیاد اور ایک نئی طرز زندگی کی داغ بیل ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ بات عمر کو بری لگتی تھی کہ سینکڑوں سال سے جو باتیں چلی آ رہی تھیں، وہ یک بیک ایک تقریباً ہم عمر قریشی جوان کے (محمدؐ) کہنے سے غلط کیسے ہو گئیں۔ پھر جو باتیں محمدؐ کہتے ہیں وہ کچھ ایسی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتیں، پھر ان باتوں سے بزرگوں کی عزت آبرو پر حرف آتا ہے اور معبودوں کی ہتک اور بے حرمتی کا پہلو نکلتا ہے، اسی لئے وہ اس دین اور اس دین کے داعی حضرت محمدؐ کے سخت دشمن ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ مسلمانوں اور خاص طور سے ملازموں اور غلاموں کو سخت سے سخت سزائیں دیتے تھے۔ تھے بھی بہت رعب داب کے آدمی، اس لئے ان کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑی دہشت اور خوف و ہراس پھیلا رہتا تھا۔ انھوں نے اور ابو جہل نے مل کر آں حضرتؐ اور مسلمانوں پر دنیا تنگ کر رکھی تھی اور جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ اس لئے آنحضرتؐ اور آپ کے چند ساتھی حرم کے قریب، الأرقم بن الأرقم کے گھر میں چھپے رہتے تھے، اور وہیں چوری چھپے عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ خانہ کعبہ میں جا کر عبادت کرنے کی آسانی سے ہمت نہ ہوتی تھی۔ مگر آنحضرتؐ نے اس کے باوجود اسلام پھیلانے کے کام کو بند نہیں کیا۔ اور آپ اللہ سے دعا کیا کرتے تھے کہ خداوندا یا تو عمر کو یا ابو جہل کو اسلام میں داخل کر دے۔ انہیں دنوں خدا نے آپ کو حکم دیا کہ "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" یعنی اب کھل کر اسلام کی اشاعت کیجیے۔ چنانچہ آپ نے اپنا مشن اور تیز کر دیا۔ یہ دیکھ کر عمر اور زچ ہوئے۔ اور ٹھان لیا کہ محمد کو ہی ختم کر دو، قصہ پاک۔ اور ایک دن اسی نیت سے تلوار لٹکا کر گھر سے نکلے، لیکن ہوا یہ کہ قاتل خود ہی مقتول ہو گیا۔

اس سلسلہ میں دو دلچسپ روایتیں بیان کی جاتی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

حضرت انس بن مالک نے روایت کی ہے کہ "ایک دن عمر تلوار لٹکائے گھر

۱۔ تاریخ العرب: طلس ۳/۹۴

سے نکلے، راستے میں بنی زہرہ کا ایک آدمی ملا۔ اس نے پوچھا کہ اس انداز سے آج کہاں چلے؟ تو بولے کہ "محمدؐ کو قتل کرنے" زہری بولا کہ "محمد کو تو بعد میں قتل کرنا پہلے اپنے گھر کی خبر لو، بہن اور بہنوئی دونوں (بد دین) مسلمان ہو گئے ہیں۔ اب تو آگ پر تیل پڑ گیا۔ غصہ میں بھرے ہوئے ان کے یہاں پہونچے اور اپنے کانوں سے کچھ قرآن جیسی آواز بھی سنی تو پارہ اور چڑھ گیا۔ اور اسی حالت میں بہنوئی کو خوب لاتوں سے مارا، بہن بچانے آئیں تو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ زمین پر منہ کے بل گر پڑیں اور چہرہ لہولہان ہو گیا۔ تو غصہ میں بولیں کہ عمر جو جی چاہے کرو، جو جی چاہے کہو، مگر تمہارا دین سچا دین نہیں ہے بلکہ صرف محمدؐ کا دین حق ہے۔ اس کے بعد کلمۂ شہادت پڑھا یہ سن کر اور بہن کے یہ تیور اور عزم دیکھ کر اور اس حالت میں کہ چہرہ سے خون جاری ہے عمرؓ کچھ ڈھیلے پڑے، بولے اچھا دکھاؤ کیا پڑھ رہے تھے تم لوگ؟ تو بہن بولیں کہ تم "رجس" یعنی ناپاک ہو اور قرآن کو صرف پاک وصاف ہی لوگ چھو سکتے ہیں اس لئے یا تو نہاؤ یا وضو کرو، تب قرآن کو ہاتھ لگانا۔ چنانچہ عمر نے وضو کیا، پھر قرآن لیا یہ سورۃ "طٰہٰ" کی ابتدائی آیتیں تھیں، انھیں پڑھنا شروع کیا اور جب اس آیت پر پہونچے کہ "اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ۔۔۔" یعنی بلاشک وشبہ میں ہی اللہ یعنی عبادت کرنے اور پوجنے کے لائق ہوں، میرے علاوہ کوئی دوسرا پرستش کے قابل ہرگز نہیں، اس لئے صرف میری عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز کو پابندی سے قائم کرو، تو تھوڑی دیر کے لئے عمر سکتہ میں آگئے یہ حاکمانہ لاہوتی انداز تخاطب، قطعی فیصلہ کا یہ ناقابل انکار اعلان، یہ اٹل حکم، اور حق وحقیقت کے اظہار، اثبات اور نفاذ کا یہ آمرانہ مؤثر زور بیان عمر کے دل و دماغ کی پہنائیوں میں اتر گیا۔ ایک بجلی سی گری اور پتھر موم تھا۔ بولے: اچھا مجھے محمدؐ کے پاس لے چلو۔ جب ارقم کے گھر میں پہونچے تو آنحضرتؐ نے ان کا دامن پکڑ کر کہا کہ عمر کیا تم اپنی حرکتوں سے اس وقت تک باز نہیں آؤ گے جب تک کہ ذلت و رسوائی میں تمہارا بھی وہی انجام نہ ہو جائے جو اللہ نے ولید بن المغیرہ کا کیا؟ اس کے بعد بڑے درد اور تاثر سے کہا کہ خداوندا عمر کو ہدایت دے، اس دین کو عمر کے ذریعہ قوت اور عزت عطا فرما۔ یہ سن کر عمر تھرا سے گئے، اور دوسرے ہی لمحہ

پکار اٹھے "اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللهِ": میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں
یہ سننا تھا کہ سارے مسلمان خوشی میں نکل آئے اور اتنی زور سے نعرۂ تکبیر لگایا کہ
مکہ کی وادی گونج اٹھی (۱)

دوسرا قصہ :

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے سلسلہ میں دوسرا قصہ خود انھیں کی زبانی یوں بیان
کیا جاتا ہے کہ ایک دن انھوں نے چھپ کر حرم میں آنحضرتؐ کو قرآن پڑھتے سنا تو اس کے
انداز بیان اور معانی و مطالب سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ اپنی بہن کے گھر گئے اور اس کے
بعد دار ارقم میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لے آئے۔

بہر حال قصہ کوئی بھی ہو، اس میں شک نہیں کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا سبب
قرآن کی وہ اثر انگیزی تھی جس کے ڈر سے مکہ والے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس کر حرم کے
پاس سے گزرتے تھے کہ کہیں قرآن کی آواز کان میں نہ آجائے اور وہ اپنا دین و ایمان
سب کچھ محمدؐ کے حوالہ کر دیں۔

حضرت عمرؓ نے اسلام لانے کے بعد آنحضرتؐ سے کہا کہ ہم حق پر ہیں اس لئے ہم چھپ کر
نہیں رہیں گے اور حرم میں جا کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور کہہ دیا کہ اب کوئی
کسی مسلمان کو نہ چھیڑے، اس کے بعد سے مسلمان علانیہ نماز وغیرہ پڑھنے لگے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وفات کے وقت ہی بڑے صحابہ سے
مشورہ کے بعد ایک عہد نامے کے ذریعہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرا دیا تھا۔ چنانچہ انھوں
نے سنہ ۱۳ھ مطابق ۷/ مارچ سنہ ۶۳۴ء کو زمام خلافت ہاتھ میں لی۔ اور دس سال تک خلیفہ
رہے اور اس عرصہ میں ایک اسلامی سلطنت اور ایک ایسے اسلامی سماج کی بنیاد ڈال گئے
جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس زمانے کی عظیم الشان سلطنتوں کو اسلام کے جھنڈے
کے نیچے جھکا دیا۔ چنانچہ عراق، شام، ایران اور مصر جیسی عظیم ممالک آپ کے زمانے میں فتح
ہوئے۔ اور اسلامی فوجیں اس کے بعد دراتی ہوئی آگے بڑھتی ہی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ آپ کے زمانے میں ہی مسلمان ایک ایسی صالح قوم اور طاقت ور فوج بن کر دنیا کے

(۱) تاریخ العرب، اسعد طلس ۳/ ۹۷، بحوالہ الریاض النضرۃ/ ۱۹۱ تا ۱۹۳۔ حفیظ جالندھری نے حضرت عمرؓ کے اسلام کے واقعہ کو شاہنامہ اسلام" جلد اول میں بہت خوبصورت انداز سے نظم کیا ہے۔

سامنے آگئے۔ جس نے آگے چل کر جزیرہ عرب سے لے کر چین تک اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔

امتیازی خصوصیات:

حضرت عمر نے اپنے زمانہ خلافت میں اسلامی مملکت کو انتظامی سہولتوں کے پیش نظر نئے سرے سے اس طرح منظم کیا کہ ایک مثالی سلطنت کا نمونہ بنا دیا آپ نے اسلامی فوج کی نئے سرے سے تنظیم و ترتیب دی' اور سارے فوجیوں کا ریکارڈ رکھنے کے لئے رجسٹروں میں اندراجات کا طریقہ نکالا، بیت المال (سرکاری خزانہ) کو جہاں مال غنیمت' جزیہ' فے' زکاۃ و صدقات وغیرہ جمع کیا جاتا تھا۔ نئے سرے سے منظم کیا۔ اور اس کے حساب کتاب رکھنے کے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے اور ساری آمد و خرچ کو باقاعدہ رکھنے کے لئے رجسٹروں میں اندراجات کا طریقہ ایجاد کیا۔ اس کے علاوہ دوسرے انتظامی اور تنظیمی کام ایسے کئے جن میں وہ منفرد ہیں اور اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے اسلامی مملکت کو صحیح معنوں میں ہر اعتبار سے ایک منظم اور مستحکم حکومت بنا دی۔

حضرت عمر انتظامی اور ادارتی معاملات میں امتیازی شان رکھنے کے علاوہ دینی معاملات میں بھی بالغ نظری' معاملہ فہمی کے ساتھ حالات و ضرورت کے پیش نظر فیصلہ کرنے میں اجتہادی شان رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بعض دینی مسائل میں اپنے اجتہاد اور اپنے علم و یقین کی بنیاد پر چند بہت اہم اور نادر فیصلے کئے ہیں۔ جو فقہ میں "اجتہادات عمر" کے نام سے مشہور ہیں (۱)

اس سلسلہ میں ان کا ایک بہت اہم اور جرأت مندانہ اجتہاد "مؤلفة قلوبهم" یعنی تالیف قلب کرنے کے لئے اہم اور بڑی حیثیت کے نومسلموں کو زکاۃ کی مد میں سے وظیفہ دینا تھا تاکہ وہ مالی اعتبار سے اپنی حیثیت کے مطابق

---

(۱) ان کی تفصیل مولانا تقی امینی کی کتاب میں ۔۔۔ اور خاکسار مصنف کے مضمون "اجتہاد صحابہ" شائع شدہ۔ اسلام اور عصر جدید ماہ اپریل اور جولائی ۱۹۷۵ء میں ملاحظہ کیجئے۔"

زندگی گزار سکیں اور اسلام سے منحرف نہ ہوں۔ قرآن نے منجملہ اور مدوں کے اس مد کو بھی زکاۃ کی مدوں میں مقرر کیا ہے، لیکن حضرت عمر نے یہ کہہ کر ان لوگوں کے وظیفے بند کر دیئے اور نئے لوگوں کو بھی یہ وظیفہ دینا بند کر دیا کہ یہ رقم اس وقت دی جاتی تھی جب اسلام کمزور تھا، اب اسلام اور مسلمان طاقت ور ہیں اب جس کا جی چاہے اسلام پر قائم رہے اور جس کا جی چاہے پھر جائے۔

حضرت عمر ان انتظامی اور تنظیمی معاملات میں امتیازی شان رکھنے کے علاوہ علم و فن اور خاص طور سے خطابت میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے زمانے میں رائج شدہ علوم و فنون کے علاوہ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے اور شعر و شاعری کا بہت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ دور جاہلی کی شاعری، اس زمانے کی کہاوتیں اس زمانے کی تقریریں اور نسب دانی میں مہارت تامہ رکھتے تھے، حضرت نوجوانوں کو اپنے بزرگوں کے علوم و فنون اور تاریخ کو یاد کرنے کی ہدایت بھی کیا کرتے تھے۔

روایت ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ اپنے بیٹے عبدالرحمن بن عمر سے کہا کہ "اپنا حسب نسب اچھی طرح یاد رکھا کرو تا کہ عزیزوں سے تعلقات استوار رکھو اور اچھے شعر یاد رکھا کرو تمہارا ادب نکھر جائے گا اس لئے کہ جو اپنا حسب نسب نہیں جانتا وہ صلہ رحمی نہیں کر سکتا، اور جس نے اچھے شعر نہیں یاد رکھے وہ نہ کوئی حق ادا کر سکتا ہے اور نہ کوئی ادب سیکھ سکتا ہے۔ اس سے پہلے کئی موقعوں پر شعر و شاعری اور علم و ادب کے بارے میں ان کی جچی تلی اور صحیح رایوں کا ذکر آ چکا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر شعر و ادب پر بھی بہت وسیع تھی اور کئی موقعوں پر ان کے شعر پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر و شاعری کو ناپسند نہیں، بلکہ بہت پسند کرتے تھے اور لطف لیتے تھے۔

حضرت عمر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور کثرت تلاوت کی وجہ سے زبان و بیان اور علوم شرعیہ پر ایسا ملکہ حاصل تھا کہ جیسا اوپر گزرا اجتہادی شان کے مالک تھے، عبداللہ بن مسعود کہا کرتے تھے کہ "اللہ کی کتاب کے علم کو عمر ہم سب سے زیادہ جانتے تھے اور اللہ کے دین کے معاملہ میں ہم سب سے زیادہ فقیہہ تھے، یعنی صاحب فکر و نظر تھے" یہ بھی کہا کرتے تھے

کہ ترازو کے ایک پلڑے میں عمر کا علم اور دوسرے میں ساری دنیا کا علم رکھا جائے تو عمر کے علم کا پلڑا بھاری رہے گا۔ (۱)

حضرت عمر بہت شیریں بیان اور خوش مقال مقرر تھے۔ تاریخ نے ان کے علمی وادبی کارناموں میں سے دو ایک خطبات محفوظ رکھ لئے ہیں۔ جن میں ایک وہ ہے جو آپ نے خلیفہ ہونے کے بعد دیا، جس کی حیثیت آج کل کی پالیسی تقریر جیسی ہے خطبہ اس طرح شروع ہوتا ہے :

" أیها الناس إنه لم یبلغ ذو حق فی حقه أن یُطاع فی معصیة الله، و إنّی لا أجد هذا المال یصلحه إلا فلال ثلاث : أن یُؤخذ بالحق ویُعطی فی الحق ویمنع من الباطل. وإنما أنا ومالکم کولی الیتیم، إن استغنیتُ إستعففتُ وإن افتقرتُ أکلتُ بالمعروف. ولست أدع أحداً یظلم أحداً ولا یعتدی علیه، حتی اضع خده علی الارض و أضع قدمی علی الخد الآخر، حتی یذعن للحق....."

یعنی اے لوگو! کوئی صاحبِ حق اپنے حق میں اس درجہ کو نہیں پہونچتا کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ مال تین باتوں سے مفید بن سکتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ حق سے لیا جائے، دوسرے یہ کہ حق میں دیا جائے (خرچ کیا جائے) اور تیسرے یہ کہ باطل سے روک دیا جائے۔ میری اور تمہارے مال کی مثال یتیم کے سرپرست کی سی ہے، اگر مجھے ضرورت نہ ہوئی میں عفت اختیار کروں گا یعنی کچھ نہ لوں گا، اور اگر ضرورت مند ہوا تو رواج کے مطابق کھاؤں گا۔ کسی کو کسی پر ظلم نہ کرنے دوں گا اور نہ جبر وزیادتی، یہاں تک کہ میں اس کا ایک رخسار زمین پر رکھ کر اس کے دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں رکھ دوں۔ (اور اسی طرح اسکو اس وقت تک دبائے رکھوں۔) جب تک کہ وہ حق کے سامنے جھک نہ جائے۔

اس کے بعد لوگوں کے لئے ان کی جو ذمہ داریاں، اور پھر لوگوں کی ان کے تئیں جو ذمہ داریاں ہیں ان کا ذکر کیا پھر اپنے حکام اور گورنروں کو مخاطب کرکے ان کی

---

(۱) تاریخ العرب : ڈاکٹر محمد اسعد طلس ۳/۹۴

ذمہ داریاں اور فرائض گنائے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ :

ألا و إنی لم ابعثکم امراء ولاجبارین، ولکن بعثتکم أئمة الھدی یھتدی بکم.... الخ

جان لو کہ میں نے تم کو محض حکومت کرنے والے افسر یا ظلم و زیادتی کرنے والے جابر لوگ بنا کر نہیں بھیجا ہے بلکہ ہدایت کے امام بنا کر بھیجا ہے تاکہ تمہارے ذریعہ سے ہدایت حاصل کی جائے۔ اس کے بعد ان کو مشورہ دیا ہے کہ مسلمانوں کے حقوق ادا کرتے رہنا، ان کو ذلیل و رسوا نہ کرنا اور ان کے لئے اپنے دروازے بند نہ کرنا۔ اور ان کے ذریعہ فتح و نصرت حاصل کرنا، لیکن جب محسوس کرنا کہ وہ جنگ کرتے کرتے تھک گئے ہیں تو فوراً جنگ بند کر دینا۔

حضرت عمر کی یہ تقریر اور یہ نصیحتیں، زور بیان، اسلوب اور اثر اندازی کے نقطۂ نظر سے عربی ادب میں نمونے کی ان تقریروں میں شمار ہوتی ہے جو ہر اعتبار سے فن خطابت کے اصولوں پر پوری اترتی ہے۔ اس کے علاوہ حضرت عمر کی وہ نصیحتیں جو آپ نے ابن قیس کو لکھوا کر بھجوائی تھیں، عربی ادب میں شہ پارہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قاضی کے فرائض اور ذمہ داریاں گناتے ہوئے کہتے ہیں :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من عبد اللہ عمر، امیر المؤمنین، إلی عبد اللہ بن قیس: سلام علیك۔ أما بعد ! فإن القضاء فریضة محکمة. وسنة متبعة، فافھم إذا أدلی الیك، فانه لا ینفع تکلم بحق لانفاذ له.(۱)

حضرت عمر کے خطبات اور نصیحتوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ بعض جگہ وہ زور بیان اور انداز خطابت ملتا ہے جو دوسرے خطباء کے یہاں خال خال نظر آتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ جیسی ان کی شخصیت بھاری بھرکم تھی، ویسی ہی ان کی تقریریں مقولے، اجتہادات نصیحتیں اور رائیں بھاری بھرکم مؤثر حقیقت پر مبنی اور علم و ادب کا نمونہ تھیں۔

---

(۱) تاریخ و سیرت کی کتابوں کے علاوہ حضرت عمر کے خطبات البیان والتبیین للجاحظ، تاریخ الأدب العربی ۲/۵۲، النعن ومذاھبه فی النثر العربی۔ شوقی ضیف /۶۱ اور مختارات من ادب العرب، مولانا ابوالحسن علی ندوی میں ملاحظہ کیجئے۔

وفات :

حضرت عمر کی وفات بڑے دردناک طریقے سے ایک گہری اور ناپاک سازش کے نتیجہ میں واقع ہوئی جس میں اسلام اور خود حضرت عمر کے دشمن اور ان سے جلنے والے شامل تھے یہ چار اشخاص یہ تھے :

۱۔ کعب الأحبار : یہ ایک یہودی تھا جو بہت پڑھا لکھا اور صاحب علم وفضل تھا۔ لیکن ساتھ ہی بہت بڑا فسادی، سازشی اور پرلے درجہ کا منافق تھا۔ اور اسلام اور مسلمانوں کا سخت دشمن۔

۲۔ ھرمزان : ایک ایرانی مجوسی آتش پرست۔ جس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بہت فتنہ وفساد پھیلا رکھا تھا۔ پکڑ کر حضرت عمر کے پاس لایا گیا تو ڈر کے مارے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن دل میں بدستور مجوسی رہا اور حضرت عمر کا جانی دشمن۔

۳۔ فیروز أبو لؤلؤة : مغیرہ بن شعبہ کا آزاد کیا ہوا عجمی غلام، حضرت عمر سے اپنے خلاف ایک فیصلہ کی وجہ سے ناراض تھا۔ اس لیے ان سے اور مسلمانوں سے سخت نفرت کرتا تھا اور دل میں بری طرح جلتا تھا۔

۴۔ ایک عیسائی جس کا نام جُفَینہ تھا اور انبار سے تعلق رکھتا تھا، عربوں اور خاص طور سے حضرت عمر سے بہت نفرت کرتا تھا۔

مذکورہ بالا اشخاص موقع کی تلاش میں رہتے تھے اور اس سلسلہ میں آپس میں مشورے بھی کرتے رہتے تھے۔ عبدالرحمن بن ابی بکر نے ان لوگوں کو ایک موقعہ پر بیٹھے دیکھا تو پاس گئے تو یہ لوگ گھبراہٹ میں جب کھڑے ہوئے تو وہ دودھاری خنجر گر پڑا جس سے آخر میں حضرت عمر شہید کیے گئے۔ (۱)

شہادت کے واقعہ کو صحیح بخاری نے عمرو بن میمون کی روایت سے تفصیل کے ساتھ

---

(۱) اردو میں حضرت عمر پر علامہ شبلی نعمانی کی کتاب "الفاروق" اور دیگر مصنفین کی کتابیں ملاحظہ کیجیے، ساری تفصیلات مل جائیں گی۔ عربی میں تاریخ وسیرت کی کتابوں میں سب تفصیلات ملتی ہیں: خاص طور سے تاریخ العرب اسعد طلس ۳/۱۵۴،

ذکر کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر کی عادت تھی کہ جب وہ فجر کی نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوتے تو جب دو صفوں کے درمیان سے گزرتے تو کہتے کہ صفیں سیدھی کیجئے اور جب صفیں سیدھی ہو جاتیں تب آگے بڑھتے اور اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لیتے، اس کے بعد پہلی رکعت میں کبھی سورۂ یوسف یا سورۃ النحل یا اس جیسی کوئی لمبی سورۃ پڑھتے تاکہ سب لوگ آ جائیں (اور کسی کی کوئی رکعت چھوٹنے نہ پائے) چنانچہ اس دن جیسے ہی تکبیر کہہ کر نیت باندھی ویسے ہی میں نے ان کو یہ کہتے سنا کہ مجھے کسی نے قتل کر دیا، کھا لیا" اور اسی لمحہ میں نے دیکھا کہ ابو لؤلؤہ ان کو خنجر گھونپنے کے بعد ہاتھ میں وہی دو دھاری خنجر لئے دائیں بائیں جس کو پاتا ہے مارتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس نے اس طرح ۱۳ آدمیوں کے خنجر گھونپ دیا جن میں سے سات فوراً ہی مر گئے۔ ایک مسلمان نے جب یہ حالت دیکھی تو جلدی سے اس کے منہ پر ایک ٹوپی ڈال دی۔ جب ابو لؤلؤہ نے یہ سمجھ لیا کہ اب پکڑ لیا جاؤں گا تو اپنا خنجر فوراً اپنے ہی گھونپ لیا۔

حضرت عمر کو مسجد نبوی سے اٹھا کر گھر لایا گیا، آپ کے پیٹ میں کاری زخم آیا تھا چنانچہ نبیذ پینے کے لئے دی گئی تو پیتے ہی پیٹ سے نکل گئی، پھر دودھ دیا گیا وہ بھی پیتے ہی پیٹ سے باہر نکل آیا۔ اب لوگوں کو مایوسی ہو گئی اور لوگوں نے اپنے بعد خلیفہ مقرر کرنے کی درخواست کی تو حضرت عمر نے اس کام کے لئے ایک کمیٹی جس کے چھ صحابہ ممبر تھے نامزد کر دی، جن کے نام یہ تھے۔ حضرت علی، حضرت عثمان بن عفان، حضرت زبیر بن العوام، حضرت سعد، حضرت طلحہ، اور عبدالرحمن بن عوف۔ اس کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے اپنے بیٹے عبداللہ بن عمر کو مقرر کیا اور اعلان کیا کہ لیکن ان کو خلافت سے سروکار نہ ہوگا۔ صرف مذکورہ بالا چھ اشخاص باہمی مشورہ سے جس کو پسند کریں اپنا خلیفہ مقرر کریں۔ چنانچہ ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کرنے کے بعد حضرت عثمان بن عفان کو خلیفہ چنا، جو تیسرے خلیفہ راشد کی حیثیت سے مسند نشین ہوئے۔

حضرت عمر کا انتقال ہو گیا تو ان کی خواہش کے مطابق حضرت عائشہ کی اجازت سے اس کمرے میں، جس میں آنحضرتؐ اور حضرت ابو بکر مدفون تھے، ان کو بھی سپرد خاک

کیا گیا، (۱)
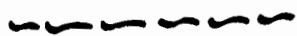
مسلمانوں کے لیئے یہ اتنا بڑا سانحہ تھا کہ ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا، اور خاص طور سے اس بے دردی اور سفاکی سے اتنے بڑے اور جلیل القدر خلیفہ اور ۱۳ مسلمانوں کا قتل لوگوں کے لیئے انتہائی المناک اور دردانگیز واقعہ تھا. ایک دفعہ رسول اللہؐ سے حضرت جبریل نے کہا تھا کہ " اے محمد تمہارے مرنے کے بعد عمر کی موت پر اسلام یقیناً روئے گا (۲) اور واقعی آہ و بکا کا جو عالم مدینہ کی گلیوں میں تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آج صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں اسلام رو رہا ہے" اور اس طرح حضرت عمر دس سال تک ۱۳ھ سے ۲۳ھ مطابق ۶۳۴ء سے ۶۴۴ء تک خلیفہ رہے، اور اس قلیل عرصہ میں اسلامی حکومت کی جڑوں کو اتنا مضبوط کر گئے کہ باوجود بعد میں ہونے والے فتنہ و فساد اور سخت سیاسی ہنگاموں اور کشت و خون کے ایسا قصر معلی کھڑا ہوا جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

حضرت عمر کی مختلف امتیازی خصوصیات کے علاوہ ان کے ابدی امتیاز کیلئے آنحضرتؐ کا یہ جملہ کافی ہے " لو کان نبی من بعدی لکان عمر ابن الخطاب" اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن الخطاب ہوتے۔

حوالہ جات:

۱۔ البیان والتبیین للجاحظ، ۲۔ عیون الاخبار لابن قتیبۃ اول
۳۔ العقد الفرید لابن عبدربہ، ۴۔ الکامل للمبرد، ۵۔ تاریخ الطبری،
۶۔ جمہرۃ خطب العرب لاحمد زکی صفوت، ۷۔ لفظ "خطبہ" دائرۃ المعارف الاسلامیہ
۸۔ تاریخ الادب العربی، ۹۔ الفن و مذاہبہ فی النثر العربی، ڈاکٹر شوقی ضیف
۱۰۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ لجرجی زیدان، ۱۱۔ مختارات من ادب العرب

---

(۱) دفن کے لیے حضرت عائشہ سے اجازت لینے کے لیے جس طرح حضرت عمر نے گزارش کی تھی وہ بھی عربی زبان کا بہت خوبصورت نمونہ ہے۔ دیکھئے "مختارات من ادب العرب" مولانا ابو الحسن علی ندوی

(۲) تاریخ العرب: طلس بحوالہ الریاض النضرہ طبری۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی وغیرہ۔

اردو میں تاریخ اسلام مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور الفاروق علامہ شبلی نعمانی کے علاوہ دیگر مصنفین کی کتابیں۔

تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ

شہادت ۳۵ھ

سازش اور اس کے نتیجہ میں فتنہ وفساد، تعصب اور اس کے نتیجہ میں حق و باطل کی تمیز اٹھ جانے کی وجہ سے جو نقصان کسی فرد یا جماعت یا پوری قوم اور ملک کو پہونچ سکتا ہے اس کی عبرت ناک مثال حضرت عثمان کی زندگی اور انجام کار ان کی سفاکانہ شہادت ہے۔

کہانی بڑی دردناک اور سبق آموز ہے، جس میں چند سازشیوں اور متعصب لوگوں نے اسلام میں فتنہ و فساد کا ایسا خونین دروازہ کھول دیا جو آج تک بند نہیں ہو سکا ہے اور اس کے مظاہرے اس ترقی یافتہ زمانے بھی مسلمانوں اور مسلمان حکومتوں کے درمیان آئے دن ہوتے رہتے ہیں جہاں برسر اقتدار اشخاص کا قتل اور حکومتوں کا تختہ پلٹنا آئے دن کا معمول سا بن گیا ہے۔

حضرت عثمانؓ خلفائے راشدین کے سلسلہ کے تیسرے خلیفہ ہیں اور حضرت عمرؓ کے بعد آپ کا انتخاب چھ صحابہ کے اس پینل میں سے ہوا جسے حضرت عمر نے مقرر کیا تھا، جن میں حضرت عثمان بھی تھے۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی تحریک پر آپ کا انتخاب بحیثیت خلیفہ محرم ۲۴ھ میں عمل میں آیا۔

اس وقت آپ کی عمر ہجری حساب سے ستر سال اور عیسوی سن سے ۶۸ سال تھی۔ عام صحابہ میں آپ کو ۳ امتیاز حاصل ہیں۔ ایک تو یہ کہ آنحضرتؐ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ اور ام کلثوم یکے بعد دیگرے آپ کے نکاح میں آئیں، جس کی وجہ سے آپ کو "ذوالنورین" یعنی "دو نوروں والے" کے لقب سے یاد کیا جانے لگا، دوسرے یہ کہ تجارت ذریعہ معاش ہونے کی وجہ سے عرب کے امیر ترین رؤساء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اور "غنی" یعنی رئیس مالدار کے لقب سے مشہور تھے، تیسرا امتیاز جو دینی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عثمان غنی نے جب یہ دیکھا کہ عجمیوں کے اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے قرآن کے پڑھنے میں غلطیاں اور عربوں میں

لہجوں اور تلفظ کے فرق کی وجہ سے اختلافات ہونے لگے ہیں تو قرآن شریف کی کئی کاپیاں کراکے سارے ممالک اسلامیہ میں بھجوادیں اور حکم دیا کہ اب صرف یہی قرآن پڑھا جائے گا، اس کے علاوہ قرآن کی دوسری کاپیاں نہ استعمال کی جائیں۔ اور اس کے بعد سارے نسخے جلوادیئے تاکہ کسی کے پاس قرآن کی مختلف فیہ کاپیاں نہ رہنے پائیں، اب ساری دنیا میں اس وقت وہی قرآن رائج ہے۔ آپ کے اس عمل کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے قرآن ہر قسم کے اختلافات سے محفوظ ہوگیا، آپ کے اس کارنامے کی وجہ سے آپ کو "مُوَحِّدُ القرآن" کا لقب دیا گیا۔
آپ کے اس کارنامے کی تفصیل اس کتاب کے باب "قرآن شریف" (۱) میں گذر چکی ہے، اور چوتھا امتیاز یہ حاصل تھا کہ غزوہ حدیبیہ میں قریش سے صلح کی گفتگو کرنے کے لیے آپ کو آنحضرتؐ نے سفیر مقرر کر کے بھیجا تھا اور جب آپ کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ سے حضرت عثمان کے قتل کا قصاص لینے کے لئے جان تک دے دینے کا معاہدہ کیا اور اس پر بیعت لی۔ جس کو "بیعت رضوان" کہتے ہیں۔

حضرت عثمان بن عفان خاندانی اعتبار سے بنوامیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ امیہ ابن عبد شمس تھے۔ بنوامیہ کا خاندان زمانۂ جاہلیت سے ہی بڑا معزز و باحیثیت اور دبدبہ کا خاندان سمجھا جاتا تھا۔ اور قریش کا ایک بہت اہم عہدہ اور بڑی ذمہ داری اس خاندان میں تھی، اور وہ تھی جنگوں میں قریش کے فوجی جھنڈے "عقاب" کے اٹھانے کی ذمہ داری، قریش کے خاندانوں میں بنوامیہ کا مد مقابل صرف بنو ہاشم کا خاندان تھا۔ جس سے ایک زمانے تک چشمک چلتی رہی۔ پانچویں پشت پر حضرت عثمان کا نسب حضورؐ سے مل جاتا ہے۔

حضرت عثمان، آنحضرت کی پیدائش کے چھ سال بعد، اور ہجرت نبوی سے سینتالیس سال پہلے پیدا ہوئے، آپ چونتیس (۳۴) سال کے تھے کہ اسلام کا ظہور ہوا، حضرت ابو بکرؓ پہلے اسلام لاچکے تھے، انھیں کی ترغیب سے حضرت عثمان بھی آنحضرتؐ کے دستِ مبارک پر اسلام لے آئے تھے۔ بعد میں آنحضرتؐ نے اپنی منجھلی صاحبزادی حضرت رقیہ کا عقد ان کے ساتھ کر دیا (۲)

(۱) مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجئے بخاری شریف اور فتح الباری ابواب جمع القرآن۔

(۲) اصابہ ج (۸) اور اُسد الغابۃ تذکرہ عثمان "تاریخ اسلام حصہ اول شاہ معین الدین احمد ندوی،

یوں تو عام طور سے قریشی اسلام اور مسلمانوں دونوں کے سخت مخالف تھے، اور ان کو تکلیف پہونچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، مگر ان میں بنو امیہ تو بہت سخت دشمن تھے۔ خود حضرت عثمان کے چچا حکم اسلام اور مسلمانوں کے جانی دشمن تھے، جب ان کو بھتیجے کے اسلام لانے کی خبر ملی تو انھوں نے ان کو باندھ کر خوب مارا پیٹا، مگر اسلام کا نشہ حضرت عثمان پر سے نہ اترا، دوسرے عزیزوں نے بھی ان پر زیادتیاں کیں، اور ہر قسم کی اتنی تکلیفیں پہونچائیں کہ برداشت سے باہر ہو گئیں۔ اسی درمیان اپنا دین اور جان بچانے کی خاطر مکہ چھوڑ کر ہجرت کر جانے کی خدا کی طرف سے اجازت مل چکی تھی، چنانچہ حضرت عثمان بھی اپنی اہلیہ (آنحضرت کی صاحبزادی) حضرت رقیہ کو لے کر دوسرے مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ حبشہ (اتھیوپیا) ہجرت کر گئے، اور اس طرح خدا کی راہ میں گھر بار چھوڑ کر پہلی ہجرت کرنے کا شرف حاصل کیا۔ چند سال کے بعد یہ غلط خبر اڑ گئی کہ قریش اسلام لے آئے ہیں تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ مکہ واپس آ گئے، یہاں آ کر معلوم ہوا کہ خبر غلط تھی، دوسرے ساتھی تو پھر حبشہ واپس چلے گئے لیکن حضرت عثمان مکہ ہی میں ٹھہر گئے، چند دنوں کے بعد مکہ چھوڑ کر مدینہ کو ہجرت کر گئے۔

مدینہ پہونچنے کے بعد حضرت عثمان، غزوہ بدر کو چھوڑ کر جس میں حضرت رقیہ کی بیماری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے تھے، تمام غزوات میں حضورؐ کے ساتھ شریک ہوئے، غزوہ حدیبیہ میں بھی آنحضرتؐ کے ساتھ تھے، اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا، قریشیوں سے صلح کی بات چیت کرنے کے لئے حضورؐ نے آپ کو ہی بھیجا تھا، اور آپ ہی کے قتل ہو جانے کی غلط خبر پر آپ نے صحابہ سے ان کے خون کے قصاص لینے کے لئے بیعت لی تھی جس کو تاریخ میں "بیعت رضوان" کہتے ہیں

حضرت عثمان بہ نفس نفیس غزوات میں صرف شریک ہی نہیں ہوئے تھے، بلکہ اپنا مال اور روپیہ پیسہ بھی جی کھول کر فوج پر خرچ کرتے تھے، چنانچہ روایت ہے کہ غزوہ تبوک میں حضرت عثمان نے آدھی یا تہائی فوج کے اخراجات برداشت کئے، اور اس کے علاوہ ایک ہزار اونٹ ستر گھوڑے اور ایک ہزار دینار بطور سامان رسد کے پیش کئے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان کی اس دریادلی کا

حضورؐ پر اتنا اثر ہوا کہ آپ ان کی دی ہوئی اشرفیوں کو اچھالتے تھے اور فرماتے تھے کہ آج کے بعد عثمان کو ان کا کوئی عمل نقصان نہیں پہونچا سکتا (۱) مسلمانوں کو مدینہ میں پینے کے پانی کی بہت تکلیف تھی، حضرت عثمان نے رومہ کنواں اس کے یہودی مالک سے خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ (۲)

حضرت عثمان کے دورِ خلافت کے ابتدائی چھ سال بہت امن و سکون، فارغ البالی اور ہر طرح سے اطمینان سے گزرے، جن میں فتوحات کا سلسلہ بہت بڑھا، ان کی وجہ سے مال غنیمت بھی بہت آیا، دوسری طرف محاصل و خراج کی وصولیابی بھی بڑھی، تجارت و زراعت میں بھی ترقی ہوئی۔ اور اس طرح ملک فارغ البالی اور عیش و تنعم کے سامانوں سے بھر گیا۔" اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے لوازم و نتائج بغض و حسد اور رشک و رقابت کا قدم بھی آیا، اور ان اندرونی تغیرات اور بیرونی اسباب نے مل کر حضرت عثمان کے خلاف ایسا انقلاب برپا کیا، جس نے نظام خلافت کو درہم برہم کر دیا" اور آخر میں حضرت عثمان کی جان لے کر رہا۔ اور اس طرح اسلام کی تاریخ میں ایک خلیفہ کا ایسا سفاکانہ خون بہایا گیا جس نے امتِ مسلمہ کے اندر اختلاف و افتراق کے ایسے دروازے کھول دیے جو آج تک بند نہ ہو سکے اور جس کی وجہ سے اس امت کے تن میں ایک ناسور پیدا ہو گیا جس سے آج تک خون رستا رہتا ہے۔

انقلاب برپا کرنے والوں نے حضرت عثمان پر مختلف قسم کے الزامات لگائے تھے جن میں ایک الزام ایک حد تک وقیع تھا، اور وہ تھا حضرت عثمان کا اپنے عزیزوں کا اہم عہدوں پر تقرر کرنا۔ جن میں بعض دینی اور اخلاقی اعتبار سے مملکت اسلامیہ کے کسی اہم منصب اور عہدہ کے قابل نہ تھے۔ مگر حضرت عثمان کا یہ عمل، جس کے جواز کے لئے ان کے پاس دلائل تھے (جن میں سے ایک ان اشخاص کی امتیازی قابلیت اور انتظامی و جنگی امور میں ان کی عدیم المثال صلاحیت تھی)

---

(۱) تاریخ اسلام حصہ اول: شاہ معین الدین احمد ندوی۔ بحوالہ مستدرک حاکم ج ۳/۱۰۲ اور ترمذی مناقب عثمان۔

(۲) یہ کنواں مدینہ منورہ سے شمال مغرب میں العقیق کے بڑے میدان میں واقع ہے اس جگہ کو آج کل زغابہ کہتے ہیں۔ المرتضیٰ ص ۲۳ بحوالہ آثار المدینہ منورہ ص ۲۴۵۔

اتنا سنگین نہ تھا کہ اس کے لیے خلیفہ کا خون بہادیا جاتا (۱) اس فتنہ کا اصل بانی ایک منافق یہودی عبداللہ بن سبا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا کوفہ میں اس کا سرغنہ اشتر نخعی اور جندب بن کعب وغیرہ تھے،

" اس تحریک کے علمبردار مصر، کوفہ اور بصرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے باہم خط و کتابت کر کے خفیہ طور سے یہ طے کیا کہ اچانک مدینہ پہونچ کر حضرت عثمان پر دباؤ ڈالیں۔ انھوں نے حضرت عثمان کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست مرتب کی جو زیادہ تر بالکل بے بنیاد، یا ایسے کمزور الزامات پر مشتمل تھی جن کے معقول جوابات دیے جاسکتے تھے اور بعد میں دیے بھی گئے۔ پھر باہمی قرارداد کے مطابق یہ لوگ، جن کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہ تھی، مصر، کوفہ اور بصرے سے یک وقت مدینہ پہونچے۔ یہ کسی علاقے کے بھی نمائندہ نہ تھے بلکہ سازباز سے انھوں نے اپنی ایک پارٹی بنائی تھی۔ جب یہ مدینہ کے باہر پہونچے تو حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو انھوں نے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، مگر تینوں بزرگوں نے ان کو جھڑک دیا، اور حضرت علی نے ان کے ایک ایک الزام کا جواب دے کر حضرت عثمان کی پوزیشن صاف کی۔ مدینہ کے مہاجرین و انصار بھی، جو دراصل اس وقت مملکت اسلامیہ میں اہل حل و عقد کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے ہمنوا بننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ مگر یہ لوگ اپنی ضد پر قائم رہے، اور بالآخر انھوں نے مدینہ میں گھس کر حضرت عثمان کو گھیر لیا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حضرت عثمان خلافت سے دست بردار ہوجائیں۔ حضرت عثمان کا جواب یہ تھا کہ میں تمہاری ہر اس شکایت کو دور کرنے کے لئے تیار ہوں جو صحیح اور جائز ہو۔ مگر تمہارے کہنے سے معزول نہیں ہوسکتا۔ (۲) جس پر ان

---

(۱) اس انقلاب، اس کے اسباب اور مخالفوں کے الزامات اور ان کے جوابات پر شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے تاریخ اسلام حصہ اول مطبوعہ معارف ص۲۵۵ پر بہت سیر حاصل بحث کی ہے۔ نیز دیکھیے حضرت مولانا علی میاں کی جدید ترین کتاب "المرتضیٰ" کا باب پنجم، جو اس موضوع پر بہت مفصل مدلل اور فکر انگیز ہے۔

(۲) طبقات ابن سعد ج ۳ ص۶۶

لوگوں نے ۴۰ روز تک ایک ہنگامۂ عظیم برپا کیئے رکھا، جس کے دوران ایسی ایسی حرکات ان سے سرزد ہوئیں جو مدینۃ الرسول میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھیں..... آخر کار ان لوگوں نے ہجوم کرکے سخت ظلم کے ساتھ حضرت عثمان کو شہید کر دیا، جس کے دوران ان کی بیوی حضرت نائلہ کی تین انگلیاں حضرت عثمان کو بچانے میں کٹ گئیں، تین دن تک ان کا جسد مبارک تدفین سے محروم رہا۔ اور قتل کرنے کے بعد ظالموں نے ان کا گھر بھی لوٹ لیا(۱)۔ یہ دردناک حادثہ ۳۵ھ میں پیش آیا۔

امتیازی خصوصیات

بحیثیت ادب کے طالب علم کے ہمیں حضرت عثمان کی سیاسی پالیسی، ان کے نظام حکومت، ان پر عائد کردہ الزامات، اور ان کی وجہ سے ان کے بے دردانہ قتل سے براہ راست تعلق نہیں ہے، اس لیئے ہمیں ان میں پڑنے کی یہاں ضرورت نہیں، البتہ ان کی طرف اجمالی اشارہ اس لیئے کیا گیا کہ حضرت عثمان نے ان سورشوں کے دوران، مختلف موقعوں پر باغیوں اور فتنہ پردازوں کو سمجھانے اپنے اوپر عائد کیئے گئے الزامات کے جوابات دینے کے لیئے تقریریں کی ہیں۔ جو تاریخ کی کتابوں، خاص طور سے طبری میں محفوظ ہیں۔ ان تقریروں پر جو عام طور پر مختصر ہیں، نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بخلاف بعض تذکرہ نگاروں کی رائے(۲) کہ حضرت عثمان کی قوت گویائی بڑی تیز اور

---

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھیے تاریخ الطبری جز۳۰ والبدایہ والنہایہ ج ۷، اور تاریخ اسلام اول شاہ معین الدین احمد ندوی۔

(۲) جاحظ نے البیان والتبیین ۶۲/۱ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان اپنے پیش رو دونوں خلفاء سے فصاحت و بلاغت میں کم تھے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ منبر پر تقریر کرنے کے لیئے چڑھے اور کچھ نہ بول پائے اور کہا کہ "ان ابابکر و عمر کانا یعدان لهذا المقام مقالا، وانتم الی امام عادل احوج منکم الی امام خطیب"، یعنی حضرت ابوبکر و عمر ایسے موقعوں کے لیئے اپنی تقریریں تیار کر لیتے تھے، لیکن تم لوگوں کو ایک عادل امام کی بہ نسبت ایک مقرر امام کے زیادہ ضرورت ہے۔ مگر حضرت عثمان کی تقریروں سے انکی اتنی بے مائیگی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ مزید دیکھیے عیون الاخبار لابن قتیبہ ۲۳۵/۲، العقد الفرید لابن عبد ربہ ۱۰۶/۴، زہر الآداب للحصری ۳۲/۱، تذکرۃ الحفاظ ج اول، روضۃ الناظر، اور تاریخ الخلفاء

اندازِ خطابت بہت مؤثر اور قائل کر دینے والا تھا جس سے بعض وقت سامعین رو دیتے تھے۔

جہاں تک علم و عمل کا تعلق ہے تو حضرت عثمان کے متعلق یہ مذکور ہے کہ "کانَ جَمَعَ بینَ العِلمِ وَالعَمَلِ"، یعنی حضرت عثمان علم و عمل دونوں کے جامع تھے، آپ لکھنا پڑھنا بھی جانتے تھے۔ اسی لئے وحی کے لکھنے والوں میں آپ کا نام بھی تھا۔ احادیث نبوی کے بھی ممتاز حافظ تھے (۱) قرآن سے اتنا شغف تھا کہ ایک ایک رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔

حضرت عثمان کی زبان سیدھی سادی مگر الفاظ منتخب اور مختصر اور معانی و مطالب گہرے ہوتے تھے۔ اندازِ بیان اتنا سلیس اور رواں کہ اپنے مقصد و مطلب کو پوری وضاحت سے سامعین کے دل میں اتار دیتے تھے اس قسم کی تقریروں میں ان کا وہ خطبہ ہے جو انہوں نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد دیا، اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ:

اما بعد فانی قد حُمِلتُ وقد قبلت الاوانی متبع ولست بمبتدع ألا ان لکم علی بعد کتاب اللہ عزوجل و سنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثا: اتباع من کان قبلی فیما اجتمعتم علیہ و سننتم، وسن سنۃ اھل الخیر فیما لم تسنوا عن ملأ۔ والکف الا فیما استوجبتم الاو ان الدنیا خضرۃ قد شھیت الی الناس ومال الیہا کثیرٌ منھم۔ فلا ترکنوا الی الدنیا ولا تثقوا بہا۔ فانہا لیست بثقۃ، واعلموا انہا غیر تارکۃ الا من ترکہا۔"

یعنی میرے اوپر ایک ذمہ داری لادی گئی تو میں نے اس کو قبول کر لیا۔ یاد رکھیے میں (اپنے پیش روؤں) کا پیروی کرنے والا ہوں۔ نئی ریت نکالنے والا نہیں ہوں۔ یاد رکھئے قرآن کریم اور حضور کی سنت کی پیروی کرنے کے بعد آپ کے تئیں میری تین ذمہ داریاں ہیں۔ ایک تو آپ لوگوں نے جن باتوں پر اجماع کر لیا ہے ان میں اپنے پیش روں کی پیروی کرنا، دوسرے اہل خیر کی ڈگر پر چلنا۔ تیسرے (ظلم و زیادتی سے) رک جانا سوائے ان معاملات کے جہاں دخل اندازی ضروری ہو۔ جان لو کہ دنیا بڑی ہری بھری اور لوگوں کو لبھانے والی ہے اور ان میں سے بہت سے لوگ اس کی طرف جھک بھی گئے مگر آپ لوگ نہ دنیا پر بھروسہ کیجئے گا اور نہ اس پر اعتماد، اس لئے کہ وہ قابل بھروسہ نہیں

ہے، اور اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ خود کسی کو چھوڑنے والی نہیں ہے جب تک آدمی خود ہی اس کو نہ چھوڑ دے۔

مذکورہ بالا تقریر میں الفاظ کی شان و شکوہ اور پیشہ ور یا فطری مقررین کی گھن گرج تو نہیں ہے لیکن خوب صورت اور سبک الفاظ کے تانے بانے سے اپنے مقاصد اور مطالب کو پوری خوش اسلوبی اور مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے، اس زمانے کی ریت کے مطابق حکمت و فلسفہ کے گرانقدر جملے بھی کہے گئے ہیں جو سیدھے سادے ہونے کے باوجود بہت گہرے اور وقیع ہیں۔

حضرت عثمان نے شورش کرنے والوں اور فتنہ پردازوں کے سامنے مختلف موقعوں پر بڑی موثر تقریریں کی ہیں، جن میں اپنے موقف کی وضاحت کی ہے اور ان فتنہ پرداز ظالموں کی غلطیوں اور ناانصافیوں کی طرف اشارہ کرکے اپنی پالیسی کو صحیح اور ان کے عمل کو خلاف شرع ظلم پر مبنی اور بیجا قرار دیا ہے۔ ایسے ہی ایک موقع کی تقریر درج ذیل ہے۔ جس کو حضرت عثمان نے ایک بڑی حکیمانہ بات سے شروع کیا ہے، کہا ہے کہ ہر اچھی چیز کے ساتھ کوئی نہ کوئی برائی اور ہر نعمت کیساتھ کوئی نہ کوئی بیماری (دکھ) لگا رہتا ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں۔ چنانچہ اس امت (مسلمہ) کی برائی یا بیماری عیب نکالنے والے اور بدگمانی کرنے والے لوگ ہیں جو ایسی بات تو کہتے ہیں جس کو تم لوگ پسند کرتے ہو۔ مگر ناپسندیدہ باتوں کو چھپا جاتے ہیں۔ اور اس طرح تم لوگ آپس میں خوب بات چیت کرتے ہو یعنی خوب مکوٹ کرتے ہو۔ مگر یہ سب اوباش لوگ ہیں، جن کی مثال ان اونٹوں جیسی ہے کہ پہلے پہل چیخنے والے کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں، ان کے نزدیک محبوب ترین گھاٹ وہ ہے جو دور ہو۔ یا وہ کنواں ہے جس میں بہت کم پانی رہ گیا ہو۔ تم نے ابن الخطاب کے لئے اس سے زیادہ اقرار کیا جتنا تم مجھ سے چڑھے لیکن انہوں نے تمہاری ضرورت کے وقت بری طرح تم کو کھدیر دیا اور ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا اور تم کونکیل پڑے اونٹوں کی طرح جھڑکا اور پھٹکارا۔ خدا کی قسم ان کے مقابلہ میں میری مدد کرنے والے بہت ہی قریب ہیں اور ان کی تعداد بھی بہت ہے۔ اور میں ایسا ہوں کہ اگر میں مدد کے لئے ایک آواز لگا دوں، تو عمر کے مقابلہ میں میری پکار پر دوڑنے والے بہت ہوں گے۔ کیا تم اپنے حقوق میں سے کچھ کو گم شدہ پاتے ہو؟

(یعنی کیا میں نے تمہاری حق تلفی کی ہے؟) تو کیوں نہ میں حق کے معاملے میں جو چاہتا ہوں وہی کروں؟ (اور اگر ایسا نہ کرسکوں تو) تو پھر کیوں امام بنا تھا؟

"ان لکل شیء آفة، وإن لکل نعمة عاهة، وان آفة هذه الامة وعاهة هذه النعمة، عیابون طعانون، یظهرون لکم ما تحبون ویسرون ما تکرهون یقولون لکم وتقولون۔ طغام مثل النعام، یتبعون أول ناعق۔ احب مواردهم الیهم النازح۔ لقد أقررتم لابن الخطاب بأکثر مما نقمتم علیّ۔ ولکنه وقمکم وقمعکم۔ وزجرکم زجر النعام المخزمة۔ واللہ انی لاقرب ناصرا وأعز نفرا، وأقمن إن قلت ان تجاب دعوتی من عمر هل تفقدون من حقوقکم شیئا؟ فما لی لا افعل فی الحق ما أشاء؟ اذا فلم کنت اماما؟". (۱)

اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت عثمانؓ خلفائے راشدین کے حلقہ میں، بحیثیت ادیب اور مقرر کے مشہور نہ تھے۔ لیکن بقدر ضرورت اور جب موقعہ وہ موثر انداز سے سامعین کو مخاطب کرکے مطمئن ضرور کر دیتے تھے۔ اور ایسے موقعوں پر نہ ان کی زبان میں لکنت پیدا ہوتی تھی اور نہ اغراض و مطالب کو صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرنے میں کوئی دشواری پیش آتی تھی

حضرت عثمان کی کل مدتِ خلافت چند دن کم بارہ (۱۲) سال رہی، آپ کی شہادت مدینہ میں ۸۲ (بیاسی) سال کی عمر میں ہوئی :۔

---

(۱) البیان والتبیین للجاحظ

حوالہ جات

(۱) الإصابة فی تمییز الصحابة: علی بن حجر العسقلانی ج ۸
(۲) أسد الغابة فی معرفة الصحابة: علی بن الاثیر الجزری
(۳) طبقات ابن سعد ج ۳ ق اول
(۴) الاستیعاب فی معرفة الأصحاب: ج ۲، ابن عبدالبر اندلسی
(۵) صحیح بخاری مناقب عثمان
(۶) ترمذی مناقب عثمان
(۷) فتح الباری
(۸) مستدرک لحاکم ج ۳
(۹) مسند احمد بن حنبل ج ۱
(۱۰) ابن اثیر ج ۳
(۱۱) فتوح البلدان للبلاذری
(۱۲) تاریخ طبری ج ۲، ۵ و ۶
(۱۳) یعقوبی جلد ۲
(۱۴) ابن خلدون ج ۲
(۱۵) تاریخ الخلفاء للسیوطی
(۱۶) تذکرة الحفاظ ذہبی ج ۱
(۱۷) روضة النظر تذکرہ عثمان
(۱۸) الوسیط فی الادب العربی وتاریخه: احمد الاسکندری ومصطفی عنانی
(۱۹) تاریخ الادب العربی، العصر الاسلامی، ڈ. شوقی ضیف
(۲۰) تاریخ الاسلام حصہ اول: شاہ معین الدین احمد ندوی
(۲۱) خلافت وملوکیت: مولانا ابو الأعلیٰ مودودی
(۲۲) المرتضیٰ: مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی باب پنجم

چوتھے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

پیدائش : ہجرت سے ۲۱ سال پہلے　　　شہادت : ۱۷ رمضان ۴۰ھ

آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی، بچوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے، آپ کے داماد،
غزوہ تبوک کو چھوڑ کر تمام جنگوں میں آپ کے ہم رکاب سپاہی، قلعہ خیبر کو فتح کرنے والے
سورما اور چوتھے خلیفہ راشد، حضرت علیؓ صدر اسلام کی ان ممتاز شخصیات میں سے ہیں جنھوں
نے اس زمانے کے آخیر میں ہونے والی وہ سیاسی اتھل پتھل اور شکست و ریخت نہ صرف دیکھی تھی
بلکہ اس کے دھارے میں ایک فعال شخصیت کی حیثیت سے زندگی گزاری اور ہر موقع پر اس
کی کوشش کی کہ امت مسلمہ کے جسم پر اتنے کاری زخم نہ آجائیں جن کا مداوا مشکل ہو جائے،
چاہے اس راہ میں ان کو اپنے جذبات و احساسات کا کتنا ہی خون کیوں نہ کرنا پڑے اور
خود ان کا جسم چھلنی کیوں نہ ہو جائے اور زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یہ دونوں باتیں ان کی
زندگی میں ہو کر رہیں، وہ خلیفہ ہوئے لیکن شاید توقع کے خلاف بہت بعد میں، اور
ابھی اپنی خلافت کو مضبوط بنیادوں پر مستحکم نہ کر پائے تھے کہ ایک ناپاک سازش کے نتیجہ
میں ایک خارجی نے اپنی تلوار سے ان کے سر کے دو ٹکڑے کر دئے۔ اور اس طرح حضرت
عثمان کے بعد، ایک ناحق خون پھر بڑی بے دردی سے بہا دیا گیا، جس کے بعد اختلاف
اور سیاسی گٹھ جوڑ اور حکومت و سطوت کو حاصل کرنے کی ڈور نے، وہ دروانہ جو
حضرت عثمان کی شہادت سے کھلا تھا اتنا چوڑا کر دیا اور اس کے اثرات اتنے سنگین اور
خطرناک رونما ہوئے جنھوں نے امت مسلمہ کے جسم کو اتنا کھوکھلا اور بے جان کر دیا کہ
خون شہیدانِ کربلا بھی جو حضرت علی ہی کے لخت جگر تھے، اس میں جان اور زندگی
نہ پیدا کر سکا۔ اور اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ پر وہ بدنما دھبہ لگ گیا جو دھو یا نہ جا
سکا اور امتِ مسلمہ کے جسم پر وہ کاری زخم، جس سے آج تک خون رستا رہتا ہے۔
حضرت علی، آنحضرتؐ کے چچا ابو طالب بن عبدالمطلب کے صاحبزادے تھے۔

اور آپ آنحضرتؐ کی پیدائش سے ۳۲ سال بعد ہجرت نبوی سے ۲۱ سال پہلے پیدا ہوئے[1]
حضرت ابو طالب کی مالی حالت اتنی اچھی نہ تھی کہ وہ اپنے پورے کنبہ کی تنہا کفالت کرسکتے
اس لئے آنحضرتؐ کی کوششوں سے ان کے دوسرے چچاؤں نے ان کی اولاد کی کفالت کی
ذمہ داری آپس میں بانٹ لی اور آنحضرتؐ نے حضرت علی کی کفالت کی ذمہ داری سنبھالی
اور ان کی تعلیم و تربیت میں اس طرح سے لگ گئے گویا کہ وہ ان کی اپنی اولاد ہوں۔ چنانچہ
فیض صحبت اور تعلیم نبوی کے اثر سے آپ نہ صرف تیز ذہین، بااخلاق، بامروت، باہمت
اور اولوالعزم بہادر نوجوان بن کر چمکے بلکہ علم و فن اور زبان و بیان میں آنحضرتؐ کے
بعد یکتائے روزگار ادیب و خطیب بن کر تاریخ ادب عربی میں ہمیشہ کے لئے اپنا نام
سنہری حرفوں میں لکھا گئے۔

حضرت علیؓ پر آنحضرتؐ کے پورے اعتماد اور حضرت علیؓ کی آنحضرتؐ سے شدید محبت
کا یہ عالم تھا کہ جب قریشیوں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر آنحضرتؐ نے مدینہ ہجرت کرنے کا
فیصلہ کیا تو حضرت علی کو اپنے بستر پر سلا دیا۔ اس عالم میں کہ گھر کے باہر قریشی نوجوان ننگی
تلوار بس لئے آنحضرتؐ کی شمع حیات کو ہمیشہ کے لئے بجھا دینے کے عزم کے ساتھ صبح ہونے کے موقع کا
انتظار کر رہے تھے۔ مگر حضرت علی بھی بغیر انجام کی پرواہ کئے اطمینان سے تلواروں کے
سائے میں لیٹ گئے، اور آنحضرت قریشیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے اطمینان
سے گھر سے نکل کر راہ ہجرت پر حضرت ابو بکر کی معیت میں روانہ ہو گئے، صبح کو جب قریشیوں
کو ہوش آیا اور بجائے آنحضرتؐ کے حضرت علی کو گھر میں پایا تو کف افسوس مل کر رہ گئے
فوراً ان کا پیچھا کیا۔ لیکن قدرت کا فیصلہ نافذ ہو چکا تھا، آنحضرتؐ کا قافلہ بڑھتا
گیا، اور مکے والے نامراد واپس آگئے۔ اور اس طرح حضرت علی نے اسلام کے ایک کٹھن
مرحلہ اور نازک موڑ پہ اپنی جان کی بازی لگا کر اس کو عمر جاوداں بخش دی۔

پھر مدینہ پہونچنے کے بعد آنحضرتؐ اور مسلمانوں کو غزوۂ خیبر کے موقعہ پر تمام کوششوں
کے باوجود کامیابی ہوتی نہیں نظر آرہی تھی۔ تو آپ نے جھنڈا حضرت علی کے ہاتھ میں

---

(۱) دیکھئے الامام علی بن ابی طالب، مؤلفہ عبد الفتاح عبد المقصود۔ اردو میں خلفائے راشدین مطبوعہ دار المصنفین اعظم گڈھ
۲۔ الوسیط فی الأدب العربی: احمد الاسکندری و مصطفی عنانی۔ ۳۔ تاریخ الأدب العربی: احمد حسن الزیات

دیا اور اپنی دعاؤں کے ساتھ مہم پھر روانہ کی، اور آپ نے قلعہ خیبر کے دروازے کو جسے بیس آدمی اٹھاتے تھے پھینک دیا اور اسلامی فوج نے داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا اور یہودی سازشوں کے فتنہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جاں بازوں اور بہادروں سے مدینہ کے خالی ہو جانے کے بعد آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ ہی کو مدینہ کا نگہبان اور یہاں اپنا خلیفہ بنایا، اور وہ تاریخی جملہ کہا جس نے حضرت علیؓ کی شخصیت کو انبیأ کا ہم پلہ بنا دیا۔ آپ نے فرمایا اَنْتَ مِنِّی بمنزلہ ھارون من موسیٰ اِلَّا اَنَّہٗ لا نبیّ بعدی۔ "یعنی میرے نزدیک تمہاری وہی حیثیت ہے جو ہارون کی حضرت موسیٰ کے ساتھ تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ زندگی بھر حضرت علیؓ آنحضرتؐ کے دکھ، سکھ خوشی و غمی اور مصائب و مشکلات میں اس طرح ساتھ رہے تھے کہ آنحضرتؐ کے دل کی گہرائیوں میں جا بسے تھے، اسی لیے جب آنحضرتؐ حجۃ الوداع کے لیے جا رہے تھے تو مسلمانوں سے کہا تھا "من کنتُ مولاہ فعلیٌّ مولاہ، اللّٰھم والِ من والاہ وعادِ من عاداہ"۔ یعنی میں جس کا مولا ہوں تو علی بھی اس کے مولا ہیں، اے خدا تو بھی اس شخص کو دوست رکھ جو اس کو (علی کو) دوست رکھے اور اس سے دشمنی رکھ جو اس سے (علی) سے دشمنی رکھے۔ اور اس طرح حضرت علیؓ نے آنحضرتؐ کے نورِ دیدہ بن کر ساری عمر آپ کے سایہ عاطفت میں گزار کر دونوں جہاں کی دولت سمیٹ لی۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد قاتلوں سے قصاص لینے کے بہانے پوری مملکت میں فتنہ و فساد اور ہنگامہ کا وہ بازار گرم ہو گیا جو کسی کے روکے نہ رکتا تھا اور انہیں ہنگامی حالات میں حجاز اور دوسرے علاقوں کے لوگوں نے حضرت علیؓ کو امت کا خلیفہ منتخب کر لیا اس انتخاب میں انصار و مہاجرین کے علاوہ قاتلین عثمانؓ کے اصرار اور کوشش کا بڑا دخل تھا۔ قاتلین عثمانؓ اور ہنگامہ کرنے والوں نے تو اس خیال سے کہ وہ اپنے جرم کی سزا پانے سے شاید بچ جائیں اور مہاجرین و انصار نے یہ سوچا کہ ان سنگین حالات میں قوم کو ایک باصلاحیت، دور بین و جزرس، مدبر اور ایک متقی پرہیزگار اور عادل و انصاف پرور سربراہ مملکت مل جائے جو ان پر آشوب حالات میں ملک و ملت کی کشتی کو پار لگا دے۔

حضرت علی کے ہاتھ پر ۳۵ھ/۱۱/جولائی ۶۵۵ء کو ملک وملت کی اکثریت نے بیعت کرلی لیکن بنوامیہ نے حضرت معاویہ کی سرکردگی میں، جو اس وقت شام کے گورنر تھے، حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کردیا اور یہ مطالبہ کیا کہ حضرت عثمان کے خون کا پہلے بدلہ لیا جائے، اپنے اس مطالبہ میں انھوں نے طلحہ بن عبید اللہ اور زبیر بن العوام کو بھی اپنے ساتھ ملالیا، یہ دونوں ام المومنین حضرت عائشہ کے پاس گئے اور ان کو بھی پہلے قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے کے لئے قائل کرلیا، اور یہ درخواست کی کہ وہ ہنگامہ کرنے والوں سے مل کر سب سے پہلے حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص لینے کا مطالبہ کریں۔ ادھر حضرت علی کا کہنا یہ تھا کہ پہلے آپ لوگ میرے ہاتھ پر بیعت کرکے مجھے خلیفہ تسلیم کرلیجئے تب قانونی طور سے قصاص کا مطالبہ کیجئے، مگر ان لوگوں نے بات نہ مانی اور کھلم کھلا مخالفت شروع کردی جس کے نتیجہ میں جنگِ جمل ٹھن گئی، جس میں ایک طرف حضرت معاویہ کے ہمنوا البصرہ کے باغی، طلحہ اور الزبیر بن العوام اور حضرت عائشہ تھیں، اور دوسری طرف حضرت علی اور ان کے پیرو اور ساتھی۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا، جس میں طلحہ مارے گئے اور حضرت عائشہ کے اونٹ کا پاؤں کٹ گیا اور حضرت علیؓ کے مخالفین کی بھی ایک بڑی تعداد کام آئی۔ حضرت علی اس معرکہ میں کامیاب وکامران ہوئے، اور سب باغی گرفتار ہوکر لائے گئے۔ لیکن حضرت علی نے سب کو معاف کردیا اور میدانِ جنگ میں جو ساز وسامان چھوڑ کر بھاگے تھے، انھیں اٹھوا کر مسجد میں جمع کرادیا اور اعلان کرادیا کہ لوگ اپنی چیزیں پہچان کرلے جائیں۔ چنانچہ لوگ اپنی چیزیں لے گئے۔

لیکن بات حضرت علی کی اس کامیابی سے بھی نہ بنی۔ کیوں کہ حضرت معاویہ اور ان کے حامی شامی مستقل قصاص لینے کے لئے اب بھی ہنگامہ کئے ہوئے تھے۔ انھیں حالات میں عرب کے مشہور سیاسی گھاگ عمرو بن العاص بھی حضرت معاویہ کا ساتھ اس شرط پر دینے پر تیار ہوگئے کہ انھیں عمر بھر کے لئے مصر کی گورنری لکھ دی جائے حضرت معاویہ کے لئے یہ سودا بہت ہنگا نہ تھا، چنانچہ وہ راضی ہوگئے اس لئے کہ انکی دور بین نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ اگر عمرو بن العاص جیسا آدمی ساتھ ہوجائے تو خلافت کا پانسہ ان کے حق میں آسانی سے پلٹ سکتا ہے۔ اس گٹھ جوڑ کے بعد بظاہر شامیوں

میں متردد لوگوں کو مطمئن کرنے کے خیال سے حضرت معاویہ نے حضرت علی کو ایک خط لکھا جس میں بہت سختی سے مطالبہ کیا کہ قاتلین عثمان کو ان کے حوالہ کر دیں، وہ جانتے تھے کہ اس مرحلہ پر قاتلوں کو حوالہ کرنا آسان کام نہیں ہے اور یہی بہانہ بن جائے گا، حضرت علی سے آخری فیصلہ کرنے کا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ حضرت علی نے بڑے ٹھنڈے دل سے ان کے خط کا جواب دیا، جس میں ان سے پہلے بیعت کرنے کا مطالبہ کیا، ظاہر ہے حضرت معاویہ، نے ان کی یہ بات نہ مانی اور نامہ و پیام کا کام ختم ہو گیا۔ اور یہیں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس وقت دو پارٹیاں ہیں ایک حضرت معاویہ کی قیادت میں شامیوں کی اور ایک حضرت علی کی قیادت میں کوفیوں اور اکثر اہل حجاز کی اور دونوں محض اپنی خلافت و حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، حضرت علی اس اعتبار سے کہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی گئی تھی اور حضرت معاویہ اس اعتبار سے کہ ان کے ہاتھ میں خلافت کے علاوہ سیاسی گٹھ جوڑ کی صلاحیت زیادہ تھی۔ اور وہ پہلے سے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت اپنا کام کر رہے تھے۔

غرض کہ جب حضرت معاویہ اور حضرت علی میں بات چیت سے صلح صفائی کی بات نہ بنی تو پھر فیصلہ میدان کارزار میں ہی ہونا تھا اور وہی ہوا۔ حضرت معاویہ نے جنگ کا بگل بجا دیا۔ چنانچہ حضرت علی بھی اپنی فوج لے کر روانہ ہوئے، جب صفین کے مقام پر پہونچے تو دیکھا کہ حضرت معاویہ اپنی فوج لئے وہاں پہلے ہی سے نہ صرف موجود ہیں کہ بلکہ دریائے فرات پر اس طرح اپنی فوج اتار رکھی ہے کہ حضرت علی اور ان کی فوج کو پانی نہ مل سکے اور یہ لوگ پیاسوں ہی مر جائیں، چنانچہ اس بات پر سخت جھگڑا ہوا یہاں تک کہ تلواریں نکل آئیں، اور آخر میں حضرت علی کو اس معاملہ میں فتح ہوئی اور ان کی فوج نے گھاٹ پر قبضہ کر لیا، اور حضرت معاویہ کی فوج کو پانی لینے سے منع کر دیا، لیکن حضرت علی نے حضرت معاویہ کی فوج کو بھی پانی سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی کہ اللہ نے دریا بلا تفریق سب کے فائدہ کے لئے جاری کئے ہیں۔ اس موقعہ پر بھی صلح صفائی کی بات ہوئی لیکن کامیابی نہ ہوئی اور دونوں فریق اپنی بات پر اڑے رہے۔ چنانچہ جنگ کا بگل بج گیا اور فریقین ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے، اور معرکہ کارزار گرم ہو گیا۔

دو دن تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی، تیسرے دن شامیوں کے پاؤں اکھڑنے

لگے اور قریب تھا کہ وہ بھاگ کھڑے ہوتے کہ عمرو بن العاص کو ایک نئی ترکیب سوجھی انھوں نے سپاہیوں سے کہا کہ قرآن کو اٹھا کر آواز لگاؤ کہ جنگ جدال بند، اور قرآن کے فیصلہ پر عمل۔ قرآن کا نام سنتے ہی دونوں طرف خوں آشام تلواریں جھک گئیں لیکن حضرت علی کی فوج میں اچھی خاصی تعداد اس موقعہ پر اس طرح سے فوراً جنگ بندی کے حق میں نہ تھی، وہ سمجھ گئے تھے کہ شامیوں میں اب مقابلہ کی طاقت نہیں رہی ہے، اسی لیئے یہ چال چلی گئی ہے۔ حضرت علی بھی اس چال کو سمجھ گئے تھے لیکن اس خیال سے کہ قرآن کے فیصلہ پر عمل کرنے کی دعوت کو ٹھکرانے سے فوج میں سورش اور فتنہ برپا ہوسکتا ہے، جنگ بندی پر تیار ہوگئے اور اس کے بعد اپنا ایلچی حضرت معاویہ کے پاس بھیجا کہ قرآن کے اس طرح اٹھانے اور اس کے مطابق فیصلہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ حضرت معاویہ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے آدمیوں میں سے ایک آدمی کو حکم متعین کریں، اور ہم اپنے آدمیوں میں سے ایک کو۔ پھر یہ دونوں ایک جگہ بیٹھ کر قرآن کی روشنی میں ہمارے اختلافات کے بارے میں فیصلہ کریں اور وہ فیصلہ ہم دونوں تسلیم کرلیں۔ حضرت علی کو چوں کہ اس تجویز سے انشراح صدر نہ تھا اس لئے وہ دل سے اس کے حق میں نہ تھے، لیکن ان کی فوج میں سے بعض کے کہنے اور ایک شخص الاشعث بن قیس الکندی اور اس کے یمنی سائھیوں کے شدید اصرار سے بادل ناخواستہ جنگ بند کرنے اور قرآن کی روشنی میں ثالثی کی اس تجویز کو ماننے کے لئے تیار ہوگئے۔ چنانچہ جب ان کی طرف سے حکم کی نامزدگی کا سوال آیا تو پھر الکندی نے اصرار کرکے ابوموسیٰ اشعری کو حضرت علی کی طرف سے حکم مقرر کرایا (۱)

---

(۱) روایت ہے کہ الاشعث الکندی آنحضرتؐ کی زندگی میں مسلمان ہوا تھا، لیکن جب آپ کی وفات ہوئی تو پھر مرتد ہوگیا (اسلام سے پھر گیا) ارتداد کے بعد جب جان کا خطرہ ہوا تو پھر بادل ناخواستہ مسلمان ہوگیا یہ شروع میں حضرت علی کی طرف سے فارس کے بعض علاقوں کا گورنر رہ چکا تھا، لیکن جب حضرت علی نے شامیوں سے نپٹنے کی سوچی تو اس کو اس کے عہدہ سے معزول کردیا کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ الکندی دل سے ان کا مخلص نہیں ہے کہ ایک دفعہ کوفہ میں ایسے ہی ایک موقعہ پر اس نے ان کو دھوکہ دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ الکندی دل سے شامیوں کی طرف تھا اور اس نے ہی عمرو بن العاص سے مل کر یہ سازش رچی تھی کہ اگر شامی ہارنے لگیں تو قرآن کو بلند کرکے اس کی ثالثی کی آواز لگائی جائے اور پھر دو حکم مقرر کیئے جائیں اور ان کے فیصلہ کو قطعی اور آخری فیصلہ مان کر سب اس پر عمل کریں۔

حضرت معاویہ نے عمرو بن العاص کو اپنی طرف سے حکم مقرر کیا۔ جو انتہائی چالاک اور گھاگ آدمی تھے' ان کے مقابلہ میں ابوموسیٰ اشعری بہت سیدھے سادے مرنجا مرنج اور نرم طبع قسم کے آدمی تھے۔

اس طرح دونوں حکموں کی نامزدگی کے بعد حضرت علی اپنی عراقی فوج لے کر کوفہ واپس آگئے اور حضرت معاویہ اپنی فوج لے کر شام واپس چلے گئے۔ اور دونوں نے جنگ بندی اور ثالثی کے معاہدہ پر دستخط کر دئیے۔

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا حضرت علی کی فوج میں ایک اچھی خاصی تعداد لوگوں کی اس تجویز کی مخالف تھی کیوں کہ وہ لوگ حضرت علی کو ہی حق پر اور متفقہ طور سے منتخب خلیفہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ جنگ بندی کی یہ تجویز اس وقت آئی جب شامیوں کی جنگ میں ہار ہونے لگی اور ان کے پاؤں اکھڑنے لگے تھے۔ اس لیے حضرت علی برحق اور متفقہ طور سے منتخب خلیفہ ہیں اور اب سوائے اللہ کے حکم کے کسی اور کا حکم نافذ نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں ان کی دلیل قرآن کی وہ آیت ہے جس میں آتا ہے کہ "اِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا، فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا، فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ، فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ، وَاَقْسِطُوْا، اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔

"اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کر دو' پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو۔ جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو' اور انصاف کا خیال رکھو۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف والوں کو پسند کرتا ہے مسلمان سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان اصلاح کر دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔ تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔"

چنانچہ انھوں نے اعلان کر دیا کہ معاویہ باغی ہیں کیوں کہ انھوں نے متفقہ طور سے منتخب خلیفہ کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے اور اس مسئلہ میں قرآن کا حکم یہ ہے کہ معاویہ اور ان کے حامیوں سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک کہ وہ اللہ کے

فیصلہ کو مان نہ لیں اور اس طرح تاریخ اسلام میں پہلی دفعہ "فرقہ خوارج" یعنی عام شاہ راہ سے ہٹے ہوئے لوگوں کی جماعت" پیدا ہوئی جو ایمان وعقیدہ میں تو بہت پختہ مسلمان تھے لیکن انتہائی سخت بے رحم سنگ دل اور ناعاقبت اندیش لوگ"۔

حضرت معاویہ کو اس طرح ناحق پر اور حضرت علی کو حق پر ہونے کی بات طے کرنے کے بعد یہ خارجی جن کی تعداد بعض مورخین کے نزدیک ۱۲ ہزار کے قریب تھی ایک جگہ "حروراء" میں جمع ہوئے اور اپنا ایک ایلچی حضرت علی کے پاس بھیجا اور کہلایا کہ آپ پھر سے حضرت معاویہ اور ان کے ساتھیوں سے جنگ شروع کیجیے ہم آپ کا ساتھ دیں گے لیکن حضرت علی نے اس موقعہ پر معاہدہ شکنی مناسب نہ سمجھی بلکہ دونوں حکموں کے فیصلہ کا انتظار کرنا مناسب سمجھا کہ اگر وہ قرآن کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں تو بہت اچھا ورنہ شامیوں سے پھر جنگ شروع۔ یہ بات خارجیوں نے نہیں مانی، بلکہ حضرت علی کو منصب خلافت سے معزول کر دیا اور ان کے کفر کا فتویٰ دے دیا۔ اسی طرح حضرت معاویہ کو بھی کافر ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس طرح دونوں سربراہوں کو کافر بنا کر ان دونوں سے جنگ کرنے کا جواز نکال لیا۔ اور ان سے جنگ کرنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

ادھر دونوں حکموں نے ایک دن دومۃ الجندل میں اور ایک دن مقام اَذْرُح میں، معاہدہ کے مطابق فیصلہ کرنے کے لئے اپنی میٹنگ کی، میٹنگ کی نگرانی اور فیصلہ کا انتظار کرنے کے لئے حضرت علی کے حامیوں میں سے چار سو آدمی اور حضرت معاویہ کے حامیوں میں سے چار سو شامی مقام اجتماع میں اکٹھا ہو گئے اور آپس میں تو تو میں میں کرنے لگے بات بڑھنے والی تھی کہ اتنے میں دونوں حکم کمرہ سے باہر نکلے اور اعلان کیا کہ ہم دونوں نے ایک ایسا فیصلہ کیا ہے کہ جس سے سب مسلمان متفق ہو جائیں گے۔ پھر عمرو بن العاص نے ابو موسیٰ اشعری کو آگے بڑھا کر کہا کہ آپ ہم دونوں کے متفقہ فیصلہ کا اعلان فرمایئے۔

چنانچہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کھڑے ہوئے، خدا کی حمد و ثنا کی اور اعلان کیا کہ ہم دونوں نے متفقہ طور سے حضرت علی اور حضرت معاویہ دونوں کو معزول کر دیا ہے اور طے کیا ہے کہ اب اس مسئلہ کو عام مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا جائے کہ وہ باہمی مشورہ سے اس مسئلہ کو حل کر لیں اور جس کو چاہیں اپنا خلیفہ منتخب کر لیں،

اس کے بعد عمرو بن العاص کھڑے ہوئے اور اللہ کی حمد و ثناء کے بعد کہا کہ انھوں نے (ابوموسی اشعری) اپنے موکل (حضرت علی) کو معزول کر دیا ہے، میں بھی ان کو معزول کرتا ہوں، لیکن اپنے مؤکل (حضرت معاویہ) کو منصب خلافت پر برقرار رکھتا ہوں اس طرح انھوں نے انتہائی چالاکی سے دونوں کے درمیان طے شدہ معاہدہ کو ٹھکرا کر حضرت معاویہ کے حق میں پوری دیدہ دلیری کے ساتھ فیصلہ کر دیا اور ابوموسی اور حضرت علی کے ساتھی منہ دیکھتے رہ گئے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے یہ ہوا کہ کسی نے ان کی بات نہ مانی اور امت مسلمہ میں پہلے سے زیادہ اختلاف اور انشقاق پیدا ہو گیا۔ جو حضرت معاویہ کے حق میں یوں مفید ہوا کہ ان کو خلافت کی سند مل گئی اور اب انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے حضرت علی سے آخری بار جم کر نمٹنے کی غرض سے تیاریاں شروع کر دیں۔

دوسری طرف حضرت علی کی صف میں خارجیوں کے فیصلہ سے جو اختلاف اور انشقاق پیدا ہو گیا تھا وہ اب اور بڑھ گیا اور حضرت علی ایک ایسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے کہ ان کے کیے کچھ نہیں بن پڑتا تھا۔

ادھر خوارج نے اس صلح کی ناکامی کے بعد سارے علاقے میں ادھم مچادی اور لوٹ مار قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم کر دیا جس کی وجہ سے کسی کی جان و مال اور آبرو بچنی مشکل ہو گئی، حضرت علی نے کوشش کی کہ ان کو صحیح صورت حال سے آگاہ کر کے پھر ان کو اپنی فوج میں شامل کر کے شامیوں سے مقابلہ کے لئے تیار کریں، لیکن انھوں نے حضرت علی کی ایک نہ سنی، اور اپنی فوج لے کر مقام نہروان میں جمع ہو گئے اور حضرت علی کو دعوت مبارزت دی، اب حضرت علی کے لئے سوائے مقابلہ کے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ایک لشکر جرار ترتیب دیا اور ان سے اس مقام پر نبرد آزما ہوئے، دونوں طرف کے سپاہیوں نے جان کی بازی لگا دی، مگر حضرت علی کا پلہ بھاری رہا، اور ان کی فوج نے خارجیوں کی ایک بڑی تعداد کو تہ تیغ کیا جن میں اکثریت کوفہ اور بصرہ کے لوگوں کی تھی۔ اس طرح خارجیوں کی قوت اور طاقت تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی لیکن اس شکست فاش سے کوفہ اور بصرہ کے باشندے حضرت علی سے اتنے کبیدہ خاطر ہوئے اور اتنے چڑھے کہ انھوں نے بھی حضرت علی کا ساتھ اس انتہائی نازک مرحلہ پر چھوڑ دیا اور اب حضرت علی ایک ایسی مصیبت میں پھنس گئے جس سے نکلنے کے سارے راستے مسدود

نظر آنے لگے۔

حضرت معاویہ نے اس موقعہ سے پورا فائدہ اٹھایا: عمرو بن العاص کو طے شدہ پالیسی کے مطابق مصر کی گورنری بخشی، ادھر عراق کے علاقہ میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا۔ اور اس طرح حضرت علی کے لئے دوہری مصیبت کھڑی ہو گئی اور حالت یہ ہوئی کہ حضرت علی کو فیوں کو شامیوں سے جنگ کرنے کے لیے بلاتے تو کوئی ان کی بات نہ سنتا، انھوں نے بہت شعلہ بار تقریریں کیں ہر طرح سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی، چنانچہ ایک دفعہ غصے میں یہاں تک کہا کہ اے زخو میں تم کو ان شامیوں سے لڑنے کے لیے گرمی کے زمانے میں بلاتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ اتنی شدید گرمی میں ہم کیسے لڑیں، ذرا گرمی کم ہونے دیجئے تو ہم ان سے نپٹ لیں گے، اور جب سردیوں میں لڑنے کیلئے کہتا ہوں تو کہتے ہو کہ ہائے غضب کی سردی ہے، ذرا تو ٹھنڈک کو کم ہونے دیجئے اس کے بعد بڑے دکھ سے کہتے تھے کہ خدا کی قسم اگر تم لوگ سردی و گرمی سے اس قدر گھبراتے ہو تو تم تلواروں سے اس سے زیادہ گھبراؤ گے میری تمہارے مقابلہ میں یہ بے کسی اور تمہاری نااہلی اور نافرمانی دیکھ کر قریش کے لوگ کہتے ہیں کہ علی بلاشبہ بہت بہادر آدمی ہیں لیکن ان میں حکمت و تدبر کی کمی ہے۔ خدا کی قسم بات یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ جس آدمی کی اطاعت نہ کی جائے نہ اس کی رائے کی کوئی وقعت ہوتی ہے اور نہ تدبر و تدبیر کی۔ غرضکہ حضرت علیؓ کی زندگی اپنے ہی ساتھیوں اور ان کوفیوں کی بے عملی، عدم تعاون اور وعدہ خلافی کی وجہ سے بہت تکلیف دہ اور پریشان کن ہو گئی تھی اور مستقبل مجہول اور انجام غیر یقینی دکھائی دے رہا تھا۔

ان مایوس کن اور تکلیف دہ حالات میں بھی حضرت علی نے ہمت نہ ہاری، انھوں نے پھر سے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور ایک بہت مؤثر اور شعلہ بار تقریر کی جس سے دوبارہ ان کی رگ حمیت اور دلوں میں گرمی اور جسموں میں جان آ گئی اب انھوں نے شامیوں سے آخری اور فیصلہ کن مقابلہ کے لیے فوج کی ترتیب شروع کی

ادھر خارجیوں نے حضرت علی اور حضرت معاویہ کی تکفیر کے بعد یہ سازش کی کہ امت کے درمیان اس اختلاف کو دور کرنے کی غرض سے جھگڑے میں ملوث تینوں اشخاص یعنی حضرت علی، حضرت معاویہ، اور عمرو بن العاص کو قتل کر دیا جائے، چنانچہ ان لوگوں نے عبدالرحمن بن ملجم الحمیری کو حضرت علی کو قتل کرنے کے لیے، حجاج بن عبداللہ الضریمی کو

حضرت معاویہ کو قتل کرنے کے لیے اور عمرو بن بکر التمیمی کو عمرو بن العاص کو قتل کرنے کیلئے مقرر کیا' اور اس کام کو ایک ہی ساتھ ایک ہی وقت اور ایک ہی دن میں پورا کرنے کیلئے یہ طے کیا کہ سترہ رمضان المبارک ۴۰ھ کی صبح کو جب یہ تینوں نماز فجر کے لئے نکلیں تو ہر ایک پر مقرر شدہ آدمی اس پر حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مگر ہوا یہ کہ حضرت معاویہ پر عبداللہ کا وار اوچھا پڑا اور وہ صاف بچ گئے۔ عمرو بن العاص طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اس دن فجر کی نماز کے لئے نکلے ہی نہیں' حضرت علی حسب معمول کوفہ کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے نکلے ابن ملجم تاک میں تھا' اس نے آپ کی پیشانی پر تلوار کا ایسا سخت وار کیا کہ تلوار پیشانی کو چیرتی ہوئی دماغ تک اتر گئی اور اس طرح زبان حق یہ کہتی ہوئی خاموش ہو گئی کہ "فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ، وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ" یعنی جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا اسے دیکھے گا اور جو ذرہ برابر بھی برائی کریگا اسے دیکھے گا اور اس طرح بہادری و شجاعت حق و صداقت' صبر و استقامت' زہد و تقویٰ اور فصاحت و بلاغت کا یہ مثالی پیکر ایک ناپاک سازش کی نذر ہو گیا۔ حضرت علی کی مدتِ خلافت ۴ سال اور ۹ مہینے رہی۔

امتیازی خصوصیات :

تمام تذکرہ نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت علی آنحضرتؐ کے بعد اسلامی تاریخ میں ہر اعتبار سے ممتاز اور مثالی شخصیت تھے۔ جسمانی اعتبار سے بہت خوبرو تندرست و توانا آدمی تھے۔ بہادری کا یہ عالم تھا کہ جنگ میں جس طرف نکل جاتے کشتوں کے پشتے لگا دیتے قوت و طاقت کا یہ عالم تھا کہ قوی ترین شہ سوار کو پکڑ کر اس کے گھوڑے کی پیٹھ پر سے اس طرح ہوا میں اچھال کر زمین پر پٹک دیتے تھے کہ جیسے وہ کوئی ہوا ہو اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ جب در خیبر کو کوئی سر نہ کر سکا تو یہ مشکل کام حضرت علی کی قوت اور شجاعت ہی کی بدولت انجام پایا' اس لئے "حیدر کرار" کہلائے۔

حضرت علی کی نشو و نما اور تربیت آنحضورؐ کے سایہ عاطفت میں ہوئی تھی۔ اس لئے اپنے زمانے میں علم و فن' حکمت و فلسفہ اور زہد و تقویٰ میں وہ امتیازی شان

رکھتے تھے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ دنیا اور دنیاوی چیزوں سے گویا نفرت سی تھی خلیفہ ہونے کے باوجود ایک انتہائی معمولی گھر میں رکھتے تھے اور مالداری کے مقابلہ میں غریبی کو ترجیح دیتے تھے، تعیش کی زندگی گزارنے کے اب مواقع میسر تھے لیکن وہ اکثر سوکھی روٹی کھاکر گزارہ کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز مشہور بزرگ اور متقی پرہیزگار اموی خلیفہ کہا کرتے تھے کہ "دنیا میں سب سے بڑے زاہد علی بن ابی طالب تھے"۔ حضرت علی کہا کرتے تھے کہ "اے اللہ کے بندو، میں تمہیں اس دنیا سے ترک تعلق کی وصیت کرتا ہوں جو تم کو خود ہی چھوڑ دے گی اگر چہ تم اس کے چھوڑنے کو پسند نہ کرو، اور جو تمہارے جسموں کو کھوکھلا کرکے رکھ دے گی اگر چہ تم ان کی تجدید کی خواہش کرتے ہو۔ دنیا سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ شدت تاثر سے دنیا کو مخاطب کرکے آبدیدہ ہوکر فرمایا کرتے تھے " یادنیا غري غيري" یعنی اے دنیا میرا پیچھا چھوڑ دے دوسروں کو دھوکہ دے، رحم دلی، انسانیت اور شرافت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اپنی فوج کو حکم دے رکھا تھا تم پر کتنی ہی زیادتی کیوں نہ کی گئی ہو، تم کتنے ہی غصہ اور طیش میں کیوں نہ ہوں لیکن بھاگتے ہوئے دشمن کو کبھی قتل نہ کرنا کبھی زخمی دشمن کو بغیر طبی مدد دئے نہ چھوڑنا، اور نہ کبھی کسی دشمن کے کپڑے اتار کر ننگا کرنا اور نہ اس کا مال وسامان لینا۔ آپ کی طبیعت کی نرمی اور رحم دلی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے جنگ جمل میں قتل ہونے والے اپنے دشمنوں کی نماز جنازہ ادا کی اور ان کے لئے خدا سے مغفرت کی دعا مانگی جنگ صفین میں شامیوں نے فرات کے پانی پر قبضہ کرکے حضرت علی اور ان کی فوج کو پانی سے محروم کرکے پیاسوں مارنے کی سازش کرلی تھی، حضرت علی اور ان کی فوج نے ان پر حملہ کرکے پانی سے بے دخل کرکے ان کو اس حالت میں کردیا کہ اب وہ خود ہی بغیر پانی کے پیاسوں مرجاتے لیکن حضرت علی کی انسانیت اور انسانی دوستی اور رحم دلی نے یہ گوارہ نہ کیا کہ ان کے بھائی اگر چہ ان کے خونی دشمن تھے، پیاسوں مرجائیں، اس لئے پانی پر قبضہ کرنے کے بعد عام اجازت دے دی کہ وہ لوگ بھی پانی سے اسی طرح مستفید ہوں جس طرح وہ مستفید ہورہے ہیں اور یہ ہے صحیح بہادر آدمی کی پہچان کہ جب اس کو اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل ہو تو وہ انھیں پوری فراخ دلی کے ساتھ معاف کردے۔

تمام نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ صرف صدر اسلام میں ہی نہیں بلکہ شاید

پوری تاریخ ادب میں آنحضرتؐ کے بعد حضرت علی سب سے بڑے ادیب اور مقرر تھے اور اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فن خطابت میں تمام عربوں کے امام تھے۔

حضرت علی کے نثری شہ پارے تین قسم ہیں:۔

(۱) تقریریں اور احکامات (۲) خطوط و نوٹس (۳) اور پند و نصائح و عقل و دانش کے مقولے۔ آپ کے شہ پاروں کے ان تینوں قسموں کو کتاب "نہج البلاغۃ" میں جمع کر دیا گیا ہے۔

نہج البلاغۃ :

"نہج البلاغۃ" کو الشریف الرضی نے ترتیب دیا ہے' اس کام کو اس نے ۱۰۰۹ء مطابق ۴۰۰ھ میں اسی ترتیب سے مکمل کیا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا' اور کہا ہے کہ میں نے ان تینوں قسموں کو الگ الگ ابواب میں جمع کر دیا' لیکن ہو سکتا ہے کہ جو کچھ میں نے جمع کیا ہے اس میں ترتیب و تبویب کی وہ خوبی نہ ملے جو ہونی چاہیے۔۔۔۔ الخ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کتاب کے مضامین میں تاریخی تسلسل مفقود ہے جس کی مدد سے ہر خطبہ اور کلام کو کہنے کے سبب کو جانا۔ یا اس تاریخی واقعہ کی روشنی میں دیکھا جا سکے جس کے بعد اسے موصوف نے کہا تھا۔

مگر علماء اور نقادوں میں اس بارے میں شدید اختلاف ہے کہ نہج البلاغۃ میں جو مضامین، تقریریں اور مقولے حضرت علی کے نام سے جمع کئے گئے ہیں وہ واقعی ان کے ہی کہے ہوئے ہیں یا ان کے جمع کرنے والوں نے اپنی طرف سے گڑھ کر ان کے نام سے اس کتاب میں منسوب کر دئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ڈاکٹر شوقی ضیف نے اور حنا الفاخوری نے جو کچھ لکھا ہے اختصار کے ساتھ اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

شوقی ضیف کہتے ہیں کہ حضرت علی نے بہت سی تقریریں اپنی یادگار چھوڑی ہیں لیکن ان سے وہ تقریریں (خطب) مراد نہیں ہیں، جو کتاب "نہج البلاغۃ" کی دونوں دفتیوں کے بیچ میں ملتی ہیں(۱) کیوں کہ ان کی اکثریت من گھڑت ہے اور حضرت علی کی طرف منسوب کردی

---

(۱) "دونوں دفتیوں کا بیچ" عربی کا محاورہ ہے جس کے معنی کتاب کے ہوتے ہیں۔

گئی ہیں، اس بات کی طرف بہت سے علماء نے اشارہ بھی کیا ہے، پھر ان علماء میں اس بات پر اختلاف ہے کہ (جمع کرنے کا) یہ کام الشریف المرتضی متوفی ۴۳۶ھ نے کیا ہے یا یہ کام اس کے بھائی الشریف الرضی متوفی ۴۰۶ھ نے سرانجام دیا۔ چنانچہ ابن خلکان نے اپنی کتاب وفیات الاعیان میں اول الذکر کا تذکرہ لکھتے ہوئے کہا ہے کہ "لوگوں کے درمیان کتاب "نہج البلاغۃ" کے بارے میں جو امام علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے کلام کا مجموعہ ہے اختلاف ہے اس نے (یعنی الشریف المرتضی) اس کو جمع کیا ہے یا اس کے بھائی الرضی نے اسے جمع کیا ہے، اور کہا گیا ہے کہ وہ (حضرت علی) کا کلام نہیں ہے بلکہ اس آدمی کا کلام ہے جس نے اسے جمع کیا ہے اور ان کی طرف منسوب کر دیا ہے"

اسی بات کو الیافعی نے مرآۃ الجنان میں اور ابن العماد نے "شذرات الذہب" میں دہرایا ہے۔ (۱) الذہبی نے میزان الاعتدال میں اس بات کو زور دے کر کہا ہے کہ شریف المرتضی ہی وہ شخص ہے جس نے اس کو (نہج البلاغۃ) وضع کیا ہے (۲) ابن حجر العسقلانی نے بھی لسان المیزان میں انھیں کے نقطۂ نظر کو اپنایا ہے وہ کہتے ہیں "جو شخص بھی "نہج البلاغۃ" کا مطالعہ کرے گا وہ پورے وثوق سے کہہ دے گا کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جھوٹی تھوپی ہوئی چیز ہے، کیوں کہ اس میں سیدین ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما پر کھلی ہوئی گالی موجود ہے اور ان کی بے عزتی کی باتیں ہیں، اس میں ایسا تناقض (یعنی ایک بات کہنے کے بعد دوسری جگہ اسی کے خلاف بات کہنا) اور اتنی رکیک چیزیں اور معیار سے گری ہوئی چیزیں ہیں" اور ایسی عبارتیں ہیں کہ جس شخص کو بھی قریشیوں اور صحابہ کے مزاج سے اور ان کے علاوہ متاخرین میں ان لوگوں کے مزاج سے جو ان کے بعد آئے واقفیت ہوگی اسے پختہ یقین ہو جائے گا کہ کتاب کا زیادہ حصہ باطل ہے (۳) النجاشی متوفی ۴۵۰ھ نے اپنی کتاب "الرجال" میں خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کتاب (نہج البلاغۃ) کا مؤلف الشریف الرضی ہی ہے (۴) یہ بات خود الرضی اور اس کی کتاب کے شارحین

---

(۱) مرآۃ الجنان طبعۃ حیدرآباد ۳/۵۵، شذرات الذہب باخبار من ذہب: ابو الفلاح عبد الحی بن العماد الحنبلی (۲) میزان الاعتدال طبعۃ لکھنؤ (۳) لسان المیزان (۴) کتاب الرجال، طبعۃ بمبئی۔

کی گواہی سے صحیح ثابت ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ اس نے اس کی تفسیر کی پانچویں جلد میں خود ہی ذکر کیا ہے کہ "اسی نے اس کو لکھا ہے اور خود ہی اس کا نام نہج البلاغہ رکھا ہے" اسی بات کو اپنی کتاب "مجازات الآثار النبویہ" میں بھی ذکر کیا ہے (۱) اور ہم دیکھتے ہیں کہ ابن ابی الحدید متوفی ۶۵۵ھ نے کتاب کی اپنی تشریح میں اعتراف کیا ہے کہ اس کے خطبات الشریف الرضی کی کارستانی ہیں" ابن میثم البحرانی کا بھی نہج البلاغہ کی شرح میں یہ خیال ہے کہ یہ الشریف کی تصنیف ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ (نہج البلاغہ) کتاب الشریف الرضی کی کارستانی اور اسی کی گڑھی ہوئی چیز ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ پوری کتاب اس کی تالیف نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بہت سے ارباب الہوی اور فصیح شیعوں نے بہت سے خطبے اور اقوال (حضرت) علی بن ابی طالب کی طرف بڑھا دیے ہیں، اس بات کی تصدیق مسعودی نے مروج الذہب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ہو جاتی ہے وہ کہتا ہے تمام جگہوں میں کی گئی تقریروں میں سے جن کو لوگوں نے زبانی یاد کر لیا تھا ان کی تعداد کچھ اوپر چار سو اسی (۴۸۰) ہے جنھیں وہ فی البدیہہ دیا کرتے تھے، لوگوں نے انھیں کو قولاً اور عملاً اختیار کر لیا، ایسا لگتا ہے کہ الشریف الرضی کو کچھ مواد مل گیا جس سے اس نے اپنی کتاب گڑھ لی اور اس مواد کی بنیاد سجع پر ہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علی کی طرف اس کی نسبت جھوٹ ہے کیوں کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ حضرت علیؓ سجع کو استعمال کرتے جب کہ رسولِ کریم نے سجع کو استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ (حضرت) ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ نے بھی اس سے پوری طرح پرہیز کیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علی کی تقریروں کو سمجھنے کے لئے اس کتاب پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس سلسلہ میں پہلے مصادر کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے جیسے جاحظ کی البیان والتبیین ہے کہ اس نے حضرت علی کے بعض خطبات، ان کا کلام اور ان کی پند و نصائح کا کچھ حصہ نقل کیا ہے (۲) ان باتوں کے علاوہ بعض

---

(۱) الجزء الخامس من حقائق التنزیل الشریف الرضی (طبعة النجف ص ۱۶۷، مجازات الآثار النبویہ (طبعة بغداد) ص ۲۲، ۴۱

(۲) الفن ومذاہبہ فی النثر العربی: ڈاکٹر شوقی ضیف ص ۶۱ تا ص ۶۳، اس سلسلہ میں البیان والتبیین ۵۲۲
(باقی ص ۹۵ پر)

جانوروں اور چڑیوں مثلاً مور وغیرہ کا وصف اس کتاب میں آتا ہے، جو ظاہر ہے عہد راسلام کی بات نہیں ہے، کیوں کہ مدینہ اور مکہ جیسے شہروں میں مور تیتر جیسے چڑیوں کا وجود کہاں تھا، یہ سب باتیں عباسی عہد کی ایجادیں ہیں اور یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کتاب کا اکثر مضامین من گھڑت ہیں۔ مگر حنا الفاخوری نے اپنی کتاب "الجدید فی الادب العربی" میں اس کتاب کے جعلی ہونے کی بہت سی دلیلیں دینے کے بعد کہا ہے کہ "مگر یہ سب دلیلیں اتنی کمزور ہیں کہ ان سے پورا اطمینان نہیں ہوتا اس کے بعد انھوں نے کوشش کی ہے کہ نہج البلاغہ میں جو کچھ آیا ہے اس کو صحیح ثابت کریں چنانچہ انھوں نے ہر الزام کی تردید یا تاویل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو دل کو نہیں لگتی اور ایسا لگتا ہے کہ محض بات کی پچ کر رہے ہیں، کوئی معقول اور مطمئن کرنے والی دلیل نہیں پیش کر سکے ہیں (۱)

نہج البلاغہ کی اہمیت وافادیت :

کتاب نہج البلاغہ عربی زبان وادب کی مشہور ترین کتاب ہے، اسی لئے جب سے یہ منظر عام پر آئی ہے علماء، ادباء اور نقادوں کی توجہ کا مرکز اور مطالعہ ومناقشہ کا محور رہی ہے، کیوں کہ یہ ہر قسم کے مضامین کا خزانہ ہے، چنانچہ اس میں دین وسیاست، لاؤ لشکر، نظم ونسق، امور مملکت اور رموز سلطنت اور سماج ومعاشرہ سے متعلق بڑی قیمتی اور مفید معلومات جمع کر دی گئی ہیں، اس لئے مختلف ملکوں میں اس کی طباعت ہوئی، اور کئی لوگوں نے اس کی شرح لکھی، جن میں مشہور دو شرحیں ہیں، ایک ابن ابی الحدید کی اور دوسری امام محمد عبدہ کی۔

صہ ۹۳ کا حاشیہ

اور اس کے بعد العقد الفرید لابن عبد ربہ ۴/۶۶، الکامل للمبرد، عیون الاخبار لابن قتیبہ الدینوری تاریخ الرسل والملوک: الطبری ابوجعفر محمد بن جریر، مختلف جگہوں پر ملاحظہ کیجئے۔

(۱) ملاحظہ کیجئے کتاب کا صہ ۲۶۱، مطبوعہ مکتبۃ المدرسۃ ودار الکتاب اللبنانی للطباعۃ والنشر، بیروت، الطبعۃ السادسۃ سنہ ۱۹۶۷ء

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی زبان و بیان کے معاملہ میں اپنے زمانے کے ممتاز ادیب اور خطیب تھے۔ ذیل میں امام کے دو مثالی خطبے اور حکمت و عقل مندی کے چند مقولے دیے جاتے ہیں، جن سے ان کی ادبی و علمی خوبیوں کا اندازہ ہو گا۔

حضرت علی کی تقریروں میں سے ایک مثالی تقریر وہ ہے جب ایک آدمی ان کے پاس آیا اور بولا کہ پہلے تو آپ نے ہمیں حکومت سے منع کیا تھا۔ اب اس کا حکم دے رہے ہیں ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا کہ کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط۔ یہ سن کر حضرت علی نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجائی پھر فرمایا:

هذا جزاء من ترك العقدة ، اما و الله لو أنى حين امرتكم بما امرتكم به حملتكم على المكروه الذى يجعل الله فيه خيرا : فان استقمتم هديتكم ، و إن اعوججتم قوّمتكم ، و إن ابيتم تداركتكم ، لكانت الوثقى . و لكن بمن و إلى من ؟ اريد ان اداوى بكم و أنتم دائى كناقش الشوكة بالشوكة و هو يعلم ان ضلعها معها ، اللهمّ قد ملّت اطباء هذا الداء الدوىّ و كلّت النزعة بأشطان الركىّ ، اين القوم الذين دُعوا الى الاسلام فقبلوه ، و قرأوا القرآن فأحكموه ، و هيجوا الى القتال فولهوا وله اللقاح الى اولادها ، و سلوا السيوف اغمادها ، و أخذوا بأطراف الأرض زحفا زحفا و صفّا صفّا : بعض هلك ، و بعض نجا ، لا يُبَشَّرُنَ بالأحياء ، و لا يعزون بالموتى ، مُره العيون من البكاء ، خمص البطون من الصيام ، ذُبل الشفاه من الدعاء ، صفر الألوان من السهر ، على وجوههم غبرة الخاشعين .

اولئك اخوانى الذاهبون ! فحق لنا ان نظمأ اليهم و نعض الأيدى على فراقهم - . .

یعنی، یہ بدلہ ہے اس شخص کا جس نے وفاداری اور استواری کے عہد و پیماں کو چھوڑ دیا ہے۔ خدا کی قسم میں نے جس بات کا حکم تم لوگوں کو دیا تھا (اگر تم لوگ اس کو مان لیتے) تو

ایک ایسی ناپسندیدہ بات پر تم کو آمادہ کر دیتا کہ خدا اس میں تمہارے لئے بہت سی بھلائیاں پیدا کر دیتا، پھر تم اگر استواری اور استقامت سے جمے رہتے تو میں تم کو صحیح راستہ دکھاتا، اور اگر تم غلط راستے پر پڑ جاتے تو تمہیں ٹھیک راستے پر لگا دیتا اور اگر تم انکار کر تے تو میں تمہاری حالت درست کر دیتا، اور یہی بات بہت پختہ اور مناسب ہوتی، لیکن کس سے اور کس کے ذریعہ اپنا دکھ درد بیان کروں، میں چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کے ذریعہ اپنے درد کا درماں ڈھونڈ لوں حالانکہ تم ہی میری بیماری ہو، اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو کانٹے کو کانٹے ہی سے نکال رہا ہو حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ اس کانٹے کا (فطری) میلان دوسرے کانٹے کی طرف ہے۔ یا الٰہی اس لاعلاج بیماری کے طبیب اس کا علاج کرتے کرتے تھک گئے ہیں اور پانی نکالنے والے کنوئیں کی رسیوں سے عاجز آ چکے ہیں، کہاں ہیں وہ لوگ جنھیں اسلام کی دعوت دی گئی تو انھوں نے اسکو قبول کر لیا اور قرآن کو خوب سمجھ کر پڑھا اور اس کو مشعل راہ بنایا، اور جب جنگ کی طرف ان کو بلایا گیا تو اس طرح لپکے جس طرح بچے والی اونٹنی اپنے بچوں کی طرف لپکتی ہے۔ اور اپنی تلواریں ان کی نیاموں سے نکال لیں، اور پھر زمین کے گوشوں پر یلغار کر کے اور صف بستہ ہو کر قبضہ کر لیا، بعض اس مہم میں مارے گئے، بعض بچ گئے، لیکن بچنے والوں کو خوش خبری نہیں دیتے تھے اور مرنے والوں کا ماتم نہیں کرتے تھے، ان کی آنکھیں (دعاؤں میں) روتے روتے سفید ہو گئی تھیں، اور ان کے پیٹ روزہ رکھتے رکھتے سوکھ کر بیٹھ سے لگ گئے تھے اور ان کے ہونٹ دعا کرتے کرتے سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور ان کا رنگ و روپ جاگتے جاگتے پیلا پڑ گیا تھا، ان کے چہروں پر خشیت الٰہی اور خشوع و خضوع کا رنگ جھلکتا تھا۔

وہی لوگ میرے بچھڑے بھائی ہیں اس لیے ہمیں سزاوار ہے کہ ہم ان کے لیے بیتاب ہوں اور ان کی جدائی میں کف افسوس ملیں (۱)

حضرت علی کا ایک دوسرا خطبہ بھی زبان و بیان، سلاست و روانی، فصاحت و بلاغت اور اغراض و معانی کے اعتبار سے بہت بلند اور مثالی خطبہ ہے، اس میں حضرت علی ایک زخم خوردہ شیر کی طرح شعلہ فشاں ہیں، ان کے دل پر چوٹ لگی ہے اور وہ تکلیف

---

(۱) نہج البلاغۃ۔

کی شدت سے تلملا گئے ہیں، بڑے صابر و شاکر اور ضبط کے آدمی تھے، لیکن اس موقعہ پر بلا ئے صبر جاتا رہا اور وہ بری طرح کوفیوں پر برس پڑے۔ ہوا یہ کہ حضرت معاویہ کے شہسواروں کے ایک دستہ نے علاقہ انبار میں[2] آ کر وہاں حضرت علی کی طرف سے متعین حاکم حسان بن حسان کو قتل کر دیا اس کے بعد شہر میں قتل و غارت گری مچائی لوٹ مار کی اور عورتوں و بچوں تک کو معاف نہیں کیا اور پورے اطمینان و سکون سے واپس چلے گئے کسی نے چوں تک نہیں کی۔ حضرت علی کو جب اس کی خبر ہوئی تو غصہ کے مارے بیتاب ہو کر گھر سے نکلے اور نخیلہ میں جا کر ایک اونچی جگہ پر چڑھ گئے لوگ بھی ان کے ساتھ ہو لئے تھے، پھر انھوں نے اللہ کی حمد و ثناء کی اور آنحضرت ؐ پر درود بھیجا اور پھر فرمایا:

اما بعد! فان الجهاد باب من ابواب الجنة، فمن تركه رغبة عنه ألبسه الله الذل و سيما الخسف و دُيّث بالصغار و قد دعوتكم الى حرب هؤلاء القوم ليلا و نهارا، سرا و إعلانا، و قلت لكم: اغزوهم من قبل ان يغزوكم، فوالذي نفسي بيده! ما غزى قوم قط في عقر دارهم إلا ذلّوا فتخاذلتم و تواكلتم و ثقل عليكم قولي و اتّخذتموه وراءكم ظهريّا حتى شنّت عليكم الغارات هذا اخو غامد قد وردت خيله الأنبار و قتلوا حسّان بن حسّان و رجالا منهم كثيرا و نساء، و الذي نفسي بيده! لقد بلغني انه كان يدخل على المرأة المسلمة و المعاهدة فتنتزع احجالهما و رُعثهما ثم انصرفوا موفورين لم يكلم احد منهم كلما، فلو أن امرأ مسلما مات من دون هذا اسفا ما كان عندي فيه ملومًا بل كان به عندي جديرا. يا عجبا كل العجب! عجب يميت القلب و يشغل الفهم و يكثر الأحزان من تظافر هؤلاء القوم على باطلهم و فشلكم عن حقكم حتى اصبحتم غرضا تُرمون

---

(2) دریائے فرات کے کنارے مغربی بغداد میں واقع ایک شہر۔

و لاترمون ، و یغار علیکم و لاتغیرون و یعصی الله فیکم و ترضون . اذا قلت لکم اغزوهم فی الشتاء قلتم هذا اوان قُرّ و صِرّ ، و إن قلت لکم اغزوهم فی الصیف قلتم هذه حمارة القیظ ، انظرنا ینصرم الحر عنا . فاذا کنتم من الحر او البرد تفرون فأنتم و الله من السیف افرّ ، یا اشباه الرجال و لا رجال و یا طغام الأحلام و یا عقول ربات الحجال ! و الله! لقد افسدتم علیّ رأیی بالعصیان، و لقد ملأتم جوفی غیظًا حتی قالت قریش: ابن أبی طالب رجل شجاع و لکن لا رأی له فی الحرب . لله درهم! و من ذا یکون اعلم بها منی او أشد لها مراسا ! فو الله! لقد نهضت فیها و ما بلغت العشرین ، و لقد نیفت الیوم علی الستین و لکن لا رأی لمن لا یطاع - یقولها ثلاثا -

یعنی :- بیشک جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، پس جس نے اسے ناپسندیدگی کی بنا پر چھوڑ دیا تو اللہ اس کو ذلت وخواری کا لباس پہنا دے گا، اسے ہر طرح کی رسوائی اور بے عزتی میں مبتلا کر دے گا، میں نے تم کو ان لوگوں سے لڑنے کے لئے رات و دن خفیہ اور علانیہ بلایا، اور کہا کہ ان سے نبرد آزما ہو جاؤ اس سے پہلے کہ وہ تم پر چڑھ دوڑیں، کیوں کہ جس ذات کے ہاتھ میں میری جان ہے اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب بھی کسی قوم پر اس کے گھر کے اندر حملہ کیا گیا تو وہ ذلیل و رسوا ہو کر رہی، مگر تم نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا، اور ایک دوسرے پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہے اور میری بات تم کو بہت بھاری لگی چنانچہ تم نے اسے پس پشت ڈال دیا، یہاں تک کہ تم پر حملے کیے جانے لگے، یہ دیکھو غامد والے کو (۱) کہ اس کے شہسوار انبار پہونچے انھوں نے نہ صرف حسان بن حسان کو قتل کیا بلکہ بہت سے آدمیوں اور عورتوں کو بھی تہ تیغ کر ڈالا، میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ مجھے خبر ملی ہے کہ مسلمان عورت اور معاہدہ کی ہوئی عورت کے گھر میں لوگ گھس جاتے تھے اور ان کے پاؤں کی پائلیں اور کانوں کی بالیاں

---

(۱) یعنی سفیان بن عوف ایک یمنی قبیلہ بنو غامد کا ایک شخص، جسے حضرت معاویہ نے عراق کے علاقوں میں قتل و غارت گری کر کے عراقیوں کو ڈرانے کے لئے متعین کیا تھا کیوں کہ وہ حضرت علی کے ساتھ تھے

فوج لیتے تھے اور اس طرح لوٹ مار کا سامان لے کر سب اطمینان سے چلے گئے، اور ان میں سے کسی کے ایک خراش بھی نہ آئی، اب اگر اس صورتِ حال کو دیکھ کر افسوس اور دکھ کے مارے کوئی مسلمان آدمی مرجائے تو میرے نزدیک وہ قابل ملامت نہ ہوگا بلکہ اس کو میرے نزدیک یہی کرنا چاہیے تھا۔ کتنی حیرت اور تعجب کی بات ہے، ایسا تعجب جو دل و دماغ کو مردہ اور ماؤف بنا دیتا اور رنج و غم کے احساس کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ کہ یہ لوگ اپنے باطل پر بھی کتنے جمے اور متحد ہیں اور تم لوگ اپنے حق میں بھی کتنے ناکام و نامراد ہو، اور اب حالت یہ ہے کہ تم نشانہ بن گئے ہو جس پر تیر آزمائی کی جاتی ہے، اور تم ہو کہ ایک تیر بھی نہیں چلا پاتے ہو تم پر حملہ کیا جاتا ہے لیکن تم حملہ نہیں کر پاتے ہو اور تمہارے درمیان اللہ کی نافرمانی کی جاتی ہے اور تم دیکھتے رہتے ہو، جب میں ان سے (شامیوں سے) سردیوں میں جنگ کرنے کے لیے کہتا ہوں تم کہتے ہو کہ یہ سردی اور پالے کا زمانہ ہے اور جب کہتا ہوں کہ ان سے گرمیوں میں جنگ کرو تو کہتے ہیں کہ کہ دیکھیے، گرمی کی کتنی شدت ہے۔ گرمی کے ختم ہو جانے تک ہمیں ذرا مہلت دیجئے، پس اگر گرمی اور سردی سے اس طرح بھاگتے ہو تو خدا کی قسم تم تلوار سے اس سے کہیں زیادہ بھاگو گے۔ اے مردوں کی صورت والو، مگر مرد نہیں ہو (زرخو) اور اے چھوڑ دو اور اے گھر میں دبک کر بیٹھنے والی لڑکیوں کی عقل رکھنے والو، خدا کی قسم تم نے اپنی نافرمانی سے میری رائے کو بے کار کر دیا ہے اور میرے دل و دماغ کو غصہ سے اتنا بھر دیا ہے کہ قریش والے کہنے لگے ابو طالب کے بیٹے بہادر آدمی تو ہیں لیکن جنگ کے بارے میں ان کی کوئی (وسیع) رائے نہیں ہے۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ میرے مقابلہ میں اس کا زیادہ جاننے والا اور اس کا زیادہ تجربہ رکھنے والا اور اسی میں پلنے بڑھنے والا دوسرا اور کون ہو سکتا ہے؟ کہ خدا کی قسم میں اس میں مستقل ڈٹا رہا اور ابھی میری عمر بیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور آج میری عمر ساٹھ سال سے بھی زیادہ ہو گئی ہے لیکن اس آدمی کی رائے کی کوئی قیمت یا وقعت نہیں جس کی اطاعت نہ کی جائے، اس جملہ کو آپ نے تین دفعہ کہا۔ (۱)

ان دو خطبوں کے بعد فنِ خطابت میں حضرت علی کے کمال فن کی بہترین مثال ہیں ذیل

(۱) خطبہ کے لیے دیکھئے الکامل للمبرد، البیان والتبیین للجاحظ، نہج البلاغۃ للشریف الرضی۔ مختارات جلد دوم مولانا ابوالحسن علی الحسنی الندوی ص ۳۰/۳۱،

میں حکمت و دانائی کے چند مقولے بھی نقل کیے جاتے ہیں، جن میں عقل و دانش حکمت و فلسفہ کے علاوہ زبان و بیان کی پوری خوبیاں بھی نمایاں ہیں، جن کی وجہ سے ان کو بھی ادبی شہ پارہ سمجھا جاتا ہے، چوں کہ ان مختر لیکن جامع جملوں میں حضرت علی نے اپنی زندگی کے تجربوں کا نچوڑ سمو دیا ہے اس لیے ہر اعتبار سے یہ بہت مؤثر اور قابل تقلید بن گئے ہیں۔ معانی و مطالب کی گہرائی و گیرائی اور جامعیت میں آنحضرتؐ کے جوامع الکلم کے بعد شاید حضرت علی کے یہ حکیمانہ جملے اتنے بلند، اسلوب بیان کے اعتبار سے اتنے معیاری اور انمول ہیں کہ عربی ادب میں کوئی ادیب یا خطیب ان کا ہم پلہ نہیں مل سکتا۔ حنا الفاخوری نے نہج البلاغہ اور دوسری کتابوں سے یہ حکیمانہ جملے اپنی کتاب میں نقل کر دیئے ہیں، جن میں سے چند یہاں درج ہیں (۱)

حضرت علی نے عام انسانوں اور اپنے ساتھیوں اور پیروکاروں کو رزم بزم دونوں میں برتا تھا، وہ اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ نرم خوئی، اخلاق فاضلہ، ہمدردی غم گساری اور ان سب کے ساتھ خاک ساری و انکساری آدمی کے وہ جوہر ہیں جن سے لوگ آدمی کی طرف کھنچ کھنچ کر آتے ہیں اور اپنا متاع دل و دنیا دونوں اس کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں۔

ایسا آدمی جب ان کے اندر سے اٹھ جاتا ہے تو ان کے ہاتھوں سے دامان صبر و ضبط چھوٹ جاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ "خالطوا الناسَ مخالطةً إن متّم معها بكوا عليكم وإن عشتم حنّوا إليكم" یعنی لوگوں کے درمیان اس طرح رہو کہ اگر تم مر جاؤ تو وہ پھوٹ پھوٹ کر تم کو روتے رہیں اور اگر زندہ رہو تو تمہاری طرف کھنچ کر آتے رہیں" کیوں کہ وہ آدمی انتہائی ناکارہ ہے جو دوستوں اور ہمدردوں کو حاصل کرنے میں ناکام رہے، اور اس سے بڑھ کر وہ آدمی ناکام ہے جو دوستوں اور ہمدردوں کو حاصل کرنے کے بعد ان کو گنوا دے، فرماتے ہیں،

۲۔ أعجزُ الناس مَن عجز عن اكتساب الإخوان، وأعجز منه من أضاعَ مَن ظفر به۔ اس کے بعد دوست اور دشمن کی پہچان بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہارے تین دوست ہیں اور تین دشمن، تمہارے دوست یہ ہیں :

---

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ الجدید فی الادب العربی، حنا الفاخوری ص ۳۹۶ سے ص ۴۰۵ تک۔

تمہارا اپنا دوست، تمہارے دوست کا دوست، اور تمہارے دشمن کا دشمن، اور تمہارے دشمن یہ ہیں، تمہارا اپنا دشمن، اور تمہارے دوست کا دشمن، اور تمہارے دشمن کا دوست۔

۳۔ أصدقاؤك ثلاثة وأعداؤك ثلاثة: فأصدقاؤك: صديقك، وصديق صديقك وعدو عدوك. وأعداؤك: عدوك، وعدو صديقك، وصديق عدوك.

زمانہ کی اونچ نیچ اور معاشرہ کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھ ان کی دور بین نگاہوں نے اس زمانے کو دیکھ لیا تھا جب چغل خوروں، جعل سازوں، بدکار اور اوباش لوگوں کا بول بالا ہوگا اور شریف، نیک طبع اور بااخلاق لوگ کمزور اور بے بس ہو جائیں گے۔ فرماتے ہیں کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب حکومت اور جاہ وحشمت کے ایوانوں میں صرف چغل خور اور جعل ساز کا عمل دخل ہوگا، اور فاجر و بدکار آدمی کو وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا، اور انصاف پسند اور عادل آدمی کو کمزور و بے بس کر دیا جائے گا۔

۴۔ يأتي زمانٌ لا يُقرّب فيه إلا الماحِلُ، ولا يُظرّفُ فيه إلا الفاجرُ، وَلا يُضعّفُ فيه إلا المنصفُ.

انسان اپنی زبان کی بدولت کتنی مصیبتوں رسوائیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے اس کا اندازہ حضرت علی سے زیادہ کس کو ہو سکتا تھا، اسی لیے وہ ہمیشہ اپنی زبان کو قابو میں رکھنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے، فرماتے ہیں کہ بات تمہاری گرفت میں ہے جب تک کہ تم اس کو اپنی زبان سے کہہ نہ دو، اور جب تم نے اس کو کہہ دیا تو پھر تم اس کی گرفت میں آگئے۔ اسی لئے اپنی زبان کو بچائے رکھو، جس طرح تم اپنا سونا اور قیمتی کاغذات بچا کے رکھتے ہو، کیوں کہ بسا اوقات ایک بات کبھی کسی نعمت کو چھین لیتی ہے اور مصیبت و پریشانی کا باعث ہو جاتی ہے۔

۵۔ الكلام في وِثاقِكَ مالم تتكلم به، فاذا تكلمتَ به صِرتَ في وثاقه، فاخزُنْ لسانكَ كما تخزنُ ذَهبكَ ووَرِقكَ، فَرُبَّ كلمةٍ سلبتْ نعمةً وجلبتْ نِقمةً.

مال و دولت جمع کرنے کا خبط ہمیشہ لوگوں کو رہا ہے۔ حضرت علی اس کی حقیقت یوں بیان فرماتے ہیں: اے ابن آدم اپنی ضرورت یا اپنی طاقت سے زیادہ جو کچھ تم کماتے ہو تو تم اس کو دوسروں کے لیے جمع کرتے ہو، اس لیے اپنی ضرورت میں اپنا کمایا ہوا مال خرچ کرو

بخل کر کے جمع نہ کرو کہ وہ تم چھوڑ کر جاؤ گے اور وہ تمہارے ورثاء میں بٹ جائے گا۔ اس کے بعد ایک بہت پتہ کی بات کہتے ہیں کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ حسرت ناک بات اس آدمی کی حسرت ہوگی جس نے اللہ کی نافرمانی کر کے مال و دولت حاصل کیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا وارث ایک شخص ہوا، جس نے اس مال کو اللہ کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری میں خرچ کیا، تو اس کی وجہ سے جنت میں گیا، اور پہلا آدمی دوزخ کی نذر ہوا:

۶۔ یا ابنَ آدم ما کسبتَ فوقَ قوّتِکَ فأنتَ فیہِ خازنٌ لِغیرِکَ "

اِنَّ أعظمَ الحسراتِ یومَ القیامۃ حسرۃُ رجلٍ کسبَ مالاً فی غیرِ طاعۃِ اللہِ، فورثہُ رجلٌ، فانفقہُ فی طاعۃِ اللہِ سبحانہُ، فدخلَ بہِ الجنّۃَ، و دخلَ الاوّلُ بہِ النار۔

اور اس طرح حضرت علیؑ نے اپنے ان حکیمانہ جملوں سے بھی عربی ادب کے دامن کو مالامال کر دیا، جو نہ صرف دنیاوی معاملات میں ہی بلکہ دینی معاملات میں بھی شمع راہ ہیں اور زبان و ادب کے لئے مشعل راہ اور قابل تقلید نمونہ۔

خطوط و نوٹس چوں کہ وقتی نوعیت کے ہوتے ہیں اس لئے ان کا نمونہ نہیں دیا جا رہا ہے، انھیں نہج البلاغہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وفیات الأعیان لابن خلکان؛ (اردو میں جدید ترین اور مکمل ترین کتاب "المرتضیٰ"
مصنفہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ہے)
۲۔ مرآۃ الجنان للیافعی مطبوعہ حیدر آباد (دائرۃ المعارف)۔
۳۔ شذرات الذہب بأخبار من ذہب لأبی الفلاح عبد الحیٔ بن العماد الحنبلی،
۴۔ میزان الاعتدال للذہبی مطبوعہ لکھنؤ۔
۵۔ لسان المیزان لابن حجر العسقلانی۔
۶۔ کتاب الرجال للنجاشی۔
۷۔ حقائق التنزیل للشریف الرضی ج ۵۸۔
۸۔ مجازات الآثار النبویۃ للشریف الرضی۔
۹۔ البیان والتبیین للجاحظ /۲، اور مختلف جگہوں پر۔
۱۰۔ العقد الفرید لابن عبد ربہ/۴۔
۱۱۔ الکامل للمبرد، ۱۲۔ عیون الأخبار لابن قتیبہ الدینوری۔
۱۳۔ تاریخ الرسل والملوک لابی جعفر محمد بن جریر الطبری مختلف جگہوں پر۔
۱۴۔ الأمالی للقالی ۱۵ مروج الذہب للمسعودی۔ ۱۶۔ نہج البلاغۃ۔
۱۷۔ الإمام علی بن ابی طالب عبد الفتاح عبد المقصود، ۱۸۔ الوسیط فی الأدب العربی
لأحمد الاسکندری وعنانی۔ ۱۹۔ تاریخ الأدب العربی لأحمد حسن الزیات،۔
۲۰۔ تاریخ الأدب العربی لجرجی زیدان اول، ۲۱۔ تاریخ الادب العربی ڈاکٹر شوقی
ضیف العصر الاسلامی، ۲۲۔ تاریخ الأدب العربی ڈاکٹر عمر فروخ۔
۲۳۔ الفن ومذاہبہ فی النثر العربی؛ لشوقی ضیف۔
۲۴۔ الفتنۃ الکبری؛ علی وبنوہ: ڈاکٹر طہٰ حسین۔ ۲۵۔ الجدید فی الادب العربی
لحنا الفاخوری جنہوں نے حضرت علی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد
سیر حاصل بحث کی ہے جو دیکھنے کے لائق ہے۔ ۲۶۔ اردو میں بھی بہت سی کتابیں
حضرت علی پر لکھی گئی ہیں، ان میں دار المصنفین اعظم گڑھ کی خلفائے راشدین دیکھنے کے لائق ہے

تیسرا باب

۱۔ رسمِ خط/طرزِ تحریر

بشمول اموی دور

ہم نے اس کتاب کے حصۂ اوّل صفحہ ۱۱۴ پر "تحریر یا کتابت دورِ جاہلی میں" کے عنوان سے عربوں میں رسمِ خط کے ایجاد کی کہانی سے لے کر اسلام کے ابتدائی عہد تک ترقی کرنے کے بارے میں تفصیل سے لکھ دیا ہے (۱) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی رسم خط قدیم مصری طرزِ تحریر سے جسے اصطلاح میں "هیرو غلیفی" کہتے ہیں، نکلا ہے، وہ اس طرح کہ ہیرو غلیفی طرزِ تحریر سے خط فینیقی نکلا اور اس سے خط آرامی یا نبطی اور مسند، خط مسند کا رواج یمن میں تھا۔ یہ فینیقی ابجد سے ایک ہزار سال قبل مسیح نکلا تھا (۲) اور پورے جزیرہ نمائے عرب میں اس کا رواج تھا، بعد میں اسی طرزِ تحریر سے چھ قسم کی تحریریں نکلیں، جن میں آخری حمیری یا انباری تھی۔ اسلام کے ظاہر ہونے کے وقت اسی طرزِ تحریر کا رواج تھا اور یہ تحریر حجاز میں پہونچی تو اس کا نام حجازی پڑ گیا اور یہی رسم خط "خط نسخ" کی بنیاد ہے، جسے اسلام کے ظاہر ہونے کے وقت عام طور سے عربوں میں گنے چنے لوگ استعمال کرتے تھے اور قریش کے نو یا دس آدمی اور مدینہ کے اکا دکا آدمی اور ان کے پڑوسی یہودی بھی اسی خط میں لکھتے تھے۔ آنحضرتؐ نے بدر کی جنگ میں فتح کے بعد مکیوں سے رہائی کے بدلے میں دس دس لڑکوں کو لکھنا سکھانے کی جو شرط رکھی تھی وہ یہی رسم خط حجازی ہی تھا۔ اور آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے وقت تک اسی طرزِ تحریر کا رواج رہا اور قرآن کے نزول سے لے کر اس کے مکمل ہونے تک آپ کے پاس چالیس سے زیادہ لکھنے والے ہو گئے تھے، جن میں آدھے سے زیادہ وحی (قرآن) لکھنے والے تھے، اس کی

(۱) صفحہ ۱۲۶ پر رسم خط کی ایجاد سے لے کر اسلام کے ظہور تک جس طرزِ تحریر کا رواج رہا اس کا ایک مفصل نقشہ بھی دے دیا ہے۔ (۲) تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی ۸/۳۷

تفصیل قرآن کے سلسلہ میں گزر چکی ہے۔

جب خلفائے راشدین کے زمانے اور خاص طور سے عہد بنو امیہ سے فتوح کا سلسلہ شروع ہوا اور عربوں نے مفتوحہ ممالک میں جا کر اپنی بستیاں بسا کر رہنا شروع کیا اور ادھر کوفہ چھاؤنی ہونے کی وجہ سے ایک مرکزی عربی شہر کی حیثیت سے ترقی کرنے لگا تو اس عہد کے بہترین خطاط اور لکھنے والے اس شہر میں آکر بس گئے، اور انھوں نے اپنی ذہنی صلاحیتوں اور موروثی علم و فن سے کام لے کر حجازی رسم خط میں تغیر و تبدل، سدھار، نکھار اور آرائش و زیبائش کرنی شروع کی اور ایک عرصہ کے بعد ایک قدرے نئی طرز تحریر ایجاد کی اور اس کا نام "خط کوفی" رکھ دیا۔

اس طرح عہد بنی امیہ میں دو طرز تحریر پائی جاتی تھیں، ایک تو وہی پرانی طرز تحریر "حجازی" اور دوسری اس کی جنم داتا "کوفی"۔ چنانچہ حجازی جسے اب خط نسخ بھی کہہ سکتے ہیں، عام لکھائی کے کاموں میں مثلاً خط و کتابت، دفتری کاموں کی تحریروں حساب کتاب، رقعہ یا نوٹ نویسی اور اسی قسم کے دوسرے کاموں میں استعمال ہونے لگی اور کوفی رسم خط اپنے امتیازی شان کی وجہ سے قرآن شریف کے لکھنے میں، خلفا، امرا، حکام اور بڑے لوگ کے محلوں کے کتبوں کے لکھنے اور ان کی آرائش و زیبائش میں اور رائج الوقت سکوں پر لکھنے میں استعمال ہونے لگا، اس کے بعد کوفی طرز تحریر میں مزید آرائش و زیبائش پیدا کرنے اور خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش میں عہد عباسی میں اس کی ایسی شکل نکلی جو اپنے توازن و اعتدال، حسن و زیبائش اور دیدہ زیبی میں لکھنے کے سارے طریقوں پر بازی لے گئی جس کا سہرا عباسی عہد کے مشہور خطاط ابن مقلہ کے سر جاتا ہے پھر اس خط میں بھی مزید ترقی ہوئی اور آخر میں اس کی کتابت جیومیٹری قاعدوں کے مطابق ہونے لگی اور اس طرح یہ رسم خط ایک خاص طبقہ خطاطوں کا امتیازی فن بن گیا جنھوں نے اس کے ایسے نادر اور اچھوتے نمونے چھوڑے جنھیں دیکھ کر آج بھی عقل عش عش کر اٹھتی ہے یہ نمونے قرآن شریف کی لکھائی کے علاوہ جنھیں مسلمانوں نے اپنے ذہن و قوت اختراع کی ساری توانائیاں صرف کر کے ایسا معجز نما طرز تحریر ایجاد کیا ہے جس کی مثال دنیا کی کوئی زبان اب تک نہ پیدا کر سکی، عام طور سے مسجدوں محرابوں مقبروں قلعوں اور محلوں میں بھی ملتے ہیں (1) اس کی تفصیل عہد عباسی میں آئے گی۔

---

(1) ہندوستان میں اس کے نادر نمونے مغلوں کی تعمیر کردہ عمارتوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ ہندوستان میں بعض جگہ اس خط میں ہندوستانی رنگ دے کر مزید خوبصورت بنا دیا گیا ہے۔

اعراب (یعنی زیر، زبر، پیش) کی ابتدا

خلفائے راشدین اوران کے بعد بنو امیہ کے زمانے تک عربی زبان بغیر اعراب یعنی بغیر زیر، زبر اور پیش کے لکھی جاتی تھی، کیوں کہ لکھنے والے اور جن کو لکھا جاتا تھا دونوں عربی زبان کے ماہر تھے اور مادری زبان ہونے کی وجہ سے محض الفاظ کے شکلوں سے ان کو صحیح پڑھ کر معنی و مطلب سمجھ لیتے تھے۔ مگر بنو امیہ کے زمانے سے جب دوسری قومیں اسلام میں داخل ہونے لگیں اور ان کی وجہ سے عربی زبان میں غلطیاں ہونے لگیں اور سب سے بڑی مصیبت قرآن شریف کے غلط پڑھنے کی وجہ سے پیدا ہوگئی مسلمانوں کو قرآن میں تحریف یعنی رد و بدل کا اخطرہ پیدا ہوا تو ابوالاسود الدولی نے حضرت معاویہ کے عہد خلافت میں قرآن شریف کے الفاظ پر مختلف رنگوں سے مختلف قسم کے نشانات لگائے۔ چنانچہ زبر (ـَ) کی آواز کے لئے اس نے حرف کے اوپر ایک نقطہ ایک مختلف رنگ سے قائم کیا، اور زیر (ـِ) کے لئے حرف کے نیچے ایک نقطہ دوسرے رنگ سے اور پیش کی آواز کے لئے حرف کے بائیں طرف ایک نقطہ تیسرے رنگ سے لگایا۔ اور تنوین (یعنی دو زبر، دو زیر یا دو پیش) کے لئے دو نقطے مقرر کئے، اور اس طرح قرآن کو غلط پڑھنے سے روکنے کا ایسا طریقہ نکالا جس نے آگے چل کر اعراب اور اس سے فن نحو و صرف پیدا ہوا، جو اسی الدولی کی دین ہے۔ (۱) اور اس طرح اس یگانہ روزگار نے ایک طرف قرآن کو تحریف و تبدیل سے بچالیا تو دوسری طرف عربی زبان و ادب کے قواعد مرتب کرکے اسے "عرب" یعنی بولتی زبان بنا گیا

حجاج بن یوسف الثقفی نے عبدالملک بن مروان کے عہد خلافت میں اپنی تمام سیاسی برائیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا کارنامہ انجام دیا کہ اس نے نصر بن عاصم اور یحییٰ بن یعمر سے جو الدولی کے شاگرد تھے قرآن کے الفاظ پر نقطے لگوائے۔ چنانچہ ان دونوں نے اسی روشنائی یا رنگ سے جس سے قرآن یا کلام لکھا جاتا تھا نقطے لگائے تاکہ ابوالاسود کے نقطوں اور اعراب سے غلط ملط نہ ہو جائیں۔

---

(۱) یہ وہی ابوالاسود الدولی ہے جس نے عربی قواعد بھی ایجاد کیے۔ ممتاز تابعیوں میں سے تھا اس کا نام ظالم بن عمرو الدولی ہے، ۸۵ سال کی عمر میں بصرہ میں ٦٩ھ میں فوت ہوا علم نحو اس نے حضرت علی سے سیکھی تھی

عہد نبوی کے رسم خط کے نمونے آپ کے خطوط کی شکل میں

نمونہ ۱: آنحضرت کی مہر نبوت جو آپ خطوط کے آخر میں لگاتے تھے۔

۔خاتم النبی صلی اللہ علیہ وسلم مستدیر مکون من ثلاث کلمات محفورة ، محمد رسول الله ،

آپ کی مہر گول تھی، اس میں اوپر سے نیچے کی طرف یہ الفاظ کھدے ہوئے تھے:۔

الله
رسول
محمد

اور نیچے سے اوپر کی طرف پڑھیں تو ترتیب بن جاتی تھی، محمد رسول اللہ

نمونہ ۲

۔ رسالۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی کسری انو شروان حملھا الیہ الصحابی عبداللہ بن حذافۃ السہمی

کسریٰ انوشیروان پرویز بن ہرمز بن انوشیروان شہنشاہ ایران کے نام آپ کا خط۔ یہ خط آنحضرتؐ کے صحابی عبداللہ بن حذافہ السہمی (۱) لیکر گئے تھے۔ اس خط کو سن کر کسریٰ نے پھاڑ ڈالا۔ اور یمن کے اپنے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ اس آدمی (آنحضرتؐ) کو پکڑ کر میرے حضور میں پیش کرو چنانچہ اس نے دو آدمی آپ کو گرفتار کرنے کے لئے مدینہ بھیجا، جب یہ دونوں آپ سے ملے تو آپ نے فرمایا کہ پہلے اپنے بادشاہ کی خبر لو، اس کو اس کے بیٹے نے قتل کر ڈالا ہے، یہ لوگ واپس ایران پہونچے تو معلوم ہوا کہ واقعی اس کے بیٹے شیرویہ نے اس کو قتل کر دیا ہے باذان پیشین گوئی کی صحت کو دیکھ کر مع اپنے آدمیوں کے مسلمان ہوگیا۔
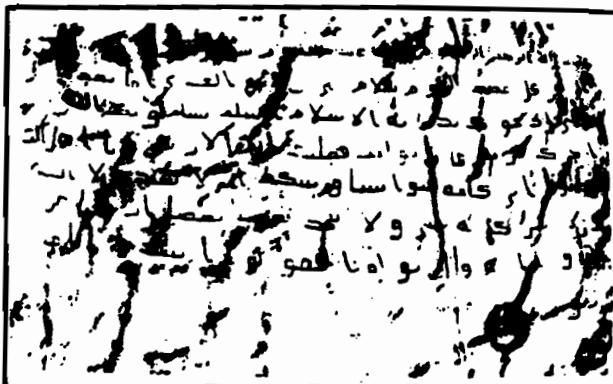
---

(۱) عبداللہ بن حذافہ بن قیس السہمی القرشی، شروع ہی میں اسلام لے آئے تھے۔ حبشہ کی ہجرت میں اپنے بھائی خنیس حفصہ بنت عمر بن الخطاب کے شوہر کے ساتھ شریک تھے۔ غزوۂ بدر میں بھی حصہ لیا۔ حضرت عمر کے عہد خلافت میں رومیوں نے ۸۰ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ان کو بھی گرفتار کرلیا تھا۔ وہ اچھے شاعر اور نڈر سپاہی تھے اس خط کے لے جانے کے بعد تقریباً ۲۶ سال تک زندہ رہے، حضرت عثمان کے عہد خلافت میں تقریباً ۳۳ھ/ ۶۵۳ء میں مصر میں انتقال ہوا۔

صدیوں تک اس خط کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر مصر کے مشہور روزنامہ الاہرام نے اپنی ۱۵ ارمئی ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں یہ انکشاف کیا کہ یہ خط شام کے شہر حلب میں ایک آدمی کے پاس موجود ہے۔ یہ خط اس آدمی کے پاس مستقل رہا یہاں تک کہ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے ۳۲ سال گزرنے کے بعد ماہ مئی ۱۹۶۳ء میں پتہ دیا کہ یہ خط اس آدمی سے لے کر بیروت کے مشہور عالم و ادیب ہنری فرعون کے پاس بحفاظت رکھ دیا گیا ہے۔ مگر لبنان کے حالیہ فسادات اور ہنگاموں کی وجہ سے اب یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اب یہ خط کہاں ہے، غالب گمان یہ ہے کہ حالات کے بہت زیادہ خراب ہو جانے اور ہر چیز کے غیر یقینی ہو جانے کی وجہ سے اس خط کو فرانس پہنچا دیا گیا ہے۔ جہاں وہ بحفاظت تمام ایک جگہ رکھا ہوا ہے۔

مکتوب گرامی کا مضمون یوں ہے:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمد رسول اللہ إلی کسری عظیم فارس سلام علی من اتبع الهدی وآمن بالله ورسوله وشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له وأن محمداً عبده ورسوله. أدعوك بدعاء الله، فإني أنا رسول الله إلى الناس كافة لأنذر من كان حيا ويحق القول على الكافرين واسلم تسلم فإن أبيت فعليك إثم المجوس"

آنحضرتؐ کا یہ مکتوب گرامی چکنے چمڑے کے ٹکڑے پر لکھا ہوا ہے۔ اس میں ابتدائی مدنی رسم خط استعمال کیا گیا ہے۔ کتابت میں کالی روشنائی استعمال کی گئی ہے۔ الفاظ پر نہ اعراب ہے اور نہ نقطے۔ خط کے بائیں طرف مہر نبوت ثبت ہے۔ چوں کہ یہ بالکل ابتدائی طرز تحریر ہے اس لئے الفاظ گٹھے ہوئے اور سطریں موزوں اور سیدھی نہیں ہیں۔ اچھی طرح محفوظ نہ رہنے کی وجہ سے بہت سے حروف مٹنے سے لگے ہیں۔ پھر بھی اصلی خط میں عبارت صحیح طریقے سے پڑھی جا سکتی ہے۔ کسریٰ نے اس کو بیچ سے پھاڑا ہے تو پھٹنے کا نشان لمبائی میں صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اس کو نوچنے کی بھی کوشش کی ہے لیکن کاغذ کی طرح چمڑا پھٹ نہیں سکا ہے، البتہ سلوٹیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔

نمونہ ۳

رسالة النبي صلى الله عليه وسلم الى هرقل عظيم الروم حملها اليه الصحابي دحية بن خليفة الكلبي .

قیصر روم ہرقل کے نام آنحضرتؐ کا یہ مکتوب گرامی مشہور کاتب وحی حضرت زید بن ثابت کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس کو حضرت دحیہ بن خلیفہ الکلبی (۱) صحابی لے کر ہرقل کے پاس گئے تھے۔ شام کے مشہور شہر حمص یا تبوک میں اسے یہ خط حضرت دحیہ نے دیا۔ اس نے اس خط کو اپنی آنکھوں سے لگایا، اپنے سر پر رکھا، اور بوسہ دے کر حضرت دحیہ سے اسلام اور آنحضرتؐ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اور آپ کے خط کا جواب لکھ کر مع تحفے تحائف حضرت دحیہ کو واپس کیا۔ آنحضرتؐ نے خط پڑھ کر فرمایا کہ جھوٹا ہے وہ اب بھی اپنی عیسائیت پر قائم ہے۔ اس کے تحفے تحائف آپ نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے یہ وہی قیصر ہے جس نے خط ملنے کے بعد سفیان بن حرب کو اپنے دربار میں بلا کر آنحضرتؐ کے متعلق معلومات حاصل کیں، جس کا تفصیلی ذکر سیرت کی کتابوں میں ہے۔ ہرقل سفیان سے بات کرنے کے بعد آنحضرتؐ کی صداقت کا معترف ہو گیا تھا۔

---

(۱) دحیہ بن خلیفہ بن فروہ بن فضالہ الکلبی، ابتدائی مسلمانوں میں ہیں، بڑے جلیل القدر صحابی تھے غزوۂ بدر کے سوا تمام غزوات میں شریک ہوئے، آنحضرتؐ ان کو بہت چاہتے تھے، بہت خوبصورت اور چھبیلے جوان تھے، آنحضرتؐ ان کے حسن وجمال کی مثال حضرت جبریل کے حسن وجمال سے دیتے تھے۔ چونکہ شام اور فلسطین کے علاقوں کو اچھی طرح سے اپنے اسفار کی وجہ سے جانتے تھے، اس لیے آنحضرتؐ نے ان کے ذریعہ ہرقل کے پاس خط بھجوایا۔ چاروں خلفائے راشدین کے زمانہ کو دیکھا۔ آخر میں شام ہی میں منتقل ہو گئے تھے اور حضرت

(باقی ص ۔۔۔ پر)

اس خط میں ۸ سطریں ہیں، اور ۶۸ الفاظ عبارت سطروں کی ترتیب سے یوں ہے :۔

۱۔ " بسم اللہ الرحمن الرحیم، من محمد عبد الله و رسوله "
۲۔ " الی هرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الهدی اما بعد "
۳۔ " فانی ادعوك بدعاية الاسلام اسلم تسلم يوتك الله "
۴۔ " اجرك مرتين فان توليت فعليك اثم الاريسيين و يا اهل الكتا "
۵۔ " ب تعالوا الی كلمة سواء بيننا و بينكم الا نعبد الا الله "
۶۔ " ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من "
۷۔ " دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مس "
۸۔ " لمون "

(مہر نبوت)
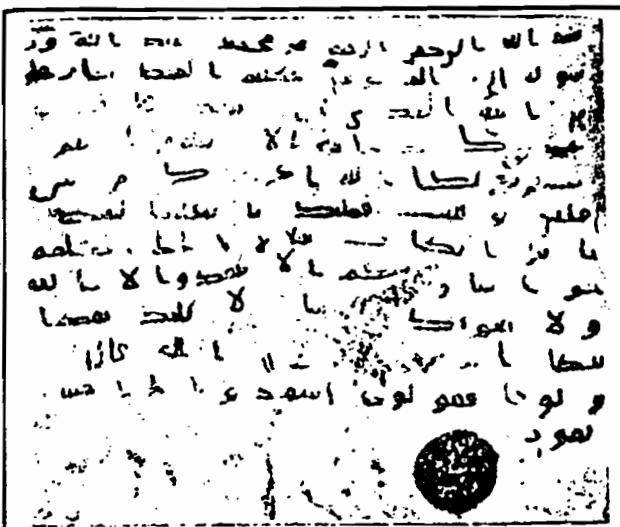
آنحضرت ؐ کا یہ مکتوب گرامی ہرن کی چکنی کھال پر لکھا ہوا ہے۔ آپ کے جتنے خطوط ملے ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ خوبصورت اور واضح صاف ستھرے مدنی رسم خط میں ہے اس کے سارے الفاظ آسانی سے پڑھ لئے جاتے ہیں، البتہ مہر نبوت کے بعض الفاظ مٹ سے گئے ہیں۔ یہ خط کالی روشنائی سے بغیر اعراب کے اور نقطوں کے لکھا گیا ہے۔

آپ کا یہ مکتوب گرامی اردن کے بادشاہ الملک حسین بن طلال کے پاس محفوظ ہے۔ اس کا اعتراف بادشاہ نے قوم کے نام ایک اعلان میں ماہ اپریل ۱۹۷۷ء میں کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے اس مقدس امانت کو مسجد الہاشمیہ میں جو الوادی الاخضر میں واقع ہے مزید حفاظت کی غرض سے رکھ دیا ہے۔ یہ مسجد بادشاہ کے محل کے قریب بنی ہوئی ہے۔

(صـــ کا حاشیہ باقی)

معاویہ کے عہد خلافت میں ناصرہ کے قریب ایک گاؤں نیم میں تقریباً ۴۵ھ ۶۶۵ء میں انتقال ہوا۔

نمونہ ۴

رسالة النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی المقوقس عظیم القبط حملها الیہ الصحابی
حاطب ابن ابی بلتعة اللخمی

آنحضرت کا یہ خط قبطیوں کے بادشاہ مقوقس کے نام ہے۔ اس مکتوب گرامی کو مشہور صحابی حاطب بن بلتعہ لے کر گئے تھے (۱) خط کی عبارت بترتیب سطور اس طرح ہے۔ اس میں ۱۲ سطریں اور ۱۰۷ الفاظ ہیں اور آخر میں مہر نبوت ثبت ہے:

۱۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (من) محمد عبداللہ (ور)"

۲۔ "سوله (الی المقوقس) عظیم القبط (سلام) علی"

۳۔ "من اتبع الهدی (اما) بعد (فانی اد)"

۴۔ "عوك بدعاية (الا) سلام اسلم"

۵۔ "(تسلم) یوتك الله اجرك (مرتين)"

۶۔ "فان توليت فعليك اثم القبط"

۷۔ "(ویا) اهل الکتاب (تعالوا) الی کلمة"

۸۔ "سواء بيننا و بينكم الا نعبدوا الا (ا) لله"

۹۔ "ولا نشرك (به شيئا) ولا يتخذ بعضنا"

۱۰۔ " لعضا اربابا (من دون) الله فا (ن) تو"

۱۱۔ " لوا فقولوا اشهدوا (بانا) مس"

۱۲۔ " لمون"۔

مہر نبوت

الله
رسول
محمد

۱۸۵۰ء میں مشہور فرانسیسی مستشرق "بارشیلیمہ" نے اس مکتوب گرامی کا پتہ لگایا یہ خط اوپری مصر (صعید مصر) کے اخمیم قبطی گرجا گھر کے ایک قدیم قبطی انجیل کے ٹائٹل پیج پر چپکا ہوا تھا۔ پتہ لگنے کے بعد اسے سلطان عبدالحمید کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ سلطان نے اسے سونے کے ایک فریم میں لگوا کے اور خالص سونے کا ایک منقش صندوق بنوا کر اس میں محفوظ کر دیا۔ یہ نامہ مبارک اس وقت ترکی میں استنبول کے طوب قپو عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

یہ نامہ مبارک بھی ابتدائی چکنے چمڑے پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مدنی طرز تحریر کا استعمال کیا گیا ہے اور سطروں کی سیج دھج اور لکھائی بہت اچھی ہے۔ سطروں کے درمیان مناسب فاصلہ اور الفاظ کے بیچ میں معقول دوری ہے۔ اور سب الفاظ واضح اور صاف ہیں' اور آسانی سے پڑھ لیے جاتے ہیں۔ حسب دستور اس کی عبارتوں پر بھی نہ اعراب ہے اور نہ الفاظ پر نقطے وغیرہ۔ اسے کالی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اس خط کی تحریر اور ہرقل کے نام آپ کے نامہ مبارک میں بڑی مشابہت ہے۔ اس وجہ سے بعض ماہروں کا خیال ہے کہ ان دونوں خطوں کو ایک ہی صحابی نے لکھا ہے۔ اس خیال کی

ص۔ کا حاشیہ :۔ (۱) قبطیوں کے بادشاہ مقوقس جس کا نام "جریج بن مینا" تھا، ان دونوں اسکندریہ میں تھا' وہیں حضرت حاطب نے اسے یہ نامہ مبارک پیش کیا۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اللخمی یمنی تھے اور آنحضرت کے ساتھ غزوہ بدر اور دوسرے تمام معرکوں میں شریک رہے وہ قریش کے بہت بڑے شہسوار اور ان کے نامور شاعر بھی تھے۔ آنحضرت کے معتمد خاص تھے' ان کی ولادت ہجرت نبوی سے تقریباً ۲۵ سال پہلے ہوئی تھی۔ جب نامہ مبارک لے کر گئے تو ان کی عمر تقریباً ۳۴ سال تھی۔ ۶۵ سال کی عمر میں (یعنی ۳۴ سال خط کے پہونچانے کے بعد) انتقال ہوا۔ حضرت عثمان نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مدینہ منورہ میں سپرد خاک ہوئے۔

تائید میں انھوں نے کئی دلیلیں پیش کی ہیں (۱) جن کو لکھنے کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

مقوقس نے عزت و قدر سے نامہ مبارک حضرت حاطب سے لیا اور ان سے اسلام اور آنحضرت ؐ کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اور بظاہر مطمئن ہوگیا، پھر بولا کہ "قبطی ان کی (آنحضرت ؐ) کی میری اطاعت کرنے پر راضی نہ ہوں گے، میں یہ نہیں چاہتا کہ میری تمہاری گفتگو کا کسی کو علم ہو، اب تم اپنے صاحب (دوست) کے پاس واپس جاؤ۔ اور میرا یہ خط ان کو پہونچا دینا، مقوقس نے آپ کے نامہ مبارک کے جواب میں ایک خط لکھ کر دیا، جس میں کہا ہے کہ میں نے آپ کا خط بغور پڑھا اور جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسے سمجھ لیا ہے اور جس کی دعوت دے رہے ہیں اسے بھی۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ ایک نبی آنے کو ہیں، لیکن سمجھتا تھا کہ وہ شام میں ظاہر ہوں گے ۔۔۔۔ میں نے آپ کے قاصد کی بڑی عزت و احترام سے پذیرائی کی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں ان کے ذریعہ دو لونڈیاں جن کی قبطیوں کی نگاہ میں بڑی قدر و منزلت ہے، اور ایک خچری تحفہ میں بھیج رہا ہوں۔ ما تی والسلام علیک :

ان دو لونڈیوں میں سے ایک حضرت ماریہ قبطیہ تھیں، جو مسلمان ہوگئیں اور آنحضرت ؐ کے عقد میں اُم المومنین کے عزت سے سرفراز ہوئیں، انھیں کے بطن مبارک سے آنحضرت ؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم پیدا ہوئے۔ دوسری لونڈی حضرت سیرین تھیں، جنھیں آنحضرت ؐ نے حضرت حسان بن ثابت کو ہدیہ میں دے دیا۔ خچری جس کا نام "دلدل" تھا، حضرت معاویہ کے عہد خلافت تک زندہ رہی۔

---

(۱) تفصیل کے لیے رسالہ "الوثیقہ"، العدد الاول۔ السنۃ الاولیٰ، رمضان ۱۴۰۲ھ مطابق جولائی ۱۹۸۲ء ملاحظہ کیجیے۔ اسی رسالہ سے مذکورہ تمام معلومات لی گئیں ہیں۔ اس عربی مضمون کا ترجمہ جناب ڈاکٹر فیضان اللہ فاروقی، ریڈر شعبہ عربی، جواہرلال نہرو یونیورسٹی نے کر دیا ہے جو رسالہ معارف، ۶، اپریل و مئی ۱۹۸۵ء میں چھپ چکا ہے۔ عربی مضمون نگار ڈاکٹر عبداللطیف کا نو

ذیل میں قرآن کے مختلف رسم خط دیے جاتے ہیں۔

قرآنی مخطوطات کے بعض نادر نمونے

نمونہ ۱ :

قرآن شریف کے ایک نادر مخطوط کی چند سطریں۔ یہ مخطوط پہلی صدی ہجری کا ہے جو چمڑے پر ابتدائی کوفی رسم خط میں بغیر نقطہ اور اعراب کے لکھا گیا ہے۔ لکھائی کالی روشنائی

جزء من مخطوط قرانی نادر من القرن الاول الهجری كتب على الرق بالخط الكوفى البدائی المبسط بدون ای نوع من الاعجام من اصل صفحة كبيرة المقاس استعمل المداد الاسود بدون ای نوع من التكوين او الزهرفة الجمالية
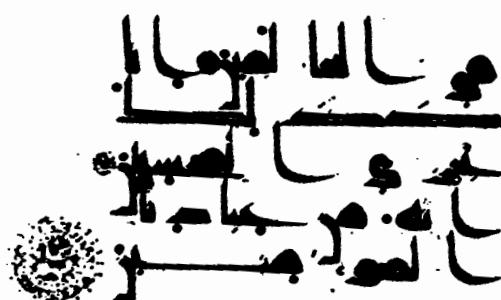
النص القرانی للمخطوط حسب الاسطر (سورة المائدة: ۷۲–۷۴

حرم الله عليه الجنة وماواه – جهنم وما للظالمين من انصار – لقد كفر الذين قالوا ان الله – ثالث ثلاثة وما من اله الا اله – واحد وان لم ينتهوا عما يقولون – ليمسن الذين كفروا منهم عذاب – اليم

سے اور بالکل سادی ہے۔ اس میں لکھی ہوئی آیتیں یہ ہیں :-

حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡجَنَّۃَ وَمَاۡوٰىہُ ۔ جَھَنَّمُ وَمَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ۔ لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ ۔ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ وَمَا مِنۡ اِلٰہٍ اِلَّاۤ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَاِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہُوۡا عَمَّا یَقُوۡلُوۡنَ ۔ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۔

مخطوطہ قرآن کا ایک دوسرا نادر نمونہ ۔ یہ دوسری صدی ہجری میں مدینہ منورہ میں چمڑے پر لکھا گیا تھا۔ یہ ترقی یافتہ خوبصورت کوفی رسم خط میں ہے۔ اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ابوالاسود الدولی کے ایجاد کردہ اعراب بھی ہیں، جو سرخ نقطوں سے ظاہر کیے گئے ہیں اور حجاج بن یوسف کے حکم سے نصر بن عاصم اور یعمر نے[1]

---

(۱) نصر بن عاصم اللیثی مشہور فقیہ اور متقی بزرگ متوفی ۸۹ھ ۔ یحیٰ بن یعمر عدوانی خراسان کے قاضی اور مشہور عالم متوفی ۱۲۹ھ ، حجاج بن یوسف ثقفی نے مذکورہ دونوں عالموں کی ایک کمیٹی بنائی تھی، جن کے ذمے قرآن کو عجمیوں کے غلط اعراب اور طریقے سے پڑھنے سے بچانے کے طریقے نکالنا اور اصلاحات کرنا تھا۔ کیوں کہ قرآن میں نہ نقطے ہوتے تھے اور نہ اعراب، ان دونوں عالموں نے اعراب اور نقطے لگانے کا طریقہ نکالا اور اس اہم کام کو ان دونوں نے تقریباً ۸۰ھ کے لگ بھگ انجام دیا۔

جو نقطے لگائے تھے وہ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ آیات درج ذیل ہیں۔

نمونہ ۲

مخطوط قرآني معجم كتب على الرق في المدينة المنورة بالخط الكوفي المجود وادخلت عليه التحلية الذهبية في مواقف الايات يرجع تاريخه الى القرن الثاني الهجري جمع التحديث الاول الذى ادخله ابو الاسود الدؤلي وهو تنقيط الاعراب النحوى (النقاط الحمراء) والتحديث الثاني الذى ادخل في ايام الحجاج بن يوسف الثقفي ويعتبر هذا المخطوط نادرا لانه استعمل الخطوط المائلة بدلا من النقاط لذلك اعجام الحروف الهجائية لاحظ كلمة . نجزى ، (في بداية السطر الثالث) كما وردت في المقال

النص القرآني للمخطوط حسب الاسطر (سورة الصافات 79—81)

في العالمين انا ○ كذلك ○ نجزى المحسنين ○ انه من عبادنا ○ المؤمنين ○

پہلی سطر = فِي الْعَالَمِينَ. إِنَّا ہ

دوسری سطر = كَذَٰلِكَ ہ

تیسری سطر = نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ہ

چوتھی سطر = إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا ہ

پانچویں سطر = الْمُؤْمِنِينَ ہ

نمونہ ۳

مخطوط قرآني

كوفي مطور محور معجم كتب في العراق على الورق البغدادي حسب التحديث الاول والثاني . النقاط الحمراء للدلالة على حركات الاعراب حسب تحديث ابي الاسود الدؤلي

والنقاط السود للدلالة على اعجام الاحرف كما وضعت في ايام الحجاج بن يوسف الثقفي يرجع تاريخه الى القرن الثالث الهجري وهذه الصفحة حصت تطور الخط العربي وصلته

نادر مخطوط قرآنی کا ایک تیسرا نمونہ یہ تیسری صدی ہجری کا رسم خط ہے جو عراق میں بغدادی کاغذ پر لکھا گیا تھا

اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بھی

ابو الأسود الدولی کا اعراب اور عاصم اور یعمر کے نقطے استعمال کئے گئے ہیں۔ چنانچہ لال رنگ کے نقطے ابو الأسود کے طریقہ پر اور کالے رنگ کے نقطے عاصم کے ایجاد کردہ طریقے پر لگائے گئے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نہ صرف پورے اعراب خوبصورتی سے نمایاں کئے گئے ہیں بلکہ کوئی طرز خط کو بھی اس صدی میں بہت ہی حسین اور دیدہ زیب بنا دیا گیا ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری میں لکھا گیا۔

نمونہ ۴ ایک اندلسی رسم خط کا

صفحة من مخطوط
اندلسي نادر كتب على الورق بالخط
المغربي المجود وادخل عليه
الاعجام والالوان المختلفة
للحركات حسب النهج الاندلسي
ويرجع تاريخه الى القرن السادس
الهجري ويلاحظ في هذا المخطوط
جودة الخط وكتابة الايات
القرانية بخط كبير منسق واضح
والايات الكريمات من سورة آل
عمران ۱۴۰-۱۴۴

قرآن شریف کے ایک نادر اندلسی (اسپینی) مخطوطہ کے دو صفحے، یہ مخطوطہ کاغذ پر خوبصورت مغربی (مراکشی) رسم خط میں چھٹی صدی ہجری میں لکھا گیا۔ اس میں اندلسی طریقے پر اعراب لگایا گیا ہے، اور مختلف رنگوں سے اس کو دیدہ زیب بنایا گیا ہے۔

ان دو صفحوں میں سورۃ آل عمران کی ۱۴۰ سے ۱۴۴ تک کی آیتیں ہیں۔

مذکورہ بالا خطاطی کے تمام نمونے اور ان کے متعلق تشریحی نوٹس عربی چھ ماہی رسالہ "الوثیقة" ، العدد الثالث ۔ السنة الاولیٰ، رمضان ۱۴۰۳ھ / جولائی ۱۹۸۳ء کے مضمون بعنوان "دراسة في كتابة المصحف الشريف" بقلم ڈاکٹر عبد اللطیف کانو سے لئے گئے۔ اس رسالہ کو "مرکز الوثائق التاریخیة، دولة البحرین" نکالتا ہے۔

چوتھا باب

صدرِ اسلام میں شعر و شاعری

اسلام اور شعر و شاعری

ایک عرصہ سے یہ بات ایک ثابت شدہ حقیقت کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام شعر و شاعری کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس بات کو یقین کا درجہ دینے میں کچھ تو عرب مؤرخین اور نقادوں کا ہاتھ ہے اور بہت کچھ یورپین مستشرقین کا جنھوں نے اس بات کو خوب ہوا دی۔

ابن عبدالبر نے اپنی کتاب "الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب" میں روایت کی ہے کہ عہد عباسی کے مشہور عالم اور شعر و شاعری کے راوی اور نقاد اصمعی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "شعر بڑی گھٹیا (نکد) چیز ہے (شر) برائی میں خوب پھلتا پھولتا ہے، اور (خیر) بھلائی میں کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے۔ پھر اس نے اپنے اس خیال کی تائید میں حسان بن ثابت کی مثال پیش کی اور کہا کہ حسان بن ثابت کو دیکھیے، ان کا شمار جاہلی شعراء کے صف اول کے شعراء میں ہوتا تھا، لیکن جب اسلام آیا تو ان کا شعر گر گیا"

ابھی یہ بحث جاری تھی کہ اصمعی کی رائے کہاں تک صحیح ہے کہ محمد بن سلام جمحی نے اپنی کتاب "طبقات فحول الشعراء" میں اصمعی کے قول کی یہ کہہ کر تصدیق کر دی کہ "پس اسلام اور شعر کہنے سے عربوں کی توجہ ہٹ گئی۔ چنانچہ وہ جہاد اور فارس و روم کی لڑائیوں میں مشغول ہو گئے اور شعر اور اس کی روایت کو بھلا بیٹھے (۲)

ابن سلام کے بعد ابن خلدون نے بھی ایسی بات کہہ دی جس سے اصمعی کی بات کو مزید تقویت حاصل ہو گئی۔ اس نے کہا! جان لو کہ شعر عربوں کا دیوان تھا جس میں ان کے علوم ان کی باتیں اور ان کا حکمت و فلسفہ محفوظ تھا۔ پھر عرب اس سے (شعر سے) ابتدائے اسلام میں پھر گئے، کیوں کہ دین کی باتوں، نبوت اور وحی نے ان کی توجہ اس

(۱) الاستیعاب مطبوعہ حیدر آباد، اور دراسات فی الشعر العربی: ڈاکٹر محمد مصطفیٰ ہدارۃ۔

(۲) طبقات فحول الشعراء ص ۲۲۔

طرف سے ہشادی اور قرآن کے اسلوب بیان اور اس کے نظم نے ان کو اس قدر حیرت زدہ اور ششدر کر دیا کہ انھوں نے اس سے (شعر سے) اپنی زبان بند کرلی اور ایک عرصہ تک نظم و نثر میں کچھ کہنے کے بجائے خاموش ہو گئے (۱)

ابن خلدون کے بعد جتنے تذکرہ نگار، نقاد اور مؤرخ آئے انھوں نے غالباً بغیر سوچے سمجھے اصمعی کی تائید کر دی۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کے مؤرخین میں جرجی زیدان جیسے صاحب فہم و فراست عیسائی مؤرخ، اور حد تو یہ ہے کہ اس زمانے کے مشہور تذکرہ نگار مؤرخ، ادیب اور معتدل و متوازن نقاد ڈاکٹر شکری الفیصل (۲) نے بھی پوری عقلی اور نقلی دلیلیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں شعر و شاعری ماند پڑ گئی، وہ کہتے ہیں کہ۔۔۔۔ چنانچہ ہم اس زمانے (صدر اسلام) میں کوئی ایسا شاعر نہیں پاتے جس میں طرفہ کی استاذانہ عظمت و رفعت۔ امرؤ القیس کی جدت طرازی و ندرت، عنترہ کی نغگی و موسیقیت یا نابغہ کی دانائی و حکمت ملتی ہو (۳)

اس طرح عام طور سے اکثر نقاد اس بات کو بغیر سوچے سمجھے اور جملوں کو حالات و حقائق کی روشنی میں دیکھے بغیر نقل کرتے چلے گئے اور یہ خیال عام ہو گیا کہ واقعی اسلام اور آنحضرتؐ کو شعر و شاعری سے نفرت تھی۔ اس پر سہاگہ کا کام مستشرقین میں بروکلمن نے جس نے اپنی کتاب تاریخ ادب عربی میں صاف طور سے کہا ہے کہ آنحضرتؐ شعر و شعراء دونوں سے نفرت کرتے تھے۔ جب اپنوں اور غیروں دونوں نے ایک ہی بات کہہ دی تو پھر شک کی گنجائش کہاں رہ گئی۔ چنانچہ یہ بات عام لوگوں کے ذہن میں بیٹھ گئی کہ اسلام اور آنحضرتؐ کے نزدیک شعر و شاعری غیر مستحسن کام اور اس کام کو کرنے والا غیر پسندیدہ شخص ہے۔

مگر موجودہ زمانے میں تاریخ ادب عربی کے سلسلہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں اور حالات و کوائف کی چھان بین کرنے کے بعد جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں، ان کی روشنی میں حقیقت بالکل دوسری نظر آتی ہے۔ یعنی یہ کہ نہ تو قرآن نے اور نہ ہی آنحضرتؐ نے شعر و شاعری کو برا سمجھا اور نہ اسلامی زمانے میں شعر و شاعری کمزور ہوئی یا ماند پڑی۔ بلکہ اس زمانے کے عام دستور

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ۱/۱۲۲ (پیدائش ۱۳۳۲ء وفات ۱۴۰۶ء) (۲)۔ حال ہی میں انتقال ہوا ہے،

(۳) تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام، اس کے علاوہ اس زمانے میں دوسری کتابیں بھی نکلی ہیں جن میں اس نظریہ کی تائید ہے۔

کے مطابق آپ نے بھی اس کو ایک دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے اور اپنے ساتھی شعراء کو حکم دے کر مخالف شعراء کا جواب دلوایا ہے اور اس قسم کے اشعار خود سنے ہیں بلکہ شاعر کو اپنے منبر پر بٹھا کر شعر سنانے کی فرمائش کی ہے۔ اور اس کے حق میں خدا کی مدد اور ملائکہ کے تعاون کی دعا بھی کی ہے (۱) یہی نہیں بلکہ اپنے ایک مخالف شاعر سے جس کے قتل کر دینے کی آپ نے منادی کرادی تھی، محض اس کے شعری معذرت نامے سے اس قدر خوش ہوئے کہ صرف اس کی غلطی اور بدتمیزی ہی نہیں معاف کی بلکہ فرط انبساط میں اپنی چادر بھی اس کو اڑھا دی اور یہ اس زمانے کے اعتبار سے بہت بڑی عزت افزائی اور قدردانی تھی (۲) تفصیل آگے کعب بن زہیر کی سوانح حیات میں۔

آنحضرت ؐ کے بعد خلفائے راشدین کے زمانے میں فتوحات کے وقت تو رزمیہ اور فخریہ شاعری کی ایسی بہتات ہوئی اور ایسے معیاری اور پائے کے شعر کہے گئے جو بعض باتوں میں زمانہ جاہلی کی شاعری سے بھی بڑھ گئے، اور اس شعری معرکہ میں بھی مسلمان شعراء اپنے مخالف شعراء کا منہ توڑ جواب دیتے رہے۔

اس زمانے میں، اس موضوع پر ڈاکٹر شوقی ضیف، ڈاکٹر یحیی الجبوری اور ڈاکٹر عبداللہ الحامد نے بہت اچھا کام کیا ہے (۲) اور موضوع کا ہر پہلو سے مطالعہ کر کے ثابت کیا ہے کہ رائج شدہ خیال نہ صرف غلط بلکہ گمراہ کن اور علمی حقائق سے پردہ پوشی ہے۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اسلام عام طور سے اپنے بنیادی اصول اور شریعت کے دائرے میں رکھتے ہوئے، انسانوں کو ان تمام تفریحی کاموں کے کرنے، اور ان تمام نعمتوں سے بہرہ ور ہونے اور دماغی عیاشی کرنے کی اس طرح اجازت دیتا ہے کہ آدمی کو خود یا دوسروں کو بھی لطف آئے بشرطیکہ اس فعل سے خود آدمی کو اور دوسری طرف سماج اور معاشرہ کو بحیثیت مجموعی کوئی نقصان نہ پہونچے، یا اس کی قائم کی ہوئی حدود کو اس قسم کا کوئی عمل یا فعل، پار نہ کر جائے۔ یا مفروضہ عبادتوں میں تغافل تساہل اور

(۱) جیسے آپ کے صحابی شاعر حضرت حسان بن ثابت۔ تفصیل حسان کی سوانح میں۔ (۲) جیسے کعب بن زہیر کا قصہ اور اس سلسلہ میں ان کا معذرت نامہ۔ (۲) اس سلسلہ میں ڈاکٹر شوقی ضیف نے اپنی کتاب "تاریخ الادب العربی ''العصر الاسلامی میں اچھی بحث کی ہے اور زمانہ فتوحات کی شاعری کے نمونے بھی دئے ہیں۔ اس کے علاوہ ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر یحیی الجبوری کی کتاب "شعر المخضرمین" اور ڈاکٹر عبداللہ الحامد کی کتاب "الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام"

جب عام تفریحات میں اسلام کا یہ اصول ہے، تو شاعری کے بارے میں، جو شاعر اور سامع دونوں کو تفریحی سامان بہم پہونچانے کے علاوہ، ایک بہت مؤثر، فعال اور ساتھ ہی ساتھ حسین ذریعہ ابلاغ اور وسیلۂ تعلیم بھی ہے، اور دوسری طرف ایک ایسا فن بھی جو ادب و زبان میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے، اور جو ایک طرف انسانی ذہن و فکر اور سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی طاقتوں کو جلا دینا اور ان کی آبیاری کرتا ہے، تو دوسری طرف فرد اور سماج دونوں کے احوال و کیفیات کی ایسی مؤثر تصویر کشی کرتا ہے کہ کبھی دل دھڑکنے اور جذبات بھڑکنے لگتے ہیں اور کبھی دل و دماغ کو وہ سکون و اطمینان دینا، اور جذبات و احساسات میں وہ ٹھہراؤ پیدا کرنا اور اعتدال بخشتا ہے جو کسی دوسرے ذریعہ کے بس کی بات نہیں۔ ظاہر ہے کوئی کام ہو یا کوئی فن ہو، جب فرد یا سماج کو نقصان پہونچانے لگے یا ان سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو تو کسی قسم کی حکومت ہو یا کسی قسم کا سماج ہو، اس کی اجازت نہ دے گا اور نہ ایسے لوگوں کی ہمت افزائی کرے گا۔ اسلام نے بھی نقطۂ نظر شعر و شاعری کے متعلق اختیار کیا ہے۔

شعر و شاعری سے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر کی سب سے پہلی ترجمانی اس آیت سے ہوتی ہے۔ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ۔ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا۔ (۱) یعنی (ترجمہ حضرت تھانوی رح) اور شاعروں کی راہ تو بے راہ لوگ چلا کرتے ہیں۔ (اے مخاطب) کیا تم کو معلوم نہیں کہ وہ (شاعر) لوگ (خیالی مضامین کے) ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہاں مگر جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور انھوں نے (اپنے شعار میں) کثرت سے اللہ کا ذکر کیا، اور انھوں نے بعد میں اس کے کہ اُن پر ظلم ہو چکا ہے (اس کا) بدلہ لیا۔

ان آیات میں شعر کی نہیں، بلکہ درحقیقت شاعر، اس کی طبیعت اور اس کے قول و فعل کی نوعیت اور کیفیت کی نشان دہی کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا کہ شاعروں کے قول و فعل کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ ان کی پیروی من چلے کھلنڈرے قسم کے لوگ کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ عام شعراء کا مزاج ہے کہ وہ بھونرے کی طرح باغ باغ میں گھس

---

(۱) سورۃ الشعراء، آیت ۲۲۴ تا ۲۲۷ تک

گھن کرتے اور کلی کلی پر منڈلاتے پھرتے ہیں، یعنی ان کے خیالات و افکار، ان کی پسند و ناپسند ان کے خوب و ناخوب کے لیے بندھا ٹکا معیار یا جانچا پرکھا اصول نہیں ہوتا۔ اسی لیے وہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر ان کے قول و فعل میں مطابقت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فخر میں یا مدح میں زمین و آسمان کے ایسے قلابے ملاتے ہیں کہ وہاں تک صرف ذہن ہی کی رسائی ممکن ہے عملاً خارج میں اس کا وجود محال ہوتا ہے یا اپنی یا اپنے ممدوح کے جود و سخا اور شجاعت و بہادری کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ ایک سماں بندھ جاتا ہے، حالاں کہ عملاً دشمن کے ایک آدمی کو بھی دیکھ کر اوسان خطا ہو جاتے ہیں، جیسا کہ بعض نامور شعراء کے متعلق مشہور ہے۔ البتہ اس قسم کی ناپسندیدہ بات یا مضحکہ خیز تعریف و توصیف سے ایمان والے شعراء، جنھوں نے عمل صالح کیے، اور ظلم و جور اٹھانے کے بعد کامیابی و سرفرازی سے بہرہ ور ہوئے، وہ شعراء کے عام حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اس طرح اسلام نے گویا ان آیات میں صرف شاعر کی طبیعت اور مزاج کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ اور اچھے اور برے شعراء کے درمیان حد فاصل ایمان اور عمل صالح کو قرار دے کر اپنے نقطۂ نظر کو واضح کر دیا ہے۔ اور اس طرح ان آیات سے شعر و شاعری کی حرمت یا ناپسندیدگی کا پہلو کہیں سے نہیں نکلتا۔

اس مسئلہ میں حدیث کا معاملہ بھی کم و بیش یہی ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر آنحضرتؐ سے جو پہلی حدیث مروی ہے، وہ ہے" لأن يمتلئ جوفُ الرجلِ قيحاً حتى يريَهُ خيرٌ له مِنْ أنْ يَمتلئَ شعراً" (۱)

یعنی اگر آدمی اپنا پورا پیٹ پیپ سے بھر لے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنا پیٹ شعر سے بھرے۔

مگر اس حدیث کے پیچھے ایک کہانی ہے جس کے بغیر اس کا مطلب صحیح طریقے سے واضح نہیں ہو سکتا، چنانچہ حضرت ابو سعید سے روایت ہے کہ ہم ایک دفعہ آنحضرتؐ کے ساتھ عرج میں چل رہے تھے کہ اتنے میں ایک شاعر کچھ گاتا ہوا نمودار ہوا، آنحضرتؐ نے جو یہ دیکھا تو فرمایا کہ لینا تو اس شیطان کو یا پکڑنا تو اس شیطان کو، کہ تم میں سے اگر کوئی آدمی

(۱) ــــ یہ حدیث تھوڑے بہت لفظی اختلاف کے ساتھ مختلف طریقوں اور مختلف موقعوں پر صحیح مسلم، صحیح بخاری، ابن ماجہ اور سنن ابو داؤد میں آئی ہے۔
۴/۲۷۳، ۴۵/۸، ۱۲۳۲/۲، ۴/۱۴/۴

اپنا پورا پیٹ پیپ سے بھرے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنا پیٹ شعر سے بھرے۔
اس واقعہ سے اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ ان اشعار کا لوگوں پر کوئی غیر معمولی اثر ضرور ہوا ہوگا جیسے آپ نے محسوس کیا ہوگا، اور دوسری بات یہ کہ اس شاعر کے کلام میں یا اس کے گانے میں ضرور کوئی بات آنحضرتؐ اور اسلام کے نقطۂ نظر سے قابل اعتراض رہی ہوگی، یا تو یہ کوئی مشرک شاعر تھا جو اپنے اصنام اور مورتیوں وغیرہ کی تعریف وتوصیف میں شعر شمار ہا تھا یا کوئی بداخلاق اور بگڑا دل شاعر تھا، جو جاہلی انداز پر عریاں غزلیہ اشعار پڑھ رہا تھا، اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جو نہ اس نئے اسلامی عربی سماج کے لیے مناسب تھیں اور نہ اسلام کے لیے، کیوں کہ ان دونوں باتوں سے آدمی کے دل کا خدا کی ذکر وفکر سے ہٹ جانے کا خطرہ ہے، اسی لیے امام بخاری نے اپنی کتاب میں اس حدیث کو "انسان پر شعر کے اس طرح غالب آجانے کی ناپسندیدگی کے بارے میں کہ اس کو اللہ کی یاد اور حصول علم وقرآن سے روک دے" (۱) کے باب کے تحت ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے اس وقت لوگ نئے نئے مسلمان ہو رہے تھے، ایک نئے سماج کی داغ بیل پڑ رہی تھی ایسی حالت میں کوئی بھی مصلح ایسی باتوں کی کھلے عام اجازت کیسے دے سکتا تھا، جس سے سارے مشن کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ شطرنج اور دوسرے کھیلوں کی اسلام میں ممانعت نہیں ہے، لیکن اگر آدمی ان میں اتنا منہمک ہو جائے کہ نماز وغیرہ کا ہوش نہ رہے تو یہی اجازت ممانعت میں بدل جائے گی اور اس قسم کی ساری مشغولیات مکروہات یعنی ناپسندیدہ کاموں میں شمار ہونے لگیں گی، لیکن حرام چیزوں میں نہیں۔ اسی طرح شعر وشاعری کا معاملہ ہے کہ اگر اس کو دلچسپی، خوش وقتی، لطف محفل، اور فرحت وانبساط کے لیے استعمال کیا جائے تو کوئی حرج نہیں (۲) کیوں کہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ شاعر اپنے کلام میں محض دینی باتیں کہیں یا محض پند ونصیحت کا انداز اختیار کریں، البتہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ شاعر اپنے شعر کو، سماج میں برائیاں، بے حیائیاں پھیلانے یا کسی کی بے عزتی کرنے یا فسق وفجور اور بے شرمی کی باتوں کو پسندیدہ اور قابل تعریف چیز بنا کر پیش کرنے کا ذریعہ نہ بنائے، جس کی اسلام ہی کیا، کوئی مذہب اور کوئی معقول سماج اجازت نہیں دیتا۔ اسی لیے آنحضرتؐ نے ہجو کے بارے میں فرمایا تھا کہ "جو کوئی

---

(۱) بخاری ۱۵/۸، (۲) العمدہ ۱/۳۴ بحوالہ "الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام" ڈاکٹر عبد اللہ المحامد/ ۳۰

اسلام میں بے ہودہ ہجو گوئی کرے گا تو اس کی زبان کاٹ لی جائے گی" (من قال فی الاسلام هجاء مقذعا فلسانه هدر"۔ اسی حکم کی بنیاد پر حضرت عمر نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس زمانے کے مشہور ہجو گو شاعر حطیئہ سے ایک بے ہودہ ہجو کہنے کے بعد کہا تھا کہ آئندہ سے کسی کی ایسی ہجو کی تو تیری زبان کاٹ لوں گا اور ایک موقعہ پر تو اس جرم کی پاداش میں اس کو قید بھی کر دیا تھا۔

چوں کہ شعر براہ راست آدمی کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے اس لئے آنحضرتؐ نے ان مرثیوں کو بھی پڑھنے سے منع فرما دیا تھا جو مسلمانوں اور مکہ والوں کی لڑائیوں میں مرنے والوں پر کہے گئے تھے کہ مبادا ان کو سن کر دشمنی اور کینے کے جذبات پھر سے نہ ابھر آئیں اور دلوں کا میل صاف ہونے کے بجائے اور بڑھتا جائے۔ کیوں کہ اسلام شعر و شاعری کو ادبی و فنی نقطۂ نظر کے علاوہ دل چسپی کی چیزوں میں شمار کرتا ہے، اب اگر بجائے خوش وقتی کے اس کے ذریعہ فسق و فجور اور بے شرمی و بے حیائی کو بڑھاوا ملے یا غم و غصہ یا حسد و کینہ کے جذبات ابھریں یا ان کی وجہ سے زمانہ جاہلی کی بعض ناپسندیدہ رسوم یا رواجوں کی طرف ذہن جائے یا ایسے اثرات پیدا ہوں تو ایسے شعر کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے کبھی بھی کھل کر شعر کہنے، سننے یا اس سے لطف لینے کو منع نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس شعر کی حیثیت یہ فرما کر بہت بڑھا دی کہ" إنَّ مِنَ البيانِ سحراً وإنَّ من الشعر حكماً" (۱) یعنی بعض اسلوب جادو بیانی اور بعض اشعار حکمت و دانائی کا خزانہ ہوتے ہیں۔ اسی حکمت کے پیش نظر آپ جب قریشیوں سے اپنے بارے میں اور اسلام کے بارے میں ہجو سنتے سنتے تھک گئے تو حسان بن ثابت، کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ سے خود ہی قریشیوں کی ہجو کہنے کی فرمائش کی، اور حضرت حسان سے تو یہاں تک فرمایا کہ جب تک تم خدا اور اس کے رسول کی طرف سے مدافعت کرتے رہو گے، روح القدس (حضرت جبرئیل) تمہاری مدد کرتے رہیں گے۔ اور جب حضرت حسان نے ان کی ہجو میں اشعار کہے تو خوش ہو کر فرمایا "هجاهم حسان فشفى واشتفى" (۲) یعنی حسان نے ان کی

(۱) بخاری، سنن ابوداؤد، ابن ماجہ، (۲) پوری حدیث صحیح مسلم میں حضرت عائشہ کی روایت سے ہے اور دلائل الاعجاز عبدالقاہر الجرجانی بھی دیکھئے۔

ہجو کر کے میرے دل کو بھی اور اپنے دل کو بھی ٹھنڈک پہونچائی۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ "اِنما الشعر کلام"، فحسنه حسن، و قبیحه قبیح"[1]
یعنی شعر بھی کلام کی ایک قسم ہے تو اس کا جو حصہ اچھا ہوگا اسے اچھا سمجھا جائے گا اور جو برا ہوگا اسے "برا" اور اس سے بڑھ کر آپ کا شعر پسند کرنے اور اس کو ایک مؤثر ذریعہ کے طور پر استعمال کرنے کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ جیسا اوپر ذکر ہوا آپ نے تینوں شعراء سے قریشیوں کا جواب دینے کی خواہش کی، اور حضرت حسان کو اپنی مسجد کے منبر پر بٹھا کر قریشیوں کے جواب میں کہے گئے اشعار سنے، چنانچہ آپ کے وصال کے بعد ایک دفعہ حضرت حسان مسجد نبوی میں اسی قسم کے اشعار سنا رہے تھے کہ حضرت عمر ادھر سے گزرے اور ان کو بڑی ٹیکھی نگاہوں سے دیکھا۔ حضرت حسان نے بھی تیور بدل کر کہا کہ جاؤ جاؤ میں اس جگہ اس شخص کو شعر سناتا تھا جو تم سے بہتر تھا (یعنی آنحضرتؐ) اس کے بعد مشہور صحابی اور راوی حدیث حضرت ابو ہریرہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ "تمہیں خدا کی قسم ہے کیا تم نے آنحضرتؐ کو یہ کہتے نہیں سنا تھا کہ" اجب عنی، اللھم أیدہ بروح القدس"؟ یعنی (اے حسان) میری طرف سے ان قریشی شاعروں کا جواب دو، اے اللہ اس کی (یعنی حسان کی) روح القدس کے ذریعہ تائید کر"؟ تو حضرت ابو ہریرہ نے کہا" اللھم نعم"، یعنی میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ہاں (وہ جملہ کہتے سنا تھا)[2] اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ قصہ تو عربی ادب کے ایک معمولی طالب علم کو معلوم ہے کہ کعب بن مالک جیسے گستاخ اور اسلام اور آنحضرتؐ کے شدید مخالف شاعر کی، جس کا خون آنحضرتؐ نے "بدر" کر دیا تھا[3]، محض ایک مدحیہ معذرتی قصیدہ کی بدولت، صرف خطا معاف کر کے جان بخشی ہی نہیں کر دی بلکہ فرط انبساط میں اپنی چادر مبارک (اتار کر ان کو) اڑھادی، جس کی وجہ اس قصیدہ کا نام ہی قصیدہ البردۃ، یعنی چادر والا قصیدہ پڑ گیا۔ بعد میں اسی کی بنیاد پر آپ کی تعریف و توصیف میں کئی قصائد کہے گئے جو "قصائد البردۃ" کے مخصوص نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ جیسے بوصیری اور شوقی کے قصائد

---

(1) حوالہ سابق۔

(2) تفصیل کے لئے دیکھیے صحیح مسلم، صحیح بخاری، ابو داؤد اور نسائی۔ (3) جان سے مار دینے کی اجازت۔

کم و بیش یہی رویہ آپ کے خلفاء کا بھی تھا حضرت عمرؓ جیسے سخت کوش خلیفہ کے متعلق یہ روایت بہت مشہور ہے کہ انھوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا تھا کہ لوگوں کو شعر سیکھنے کا حکم دیا کرو کیوں کہ اس سے اعلیٰ اخلاق کی تربیت صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت اور حسب و نسب کا علم ہوتا ہے (۱)

اسلام نے شعر و شاعری سے متعلق نئے دینی و سماجی حالات، اشخاص اور جماعتوں کی مخصوص ضروریات اور تقاضوں اور ایک مخصوص دین کی بنیاد پر ابھرتی قوم اور پروان چڑھتی ہوئی ملت کی امیدوں، آرزوؤں، امنگوں اور حوصلوں کے پیش نظر ایسا صاف واضح اور دور رس نتائج کا حامل نقطہ نظر اپنایا ہے جو کبھی بھی شعر و شاعری کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوا، بلکہ اس کے برخلاف اس پالیسی نے شعر و شاعری کی ترقی میں نہ صرف بڑا اہم رول ادا کیا ہے بلکہ اس بات کی بھی نشان دہی کر دی ہے کہ ایک اچھے سماج میں شعر و شاعری کی بنیاد اور اس کے اغراض و مقاصد کیا ہونے چاہئیں۔ اس بات کو جانچنے کے لئے جاہلی زمانے کی شاعری اور اسلامی عہد کی شاعری کی محض قلت و کثرت کے اعتبار سے موازنہ کر کے نتائج نہیں اخذ کرنا چاہئے بلکہ زبان و بیان کی معجز نمائی و گیرائی، معانی و مطالب کے تنوع اور گہرائی و اثر اندازی سے۔ شاعروں کی کثرت اور ان کے امتیازی خصوصیات سے اخذ کرنا چاہئے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ عہد جاہلیت کی شاعری جو اسلامی زمانے کے مقابلہ میں ایک بڑی مدت کو محیط ہے، محض چند گھسے پٹے مضامین اور محدود قسم کے خیالات، اور چند جنسی و شہوانی تجربات کی عکاسی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بہت اہم بات سوچنے کی یہ ہے کہ اگر اسلام شعر و شاعری کا مخالف ہوتا تو آنحضرتؐ کے زمانے سے لے کر آج تک وہ ہزاروں لاکھوں مسلمان شعراء جو صرف عربی زبان میں نہیں بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ابھرے، بھلا پیدا ہو سکتے تھے؟ اور اس طرح کھلے عام شاعری کر سکتے تھے، جس طرح کرتے رہے ہیں، اور جس کا سلسلہ آج تک بڑی شان سے جاری ہے؟ ہرگز نہیں، اگر اسلام یا آنحضرتؐ کا ادنیٰ اشارہ بھی اس کی مخالفت کا ہوتا تو شعر و شاعری کب کی اپنی موت آپ مر چکی ہوتی، جس طرح وثنیت اور

---

(۱) العمدۃ فی محاسن الشعر و آدابہ ونقدہ۔ لابن رشیق القیروانی، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید، القاہرہ۔

اوہام پرستی مسلمانوں میں ختم ہو کر رہ گئی اور جس طرح رقص، مجسمہ سازی، پینٹنگ اور تصویر کشی مسلمانوں میں بحیثیت پسندیدہ فن اور آرٹ کے آج تک مقبول نہ ہو سکے، اسی طرح شعر و شاعری بھی مسلمانوں میں پنپ نہ پاتی۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ عربی زبان میں کعب بن مالک کے انداز پر کہے گئے، آنحضرتؐ کی شان میں مدحیہ اور وصفیہ قصائد کا بعد میں عام رواج ہو گیا، اور رفتہ رفتہ اس قسم کی شاعری کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی اور اس کو ایک مخصوص رنگ اور صنف کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ جیسے بوصیری کا قصیدہ البردۃ (چادر والا قصیدہ) یا اسی انداز پر کہے گئے، شوقی کا قصیدہ "نہج البردہ" جو آج تک ممالک اسلامیہ میں مخصوص جلسوں اور مواقع پر خاص اہتمام اور بڑے ادب و احترام سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں،

عرب دنیا سے باہر کے مسلمانوں نے تو آنحضرتؐ سے شدید محبت، بے انتہا عقیدت اور آپ کی خاطر سرفروشی و جاں نثاری کے جذبے کے تحت اپنی شعر و شاعری میں ایک نئی اور مخصوص صنف سخن وضع کر لی، جس کو "نعت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس موضوع کا صرف آنحضرتؐ کی مدح، وصف، اور فضائل و امتیازات کا بیان کرنا ہے جیسے فارسی ادب اور اردو ادب کہ ان میں "نعت" کسی دوسری شخصیت کے وصف یا سراپا نگاری یا فضائل و امتیازات کے بیان کو کہہ ہی نہیں سکتے۔ بلکہ صرف آنحضرتؐ سے متعلق ان باتوں کے بیان کرنے کے لئے مخصوص ہے۔ جس طرح "حمد"، کہ عربی اور دوسری زبانوں میں صرف اللہ کی تعریف و توصیف کے لئے مخصوص ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر آنحضرتؐ یا اسلام شعر و شاعری کو ناپسند کرتے ہوتے تو آپ سے یا خدا سے متعلق ایک نئی اور خاص صنف سخن کو نہ صرف وضع کرنے بلکہ اس طرح آسانی سے رواج دینے، پروان چڑھانے کی اجازت دی جاتی جس طرح یہ دونوں اصناف سخن آج تک مروج اور مقبول ہیں، اور کیا مسلمانوں کی ۱۴ سو سال کی تاریخ میں کسی مرحلہ یا کسی زمانے یا کسی موڑ پر ایسا وقت نہ آتا کہ اس کے خلاف آواز اٹھائی جاتی؟ جب کہ انھیں مسلمانوں نے دین کے ادنیٰ ترین معاملہ میں بحث و مباحثہ ہی نہیں بلکہ مدتوں تک جھگڑا لڑائی کی ہے اور جب بھی معاملہ نہ ختم ہوا تو اپنی رائے کے مطابق مختلف فرقے وجود میں آ گئے، جن میں سے بعض آج تک باقی ہیں۔ بھلا اس قسم کا مزاج

رکھنے والے مسلمان شاعری کو اگر وہ ناپسندیدہ ہوتی تو اس طرح آسانی سے پنپنے دیتے، اس کو قبول کرتے، اور اس کو ادب و زبان کے ایک اہم اور جاندار فن کی حیثیت سے تسلیم کر کے اس کی ترقی و عروج کے لیے ہر قسم کی کوشش کرتے اور ہر زبان اور ہر زمانے میں ایسے ممتاز، باکمال، معجز نما شاعر پیدا کرتے جو اپنا نام زبان و ادب کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا گئے، اور جس کا سلسلہ ہر زبان میں اب تک چل رہا ہے۔

درحقیقت بات وہی ہے جس کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا کہ ہمارے بزرگوں نے محض بھروسہ اور اعتماد کی بنا پر ایک راوی اور ایک مورخ کی کہی ہوئی بات کو گرہ میں باندھ لیا، اور اس کی بنیاد پر، اسلام اور آنحضرتؐ کو بدنام کرنے والوں نے ایک جھوٹی عمارت کھڑی کر دی، اور فتویٰ دے دیا کہ اسلام اور آنحضرتؐ شعر و شاعری کے مخالف ہیں، حالاں کہ حق و حقیقت اس کے بالکل خلاف ہیں۔

آنحضرتؐ اور اسلام نے شعر و شاعری سے متعلق جو رویہ اپنایا تھا، اس کی طرف مذکورہ صفحات میں اشارہ کیا گیا۔ مزید باتیں مناسب موقعوں پر کہی گئی ہیں، جن کا خلاصہ بقول حاتم الرازی یہ ہے کہ "آنحضرتؐ نہ صرف شعر پسند فرماتے تھے بلکہ فرمائش کر کے سنتے بھی تھے (اور اپنے موافق شعراء سے اپنے مخالفین کا جواب بھی دلواتے تھے) شعر سن کر مجرموں اور خطا کاروں کو معاف فرما دیتے تھے، اور معذرت اور توبہ قبول فرماتے تھے اور اچھا شعر کہنے پر انعام و اکرام سے نوازتے بھی تھے، اور اچھا شعر سن کر فرطِ انبساط سے جھومنے لگتے تھے (۱)

جابر بن سمرۃ رضی اللہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں سو مرتبہ سے زیادہ بیٹھا ہوں، میں نے دیکھا کہ آپ کے صحابہ مسجد نبوی میں شعر خوانی کرتے تھے، اور جاہلیت کے بہت سے امور سے متعلق باتیں کرتے تھے تو آپ اکثر دیکھ کر مسکرا دیتے تھے، اس حدیث سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ آپ شعر کو اس قدر پسند فرماتے تھے کہ آپ کی مسجد میں مشاعرہ یا شعر خوانی ہوتی تھی۔ اور آپ منع نہیں کرتے تھے بلکہ اظہار پسندیدگی کے طور پر مسکرا دیتے تھے۔

---

(۱) الزینۃ فی الکلمات العربیۃ الاسلامیۃ لابی حاتم الرازی، تحقیق حسین بن فیض اللہ الہمدانی (الہندی) دار الکتاب العربی، ابغا...

آنحضرتؐ کے زمانے میں جو شعراء ابھرے ان میں سے اکثر وہ تھے جن کی پیدائش زمانہ جاہلیت میں ہوئی تھی اور جب آپ کا ظہور ہوا تو آپ پر ایمان لے آئے یا بدستور اپنے مذہب پر قائم رہے ایسے شعراء کو ادبی اصطلاح میں "مخضرمین" یعنی دو زمانے دیکھے ہوئے شعراء کہتے ہیں۔ مخضرم کا صحیح مفہوم کیا ہے، مخضرمین شعراء کون سے تھے، ان کے کلام کی کیا خصوصیات تھیں اور عربی ادب میں ان کی حیثیت اور مرتبہ کیا تھا، ان کا مطالعہ آئندہ صفحات میں تفصیل سے کیا جائے گا۔

حوالہ جات:

۱۔ الأدب فی موکب الحضارۃ الاسلامیۃ، ڈاکٹر مصطفیٰ الشکعۃ، مکتبۃ الانجلوالمصریۃ، القاہرۃ۔

۲۔ الأدب فی خدمۃ الحیاۃ والعقیدۃ؛ عبداللہ حمد الحویشق، دار العربیۃ، بیروت۔

۳۔ أسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ؛ عزالدین بن الاثیر،

۴۔ الاسلام والشعر، ڈاکٹر یحییٰ الجبوری، مکتبۃ النہضۃ بغداد۔

۵۔ أمالی المرتضیٰ (غرر الفوائد ودرر القلائد) الشریف المرتضیٰ، علی بن الحسین الموسوی العلوی۔

۶۔ تاریخ ابن خلدون (العبر ودیوان المبتدا، والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومن عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر) بیروت۔

۷۔ تاریخ الادب العربی (العصر الاسلامی) ڈاکٹر شوقی ضیف قاہرۃ۔

۸۔ تاریخ الادب العربی ج اول، ڈاکٹر عمر فروخ، بیروت۔

۹۔ تاریخ آداب العرب، مصطفیٰ صادق الرافعی، تحقیق محمد سعید العریان، قاہرہ۔

۱۰۔ تاریخ التمدن الاسلامی، جرجی زیدان، بیروت۔

۱۱۔ تاریخ الشعر السیاسی الی منتصف القرن الثانی احمد الشایب، قاہرہ۔

۱۲۔ تاریخ الشعر العربی حتیٰ آخر القرن الثالث الہجری ڈاکٹر نجیب محمد البہبیتی، بیروت۔

۱۳ - تطورالغزل بین الجاہلیۃ والاسلام، ڈاکٹر شکری الفیصل، بیروت۔
۱۴ - دواوین، حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحۃ کعب بن زہیر۔
۱۵ - الحیاۃ العربیۃ فی الشعر الجاہلی ڈاکٹر احمد محمد الحوفی، قاہرہ۔

"مُخَضرم" کی اصطلاح کا مطلب

لغت میں خَضرَمَ کے دو معنی ہیں :-

۱- اونٹ کے کان کاٹنا۔

جاہلی زمانے میں رواج تھا کہ عرب اپنے اونٹوں کے کان ایک مخصوص جگہ سے کاٹ دیتے تھے، لیکن جب یہ لوگ مسلمان ہوئے تو ان سے کہا گیا کہ وہ اپنے اونٹوں کے کان اس جگہ سے نہ کاٹیں جس جگہ سے زمانہ جاہلی میں کاٹتے تھے، تاکہ ان کے اور غیر مسلموں کے اونٹوں میں فرق کیا جا سکے۔ اس طرح جاہلی زمانہ کے "خضرمۃ" (اونٹ کے کان کاٹنا) اور مسلمانوں کے زمانے کے خضرمۃ میں نمایاں فرق ہو گیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ بنو تمیم کے کچھ لوگوں نے ایک جگہ رات گزاری اور ان کے اونٹ، (مسلمان) ہنکالے گئے تو انھوں نے دعویٰ کیا کہ انھوں نے اسلامی طریقہ سے ان کے کان کاٹے ہیں اور یہ کہ وہ لوگ مسلمان ہیں تو ان کے اونٹ ان کو واپس کر دیے گئے۔ کان کاٹنے کے اسی امتیازی طریقے کو دھیان میں رکھتے ہوئے "ہر اس شخص کو جس نے جاہلی اور اسلامی دونوں زمانے پائے مُخَضرَم کہتے ہیں"۔ کیوں کہ اس نے دونوں قسم کے خَضرَمَۃ پائے یعنی اسلامی زمانہ کا خضرمۃ اور جاہلی طریقہ کا خضرمۃ اور اسی سے "رَجُلٌ مُخَضرَم" اس آدمی کو کہتے ہیں جس نے اپنی عمر کا آدھا حصہ جاہلی زمانہ میں اور آدھا اسلامی زمانہ میں گزارا ہو، اسی طرح شاعر مُخَضرَم" وہ شاعر جس نے جاہلی اور اسلامی دونوں زمانے پائے ہوں، جیسے لبید وغیرہ۔ جنھوں نے دونوں زمانے دیکھے۔ (۱) رَجُلٌ "مُخَضرَم" اس آدمی کو بھی کہتے ہیں جس کا ختنہ نہ ہوا ہو۔

۲- ملانا

القاموس المحیط مؤلفہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی (۱۳۲۹ - ۱۴۱۴م) میں

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے لسان العرب، ابن منظور (م ۱۳۱۱ء) مادۃ خَضرَمَ

مادۃ خَضْرَمَ کے تحت آیا ہے کہ "المُخَضْرَم" "را" پر زبر کے ساتھ (۱) وہ آدمی جس کا ختنہ نہ ہوا ہو، (۲) وہ آدمی جس نے اپنی آدھی عمر جاہلی زمانہ میں اور آدھی اسلامی زمانہ میں گزاری ہو (یعنی دونوں زمانوں کو ملایا ہو) یا وہ آدمی جس نے یہ دونوں زمانے پائے ہوں۔ یا وہ شاعر جس نے یہ دونوں زمانے پائے ہوں، جیسے لبید، یا وہ کالا (حبشی) جس کا باپ سفید (عرب) ہو (یعنی دو رنگ اپنی ذات میں ملائے ہوں)۔

عبدالقادر البغدادی (۱۰۳۰ھ ۱۶۲۰ء — ۱۰۹۳ھ ۱۶۸۲ء) نے خزانۃ الادب ج اول (۱) میں سیوطی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اہل لغت کی اصطلاح میں "مُخَضْرَم" اس آدمی کو کہتے ہیں جس نے آدھی زندگی جاہلی زمانہ اور آدھی اسلامی زمانہ میں گزاری ہو، چاہے آنحضرتؐ کو دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، یعنی دونوں زمانوں کو اپنی زندگی میں ملایا ہو۔ اس مفہوم کو بڑھا کر بعد میں مخضرم ان شاعروں کو بھی کہا جانے لگا جنھوں نے دو زمانے یعنی بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانے دیکھے ہوں، جیسے رؤبۃ العَجاج، اور حمّاد عجرد (۲) کہ دونوں نے آنکھ کھولی بنو امیہ کے زمانے میں اور انتقال ہوا عباسی زمانے میں۔

۳۔ حَضْرَمَۃٌ بجائے خَضْرَمَۃٌ (ح بجائے خ) کی بھی روایت ہے۔ جس کے معنی بھی ملانے کے ہیں۔ جیسے شاعرٌ مُحَضْرَمٌ، یعنی وہ شاعر جس نے اسلامی اور جاہلی دونوں زمانے ملائے ہوں۔ ابن خلکان (۳) نے مُحَضْرِمٌ ("ر" کے نیچے زیر) کی روایت کی ہے۔

غرض کہ مُخَضْرَمٌ اور مُحَضْرِمٌ دونوں کے معنی دو رنگوں کو ملانے کے ہیں اسطرح اصطلاح میں مُخَضْرَم وہ شاعر ہے جس نے آنحضرتؐ کا زمانہ اور جاہلی زمانہ دونوں دیکھے ہوں چاہے آپ سے ملا ہو یا نہ ملا ہو۔ اس قسم کے شاعر مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی۔ اس لئے عام طور سے ادبی اصطلاح میں مخضرم صرف اس شاعر کو کہتے ہیں جس نے دونوں زمانے دیکھے ہوں، اور مسلمان بھی ہوا ہو، چاہے آنحضرتؐ کو دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، جیسے لبید بن ابی ربیعہ (۴)۔

---

(۱) کتاب کا پورا نام "خزانۃ الادب ولبُّ لُباب لسانِ العرب" ہے۔ مصنف کا پورا نام عبدالقادر بن عمر البغدادی (م ۱۰۹۳ھ) ہے۔ (۲) ان دونوں کے بارے میں اس کتاب میں ص ۔۔ پر تفصیل پڑھئے۔

(۳) ابوالعباس شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان ۶۰۸ھ — ۶۸۱ھ۔

(۴) حاشیہ ص ۱۳ پر)

طبقۂ مخضرمین میں چوں کہ عام طور سے تمام شعراء مسلمان ہیں، اس لیے ان کے یہاں زندگی کا منفی پہلو یا تصور نہیں پایا جاتا جیسا کہ جاہلی شاعری میں اکثر حالات اور شاعر کی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے ملتا ہے۔ بلکہ ایک نئی زندگی کا تخیل اور ایک نئے سماج کا تصور، اور ایک نئے ڈھنگ اور نئے رنگ سے کارگاہ حیات میں پورے عزم اور حوصلے کے ساتھ اپنا رول ادا کرنے کا مصمم ارادہ ملتا ہے، اور یہ سب دین ہے اسلام کی، جس نے جاہلی زمانہ کے کھنڈرات پر ایک نئی زندگی کا قصر زرین تعمیر کیا اور یہیں سے عربی زبان و ادب میں بقول بطرس البستانی قرآن کریم کے طفیل نیا اسلوب بیان اور نیا انداز تعبیر آیا جس میں ایسے الفاظ استعمال کیے گئے جو پہلے مستعمل نہ تھے۔ جیسے جنت، دوزخ، کفر، ایمان، صلوٰۃ، زکوٰۃ اور رکوع وغیرہ، یہ سب الفاظ جاہلی زمانے میں بھی عام طور سے لوگوں کو معلوم تھے، لیکن اسلام نے ان کو جن نئے معنوں میں استعمال کیا ہے، ان میں استعمال نہیں ہوتے تھے، اسی طرح اس طبقہ کے شعر میں ایک نئی صنف سخن اسی زمانہ میں وجود میں آئی اور وہ تھی "سیاسی ہجو گوئی"۔ ہجو کی یہ قسم بہت تلخ، فحش اور تکلیف دہ تھی، جس کی مثال آنحضرتؐ کے مخالف قریشی شعراء کے کلام میں اور آنحضرتؐ کی مدافعت کرنے والے شعراء کے کلام میں ملتی ہے (۱)۔

طبقۂ مخضرمین میں بہت سے شعراء گزرے ہیں، جن کو ہم نے ان کے خاص موضوعات کے پیش نظر علیحدہ طبقوں میں بانٹ دیا ہے، ان میں وہ شعراء بھی ہیں جنھوں نے آنحضرتؐ کی طرف سے مدافعت کا کام کیا۔ ان طبقوں میں مندرجہ ذیل بہت اہم ہیں۔ آئندہ صفحات میں ہم تھوڑی تفصیل سے ان کے حالات زندگی، اسلوب نگارش اور ان کی امتیازی خصوصیات کا مطالعہ کریں گے۔

۱۔ لبید بن ربیعہ، ۲۔ حسان بن ثابت الأنصاری، ۳۔ کعب بن مالک،

---

(۱) مخضرمین) جدید تذکرہ نگاروں میں مصطفیٰ صادق الرافعی نے اپنی کتاب "تاریخ آداب العرب ج ۳"، ڈاکٹر شوقی ضیف نے "تاریخ الادب العربی العصر الاسلامی" میں اور مولوی سعید الرحمن الاعظمی الندوی نے اپنے مضمون "ادب المخضرمین فی تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ" "البعث الاسلامی" ماہ ذوالقعدہ ۱۴۰۳ھ مطابق اگست و ستمبر ۱۹۸۳ء میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔

(۱) ادبار العرب ج ۱/۲۶۵

۴۔ عبداللہ بن رواحہ (ان شعراء نے عام طور سے آنحضرتؐ کی طرف سے مدافعت کا کام کیا) ۵۔ الخنساء (تماضر) ۶۔ الحطیئۃ، ۷۔ کعب بن زُہیر، ۸۔ النابغۃ الجعدی۔ ۹۔ عمرو بن معدی کرب الزُبیدی، ۱۰۔ ابو ذُؤیب الہذلی۔

ممتاز مخضرم شعراء:

۱۔ کعب بن زہیر

وفات: تقریباً ۲۶ھ / ۶۴۵ء

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم ہائے سیاہ کو ترے عفو بندہ نواز میں

اور یہی کہانی ہے کعب بن زہیر کی۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

آنحضرتؐ کے زمانے میں مخضرم شعراء کے طبقہ میں، دو شاعر کعب کے نام سے مشہور ہوئے ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں پہلے آپ کے عتاب پھر خوشنودی، اور اس کے بعد ایسے انعام کے مستحق قرار پائے، جنھوں نے ان کو ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید کر دیا۔ ان میں ایک تو یہی کعب بن زہیر ہیں، جن سے آپ اتنے خفا ہوئے تھے کہ ان کا خون ہدر کر دیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر کے، سر آپ کے قدموں میں ڈال دیا، اور پھر آپ کی مدح اور معذرت میں ایک لاجواب قصیدہ پڑھ کر سنایا تو آپ اتنے خوش ہوئے کہ نہ صرف ان کے سارے گناہ معاف کر دئے بلکہ فرط انبساط میں اپنی چادر مبارک ان کو اڑھا دی جس کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ کعب تر گئے بلکہ ان کا قصیدہ عربی شعر و شاعری میں "قصیدہ بردہ" یعنی چادر والا قصیدہ کے نام سے، نابغہ ذبیانی کے بعد مدح و معذرت کا شاہکار بن گیا۔

دوسرے شاعر کعب بن مالک تھے، جو پکے مسلمان اور آنحضرتؐ کے شیدائیوں میں سے تھے، مگر ایک موقعہ پر آپ ان سے اتنے خفا ہو گئے کہ خود بھی بول چال بند کر دی۔ اور اس کے بعد ان کا مکمل سماجی بائیکاٹ کرا دیا، جس سے بقول خود ان کے زمین ان کے لئے اتنی تنگ ہو گئی کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ آخر میں قرآن نے ان کی براءت کا اظہار کیا، تو نئی زندگی ملی۔

---

(۱) اغانی الاصفہانی ۱۵/ ۹ ۱۴۴ اور تبریزی کی شرح قصیدہ بانت سعاد۔

مگر پہلے زیر تذکرہ کعب کی کہانی۔ کچھ ان کی اور کچھ تذکرہ نگاروں کی زبانی۔ دوسرے کعب کا تذکرہ اور ان کی دل چسپ کہانی بعد میں۔

کعب معلقہ کے مشہور صلح پسند اور نیک خو شاعر زہیر بن ابی سُلمیٰ کے بیٹے تھے(۱) ماں کا نام "کبشۃ" تھا جن کا قبیلہ غطفان سے نسلی اور نسبی تعلق تھا۔ اس طرح کعب ماں اور باپ دونوں کی طرف سے خاندانی اور اپنے اوصاف اور شاعری کی وجہ سے ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔

زہیر بن ابی سُلمیٰ کا گھرانہ سارے عرب میں شعراء کی کان سمجھا جاتا تھا کیونکہ تنہا اس خاندان میں گیارہ شاعر یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ ان کے بزرگوں میں بشامۃ بن الغدیر جیسے فلسفی بزرگ اور عقل مند اور دانا شخصیت نے اس خاندان کو سیاسی اعتبار سے بھی خاصا نامور اور مشہور کر دیا تھا۔ (۲) اور ایسے شاعرانہ ماحول اور ایسی دیو قامت شخصیتوں کے درمیان کعب کی پرورش ہوئی اور وہ بھی آسمان شعر و ادب پر ایک روشن ستارہ کی طرح چمکے جس کی تابناکی میں آنحضرتؐ سے معذرت اور پھر مدح نے چار چاند لگا دئے۔

کہتے ہیں کہ بچپنے میں جب ان کے باپ زہیر نے کعب میں شاعری کا رجحان محسوس کیا تو طبع آزمائی سے اس وجہ سے منع کر دیا کہ کہیں گھٹیا قسم کی شاعری کر کے خاندان کی شاندار روایات کو مجروح نہ کرے لیکن جب کعب کی طرف سے اصرار دیکھا تو اکثر بستی سے باہر لے جاتے اور اپنے اور جاہلی شعراء کے عمدہ عمدہ چیدہ قسم کے اشعار یاد کرا کے ان کو سنتے اور مشق سخن کراتے، اصلاح کرتے اور رموز فن سے روشناس کراتے۔ اس طرح کعب کی اس فن میں اس زمانے کے یکتائے روزگار شاعر کے ہاتھوں پر تربیت ہوئی اس لئے خوب منجھ کر مکتب شعر و شاعری کے مختلف کٹھن امتحانات پاس کر کے اس فن کے ممتاز فن کار بن گئے (۳) اور زمانۂ جاہلی میں ہی خاصی شہرت اور حیثیت

---

(۱) زہیر بن ابی سلمیٰ کے حالات زندگی کے لئے دیکھئے اس کتاب کی جلد اول ص۲۴۳۔ پورا سلسلہ نسب یوں ہے۔ کعب بن زہیر بن ابی سُلمیٰ بن زباح بن قرۃ الخ۔۔۔۔ کعب کی پیدائش کی صحیح تاریخ نہیں معلوم، تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔

(۲) تفصیل کے لئے زہیر بن ابی سلمیٰ کے حالات میں پڑھئے۔

(۳) الاغانی ۱۵ اور امالی المرتضیٰ ۱/۷۹۔

حاصل کرلی۔ اس بات کی دلیل میں اس واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے کہ زہیر کے شاگرد اور عربی ادب کے مشہور ہجو کے مستند شاعر الحطیئہ نے ایک دفعہ کعب سے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کے خاندان کا راویہ ہوں سب سے کٹ کر صرف آپ لوگوں سے رشتہ جوڑ رکھا ہے اب جب کہ سارے اساتذہ خاص ختم ہو چکے ہیں اور صرف آپ ہی بچ رہے ہیں کیوں نہ آپ چند شعر ایسے کہیں جن میں پہلے اپنا تذکرہ اور پھر میرا ہو، کیوں کہ لوگوں میں آپ کی کہی ہوئی بات جلدی پھیل جائے گی اور آناً فاناً سارے عرب میں ہم دونوں کا چرچا ہو جائے گا۔ چنانچہ کعب نے اپنا وہ مشہور قصیدہ کہا جس میں کہتے ہیں۔

فمن للقوافی شانہا من یحوکہا   إذا ما ثوی کعبٌ و فوّز جرولُ

یعنی جب کعب اور جرول (الحطیئہ کا لقب) مر جائیں گے تو شعر و شاعری کے شایان شان کون رہ جائے گا۔

اغانی نے روایت کی ہے کہ کعب اور ان کے چھوٹے بھائی بجیر ایک صبح اپنی بکریوں کا ریوڑ لے کر نکلے اس وقت تک اسلام اور آنحضرتؐ کا اچھا خاصا چرچہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ دونوں بھائی اسلام اور آنحضرتؐ کے بارے میں راستے بھر باتیں کرتے رہے اور جب بنو اسد کے ایک تالاب "ابرق العزاف" پر پہنچے تو کعب نے کہا کہ بجیر میں یہیں ٹھہر جاتا ہوں تم ذرا مدینہ جا کر اس آدمی (آنحضرتؐ) اور اس کے دین کے بارے میں معلومات حاصل کر کے مجھے بتاؤ (۱)

اسلام کے ابھرنے اور آنحضرتؐ کے چرچے کے علاوہ کعب کے جی میں اس خیال کے آنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے باپ زہیر بن ابی سلمیٰ نے جو فطرتاً بہت نیک صلح جو اور حق پسند اور اس کے متلاشی تھے اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے اور ان کی باتیں سنا کرتے تھے آخر عمر میں ایک مرتبہ کچھ طلسماتی قسم کے خواب دیکھے جن میں سے ایک خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ان کی طرف ایک موٹی رسی لٹکی ہوئی ہے جب یہ اس کو پکڑنے کے لئے بڑھے تو وہ فوراً اوپر اٹھ گئی اتنے میں ان کی آنکھ کھل گئی چنانچہ صبح کو اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ دیکھو میرے بعد آسمان سے کوئی نئی بات

---

(۱) الاغانی ۱۵/۱۴۹ اور الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ابن حجر العسقلانی ۵/۳۰۳

ظاہر ہو گی تم دونوں اس بات کا پتہ لگانا اس کی چھان بین کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا اور اگر اس آدمی کو پاؤ تو اس کی پیروی کرنا۔

چنانچہ اس موقعہ پر باپ کی کہی ہوئی بات کا دھیان بھی دونوں کو آیا کعب بولے کہ اچھا ہے جا کر اس آدمی اور اس کے دین کے بارے میں پتہ لگاؤ اگر بات ٹھیک اور دل کو لگتی ہو گی تو ہم لوگ اس کے پیرو بن جائیں گے۔ اس طرح باپ کی وصیت اور ہماری خواہش دونوں پوری ہو جائیں گی۔ چنانچہ بجیر بھائی کی یہ بات گرہ میں باندھ اپنی مہم پر مدینہ روانہ ہو گئے۔

بجیر جو مدینہ پہنچے اور آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرتؐ کی ایک نگاہ غلط انداز ہی سے دل و جاں سب آپ پر نثار کر بیٹھے۔ اب نہ اپنی سدھ رہی اور نہ وہ وعدہ جو بھائی سے کر کے آئے تھے۔ ادھر بھائی کعب دن بھر بکریوں کو چراتے آتے جاتے لوگوں سے پوچھتے اور بھائی کے واپس آنے کی راہ تکتے مگر بجیر کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ یہ واقعہ تھا ۸ھ کا جبکہ مکہ ابھی فتح نہیں ہوا تھا۔

بھائی کا انتظار کرتے کرتے جب کعب تھک گئے تو بھائی کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ پتہ چلا کہ بقول مکیوں کے وہ بد دین ہو گئے یعنی مسلمان ہو گئے ہیں یہ جان کر تن بدن میں آگ لگ گئی اور جوان خون نے جوش مارا اور ملکۂ شاعری میں ابال آیا۔ اور اسلام، مسلمانوں اور آنحضرتؐ کی شان میں ہجو یہ انگارے اگلنے لگے۔ اور اس جوش میں بھائی کو لکھ بھیجا جس میں نہ صرف آنحضرتؐ اور اسلام سب کو برا بھلا کہا۔ بلکہ یہاں تک کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ ابو بکر نے تمہیں تند و تیز شراب اتنی کثیر مقدار میں پلا دی ہے کہ تم نے مدہوشی میں ہدایت کے سارے راستے چھوڑ دئے ہیں اور ایسے دین کو قبول کر لیا ہے جس پر تم نے نہ اپنے ماں باپ کو پایا اور نہ اپنے کسی بھائی کو اب اگر تم میری بات نہیں مانتے اور اس دین سے باز نہیں آتے تو پھر مجھے تم سے کوئی مطلب نہیں مجھے اس کا افسوس نہ ہو گا اور اگر تم کسی مصیبت میں پڑ گئے تو میں ہرگز تمہارا ساتھ نہ دوں گا۔

الا أبلغا عنّی بجیراً رسالة	فهل لك فیما قلت ویحك هل لكا
سقاك ابو بكر بكأس روية	فانهلك المامون منها وعلكا[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فغارقْتَ اسبابَ الهدی وتبعته — علی أی شیٔ ویب غیرك دلّکا(۱)
علی مذهب لم تلف اُمّاً ولا اُباً — علیه ولم تعرف علیه اخا لکا(۲)
فان لم تفعل فلستُ بآسف — ولا قائل إما عثرتَ لعاً لکا

اوراس کے بعد جم کرآنحضرتؐ اور مسلمانوں کی ہجو کرنے لگے۔ مگر بجیر کا معاملہ دوسرا تھا کیوں کہ ان کے مسلمان ہو جانے کے بعد کسی مصیبت میں پڑنے کا سوال نہ تھا البتہ خود کعب سخت مصیبت میں پھنس گئے کیوں کہ آنحضرتؐ نے جب یہ ہجویہ قصیدہ سنا تو آپ کو بہت تکلیف ہوئی اور آپ نے کعب کا خون ہدر کر دیا اور منادی کرادی جو کوئی کعب کو پائے قتل کر دے۔

بجیر کو بھائی کے برے انجام کا اندازہ تھا چنانچہ انھوں نے ان کو چند اشعار لکھ بھیجے جن میں کہا کہ اب تمہارے نجات کی صرف ایک صورت رہ گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے پاس توبہ کرکے آجاؤ اور معافی مانگ لو ورنہ تمہارا جو حشر ہونے والا ہے وہ تم کو معلوم ہے آنحضرتؐ نے تمہارا خون ہدر کر دیا ہے اور اب تم کو کوئی پناہ نہ دے گا، اس لئے لات وغیرہ کے مذہب کو چھوڑ کر خدائے وحدہ لاشریک کی طرف آجاؤ۔ ورنہ جہنم کی آگ اور دنیاوی سزا دونوں سے نجات نہ مل سکے گی اس لئے میں نے زہیر اپنے باپ اور ابوسلمیٰ اپنے دادا کے مذہب کو ہمیشہ کے لئے خیرآباد کہہ دیا ہے۔

مَنْ مبلغ کعباً فهل لك فی التی — تلوم علیها باطلاً وهی أحزم
الی الله لا العزّی ولاألّلات۔ وحدہ۔ — فتنجوا ذا کان النجاء وتسلم
فدین زهیر و هولا شیٔ غیرہ — ودین ابی سلمیٰ علیَّ محرّم

کہتے ہیں کہ کعب بجیر کے اس خط کے باوجود بھی دربار نبوت میں حاضر نہ ہوئے بلکہ مستقل اپنے آبائی دین پر رہے اور آنحضرتؐ کی مخالفت کرتے رہے البتہ ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ آنحضرتؐ کے میرا خون مباح کرنے کی وجہ سے عام طور سے قبائل

بعض روایات میں سقاک ابوبکر کی جگہ "شربتَ مع المأمون کا سا رویۃ" ہے۔

(۱) بعض روایات میں فغارقت کی جگہ فخالفت ہے۔

(۲) علی مذہب کی جگہ بعض روایتوں میں علیٰ خُلُقٍ ہے۔

عرب اور خاص طور سے اشخاص مجھے پناہ دینے سے انکار کرنے لگے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ کوئی مجھے مار دے اور ہمارا قبیلہ خون کا دعویٰ بھی نہ کرسکے۔ اتنے میں آنحضرتؐ نے مکہ فتح کرلیا اور طائف سے مدینہ تشریف لے آئے اب سارے مکیوں اور قبائل عرب کو اندازہ ہوگیا کہ آنحضرتؐ سے پاس پانا آسان نہیں اس لیۓ سب نے اپنی گردنیں جھکا دیں۔

بجیر کو اب اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ بھائی کے بچنے کی اب کوئی سبیل نہیں چنانچہ انھوں نے کعب کو پھر ایک خط لکھا کہ اب بھی وقت نہیں گیا ہے۔ تم آنحضرتؐ کے پاس نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ آجاؤ اور اپنی غلطی کے لیۓ معافی مانگ لو وہ بڑے رحم دل اور عفو و درگذر سے کام لینے والے ہیں، یاد رکھو آنحضرتؐ کے مخالف شعراء جیسے عبداللہ بن الزبعری اور ہبیرہ بن ابی وہب جیسے لوگ ادھر ادھر بھاگے پھر رہے ہیں کہیں پناہ نہیں مل رہی ہے آپ نے اپنے سارے دشمنوں کو جنہوں نے معافی مانگ لی معاف کر دیا تم کو بھی معافی مل جائے گی ادھر کعب خود بھی اپنی زندگی سے مایوس ہونے لگے تھے اور پناہ ملنے کے سارے دروازے اب مستقل بند ہوگئے تھے خون کے ہدر ہونے کے بعد وہ گاؤں گاؤں اور افراد و قبائل میں مارے مارے پھرے کہ کوئی ان کو پناہ دے دے، لیکن کسی نے پناہ نہ دی اور ان کو یقین ہوگیا کہ اب جان بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اسی لیۓ وہ ۹ھ کی ایک رات چپکے سے مدینہ پہنچے اور بعض راویوں کے بقول جہینہ قبیلہ کے ایک آدمی کے یہاں ٹھہرے جس کو وہ پہلے سے جانتے تھے وہ آدمی ان کو لے کر فجر کی نماز کے وقت مسجد نبوی میں گیا اور آنحضرتؐ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھنے کے بعد اس نے اشارہ سے بتایا کہ وہ دیکھو وہ آنحضرتؐ ہیں آپ کے پاس جاؤ۔ (۱)

چنانچہ کعب نے کہا کہ میں نے آپ کو آپ کے حلیہ کی وجہ سے پہچان لیا۔ اب میں آگے بڑھا آپ کے پاس بیٹھا اور اسلام لے آیا (۲) اس کے بعد کعب نے بقول ابن ہشام آپ سے کہا "اے رسول اللہ کعب بن زہیر آپ کے پاس توبہ کرتے ہوئے اسلام

(۱) سیرۃ ابن ہشام ص ۲۰۳

(۲) ابن حجر العسقلانی: الإصابۃ فی تمییز الصحابۃ ۔ ۵ / ۳۰۲ شعر المخضرمین۔ یحیی الجبوری ص ۲۲۲

لاکر امان مانگنے آئے ہیں تو اگر میں انھیں آپ کے پاس لے آؤں تو آپ ان کو معاف کر دیں گے ؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ تو کعب بولے میں ہی کعب بن زہیر ہوں یا رسول اللہ(1)

راویوں کا کہنا ہے کہ انصار نے جب کعب کا نام سنا تو سب کے سب ان کو قتل کرنے کے لیے ٹوٹ پڑے اور رسول اللہ صلعم سے بولے کہ آپ ہمیں ان کا صفایا کر دینے کی اجازت دے دیجئے، اُن میں سے ایک نے یہاں تک کہا کہ آپ مجھے اور اس دشمن خدا کو چھوڑ دیجئے۔ میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں" مگر آپ نے فرمایا کہ "انھیں چھوڑ دو وہ توبہ کر کے اور اپنی تمام پچھلی باتوں کو چھوڑ کر آئے ہیں (۲)

کعب بن زہیر کو انصاریوں کی اور خاص طور سے اس انصاری کی یہ حرکت بہت بری لگی اور انھوں نے اپنے قصیدوں میں انصاریوں کا ذکر تک نہ کیا۔ جس کو آنحضرت اور مہاجرین نے بہت محسوس کیا چنانچہ مہاجرین نے تو یہاں تک کہا کہ جس نے انصاریوں کی ہجو کی گویا ہماری مدح نہیں کی تو کعب نے انصاریوں کی شان میں بھی ایک خوبصورت قصیدہ کہا۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ کعب مدینہ پہنچ کر حضرت ابوبکر سے ملے جو ان کو لے کر فجر کے وقت مسجد نبوی میں پہنچے جب آپ نے سلام پھیرا تو کعب کو لے کر آنحضرت کے پاس آئے کعب نے اس وقت اپنا چہرہ اپنے صافہ سے ڈھانپ رکھا تھا۔ حضرت ابوبکر نے آنحضرت سے کہا کہ حضور ایک آدمی آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت لینے کے لئے آیا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ اب کعب نے اپنا چہرہ کھول دیا اور کہا کہ سرکار میں آپ سے آپ کی ہی پناہ میں آرہا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ میں کعب بن زہیر ہوں" یہ سننا تھا کہ انصاریوں کے چہروں پر شکنیں پڑ گئیں اور ان کو سخت سست کہنے لگے۔ مگر مہاجرین کی خواہش تھی کہ وہ اسلام لے آئیں اور آنحضرت ان کو امان دے دیں چنانچہ آپ نے ان کو امان دے دی (۳) اس پر کعب نے اپنا وہ مشہور مدحیہ

---

(۱) شعر المخضرمین ص ۲۲۲ بحوالہ سیرت بن ہشام۔

(۲) حوالہ سابق۔ جمہرۃ اشعار العرب لزید القرشی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ کے پاس کعب کو جو لیکر گیا وہ حضرت علی تھے۔

۳۔ طبقات فحول الشعراء للجمی، الشعر والشعراء لابن قتیبہ اور اغانی ۱۴، ڈاکٹر شوقی ضیف، ڈاکٹر طہ حسین وغیرہ نے لکھا ہے کہ آنحضرت تک لے جانے والے ابوبکر ہی تھے۔

قصیدہ پڑھا جو اپنی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے ادب عربی میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے اور جس نے نہ صرف کعب کو بلکہ اس قصیدہ کو بھی زندہ جاوید کر دیا۔ اور جسے سن کر آنحضرت ﷺ اس قدر خوش ہوئے کہ اپنی چادر مبارک اتار کر ان کو اڑھا دی (۱) اور اسی وجہ سے اس قصیدہ کا امتیازی نام ' قصیدہ بردہ ' پڑ گیا۔ جسے بہت متبرک اور اس کا پڑھنا باعث ثواب اور خیر و برکت سمجھا جاتا ہے اور آج تک بعض عرب ممالک میں سیرت کے جلسوں میں بوصیری کے قصیدہ بردہ کے علاوہ اس کو بھی عام طور سے پڑھا جاتا ہے۔ قصیدہ کا مطلع ہے۔

بانتْ سُعادُ فقلبی الیوم مَتبُول

مُتَیَّمٌ اِثرہا لم یُجز مکبول (۲)

یعنی سعاد مجھے چھوڑ کر چلی گئی تو آج میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگا جا رہا ہے اس قیدی کی طرح جس کو فدیہ دے کر چھڑایا نہیں گیا تو وہ چار و ناچار اپنے قید کرنے والے کے پیچھے چلنے پر مجبور ہے۔

اس قصیدہ میں ۵۸ شعر بحر بسیط میں ہیں۔ اس کے تین حصے ہیں۔

۱۔ پہلا حصہ جاہلی ریت کے مطابق تشبیب پر مشتمل ہے جو بارھویں شعر تک چلتا ہے جس میں محبوبہ کا سراپا ہے۔

۲۔ دوسرا حصہ جو تیرھویں شعر سے شروع ہو کر ۳۳ ویں شعر پر ختم ہوتا ہے اسمیں اونٹنی کا ذکر ہے جو شاعر کو محبوبہ کی نگری میں پہنچاتی ہے۔

۳۔ تیسرا حصہ جو دراصل قصیدہ کی جان اور مرکزی خیال ہے وہ آنحضرت ﷺ سے معذرت اور پھر مہاجرین کی تعریف پر مشتمل ہے۔

---

(۱) حضرت معاویہ نے اس چادر کو کعب سے خریدنا چاہا۔ لیکن انھوں نے دینے سے انکار کر دیا ان کے انتقال کے بعد بیس ہزار دینار میں ان کے ورثاء سے پھر یہ چادر خریدی، جسے جمعہ اور عیدین کے موقعہ پر تبرکاً پہنتے تھے پھر یہ چادر عباسی خلفاء کے یہاں پہنچی یہ لوگ بھی تہواروں کے موقعہ پر تبرکاً اس کو اوڑھتے تھے۔

طبقات فحول الشعراء ابن سلام۔ الشعر و الشعراء لابن قتیبۃ اور الاصابۃ لابن حجر العسقلانی۔ بردہ کی تاریخ کے لئے دیکھئے۔ تاریخ التمدن الاسلامی ۱/۱۱۵ بحوالہ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ، جرجی زیدان اول ص۸۳

(۲) بعض روایتوں میں 'لم یُفدَ' ہے دیکھئے دیوان ص۶ مطبوعہ دار الکتب المصریہ۔

اس قصیدہ کو کعب نے جاہلی ریت کے مطابق تشبیب سے شروع کیا ہے اور اپنی محبوبہ سعاد کے فراق سے آغاز کیا ہے اور جس طرح ان کے باپ زہیر نے اپنے ایک شعر میں اپنی محبوبہ کا سراپا کھینچا تھا بالکل اسی انداز اور اسی رنگ میں کعب نے بھی اپنی محبوبہ کا خوبصورت سراپا کھینچا ہے جس میں اسے ایک حسین ہرنی سے تشبیہہ دیتے ہیں اور اس کے دہانے کا ذکر کر کے اس کے لعاب دہن کو شراب دو آتشہ قرار دیتے ہیں جس کو صاف ستھرا ٹھنڈا اور میٹھا پانی ملا کر انتہائی خوش ذائقہ نشاط افروز اور حیات بخش بنا دیا گیا ہے اور جس کی سرمگیں آنکھیں ایسی کاری کجراری ہیں، ان میں وہ کیف ہے کہ "ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں"

وماسعادُ غداۃَ البَین إذ برَزتْ

الا أغنُّ غضیضُ الطرفِ مکحولُ

تجلو عوارض ذی ظَلم إذا ابتسمتْ

کأنّہ مُنھلٌ بالرّاحِ معلولُ

شُجّتْ بذی شَبَمٍ من ماءِ مَحنیۃٍ

صافٍ بأبطحَ أضحیٰ و ھومشمولُ

تنفی الریاحُ القَذیٰ عنہ وأفرطہ

مِن صَوبِ غادیۃٍ بیض لھا لیلُ

ظاہر ہے تشبیب اور وصف محبوبہ کے بعد ہجر و فراق اور محبوبہ کی قدیم اور مالوف ریت وعدہ خلافی، بات کہہ کر مکر جانے کی ادا کا ذکر ہے۔ اس لئے ان حسینوں کی باتوں اور وعدوں پر نہ جانا ان پر یقین نہ کرنا ان کے وعدہ کی مثال تو ایسی ہے کہ چھلنی میں پانی ڈالو اور وہ بہہ جائے یہ لوگ تو بھوتوں کی طرح رنگ بدل لیتے ہیں اور وعدہ خلافی ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اور اس کے بعد بھی اگر دم خم ہے تو رسم وفا بنا ہے جانا، کہ خود ان کے باپ زہیر نے بھی اسی انداز کا اپنی محبوبہ اسماء کے بارے میں ایک شعر کہا تھا۔

أخلفتْکَ ابنۃُ البکری ما وعدتْ

فأصبح الحبلُ منھا واھناً خَلِقا

کعب نے انھیں کے معانی و مطالب کو ذرا بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے پھر خود

ہمارے یہاں حضرت غالب بھی تو صرف ایک ہی شعر میں سب کچھ کہہ گئے ہیں!

تیرے وعدہ پہ جو جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اب اسی معنی کی تفصیل کعب سے سن لیجئے مگر بڑے خوبصورت انداز میں کہتے ہیں۔

لکنھا خُلَّةٌ قد سیط من دمِھا ۔۔۔ فَجْعٌ و وَلْعٌ وإخلافٌ وتبدیلُ
فما تدوم علی حالٍ تکون بھا ۔۔۔ کما تلوّنُ فی اثوابھا الغُولُ
ولا تُمَسِّکُ بالعھدِ الذی زَعَمَتْ ۔۔۔ إلّا کما یمسِکُ الماءَ الغرابیلُ
کانت مواعدُ عُرقوبٍ لھا مثلا ۔۔۔ وما مواعیدُھا إلّا الأباطیلُ
فلا یُغرّنك ما مَنّتْ وما وَعَدَتْ ۔۔۔ إنّ الأمانیَّ والأحلامَ تضلیلُ

محبوبہ کے ذکر اور جاہلی انداز کی شاعری کے مطابق تشبیب کے بعد قصیدہ کے دوسرے حصہ پر آتے ہیں جو تیرہویں شعر سے شروع ہوتا ہے اور وہ ہے اس اونٹنی کا ذکر جس پر سوار ہو کر وہ اس بچھڑی محبوبہ سے ملنے جاتے ہیں اس لئے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ کیوں کہ یہ عاشق کا وطیرہ نہیں کہ سب کچھ نثار رہ یار کو دنیا ہی حاصل عشق و زندگی ہے۔ یہ حصہ بھی وصف کی بہترین مثال ہے اس میں انھوں نے اپنی اونٹنی کے رنگ و روپ کا سراپا کھینچا ہے اور طاقت، صبر، قوت برداشت، تیز رفتاری سمجھ بوجھ کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ اونٹنی، اونٹنی نہیں رہ جاتی بلکہ اونٹ بن جاتی ہے اور وہ بھی کچھ مافوق الفطرت قسم سا، اور بقول رواۃ اس وصف میں بھی کعب نے اپنے باپ زہیر کی نقل اتارنے کی کوشش کی ہے بلکہ اُن سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ صرف دو شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

غَلْباءُ وَجْناءُ عُلکومٌ مذکّرةٌ ۔۔۔ فی دِفّھا سعةٌ قُدّامھا مِیلُ
حَرفٌ أخوھا أبوھا من مُھَجّنةٍ ۔۔۔ وعمُّھا خالُھا قَوداءُ شملیلُ

اپنی اونٹنی کا بھرپور تذکرہ کرنے کے بعد کعب نے اپنے اس خوف اور پریشانی کا ذکر کیا ہے جو ان کو آنحضرت ﷺ کی خفگی اور ان کے خون کے مباح کر دینے سے پیدا ہو گئی تھی جس سے نہ صرف ان دن کے آرام اور راتوں کی نیند چھن گئی تھی

بلکہ ہر ایک آدمی ان کے لئے بدل گیا تھا کوئی منہ نہیں لگاتا کوئی اپنے گھر میں گھڑی بھر کو ٹھہرانے کو تیار نہیں ہوتا تھا ایسا لگتا تھا کہ یہ لمبی چوڑی زمین ان کے لئے اتنی سمٹ گئی ہے کہ کہیں پاؤں دھرنے کی بھی جگہ نہیں رہ گئی اور اس حالت میں چغل خوروں کا یہ کہنا کہ اب بچنے کی کوئی امید نہیں' میرے ہوش و حواس کو سلب کر لیتے ہیں مگر میں اس حالت میں بھی دامن امید کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہر پیدا ہونے والے آدمی کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور جو کچھ خدا نے مقدر کر دیا ہے وہ ہو کر رہے گا مگر مجھے کوئی ایسا خطرہ نہیں ہے کیوں کہ میرا معاملہ تو رحمۃ للعالمین سے ہے وہ بڑے معافی دینے والے عفو و درگذر کرنے والے ہیں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ سے معذرت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ چغل خوروں کی باتوں میں نہ آیئے چاہے وہ کتنی ہی الٹی سیدھی باتیں کیوں نہ کہیں' آپ تو صاحب قرآن ہیں اس میں تو بس ہر قسم کی موعظت و نصیحت کی باتوں کی تفصیل ہے پھر آپ ان لوگوں کی باتیں سن کر مجھے مورد الزام نہ ٹھہرائیں

تسعی الوشاۃ بجنبیھا وقولھم	إنک یا ابن أبی سلمی لمقتول
وقال کل خلیل کنت آملہ	لا ألھینک إنی عنک مشغول
فقلت خلوا سبیلی لا أبا لکم	فکل ما قدر الرحمن مفعول
فکل ابن أنثی وإن طالت سلامتہ	یوما علی آلۃ حدباء محمول
أنبئت أن رسول اللہ أوعدنی	والعفو عند رسول اللہ مأمول
مھلا ھداک الذی أعطاک نا	فلۃ القرآن فیھا مواعیظ وتفصیل
لا تأخذنی بأقوال الوشاۃ ولم	أذنب وإن کثرت فی الأقاویل

معذرت کے ان اشعار کے بعد جن میں ان کے باپ زہیر کا رنگ جھلکتا ہے کہ انھوں نے بھی ہرم بن سنان کی تعریف میں کچھ اسی قسم کی باتیں کہی ہیں (۱) یہ اشعار چونتیسویں شعر سے شروع ہوتے ہیں پھر کعب اصل مطلب یعنی آنحضرتؐ کی مدح پر آتے ہیں اور اتنا شاندار خوبصورت اور گٹھا ہوا انداز بیان اختیار کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ بھی جھوم جھوم اٹھے اور بعض اشعار پر سامعین کی توجہ مبذول کرانے جاتے تھے۔

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے اس کتاب کا پہلا حصہ ص ۲۰۳

إنّ الرسولَ لسيفٌ يُستضاءُ بهِ | مُهنّدٌ مِنْ سيوفِ اللهِ مسلولُ (١)
في عُصبةٍ من قريشٍ قال قائلُهم | ببطنِ مكةَ لمّا أسلموا زولوا
زالوا، فما زال أنكاسٌ ولا كُشفٌ | عند اللقاءِ ولا ميلٌ معازيلُ
شُمُّ العرانينَ أبطالٌ لبوسهمُ | مِن نسجِ داؤدَ في الهيجاءِ سرابيلُ

مذکورہ اشعار میں آپ کی تعریف کے علاوہ جس میں کہتے ہیں کہ آپ اللہ کی وہ تلوار ہیں جو اپنی روشنی اور نور میں ہندوستان کی آبدار اور چمکیلی تلوار کی طرح ہے۔ اس کے بعد مہاجرین کی بھی بہت تعریف ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہجرت کا حکم ملتے ہی اپنے گھر بار سب کو چھوڑ کر خدا کی راہ میں ایک نئی دنیا بسائی اور جب جنگ کا موقعہ ہوا تو بزدلی نہیں دکھائی اور نہ نہتے آدمیوں کی طرح میدان کارزار سے کبھی بھاگے اور حسب نسب کے اعتبار سے بڑی اونچی ناکوں والے اور جب جنگ کا موقعہ ہوتا ہے تو بہت ہی مضبوط قسم کی زرہیں پہن کر جنھیں گویا کہ حضرت داؤد نے بنائی ہیں میدان کارزار میں کود پڑتے ہیں۔

اور جب اس شعر پر پہنچے۔

يمشون مَشيَ الجمالِ الزُّهرِ يَعصِمُهُم | ضربٌ إذا عرّدَ السُّودُ التنابيلُ

یعنی مہاجرین سفید رنگ کے تنومند اونٹوں کی چال سے معرکۂ کارزار کی طرف چلتے ہیں اور تلوار بازی ان کی حفاظت کرتی رہتی ہے جب کہ بزدل اور چھوٹے قد کے لوگ ہمت ہار جاتے ہیں۔ اس شعر میں انصار سے تعریض ہے کیوں کہ جب کعب نے رسول اللہ کی خدمت میں حاضری دے کر معافی مانگی تو انصاری نام سنتے ہی بھڑک اٹھے اور ان میں سے ایک نے تو ان کی گردن اڑا دینے کی اجازت مانگی تھی ان کے مقابلے میں مہاجرین یہ چاہتے تھے کہ آنحضرت ان کو معاف کردیں اور کعب مسلمان ہوجائیں ظاہر ہے انصاریوں کی یہ حرکت کعب کو بری لگی تھی اس لیے انھوں نے مہاجرین کے مقابلے میں ان کی حیثیت مذکورہ بالا شعر میں گرادی تھی مگر مہاجرین کے پاس ادب اور پاس اسلامی اخوت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے شعر سنتے ہی کہا کہ "جس نے انصاریوں کی ہجو کی اس نے ہماری مدح نہیں کی۔" آنحضرت ﷺ نے بھی اس انداز کو پسند نہیں کیا اور فرمایا کہ تم نے انصاریوں کا ذکر

---

(١) بعض نسخوں میں "لسیف" کی جگہ "لنور" بھی آیا ہے

بھلائی کے ساتھ نہیں کیا حالاں کہ وہ لوگ اس کے اہل ہیں (۱)۔ اور انصاریوں نے بھی کعب سے اپنے کیے پر معذرت کر لی تھی اور بقول بعض راویوں کے تحفے اور ہدیے دئے تھے (۲)۔ چنانچہ کعب نے انصاریوں کی شان میں بھی ایک خوبصورت قصیدہ کہا جس میں ان کی بہت تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ وہ بہت عقل مند سخی دل، بہادر اور آنحضرت اور اسلام پر اپنی جانوں کو فدا کر دینے والے لوگ ہیں اور کافروں کے خون سے طہارت حاصل کرنے کو اصل زہد و تقویٰ سمجھتے ہیں ان کی بہادری کا یہ عالم ہے کہ غزوۂ بدر کے موقعہ پر انھوں نے بنو علی بن مسعود کے جو قبیلہ کنانہ کے لوگ ہیں پرخچے اڑا دئے ان لوگوں کے یہاں بڑائی بہادری اور مکارم اخلاق پرکھوں سے چلی آرہی ہے کہ یہ لوگ بہترین بزرگوں کی آل اولاد ہیں۔

مَنْ سَرّہٗ کَرَمُ الحیاۃ فلا یزلُ
فی مقنبٍ من صالحی الأنصارِ

المکرھین السمہری بأذرعٍ
کمواقل الھندیِّ غیرِ قصارِ

تزن الجبالُ رزانۃ احلامھم
وأکفّھم خلفٌ من الامطارِ

الباذلین نفوسھم لنبیّھم
یومَ الھیاج وقبۃ الجبّار

یتطھّرون، یرونہ نسکاً لھم
بدماءِ مَن علقوا من الکفّار

صدموا علیا یوم بدرٍ صدمۃ
دانت لوقعتھا جمیعُ نزارِ (۳)

---

(۱) سیرت ابن ہشام اور الاغانی للاصفہانی۔

(۲) شعراء المخضرمین یحیی الجبوری ص ۳۲۴ اور دیوان کعب ص ۱۴

(۳) نزار بن معد بن عدنان اسی قبیلہ سے قریش اور بنو کنانہ ہیں۔

ورثوا السیادۃَ کابرًا من کابر
ان الکرامَ ھمُ بنو الأخیار

امتیازی خصوصیات :

آنحضرت سے معافی ملنے اور اسلامی برادری میں شمولیت کے بعد سے کعب کی دنیا بدل گئی اور وہ ایک سچے مخلص مسلمان کی حیثیت سے زندگی گذارنے لگے اب وہ زبان جو آنحضرت مسلمانوں اور دین کی ہجو اور برائی کے لیے وقف تھی، اسلام مسلمانوں اور آنحضرت کی تعریف و توصیف اور تبلیغ میں لگ گئی چنانچہ انھوں نے اس زمانے میں جو پہلا قصیدہ کہا اس کے متعلق بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس کو زمانۂ جاہلی میں شروع کیا تھا کیوں کہ اس میں شراب وکباب کا ذکر ہے۔ (۱) مگر محض اس ذکر کی وجہ سے اس کو جاہلی دور کا قصیدہ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ کعب اپنے باپ کے رنگ میں کہنے ہی تھے جاہلی انداز میں، جس کا ثبوت ان کا قصیدہ "بانت سعاد" ہی سے مل جاتا ہے۔ جس کو تشبیب سے شروع کیا ہے جس میں محبوبہ کا نہ صرف بہت صاف سراپا اور وصف بھی ہے بلکہ بہت ہی دل نشیں غزل بھی ہے جو بالکل جاہلی رنگ کی ہے پھر محض شراب وکباب اور حسن و شباب کے ذکر کی وجہ سے کوئی قصیدہ جاہلی نہ ہو جائے گا اس کی مثال آنحضرت کے زمانے میں بھی ملتی ہے آنحضرت کے شاعر خاص حسان بن ثابت کے یہاں بھی قصیدے کی ابتدا، جاہلی ڈھنگ یعنی تشبیب اور محبوبہ کے توبہ شکن وصف اور جام شراب ناب اور ساقی گلفام کے ذکر سے ہوتی ہے۔ جیسے ان کا وہ قصیدہ جو انھوں نے غزوۂ بدر کی فتح پر فخر اور حارث بن ہشام کو اپنے بھائی ابوجہل بن ہشام کو چھوڑ بھاگنے پر غیرت اور شرم دلاتے ہوئے کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

تبلّتْ فؤادَکَ فی المنام خریدۃٌ   تسقی الضجیعَ ببارِدٍ بسّامِ

---

(۱) شوقی ضیف: تاریخ الادب العربی۔ العصر الاسلامی ص۸۸

یہ قصیدہ اور اس کے علاوہ ان کے کئی قصیدے ایسے ہیں جنھیں آنحضرت کو پڑھ کر انھوں نے سنائے ہیں اور ان میں بھی حسن و شباب، شراب و کباب اور چنگ و رباب کا بڑا حسین اور حیات آفریں ذکر ہے۔ جو بہرحال زمانہ جاہلی کے قصیدے نہیں ہیں (۱) لہذا محض شراب کے ذکر سے اس کو جاہلی نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں سے ایک قصیدہ کا مطلع ہے۔

الأبكرتْ عرسی تلومُ و تعـذل　　　　وغیرُ الذی قالتْ أعفُّ وأجملُ

جس میں آگے چل کر خالص اسلامی رنگ میں کہتے ہیں۔

فأقسمت بالرحمٰن لا شئ غیره　　　　یمینَ إمرئٍ بر ولا اتحلّلُ

لأُ ستشعرن [illegible] د ـ بیس سانًا　　　　لوجه الذی یحیي الأنام ویقتل

اس کے بعد کعبؓ بلغ اسلام بھی (۲)[۱] گئے چنانچہ وہ مدینہ سے اپنے قبیلہ بھی گئے اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ ان کی قوم میں کچھ اختلاف بھی تھا وہ سب مٹ گیا۔ اور ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا چنانچہ اپنی مہم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

رحلتُ إلی قومی لادعوجُلّهم　　　　إلی امرِحزمٍ احکمتْهُ الجوامعُ

لیُوفوا بما کانوا علیه تعاقدوُا　　　　بخیفِ منی واللّهُ راءٍ وسامعُ

آگے تبلیغ دین اور بھلائی و تقویٰ کی تلقین کرنے کو اپنی زندگی کا مشن بتاتے ہیں کہتے ہیں۔

سأدعوهُم جهدی إلی البِرّ والتُقیٰ　　　　وأمرِ العُلیٰ ماشا یَعتنِی الأصابعُ

کعب کے کلام میں فیض رسول اور فیضان قرآن کریم سے حکمت و موعظت اور فلسفہ حیات کی چاشنی بھی آگئی چنانچہ ایک موقعہ پر انھوں نے کہا کہ مجھے اس شخص سے بڑا تعجب ہوتا ہے جو دنیا کے لئے مرجاتا ہے مگر یہ نہیں سمجھتا کہ پس پردہ مقدر قضا کے تیور چڑھے ہوئے ہیں" اسی لئے وہ محال چیزوں کے حصول کے لئے جان لڑا دیتا ہے انسان اپنی لمبی چوڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتا رہتا ہے بھلا خواہش اور تمنائیں کہیں پوری ہوتی ہیں؟ کہ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"۔

---

(۱) دیوان حسان ص ۲۱۴-۲۱۷ دوسرے قصیدوں کے لئے دیوان ملاحظہ کیجئے اور اس کتاب میں حسان بن ثابت کے حالات۔

لو كنتُ أعجبُ مِن شيءٍ لأعجبني ... سعىَ الفتى و هو مخبوءٌ له القدرُ

يسعى الفتى لامورليس يُدرِكها ... والنفسُ واحدةٌ والهمّ منتشرُ

والمرءُ ماعاشَ ممدودٌ له أملٌ ... لا تنتهي العينُ حتى ينتهي الأثرُ

یعنی بقول احسان بن دانش :

امّید کے قافلے کو لے کر خیال کوسوں بڑھے ہوئے ہیں
مگر پس پردۂ مسرت قضا کے تیور چڑھے ہوئے ہیں

اس طرح کعب نے جو تقریباً دو سال تک آنحضرت، اسلام اور مسلمانوں کی برائی، ہجو اور دشمنی کرتے رہے جب آنحضرت کے در پر سر رکھ دیا تو ایک مسلمان شاعر اور دین کے پرجوش خادم مبلغ اور مبشر کی حیثیت سے گوہر تابدار بن کر چمکے۔

اسلام لانے کے بعد اگرچہ کعب نے حسان بن ثابت کے مقابلے میں بہت کم شعر کہے ہیں لیکن جو کہا ہے وہ بہت دقیع، انداز بیان کے اعتبار سے بہت گہرا تو نہیں، البتہ سیدھے سادے اسلامی رنگ کا ہے، جیسے یہ کہ خدا رزاق ہے وہ ان کو ہر حال میں رزق دے گا بغیر یار و مددگار ان کو چھوڑے گا نہیں مال و دولت سب آنی جانی چیز ہے اسی لیے اس کا بھروسہ نہیں۔ بھروسہ صرف اللہ کا ہے اور بس۔

أعلمُ أني متىٰ ما يأتني قَدَرِي ... فليسَ يُحبِسُهُ شُحٌّ ولاشفق

والمرءُ والمالُ يَنمِي ثم يُذهِبه ... مرُّ الدهور ويُفنيه فينسحقُ

فلاتخاف علينا الفقر وَانتظري ... فضلَ الذي بالغنى من عنده نثقُ

اسی طرح انھوں نے اخلاقی درس بھی دئے ہیں اور کہا ہے کہ ہجو گالی گلوج آخر لوٹ کر دینے والی پر پڑتی ہے بلکہ اس سے سخت اور ذلیل کن اسی لیے آدمی کو اپنی زبان بچا کر رکھنی چاہیے اور جہاں تک ہوسکے عفو و درگذر سے کام لیتے ہوئے زندگی گذارنی چاہیے۔ نہ برائی کرنی چاہیے نہ برائی سننی چاہیے کہ دونوں برائی میں شریک سمجھے جاتے ہیں۔

فالسامع الذام شريكٌ لـه ... مطعمُ المأكول كالآكلِ

مقالة السوء الى أهلها ... أسرع من منحدرٍ سائلِ

ولا تَهِجْ إن كنتَ ذا إربة ... حرب اخي التجربة العاقلِ

فان ذا العقل اذا هجته ... هجتَ به ذا خَبَلٍ خابلِ

کعب کے قصیدہ بردہ کو خاص طور سے اور دوسرے قصائد کو عام طور سے جن کا پچھلے صفحات میں ہم نے مطالعہ کیا ہے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کعب جنہوں نے شعرو شاعری کی فضا اور شاعروں کے خاندان میں آنکھیں کھولیں اور زہیر بن ابی سلمیٰ جیسے قادر الکلام، شہرۂ آفاق اور نیک طبیعت باپ کی آغوش تربیت میں جلا پائی اپنے باپ زہیر ہی کے رنگ میں رنگ گئے تھے طبیعت بڑی حساس ملی تھی اسی لئے واقعات و مناظر کو اپنی حس اور خیال و عاطفہ کے رنگ و روغن سے چمکا کر شاہکار بنا دیتے تھے اور اس کے لیے وہ تشبیہات اور دکھائی دینے والی چیزوں کی مثالیں دے کر اثر اندازی کی ایسی فضا پیدا کر دیتے تھے کہ سامع یا قاری اس طلسم سے نکل نہیں پاتا ہے یہ خصوصیت ان کی تشبیب اور غزل میں بہت نمایاں ہے ایسے موقعوں پر وہ الفاظ کا حسین انتخاب کر کے انتہائی خوبصورت جاذب نظر اور دل فریب گلدستہ بنا کر پیش کرتے تھے کہ آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے مگر جیسا کہ بیان ہوا معانی و مطالب میں گہرائی یا دقت نظری نہیں ملتی یہ انداز بیان اس زمانہ میں کچھ اتنا مقبول ہوا کہ کعب کے ایک معاصر شاعر عَبدَہ ابن الطیب نے بالکل کعب کے قصیدہ بانت سعاد کی زمین بحر اور اکثر موضوعات کو بھی اپنے ایک قصیدہ میں باندھا ہے جس کا مطلع ہے۔

هل حبلُ خولة بعد الهجر موصول

أم أنت عنها بعيد الدار مشغول (۱)

کعب کی ان خوبیوں کی وجہ سے ان کو جمحی نے طبقات میں زمانہ جاہلی کے ممتاز شعراء کے دوسرے طبقہ میں اوس بن حجر، بشر بن ابی خازم اور الحطیئہ کے ساتھ شامل کیا ہے (۲) بعض نقادوں نے کعب کا موازنہ لبید اور نابغہ سے کر کے ان کے ہی طبقہ کا شاعر گردانا ہے۔ خلف الاحمر کہا کرتا تھا کہ اگر زہیر کے وہ خوبصورت اشعار نہ ہوتے جن کی لوگ بہت قدر و منزلت کرتے ہیں تو میں کہہ دیتا کہ کعب زہیر سے بھی بڑا شاعر ہے (۳)۔

---

(۱) ڈاکٹر طہٰ حسین: تاریخ الادب العربی: العصر الجاہلی والعصر الاسلامی ص ۱۵۱۔

(۲) طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی ص ۸۳۔

(۳) الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔

کعب کا کلام کئی مرتبہ چھپ چکا ہے خاص طور سے ان کا قصیدہ بانت سعاد یا قصیدہ البردہ کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں جن میں مشہور یہ ہیں۔

۱۔ شرح قصیدہ بانت سعاد لابی محمد عبداللہ بن یوسف بن ہشام قاہرہ سنہ ۱۲۹۰ھ
۲۔ مصدق شرح قصیدہ بانت سعاد، شہاب الدین احمد ابن عمر الہندی حیدرآباد سنہ ۱۳۲۳ھ۔
۳۔ العقول المراد من بانت سعاد، محمد حسن المرتضیٰ۔ قاہرہ۔
۴۔ شرح دیوان کعب بن زہیر للسکری۔ تحقیق مولانا عبدالعزیز المیمنی بسابق صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ مطبوعہ دار الکتب المصریہ۔ قاہرہ۔ سنہ ۱۳۵۹ھ۔ مطابق سنہ ۱۹۵۰ء۔
۵۔ دیوان کعب بن زہیر۔ جمع و ترتیب۔ عمر السویدی لیدن سنہ ۱۳۰۳ھ م سنہ ۱۹۰۶ء۔
۶۔ قدیم علماء میں سے اس کی شرح ابن درید سنہ ۹۳۲ھ، التبریزی سنہ ۱۱۰۹ھ اور ابن الباجوری سنہ ۱۲۶۰ھ نے کی ہے دار الکتب المصریۃ قاہرہ نے ثعلب کی روایت سے کعب کا دیوان چھاپ دیا ہے۔

مذکورہ ممالک کے علاوہ یورپ کے ملکوں میں بھی یہ قصیدہ ایک زمانہ سے چھپتا چلا آیا ہے چنانچہ لیدن میں سنہ ۱۷۴۸ء میں ہال میں سنہ ۱۸۳۳ء میں لبسیک میں سنہ ۱۸۱۸ء میں برلین میں سنہ ۱۸۹۰ء میں پیرس اور قسطنطنیہ میں سنہ ۱۹۰۴ء میں چھپا۔

اس قصیدہ کے ترجمے بہت سی زبانوں میں ہو چکے ہیں جن میں قابل ذکر ہیں لاطینی۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ انگریزی اور اطالوی۔

حوالہ جات:

۱۔ الاغانی لاصفہانی ج ۱۵۔
۲۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔
۳۔ جمہرۃ اشعار العرب لزید القرشی۔
۴۔ حماسۃ ابی تمام۔
۵۔ السیرۃ النبویۃ لابن ہشام۔
۶۔ طبقات الصحابہ
۷۔ الوسیط فی الادب العربی احمد الاسکندری وعنانی ص ۱۵۲
۸۔ تاریخ الادب العربی احمد حسن زیات ص ۱۴۷

۹۔ تاریخ الادب العربی اوّل جرجی زیدان ص۱۸۳

۱۰۔ " " " عمر الفروخ ص۲۸۲

۱۱۔ " " " حنا الفاخوری ص۲۲۴

۱۲۔ " " " شوقی ضیف ص۸۳

۱۳۔ حدیث الاربعاء : طہ حسین (مجموعۃ ص۴۰۶

۱۴۔ شعر المخضرمین : یحیی الجبوری ص۲۲۰

۱۵۔ الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام عبداللہ الحامد ص۲۸۷

۱۶۔ الاستیعاب ص۲۲۶

۱۷۔ اسد الغابۃ ۴/ ۲۴۰

۱۸۔ الاصابۃ فی احوال الصحابہ

۱۹۔ معجم الشعراء۔ للمرزبانی ص۲۳۰

۲۰۔ الخزانۃ (خزانۃ الادب) ۱/ ۳۷۵/ ۴/ ۱۱

۲۱۔ طبقات فحول الشعراء لابن سلاّم الجمحی ص۸۱

۲۲۔ عربی مقالہ "کعب بن زہیر" مولوی سعید الرحمن الاعظمی
شائع شدہ "البعث الاسلامی"
ماہ مارچ ۸۹ء، ندوہ، لکھنؤ۔

۲ — لبید بن ربیعہ (م۔ ۴۱ھ مطابق ۶۶۲ء یا ۶۶۰ء)

ابو عقیل۔ لبید بن ربیعہ وہ نامور مخضرم شاعر ہے جس نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں اپنی عمر کا ایک معتد بہ حصہ گزارا۔ لبید نے اپنی قوم کے وفد کے ساتھ اسلام قبول کیا اور مسلمان ہوتے ہی اس کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ باقی عمر قرآن اور اسلام ہی کا ہو کر رہ گیا۔ اور بڑی پاک باز، صاف ستھری اور باوقار زندگی گزاری۔ اس کی عظمت و عزت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا چرچا جاہلیت کے بزم ہائے طرب اور خوش باش و زندہ دل نوجوانوں کی محفلوں میں ہی نہیں رہتا تھا بلکہ بڑے بوڑھوں کی پروقار انجمنوں اور بیٹھکوں میں بھی اس کا نام عزت وقار اور قدر سے لیا جاتا تھا اور جب وہ اسلام لایا تو شاید حضرت حسان کے بعد وہ پہلا شاعر ہے جس کا ذکر اور اس کی ایک ریت کا چرچا کوفہ کی مسجد کے ممبر پر ہوا۔ اور خود گورنر نے اس کی مدد کرنے اور اس کی قسم کو نبھانے میں پہل کی اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ اس کی قسم یہ تھی کہ جب بھی باد صبا چلے گی میں لوگوں کو کھانا کھلاؤں گا۔ تفصیل آگے آئے گی۔

لبید بنو عامر کا شاعر۔ ان کا مشہور شہسوار اور ان کی ناموس کا نگہبان اور ان کی شہرت و عزت کا نشان تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب قبیلہ مضر سے جا ملتا ہے (۱) لبید کا باپ ربیعہ بڑا فیاض اور سخی داتا تھا۔ اس کی غربا پروری۔ داد رسی۔ دریا دلی اور داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ لوگ اسے "ربیعۃ المقترین" یعنی دکھیاروں کا ربیعہ کے نام سے پکارتے تھے (۲) اس کی ماں خاندان عبس کی لڑکی تھی اور اس کا نام تامرہ بنت زنباع تھا۔ لبید نے آنکھیں زمانہ جاہلیت میں کھولیں لیکن اتنی لمبی عمر پائی کہ انتقال حضرت

---

(۱) پورا سلسلۂ نسب یہ ہے: لبید بن ربیعہ بن عامر بن مالک بن جعفر بن کلاب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ۔

(۲) ربیعہ بنو اسد کے ہاتھوں ایک لڑائی میں مارا گیا تھا۔ ربیعہ کے بھائی عامر بن مالک نے اس کے قاتل کو قتل کر کے بدلہ لیا۔ (الشعر والشعرا: ابن قتیبہ صفحہ ۱۵۱۔

معاویہ کے عہد خلافت یعنی ۴۱ ہجری مطابق ۶۶۲ میں ہوا۔)(۱)

جاہلی اور مخضرم شعراء میں لبید کو کئی چیزوں میں امتیازی شان حاصل ہے ایک طرف اسے شریف النفس۔ سلیم الطبع۔ فکرونظر کا پاکیزہ۔ حق بین وحق گو کہنہ مشق قابل تقلید بدوی شاعر سمجھا جاتا تھا تو دوسری طرف اسے بہادری۔ شجاعت رعب و دبدبہ میں یکتائے زمانہ، یہاں تک کہ لوگ اسے بھی "فتاک العرب" یعنی "شیر عرب" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ان صفات کے ساتھ ساتھ سخاوت۔ دریادلی اسے اپنے باپ اور چچا سے ورثہ میں ملی تھی اور معرکۂ کارزار میں تلوار کے جوہر دکھانے کا فن شہسواری میں مثال قائم کرنے کا گرا سے "ملاعب الأسنة" سے ملا تھا۔ جو زمانہ جاہلیت کا ایک مشہور بہادر اور دلیر شاعر تھا۔ اور رشتہ میں اس کا چچا (۲)۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی ملاعب الاسنہ کا ایک موقعہ پر سکوت اور اپنے حریف کے مقابلہ میں اس کی شکست لبید کی شاعری کے چمکنے کا پیش خیمہ اور اس کی شہرت کا سبب بن گئی۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے اپنے قبیلہ بنو عامر اور اس کے ننھیال کے قبیلہ عبس میں سخت دشمنی اور عداوت تھی۔ ایک دفعہ النعمان بن المنذر کے دربار میں دونوں قبیلوں کی مڈ بھیڑ ہو گئی۔ اس موقعہ پر عبس قبیلہ کا سردار الربیع بن زیاد تھا۔ اور عامریوں کے وفد کا لیڈر لبید کا چچا "ملاعب الأسنة"، ربیع نعمان بن منذر کے بہت منہ چڑھا ہوا تھا۔ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ساتھ کھاتا پیتا اور اٹھتا بیٹھتا تھا۔ اس نے عامریوں کی طرف سے نعمان بن المنذر کے کان خوب بھر رکھے تھے۔ چنانچہ جب قبیلہ بنو عامر کا وفد اس کے دربار میں آیا تو اس نے منہ پھیر لیا۔ اور بہت ذلت آمیز سلوک کیا۔ اور "ملاعب الأسنة" اس کی کچھ کاٹ نہ کر سکا۔ یہ بات عامریوں کو بہت بری لگی اور وہ لوگ غصے میں بھرے ہوئے اس کے دربار سے اٹھ کر چلے آئے۔ اور اگلے قدم کے بارے میں آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ لبید اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ اور اس کے ذمہ وفد کے اونٹوں کو چرانے کا کام تھا۔ جب اس نے

---

(۱) تاریخ انتقال کے سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ راجح وہی ہے جو ہم نے لکھا ہے۔

(۲) "ملاعب الأسنة" یعنی نیزوں سے کھیلنے والا۔ کا نام عامر بن مالک ہے۔ ملاعب الاسنہ اس کا نام اوس بن حجر کے اس شعر کی وجہ سے پڑا۔ ولاعب اطراف الاسنہ عامر فراح لہ حظ ا... اجمع۔

دیکھا کہ سارے لیڈر اور بڑے بوڑھے بیٹھے کچھ مشورہ کر رہے ہیں تو اس نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ لوگوں نے اس کی کم عمری کی وجہ سے اس کی بات پر دھیان نہ دیا کہ بقول کسے "بڑے بڑے بہے جائیں اور گدڑیا پوچھے کتنی تھاہ" مگر جب اس نے بہت اصرار کیا اور قسم کھائی کہ اگر آپ لوگ مجھے بات نہ بتائیں گے تو نہ میں آپ کے اونٹوں کو چراؤں گا اور نہ ان کی دیکھ بھال۔ تب لوگوں نے نعمان کے حقارت آمیز سلوک کا ذکر کیا اور کہا کہ تمہارے ماموں الربیع کا یہ سب کیا دھرا ہے۔ اس پر لبید نے کہا کہ آپ لوگ اجازت دیں تو میں اس کو ایسا جواب دوں کہ اسے منہ کی کھانی پڑے۔ اور نعمان ہمیشہ کے لیے اس کی صورت سے متنفر ہو جائے۔ لوگوں نے کہا کہ ہم تمہیں ایسے تو اجازت دیں گے نہیں۔ ہاں پہلے تم اپنی صلاحیت کا ثبوت دو۔ تو اجازت دے دیں گے۔ لبید نے کہا کہ بہت اچھا امتحان لے لیجئے۔ اتفاق سے سامنے ایک مرجھلا سو کھا ننھا سا پودا لگا تھا جو زمین پر پڑا تھا اور اس میں گنتی کے چند پتے باقی رہ گئے تھے۔ جسے عربی میں "التوبة" (۱) کہتے ہیں۔ اس کے قبیلہ کے ان بزرگوں نے کہا کہ تم اس پودے کی ہجو کر دو تو جانیں۔ چنانچہ لبید نے اس کی ایسی ہجو کی جو مضحکہ خیز ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی زبان دانی کا بھی بہت اچھا مظاہرہ تھا۔ اس نے کہا: "هذه النوبة لا تذكى نارًا و لا تؤهل دارًا ۔ ولا تسر جارًا ۔ عودها ضئيل وخيرها قليل و فرعها كليل ۔ اقبح المقول مرعىً و اقصرها فرعًا ۔ واشدها قلعًا فخزيًا لجارها وجدعًا ۔ القوا لى اخا عبس ۔ ارجعه عنكم بتعس ونكس ۔ واتركه من أمره فى لبس۔" (۲)

یعنی یہ توبہ کا پودا اتنا حقیر اور بے مصرف ہے کہ اس سے نہ تو آگ روشن ہو سکتی ہے اور نہ یہ کسی گھر کی زینت بن سکتا ہے۔ اور نہ اسے دیکھ کر کسی پڑوس کو خوشی ہو سکتی ہے۔ اس کا تنا بہت ہی پتلا اور اس سے فائدہ بہت ہی کم اور اس کی شاخ بالکل ہی کمزور ہے۔ چرے جانے والی چیزوں (پودوں) میں سب سے بدترین۔ شاخوں میں سب سے چھوٹی اور اکھاڑنے میں سب سے سخت۔ جو اس کے پڑوس میں رہے اس کا ستیا ناس جائے

---

(۱) بعض کتابوں میں "التوبة" بھی آیا ہے۔

(۲) اس کے یہ جملے کمی زیادتی کے ساتھ مختلف طریقوں سے مروی ہیں۔

میرا اس عبسی سے مقابلہ کرا دو میں اسے اتنا ذلیل و خوار کر دوں گا کہ وہ پھر تمہارے مقابلہ میں کبھی نہ آسکے گا اور اپنے معاملہ کے گھورک دھندے میں ہی پڑا اسٹرنار ہے گا۔

جب بزرگوں نے اس کی یہ طلاقت لسانی دیکھی تو کہا کہ بیشک تم اس مہم کے لائق ہو۔ پھر ان لوگوں نے اس کے بال منڈوائے اور دو چوٹیاں چھوڑ دیں اور ایک خاص قسم کا لباس پہنا کر اسے لے کر النعمان بن المنذر کے دربار میں پہونچے۔ نعمان اس وقت دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔ اور دسترخوان پر اس کے ساتھ صرف الربیع بن زیاد عبسی تھا۔ دربار مختلف وفدوں سے بھرا پڑا تھا۔ جب نعمان کھانا کھا چکا تو لبید کے قبیلہ کے لوگوں کو حاضری کی اجازت دی۔ جب یہ لوگ اس کے سامنے گئے اور اپنی ضرورتیں بیان کرنے لگے تو اس کے پہلو میں الربیع بھی کھڑا تھا۔ وہ سامنے آگیا اور اس نے ان کی بات کاٹ دی۔ اب لبید اپنی اس ہیئت کذائی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ سب کی نگاہیں اس کمسن لڑکے اور پھر اس کی مضحکہ خیز سج دھج کی طرف اٹھ گئیں۔ اس نے سامنے آکر الربیع بن زیاد کی ایسی سخت اور فحش ہجو کی کہ نعمان بول پڑا کہ "اس لونڈے کا ستیاناس جائے اس نے ان گندی باتوں سے میرے کھانے کا سارا مزہ کرکرا کر دیا" اس کی ہجو کا پہلا شعر تھا؛

یارب هیجا هی خیر من دعه ۔ اذ لا نزال هامتی فقزعة

آگے چل کر اسی قصیدہ میں کہا ہے۔

فمهلاً ابیت اللعن لا تاکل معه ۔ یعنی چشم بد دور حضور ایسے آدمی کے ساتھ ہرگز کھانا نہ کھایا کیجئے۔ اور اس کی وجہ بہت گندی بتائی ہے (۲)

کہتے ہیں کہ نعمان نے اس کے بعد۔ عامریوں یعنی لبید کے قبیلہ کے وفد کی ضرورتیں پوری کر دیں اور الربیع سے کہا کہ کیا تم ایسے ہی ہو جیسا کہ اس لڑکے نے بیان کیا ہے۔ اس پر وہ بولا کہ یہ لڑکا جھوٹا اور احمق ہے۔ اور کھسیا کر اپنے گھر چلا گیا۔ وہاں سے اس نے النعمان کے پاس لکھ بھیجا کہ آپ کسی آدمی کو میرے پاس بھیج دیجئے وہ میرے کپڑے اتار کر دیکھ لے کہ میرے کولہوں اور نچلے حصے میں کہیں بھی برص کے داغ نہیں ہیں۔ (یہ اس وجہ سے کہ لبید نے اپنی ہجو میں یہ کہہ دیا تھا کہ الربیع کے

---

(۱) ہجو کے ان اشعار کے لئے دیکھئے۔ الاغانی۔ جلد ۱۴۔ المعلقات العشر واخبار قائلیها۔ للأمین الشنقیطی اور تذکرہ کی دوسری کتابیں۔

صرف کولہوں ہی میں نہیں بلکہ نچلے حصے میں بھی بہت خراب قسم کے ناپرص کے داغ ہیں جن میں جب چل اٹھتی ہے تو یہ بہت گھناؤنی باتیں کرتا ہے۔) مگر نعمان نے کہلا بھیجا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

اس واقعہ اور اس ہجویہ قصیدے کے بعد لبید کی زبان چل پڑی اور اس کے جذبات شاعری ابل پڑے۔ اور اس کا شہرہ سارے علاقے میں پھیل گیا۔ چنانچہ اس نے اس کے بعد چھوٹے بڑے کئی قصیدے کہے جن کی وجہ سے اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔

لبید بن ربیعہ کی دلیری۔ بے خوفی اور شہسواری میں یکتائی روزگار ہونے کے سلسلہ میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ الحارث الأعرج الغسانی نے ایک سو بہادر اور نڈر نوجوانوں کا ایک جتھہ لبید کی سرکردگی میں حیرہ کے بادشاہ المنذر بن ماء السماء کو قتل کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ لوگ اس کے پاس پہونچے اور یہ ظاہر کیا کہ وہ لوگ اس کی اطاعت اور فرماں برداری قبول کرنے کے لیے آئے ہیں۔ چنانچہ اس نے انھیں اپنے پاس رکھ لیا۔ یہ لوگ موقعے کی تلاش میں رہے۔ اور ایک دن گھات لگا کر اسے قتل کر ڈالا۔ اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ منذر کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا اور بہت سوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لیکن لبید نے اپنے گھوڑے کو ایسی ایڑ لگائی کہ انھوں نے لاکھ کوشش کی لیکن اس کو پکڑ نہ سکے۔ اور صاف بچ کر نکل گیا۔ اور غسان کے بادشاہ کے پاس آیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔ چنانچہ غسانیوں نے منذر کے لشکر پر چڑھائی کر دی اور انھیں سخت شکست دی۔ اس جنگ کو "یوم حلیمہ" کہتے ہیں۔ [1]

اغانی نے اصمعی اور ابن الکلبی کی سند سے روایت کی ہے کہ "جب اسلام ظاہر ہوا اور عرب کے وفود رسول اللہ کے پاس آنے لگے تو بنو جعفر بن کلاب کا وفد بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس میں لبید بن ربیعہ بھی تھا۔ چنانچہ وہ وفد کے ساتھ آپ کے ہاتھوں اسلام لایا۔ وطن جا کر قرآن شریف حفظ یاد کیا اور اس کے بعد بہت پاک اور صاف ستھری اسلامی زندگی گزارنے لگا۔ اور شعر و شاعری بالکل ترک کر دی۔

---

(1) اس جنگ میں غسانی بادشاہ کی لڑکی بھی شریک تھی۔ چنانچہ اس کے نام پر اس کو "یوم حلیمہ" کہتے ہیں۔ ابن قتیبہ نے الشعر والشعراء میں روایت کی ہے کہ حلیمہ نے بہادروں کو اپنے ہاتھ سے زرہیں اور خود پہنائے تھے اور دل داری و دل جوئی کی تھی۔ صفحہ ۱۴۸۔

روایت یہ ہے کہ اس نے اسلام لانے کے بعد صرف ایک شعر کہا تھا۔

ما عاتب الحر الکریم کنفسہ والمرء یصلحہ الجلیس الصالح

ابن قتیبہ نے ابوالیقظان سے روایت کی ہے کہ اسلام لانے کے بعد پہلا اور آخری شعر یہ تھا:

الحمد للہ إذ لم یأتنی أجلی حتی اکتسیت من الاسلام سربالا

حضرت عمر رضؓ کی خلافت کے زمانے میں لبید کوفہ میں منتقل ہو گئے اور وہیں رہ کر بس گئے۔ ایک دفعہ حضرت عمر نے کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ کو لکھا کہ اپنے علاقے کے شعراء نے جو اشعار اسلام لانے کے بعد کہے ہیں انھیں سن کر لکھ بھیجو۔ چنانچہ انھوں نے سب سے پہلے اس علاقے کے مشہور شاعر الاغلب الراجز العجلی کو بلوا بھیجا اور کہا کہ مجھے اپنے اشعار سناؤ۔ اس نے کہا:

أرجزاً ترید ام قصیداً لقد طلبت هینا موجوداً

یعنی آپ رجز یا قصیدہ سننا پسند فرمائیں گے۔ آپ نے تو انتہائی آسان بات کی فرمائش کی ہے۔ اس کے بعد لبید بن ربیعہ کو بلوا بھیجا۔ اور حضرت عمر کا حکم سنایا اور شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ لبید نے کہا کہ "ان شئت ما عفی منہ" یعنی اگر آپ چاہیں تو ان میں سے سناؤں جو اب مٹ چکے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ زمانہ جاہلیت کا کلام سناؤں۔ مغیرہ نے کہا کہ نہیں۔ اسلام لانے کے بعد جو کچھ کہا ہے وہ سنایئے۔ لبید بولے کہ بہت اچھا۔ تھوڑی سی مہلت دے دیجئے یہ کہہ کر اٹھے اور جا کر ایک کاغذ پر سورہ بقرہ لکھ کر لائے اور پیش کر کے بولے کہ اللہ نے شعر کے بدلے میں مجھے یہ عنایت فرمادیا ہے سو وہ حاضر ہے مغیرہ نے اس واقعہ کی خبر حضرت عمر کو دی۔ تو آپ نے اغلب کے وظیفے میں سے پانچ سو درہم کم کر کے لبید کے وظیفہ میں بڑھا دیئے۔ چنانچہ لبید کا وظیفہ دو ہزار پانچ سو درہم ہو گیا اغلب کو جب اس کتر بیونت کی خبر ہوئی تو اس نے حضرت عمر کو عرضی دی کہ آپ نے میرا وظیفہ صرف اس لئے کم کر دیا کہ میں نے آپ کی اطاعت کی تھی۔ یہ سن کر حضرت عمر نے اس کے پانچ سو پھر بحال کر دیئے۔ اور لبید کو بڑھی ہوئی رقم کے ساتھ وظیفہ ملتا رہا۔ جب حضرت معاویہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اس پانچ سو کو کم کرنا چاہا تو لبید نے کہا کہ ایسا نہ کیجئے میں تو خود ہی چراغ سحری ہو رہا ہوں آج مرا کل دوسرا دن۔ حضرت معاویہ

یہ سن کر پسیج گئے اور وظیفہ برقرار رکھا۔ لیکن کہتے ہیں کہ لبید اس واقعہ کے بعد مر گئے اور وظیفہ لینے کی نوبت نہ آئی (۱)

جیسا کہ پہلے بیان ہوا سخاوت اور غربا پروری لبید کو اپنے باپ ربیعہ المقترین سے ورثہ میں ملی تھی۔ لبید نے زمانہ جاہلیت میں قسم کھا رکھی تھی کہ جب جب بادصبا چلے گی وہ لوگوں کو کھانا کھلائیں گے۔ انھوں نے اس نیک کام کو انجام دینے کے لیے دو دیگیں بنوا رکھی تھیں اور جب بادصبا چلتی تو ان میں کھانا پکوا کر صبح اور شام کوفہ میں اپنی قوم کی مسجد میں لے جاتے اور سب کو کھانا کھلاتے۔ لبید نے اپنی اس منت کا ذکر اپنے معلقہ میں بھی کیا ہے ۔ کہتا ہے ۔

وجذ ورأيسارٍ دعوتُ لحتفها	بمغالق متشابهٍ أجسامها
ادعو بهنّ لعاقر او مطفل	بذلتْ لجيران الجميع لحومها
فالضيف والجارُ الجنيب كأنّما	هبطا تبالة مُخصباً أهضامها
تأوي إلى الأطناب كل رزيـة	مثل البلية قالص أهدامها
ويكللون إذا الرياح تناوحت	خلجاً تمد شوارعاً أيتامها

میں نے اپنے دوستوں کو بلایا کہ ایسی اچھی اونٹنیوں کو جن پر جوا کھیلا جاتا ہے جوئے کے تیر سے جو جسامت میں برابر سرابر ہیں ہلاک کریں۔ تاکہ ان کے گوشت کو بانجھ اور کثیر الاولاد عورت (یعنی مایوس اور بانجھ پن کی وجہ سے ٹھکرائی ہوئی عورت اور بچوں کی زیادتی کی وجہ سے تنگ دستی و فقر و فاقہ میں مبتلا عورت) کو کھلانے کے لئے بلاؤں کہ ان کا گوشت سارے پڑوسیوں کے لئے وقف ہے۔ (یہی نہیں) بلکہ مہمان اور دور کے پڑوسی بھی اس شاندار دعوت کو کھا کر ایسا محسوس کرتے ہیں کہ تبالہ (یمن کی ایک سرسبز وادی) کی سرسبز شاداب وادی میں پہونچ گئے ہیں۔ (اور میری دست گیری اور غم گساری) کا یہ اثر ہے کہ ہر وہ دکھیاری اور مصیبتوں کی ماری عورت میرے خیمے کی طنابوں کی پناہ لیتی ہے جو فقر و فاقہ سے اتنی لاغر اور نحیف ہوگئی ہے کہ قریب المرگ ہوگئی ہے جیسے وہ اونٹنی جو اپنے مالک کی قبر پر باندھ دی جائے اور دانا پانی

(۱) ابن سلام الجمی نے نقل کیا ہے کہ لبید نے حضرت معاویہ سے کہا کہ۔ اوتدعني فليلاً ثم تضم عطائي إلى عطائك۔ خذة أجمع (طبقات فحول الشعراء) ۔ ص ۱۱۴ ۔

نہ ملنے کی وجہ سے بہت لاغر ہو چکی ہو اور قریب المرگ ہو گئی ہو۔ اور ہم فقیروں اور قبیلہ کے یتیموں کو ثرید اور گوشت سے بھری ہوئی دیگیں جن میں شور برجھلکتا رہتا ہے اس سخت سردی کے زمانے میں پیش کرتے ہیں جب ہوائیں طوفان مچائے رہتی ہیں۔

آخری مصرعہ میں جن "ریاح" کا ذکر ہے وہ وہی "باد صبا" ہے جو بہت ٹھنڈی ہوتی ہے اور جس کے چلنے پر لبید کی دیگیں کھنکنے لگتی تھیں اور دعوت عام بول دی جاتی تھی[1]

چنانچہ راویوں کا کہنا ہے کہ جب باد صبا چلتی تھی تو حضرت عمر کی طرف سے متعین کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ لوگوں سے کہتے تھے کہ ابو عقیل کی مروت اور شجاعت و شرافت کی وجہ سے ان کی اس موقع پر مدد کریں کہ وہ اپنی منت پوری کر سکیں اسی طرح ایک دفعہ جب کہ الولید بن عقبہ کوفہ کے گورنر تھے۔ باد صبا چلی۔ یہ زمانہ لبید کے بڑھاپے اور انتہائی تنگ دستی کا تھا۔ ولید کو اس کی خبر تھی۔ چنانچہ وہ ممبر پر چڑھے اور لوگوں سے کہا کہ تمہارے بھائی لبید نے زمانہ جاہلیت میں قسم کھا رکھی تھی کہ جب بھی باد صبا چلے گی وہ لوگوں کو کھانا کھلائیں گے۔ آج باد صبا چلی ہے اس لیے آج کا دن ان کے اس نیک کام کا دن ہے۔ آپ لوگ اس نیک روایت کو برقرار رکھنے میں ان کی مدد کیجیے اور اس کام میں میں پہل کرتا ہوں اور ممبر سے اتر کر لبید کے پاس ایک سو اونٹوں کی بچھیڑیاں

---

(1) بعض شارحین معلقات نے "عاقر" سے بچہ نہ دینے والی اونٹنی اور "مطفل" سے بچہ والی اونٹنی مراد لیا ہے۔ اور ترجمہ یوں کیا ہے کہ میں جوے کے تیروں کو منگواتا ہوں کہ بچہ نہ دینے والی اور بچہ والی اونٹنی کو ان کے ذریعہ ذبح کراؤں۔ تاکہ ان کے گوشت کو پڑوسیوں میں تقسیم کراؤں۔ اور اس کی تعلیل یہ کی ہے کہ جو اونٹنی بچہ نہ دے وہ خوب موٹی تازی ہوتی ہے۔ اور بچہ والی بہت قیمتی ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ میں خوب موٹی تازی اور قیمتی اونٹنیوں کو ذبح کرتا ہوں مگر یہ ترجمہ ذوق اور شاعر کی نیت پر نفس شعر کی وضع اور اسلوب پر گراں ہے۔ شعر کا لطف اور معنی میں گہرائی اور گیرائی تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم عاقر سے بانجھ اور مطفل سے کثیر الاولاد عورت مراد لیں۔ اسی ترجمہ کی طرف ڈاکٹر طہ حسین نے بھی اشارہ کیا ہے۔ (حدیث الاربعاء الاول) اس ترجمہ کے ساتھ بعد والے اشعار بھی بڑی مطابقت رکھتے ہیں۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ عام شارحین معلقات نے ان اشعار کی شرح میں لبید کی اس قسم کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ حالاں کہ پورے قرائن اور انداز بیان اور پھر "ریاح" کا لفظ اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ان اشعار کو عام طور سے لبید کی سخاوت وجود و کرم پر محمول کیا گیا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

بھیجیں اور اس کے ساتھ یہ اشعار لکھ بھیجے:۔

أری الجزار یشحذ شفرتیه	إذا هبت ریاح ابن عقیل
أشم الأنف أصید عامری	طویل الباع کالسیف الصقیل
وفی ابن الجعفری بحلفتیه	علی العلاة والمال القلیل
بنحر الکوم اذسحبت علیه	ذیول صبا تجاوب بالأصیل

ان اشعار کا مختصراً مطلب یہ ہے کہ جب ابوعقیل کی ہوائیں (بادصبا) چلتی ہیں تو میں دیکھتا ہوں کہ قصاب اپنے چھروں کو تیز کر رہا ہے۔ تاکہ یہ معزز اور محترم سخی داتا قبیلہ عامر کا فرد اپنی قسم پوری کر سکے اور یہ واقعہ ہے کہ اس نے باوجود تنگ دستی اور تھوڑے سے مال کے اپنی قسم کو موٹی تازی اونٹنیوں کو ذبح کر کے پوری کی جبکہ باد صبا سرشام چل پڑی۔

جب یہ اشعار لبید نے پڑھے تو اپنی لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا کہ بیٹی تم تو جانتی ہو کہ میں نے اب شعر کہنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ تم ہی ان کا جواب دے دو۔

چنانچہ ان کی لڑکی نے یہ شعر کہے۔

إذا هبت ریاح ابن عقیل	ذکرنا عند هبتها الولیدا
اشم الأنف أصید عبشمیاً،	أعان علی مروته لبیدا
بأمثال الهضاب کأن رکباً	علیها من بنی حام قعودا
ابا وهب جزاك الله خیراً	نحرنا ها فا طعمنا الثریدا
فعد إن الکریم له معاد	وظنی بابن أروی أن یعودا

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوعقیل کی ہوا (باد صبا) چلی تو ہم نے مدد کے لئے ولید کو یاد کیا۔ جو عالی خاندان و معزز و مکرم شخص ہے۔ چنانچہ اس نے لبید کی مدد بھاری بھرکم موٹی تازی اونٹنیاں بھیج کر کی۔ اے ابو وھب خدا تمہیں اچھا بدلہ دے ہم نے ان کو ذبح کر کے سب کو کھلا دیا۔ اور ہمیں امید ہے کہ تم آئندہ بھی ایسا ہی کرتے رہو گے۔

صفحہ گذشتہ کا بقیہ:۔ حالاں کہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ جو دوسخا کی طرف اشارہ کرنے والے اشعار دوسرے ہیں ۔ یہ اشعار تو اس کی قسم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

لبید نے جب یہ شعر سنے تو کہا کہ تم نے بہت اچھا کہا ہے صرف ایک خرابی ہے وہ یہ کہ تم نے اس سے مزید مانگا ہے۔ بیٹی بولی کہ خدا کی قسم میں نے تو صرف اس لئے مانگا ہے کہ وہ حکمران ہیں اگر وہ کوئی بازاری آدمی ہوتے تو ہرگز نہ مانگتی۔

لبید نے بڑی لمبی عمر پائی۔ چنانچہ جب وہ ۷۷ سال کا ہوا تو اس نے کہا:

باتت تشکی الیّ النفس مجہشۃً   وقد حملتک سبعاً بعد سبعینا

فان تزادی ثلاثاً تبلغی املا   وفی الثلاث وفاء للثمانینا

اور جب نوّے سال کا ہوا تو اس کی یادگار میں یہ شعر کہا:

کأنّی وقد جاوزتُ تسعین حجۃً   خلعتُ بہا عن منکبی رداثیا

نوے کو پار کر کے جب ایک سو دس سال کی عمر ہوئی تو کہا کہ ع

ألیس فی مائۃ قد عاشہا رجلٌ   وفی تکامل عشر بعد ہا عمر

اور جب ایک سو بیس سال پورے کر لیے تو زندگی سے اکتا کر کہا:

ولقد سئمتُ من الحیاۃ وطولہا   وسوال ہذا الناس کیف لبیدُ

حضرت امام مالک نے کہا ہے کہ لبید نے ایک سو چالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک سو ستاون سال کی عمر کو پہونچ کر ان کا انتقال ہوا۔ بہرحال اس بات میں تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ حضرت معاویہ کے عہد خلافت ۴۰ہجری یا ۴۱ ہجری میں لبید کا انتقال ہوا۔ اور اپنے خاندان کے صحرا (خالی زمین) میں دفن ہوا۔

اغانی اور ابوزید القرشی نے روایت کی ہے کہ جب لبید کا آخری وقت آیا تو اس نے اپنے لڑکے (۱) کو بلایا اور کہا کہ جب تمہارا باپ مر جائے تو اس کی آنکھیں بند کر کے اس کا منہ قبلہ کی طرف کر دینا اور ایک کپڑے سے اسے ڈھانپ دینا۔ پھر کسی رونے والی اور بین کرنے والی کو نالہ و شیون نہ کرنے دینا۔ پھر میری دونوں دیگوں میں اچھا کھانا پکا کر اپنی مسجد میں ان لوگوں کے لئے لے جانا جو میرے زمانے میں ان میں سے

---

(۱) (یعنی بھتیجے کو) کیوں کہ لبید کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی) مگر ابن سعد نے طبقات میں روایت کی ہے کہ لبید کے لڑکے تھے جو لبید کے مرنے کے بعد کوفہ سے بادیہ میں واپس آگئے۔

کھاتے تھے۔ اور جب امام سلام پھیر دے تو پھر اسے ان لوگوں کے سامنے پیش کرنا اور جب وہ لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو جائیں تو کہنا کہ اپنے بھائی لبید کے جنازہ کی نماز پڑھنے جایئے۔ اس کے بعد چند شعر پڑھے (۱) جن کا ذکر اہم کتابوں میں ہے۔

لبید نے شعر و شاعری کی ابتدا بہت ہی کم سنی میں کر دی تھی اور اسی زمانے میں خاص شہرت بھی حاصل کر لی تھی۔ شاعری کے میدان میں وہ اپنے پیش رو آزاد منش عالی نسب اور اولوالعزم شاعروں جیسے عنترہ بن شداد العبسی اور عمرو بن کلثوم کی پیروی کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کبھی شاعری کو ذریعہ روزی نہیں بنایا اور نہ انعام و اکرام حاصل کرنے کے لئے مدحیہ قصیدے لکھے۔ اس لئے ان کا کلام بلند لیکن مناسب اور پند بدہ فخر کے علاوہ اخلاق حمیدہ جیسے بہادری۔ دوسروں کی مدد کرنا۔ فیاضی۔ پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک اور رواداری کی تلقین سے بھرا پڑا ہے۔ اس قسم کی تعلیمات ان کے معلقہ میں خاص طور سے ملتی ہیں۔ لبید کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اغراض و مقاصد کو بیان کرنے کے لئے بہت ہی پر شکوہ لیکن خوبصورت الفاظ کا انتخاب کرتے تھے۔ اور ان کو نظم کے قالب میں اس طرح ڈھالتے تھے کہ حسن عبارت۔ دقیق معانی۔ شریف اور پاکیزہ مقاصد سے ہم آہنگ ہو کر شاہکار بن جاتے تھے۔ جس میں نہ غرابت لفظ پائی جاتی ہے اور نہ تعقید معنوی۔ بلکہ مضامین صاف اور واضح ہو کر دل کی گہرائی میں اتر جاتے ہیں۔ لبید کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کلام میں شاعرانہ مبالغہ آرائی کی کثرت نہیں ہے اور وہ عام طور سے ایمان۔ عقیدہ حکمت و فلسفہ اور پند و نصیحت کے مضامین بیان کرتے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق گوئی کی گواہی دی ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ سب سے سچی بات جسے کسی شاعر نے کہی ہے وہ لبید کا یہ قول ہے۔

(۱) جمہرۃ اشعار العرب لابی زید القرشی اور الاغانی ابو الفرج الاصفہانی ــ جلد ۱۴۔

"ألا كل شیئ ما خلا الله باطل (۱) "ان صفات کے علاوہ لبید کو جاہلی شعراء میں صنف مرثیہ گوئی میں بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے،
مرثیہ میں حکمت اور عقل مندی کی ایسی باتیں کہنا ہے کہ انھیں سن کر رنج و غم ہلکا ہو جاتا ہے اور آدمی کو صبر اور سکون ملنے لگتا ہے۔ اور جی کو ٹھنڈک پہونچتی ہے۔

ابن سلام الجمحی نے اپنی کتاب طبقات فحول الشعراء میں لبید کو جاہلی شعراء کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے اور اسے النابغۃ الجعدی۔ ابو ذویب الہذلی اور الشماخ بن ضرار کا ہم پلہ ٹھہرایا ہے (۲) اور خیال ظاہر کیا ہے کہ لبید کا کلام شماخ کے کلام کے مقابلہ میں زیادہ عام فہم اور آسان ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی نے لبید سے پوچھا کہ عربوں میں سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ تو لبید نے جواب میں کہا کہ " الملک الضلیل "، یعنی امرؤ القیس۔ پھر پوچھنے والے نے کہا کہ اس کے بعد کون ؟ تو کہا کہ " الغلام القتیل "، " مقتول لڑکا "۔ یعنی طرفۃ العبد۔ پھر سائل نے کہا کہ اس کے بعد ؟۔ تو بولا کہ " الشیخ ابو عقیل " یعنی خود ہیں۔ لبید۔

روایت ہے کہ ایک دفعہ نابغہ الذبیانی نے النعمان بن المنذر کے دربار میں لبید سے شعر سنانے کی خواہش کی تو لبید نے اپنا وہ قصیدہ سنایا جس کا مطلع ہے ع

---

(۱) اس شعر کے بارے میں ایک دلچسپ قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ عثمان بن مظعون ایک دفعہ قریش کی ایک مجلس کے پاس سے گذرے تو انھوں نے دیکھا کہ لبید اپنے شعر سنا رہا ہے۔ چنانچہ جب اس نے اپنا یہ مصرعہ پڑھا کہ " الا کل شئی ما خلا الله باطل " تو عثمان نے کہا کہ بالکل سچ بات کہی اور جب دوسرا مصرعہ پڑھا ع " و کل نعیم لا محالۃ زائل " تو بولا کہ بالکل جھوٹ۔ لوگوں کی سمجھ میں بات نہ آئی کہ پہلی بات صحیح اور دوسری جھوٹی کیوں۔ چنانچہ پھر سے شعر پڑھوایا گیا اب کی دفعہ بھی عثمان نے پہلے مصرعے کو صحیح اور دوسرے کو جھوٹ کہا۔ اب لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیسے۔ تو جواب دیا کہ جنت کی نعمتوں کو کبھی زوال نہیں۔ اس لئے دوسرا مصرعہ جھوٹ ہے۔ یہ بات ولید کو بہت بری لگی۔ اس نے کہا کہ اے معزز قریش تمہاری مجلسوں میں تو ایسی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ اس پر ابی بن خلف اور اس کا بیٹا اٹھا اور عثمان کی آنکھوں پر چانٹے مارے۔

(۱) صف۔ ۱۰۳۔

أَلَم تُلْمِم علی الدِّمن الخوالی   لسلمی بالمذانب فالقنال

تو نابغہ نے کہا کہ قبیلہ بنو عامر میں تم سب سے بڑے شاعر ہو کچھ اور سناؤ۔ تو لبید نے وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے۔

طلَلٌ لخولةَ بالرسیس قدیم   بمعاقل فالأنعمین وشوم

تو نابغہ بولا کہ تم قبیلہ ہوازن میں سب سے بڑے شاعر ہو کچھ اور سناؤ۔ تو لبید نے اپنا معلقہ سنایا جس کا پہلا شعر ہے۔

ع : عَفَتِ الدیار محلّها فمقامها   بمنیً تأبّد غولها فرجامُها

معلقہ سن کو نابغہ جھوم جھوم اٹھا اور فرط مسرت میں کہا کہ جاؤ تم عربوں میں سب سے بڑے شاعر ہو۔ فرزدق کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ کوفہ میں بنو اقیصر کی مسجد کے پاس سے گذر رہا تھا کہ اس کے کان میں لبید کے اس شعر کی آواز پڑی۔

وجلا السیولُ عن الطلول کأنّها   زُبُرٌ تجدّ متونَها أقلامها

یوں تو لبید نے بہت سے شگفتہ اور پر مغز قصیدے کہے ہیں لیکن اس کی شاعری کا بہترین نمونہ اس کا معلقہ ہے جس کا مطلع ہے۔

عَفَتِ الدیارُ محلُّها فمقامُها   بمنیً تأبّدَ غولُها فرجامُها

یعنی منیٰ میں جو طخفہ کے قریب ہے میرے محبوب کے ٹھہرنے کی جگہیں مٹ گئیں ہیں اور اس کے دونوں پہاڑ یعنی غول اور رجام ویران و سنسان پڑے ہیں۔ اس قصیدہ میں باتفاق ۸۸ شعر ہیں۔

لبید بدوی شاعر ہے۔ اس لئے اس کے معلقہ میں بدوی زندگی کی پوری تصویر ملتی ہے۔ اس کا موضوع شاعر کی اپنی زندگی اس کی عیش کوشی سخاوت اور اس کی بہادری اور شجاعت ہے۔ اور آخر میں اپنی قوم اور قبیلہ کی تعریف اور اس پر فخر۔ (۱)

دستور کے مطابق اس نے اپنا قصیدہ تشبیب سے شروع کیا ہے۔ جس میں اپنی محبوبہ کے ٹھہرنے کی جگہوں کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے نشانات مٹ گئے تھے لیکن بارش نے اوپر کی گرد و غبار کو دھو کر اسے پھر سے ظاہر کر دیا ہے اور ایسا لگتا ہے

---

(۱) معلقہ کے مضامین کی تفصیل اور لبید کے متعلق دوسری تفاصیل کے لیے عربی ادب کی تاریخ کی کتابیں دیکھیے۔ نیز دیکھیے: شرح المعلقات السبع للزوزنی تحقیق اور تعلیق محمد علی حمد اللہ دمشق ص۵ سے آگے۔

کہ پتھر پر کوئی تحریر کندہ کر دی گئی ہو۔ اور باوجود امتداد زمانہ کے ابھی تک باقی ہے۔ لیکن یہ بات اس کو معلوم ہو سکتی ہے جو قریب سے بہت دیر تک غور سے اسے دیکھتا رہے پھر دیار محبوب کی ویرانی اور وہاں پر جانوروں کے آزادانہ رہنے کا ذکر کرتا ہے کیوں کہ اب یہاں کوئی انسان نہیں رہتا جس سے ڈر کر وہ دوسری جگہ بھاگ جائیں اور یہ سلسلہ نویں شعر تک چلتا ہے۔ دسویں شعر سے گریز کر کے غزل کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اوران نشانوں کے پاس کھڑے ہو کر اپنی محبوبہ کے متعلق ان سے سوالات کرتا ہے لیکن پھر خود ہی جواب بھی دیتا ہے کہ بھلا یہ گونگے سخت جان پتھر میری بات کا جواب دے سکتے ہیں۔ نہیں یہ محض واہمہ ہے۔ یہاں کوئی نہیں محبوبہ کا قبیلہ یہاں سے کب کا جا چکا۔ اوران جگہوں پر چرندوں اور پرندوں نے اپنے بسیرے بنا لئے ہیں۔ اور اب تو اس کی نشانی نالیاں اور ثمام کے درخت رہ گئے ہیں۔

فَوَقَفْتُ أسألها وکیف سؤالنا   صمّاً خوالد ما یبین کلامها

عَرِیتْ وکان بها الجمیعُ فأبکروا   منها وغودِر نؤیها وثمامها

اس کے بعد محبوبہ کے کوچ کرنے کا ذکر کرتا ہے اوراس کا منظر پیش کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ وہ کن کن جگہوں پر اتری اور آخر میں اس کے وصال سے مایوس ہو کر اپنے دل کو اس سے قطع تعلق کرنے کے لئے سمجھاتا ہے اوراس ضمن میں محبت سے متعلق جاہلی شاعر کا نقطۂ نظر بتاتا ہے کہ اگر محبوب دل دار نہیں اس کا وصل ممکن نہیں۔ تو اس سے قطع تعلق کر لینا ہی بہتر ہے۔

فاقطعْ لبانةَ مَن تعرّض وصلُهُ   ولَشَرُّ واصلِ خُلّة صرّامها

غالب نے بھی شاید انہیں حالات میں کہا تھا۔

وفا کیسی۔ کہاں کا عشق۔ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

غالب تو سر پھوڑنے کے لیے دوسرے کے سنگ آستان کے متلاشی تھے لیکن جاہلی شاعر ایسے موقعوں پر اپنی اونٹنی کا سہارا لیتا ہے وہ سر پھوڑنے کا قائل نہیں۔ صحرا کی پہنائیوں میں اپنی کشتی بے بادبان کے ذریعہ محبت کی تلاش کا قائل ہے۔ جہاں نیل گائیں خور گر۔ شتر مرغ۔ آزادی کی فضا میں بے روک ٹوک محبت کرتے

ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر صحرا نوردی کے لئے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یہ اونٹنی مدتوں تک پیہم سفر کرتے رہنے کی وجہ سے بہت لاغر و نحیف ہو گئی ہے۔ اس کی پیٹھ اور کوہان سوکھ کر کھنکھڑ ہو گئے ہیں۔ اس کی دہار پرانی ہو گئی ہے۔ اس کے کجاوے کے تسمے کثرت استعمال سے ٹوٹ پھوٹ کر گر گئے ہیں۔ لیکن جیالی اتنی ہے کہ جب چلتی ہے تو ایسی تیز رفتاری دکھاتی ہے کہ سرخ تیز رو بادلوں کو بھی مات کر دیتی ہے۔

بطلیح اسفار ترکن بقیۃً　　　منہا فاحنق صلبہا وسنامہا

واذا تغالی لحمہا و تحسرت　　　و تقطعت بعد الکلال خدامہا

فلہا ہباب فی الزمام کانہا　　　صہباء خف مع الجنوب جہامہا

اور یہاں سے اپنی اس اونٹنی کا وصف اور امتیازی خصوصیات گنانا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کی تیز رفتاری کی تشبیہ کبھی اس بادل سے دیتا ہے جسے جنوب کی ہوا اڑائے لئے پھرتی ہو اور کبھی اس مادہ گورخر اور نیل گائے کی تیزی سے جس کا بچہ کھو گیا ہو اور وہ دیوانہ وار اس کی تلاش میں بھاگتی پھرتی ہو۔ اور تشبیہ دیتے وقت ان جانوروں کی نقل و حرکت۔ ان کے اعضا و انداز۔ ان کا شکاریوں سے ڈر کر بھاگنا۔ شکاری کتوں سے مقابلہ کرنا اور دو نامی کتوں یعنی سخام اور کساب کو سینگ سے مار ڈالنا۔ غرضکہ ان سب اوصاف و اطوار کی ایسی تصویر کھینچتا ہے کہ گمان ہونے لگتا ہے کہ انھیں کا وصف پیش نظر ہے۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ یہ جملہ معترضہ کے طور پر آیا ہے۔ اصل بات تو اسے اپنی اونٹنی کی برق رفتاری بتانی ہے۔ لبید نے اپنی اونٹنی اور چال ڈھال کا اتنی تفصیل اور دقت نظری سے نقشہ کھینچا ہے کہ اس میں طرفہ کو بھی مات کر دیا ہے۔ اونٹنی اور مذکورہ باتوں کی تعریف کے بعد جس کا سلسلہ دراز ۵۴ ویں شعر تک چلتا ہے پھر اپنی محبوبہ نوار سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تجھے اس بات کی غلط فہمی ہے کہ تم میرے ساتھ جو بھی سلوک کرو میں تمہارا ہی رہوں گا تو اس غلط فہمی کو دور کر لے۔ مجھے محبت اور قطع محبت دونوں فن آتے ہیں۔ جو مجھ سے محبت کرے گا میں اس سے محبت کروں گا جو کٹے گا میں بھی اس سے کٹ جاؤنگا ہی نہیں بلکہ جس جگہ محبت نہیں ملتی اس جگہ کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہیں۔ اسے بھی چھوڑ دیتا ہوں۔

أَوَلَم تَكُن تَدري نَوارُ بِأَنَّني ... وَصّالُ عَقدِ حَبائِلٍ جَذّامُها
تَرّاكُ أَمكِنَةٍ إِذا لَم أَرضَها ... أَو يَعتَلِق بَعضَ النُفوسِ حِمامُها

اس کے بعد اپنی لذت کوشیوں۔ شراب و کباب اور محفل یاراں خوش باش کا ذکر کرتا ہے۔ اور پھر یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے قبیلہ کی حفاظت وحمایت کرتا ہے۔ اس کام میں اس کا ساتھ اس کا تیز رفتار گھوڑا دیتا ہے۔ اس کے بعد الربیع بن زیاد اور اس کے درمیان النعمان بن المنذر کے دربار میں جو مناظرہ ہوا تھا اس کا ذکر کر کے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اتنا شریف اور کارہائے نمایاں کرنے والا انسان ہوں کہ حریف اپنے بزرگوں کے کارنامے گنا کر بھی مجھ سے جیت نہ سکا۔

أَنكَرتُ باطِلَها وَبُؤتُ بِحَقِّها ... عِندي فَلَم يَفخَر عَلَيَّ كِرامُها

پھر اپنی قسم کا ذکر کر کے کہ جب بھی باد صبا چلے گی میں "عام دعوت کروں گا" اپنی دریا دلی سخاوت ہمدردی اور یتیموں۔ محتاجوں، تنگ دستوں کی دست گیری کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

وَجَزورِ أَيسارٍ دَعَوتُ لِحَتفِها ... بِمَغالِقٍ مُتَشابِهٍ أَعلامُها
أَدعو بِهِنَّ لِعاقِرٍ أَو مُطفِلٍ ... بُذِلَت لِجيرانِ الجَميعِ لِحامُها

اپنی تعریف و توصیف کرنے کے بعد اپنی قوم کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم لوگ اتنے بڑے اور عزت والے ہیں کہ ہر قوم کا سردار ہمارے قبیلہ ہی کا کوئی آدمی ہوتا ہے۔ اور وہی سب کو مال غنیمت وغیرہ اپنی مرضی سے تقسیم کرتا ہے جس کو جو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس کو نہ چاہے نہیں دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے کاموں اور اپنے فیصلوں میں خود مختار ہوتا ہے۔

إِنّا إِذا التَقَتِ المَجامِعُ لَم يَزَل ... مِنّا لِزازُ عَظيمَةٍ جَشّامُها
وَمُقَسِّمٌ يُعطي العَشيرَةَ حَقَّها ... وَمُغَذمِرٌ لِحُقوقِها هَضّامُها

پھر اپنے قبیلہ کی بہادری۔ سخاوت۔ عقل و فراست۔ کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے کہ یہ عزت۔ یہ بزرگی۔ یہ ناموری۔ ہماری تقدیر میں اس خدا نے لکھ دی تھی جو طبیعتوں اور دلوں کو جانتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ان فضائل۔ انعام و اکرام کے ہم ہی لوگ

اہل ہیں۔ اس لئے اس نے روز ازل ہی سے یہ سب خوبیاں اور عزتیں ہمیں بخش دیں جس کو ہمارے بڑے بوڑھے سب نباہتے ہیں۔ قبیلہ کے افراد پر جب مصیبت پڑتی ہے تو سب دوڑ پڑتے ہیں۔ اس طرح ہم ہمسایوں کے لئے بھی مثل فصل بہار کے مہربان و شفیق رہتے ہیں اور ان کے سایہ میں یہ پڑوسی پھلتے پھولتے رہتے ہیں۔ اور انھیں اشعار پر اپنا معلقہ ختم کر دیتا ہے۔

وإذا الأمانةُ قسّمت في معشرٍ — أوفى بأوفرِ حظّنا قسّامها

فبنى لنا بيتاً رفيعاً سمكه — فسما إليه كهلها وغلامها

وهم السعاة إذا العشيرة أُفظِعت — وهم فوارسها وهم حكّامها

وهم ربيعٌ للمجاور فيهمُ — والمرملات إذا تطاول عامها

وهم العشيرة أن يُبطّئ حاسدٌ — أو أن يميلَ مع العدو لئامها

لبید کے معلقہ کی یہ شان اس کا یہ فخریہ انداز اور زندگی کو اس انداز سے گذارنے کے رنگ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معلقہ اس کی جوانی کے زمانے کی یادگار ہے۔ کیوں کہ

اسی لبید کے مذکورہ ذیل اشعار میں جو ایک دوسرے قصیدے میں آئے ہیں حکمت و فلسفہ کی وہ آمیزش ہے جو ایک مدت تک زندگی کی خو کرنے کے بعد ہی آدمی کو حاصل ہوتی ہے۔ زندگی کی حقیقت شہاب ثاقب سے زیادہ نہیں۔ جو صرف ایک لمحہ کے لئے چمک کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔ اور یہ مال و دولت جس پر تم ناز کرتے ہو یہ آل اولاد جس پر تم پھولے نہیں سماتے۔ درحقیقت دوسرے کی امانت ہیں جنھیں ایک نہ ایک دن اصل مالک کو واپس کرنا ہے۔ ہماری تگ و دو۔ دوڑ دھوپ کا مآل اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایک شخص تو مکان بناتا ہے لیکن ایک دن دوسرا شخص اسے ڈھا دیتا ہے۔ یہ ہے ہماری دنیا کی ہوس کا انجام۔ اور ہماری کوششوں کا آخری نتیجہ۔ چنانچہ اپنے بھائی اربد کے مرثیہ میں کہتا ہے:

وما المرء إلا كالشهاب وضوئه — يحور رماداً بعد ما هو ساطع

وما المال والأهلون إلا ودائع — ولابد يوماً أن ترد الودائع

وما الناس إلا عاملان فعامل — يتبر ما يبني وآخر رافع

اربد کا یہ مرثیہ درحقیقت بدوی کی نگاہ میں فلسفہ موت و حیات کی تفسیر ہے۔ جو بہت

خوب ہے اور حقیقت پر مبنی۔ سو سو سال تک زندگی سے لڑنے۔ نرم گرم جھیلنے کے بعد آخری عمر میں یہ عقدہ کھلا کہ اللہ بس باقی ہوس۔

الا کل شی ما خلا اللہ باطل　　　وکل نعیم لا محالۃ زائل

اس زندگی اور اس کی طمطراقی کا انجام موت ہے۔

وکل اناس سوف تدخل بینھم دویھیۃ تصفر منھا الانامل۔

پھر اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ اس کائنات میں جاری وساری صرف خدا کی مرضی ومشیت ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو وہ سکون واطمینان کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ جسے چاہتا ہے گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

احمد اللہ ولاند لہ + بیدیہ الخیر ما شاء فعل

من ھداہ سبل الخیر اھتدی + ناعم البال ومن شاء اضل

عقل ودانائی اور حکمت وفلسفہ کے علاوہ لبید کو مرثیہ گوئی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ النعمان بن المنذر کے مرثیہ میں کہتا ہے۔

الا تسألان المرء ماذا یحاول	أنحب فیقضی ام ضلال وباطل
اری الناس لا یدرون ما قدر امرھم	بلی کل ذی لب الی اللہ واصل
الا کل شی ما خلا اللہ باطل	وکل نعیم لا محالۃ زائل
وکل اناس سوف تدخل بینھم	دویھیۃ تصفر منھا الانامل
وکل امری یوما سیعلم غیبہ	اذا کشف عند الالہ المحاصل
اذا المرء أسری لیلۃ خال أنہ	قضی عاملاً والمرء ما دام عامل
فقولا لہ ان کان یقسم امرہ	ألما یعظک الدھر امک ھابل
فتعلم ان لا انت مدرک ما مضی	ولا انت مما تحذر النفس وائل
فان انت لم ینفعک علمک فانتسب	لعلک تھدیک القرون الاوائل
فان لم تجد من دون عدنان والدا	ودون معد فلتزمک العواذل

یعنی، ذرا دنیا پر مرنے والے اس آدمی سے پوچھو تو کہ کیوں اس قدر سرگردان و پریشان ہے۔ کیا اس نے کوئی منت مان رکھی ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے یا محض گمراہی اور دھوکہ میں پڑا ہوا ہے۔

لوگوں کو اس دنیا کے خطرات اور پریشانیوں اور اس کے سرعت زوال کا بالکل علم نہیں ہے عقل مند تو وہ ہے جو اطاعت اور فرماں برداری کے ذریعہ اللہ کی مرضی کو ڈھونڈتا ہے۔

یہ سمجھ لو کہ اللہ کی ذات کے سوا ہر چیز دھوکہ ہے اور ہر عیش و آرام اور نعمت ایک نہ ایک دن ختم ہو کر رہے گی۔

ہر آدمی پر ایک نہ ایک دن وہ بڑی مصیبت (موت) آ کر رہے گی جس سے ناخن پیلے پڑ جاتے ہیں۔ اور ہر آدمی کے سامنے اس کا کچا چٹھا صاف صاف کھل کر سامنے آئے گا جس دن برائیوں اور بھلائیوں کا دفتر کھل جائے گا۔

جب آدمی کسی کام میں پوری رات گزار دیتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اس نے پالا مار لیا حالاں کہ جب تک وہ زندہ ہے اس قسم کے حادثات ضرور کام آتے رہیں گے تو اگر وہ اپنے کاموں اور معاملات کے ادھیڑ بن ہی میں پڑا ہوا ہے تو اس سے کہدو کہ کیا ابھی تک زمانے نے تمھیں سبق نہیں دیا۔ اگر ایسا ہے تو تمہاری ماں تم کو روئے یعنی یہ اچھی طرح سے جان لو کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب اسے تم واپس نہیں لاسکتے۔ اور نہ ہی جس خطرہ سے تم ڈرتے ہو اس سے بچ کر کہیں جا سکتے ہو۔ اگر اپنے علم سے تمہاری آنکھیں نہیں کھلی ہیں تو اگلے لوگوں کو یاد کر کے ان کے انجام پر غور کرو۔ شاید گزشتہ لوگوں کی تاریخ تمہیں سیدھے راستے پر لگا دے۔ پس اگر عدنان اور معد تک کی لمبی تاریخ میں تمہارا کوئی بزرگ زندہ نہیں بچا ہے تو زندگی میں حرص و ہوس سے باز آجاؤ۔

لبید کے بعض اشعار کے معانی کو اپنا کر بعض شعرا نے اپنے انداز میں بھی شعر کہے ہیں۔ ان میں قابل الذکر النابغۃ الجعدی۔ طرماح اور الاخطل ہیں[1]۔ مگر اس جگہ ان کے ذکر کا موقع نہیں۔

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے کتاب: الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔ ص۱۵۴ اور اس سے آگے۔

حوالہ جات :-

۱- الاغانی لابن فرج الاصفہانی - جلد - ۱۴ -

۲- طبقات فحول الشعرا - لابن سلام الجمحی -

۳- الشعر والشعراء - لابن قُتیبہ -

۴- جمہرۃ اشعار العرب - ابو زید القرشی

۵- رسالۃ الغفران - ابو العلا المعری تحقیق کامل کیلانی -

۶- تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ - جرجی زیدان - جلد اول -

۷- الوسیط فی الادب العربی - احمد الاسکندری -

۸- الوصف (سلسلہ فنون الادب العربی) شائع کردہ دار المعارف - مصر -

۹- اس کتاب میں لبید نے اپنی ناقہ کا وصف جس حسین انداز سے کیا ہے اور اپنے بھائی کے مرنے کی وجہ سے جو رنج و غم اسے ہوا ہے اس کا بہت اچھا نقشہ کھینچا گیا ہے -

۱۰- الحکم والامثال (سلسلہ فنون الادب العربی) شائع کردہ دار المعارف مصر -
اس کتاب میں لبید کے حکیمانہ اور فلسفیانہ اشعار کا مختصر لیکن جامع تجزیہ ہے -

۱۱- حدیث الاربعا - ڈاکٹر طٰہٰ حسین - جلد اول -
ڈاکٹر طٰہٰ صاحب نے لبید کے معلقہ کے مختلف حصوں کا بہت ہی حسین انداز میں تجزیہ کیا ہے - اور اس کی فنی باریکیوں کی طرف بہت اچھے انداز میں اشارہ کیا ہے -

۱۲- شرح المعلقات السبع للامام الزوزنی - تحقیق محمد علی حمد اللہ، دمشق -

۱۳- المعلقات الشعر واخبار قائلیہا لاحمد الامین الشنقیطی -

۳- الخنساء

م سنہ ۲۴ھ / سنہ ۶۴۶ء

آنکھوں کو شغلِ گریہ ہمیشہ رہا عـــزیز

دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی

یہ ہے خنساء کی مختصر لیکن جامع تصویر، بڑی دردناک اور دل خراش، اور کیوں نہ ہو کئی شوہروں نے داغ جدائی دیا، دو عزیز ترین بھائی لقمۂ اجل ہوئے جن کو روتے روتے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ اور آخر میں رہی سہی زندگی کی ساری پونجی لٹ گئی۔ دلِ زخم خوردہ کے چار ٹکڑے، بڑھاپے کے سہارے، چار جوان خوب رو اور تنومند بیٹوں کو جنگ قادسیہ کھا گئی۔ مگر یہ آنکھیں جو بھائیوں کو ساری عمر روتے روتے اندھی ہو چکی تھیں، خشک تھیں اور انھیں کے ساتھ زبان بھی بند کہ اسلام نے مرثیہ گوئی کو منع کر دیا تھا۔ اس صدمۂ جانکاہ سے جو آہ نکلی وہ بھی صبر و شکر تھی۔ جب ایک کے بعد دوسرے اور تیسرے کے بعد چوتھے بیٹے کے قتل ہونے کی اطلاع ملی تو بولیں "الحمد للہ الذی شرفنی بقتلہم" خدا کا شکر ہے جس نے ان کو شہادت دے کر مجھے سرخ روئی بخشی۔ کہاں اسلام سے پہلے آنسوؤں کی دریا کی سی روانی کہاں اسلام کے بعد پہاڑوں جیسا صبر و ثبات۔

یہ تھیں تماضر، جن کا لقب تھا خنساء (ناک چپٹی تھی) مشہور صحابیہ اور صرف مخضرمین ہی میں نہیں بلکہ تمام عرب عورتوں میں شعر و شاعری اور خاص طور سے مرثیہ میں ممتاز اور عدیم المثال کہ عربی ادب کی تاریخ میں وہ پہلی شاعرہ ہیں جنہوں نے دل دوز اور جاں فگار مرثیہ گوئی کی بنیاد ڈالی۔ اور اس میں مردوں کو بھی مات کر دیا اور اس طرح فن مرثیہ میں ضرب المثل بن گئیں۔ جن کو ابن سلام الجمحی نے اصحاب مراثی کے طبقہ اول میں شمار کیا ہے۔ (۱)

---

(۱) طبقات فحول الشعراء : ص ۱۶۳

تماضر خنساء کا تعلق عرب کے مشہور قبیلہ مضر سے تھا۔ باپ اپنے خاندان کا سردار
اور اس کے دونوں بیٹے معاویہ اور صخر، فخر قبیلہ اور خاندان کی آنکھ کا تارا تھے (۱)۔
اس طرح تماضر خنساء نے ایک معزز خاندان، ایک سردار باپ کی گود اور دو مشہور
اور لائق ستائش بھائیوں کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی اور ایک خوددار
باوقار اور بھاری بھرکم شخصیت کی حیثیت سے ابھریں۔ اس لئے باپ کے علاوہ دونوں
بھائی بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ دونوں بھائیوں میں سے معاویہ حقیقی بھائی تھے
اور صخر دوسری ماں سے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ وہی ان کو چاہتے تھے۔ اور خنساء بھی
دونوں پر جان چھڑکتی تھیں۔ کیونکہ وہ اتنے بہادر خوبرو خوش خصال اور ابھرتے
نوجوان تھے کہ باپ ان کو عرب کے میلوں میں لے کر جاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ "میں
مضر کے دو بہترین نوجوانوں کا باپ ہوں اور سب اس بات کو ایک بڑی حقیقت
کی طرح تسلیم کرتے تھے! اسی لئے بجا طور پر باپ اور بہن دونوں کو یہ امید تھی کہ یہ
دونوں ایک دن بہادری، اخلاق فاضلہ اور اپنے عظیم الشان کارناموں کے ذریعے
نہ صرف اپنا بلکہ پورے قبیلہ مضر کا نام روشن کریں گے مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا
جاہلی زمانہ میں قبائل کی جنگ عام بات تھی چنانچہ اس طرح کے ایک معرکہ میں
خنساء کے حقیقی بھائی معاویہ کو قبیلہ مرۃ کے دو نوجوانوں ہاشم اور زید نے مل کر قتل
کر دیا تو سوتیلے بھائی صخر سے ان کی اور ساری قبیلہ کی امیدیں بندھ گئیں کہ وہ
نہ صرف معاویہ کے خون کا بدلہ لے گا بلکہ اس کمی کو بھی پورا کر دے گا جو معاویہ کے
نہ رہنے سے پیدا ہو گئی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ صخر نے مرۃ کے چار جوانوں کو مار کر خون کا
بدلہ لیا اور اس طرح خنساء اور افراد خاندان کے دل کو ٹھنڈک پہنچائی مگر تقدیر اس
کی گھات میں بھی تھی چنانچہ ایک جنگ میں اشعر قبیلہ کے ایک شخص ابو ثور الاسدی نے
نیزہ کا ایسا وار کیا کہ صخر بری طرح زخمی ہو گیا اور تین سال تک زخم کی تکلیف میں مبتلا
رہ کر وہ بھی چل بسا اور خنساء کے دل میں ایسا کاری زخم لگا کہ ساری عمر اس سے

---

(۱) پورا سلسلہ نسب یوں ہے: تماضر بنت عمرو بن الحارث بن الشرید بن رباح بن یقظہ
بن عُصَیّۃ بن خفاف بن امرئ القیس بن بہثہ جو آگے جا کر ابن حیلان بن مضر سے
مل جاتا ہے۔ (ابن سلام الجمحی)

خون رستا رہا اس طرح دونوں بھائیوں سے خنساء ہاتھ دھو بیٹھیں۔ خنساء کو ان کے مرنے کا اور خاص طور سے سوتیلے بھائی صخر کے مرنے کا بڑا دکھ ہوا کیوں کہ وہ انتہائی مشکل اوقات میں ہر طرح سے ان کا ساتھ دیتا تھا اور محسوس نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ ان کا سوتیلا بھائی ہے۔ خنساء کی دوسری شادی بنو خثاف کے ایک باحیثیت آدمی عبدالعزیٰ سے ہوئی لیکن یہ بہت خراج اور شراب وکباب کا رسیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا سارا مال و دولت اس راہ میں بہا دیا۔ جب فاقہ کی نوبت آئی تو خنساء اپنے بھائی صخر کے پاس گئیں اور اپنی بپتا سنائی۔ بھائی نے فوراً اپنے مال میں سے آدھا خنساء کو دے دیا۔ خنساء سب لے کر گھر آئیں دو چار دن میں شوہر نے اسے بھی ٹھکانے لگا دیا۔ پیٹ کی آگ بہت بری ہوتی ہے خنساء لاچار پھر صخر کے پاس آئیں اور اس نے بے چون وچرا جو کچھ رہ گیا تھا اس میں سے آدھا دے دیا اور اس طرح خنساء کی دونوں موقعوں پر مدد کر کے اس جاہلی معاشرے میں اس نے ایک ایسی مثال قائم کر دی جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ اس کی فیاضی اور دیگر خصوصیات نے صرف خنساء ہی نہیں بلکہ سارے افراد خاندان کی نظر میں صخر کی ایک مثالی حیثیت بنا دی تھی ایسا بھائی جب چل بسا تو خنساء کی نگاہوں میں ساری دنیا اندھیری ہو گئی اس سے پہلے حقیقی بھائی کو دفن کر چکی تھیں۔ اب جو یہ صدمہ پہنچا تو یارائے صبر جاتا رہا۔ اور پہلے ہی سے دکھی دل اس عظیم صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور ساری عمر خون جگر آنسو بن کر ان کی آنکھوں سے بہتا رہا۔ جو ان کے غم میں مرثیوں کی شکل میں ڈھل کر خود ان کو اور دوسروں کو تڑپاتے رہے یہاں تک کہ روتے روتے ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

عجیب بات ہے کہ خنساء کو ساری عمر کبھی بھی سچی خوشی نصیب نہ ہو سکی بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر ان کو چرکے پر چرکے لگتے رہے اور ان کا دل چھلنی ہوتا رہا۔ ان کا شمار سمجھ بوجھ علم وفضل اور حسن وجمال کے اعتبار سے بادیہ نجد کی مثالی دوشیزاؤں میں ہوتا تھا مگر سب سے پہلے جس شخص نے شادی کا پیام دیا وہ مشہور جاہلی شاعر دُرَید بن الصمّہ تھا۔ جو دولت وشہرت کے باوجود خاصا بوڑھا تھا اور کسی طرح عمر کے اعتبار سے ان کے جوڑ کا نہ تھا۔ ظاہر ہے خنساء نے اس پیام کو رد کر دیا۔ اور

اپنے خاندان ہی کے ایک نوجوان رواحہ بن عبدالعزیز السلمی سے شادی کی جس سے ایک بچہ عبداللہ ہی ہوا تھا کہ وہ مرگیا۔ اس کے بعد دوسری شادی عبدالعزیٰ سے ہوئی یہ بڑا فضول خرچ اور ناعاقبت اندیش آدمی تھا۔ اپنی ساری دولت رندی و مستی میں اڑادی اور فاقوں کی نوبت آگئی تو بھائی صخر نے کئی دفعہ مدد کی تو زندگی کی گاڑی سرکی۔ اور آخرکار وہ شوہر بھی مرگیا تو تیسری شادی پھر اپنے خاندان کے ایک آدمی مرداس بن ابی عامر السلمی سے کی یہ شادی بھی کچھ راس نہ آئی اور مرداس سے خنساء کے تین بچے زید معاویہ اور عمر پیدا ہوئے۔ یہ شوہر بھی کچھ دنوں کے بعد ایک پہلے کا بچہ اور تین اپنی اولاد چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوگیا۔ کہتے ہیں ان کی چوتھی شادی بھی ہوئی لیکن وہ بھی کچھ بہت دنوں تک نہ چل سکی اور اس شوہر نے بھی داغ مفارقت دے دی اور اس طرح خنساء آخر میں بغیر کسی ساتھی اور زندگی کے شریک کے رہ گئیں۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال نے ان کے عملی طور سے گھائل دل پر پے در پے ایسے چرکے لگائے کہ زندگی کی ساری خوشیاں اور دل چسپیاں ان کے لئے صرف آنسو اور نالہ و شیون بن کر رہ گئیں۔ چنانچہ دکھ درد کی ماری اس زندگی کا بوجھ لئے وہ ساری عمر شمع کی طرح گھلتی رہیں۔ اور زخم پنہاں کی کہانی مرثیوں کے ان اشعار کی طرح آنسو بن کر ان کی آنکھوں سے ٹپکتے رہی جنہیں سن کر دوسروں کی آنکھیں بھی گنگا جمنی بہانے لگتیں۔ خاص طور سے وہ مرثیے جو انھوں نے اپنے بھائی صخر کے بارے میں کہے ہیں وہ اتنے دل خراش ہیں کہ کتنا ہی سنگ دل آدمی کیوں نہ ہو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیوں کہ وہ اُس زخمی دل کی صدا ہیں جس نے کبھی خوشی کی شکل نہیں دیکھی۔

اور اس طرح بقول حنا الفاخوری خنساء کا پہلا شعری تجربہ موت کے تجربے کی صدائے بازگشت ہے (۱) جو ساری عمر ان کے کانوں میں گونجتی رہی یہاں تک کہ بقول بعض راویوں کے ایک دفعہ مدینہ میں حضرت عمر کے پاس تقریباً پچاس سال کی عمر میں آئیں۔ تو حضرت عمر نے بھائیوں کے غم میں اس قدر روتے دھوتے دیکھ کر ان سے کہا کہ تم ان کو اب کیوں روتی ہو وہ تو اب دوزخ میں ہیں، تو بولیں کہ "اسی وجہ سے تو اور مجھے رونا آتا ہے پہلے تو میں ان کے خون کے بدلے کے لئے رویا کرتی تھی

(۱) الجدید فی الادب العربی ج ۵ ص ۲۹۳۔

اور اب ان کے دوزخ میں جانے سے روتی رہتی ہوں (۱)۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو وہ اپنی قوم کے وفد کے ساتھ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اسلام لائیں اور پھر ان کی ایسی کایا پلٹ ہوئی کہ زندگی کا رخ بدل گیا۔ اب وہی خنساء جو اپنے بھائیوں کو اب تک روتی رہی تھیں۔ صبر و شکر کا ایک ایسا اعلیٰ مجسمہ بن گئیں کہ غم و اندوہ کے پہاڑ بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے۔ لٹی ہوئی زندگی کا سہارا چار جگر گوشے رہ گئے تھے۔ جنگ قادسیہ میں جو سعد بن ابی وقاص کی سرکردگی میں ۱۵ھ میں ہوئی تھی چاروں کو موت کے منہ میں یہ کہہ کر جھونک دیا کہ دیکھو معرکہ کارزار میں پیٹھ نہ دکھانا۔ صبر و ہمت اور استقلال سے دشمنوں کا مقابلہ کر کے سرخروئی اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنا۔ چاروں ہتھیاروں سے سج دھج کر معرکہ کارزار میں پہنچے بڑی بے جگری سے لڑے لیکن خنساء کی آزمائش اب بھی باقی تھی۔ خبر آئی کہ چاروں جگر گوشے مارے گئے۔ خنساء کی آنکھوں میں چاروں اور اندھیرا چھا گیا۔ آخری سہارے بھی دم دے گئے لیکن منہ سے آہ تک نہ نکلی اور کہا تو صرف اتنا کہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ شَرَّفَنِیْ بِقَتْلِهِمْ" اس خدا کا شکر ہے جس نے ان کے قتل سے مجھے عزت بخشی"

خنساء نے کافی لمبی عمر پائی بعض روایت کہتے ہیں کہ ان کی وفات حضرت عثمان کے ابتدائی دور خلافت ۲۴ھ (۶۴۵-۶۴۴ء) میں ہوئی بعض کا کہنا ہے کہ حضرت معاویہ کے عہد خلافت ۴۲ھ مطابق ۶۶۳ء اپنی قوم کی جائے رہائش بادیہ میں ہوئی۔

امتیازی خصوصیات :

عام طور سے علماء اور نقادوں کا اس پر اتفاق ہے کہ عورتوں میں زمانہ جاہلی

---

(۱) عربی کا جملہ اس موقع پر بہت خوبصورت ہے کہتی ہیں " ذالک أدعی لحزنی علیهما۔ لقد کنت من قبل أبکی لهما من الثأر۔ وأنا الیوم أبکی لهما من النار"۔

اور اسلام دونوں میں خنساء سے بڑھ کر کوئی شاعرہ نہ تھی اور نہ اس کے بعد پیدا ہوئی اس خصوصیت کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ آنحضرت نے جن چند شعراء کی تعریف کی ہے ان میں خنساء کا نام سرفہرست ہے چنانچہ آپ خنساء سے "ھیئہ یا خناس" یعنی ہاں بھئی خنساء کچھ سناؤ کہہ کر اشعار سنتے تھے اور داد دیتے تھے۔ بعض نقاد خنساء کے مقابلہ میں لیلیٰ الأخیلیة (۱) کو پیش کرتے ہیں لیکن وہ بھی) مرثیہ گوئی) میں خنساء کی فوقیت کے قائل ہیں۔ مُبَرّد نے کامل میں کہا ہے کہ خنساء اور لیلی الاُخیلیة نے اپنے اشعار میں بڑا بانکپن دکھایا ہے اور مردوں سے بھی اس فن میں بازی لے گئیں۔ عباسی دور کا مشہور شاعر بشار بن بُرد کہتا تھا کہ جب بھی کسی عورت نے شعر کہا غلطی ضرور کی۔ تو اس سے کہا گیا کہ کیا خنساء بھی ایسی تھیں تو بولا کہ "ارے اس نے تو بڑے بڑے جغادریوں کو بھی چت کر دیا۔ ابوزید کہا کرتے تھے کہ لیلیٰ کے یہاں بڑا تنوع بڑی گہرائی اور الفاظ میں بڑی جان ہے۔ مگر مرثیہ میں خنساء کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خنساء کی حیثیت صرف زمانہ اسلام میں ہی نہ تھی بلکہ زمانۂ جاہلیت میں بھی ان کی بحیثیت فن کار شاعرہ کے شہرت تھی اور عکاظ کے میلے میں مشاعروں میں شریک ہو کر داد حاصل کر چکی تھیں چنانچہ ایک مشاعرے میں جس کی صدارت نابغہ الذبیانی کر رہا تھا خنساء نے اپنا وہ قصیدہ سنایا جس کا مطلع ہے ؎

قَذًى بِعَيْنِكِ أَمْ بِالعَيْنِ عُوّارُ ‏‏ ‏‏ ‏‏ أَمْ ذَرَفَتْ إِذْ خَلَتْ مِنْ أَهْلِهَا الدَّارُ

یعنی تمہاری آنکھوں میں کوئی تنکا پڑ گیا ہے یا اٹھنے کو آ گئی ہیں جس کی وجہ سے مستقل آنسو جاری ہیں یا اس وجہ سے خون کے آنسو رو رہی ہیں کہ گھر کے سب لوگ کوچ کر گئے؟ نابغہ کو یہ قصیدہ اس قدر پسند آیا کہ بولا کہ "اگر ابھی ابوبصیر (یعنی الاعشیٰ) نے اپنا قصیدہ نہ سنا دیا ہوتا تو میں فیصلہ دے دیتا کہ میلے میں جتنے شعراء ہیں نہ صرف ان میں تو سب سے بڑی شاعرہ ہے بلکہ انسانوں اور جنات میں بھی تو سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ اس موقع پر حسان بھی موجود تھے انھوں نے جب نابغہ کے منہ سے

---

(۱) اس کے بارے میں تفصیل اس کتاب کے صــ پر ملاحظہ کیجیے۔

خنساء کے بارے میں یہ کلمات سُنے تو بولے" میں تجھ سے اور اس سے (خنساء) بھی بڑا شاعر ہوں۔" اس پر نابغہ نے کہا" بات ایسی تو نہیں ہے پھر خنساء کو مخاطب کر کے کہا کہ ارے بھئی تم ہی ان کو جواب دے دو۔ چنانچہ خنساء نے حسان سے کہا کہ اچھا آپ نے ابھی اپنا جو قصیدہ پڑھا ہے اس کا سب سے اچھا شعر کونسا ہے؟" حسان بولے کہ میرا یہ شعر ہے

لنا الجفنات الغر یلمعن بالضحیٰ وأسیافنا یقطرن من نجدۃ دما

شعر سن کر خنساء نے کہا کہ آپ نے اپنے فخر کو کمزور کر دیا ہے اور سات آٹھ جگہ اس میں نقص پیدا کر دیا ہے،" حسان بولے کہ وہ کیوں کر؟" تو بولیں کہ آپ نے "جفنات" کا لفظ استعمال کیا ہے اور جفنات کا لفظ دس سے کم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اگر آپ نے جفان کہا ہوتا تو زیادہ مناسب ہوتا پھر آپ نے "الغر" کہا ہے اور "الغرۃ" پیشانی کی سفیدی کو کہتے ہیں" اگر آپ نے اس کے بجائے لفظ "بیض" استعمال کیا ہوتا تو زیادہ بامعنی ہوتا۔ اسی طرح آپ نے "یلمعن" کا لفظ استعمال کیا ہے اور لمعان اس چمک کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے بعد آتی ہے (لمعان البرق بجلی کی چمک جو مستقل نہیں رہتی۔ مصنف) اس کے بجائے "یشرقن" لمعان سے زیادہ دیرپا چمک ہے۔ آپ نے "بالضحیٰ" کا لفظ استعمال کیا ہے اگر آپ "بالدجیٰ" کہتے تو معنیٰ بھرپور ہو جاتے پھر آپ نے لفظ "اسیاف" استعمال کیا ہے اور "اسیاف" دس سے کم تلواروں کو کہتے ہیں اس کی جگہ "سیوف" کہنا تھا کیوں کہ ان میں زیادہ اکثریت ہے اسی طرح آپ کو "یقطرن" کی جگہ "یسلن" استعمال کرنا تھا کیوں کہ اس میں زیادہ کے معنی ہیں پھر آپ نے "دما" کا لفظ استعمال کیا ہے حالاں کہ "الدماء" کے لفظ میں زیادہ وسعت ہے۔" یہ سن کر حسان خاموش ہو گئے اور کچھ نہ بول سکے۔

خنساء بڑی صاحب نظر اور دقیق بین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ ان کے شعر میں بڑا سوز، بڑی کسک اور بڑا درد ملتا ہے۔ کیوں کہ یہ ٹوٹے دل کی صدا ہے غموں سے چھلنی دل کی پکار ہے اور ایسی پکار سیدھی دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے اور سامع اور قاری کو بھی تاثر کے اتھاہ سمندر میں غرق کر دیتی ہے اور ان سب باتوں پر مزید ان کے کلام میں بڑی موسیقیت اور

نغمگی ہے کیوں کہ وہ ہلکے پھلکے خوبصورت اور چیدہ الفاظ کو چھوٹی بحروں کے تقاضا اس طرح خوبصورتی سے سجا کر شعر کے قالب میں ڈھالتی تھیں کہ وہ نغمہ و موسیقی، راگ رنگ اور تاثیر و تاثر کی عدیم المثال مرقع بن جاتا تھا اس لئے جریر سے جو اس صنعت میں اپنے زمانے کا منفرد شاعر تھا جب پوچھا گیا کہ کون بڑا شاعر ہے؟ تو بولا کہ "میں! اگر خنساء نہ ہوتی" کہا گیا کہ وہ تم سے کس طرح بازی لے گئی؟ تو بولا کہ اپنے اس شعر سے ؎

اِنّ الزمانَ وما یَفنی لہٗ عجبٌ ۔۔۔ اُبقیٰ لنا ذَنَباً واستؤصِلَ الرأسُ

ان الجدیدینِ فی طولِ اختلافہما ۔۔۔ لا یَفسُدان ولکن یفسدُ الناسُ

یعنی زمانے کا رنگ بھی عجیب ہے ہمارے جسم سے سر کو تو کاٹ کر الگ کر دیا اور صرف دم رہنے دی یعنی (ہمارا سارا قیمتی سرمایہ) لوٹ کر صرف گھٹیا چیز ہی ہمارے لئے چھوڑتا ہے۔ دن و رات ایک عرصہ دراز سے آتے جاتے رہنے کے باوجود خراب نہیں ہوتے ہیں، لیکن لوگ خراب ہو جاتے ہیں" یعنی مرتے رہتے ہیں۔

خنساء کا اکثر کلام مرثیہ ہے جسے انھوں نے اپنے دو بھائیوں معاویہ اور صخر کے قتل کے بعد کہا ہے دونوں بھائیوں کے مرثیہ کو غور سے پڑھا جائے تو معانی و مطالب کا فرق صاف نظر آتا ہے چنانچہ معاویہ کے مرثیوں میں بھاری بھرکم الفاظ کے ذریعے رنج و غم کے گمبھیر معانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جن میں دل صد پارہ کی وہ کسک وہ سوزش یا ٹوٹے دل کی وہ جھنکار نہیں ہے جو صخر کے مرثیوں میں ملتا ہے اور جسے پڑھ کر دل پر غم کی وہ بدلی چھا جاتی ہے جو آنکھوں کی راہ سے جب تک برس نہیں لیتی، کھلتی نہیں۔ بلکہ اس کے برخلاف ان مرثیوں میں فنی کمالات مصیبت کی اور رونے دھونے کی بھرپور تصویر، فلسفۂ موت وحیات اور غم پوری شان و شکوہ سے ملتا ہے۔ (۱) لیکن صخر کے مرثیہ میں دل کے رونے کی جو آواز ہے اور جو درحقیقت غم کی اصل آواز اور صحیح تصویر ہے اور جو صحیح معنوں میں خنساء کا اصل رنگ بھی ہے نہیں ملتا۔ ذرا ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیے جن کی ابتداء وہ ایک سوالیہ جملہ سے کرتی ہیں جس میں کہتی ہیں کہ آخر

---

(۱) حنا الفاخوری: الجدید فی الادب العربی ۵/۹۵م

ان کی آنکھوں کو کیا ہوگیا ہے کہ انھوں نے اتنے آنسو بہائے کہ سارے کپڑے تک بھیگ گئے ہیں اپنے بھائی کی موت کی وجہ سے اتنی شدید تکلیف میں مبتلا اور اتنی سخت مایوسی سے دوچار ہوں کہ اب زندگی کی کوئی پرواہ نہیں رہی اس لئے اچھا ہے موت آتی رہے اور جس کو جی چاہے لے جاتی رہے کہ اس سے میرے رنج وغم میں کوئی زیادتی نہ ہوگی میں صبر کروں گی کیوں کہ صبر آخیر میں آدمی کو سعادت اور خوشی بخشتا ہے اور رنج و غم، تکلیف اور بدبختی بڑھاتے ہیں ؎

ألاما لِعَيني ألاما لها	وقد أخضل الدمعُ سربالها
لِتَغيرِ المَنِيّة بعد الفتى	المغادرُ بالمحو إذ لا لها
فإن تصبرا لنفسُ تلق السرور	وإن تجزع النفسُ اشقى لها

چنانچہ مذکورہ بالا اشعار میں رنج وغم کی کسک کے مقابلے میں فلسفہ رنج وغم کی بات زیادہ ہے البتہ اس قصیدہ میں معاویہ کو بحیثیت ایک مثالی عربی نوجوان کو پوری عربی بدوی صفات اور اخلاق کے ساتھ پیش کرنے میں خنساء کو پوری کامیابی ہوئی ہے کہتی ہیں کہ وہ جنگ کی آگ بھڑکانے میں مثالی نوجوان تھا یعنی وہ بزدل نہ تھا وہ تلوار کا دھنی زبان کا پکا اور دشمنوں کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کرتا تھا جو وہ اس کے ساتھ کرتے تھے ایسے نوجوان کے کھوجانے پر میرے دل کو کیوں نہ دکھ ہو کہ ایسے نوجوان کے مرنے پر صبر مشکل سے آتا ہے ؎

لَعَمرُ أبيكَ لَنِعمَ الفتى	تَحُشُّ به الحربُ أجذالها
حديدُ السنانِ ذليقُ اللسانِ	يجازي المقارضَ أمثالها
فنفسي الفدا وله من فقيدٍ	أبتْ أن تُزايل إعوالها

یہ اور اسی قسم کے معانی ومطالب اور صورتیں معاویہ کے اکثر مرثیوں میں ملتی ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ان میں وہ جان اور شان نہیں جو صخر کے مرثیہ میں ہے صخر کے مرثیوں میں

اس امتیازی شان کی ایک وجہ یہ ہے کہ صخر نے معاویہ کے قتل کا نہ صرف بدلہ لیا تھا بلکہ اس کے بدلے میں حریف قبیلے کے تین نوجوانوں کو موت کی گھاٹ اتار دیا تھا اور اس طرح نہ صرف اپنی بہادری، قبیلہ کی عزت، پاسبانی اور اس کے نام کو قبائل عرب میں اونچا کیا بلکہ بدلہ لے کر خنساء کے دل رنجور کو بھی تسکین و تسلی بخشی کہ ان کے بھائی کے خون کا

بدلہ مل گیا اور اس طرح وہ بھی سرخ رو ہو گئیں اور دوسری سب سے اہم اور بڑی وجہ یہ ہے
کہ صخر نے اس سماج میں جس میں ہر طرف نفسی نفسی کا عالم رہتا تھا مصیبت کے وقت
نہ صرف ان کا ساتھ دیا بلکہ اپنی جائیداد بھی ان پر نچھاور کر دی اور ایک مرتبہ ہی
نہیں بلکہ تین چار مرتبہ ۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ خنساء حضرت عائشہ رض
سے ملنے آئیں حضرت عائشہ نے جو ان پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہ "صدار" (کمل کی لمبی قمیص
جس میں آستینیں نہیں ہوتیں) پہنے ہوئے ہیں۔ اور بڑھاپے کی وجہ سے لکڑی کا سہارا
لے کر چل رہی ہیں۔ حضرت عائشہ بولیں کہ کیا تم خنساء ہو؟ تو جواب دیا کہ ہاں اماں۔
اس پر عائشہ رض نے کہا کہ تم صدار پہنتی ہو حالاں کہ اسلام میں اس کی ممانعت ہے؟
خنساء نے جواب دیا مجھے معلوم نہ تھا، حضرت عائشہ نے کہا تمہاری یہ حالت کیسے ہو گئی؟
خنساء نے جواب دیا "میرے بھائی صخر کی موت کی وجہ سے" حضرت عائشہ نے کہا کہ اس کا
مطلب ہے کہ اس نے تمہارے ساتھ اتنے احسانات اور نیکیاں کی ہیں کہ تم نے اس کی
خاطر اپنی دنیا بدل ڈالی، ذرا اس کے متعلق تفصیل سے کچھ بتاؤ تو" اس پر خنساء نے کہا
"جی ہاں! میری جو یہ ہیئت آپ دیکھ رہی ہیں اس کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ہوا یہ کہ
میرا شوہر بہت فضول خرچ اور پکا جواری تھا۔ جوئے میں جب سارا مال و متاع لٹ
چکا تو گھر چھوڑ کے جانے لگا میں نے کہا اچھا ٹھہرو میں اپنے بھائی صخر کے پاس جاتی ہوں
اور اس سے کچھ مانگ کر لاتی ہوں۔ چنانچہ میں اپنے بھائی کے پاس گئی اور اپنی تکلیف
و پریشانی ان کو سنائی۔ اس نے بلا تکلف اپنے مال و جائیداد میں سے آدھا مجھے
دے دیا۔ میں لے کر گھر آئی۔ اور اس کو بھی میرے شوہر نے جوئے میں گنوا دیا۔ دوسرے
سال میں پھر صخر کے پاس اپنا دکھ درد لے کر گئی۔ اس دفعہ بھی اس نے اپنا آدھا
مال بلا تکلف میرے حوالہ کر دیا۔ اور اسے بھی میرے شوہر نے برباد کر دیا۔ میں تیسری
دفعہ پھر صخر سے مدد مانگنے گئی اب کی دفعہ اس کی بیوی اس کو تنہائی میں لے گئی اور
اس سے بولی کہ کیا فائدہ اس مدد سے جو دیتے ہو اس کا شوہر اس کو برباد کر دیتا
ہے ۔ ایسا ہی اگر دینا ہے تو کوئی گھٹیا سی چیز دے دو۔ ظاہر ہے اسے بھی وہ برباد کریگا
صخر کو بیوی کی یہ بات بہت بری لگی۔ اس نے دو شعر پڑھے۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ
میں اسے گھٹیا چیز ہرگز نہ دوں گا۔ وہ شریف زادی ہے جن کی بے عزتی میں برداشت

نہیں کر سکتا۔ اور جانتی ہو اگر میں مر گیا تو وہ اپنی اوڑھنی پھاڑ اون کی کملی گلے میں ڈال میرا سوگ منائے گی ؎

ولو هلكتُ خرقتْ خمارها ۔۔۔ واتخذت من شعر صدارها

اس کے بعد اس نے اپنی آدھی دولت میرے حوالے کر دی۔ چنانچہ جب وہ مر گیا تو میں نے اس کے کہنے کے مطابق کملی گلے میں ڈال لی کہ میرے بارے میں اس کا جو خیال تھا اسے سچ کر دکھاؤں اس لئے خدا کی قسم جب تک زندہ ہوں اس کی بات کو جھوٹ نہ کروں گی"[1]

اس طرح صخر نے انھیں فقر و فاقہ اور اس مصیبت سے بچایا جو جسمانی تکلیف کے علاوہ عزت نفس اور شرافت و بڑائی کو بھی داؤ پر لگا دیتی ہے اور اس کو کسی کے سامنے دست سوال دراز کر کے بے عزت ہونے سے بچا لیا۔ اس لئے جب وہ مرا تو ان کی دنیا ایسی تاریک ہوئی جتنی ان کو اپنے بیٹوں کے مرنے سے بھی نہ معلوم ہوتی ہوگی، اب ان کو تنہائی کس مپرسی کے علاوہ اپنے بڑے دل کے بھائی ساتھی کا سہارا ختم بھی ہو گیا۔ اور اس احساس سے ان کی آنکھیں نہیں بلکہ ان کا دل روتا تھا اور دل کے رونے کی آواز تو نہیں آتی لیکن خون کے سارے سوتے آنکھوں کی راہ سے صفحۂ قرطاس پر سرخ آنسو بن کر بکھر جاتے ہیں۔ چنانچہ کہتی ہیں کہ یہ تمہاری آنکھوں کو کیا ہو گیا کہ محبوب گھر والوں سے خالی ہو گیا تو ان کے آنسو رکتے نہیں ان میں کوئی تنکا پڑ گیا ہے یا اُمنڈے کو آ رہی ہیں۔ صخر کی یاد کے ساتھ میرے آنسوؤں کے بہنے کی یہ کیفیت ہے جیسے ایک سخت سیلاب ہو جو میرے دونوں رخساروں سے بے تحاشا اور مستقل امنڈتا چلا آ رہا ہے ؎

قذى بعينك، أم بالعين عوّار ۔۔۔ أم ذرفت إذ خلت من أهلها الدار

كأن دمعي لذكراه، إذا خطرت ۔۔۔ فيض، يسيل على الخدين مدرار

مذکورہ اشعار میں دل کے رنج و غم کی تصویر اپنی پوری اثر انگیزیوں کے ساتھ الفاظ کے قالب میں بھی اور حسی طور پر بھی پوری طرح اجاگر ہے یہ رنج و غم اس طوفان کی طرح ہے جو روکے بھی نہیں رکتا۔ بلکہ خونِ جگر سے کھنچی ہوئی مئے عشرت شبانہ کو جسے عمر بھر حرز جان بنا کر بچا رکھا تھا آنسوؤں کی شکل میں بے دریغ بہا دیتی

---

(1) مقدمہ دیوان خنساء مطبوعہ دار التراث (بیروت)

ہیں۔ جب صخر ہی نہیں تو پھر کس کے لئے یہ انمول موتی سجا کر دل کے خزانے میں رکھے جائیں کہ صخر تو اب زمین کا پیوند ہو گیا اور میرے اور اس کے درمیان ہزار ول دبیز پردے پڑ گئے اب تو صرف رونا ہے، رونا ہے اور صرف رونا ہے

تبکی لصخر ھی العبری وقد ولھت | ودونہ من جدید الترب استار
تبکی خناس فما تنفک ما عمرت | لھا علیہ رنین وھی مفتار
تبکی خناس علی صخر، وحق لھا | إذ رابھا الدھر، إن الدھر ضرار

ایسے آدمی کا دل اتنا کمزور اور حساس ہو جاتا ہے کہ فاختاؤں اور قمریوں کی غم انگیز آواز سن کر بھی آنکھیں خون کی لڑیاں پرونے لگتی ہیں۔ سینہ میں حساس دل نہیں رہ جاتا ہے بلکہ

دل ہے کہ نشور اک باجہ ہے سینہ کے اندر تاروں کا
جب چوٹ لگے جھنکار اٹھے جب ٹھیس لگے تھرا جائے

یہ اس لئے کہ دل کی وہ شدید محبت، جو اپنے محبوب سے ہوتی ہے اس کے چھٹنے کے بعد اس کو دیکھنے، اس سے باتیں کرنے کی تمنا حسرت میں بدل جاتی ہے جس کے متعلق آدمی کو یقین ہے کہ یہ ناممکن الحصول ہے لیکن اس تمنا اور حسرت کی تکلیف سے جو مزہ ملتا ہے اس کا بدل کسی صبر و سکون اور وجہ شکیبائی میں نہیں ہے

تذکرت صخرا، اذ تغنت حمامۃ | ھتوف علی غصن الأیک تسجع
فظلت لھا أبکی بدمع حزینۃ | وقلبی مما ذکرت تنی موجع
تذکرنی صخرا وقد حال دونہ | صفیح واحجار وبید برتلقع

اس حالت میں قدرت اور اس کے مظاہر چاند سورج اور دوسری چیزیں صرف اس محبوب کی یاد دلاتی ہیں اور خون کے آنسو رلا جاتی ہیں۔ اب آنکھوں میں نیند کہاں دل میں صبر و قرار کی سکت کہاں اب تو سکون صرف موت میں ہے ہے

یؤرقنی التذکر حین أمسی | فأصبح قد بلیت بفرط نکس
یذکرنی طلوع الشمس صخرا | وأذکرہ لکل غروب شمس
فلا واللہ لا أنساک حتی | أفارق مھجتی ویشق رمسی

یہ اس لئے تھا کہ وہ انسان کامل اور شرافت اور نجابت کا جیتا جاگتا نمونہ

تھا وہ سخت سردیوں قحط وخشک سالی میں اونٹنیوں کو ذبح کر کے لوگوں کو کھلاتا تھا۔ اسی کے ساتھ بڑا سجیلا خوبصورت اور ہر طرح سے بھرپور اور بہادر جوان ہونے کے علاوہ بڑا متقی پرہیزگار بھی تھا۔ اور ایسا کہ بڑے بڑے لوگ اس سے بڑے ہی اہم معاملات اور مشکلات میں مشورہ لیتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک بلند بالا پہاڑ ہے جس کی چوٹی پر ایک دیا روشن ہے جس سے اندھیری راتوں کو چلنے والے راہ پا جاتے ہیں ؎

وإن صخراً لوالينا وسيدنا   وإن صخرا إذا نشتو لنحار
وان صخراً لمقدامٌ إذا ركبوا   وإن صخرا إذا جاعوا لعقّار
وإن صخرا لتأتم الهداة به   كأنه علمٌ في رأسه نارٌ
جلدٌ جميلُ المحيا، كاملٌ ورعٌ   وللحروب غداة الروع مِسعارٌ

غرض کہ ان اشعار اور ان جیسے دوسرے اشعار میں خنساء نے صخر کی مختلف جاذب نظر عدیم المثال اور خوبصورت تصویر کھینچ کر پہلے اس کی عظمت کے سارے پہلو اجاگر کرنے کے بعد ایسی ہستی کے ہمیشہ کیلئے کھو جانے پر نوحہ وزاری کرنے کو بجا ثابت کر کے دل کے زخموں کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ پھر کہتی ہیں کہ اتنا بڑا غم انسانوں کو درکنار جنات پر بھی نہیں پڑا ہے ؎

فلم أر مثله رزءا لجن   ولم أر مثله رزءا لانس

اپنے بھائی صخر کو مخاطب کر کے کہتی ہیں کہ اے صخر اپنی موت کے بعد تم مجھے اس قدر رلا رہے ہو تو کیا ہوا تم نے ایک زمانے تک مجھے ہنسایا بھی تو ہے۔ جب تم زندہ تھے تو تمہارے سہارے میں بڑی بڑی مصیبت کو جھیل گئی اور اب اس سب سے بڑی مصیبت کو کس کے سہارے سہاروں؟ ؎

ألا يا صخر إن أبكيت عيني   فقد أضحكتني زمناً طويلا
دفعتُ بك الخطوب وأنت حيٌّ   فمن ذا يدفع الخطب الجليلا

انسان کی فطرت ہے کہ وہ رنج وغم کے موقعہ پر پاس پڑوس یا عزیز واقارب میں ایسے واقعات سن کر یا معلوم کر کے یا دیکھ کر صبر وسکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ تو قدرت کی ریت ہے جس سے مفر نہیں، خنساء نے بھی یہ کیا تاکہ

دل میں جو آگ لگی ہے اس کی سوزش کچھ تو کم ہو جائے۔ تو انھیں اپنے پاس ہی ایک گائے
مل گئی جس کا بچہ مر گیا تھا اور دستور کے مطابق اس بچے کی کھال کھینچ کر اس میں بھوسہ
بھر کر لگاؤنا بنا دیا گیا ہے۔ (تاکہ دودھ دوہتے وقت اسے ماں کے تھن سے لگا دیں
تو وہ پینو سا جائے یعنی اس کا دودھ اترنے لگے) یہ دکھیاری گائے اسی لگاؤنے کے
ارد گرد بے قراری میں چکر لگائے جاتی ہے چرنے جاتی ہے تو بچہ یاد آجاتا ہے تو بھاگ کر
پھر اسی ڈھوکے کی ٹٹی کے پاس آکر بالکل انسانوں کی طرح ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے اور
موسم بہار کی ہری اور جاندار گھاس کے باوجود بھی وہ روز بروز اپنے بچّے کے غم میں
دبلی ہوتی جاتی ہے خنساء اس بیتاب اور دل فگار جانور کو دیکھتی ہیں اور بجائے صبر و
سکون حاصل کرنے کے کہتی ہیں کہ اس گائے کو بھی اپنے بچّے کا اتنا غم نہیں جتنا مجھے صخر
کے مرنے کا غم ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ قسام ازل نے میری قسمت میں رنج و غم لکھ دئے ہیں کہ
میں ہی اس بار عظیم کو اٹھا سکتی تھی ؎

وَمَا عَجُولٌ عَلَى بَوٍّ تُطِيفُ بِهِ	لَهَا حَنِينَانِ: إِصْغَارٌ وَإِكْبَارُ
تَرْتَعُ مَا رَتَعَتْ حَتَّى إِذَا ادَّكَرَتْ	فَإِنَّمَا هِيَ إِقْبَالٌ وَإِدْبَارُ
لَا تَسْمَنُ الدَّهْرَ فِي أَرْضٍ وَإِنْ رَتَعَتْ	فَإِنَّمَا هِيَ تَحْنَانٌ وَتَسْجَارُ
يَوْماً بِأَوْجَدَ مِنِّي حِينَ فَارَقَنِي	صَخْرٌ، وَلِلدَّهْرِ إِحْلَاءٌ وَإِمْرَارُ

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص بھی جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا رونا تو پروانے کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اور اس طرح زندگی بھر شمع کی طرح جلتی اور گھلتی خنساء اپنے پیاروں اور
دلاروں سے جا ملیں۔ خنساء کا مکمل دیوان موجود ہے جس کے کئی نسخے مختلف زمانوں
میں چھپ چکے ہیں جن میں سے بعض کی تفصیل ذیل میں ہے۔

(۱) دیوان الخنساء: المطبعة الوطنية، مصر ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء
(۲) دیوان الخنساء: القاھرۃ ۱۳۱۵ھ
(۳) انیس الجلساء فی شرح دیوان الخنساء، المطبعة الكاثوليكية، بيروت ۱۸۹۶ء

(۴) دیوان الخنساء : دیوان حاتم الطائی کے ساتھ ۱۳۲۶ھ
(۵) دیوان الخنساء : حسنین محمد الزیدانی القاهره ۱۳۲۶ھ
(۶) دیوان الخنساء : (دار صادر و دار بیروت) بیروت ۱۹۶۰ء

حوالہ جات:

۱۔ الأغانی للاصفہانی متفرق حصے۔
۲۔ خزانة الادب (ولب لباب لسان العرب) لابن عمر البغدادی۔
۳۔ الشعر والشعراء لابن قتیبة۔
۴۔ طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی۔
۵۔ الکامل للمبرد۔
۶۔ البیان والتبیین للجاحظ۔
۷۔ الامالی للمرتضی۔
۸۔ تاریخ الطبری۔
۹۔ دائرة المعارف الاسلامیة مادة خنساء۔
۱۰۔ تاریخ آداب اللغة العربیة لجرجی زیدان جلد اول ص ۱۲۶۔
۱۱۔ الوسیط فی الادب العربی لاحمد الاسکندری ومصطفیٰ عنانی ص ۱۵۶۔
۱۲۔ الجدید فی الادب العربی جلد ۵ حنا الفاخوری ص ۲۹۳۔
۱۳۔ تاریخ الادب العربی عمر فروخ ص ۳۱۷۔
۱۴۔ شعر الخنساء تحقیق وشرح کرم بستانی، بیروت مکتبہ صادر ۱۹۵۱ء
۱۵۔ الخنساء : بنت الشاطی (عائشہ عبدالرحمن) بیروت ۱۹۵۷ء

۴- اَلحُطَیئَہ

۶۷۹ء مطابق ۵۹ھ

دوسروں کی ہجو اور اپنی تعریف یا افراد کی یا کسی خاندان کی برائیاں اچھالنا۔ ان کو بیان کر کے عار دلانا اور اپنی اپنے ماں باپ بھائی بہن اور خاندان والوں کی چھوٹی سے چھوٹی بھلائی اور نیک کام کو بڑا کر کے دکھانا اور کسی پر فخر کرنا عام بات ہے مگر اپنے ماں باپ، بھائی بہن خاندان اور حد تو یہ ہے کہ خود اپنی اور وہ بھی سخت اور فحش ہجو نہ آپ نے کسی شاعر کے منہ سے سنی ہوگی اور نہ شاید کبھی پڑھی ہوگی۔ (۱) آیئے اب آپ کو ایک ایسے شاعر سے ملاؤں جس نے ساری دنیا کی سخت ہجو کرنے کے بعد اپنی بھی سخت ہجو اپنے منہ سے کی ہے اور وہ ہے زمرہ مخضرمین کا مشہور زیر تذکرہ شاعر اَلحُطَیئَہ۔

روایت ہے کہ ایک دن ہمارا شاعر صبح کو جو سو کر اٹھا تو اس کو ایسا لگا کہ اس کا منہ کسی کی ہجو کرنے کے لئے کھجلا رہا ہے مگر سمجھ میں نہ آیا کہ کس کی شان میں منہ کھولے اور اس صورت حال کا ایک شعر فوراً وارد ہو گیا۔

أبتْ شَفَتَایَ الیوم إلا تکلّما ‌ ‌ ‌ بِسُوءٍ فما أدری لمَن أنا قائله

یہ شعر جب وارد ہو گیا تو اس کا ورد کرتے ہوئے اپنے شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں اتفاق سے ایک کنواں مل گیا اس میں جو جھانک کر دیکھا تو ایک بہت ہی بھیانک کریہہ المنظر گھناؤنا چہرہ نظر آیا۔ اب جو شاعر نے غور کیا تو انکشاف ہوا کہ یہ خود شاعر کا اپنا روئے مبارک ہے اس حال کو دیکھ کر فوراً زبان قال نے کہا۔

---

(۱) اردو میں لکھنؤ کے ایک مشہور پرانے غزل گو شاعر کے متعلق مشہور ہے کہ جب کسی نے ان کا دیوان چرا کر اپنے نام سے شائع کرا لیا تو انھوں نے اپنا تخلص 'چرکین' رکھ لیا اور ہزل گوئی شروع کر دی اور کہا کہ دیکھیں اب کس کی مجال ہے کہ اس کو چرا کے اپنے نام سے چھپوا تا ہے انھوں نے بہت عریاں اور مبتذل اشعار کہے ہیں لیکن اتنی عریانی اور ابتذال ان کے یہاں بھی نہیں ہے جتنی حطیئہ کے یہاں ملتی ہے۔

أرى لي وجها شوّه الله خلقه ۔۔۔ فقُبّح من وجهٍ وقُبّح حامله

لاحول ولا قوۃ خدا نے بھی میرا چہرہ کتنا بدنما اور بھیانک بنایا ہے اس چہرہ اور اس چہرے والے دونوں پر خدا کی پھٹکار۔

یہ تیکھا اور خود سوز انداز ہجو وہی اختیار کر سکتا ہے جس کو ملک، سماج، خاندان دوست احباب اور خود اپنے سے نفرت ہو اور یہ نفرت کب ہوتی ہے؟ جب انسان مایوسی کے اس اتھاہ سمندر میں ڈوب جاتا ہے جہاں سے نکلنا بھی چاہے تو نکل نہیں پاتا کہ ایک مرتبہ کہیں دھبہ لگ گیا تو آپ اپنی بہترین صلاحیتیں لگا کر اس کو دھونا چاہیں تب بھی وہ نہیں مٹ پاتا۔ اور جب دھبہ نہیں مٹنے دیا جاتا تو داغ دار شخص اس دھبہ کو اتنا چمکا دیتا ہے کہ دوسرے بھی پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ اور یہی کہانی ہے ہمارے اس فطری حساس دل شاعر کی جس کا نہ کوئی چانا پہچانا باپ تھا اور نہ ماننے والے بھائی، بہن اور نہ سینے سے لگانے والا خاندان۔ رہ گئی ماں سو وہ ایک لونڈی تھی ایک کی ملکیت مگر سب کا مال۔ اور عرب کے اس معاشرہ میں ایسے آدمی کی جو حیثیت ہوتی ہے اس کو سب جانتے ہیں۔ ایک حقیقی وجود۔ قدرت کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کے ساتھ، لیکن مطعون مقہور۔ ہر طرف سے دھتکارا ہوا، مایوس، ناامید، اور ظاہر ہے ایسا آدمی جب حساس دل بھی رکھتا ہو تو ان حالات میں سب سے انتقام کا جذبہ اس کے دل میں آگ لگا دیتا ہے اور یہی ہمارے شاعر کے ساتھ ہوا اور کیوں نہ ہو۔ اس کے وجود میں اس کا کیا گناہ تھا بلکہ بقول ابوالعلاء المعری۔

هذا جناه عليّ أبي ۔۔۔ وما جنيتُ على أحدْ

میں اپنے باپ کا گناہ ہوں۔ پر میں نے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ اور حطیئہ تو صحیح معنوں میں اپنے باپ کا گناہ تھا۔ چنانچہ اس کو سب سے نفرت پیدا ہو جانا فطری بات تھی اپنے باپ، اپنی ماں، بھائی بہن یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے۔ اور جب یہ نفرت انتقام کی شکل میں بدلی تو سخت اور فحش ہجو کی صورت میں ظاہر ہو کر عربی ادب میں ہجو کے ایک ایسے باب کا اضافہ کر گئی جس کی مثال اس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

شاعر کا نام جرول تھا باپ کا نام اوس بن مالک تھا۔ جو قبیلہ عبس کا فرد تھا اس طرح اس کا سلسلۂ نسب قبیلۂ مضر سے جا ملتا ہے۔ ماں کا نام "الضراء" تھا جو اوس کی حبشی نژاد لونڈی تھی۔ کالی کلوٹی بڑی بدچلن آوارہ، بدہیئت اور بدقوارہ۔ جرول کا

لقب الحطیئہ، کنیت ابو ملیکہ تھی۔ ملیکہ اس کی لڑکی کا نام تھا حطیئہ کے معنی ہیں چھوٹے قد کا زمین سے لگا ہوا آدمی یعنی بونا۔ جروں بونا تھا۔ اور اس کے ساتھ بڑا پتلا دبلا مرجھلا کہ مشکل سے نظروں میں سمائے اور چہرہ بہت بے ہنگم اور بے تکا تھا اس کے نچلے جبڑے کی ہڈی ابھری ہوئی تھی اور منہ سوکھا روکھا، بڑا بدصورت اور ڈراونا۔ غرض جسمانی اعتبار سے بھی ہر طرح ناقص کوہیہ المنظر اور بد ہیت انسان تھا (۱)۔ حطیئہ زمانۂ جاہلیت میں پیدا ہوا اور اسلام کے ظاہر ہونے کے بعد مسلمان ہوا مگر اس کو آنحضرت کی صحبت نہ نصیب ہو سکی فتنۂ ارتداد کے زمانہ میں مرتد ہو گیا تھا لیکن بقول رواۃ پھر توبہ کر کے دوبارہ مسلمان ہوا۔ پوری بحث آگے آئے گی۔

حطیئہ نے جب گوش وہوش کی آنکھیں کھولیں تو دیکھا وہ جسمانی اعتبار سے عام لوگوں سے بہت مختلف ہے نہ اس کی قد وقامت ان لوگوں جیسی نہ رنگ نہ روپ۔ ہر چیز میں ان سے مخالف۔ اس جسمانی کمی کے ساتھ اس کو اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ اس کا نسب بھی صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی ماں الضراء کو ٹھیک طریقہ سے یہ تک نہ معلوم تھا کہ وہ کس کا نطفہ ہے۔ ایک دفعہ جب حطیئہ نے اس سے پوچھا کہ میں کس کا بیٹا ہوں تو بولی کہ تو ایک یا دو کا نطفہ تھوڑا ہی ہے جو بتا دوں بلکہ نامعلوم کتنوں کا۔ اب تم ہی ان لوگوں کی بدمعاشیوں کا اندازہ لگا لو۔ (۲) رہا اوس جس کی وہ لونڈی تھی وہ حطیئہ کو اپنی اولاد ماننے سے پہلے ہی مر گیا اس کی ایک آزاد بیاہتا بیوی بھی تھی جس کا تعلق قبیلہ ذہل سے تھا اس عورت کا ایک بھائی افقم نامی بھی تھا جو ٹھگنا بڑا بدصورت کھبڑ دنتا اور بدقوارہ تھا۔ جب حطیئہ پیدا ہوا تو شکل وصورت میں بالکل اس آدمی جیسا بدصورت اور گھناؤنا۔ تو ضراء نے کہہ دیا کہ یہ اسی کا بیٹا ہے اور اوس کی طرف اس کو منسوب کرنے کی ہمت نہ کر سکی مگر افقم نے بھی حطیئہ کو اپنا بیٹا ماننے سے انکار کر دیا۔ اور اس طرح حطیئہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ خاندانی اعتبار سے اس کی نسبت نہ قبیلۂ ذہل میں یقینی ہے اور نہ قبیلہ عبس میں کہ دونوں قبیلوں نے اس کو اپنا ماننے سے انکار کر دیا

---

(۱) الاغانی ۲/ طبقات الشعراء جمحی اور خزانۃ الادب بغدادی۔

(۲) اغانی نے ج ۲/ ۱۴۳ حطیئہ کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے "تقول لی الضراء لست لواحد ولا لاثنین فانظر کیف شرک اولئک"۔

تھا۔ چوں کہ عرب کی سرزمین میں اب بھی اس آدمی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی جو کسی بڑے قبیلہ کا فرد نہ ہو۔ بیچارہ شاعر کبھی اپنا رشتہ ذہل سے جوڑتا کبھی اپنے کو عبس کا فرد بتاتا۔ مگر کوئی بھی اس کو نہ اپناتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ وہ ادھر ادھر ذلیل وخوار مارا مارا پھرتا رہا اور کسی نے بھی اس کو نہ وہ عزت دی اور نہ وہ وقعت جس کی اس کو تمنا تھی۔

روایت ہے کہ ایک دفعہ وہ گھومتا گھامتا بنو ذہل کے گاؤں "قریّۃ" میں پہنچا اس کا عزیز نہیں باپ افقم اسی قبیلہ کا تھا چنانچہ حطیئہ نے افقم کے لوگوں سے افقم کے ترکہ میں سے بیٹے کی حیثیت سے اپنا حصّہ مانگا اور ان کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی کہا جس میں کہتا ہے کہ جو لوگ یمامہ میں رہتے ہیں ان میں بنو ذہل سب سے ممتاز اور اچھے لوگ ہیں وہ لوگ اپنے پڑوسیوں کے مال کی حفاظت کرتے ہیں اور اگر ضائع ہو جائے تو اس کے بدلے میں ان کو دوسرا مال دے دیتے ہیں اور اگر قحط پڑ جائے تو ان کی کفالت کرتے ہیں یہاں تک پھر بہار آجائے اور پھول پتے ہرے بھرے ہو جائیں اس کے بعد اس خاندان کی اصل اور اس کی شاخ سے اپنا رشتہ جوڑ کر فخر کرتا ہے کہتا ہے۔

إنّ اليمامةَ خيرُ ساكنها   اهل اليمامة من بني ذهل

الضامنون لمالِ جارِهم   حتى يتم نوا هضُ البقل

قوم إذا انتسبوا ففرعُهم   فرعي وأثبتَ أصلهم أصلي

حطیئہ کے اس مدحیہ قصیدہ کو سن کر اور اس کی حالت زار کو دیکھ کر افقم کے بیٹوں کو ترس آگیا اور انھوں نے اس کو تین کھجور کے پیڑ دے دیئے اور ان کا نام ام ملکیۃ کے کھجور رکھ دیا جو حطیئہ کی بیوی کا لقب تھا۔ مگر حطیئہ کو اس سے تشفی نہیں ہوئی اور وہ افقم کی جائیداد میں شرعی اولاد کی طرح اپنا پورا حصّہ مانگتا رہا۔ مگر افقم کے بیٹوں نے سختی سے انکار کر دیا چنانچہ حطیئہ نے غصہ میں مذکورہ بالا مدحیہ قصیدہ کو ہجویہ قصیدہ میں بدل دیا اور کہا۔

إنّ اليمامةَ شرُّ ساكنها   أهل القُرَيّة من بني ذهل

یعنی یمامہ میں رہنے والوں میں سب سے بدتر قبیلہ بنو ذہل کے وہ لوگ ہیں جو قُرَیّۃ میں رہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ خفا ہو کر بنو عبس کے پاس چلا گیا اور اوس ابن مالک سے اپنی

غرض اس نے اپنی زندگی کی ابتداء سے لے کر مرتے دم تک غیر اسلامی حرکتیں کیں۔ غیر اسلامی زندگی گزاری جس سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ ایمان و یقین کے ساتھ مسلمان نہ ہوا تھا بلکہ کافر رہتے ہوئے ناچار مسلمان ہونے کے انداز پر اس نے اسلام کو محض اپنی جان بچانے کے لئے ایک حربے کے طور پر اختیار کیا تھا۔ یہ اس کی سیرت کی اس کمتی کی وجہ سے ہوا جو اس کی زندگی میں اس کے حالات اور سماج میں اس کی ناقدری اور اس سے پیدا شدہ مایوسی اور جذبۂ انتقام نے ڈال دیا تھا اسی لئے وہ ہر اس چیز کا منکر بن گیا اور اس کا مذاق اڑاتا تھا جس کو عام لوگ اور سماج مانتا تھا اور اس میں اسلام بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پھرنے پر قبائل کو ابھارتے ہوئے جو قصیدہ کہا ہے اس میں ان قبائل کی مخش اور مبتذل ہجو کی ہے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا کہا ہے۔

أَلَا كُلُّ أَرْمَاحٍ قِصَارٍ أَذِلَّةٌ — فِدَاءٌ لِأَرْمَاحٍ كُنَّ عَلَى الْغَمْرِ

فَبَاسْتِ بَنِي عَبْسٍ وَأَفْنَاءِ طَيِّءٍ — وَبَاسْتِ بَنِي دُودَانَ حَاشَا بَنِي نَصْرِ

بنو عبس اور بنو دودان کو گالی دینے کے بعد قبائل کو اسلام اور حضرت ابوبکر کے خلاف ابھارتے ہوئے کہتا ہے کہ تم لوگ اب کھڑے ہو جاؤ اور کمینوں کے ہاتھ میں اپنی قیادت کی باگ ڈور نہ دو بلکہ مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگرچہ چنگاریوں پر ہی کیوں نہ کھڑا ہونا پڑے" پھر حضرت ابوبکر کی اطاعت کرنے سے یوں انکار کرتا ہے کہ ہم نے رسول اللہ کی جو سچے تھے اطاعت کی اب ابوبکر کے دین کو کیا کریں۔

فَقُومُوا وَلَا تُعْطُوا اللِّئَامَ مَقَادَةً — وَقُومُوا وَإِنْ كَانَ الْقِيَامُ عَلَى جَمْرِ

أَطَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ إِذْ كَانَ صَادِقًا — فَيَا عَجَبًا مَا بَالُ دِينِ أَبِي بَكْرٍ (1)

کہتے ہیں کہ جب مرتدین شکست کھا کر بھاگنے لگے تو حطیئہ گرفتار ہو گیا اور بقول طبری اس نے کفر سے توبہ کر لی۔ اور اسلام لایا اور سچا اور پکا مسلمان ہو گیا۔ کیوں کہ سنہ ۱۴ھ میں جنگ قادسیہ میں شریک ہوا (۲) اور مسلمانوں کو جوش دلاتا تھا۔ مگر طبری کی یہ بات غالباً صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ مستقل مسلمانوں کی بے عزتی کرتا رہا اور اسلام کا مذاق اڑاتا رہا۔ حتیٰ کہ مرتے وقت اس نے ایسی بے ہودہ اور مضحکہ خیز

---

(۱) دیوان حطیئہ ص ۳۲۹ (۲) تاریخ طبری ۲، ۱۸۰۸، و ۱، ۲۳۹۳

وصیت کی جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا جیسی کوئی معمولی آدمی بھی آخری وقت میں نہیں کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے میراث کے معاملہ میں لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر حصہ دینے کی وصیت کر کے ترکہ کے معاملے میں خدا کے حکم کی صریح خلاف ورزی کی ہے اور جب اس کی توجہ اس طرف دلائی گئی کہ " لیس ھکذا قضی اللہ لھن " یعنی خدا نے تو لڑکیوں کے معاملہ میں ایسا فیصلہ نہیں کیا ہے تو بولا " ولکن قضیتُ ھکذا " یعنی " لیکن میں نے اسی طرح فیصلہ کیا ہے۔"

ڈاکٹر شوقی ضیف نے بھی شاید طبری کی روایت سے متأثر ہو کر فیصلہ کر دیا ہے کہ " راویوں نے حطیئہ کو بخیل اور فطرتاً کمینہ بتانے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اسی طرح انہوں نے اس کے فساد دین کے بارے میں بھی مبالغہ سے کام لیا ہے ممکن ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں سہل پسند رہا ہو لیکن بد دین نہ تھا (۱) اپنی بات کی دلیل میں انہوں نے اس کے وہ اشعار نقل کئے ہیں جن میں اس نے احسان بھلائی عمل صالح کی تعریف کی ہے۔ اور کہیں کہیں خدا کا ذکر اور اس کا شکر بھی ادا کیا ہے اس ضمن میں اس کے وہ مشہور شعر بھی نقل کئے ہیں جس کو عمرو بن اسد نے عربوں کا سب سے سچا شعر کہا ہے یعنی

" من یفعل الخیرَ لا یعدم جوازیہ " الخ

یا اس کا وہ شعر جس میں کہتا ہے " لست اری السعادۃ جمع مال " الخ وغیرہ لیکن یہ سب شعر اس وقت کے ہیں جب حضرت عمرؓ زندہ تھے اور ان کے دُرّے اور جیل کے ڈر سے اس کو کوئی بری بات کہنے کی جسارت نہ ہوئی لیکن ان کے انتقال کے فوراً بعد ردّت کے قصّہ میں اس کا رول اور پھر ان کی پیشین گوئی کے مطابق ان کے ہی بیٹے کے سامنے ہجویہ اشعار پڑھنے کے قصّے نے اس کی منافقت اور فساد دین کا بھانڈا بری طرح پھوڑ دیا تھا۔ درحقیقت حطیئہ ان اعراب میں سے تھا جن کے متعلق خود قرآن نے فیصلہ کر دیا ہے کہ

" الاعراب اشدُّ کفراً ونفاقاً " بدوی گنوار کفر اور نفاق میں بہت سخت ہوتے ہیں اور اس کا مظہر حطیئہ بھی تھا رہ گئیں وہ اسلامی باتیں جو اس کے کلام میں ملتی ہیں تو وہ

---

(۱) تاریخ الادب العربی : العصر الاسلامی ص ۹۹ ۔

محض وقت کے تقاضے اور مصلحت اور ڈر کی وجہ سے تھا دل سے نکلی ہوئی باتیں نہیں ہیں یہی نہیں بلکہ وہ اسلام اور اس کی طرف سے زندگی پر عائد کردہ پابندیوں سے بچنے اور اپنی جاہلی آزاد زندگی گزارنے کی خاطر اپنے پرانے دوست اور آزاد منش شاعر علقمہ بن علاثہ کے پاس بھاگ کر گیا تھا جس کے متعلق راویوں کا خیال ہے کہ وہ بھی مسلمان نہ ہوا تھا اور مسلمانوں کے خلاف زودیوں کی تدکرتا تھا۔ مگر جب حطیئہ علقمہ کے گاؤں کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ مرچکا ہے چنانچہ مایوس اور نامراد وہاں سے واپس آیا اور ایک قصیدہ کہا جس میں علقمہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ میرے اور مالداری کے درمیان صرف چند راتوں کا فاصلہ رہ گیا تھا اگر میں صحیح وسالم حالت میں تجھ سے مل پاتا۔

وما کان بینی لو لقیتک سالما وبین الغنی الا لیال قلائل

ان سب باتوں سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ حطیئہ نہ صرف بد دین رہا بلکہ بد دینی کی حالت میں مرا بھی جیسا کہ اس کے مرتے وقت کی وصیت سے ثابت ہوتا ہے اور آنحضرت کا فیصلہ ہے کہ "الاعمال بالخواتم" اس قول کے سامنے اس کے آخری عمل کی کوئی توجیہہ ممکن نہیں۔

ڈاکٹر طہ حسین نے حطیئہ کی منافقت اور اس کی زندگی میں اس ناہمواری کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے وہ کہتے ہیں "میرا خیال یہ ہے کہ حطیئہ کی مایوسی اور اس کا غم محض اس کی مادی زندگی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ درحقیقت اس مایوسی اور غم و رنج کے دو اسباب تھے۔ ایک سبب تو خود حطیئہ کے دل کی گہرائی تھی جو کبھی اس نئے دین (اسلام) سے مطمئن نہ ہو سکی اور اس لئے شرح صدر کے ساتھ اس کو قبول نہ کر سکی چنانچہ ایک طرف بظاہر ریاکاری اور تکلفاً اس کو انگیز کرتا رہا اور دوسری طرف اس تلوار کے ڈر سے بھی جو اس وقت عربوں کے اور اسلام کے درمیان لٹکی ہوئی تھی اور جن میں سے ایک کو انھیں انتخاب کرنا تھا اس طرح حطیئہ کا دل صرف اپنی مادی زندگی ہی سے نالاں نہ تھا بلکہ اس کی اپنی معنوی زندگی بھی اس کے لئے ایک دردسر بنی ہوئی تھی کیونکہ اس کو اس بات کی سخت کوفت تھی کہ یہ نئی زندگی (اسلامی) اس کی اس جاہلی زندگی کے بے قید جذبات وخیالات کے لئے ایک روک بن کر کھڑی ہو گئی ہے جنھیں وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق ابھرتے پروان چڑھتے اور پھیل و

پھولتے پھلتے دیکھنا چاہتا تھا اور جن کے جلو میں زندگی کی آلام و مصائب تھے دکھ درد کو جھیلنا اور اس کے آرام و آسائش کا لطف اور مزہ لینا چاہتا تھا اس مایوسی اور نامرادی کا دوسرا سبب اس کی جسمانی ساخت اور کمزوری تھی کیونکہ حطیئہ قد میں بہت چھوٹا تھا چنانچہ بقول روات اسی لیے لوگ اسے حطیئہ یعنی زمین سے چپکو شخص کہا کرتے تھے اور اس پر مستزاد یہ تھا کہ اس کی سخت بدصورتی بدنمائی بدقولی اور بے ڈھنگی جسمانی بناوٹ تھی جو کسی طرح نہ آنکھوں کو بھاتی تھی اور نہ دل میں سماتی تھی جن کی وجہ سے وہ بہت بھیانک اور ڈراؤنا دکھائی دیتا تھا۔

حطیئہ کو بلاشبہ لوگوں کے اس انداز نظر اور اس کے متعلق اس انداز فکر کا پورا احساس تھا اور یہ بات اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور مجروح فرسا تھی اور ان سب باتوں کے علاوہ اس کا حسب نسب بھی صحیح نہ تھا۔ لہٰذا عربوں کو اس کے حسب نسب کی اس خامی کا علم تھا اسی لیے وہ لوگ اس کو حقیر سمجھتے تھے اور اس طرح حطیئہ ہر طرف سے ہدف ملامت تھا اور اس لیے ہر اعتبار سے اپنی مدافعت کرنے پر مجبور بھی تھا۔ لہٰذا رد عمل کے نتیجہ میں حطیئہ ایک خطرناک اور بڑی خوفناک چیز بن کر سامنے آیا جس کی شکل سے لوگ نفرت کرتے تھے اور جس کی زبان سے بچنے کی کوشش کرتے تھے اور مال دے کر عزتوں کو اس سے بچاتے تھے چنانچہ حضرت عمرؓ جیسے رعب و دبدبہ والے خلیفہ کو تین ہزار درہم دے کر مسلمانوں کی عزتیں اس سے خرید لینی پڑیں (۱) تفصیل آگے آئے گی۔

حطیئہ اور زبرقان کا قصہ :

عربی ادب کے مختلف ادوار میں عام طور سے مدحیہ قصائد اور کبھی کبھی ہجویہ قصائد کہہ کر روپیہ پیسہ کمانے کی ریت ملتی ہے اس ریت کی ابتداء دور جاہلی میں اعشیٰ اور نابغہ ذبیانی نے ڈالی تھی۔ (۲) حضرت حسان نے بھی دور جاہلی میں غسانی بادشاہوں کی اور اس کے

(۱) حدیث الاربعاء ۲/ ۱۲۷

(۲) تفصیل کے لیے دیکھئے اس کتاب کا حصہ اول حالات اعشیٰ ص ۲۲۷ اور حالات نابغہ ص ۲۸۹۔ اول الذکر کے ممدوح شاہان نجران بنو عبد المدان تھے اور نابغہ کا ممدوح حیرہ کا بادشاہ ابو قابوس نعمان بن

بعد آنحضرت کی تعریف و توصیف میں مدحیہ قصائد لکھے تھے (۱) یہ شعراء ان قصائد کے ذریعہ عزت و شہرت کے علاوہ انعام و اکرام حاصل کر کے نہ صرف اپنی روزی چلاتے تھے. بلکہ ان میں سے بعض بہت مالدار بھی ہو گئے تھے جیسا کہ اعشیٰ کے متعلق مشہور ہے۔ تعریف و توصیف یا کبھی کبھی ہجو کر کے روپیہ پیسہ اور عزت و شہرت کمانے کا طریقہ شاعروں میں عرصہ دراز تک رہا ہے مگر صرف ہجویہ قصائد لکھ کر اور بلیک میل کے طور پر ان کو استعمال کر کے روپیہ پیسہ کمانا اور اس کمائی پر اپنی روزی کے انحصار رکھنے کی ریت عربوں میں نہ تھی۔ شاید پہلی مرتبہ یہ بدعت حطیئہ نے ایجاد کی کیونکہ اپنی فطری اور جسمانی کمزوری کی وجہ سے وہ کام تو کر نہیں سکتا تھا باپ کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے اس کو کسی خاندان سے ترکہ میں حصہ نہ ملا اور اس پر بار تھا بیوی اور بچوں کے خرچ کا۔ مزید برآں جیسا کہ پہلے ذکر ہوا سماجی پابندیوں کی وجہ سے وہ عام طور سے لوگوں سے یوں ہی جلا بھنا رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ہجو گوئی کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ لوگ اس کو اپنی مخالفین کی ہجو کرانے اور اپنی تعریف کرانے کے لئے کرایہ پر لے لیتے تھے اور یہ بھی کھول کر تعریف یا منہ پھوڑ کر ہجو کرتا تھا۔ چنانچہ لوگ اس سے ڈرنے لگے تھے اور اس کا منہ روپیہ پیسہ سے بند کیا کرتے تھے حطیئہ بھی لوگوں کی اس کمزوری اور اپنے اس حربے کی طاقت کو خوب سمجھتا تھا چنانچہ تنگ دستی کے موقعوں پر لوگوں کی کمزوریوں کا ذکر کر کے ان کو بلیک میل بھی کیا کرتا تھا۔ اس قسم کا قصہ الزبرقان بن بدر کے ساتھ پیش آیا جو آنحضرت کے مشہور صحابی اور حضرت عمر کی طرف سے صدقات کے مال کے انچارج تھے۔ زبرقان اپنی قوم کے سردار تھے اور ان کے اور ان کے چچازاد بھائیوں بغیض بن عامر بن قریع کے درمیان جو 'بنی انف الناقة' (اونٹنی کی ناک کی اولاد) کے برے لقب سے مشہور تھے عرصہ سے ناچاقی چلی آرہی تھی اور عربوں کے دستور کے مطابق دونوں خاندان ہر معاملہ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔

کہتے ہیں کہ الزبرقان بن بدر ایک دفعہ قحط سالی کے زمانہ میں اپنی قوم سے وصول کیا ہوا زکاۃ کا مال لے کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آرہے تھے

---

(۱) تفصیل حسان کے حالاتِ زندگی میں۔

کہ قرقری کے مقام پر ان کو حطیئہ اپنی بیوی اور بیٹیوں اور اپنے دونوں بیٹوں اوس اور سودہ کے ساتھ مل گیا۔ زبرقان نے دیکھتے ہی اس کو پہچان لیا لیکن حطیئہ ان کو نہ پہچان سکا چنانچہ زبرقان نے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ تو حطیئہ بولا کہ عراق کا۔ اس قحط سالی نے کمر توڑ دی ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ وہاں کرو گے کیا؟ تو اس نے جواب دیا کہ سوچتا ہوں کہ مجھے عراق میں کوئی ایسا آدمی مل جائے جو میری اور میرے بیوی بچوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لے اور میں اس کی تعریف و توصیف اپنے ذمہ لے لوں۔ تو زبرقان بولے کہ تم نے ایسا آدمی پالیا تو کیا تم ایسے آدمی کے پاس رہنا پسند کرو گے جو تم کو دودھ اور کھجور سے چھکا دے اور بہترین پڑوسی کی طرح رہے؟ اس پر حطیئہ نے کہا کہ آپ کے والد کی قسم زندگی تو یہی ہے بس تو ان سب کی توقع بھی نہیں کرتا تھا۔ زبرقان نے جواب دیا کہ تم کو یہ سب کچھ مل گیا۔ حطیئہ بولا کہ مگر کس کے پاس؟ زبرقان نے کہا میرے پاس۔ اب حطیئہ نے پوچھا مگر آپ ہیں کون؟ میں الزبرقان بن بدر ہوں۔ زبرقان نے جواب دیا۔ حطیئہ نے پوچھا کہ آپ کا گھر کہاں ہے؟ زبرقان نے جواب دیا کہ ان اونٹوں پر سوار ہو جاؤ۔ اور مشرق کا رخ کر کے روانہ ہو جاؤ اور چاند (نکلنے) کے متعلق پوچھتے رہو۔ یہاں تک کہ میرا گھر آجائے۔ یہ کہہ کر ایک پرچہ پر اپنی بیوی کو حطیئہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا خط لکھ کر اسے دے دیا۔ چنانچہ حطیئہ اپنی منزل کی طرف اور زبرقان اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا زبرقان اور ان کے چچازاد بھائیوں بنو انف الناقہ کے درمیان عرصہ سے چشمک اور ایک دوسرے پر فخر کرنے، ہر معاملہ میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی ہوڑ چلی آرہی تھی۔ بنو انف الناقہ شرافت اور نجابت میں زبرقان سے کچھ اونچے ہی تھے مگر زبرقان نے اپنی بھاری بھرکم شخصیت اور رعب داب سے ان کو زیر کر رکھا تھا۔ دوسرے 'انف الناقہ' یعنی 'اونٹنی کی ناک' کے لقب سے جو ان کے بڑکھوں میں سے ایک شخص جعفر بن قریع کا لقب تھا لوگ ان کو چڑھاتے اور غیرت دلایا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے بیچارے دبے بھنچے سے رہتے تھے اس لقب کے پڑنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ جعفر کے باپ نے ایک اونٹنی ذبح کی۔ اور سارا گوشت اپنی بیویوں میں بانٹ دیا۔ جعفر کی ماں کو خبر ہوئی تو اس نے جعفر کو باپ کے پاس اپنا حصہ لینے کے لئے بھیجا

مگر اس وقت تک سارا گوشت ختم ہو چکا تھا صرف اونٹنی کی سری اور گردن رہ گئی تھی جعفر نے باپ سے مال کا حصہ مانگا تو باپ نے گردن اور سری کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اب تو یہی بچا ہے اسی سے کام چلاؤ۔ چنانچہ جعفر نے اونٹنی کی ناک میں اپنا ہاتھ گھسیڑا اور باپ نے جو کچھ دیا تھا اسے گھسیٹتا ہوا لے کر چلا۔ لوگوں نے جو یہ منظر دیکھا تو اس کو "انف الناقہ" اونٹنی کی ناک کے لقب سے پکارنا شروع کر دیا۔ اور اسی دن سے یہ لقب اس کی آل اولاد سے چپک کر رہ گیا جو ان کے لیے ہمیشہ باعث رسوائی بنا رہا۔

چنانچہ بنو انف الناقہ نے جو زبرقان کے گھر کے پاس ہی رہتے تھے دیکھا کہ حطیئہ زبرقان کے یہاں ٹھہرا ہوا ہے اور زبرقان بھی غائب ہیں تو سوچا کہ کسی طرح اس کو اپنے یہاں بلا کر ٹھہرا لیا جائے اور پھر اس سے زبرقان کی ہجو اور اپنی تعریف کرائی جائے چنانچہ ان لوگوں نے اپنے چار سر کردہ جوان یعنی شماس بن لای۔ علقمہ بن ہوذہ بغیض بن شماس اور مخبل شاعر کو حطیئہ کے پاس بھیجا اور اس سے کہلا یا کہ زبرقان کی بیوی تمہاری خاطر مدارات کرنے میں لا پرواہی سے کام لیتی ہے اس لئے تم ہمارے پاس آجاؤ ہم تمہاری ہر طرح دلداری اور بہت خاطر تواضع کریں گے مگر حطیئہ نے جانے سے انکار کر دیا جب انکا یہ حربہ ناکارہ ثابت ہوا تو انھوں نے زبرقان کی بیوی کے کان میں پھونکوا دیا کہ زبرقان حطیئہ کی بیٹی ملکیہ سے جو بہت خوبصورت تھی شادی کرنا چاہتے ہیں اسی لئے اس کو مع خاندان کے اپنے یہاں ٹھہرایا ہے اور تم سے اس کی خدمت اور چاکری کرا رہے ہیں یہ تیر نشانے پر ٹھیک بیٹھا۔ چنانچہ زبرقان کی بیوی بدک گئیں اور لڑکی اور حطیئہ کے پورے خاندان سے جلنے لگیں اور برتاؤ بھی سخت کرنے لگیں۔

زبرقان کے خاندان کو اب چارہ کی تلاش میں دوسری جگہ جانا تھا چنانچہ زبرقان کی بیوی نے حطیئہ سے کہا کہ تم اور تمہارے بال بچے ان اونٹوں پر بیٹھ کر فلاں جگہ پہلے پہنچ جاؤ اور ان اونٹوں کو پھر ہمارے لئے واپس بھیج دو۔ تاکہ ہم بھی تم سے آملیں اس لئے کہ یہ اونٹ ہم سب کے لئے کافی نہ ہوں گے۔ مگر حطیئہ نے کہا کہ نہیں آپ پہلے جائیں کیوں کہ آپ کو اس کا حق ہم سے زیادہ حاصل ہے چنانچہ زبرقان کی بیوی اپنے بچوں وغیرہ کو لے کر چلی گئیں اور اونٹوں کو جلدی

واپس کرنے میں ٹال مٹول کرنے لگیں یہاں تک کہ دو تین دن گزر گئے۔ بنو انف الناقہ کے لیے یہ سنہری موقعہ تھا چنانچہ وہ لوگ حطیئہ کے پیچھے پڑ گئے اور اونچ نیچ سمجھا کر اس کو اپنے یہاں لے گئے اور اس کیلئے ایک شاندار خیمہ لگایا جس کے ہر کھمبے میں ہجر کے مشہور کھجور ایک ایک تھیلے میں بھر کر لٹکا دیں اور دودھ دہی کے دریا بہا دئیے اور اسے اونٹنیاں اور کپڑے لتے دے کر نہال کر دیا۔

زبرقان بن بدر جب واپس آئے تو دنیا بدلی ہوئی ملی انہوں نے بنو انف الناقہ سے حطیئہ کے لئے کہا کہ میرا پڑوسی مجھے واپس کرو ان لوگوں نے حطیئہ کو اختیار دے دیا کہ جس کے پاس رہنا چاہے رہے حطیئہ نے ظاہر ہے بنو انف الناقہ کے یہاں رہنا پسند کیا اور اس کے بعد ان کی تعریف و توصیف میں اشعار کہنے لگا اسی زمانہ میں اس نے وہ مشہور شعر کہا جس کی وجہ سے بنو انف الناقہ کی چڑھ فخر میں بدل گئی اس نے کہا۔

قوم هم الأنف والأذناب غيرهم   من يسوى بانف الناقة الذنبا؟

یہ لوگ (بنو انف الناقہ) تو ناک ہیں اور دوسرے لوگ دم ہیں بھلا دم کو کوئی ناک کے برابر کر سکتا ہے؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

چنانچہ راویوں کا کہنا ہے کہ اس شعر کے بعد انف الناقہ کے لوگ اپنا سر اونچا کر کے اور سینہ تان کر چلا کرتے اور بڑے فخر سے اپنے کو بنو انف الناقہ بتایا کرتے تھے۔

جب حطیئہ پر چربی چڑھ گئی تو اس نے بنو انف الناقہ کو خوش کرنے کے لیے زبرقان کی ہجو شروع کر دی یہاں تک کہ اس نے وہ مشہور ہجو یہ قصیدہ کہا جس کے ایک شعر کی تلخی کو زبرقان برداشت نہ کر سکے اور سن کر تلملا اٹھے اور حضرت عمرؓ سے جا کر شکایت کی کہ حطیئہ نے میری عزت لوٹ لی۔ حضرت عمرؓ بولے کہ وہ کیسے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میرے بارے میں یہ شعر کہہ کر۔

دع المكارم لا ترحل لبغيتها   واقعد فانك انت الطاعم الكاسى

یعنی بڑنے اور اونچے کارنامے کرنے کے خیال کو چھوڑو کہاں ان چکروں میں پڑتے ہو یہ تمہارے بس کی چیزیں نہیں ہیں اور اطمینان سے موج

مگر اس وقت تک سارا گوشت ختم ہو چکا تھا صرف اونٹنی کی سری اور گردن رہ گئی تھی جعفر نے باپ سے مال کا حصہ مانگا تو باپ نے گردن اور سری کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اب تو یہی بچا ہے اسی سے کام چلاؤ۔ چنانچہ جعفر نے اونٹنی کی ناک میں اپنا ہاتھ گھسیڑا اور باپ نے جو کچھ دیا تھا اسے گھسیٹتا ہوا لے کر چلا۔ لوگوں نے جو یہ منظر دیکھا تو اس کو 'انف الناقہ' اونٹنی کی ناک کے لقب سے پکارنا شروع کر دیا اور اسی دن سے یہ لقب اس کی آل اولاد سے چپک کر رہ گیا جو ان کے لئے ہمیشہ باعث رسوائی بنا رہا۔

چنانچہ بنو انف الناقہ نے جو زبرقان کے گھر کے پاس ہی رہتے تھے دیکھا کہ حطیئہ زبرقان کے یہاں ٹھہرا ہوا ہے اور زبرقان بھی غائب ہیں تو سوچا کسی طرح اس کو اپنے یہاں بلا کر ٹھہرا لیا جائے اور پھر اس سے زبرقان کی ہجو اور اپنی تعریف کرائی جائے چنانچہ ان لوگوں نے اپنے چار سرکردہ جوان یعنی شماس بن لاءی۔ علقمہ بن ہوذہ۔ بغیض بن شماس اور مخبّل شاعر کو حطیئہ کے پاس بھیجا اور اس سے کہلا بھیجا کہ زبرقان کی بیوی تمہاری خاطر مدارات کرنے میں لاپرواہی سے کام لیتی ہے اس لئے تم ہمارے پاس آجاؤ ہم تمہاری ہر طرح دلداری اور بہت خاطر تواضع کریں گے مگر حطیئہ نے جانے سے انکار کر دیا جب انکا یہ حربہ ناکارہ ثابت ہوا تو انھوں نے زبرقان کی بیوی کے کان میں پھونکوا دیا کہ زبرقان حطیئہ کی بیٹی ملیکہ سے جو بہت خوبصورت تھی شادی کرنا چاہتے ہیں اسی لئے اس کو مع خاندان کے اپنے یہاں ٹھہرایا ہے اور تم سے اس کی خدمت اور چاکری کرا رہے ہیں یہ تیر نشانے پر ٹھیک بیٹھا۔ چنانچہ زبرقان کی بیوی بدک گئیں اور لڑکی اور حطیئہ کے پورے خاندان سے جلنے لگیں اور برتاؤ بھی سخت کرنے لگیں۔

زبرقان کے خاندان کو اب چارہ کی تلاش میں دوسری جگہ جانا تھا چنانچہ زبرقان کی بیوی نے حطیئہ سے کہا کہ تم اور تمہارے بال بچے ان اونٹوں پر بیٹھ کر فلاں جگہ پہلے پہنچ جاؤ اور ان اونٹوں کو پھر ہمارے لئے واپس بھیج دو۔ تاکہ ہم بھی تم سے آملیں اس لئے کہ یہ اونٹ ہم سب کے لئے کافی نہ ہوں گے۔ مگر حطیئہ نے کہا کہ نہیں آپ پہلے جائیں کیوں کہ آپ کو اس کا حق ہم سے زیادہ حاصل ہے چنانچہ زبرقان کی بیوی اپنے بچوں وغیرہ کو لے کر چلی گئیں اور اونٹوں کو جلدی

واپس کرنے میں ٹال مٹول کرنے لگیں یہاں تک کہ دو تین دن گزر گئے۔ بنوانف الناقہ کے لئے یہ سنہری موقعہ تھا چنانچہ وہ لوگ حطیئہ کے پیچھے پڑ گئے اور اُونچ نیچ سمجھا کر اس کو اپنے یہاں لے گئے اور اس کیلئے ایک شاندار خیمہ لگایا جس کے ہر کھمبے میں ہجر کے مشہور کھجور ایک ایک تھیلے میں بھر کر لٹکا دیں اور دودھ دہی کے دریا بہا دئے اور اسے اونٹنیاں اور کپڑے لتے دے کر نہال کر دیا۔

زبرقان بن بدر جب واپس آئے تو دنیا بدلی ہوئی ملی انہوں نے بنوانف الناقہ سے حطیئہ کے لئے کہا کہ میرا پڑوسی مجھے واپس کر دو ان لوگوں نے حطیئہ کو اختیار دے دیا کہ جس کے پاس رہنا چاہے رہے حطیئہ نے ظاہر ہے بنوانف الناقہ کے یہاں رہنا پسند کیا اور اس کے بعد ان کی تعریف و توصیف میں اشعار کہنے لگا۔ اسی زمانہ میں اس نے وہ مشہور شعر کہا جس کی وجہ سے بنوانف الناقہ کی چڑھ فخر میں بدل گئی اس نے کہا۔

قومٌ هُمُ الأنفُ والأذنابُ غيرُهم ومن يُسَوّي بأنفِ الناقةِ الذنبا

یہ لوگ (بنوانف الناقہ) تو ناک ہیں اور دوسرے لوگ دم ہیں بھلا دم کو کوئی ناک کے برابر کر سکتا ہے؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔

چنانچہ راویوں کا کہنا ہے کہ اس شعر کے بعد انف الناقہ کے لوگ اپنا سر اونچا کر کے اور سینہ تان کر چلا کرتے اور بڑے فخر سے اپنے کو بنوانف الناقہ بتایا کرتے تھے۔

جب حطیئہ پر چربی چڑھ گئی تو اس نے بنوانف الناقہ کو خوش کرنے کے لئے زبرقان کی ہجو شروع کر دی یہاں تک کہ اس نے وہ مشہور ہجو یہ قصیدہ کہا جس کے ایک شعر کی تلخی کو زبرقان برداشت نہ کر سکے اور سن کر تلملا اٹھے اور حضرت عمر سے جا کر شکایت کی کہ حطیئہ نے میری عزت لوٹ لی۔ حضرت عمر بولے کہ وہ کیسے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میرے بارے میں یہ شعر کہہ کر۔

دَعِ المكارمَ لا ترحل لبغيتها واقعد فإنك أنت الطاعم الكاسي

یعنی بڑے اور اونچے کارنامے کرنے کے خیال کو چھوڑو کہاں ان چکروں میں پڑتے ہو یہ تمہارے بس کی چیزیں نہیں ہیں اور اطمینان سے موج

اڑا دو کہ کھاتے پیتے اور پہننے اوڑھنے والے آدمی ہو۔ (۱)

حضرت عمر نے جب یہ شعر سنا تو بولے کہ بھئی مجھے اس میں تو کوئی ہجو کی بات نہیں دکھائی دی اس میں تو صرف ہلکی سی ایک چوٹ ہے اور بس زبرقان بولے بہت خوب تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری مروت (انسانیت وشرافت واعلیٰ اقدار) کا نقطۂ عروج بس کھانا اور پہننا ہی رہ گیا ہے؟(۲) نہیں صاحب آپ براہ کرم ابن الفریعہ کو (یعنی حسان بن ثابتؓ) کو بلا کر پوچھ لیجئے۔

چنانچہ حسانؓ بلائے گئے حضرت عمر نے ان سے پوچھا کہ کیوں بھئی حطیئہ نے مذکورہ شعر میں زبرقان کی ہجو کی ہے؟ حضرت حسان نے جواب دیا ایسی ویسی ہجو! ارے صاحب بہت ہی بے ہودہ قسم کی ہجو کی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر نے حطیئہ کو جیل میں ڈال دیا۔ راویوں کے کہنے کے مطابق اس زمانے کے جیل آج کل کے جیلوں کی طرح اینٹ اور چونے کی بنی عمارتیں نہ ہوتی تھیں جن پر سپاہیوں کا پہرہ لگا رہتا ہو اور قاعدوں اور ضابطوں کے مطابق زندگی گزاری جاتی ہو بلکہ ایک گہرا گڑھا یا اندھا کنواں ہوتا تھا جس میں مجرم کو ڈال کر اوپر سے گھاس پھوس ڈال کر اس کو بند کر دیتے تھے اب اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جیل کیا تھے بلکہ جہنم کی کال کوٹھری تھے۔

ظاہر ہے جیل میں بند کیے جانے کے بعد حطیئہ صاحب کے ساتوں طبق روشن ہو گئے اور لگے حضرت عمر کی خوشامد کرنے مگر حضرت عمر اتنے خفا تھے کہ انھوں نے اسکی ایک نہ سنی چنانچہ حطیئہ نے اپنا وہ مشہور معذرت نامہ لکھا جو عربی ادب میں نابغہ ذبیانی کے معذرت ناموں کے بعد سب سے زیادہ مؤثر معذرت نامہ سمجھا

---

(۱) بعض تذکرہ نگاروں نے الطاعم کے معنیٰ 'المطعوم' اور 'الکاسی' کا ترجمہ 'المکسو' مفعول کھلایا ہوا یا پہنایا ہوا آدمی یعنی مانگ کر کھانے اور پینے والا شخص۔ مگر زبان کا لطف اسی میں ہے کہ اس کو فاعل کے معنی میں لیا جائے کہ اس سے ہجو ملیح کی شان پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے حضرت عمر نے اس کو کھلی ہوئی ہجو نہ سمجھا۔ پھر اس طرح ظاہری الفاظ بھی بدلنے کی ضرورت نہ ہوگی، اور معنی بھی بہت لطیف پیدا ہو جائیں گے

(۲) اس سارے قصے کی تفصیل الاغانی للاصفہانی جلد دوم میں ملاحظہ کیجئے۔ الشعر والشعراء لابن قتیبہ میں بھی واقعات درج ہیں۔

جاتا ہے جس میں کہتا ہے کہ ؎

ماذا تقول لأفراخ بذي مرخ (۱)

حمر الحواصل لا ماء ولا شجر

غيبت كاسبهم في قعر مظلمة

فاغفر عليك سلام الله يا عمر

یعنی آپ ذی مرخ (حطیئہ کا گاؤں) میں پڑے ان چھوٹے چڑیا کے بچوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں (یعنی حطیئہ کی اولاد)۔ جن کے پوٹے ابھی تک لال ہیں (یعنی ابھی بال و پر بھی نہیں نکلے) جو بے یار و مددگار پڑے ہیں جن کو نہ پینے کا پانی میسر ہے اور نہ رہنے کے لیے درخت۔

آپ نے ان کے کمیرے کو اندھے کنوئیں میں ڈال دیا ہے آپ پر خدا کی سلامتی ہو اے عمر اب تو خطا معاف کر دیجئے۔

روایت ہے حضرت عمر قاعدوں اور ضابطوں کے نافذ کرنے کے معاملہ میں بہت سخت ہونے کے باوجود اس کے یہ شعر سن کر پسیج گئے اور ان پر بہت اثر ہوا اور بقول روات عبدالرحمن بن عوف نے بھی حطیئہ کی سفارش کی۔ چنانچہ حضرت عمر نے اس کو جیل سے آزاد کر دیا اور بلا کر کہا کہ خبردار جواب لوگوں کی ہجو کی "تو حطیئہ بولا کہ پھر تو میرے بال بچے بھوکے مر جائیں گے یہی تو میری روزی اور دھندا ہے"۔

چنانچہ روایت ہے کہ حضرت عمر نے اس کو تین ہزار درہم دئیے اور اس طرح اس سے مسلمانوں کی عزت خریدی۔ اور اس سے وعدہ لیا کہ پھر کبھی کسی کی ہجو نہ کہے گا۔ حطیئہ نے یہ عہد حضرت عمر کی زندگی تک تو نباہا لیکن ان کے انتقال کے بعد پھر ہجو کہنی شروع کر دی (۲)

---

(۱) ذو مرخ حجاز میں ایک وادی کا نام ہے۔

(۲) الاغانی للاصفہانی ۲/۵۷۔

حطیئہ کی موت اور اس کی وصیت :

تذکرہ نگاروں میں حطیئہ کی موت کے بارے میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے آخری زمانے میں مرا دوسروں کا کہنا ہے کہ نہیں وہ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ کے عہد خلافت تک جیا۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو حطیئہ کوفہ چلا گیا اور کچھ مدت کے بعد پھر مدینہ واپس آیا اور حضرت علی کے عہد خلافت میں گوشہ نشین ہو گیا۔ چنانچہ اس پورے پر آشوب زمانے میں حطیئہ کا نام نہیں سنائی دیا مگر جب حضرت معاویہ خلیفہ ہوئے تو پھر وہ مدینہ میں دوبارہ نمودار ہوا۔ اور انھیں کے آخری زمانے میں اس کا انتقال ہوا

چنانچہ اغانی نے زید بن اسلم سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر نے جب حطیئہ کو جیل سے رہا کیا تو اس سے کہا کہ "اے حطیئہ مجھے ایسا نظر آرہا ہے کہ تو ایک قریشی نوجوان کے پاس بیٹھا ہے اس نے تیرے لئے ایک غالیچہ بچھا رکھا ہے اور دوسرے کو موڑ کر گاؤ تکیہ بنا دیا ہے اور تم سے کہتا ہے کہ حطیئہ کچھ سناؤ تو تم نے لوگوں کی عزتوں کے بارے میں اس کو سنانا شروع کیا۔ راوی کہتا ہے کہ بہت دن نہیں گزرے تھے کہ میں نے حطیئہ کو عبداللہ بن عمر کے پاس اس حال میں دیکھا کہ انھوں نے اس کے لیے ایک غالیچہ بچھا رکھا ہے اور دوسرے کو موڑ کر گاؤ تکیہ بنا دیا ہے اور پھر اس سے کہا کہ حطیئہ کچھ سناؤ تو اس نے گانا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا کہ حطیئہ حضرت عمر کی وہ بات یاد ہے؟ تو حطیئہ گھبرا سا گیا اور بولا کہ خدا اس آدمی پر رحم کرے اگر وہ زندہ ہوتے تو میں یہ ہرگز نہ کرتا پھر میں نے عبداللہ بن عمر کو مخاطب کر کے کہا کہ میں نے تمہارے باپ کو یہ کہتے سنا تھا تو تم ہی وہ آدمی (قریشی نوجوان) نکلے؟ اس روایت سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر کا انتقال حطیئہ کے مرنے سے پہلے ہو گیا تھا۔ اور یہ کہ حطیئہ ان کے آخری زمانے میں نہیں مرا۔ اب رہا یہ سوال کہ حطیئہ حضرت معاویہ کے زمانے تک جیا تو اس کی دلیل میں ایک دوسری روایت پیش کی جاتی ہے اور جس کی تصدیق حطیئہ کے شعر سے بھی ہوتی ہے۔

ابن قتیبہ اور اصفہانی دونوں نے روایت کی ہے کہ جب سعید بن العاص مدینہ

کے گورنر تھے تو حطیئہ ان کے دربار میں ایک رات آیا جب وہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ جب لوگ کھانا کھا کر جا چکے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک بدصورت بوڑھا پھٹے حال میں اب تک دستر خوان پر بیٹھا ہے پولیس والے اس کو پہچانتے نہ تھے چنانچہ انھوں نے اس کو اٹھانا چاہا۔ سعید بن العاص نے کہا کہ رہنے دو نہ اٹھاؤ۔ چنانچہ گپ شپ شروع ہو گئی عربوں کی باتیں، اوران کی شعروشاعری کا تذکرہ ہونے لگا تو یہ آدمی بولا کہ آپ لوگوں کو اچھے اشعار معلوم ہی نہیں ہیں تو لوگ بولے کہ تو کیا تم کو ان سے اچھے شعر یاد ہیں"۔ آدمی نے جواب دیا "ہاں" تو لوگوں نے کہا کہ اچھا بتاؤ سب سے بڑا شاعر کون ہے تو آدمی بولا کہ وہ جو کہتا ہے ؎

لا أعُدُّ الإقتارَ عُدماً ولكن   فَقْدَ من رزئتُه، الإعدام

یعنی فقر و فاقہ محرومی و نامرادی نہیں ہے بلکہ کسی شخصیت کا کھودینا درحقیقت تنگ دستی و محرومی ہے اوراس سے اس کی مراد ابو داؤد الایادی تھا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کے بعد کون؟ تو بولا کہ "اس کے بعد تو پھر میرا ہی نمبر ہے۔ خدا کی قسم جب میں اپنی ایک ٹانگ دوسری پر رکھ کر قافیوں کی تلاش میں اونٹنی کے پیاسے بچھڑے کی طرح بلبلاتا ہوں تو غضب ڈھا دیتا ہوں)۔ یہ سن کر لوگوں نے کہا کہ "اچھا تم ہو کون؟ تو بولا کہ میں حطیئہ ہوں"۔ اب سعید نے اس کو خوش آمدید کہا اور بولے کہ تم نے ہم سے اپنے کو چھپا کر ہم پر بڑی زیادتی کی ہے، حالاں کہ تم کو معلوم ہے کہ ہمیں تم سے کتنی محبت ہے اور تم سے ملنے کا کتنا اشتیاق رہتا ہے"۔ اس کے بعد حطیئہ کی بڑی آؤ بھگت کی اور بڑا اچھا برتاؤ کیا۔ اور یہ بات تو تاریخ سے ثابت ہے کہ سعید بن العاص حضرت معاویہ کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ حطیئہ نے حضرت معاویہ کا زمانہ پایا تھا۔ اور یہیں سے اس کے مرنے کی تاریخ کے سلسلہ میں جو دوسری باتیں کہی جاتی ہیں وہ غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔

حطیئہ کی وصیّت :

جیسا کہ پہلے مختصراً ذکر ہوا حطیئہ نے مرنے سے پہلے جو وصیت کی تھی وہ اس کی مسخ فطرت گری ہوئی طبیعت اور سماج میں رائج چیزوں، عام مذہبی اور تہذیبی رواجوں کے خلاف ردعمل کا بہترین نمونہ ہے۔ لہ (حاشیہ اگلے صفحہ)

اغانی نے روایت کی ہے کہ جب حطیئہ مرنے کے قریب ہوا تو اس کی قوم کے لوگ اس کے پاس آئے اور بولے "اے ابو ملیکہ وصیت کرو" تو بولا کہ "شعر کی بربادی بری روایت ہے" تو لوگوں نے کہا کہ "خدا تم پر رحم کرے کچھ وصیت کرو" تو اس نے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے ؎

إذا أُنبِضَ الرامونَ عنها ترنَّمتْ

ترنُّم ثَكلى اَوجَعَتها الجنائزُ (۲)

تو لوگوں نے کہا کہ شماخ کا ہے تو بولا کہ (قبیلہ) غطفان سے کہہ دو کہ وہ عربوں میں سب سے بڑا شاعر ہے۔ اس پر لوگوں نے اس کو ڈانٹ کر کہا کہ تیرا ستیہ ناس جائے یہ وصیت ہے؟ ارے ایسی وصیت کرو جس سے تم کو فائدہ پہنچے تو کہا کہ "ضابئ (مشہور شاعر ضابئ بن الحرث البرجمی) کے خاندان کو یہ خبر پہنچا دو کہ وہ اس شعر کی وجہ سے شاعر کہلانے کا مستحق بن گیا ہے۔

لکل جدید لذۃٌ غیر أننی ۔ رأیتُ جدیدَ الموت غیر لذیذ (۳)

اس پر لوگوں نے کہا ارے بھائی کوئی ایسی بات کہو جس سے تم کو نفع حاصل ہو، تو بولا کہ امرؤالقیس کے خاندان سے کہہ دو کہ وہ اپنے اس شعر کی وجہ سے عربوں کا سب سے بڑا شاعر ہے۔

فیالک من لیل کأنّ نجومہ ۔ بکل مغار الفتل شُدَّت بیذبل (۴)

لوگوں نے کہا "ارے کچھ خدا سے ڈرو اور یہ خرافات چھوڑو تو بولا کہ انصاریوں سے کہہ دو کہ ان کا آدمی (حسان بن ثابت) اپنے اس شعر میں عربوں کا سب سے بڑا شاعر ہے

(گزشتہ صفحہ کا حاشیہ)

(۱) الشعر والشعراء لابن قتیبہ اور الأغانی جلد ۱۶۔

(۲) یعنی جب تیر اندازوں نے کمانوں کے تاروں کو سونتا تو ان کی ایسی غم گین آوازیں نکلیں جیسی کہ اس عورت کے منہ سے آہیں نکلتی ہیں جس کا بچہ مر چکا ہو اور جنازوں کو دیکھ کر اس کے زخم ہرے ہو جاتے ہیں۔

(۳) یعنی ہر نئی چیز اچھی لگتی ہے البتہ میں نے موت ایسی ایک نئی چیز دیکھی ہے جو بڑی بدمزہ ہے۔

(۴) ترجمہ: ہجر کی لمبی رات کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے رات کتنی تعجب کی بات ہے کہ (تیرے ستارے ڈوبنے کا نام ہی نہیں لیتے) ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت گنتھی بٹی ہوئی مضبوط رسی سے یذبل پہاڑ سے باندھ دیے گئے ہوں کہ ہل ہی نہ سکیں۔

يَغشَونَ حتّی ما تَهِرُّ کِلابُهم　　لا یَسأَلونَ عنِ السوادِ المُقبِلِ (۱)

اب لوگوں نے کہا ارے خدا کے بندے یہ سب تیرے کچھ کام نہ آئے گا ان باتوں کے علاوہ کچھ کہو تو بولا کہ

الشعرُ صعبٌ وطویلٌ سُلَّمُہ　　إذا ارتقی فیہِ الذی لا یعلمُہ

زلّت بہ إلی الحضیضِ قدمُہ　　یریدُ أن یُعرِبَہ فیُعجِمُہ (۲)

اب لوگوں نے کہا کہ تمہاری حالت ہو بہو یہی تھی تو جواب میں یہ شعر پڑھا۔

قد کنتُ أحیانا شدیدَ المُعتَمَدْ　　وکنتُ ذا غَربٍ علی الخصمِ أَلَدْ

فوردتُ نفسی ما کادتْ تَرِدْ (۳)

اب لوگوں نے دوسرا انداز گفتگو اختیار کیا اور بولے کہ "اے ابو مُلیکہ تم کو کوئی ضرورت ہے؟" تو جواب دیا کہ "نہیں خدا کی قسم، لیکن مجھے اس تعریف پر رونا آتا ہے جس کے ذریعہ کسی غیر اہل کی تعریف کی جائے۔ لوگوں نے کہا کہ اچھا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟" تو اپنے کھلے منہ کی طرف اشارہ کر کے بولا کہ "یہ کھڈا جب اسے کسی اچھی چیز کی لالچ ہو۔" یہ کہہ کر اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں تو لوگوں نے کہا کہ "لا الٰہ الا اللہ" کہو تو بولا کہ ع:

---

(۱) یعنی ممدوح کے یہاں رات دن اتنے لوگ اور اتنے مہمان آتے ہیں کہ ان کے کتے اب سب سے مانوس ہو گئے ہیں اور مطلق نہیں بھونکتے اور ان لوگوں کی یہ حالت ہے کہ ان کی مہمانی میں اور ان سے انعام و اکرام لینے کی خاطر ایک خلقت آیا کرتی ہے لیکن وہ لوگ ان میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتے کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو بلکہ بغیر پوچھے گچھے مہمان نوازی کرتے ہیں انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔

(۲) یعنی شعر کہنا آسان کام نہیں ہے یہ بہت محنت اور ریاض چاہتا ہے اس لئے اگر نوسکھیا اس وادی میں قدم رکھے گا تو اس کے قدم ڈگمگا جائیں گے اور وہ دھڑام سے زمین پر آ رہے گا۔ کہ وہ اپنے خیالات و افکار کو صفائی اور وضاحت سے بیان کرنے کے بجائے اس میں ابہام و تعقید پیدا کر دے گا۔

(۳) اس شعر میں فخر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں جنگ کا قابل بھروسہ اور طاقت ور سپاہی تھا اور اپنی تیز تلوار سے دشمن پر اتنے سخت حملے کرتا تھا کہ بسا اوقات مجھے اپنی جان تک کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا۔

قالَتْ وفيها حَيْدَةٌ وذُعْرٌ عَوْذٌ بربّی منكمُ وحَجْرُ (۱)

لوگ بولے کہ "اچھا اپنے غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" تو کہا کہ "جب تک رات دن ایک دوسرے کے پیچھے آتے جاتے رہیں گے اس وقت تک کے لئے یہ سب مستقل غلام رہیں گے۔"

لوگوں نے کہا کہ "فقیروں کے لئے کچھ وصیت کرتے جاؤ" تو بولا کہ "میں ان کو وصیت کرتا ہوں کہ مانگنے میں چپکے رہا کریں اصرار کرتے رہا کریں یہ ایسی تجارت ہے کہ اس میں کبھی گھاٹا نہیں ہوتا" اب لوگوں نے پوچھا کہ "تم اپنے مال کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" تو بولا کہ "میری اولاد میں سے لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر حصہ ملے گا" لوگوں نے کہا کہ "خدا نے تو ایسا فیصلہ نہیں کیا ہے" تو کہا "لیکن میں نے ایسا ہی فیصلہ کیا ہے" لوگ بولے کہ "یتیموں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" تو جواب دیا کہ "ان کا مال خوب کھاؤ" اب لوگوں نے پوچھا کہ "اچھا کوئی اور بات کہنا چاہتے ہو؟" تو کہا "ہاں مجھے ایک گدھی پر سوار کرا دینا مجھے اس پر اس وقت تک بیٹھے رہنے دینا جب تک کہ مر نہ جاؤں کیوں کہ شریف آدمی اپنے بستر پر نہیں مرتا ہے اور گدھی ایسی سواری ہے جس پر کبھی کوئی شریف آدمی نہیں مرا" چنانچہ لوگوں نے اس کو ایک گدھی پر لاد دیا اور اس کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر لاتے لے جاتے رہے یہاں تک کہ اسی حالت میں یہ کہتا ہوا مر گیا۔

لا احدٌ أَلأمُ من حُطَيْئَة هجا بَنِيهِ وهجا المرّيّة

من لؤمِهِ مات على فَرِيّة

یعنی حطیئہ سے زیادہ کمینہ کوئی نہ ہوگا اس نے اپنے بیٹوں کی ہجو کی اور اپنی بیوی کی ہجو کی اور انجام کار ایک گدھی پر مرا۔

تاریخ وفات ۵۹ھ مطابق ۶۷۸ء ہے۔

---

(۱) ایک لاچار اور ڈری ہوئی عورت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ اللہ کی پناہ میں آئی اور دعا کرنے لگی کہ اس کو ان کی برائیوں سے محفوظ رکھے۔

امتیازی خصوصیات:

یہ تھا اس عجیب وغریب انسان اور اچھوتے ہجوگو شاعر کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ جو بظاہر بڑا مضحکہ خیز اور ہر اعتبار سے بڑا عجیب وغریب اور نرالا سا ہے جس کی مثال فن کاروں اور ادیبوں میں تو ملتی ہی نہیں عام انسانوں میں بھی بڑی حد تک نہیں ملتی مگر اس شاعر کی زندگی میں ذرا گہرائی سے نظر ڈالیے اس کے ماحول سماج اور اس میں رائج شدہ اقدار واخلاق کی روشنی میں اسکی نفسیاتی کیفیت اور اس کے ردعمل کا تجزیہ کیجئے۔ تو کہانی بڑی دردناک سبق آموز اور عبرت ناک بن جاتی ہے اور شاعر پر ترس آنے لگتا ہے پھر اس کی تمام بے ہودگیاں اخلاق سوز حرکتیں اور شرافت سے گری ہوئی باتیں عین تقاضائے بشریت لگنے لگتی ہیں جس میں مجبوری کا پہلو بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

ایک آدمی بغیر اپنی مرضی کے محض کسی کی عیش کوشی کے نتیجہ میں ایک ایسی دنیا اور ماحول میں پیدا کر دیا جاتا ہے جہاں شرافت، عزت، نام اور وقار کے لیے شخصیات اور افراد کے پیش نظر الگ الگ پیمانے مقرر ہیں۔ جن میں سے کسی پیمانے پر یہ شخص اس لئے نہیں پورا اترتا کہ اس پر پورا اترنے کے لیے بھی مخصوص ذرائع اور طریقے مقرر کیے گئے ہیں۔ وہ شریف باپ کا بیٹا کہلانا چاہتا ہے مگر باپ محض اس لئے اس کو ماننے سے انکار کرتا ہے کہ وہ اس کی حبشی لونڈی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے اور وہ خود ایک شریف عرب سردار ہے جس کے لیے لونڈی زادہ کو اپنی نسل میں شامل کرنا معیوب بلت ہے، وہ اس باپ کے ترکہ میں سے حصّہ لینے اور اپنے سوتیلے بھائیوں (باپ کی ایک نکاحی بیوی بھی تھی جس سے شاعر کے کئی بھائی تھے) سے اپنا رشتہ جوڑ کر اس خاندان کا فرد بننا چاہتا ہے تو دتکار دیا جاتا ہے وہ گاؤں گاؤں اور شہروں شہروں عزت، نام اور پیٹ بھرنے کے لیے چند سکوں کی بھیک مانگتا پھرتا ہے لیکن ہر طرف سے نامراد و مایوس بھگا دیا جاتا ہے۔ اس کے بال بچے ہیں جن کا پیٹ پالنا ہے جسمانی اعتبار سے اتنا کمزور کہ کوئی محنت کا کام کر کے روزی نہیں کما سکتا مگر حساس بیدار ساذہن اور کھلی آنکھیں رکھتا ہے چنانچہ جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے

تو ہر چیز کا منکر ہو جاتا ہے حتیٰ کہ انسانیت اور آدمیت کا بھی اس کے نزدیک کسی چیز کی کوئی قیمت ہے نہ وقعت دین ایمان سماج اور اس کے پیدا کردہ اقدار شرافت عزت نام وناموس سب اس کے نزدیک بے معنی الفاظ اور بے جان اور کھوکھلی تعبیریں ہیں اس لئے وہ ان سب کے خلاف نعرہ لگانا چاہتا ہے ان کو بدل دینا چاہتا ہے۔ اور ان بندھنوں کے ایجاد کرنے والوں سے انتقام لینا چاہتا ہے توپ وتفنگ چلا نہیں سکتا۔ اس کے پاس صرف قلم اور زبان کا ہتھیار ہے جو ہجو اور انتقامی ہنسی کی تلوار کے قالب میں ڈھل کر معاشرہ رسم ورواج اقدار واخلاق پر ایسی کاری ضرب لگاتا ہے جس کے زخم سے ہمیشہ خون اور پیپ رستی رہتی ہے۔ چنانچہ وہ سب کی ہنسی اڑاتا ہے سب کی ہجو کرتا ہے اپنی اولاد کی اپنی ماں کی اپنے باپ کی ملنے جلنے والوں کی مہمانوں کی اور حد تو یہ ہے کہ خود اپنی۔ یہ اس لئے کہ انھیں بندھنوں اور انھیں لوگوں نے اس کی زندگی کو داغدار کیا تھا تو پھر وہ کیوں نہ ان داغوں کو انھیں میں بانٹ دے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کو نہ کچھ خود دیا اور نہ مانگنے پر لینے دیا اس لئے وہ کیوں نہ خود اپنی ایک الگ ریت قائم کرے اپنا ایک الگ سماج بنائے جس میں اس کی اپنی اخلاقی قدریں اور زندگی کے اپنے اصول ہوں۔ چنانچہ اس نے یہی کیا بقول ساحر لدھیانوی ؎

دنیا نے واقعات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

چنانچہ ہر چیز میں اپنے لئے ایک الگ ریت قائم کی جو سماج اور ماحول میں رائج شدہ ریتوں رواجوں سے بالکل الگ تھلگ تھی اور نرالی حتیٰ کہ مرنے کا ڈھنگ بھی دنیا سے نرالا اور انتہائی مضحکہ خیز نکالا کہ کوئی شریف آدمی آج تک اس طرح نہ مرسکا اور نہ شاید آئندہ کوئی اس طرح مرے گا اور یہ سب کچھ کیا اس نے اپنے ان تیکھے چبھتے ہجو یہ اشعار کے ذریعہ جن کی صدائے بازگشت آج تک انسانی ذہن اور عربی معاشرہ کو جھنجھوڑ رہی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ اب یہ بندھن ٹوٹ رہے ہیں اور ان بنیادوں پر کسی کو شریف اور کسی کو رذیل سمجھنے کا دستور ختم ہو چکا ہے۔

حطیئہ سے پہلے عنترہ بن شداد العبسی معلقہ کا مشہور شاعر تقریبا انھیں

حالات سے گزر چکا تھا۔ حطیئہ کے باپ کی طرح عنترہ کا باپ بھی عبسی تھا مگر حطیئہ کے حالات اور عنترہ کے حالات میں بڑا فرق تھا۔ یہ صحیح ہے کہ عنترہ بھی لونڈی زادہ تھا مگر حطیئہ کے باپ کی طرح عنترہ کے باپ نے اس کو اپنا بیٹا ماننے سے کبھی انکار نہیں کیا بلکہ اسے اپنی نسل میں شامل کیا چنانچہ عنترہ کے نام کے ساتھ اس کے باپ کا نام شداد العبسی بھی لگتا تھا فرق صرف یہ تھا کہ باپ نے اس کو غلام ہی بنائے رکھا تھا۔ مگر عنترہ نے کبھی وہ غلامانہ ذہنیت پیدا ہونے نہ دی جو عام طور سے ایسے حالات میں پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس نے اپنی عزت نفس، خودداری و خودنگری کو قائم رکھا اور دوسرے غلاموں کے برخلاف شہسواری اور فنون جنگ میں بڑی مہارت پیدا کی یہاں تک کہ قبیلہ میں شہسوار، اولوالعزم اور باہمت نوجوان کی طرح اس کی شہرت ہو گئی۔ اور پھر قبیلہ طے نے جب عنترہ کے باپ کے قبیلہ عبس پر حملہ کیا اور عبسیوں کے پاؤں اکھڑنے لگے تو باپ نے عنترہ کو غلامی سے آزاد کر کے حملہ کرنے کا حکم دیا اور اس نے بے جگری سے حملہ کر کے سب کو مار بھگایا (۱) اس کے بعد عنترہ عربی قصے کہانیوں کا ہیرو اور شعرو شاعری میں صف اول کے شعراء میں شامل ہو کر امر ہو گیا مگر حطیئہ عنترہ کے مقابلے میں جسمانی اعتبار سے کمزور، خاندانی اعتبار سے بے نام و نشان، اور سماجی اعتبار سے بہت کمتر تھا۔ اسی لئے حطیئہ کی زندگی میں ایسا ردعمل ہوا کہ اس نے سماج معاشرہ اور رسم و رواج سب کا انکار کر کے اپنی ایک الگ نت نئی دنیا بنائی جس کی بنیاد منفی پہلو پر تھی جس کا بہترین مظہر شعر میں ہجو ہے چنانچہ وہ کبھی ایک چیز کی تعریف کرتا تو دوسرے موقعہ پر اسی کی برائی کرتا جیسا کہ اس نے اپنے سوتیلے بھائیوں کے ساتھ کیا کہ پہلے ان کی مدح لکھی اس کے بعد ان کی سخت ہجو بھی کر دی۔ پھر حطیئہ نے ہجو کو ہی اپنا پسندیدہ موضوع بنا لیا اگرچہ اس نے مدح میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور ایسے ایسے عمدہ مدحیہ قصائد لکھے ہیں کہ بعض افراد اور قبائل کی گمنامی اور بدنامی کے داغوں تک کو ان کے ذریعہ دھو دیا ہے جس کی مثال بنو انف الناقہ کی شان میں کہا ہوا اس کا قصیدہ ہے مگر ہجو میں اس نے جس مہارت فن، خوبصورت اسلوب بیان، اور بانکپن کا اظہار کیا ہے اس نے اس کے ہجو یہ کلام کو ادب و فن کا شاہکار بنا دیا ہے۔ اسی لئے آج

(۱) عنترہ کے حالات اور خصوصیات کے لئے پڑھیئے اس کتاب ہ صفحہ اول ۲۱۲ اور ۱۱

تک اس کے یہ قصیدے عربی ادب میں ہجو کے بہترین نمونوں کے طور پر پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔

حطیئہ معلقہ کے مشہور صوفی منش شاعر زُہَیر بن ابی سُلمیٰ کا شاگرد اور اس کا راویہ تھا اور اس سے مشق سخن کرتا تھا چنانچہ حطیئہ بھی زہیر کی طرح اپنے کلام کو مدتوں نوک پلک سے درست کرنے کے بعد ہی لوگوں کو سناتا تھا۔ اصمعی نے روایت کی ہے کہ حطیئہ کہا کرتا تھا کہ "خیر الشعر الحولی المنقح المحکک" یعنی بہترین شعر وہ ہے جو سال بھر تک نوک پلک سے درست اور کسوٹی پر پرکھا جاتا رہا ہو (۱)۔ جاحظ نے اس کی تائید میں کہا ہے کہ بہترین قصائد وہی ہیں جن کو زُہَیر اور حطیئہ کی طرح خوب اچھی طرح سے ہر عیب سے اور خامی سے مدتوں تک پاک وصاف کیا جاتا رہا ہو (۲)۔

چنانچہ حطیئہ کا شمار مخضرمین شعراء کے صف اوّل میں ہوتا ہے کیوں کہ وہ بھی اپنے استاذ زہیر بن ابی سُلمیٰ کی طرح اپنے اشعار میں مدتوں مستقل کاٹ چھانٹ اور اصلاح وترمیم اور تدقیق کرتا رہتا تھا اسی لئے اس کے اشعار میں خواہ وہ ہجو کے ہوں یا مدح کے، یا کسی اور صنف کے کہیں جھول یا لفظی ومعنوی تعقید یا لغوی یا تعبیری غلطی، یا اسلوب بیان میں خامی نہیں ملتی۔ بلکہ ہر اعتبار سے اس کا کلام معیاری واضح صاف وستھرا اور ردیف وقوافی کے عیوب ونقائص سے پوری طرح پاک وصاف ہے (۳) اس نے عام طور سے تمام اصناف سخن مثلاً ہجو، مدح، فخر، غزل، وصف وسراپا میں داد سخن دی ہے (۴) مگر اس کا محبوب موضوع ہجو ہے، جیسا کہ بیان ہوا۔ اس کی انھیں فنی خوبیوں کی وجہ سے زہیر کے بیٹے مشہور شاعر کعب بن زہیر نے حطیئہ کے اور زہیر کے مکتب فکر کے بارے میں کہا تھا۔

---

(۱) الشعر والشعراء لابن قتیبہ ۱۰/۳۳۔

(۲) البیان والتبیین ۲/۱۳۔

(۳) الوسیط: احمد الاسکندری والشیخ مصطفیٰ عنانی ص۱۶۲ وتاریخ الادب العربی: ڈاکٹر شوقی ضیف العصر الاسلامی ص۹۸ اور تاریخ الادب العربی حنا الفاخوری ص۱۹۸۔

(۴) تاریخ الادب العربی عمر فروخ ص۳۳۳

مَن للقوافی شانھا من یحوکھا   اذا ما ثوی کعبٌ و فوّزَ جَرْوَلٌ
فتشقُّھا حتی تلین متونُھا   فیقصر عنھا کل من یتمثّلُ (۱)

خود حطیئہ نے شعر و شاعری کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ اس کے اور زہیر کے مکتب فکر کی بہترین مثال ہے۔

الشعر صعبٌ وطویل سُلّمُہ   إذا ارتقی فیہ الذی لایعلمُہ
زلّت بہ إلی الحضیض قدمُہ   والشعر لایستطیعہ من یظلمُہ
یرید ان یُعربہ فیُعجمُہ

نمونۂ کلام :

ھجو :- اصناف شعر میں حطیئہ کا خاص فن صنف ہجو گوئی ہے اس کی ہجو کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ ہجو ہے جو اس نے مالی منفعت حاصل کرنے اور دل کا بخار اتارنے کے لیۓ کہی ہے جیسے زبرقان بن البدر کی ہجو جس میں ان کی ہجو کرکے بنو انف الناقہ سے فائدے اٹھائے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ان کی بیوی کے برے سلوک پر غم و غصہ کی آگ ٹھنڈی کی ہے۔ یا وہ ہجو ہے جس کے ذریعہ وہ لوگوں کو بلیک میل کرتا تھا۔ جیسے خود اپنے سوتیلے بھائیوں کی ترکہ دینے سے انکار کرنے پر کہی گئی ہجو۔

دوسری قسم ان ہجو یہ قصائد کی ہے جو اس نے سماج اور معاشرہ کے اقدار اور ریت کے خلاف انتقام کے جذبہ اور ان کی ضد میں کہے ہیں۔ جیسے اس کے خود اپنے بارے میں، اپنی ماں باپ اور مہمانوں وغیرہ کے بارے میں ہجو یہ قصائد کہ ان میں وہ اس سماج اس کے اقدار اور اس کے افراد اور ان کی عادات و رسم و رواج اور ان کے کھوکھلے پن پر زہر خند کرتا ہے۔ وہ خود بھی اس سماج کا فرد ہے اس لیۓ اپنا بھی مذاق اڑاتا ہے اور اس طرح ایک ایسی بات کرتا ہے جو عجیب و غریب بھی ہے اور بالکل نئی، اچھوتی اور اس کے ساتھ بڑی سبق آموز بھی۔

---

(۱) یعنی شعر و شاعری کو۔

ہجو میں عام طور سے وہ مخالف کا بہت تیکھے انداز سے مذاق اڑاتا ہے اس پر پھبتی کستا ہے۔ اس کے بخل، بزدلی، سوسائٹی میں اس کی بے وقعتی، اس کی کم ہمتی، بلندیوں اور سرفرازیوں کے حاصل کرنے کی عدم صلاحیت کا ذکر کرتا ہے۔ اور اس پر حقارت اور نفرت کا اظہار کبھی کبھی ہجو میں فحش باتیں اور مبتذل الفاظ بھی استعمال کر جاتا ہے۔ جیسے فتنۂ ردّت کے موقعہ پر ان قبائل کی ہجو میں کیا ہے جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

حطیئہ کی ہجویات کی پہلی قسم میں اس کا وہ قصیدہ سب سے پہلے آتا ہے جو اس نے زبرقان بن البدر کی ہجو کرتے ہوئے کہا ہے۔ اس میں ۱۰ شعر ہیں مطلع ہے۔

واللہ ما معشرٌ لاموا امرأ جُنُبا　　فی آل لای و شماس بأکیاس

یعنی جن لوگوں نے مجھ جیسے بیراگی کو لای اور شماس کی اولاد کی مدح کرنے پر لعنت ملامت کی ہے وہ معقول اور سمجھدار آدمی نہیں ہیں اس کے بعد کہتا ہے۔

لمّا بدا لی منکم غیبُ أنفسکم　　ولم یکن لجراحی منکم آسی

جمعتُ یاساً مُریحا من نوالکمُ　　ولن تری طارداً للحر کالیأس

جب میں نے تمہارا البغض اور تمہاری بدنفسی دیکھی اور سمجھ لیا میرے زخموں کا تمہارے پاس علاج نہیں ہے تو میں نے تمہارے انعام واکرام میں سے آرام دہ مایوسی کو لے لیا اور شریف آدمی کو بھگانے کے لئے مایوسی سے بڑھ کر کوئی خطرناک چیز نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ

ماکان ذَنْبُ بغیض لا أبا لکمُ　　فی بائس جاء یحدو آخر الناسِ

جاراً لقوم أطالوا هُوْنَ منزلهٖ　　وغادروه مقیما بین ارماسِ

مَلّوا قِراه وهَرّتْه کلابُهُمُ　　وجرّحوه بأنیاب وأضراسِ

بغیض نے جب دیکھا کہ میں مصیبت میں پھنسا ہوں اور کس ذلت کا شکار ہوں تو پناہ دے کر کوئی گناہ تو نہیں کر دیا؟ میں ایک قوم کا پڑوسی تھا۔ ان کے درمیان ٹھہرا تھا لیکن انھوں نے انتہائی ذلت و رسوائی کا سلوک میرے ساتھ کیا اور مجھے قبروں کے درمیان بے کس و لاچار مردہ کی طرح چھوڑ دیا۔ وہ میری مہمانی کرنے سے اکتا گئے اور ان کے کتے بھگانے کیلئے

مجھ پر ہجو کیجئے ۔ اور اپنے دانتوں اور ڈاڑھوں سے مجھے بھنبھوڑ کھایا۔ ان تینوں شعروں میں زبرقان کی بیوی کے سلوک کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے دوسری چراگاہ میں جا کر تین دن تک اس کی خبر نہ لی۔ اس کے بعد زبرقان کی سخت ہجو کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

دعِ المکارمَ لا ترحلْ لِبُغیتِھا　　واقعُدْ فإنک أنتَ الطاعمُ الکاسِی

یعنی نیکی اور بلندی کے کاموں کو چھوڑ دو یہ تمہارے بس کا روگ نہیں تم کھاتے پیتے آدمی ہو عیش کرو موج اڑاؤ یا تم خود ہی بھیک مانگ کر پیٹ بھرتے اور تن ڈھکتے ہو (۱) تم دوسروں کی مدد کیا خاک کرو گے کتنی سخت چوٹ اور برچھی کی انی جیسی ہجو ہے! اس پر زبرقان تلملا کر حضرت عمر کے پاس فریاد لے کر پہنچے تھے اسی ہجو یہ قصیدہ میں حطیئہ کا وہ مشہور شعر ہے جس کے بارے میں مشہور ناقد ابو عمرو بن العلاء نے کہا تھا کہ عربوں نے آج تک اس سے زیادہ سچا شعر کوئی دوسرا نہیں کہا ہے وہ شعر ہے۔

من یفعلِ الخیرَ لا یُعدمْ جوازِیَہٗ　　لا یذھبُ العرفُ بین اللہِ والناسِ

یعنی جو نیکی کرتا ہے اس کے بدلے سے محروم نہیں رہتا نیکی اللہ اور لوگوں کے درمیان کبھی ضائع نہیں ہوتی۔

انھیں زبرقان بن البدر کی ایک موقعہ پر ہجو کی ہے جو سابقہ ہجو سے کچھ نرم ہے۔ قصہ یہ تھا کہ ایک شخص عبداللہ بن ربیعہ نے ان کے تالاب بنیان' نامی پر قیام کرنا چاہا تو انھوں نے منع کر دیا وہ بنی انف الناقہ کے تالاب جس کا نام شیع' تھا گیا ان لوگوں نے اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور بڑی عزت سے اتارا اور اس کے اعزاز میں ایک بکری ذبح کر کے دعوت کی اور کہا کہ ہمارے اونٹ اس وقت بہت دور ہیں ورنہ ہم آپ کے اعزاز میں ایک اونٹ ذبح کرتے چنانچہ جب یہ آدمی یہاں سے واپس گیا تو اس نے بنو انف الناقہ کی شان میں مدحیہ قصیدہ اور زبرقان کی شان میں ہجو یہ قصیدہ کہا۔

---

(۱) اس قصیدہ کی ایلیا حاوی نے اپنی کتاب "الحطیئہ فی سیرتہ ونفسیتہ وشعرہ" میں ص۵۵ پر بہت ہی اچھا تجزیہ و تحلیل کی ہے۔

زبرقان نے حضرت عمرؓ سے جاکر شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن ربیعہ سے باز پرس کیا تو اس نے سارا قصہ بیان کیا اس پر حضرت عمرؓ نے زبرقان کو ڈانٹا کہ تم مسافروں کو پانی سے روکتے ہو چنانچہ اس قصے پر حطیئہ نے زبرقان کی ہجو کی جس کا مطلع ہے۔

أُنخنا ببيت الزبرقان وليتنا　　مَضَينا فقِلنا وَسْطَ بيتِ المُغَبّل

یعنی ہم نے ناحق زبرقان کے گھر پر اپنی اونٹنی بٹھائی کاش ہم چلے گئے ہوتے اور مجبل کے گھر کے درمیان قیلولہ کرتے (۱)

اس طرح معین بن لقمان العبسی کی بھی حطیئہ نے بہت سخت ہجو کی ہے اس قصیدہ کا مطلع ہے

أتانی وأهلی بذات الدماخ　　فما من مآب وما من قَرَب

اس میں اس کی ہجو کے ساتھ اس کی ماں کی بھی بہت ہی سخت اور گندی ہجو کی ہے جو عام اخلاقی ضابطوں کے بالکل خلاف اور شرافت سے گری ہوئی بات ہے۔ (۲)

بنو عبس کے خاندان بنو بجاد کی بھی اس نے سخت ہجو کی ہے جس کا مطلع ہے۔

فاما بجاد رهط جحش فانهم　　على البنا ثبات لا كرام ولا صُبُر

اس میں کل ملا کر ۱۳ شعر ہیں جو ہجو کے اچھے نمونے ہیں۔

اس کے دیوان میں بعض قصیدے ایسے بھی ہیں جو آج کل کی زبان میں کیری کیچر ٹائپ کے ہیں جس میں ہجو کے ساتھ کسی کا بہت حسین انداز سے مذاق اڑایا جاتا ہے اور خاکہ کھینچا جاتا ہے۔

---

(۱) پورا قصیدہ دیوان میں یا ایلیا حاوی کی کتاب میں دیکھیے۔

(۲) حنا الفاخوری نے لکھا ہے کہ وہ ہجو میں فحش اور اخلاق سے گری ہوئی باتیں نہیں کہتا تھا۔ یہ اشعار اور زمانہ ردت میں قبائل کی ہجو کے اشعار ان کے قول کی تردید کی بہترین مثال ہیں دیکھیے۔ تاریخ الادب العربی؛ حنا الفاخوری ص ۱۹۷۔

جیسے اس کا کہا ہوا ایک بخیل آدمی کا خاکہ اور مذاق ہے حالاں کہ یہ خود بھی
بہت بڑا بخیل تھا اس خاکہ میں کہتا ہے کہ میں نے پوری کوشش صرف کر دی کہ
اس سے ایک پیسہ مل جائے لیکن بھلا پتھر میں سے کہیں تیل نکلتا ہے۔

کدحتُ بأظفاری واعملتہ معولی   فصادفت جلموداً من الصخر أملسا

ایک طرف تو بخل اور بخیل کی اتنی ہجو اور مذاق۔ دوسری طرف خود بھی اس نے
یہی حرکت کی بلکہ اس سے بھی بد تر' وہ یوں کہ بنو اسد کا ایک شخص منخز بن اعیا بد قسمتی سے
اس کے یہاں آ گیا پہلے تو حطیئہ نے اس کو ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب دیکھا کہ یہ
ٹلنے والا نہیں ہے تو مجبوراً بادل ناخواستہ اس کی مہمان داری کی مگر جب وہ چلا گیا تو
اس کی ایسی سخت ہجو کی کہ اللہ کی پناہ اس کا مطلع ہے۔

لما رأیتُ أنّ ما یبتغی القِـری   و أنّ إبن اعیا لامحالۃ فاجعی

فشددتُ حیازیم ابن اعیا بشربتہٖ   علی فاقۃ شددتُ اصول الجوانح

یعنی جب میں نے یہ دیکھا کہ ابن اعیا اب تو مان نہ مان میں تیرا مہمان بن کر
ہی رہے گا اور اگر میں نے اب انکار کر دیا تو یہ مجھے بڑا رسوا و ذلیل کرے گا تو میں نے
اس کو خوب پانی پلایا تاکہ اس کا پیٹ کھانے سے پہلے ہی بھر جائے اس کے بعد
سات شعر کہے ہیں جو بہت مضحکہ خیز اور دلچسپ ہیں۔

یہ تو تھے وہ چند ہجو یہ قصیدے جنہیں اس نے اپنے دل کا بخار اتارنے اور مالی
فائدے اٹھانے کے لیے کہے تھے اب چند نمونے ان قصائد کے پیش کیے جاتے ہیں جو
اس نے محض جل کر اور سماج میں رائج ریت اور رسم و رواج کے خلاف ضد اور
انتقام میں کہے ہیں۔ جیسے خود اپنی ہجو یا اپنے ماں باپ یا سوتیلے بھائیوں کی ہجو۔

چنانچہ اس کی اپنی ہجو کے سلسلہ میں وہ مشہور قصہ نقل کیا جاتا ہے جس کا ذکر
پہلے ہوا جس میں ایک دن صبح صبح ہجو گوئی کے لیے منہ کھجلایا تو ایک کنوئیں میں اپنی
شکل دیکھ کر اپنی ہی ہجو کہہ ڈالی اور اس طرح اپنے سے بھی انتقام لیا۔ جس سے اندازہ
ہوتا ہے کہ اس کو خود اپنی ذات سے حالات کی وجہ سے کتنی نفرت تھی۔

ارى لى وجها شوّہ اللہ خلقہٗ　　　فقبّح من وجہ وقبّح حاملہٗ

یعنی مجھے اپنا وہ چہرہ دکھائی دے رہا ہے جس کو خدا نے بناتے وقت بہت ہی بھیانک کر دیا تھا تو ایسے چہرے اور ایسے چہرے والے کا برا ہو۔ اس کے بعد دوسرے اور تیسرے شعر میں اپنی ہجو کے ساتھ اپنی ماں کی بھی ہجو کر ڈالتا ہے۔

تقول لی الضرّاءُ لست لواحدٍ　　　ولا لاثنین فانظر لشر اولٰکا

وانت امرؤٌ تبغی اباً قد ضللتہٗ　　　ھبلت الما تستفق من ضلالکا

یعنی ضراء (اس کی ماں کا نام) مجھ سے کہتی ہے کہ تم صرف ایک یا دو آدمی کا نطفہ نہیں ہو اسی لئے وہ تمہارے باپ کو نہیں جانتی ہے اب اگر تم اب بھی اس کا پتہ لگانے میں لگے ہو تو یہ تمہاری گمراہی اور بے وقوفی ہے۔

یہ تو تھے وہ اشعار جن میں ماں کے ساتھ اپنے اوپر بھی حطیئہ نے کیچڑ اچھالی ہے اب صرف اس کی ماں کی ہجو ملاحظہ کیجئے جس میں اس کا مقابلہ تمام عورتوں سے کر کے اس کو سب سے ذلیل اور اس کے شوہر کو مردوں میں سب سے گرا ہوا ثابت کیا ہے اور اس میں عبسیوں کے خاندان بنو جحش کی بھی ہجو کی ہے اور کہا ہے کہ یہ لوگ اتنے ذلیل ہیں کہ اپنی عورتوں کو حملہ آوروں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں اور عرب معاشرہ میں یہ بہت بڑی برائی بلکہ گالی سمجھی جاتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ جب مصیبت پڑتی ہے یہ لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور بد معاشی اور بے ہودگی کرتے ہیں اور جنگ اور لڑائی سے بھاگتے نہیں کہ کہیں ان کی بزدلی کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے اس قصیدہ میں ۹ نو شعر ہیں۔ کہتا ہے۔

ولقد رأیتک فی النساء فسؤتنی　　　وابا بنیک فساءنی فی المجلس

انّ الذلیل لمن تزور رکاب　　　رھط ابن جحش فی مضیق المجلس

رھط ابن جحش فی الخطوب اذلۃ　　　دسم الثیاب قتالتم لم تفرس

اسی طرح ایک دوسرے قصیدے میں بھی اپنی ماں کی سخت ہجو کرتا ہے ایسا لگتا ہے کہ اس کی بدچلنی اور آوارگی سے اس کے دل میں اس کی طرف سے ایسی سخت

نفرت، حقارت اور ذلت پیدا ہو گئی تھی۔ جو کسی طرح اس کے دل میں سے نہیں نکلتی کیونکہ اس کی ان ہی بے ہودگیوں کے نتیجہ میں وہ اس طرح بے نام ونشان دنیا میں آیا اور حقیر و ذلیل ہو کر زندگی گذار رہا اس لیے اس کو بد دعا دیتا ہے کہ خدا کرے تجھے تیری اولاد نہ ملنے اور تو اتنی ذلیل اور گری ہوئی ہے کہ پاس بٹھانے کے لائق نہیں اس لیے مجھ سے دور ہی رہ، میرے قریب نہ آنا خدا تجھ جیسی عورت سے دنیا کو پاک رکھے کیوں کہ تیری زندگی جہاں تک مجھے معلوم ہے محض برائی ہے اسی لیے صالح لوگ تیری موت سے بہت خوش ہوں گے۔

جزاکِ اللہ شراً مِنْ عجوز　　ولقاک العقوقَ من البنینا

تنحیَّ فاجلسی عنّی بعیدا　　اراح اللہُ منکِ العالمینا

حیاتکِ ماعلمتُ حیاۃ سُوءٍ　　وموتکِ قد یَسُرُّ الصالحینا[1]

سوتیلے باپ کی ہجو:

حطیئہ اپنے باپ اوس کے اس کو بیٹا تسلیم کرنے سے انکار، بھائیوں کے اس کے ساتھ برے سلوک اور اپنی ماں کی بدچلنی اور بے ہودگی کی وجہ سے ان سب کی طرف سے غم وغصہ اور نفرت و حقارت کے جذبات سے ہر وقت بھرا اور اس آگ میں جلتا بھنتا رہتا تھا۔ اتنے میں اس کا باپ مرگیا۔ ماں نے یہ ستم ڈھایا کہ اپنی ایک دوسری شادی رچالی۔ اور شوہر بھی ڈھونڈ کر بے نام ونشان کم اصل بد قوارہ بدھا کھوسٹ لائی۔ یہ دیکھ کر حطیئہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ سوچتا تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد ماں شادی کرے تو کسی شریف نامور اور خاندانی آدمی سے کرے تو اس طرح اس کے ساتھ لگی ہوئی کم اصلی اور بے نسل کا داغ کسی حد تک دھل جائے گا۔ اب جو اس نے ایک ایسے آدمی سے شادی کرلی جو اس کی توقع کے خلاف تھا تو اس سے نہ رہا گیا اور اس نے اس کی بھی سخت ہجو کہہ ڈالی۔ جس میں کہتا ہے کہ خدا تجھ پر باپ کی صورت میں چچا اور

---

[1] دیوان ۲۰۳۔

خالو کی صورت میں لعنت بھیجے کہ تو برائیوں اور بد معاشیوں کے وقت بہترین بڈھا ہے۔ لیکن جب بلندیوں اور فخریہ کارناموں کا موقعہ ہو تو تو مجھ سے بدتر بڈھا ملنا مشکل ہے۔ خدا تجھے غارت کرے تو نے کمینگی کے ساتھ گمراہی اور بے وقوفی بھی جمع کر رکھی ہے:

لحاک اللہ ثم لحاک حقاً — أباً ولحاک من عم وخال

جمعت اللؤم لا حیاک ربی — وأبواب السفاهة والضلال

سوتیلے بھائیوں کی ہجو:

یہ اوس کے لڑکے تھے جنہوں نے حطیئہ کو اس کے ترکہ میں سے حصہ دینے سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے حطیئہ انتہائی تنگ دستی اور فقر و فاقہ کی زندگی گزارتا تھا اور یہ لوگ عیش و عشرت کے شادیانے بجاتے تھے۔ حطیئہ کے دل میں اس سے آگ لگ گئی تھی اور ان کی طرف سے غم و غصہ کے علاوہ نفرت و حقارت کے جذبات بھی ابل پڑے چنانچہ ان کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اگر تم لوگ میرے باپ کے ترکہ میں سے مجھے میرا حصہ نہیں دے رہے ہو بلکہ زیادتی اور ظلم کر کے اپنے مال کے ساتھ رکھ لے رہے ہو اور مجھے اپنے خاندان میں شامل نہیں کر رہے ہو تاکہ میں اپنی عزت و آبرو کو بچا سکوں۔ تو اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ کیوں کہ تمہارا باپ بہت ذلیل بہت حقیر تھا جس کے جسم سے بدترین بو نکلتی تھی اسی لئے تم لوگ مجھ سے کچھ بڑے یا معزز نہیں ہو۔ کیوں کہ تمہاری پیدائش جانوروں کے بچوں کی طرح ہوئی ہے جنھیں ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچ کر باہر لاتے ہیں۔

لا تجمعا مالی وعرضی باطلاً — کلا لعمر ابیکما الحبتاق

وکلا کما جرت جعاب برحله — لشبین بین مشیمة وملاق[1]

عرض کہ حطیئہ جو ماں باپ بھائیوں اور عزیزوں کی دی ہوئی ذلت و خواری کی

---

(۱) دیوان ص۵۸

آگ میں جلتا رہا اور اس بے کسی و لاچاری پر اپنے دل ہی دل میں روتا، اور مانند شمع گھلتا اور پگھلتا رہا۔ اور اس طرح ان لوگوں اور اس سماج اور معاشرہ سے نفرت کی سوزش سے بھنتا رہا اور پھر ان سے اور خود اپنے سے بھی ہجو کی تیز انیوں کو ان کے دلوں میں چبھو کر انتقام لیتا رہا۔ میدان ہجو کا تنہا و یکتا شہسوار ہو کر نکھرا اور اس صنف میں جو منفی حیثیت رکھتی ہے باوجود ہر قسم کے ابتذال اور بعض وقت فحاشی کے صف اول میں شمار ہوا۔

مدح:

کہتے ہیں کہ حطیئہ کے اکثر مدحیہ قصائد ضائع ہو گئے۔ حالاں کہ یہ حقیقت ہے کہ حطیئہ کو ہجو گوئی تو اکثر ڈر یا مصلحت کے تقاضے بند کرنا پڑی (۱)۔ لیکن مدح اس نے ہمیشہ جاری رکھی کیوں کہ یہی اس کی روزی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا لیکن اس کے باوجود اس کے دیوان میں بہت کم مدحیہ قصائد ملتے ہیں چنانچہ اس کے دیوان میں ۱۴ سے زیادہ مدحیہ قصائد نہیں ملتے۔ جو حطیئہ کی تقریباً ایک سو سال لمبی عمر کو دیکھتے ہوئے بہت کم معلوم ہوتے ہیں (۲)۔ اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدحیہ قصائد میں سے بہت سا حصہ ضائع ہو گیا۔

حطیئہ نے اپنے مدحیہ قصیدوں میں اکثر بنو انف الناقہ کی اور خاص طور سے ان لوگوں کی تعریف دل کھول کر کی ہے جن کو بنو انف الناقہ نے زبرقان کی ہمسائی چھوڑ کر ان کی ہمسائی قبول کرنے کی دعوت دینے کے لئے بھیجا تھا جیسے بغیض بن بدر، شماس بن لای، علقمہ بن ہود اور مشہور شاعر المخبل۔

مدح میں حطیئہ کا اسلوب جاہلی شعراء کی ریت کے مطابق بالکل قدیم ہے چنانچہ

---

(۱) جیسا کہ زبرقان کی ہجو کے بعد حضرت عمر کے ڈر کی وجہ سے ان کی وفات تک اپنی زبان بند رکھی۔

(۲) الحطیئہ فی سیرتہ و فنہ و نفسیتہ : ایلیا حاوی ص ۸۴

عام طور سے وہ اپنے مدحیہ قصائد محبوبہ کی نگری کے کھنڈرات (طلل) کے ذکر سے کرتا ہے پھر گریز کرکے مدح پر آتا ہے جیسے بغیض بن بدر کی مدح کو اس مطلع سے شروع کرتا ہے۔

طافتْ أُمامۃُ با لرّکبان آونۃً   یا حُسنہ من قوامٍ ما ومُنتقبا

اس مطلع میں اپنی محبوبہ امامہ کے خیال کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک رات جب کہ وہ قافلہ میں ٹھہرا ہوا تھا یک بیک اس کا خیال آکر جنت نگاہ بن گیا اور ایسا لگا کہ وہ اپنے قد رعنا کے ساتھ اور خوبصورت آنچل کو سنبھالے ہوئے سامنے مجسّم کھڑی ہوگئی ہے۔

اس کے بعد والے شعر میں اس کا مختصر لیکن بہت ہی حسین سراپا کھینچتا ہے کہتا ہے کہ وہ سب کو چھوڑ چھاڑ کر اس کے پاس اپنے تر د تازہ وشاداب رخسار جس پر جھرّیاں کا نشان تک نہیں اور اپنے غنچہ جیسے منہ اور موتیوں جیسے چمکتے دمکتے دانتوں کے ساتھ اس طرح آکر کھڑی ہوگئی ہے کہ دل وجان سب اس کے اسیر ہوکر رہ گئے۔

اذ تَستبیکَ بمصقولٍ عوارِضُہٗ   حمش اللثاثِ تریٰ فی غرْبہ شَنَبا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ تجدید محبت کے بعد اس کی محبت میں سرد مہری آگئی ہر نہ وہ جوش وخروش اور نہ وہ پاس وفا ہے حالاں کہ میں اپنے اسی عہد پر اب بھی قائم ہوں۔

قد خلفتْ عہدھا من بعد جدّتہا
وکذبت حُبَّ ملھوف وما کذبا

(۱) کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی   کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
(۲) مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا   تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس کے بعد جاہلی شعراء کی طرح غزل اور وصف سے گریز کرکے صحرا اور جنگلی

جانوروں کا وصف شروع کرتا ہے۔ بغیض کی مدح میں ایک دوسرے قصیدے کو بھی غزل سے شروع کیا ہے اور اس میں اعشیٰ و نابغہ کی طرح محبوبہ کے ہجر و فراق میں جو سخت تکلیف اور عذاب برداشت کرنا پڑا ہے اس کا نقشہ کھینچا ہے۔

شاقتک أظعانٌ لليلیٰ   یوم ناظرةٍ بواکره

یعنی اس کی محبوبہ کی سواریوں نے جب صبح کو کوچ کیا تو اس کا شوق اور محبت بھڑک اٹھی۔

بغیض کی طرح آل شماس کی تعریف بھی حطیئہ نے دل کھول کر کی ہے۔ اور اس میں بھی اس کا اسلوب بغیض کی مدح جیسا ہے۔ چنانچہ اس کو بھی غزل سے شروع کرتا ہے اور جاہلی شعراء کی طرح دیار حبیب اور اس کے کھنڈرات کا ذکر کرنے کے بعد اپنے ازلی دشمن زبرقان کے ذکر پر آتا ہے اور ان کا مقابلہ آل شماس سے کر کے زبرقان کی بھد اڑاتا ہے اور آل شماس کی تعریف کرتا ہے اس کا بہترین نمونہ اس کا رائیہ قصیدہ ہے جس میں ۲ شعر ہیں جس کا مطلع ہے۔

عفا مسحلانُ من سُلیمیٰ فحاصره   تمشّیٰ به ظِلمانُه وجآذره

یعنی مقام مسحلان اس کی محبوبہ سلیمی سے خالی اور ویران ہوگیا اور اب اس میں شتر مرغوں اور نیل گایوں نے اپنے ٹھکانے بنا لئے ہیں۔

اس قسم کا دوسرا قصیدہ اس کا دالیہ قصیدہ ہے جس میں ۳۰ اشعار ہیں جن میں ان لوگوں کی دل کھول کے مدح کی ہے۔ اور بقول ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس قصیدہ کو عمر دوام حاصل ہوگئی ہے (۱) خاص طور سے اس کے مندرجہ ذیل اشعار صنف مدح میں مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔

أقِلّوا علیهم لا أبا لأبیکمُ   من اللوم أو سُدّوا المکان الذی سدّوا

اولئک قومٌ إن بنوا احسنوا البنیٰ   وإن عاهدوا أوفوا وإن عقدوا اشدّوا

وان کانت النعمیٰ علیهم جزوا بها   وان أنعموا لاکدّروها ولا کدّوا

---

(۱) حدیث الاربعا اول ص۱۳۵۔

وإن التی نکبتنہا عن معاشر　　غضاب علی أن صد دت کما صدّوا
أتت آل شماس بن لأیٔ وإنما　　أتاھم بہا الأحلام والحسب العدّ
فإن الشقی من تعادی صدورھم　　وذوالجد من لانوا إلیہ ومن ودّوا
یسوسون أحلاماً بعیدا أناتھا　　وان غضبوا جاء الحفیظۃ والجدّ[1]

یعنی ان کو لعنت ملامت کرنا کم کر دو یا پھر ہمت ہے تو ان کی جگہ کو پر کر دو۔ وہ تو ایسے لوگ ہیں کہ جب کچھ بناتے ہیں تو اچھی طرح بناتے ہیں اور جب وعدہ کرتے ہیں تو پورا کرتے ہیں اور جب دوستی کرتے ہیں تو بہت گہری یا کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو بہت مضبوط اور پائیدار۔

اگر ان کے ساتھ کوئی احسان کرے تو وہ اس کا اچھا بدلہ دیتے ہیں اور جب انعام و اکرام دیتے ہیں یا بھلائی کرتے ہیں تو احسان جتا کر نہ اس کی حیثیت گراتے ہیں اور نہ دینے میں کمی کرتے ہیں۔

میں نے اپنی اونٹنی کو مجھ سے خفا ایک خاندان (خاندان زبرقان بن بدر) سے اس لئے موڑا کہ میں بھی ان سے اسی طرح منہ پھیر لوں جس طرح انھوں نے مجھ سے منہ پھیر لیا تھا۔ (اشارہ زبرقان بن بدر کی بیوی کے دو تین دن تک حطیئہ کو لینے کے لئے اونٹ نہ بھیجنے کی طرف) چنانچہ اس کے بعد میری اونٹنی خاندان شماس میں آئی کیوں کہ وہ لوگ بڑی عقل والے اور ایک زمانہ سے اعلیٰ کام والے لوگ ہیں۔

وہ شخص بہت ہی بدقسمت ہے جس کی دشمنی ان کے سینوں میں ہو۔ (جن کے وہ لوگ دشمن ہوں) اور وہ شخص بڑا ہی خوش قسمت ہے جس کے لئے وہ نرم پڑجائیں اور محبت اور سلوک کا برتاؤ کرنے لگیں۔

وہ لوگ بڑے عقل مند اور برداشت کرنے والے ہیں کتنی ہی بڑی مصیبت کیوں نہ پڑجائے دل چھوٹا نہیں کرتے اور اگر ان کو صحیح معنوں میں غصہ آجائے تو پھر وہ پورے کینہ کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

بغیض بن بدر کی مدح میں حطیئہ نے جو قصیدہ کہا ہے اور جس کا مطلع اس سے

پہلے گذر چکا ہے مذکورہ بالا قصیدہ کے بعد اسلوب بیان اور معانی و مطالب کے اعتبار سے بہت اچھا سمجھا جاتا ہے اسی قصیدہ میں بنی انف الناقہ سے متعلق وہ مشہور شعر بھی ہے۔
اس بغیض کی تعریف پہلے والے قصیدہ میں کر چکا ہے (۱)

حضرت عمر کی مدح :

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا حطیئہ نے جب زبرقان بن بدر کی ہجو کی تھی تو انھوں نے حضرت عمر سے اس کی شکایت کی اور حضرت عمر نے حضرت حسان کے فیصلہ کے بعد اس کو سزا کے طور پر جیل میں ڈال دیا تھا۔ حطیئہ کے چھوٹے چھوٹے بچے اور بیوی تھی۔ جب اس تیرہ و تاریک گڑھے میں اس کو ڈالا گیا تو اپنی تکلیف تو شاید بھول گیا لیکن اپنے چھوٹے چھوٹے جگر کے ٹکڑوں کی یاد نے اسے بیتاب کر دیا۔ اور ان کی کس مپرسی اسے تڑپا گئی۔ چنانچہ اس انفعالی کیفیت میں حضرت عمرؓ کو ایک معذرت نامہ لکھ کر بھیجا جو دراصل گزارش احوال واقعی کا ایسا دل خراش نمونہ تھا کہ حضرت عمر جیسے سخت منتظم اور با اصول خلیفہ بھی اس دلدوز تصویر کو سن کر ضبط نہ کر سکے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اور کیوں نہ ہوتا ان کے سینہ میں پتھر کا دل تو نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو شاید اس نقشہ کو دیکھ کر پسیج جاتا۔ ایک مجبور اور کمزور شخص جیل کی کالی کوٹھری میں پڑا ہے اور اس کے بچے جن کے کھانے کے لئے اس نے کچھ نہیں چھوڑا ہے کہ اس کے پاس کبھی کوئی چیز تھی ہی نہیں، بے یار و مددگار بھوکے پیاسے چڑیا کے ان بچوں کی طرح پڑے تڑپ رہے ہیں جن کے پوٹوں میں کچھ بھی نہیں اور ان کے

---

(۱) ما کان ذنبُ بغیضٍ لا اباً لکمُ ۔ فی بائسٍ جاء یحدو آخر الناس ؛ اسی آدمی کے بارے میں اسی معنی کا تیسرا شعر۔

ما کان ذنبُ بغیضٍ ان رای رجلاً ذا فاقۃٍ عاش فی مستوعرٍ شاسٍ

ماں باپ مر چکے ہیں اب وہ اپنے گھونسلے میں بھوک کے مارے تڑپ رہے ہیں اور نہ کوئی ان کا مددگار ہے اور نہ چونگا دینے والا۔ یہی ہے وہ نقشہ جو حطیئہ نے اپنے اس معذرت نامہ میں کھینچا ہے کہنا ہے جس میں حضرت عمر کی مدح کی ہے۔

ماذا تقول لأفراخ بذی مرخ
زغب الحواصل لاماءٌ ولا شجرُ
ألقیتَ کاسبہم فی قعر مظلمۃٍ
فاغفر علیک سلام اللہ یا عمر
انت الأمینُ الذی من بعد صاحبہ
ألقی الیک مقالید النہی البشرُ

یعنی آپ (حضرت عمر سے خطاب) چڑیا کے ان بچوں سے کیا کہیں گے جن کے پوٹے خالی پڑے ہیں اور جو ذی مرخ میں بغیر دانہ پانی (بغیر پانی اور درخت) اور ٹھکانے کے پڑے تڑپ رہے ہیں اور آپ نے ان کے سرپرست کو کالی کوٹھری میں ڈال رکھا ہے اس لئے اے عمر خدا انہیں سلامت رکھے اب معاف کردو (اور مجھے رہائی بخشئے) آپ وہ ہیں جسے لوگوں نے آپ کے ساتھی کے بعد عقل و خرد کی وجہ سے زمام حکومت سونپ دی۔ اور اس طرح انھوں نے آپ کے اوپر احسان نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے آپ کو خلیفہ بنا کر اپنے ساتھ ہی بھلائی کی ہے۔

اغانی نے روایت کی ہے کہ حضرت عمر اس کے یہ اشعار سن کر رو پڑے۔ چنانچہ یہ حالت دیکھ کر عمر بن العاص نے کہا "آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر اس شخص سے زیادہ انصاف پرور کوئی نہیں ہے جو حطیئہ کو چھوڑ دینے پر رو پڑتا ہے۔" (۱)

چنانچہ جیسا کہ معلوم ہے حضرت عمر نے اس کو جیل سے رہا کر دیا اور تین ہزار درہم دے کر ہدایت کی کہ اب کسی کی ہجو نہ کرنا ورنہ زبان کاٹ لوں گا اس معذرت

---

(۱) اغانی للاصفہانی ۲/۱۸۰ بحوالہ الحطیئۃ فی سیرتہ وفنہ لایلیا حاوی۔

نامہ میں ۴ شعر ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا حطیئہ لوگوں کی تعریف کرکے یا ہجو کرنے سے ڈرا کر روپیہ پیسہ وصول کرتا تھا اور اس طرح اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا تھا حضرت عمر کے اس حکم سے اس کی زبان جو بند ہوئی تو اس کی روزی کے دروازے بھی بند ہو گئے جب نوبت فاقوں تک پہنچی تو اس نے حضرت عمرؓ کو ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا جس میں اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی حالت زار بیان کرکے جن کا نہ پیٹ بھرتا ہے اور نہ تن ڈھکنے کو کپڑا میسر ہے رحم کی درخواست کرتا ہے کہتا ہے۔

یا أیھا الملک الذی امست لہ بصری وغزۃ سھلھا والأجرع

أشکو إلیک فاشتکی ذریۃ لا یشبعون وأمھم لا تشبع

اور فرط انفعال اور ان کی بری حالت سے اس قدر متاثر ہے کہ یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ نہ ان میں سے بڑا مرتا ہے اور نہ دودھ پیتا چھوٹا والا۔ سب میری جان کے لئے عذاب بنے ہوئے ہیں اس حالت میں نہ میری مدد کوئی آدمی کرتا ہے اور نہ رشتہ ناطے والے ساتھ دیتے ہیں۔ اور آپ کی بھی یہ حالت ہے کہ آپ دوسروں کو خوب بخشتے ہیں مگر آپ میری طرف توجہ نہیں دیتے۔

اگرچہ مذکورہ بالا قصیدہ کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ واقعی حطیئہ کا ہے کہ نہیں کیوں کہ بعض رواۃ اس کو جریر کا بتاتے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے حطیئہ کے بال بچوں سے شدید محبت کا اظہار اور ان کی تکلیف سے بیتاب ہو کر عمر جیسے صاحب جلال خلیفہ سے مدح کے پیرائے میں اپنے دکھ درد کا اظہار بڑے خوبصورت انداز سے کرتا ہے جس سے وہ بغیر متاثر ہوئے نہیں رہے یہ قصیدہ خاصا لمبا ہے۔

حضرت عمر کی شان میں ایک تیسرا مدحیہ قصیدہ بھی بہت شاندار اس نے کہا ہے جس میں تقریباً بیس شعر ہیں۔ اس کو اس نے بالکل جاہلی شعراء کے رنگ میں تشبیب سے شروع کیا ہے اس کے بعد انھیں کی ریت کے مطابق اور جنگلی جانوروں کے

ذکر کے بعد گریز کر کے مدح پر آتا ہے۔ موقعہ غالباً یہ ہے کہ لوگوں نے شاید حضرت عمر سے چغل خوری کی ہے کہ حطیئہ نے مرتد ہونے کے بعد جی سے اسلام نہیں قبول کیا ہے بلکہ ریاکاری کرتا ہے چنانچہ کہتا ہے کہ

إلی ملک عادل حکمہ　　فلما وضعنا إلیہ الرحالا

عری قول من کان ذا إحنۃ　　ومن کان یأمل فی الضلالا

یعنی جب میں نے ایک عادل بادشاہ کے سایہ عاطفت میں پناہ لی تو کینہ رکھنے والوں اور مجھے گمراہ کرنے والوں کی ساری باتیں غلط ثابت ہوگئیں کیوں کہ

بأن الوشاۃ بلا جرمۃ　　أتوک فزاموا الدیک المحالا

چغل خوروں نے آپ کے پاس آکر میری چغلی یہ سمجھ کر کھائی ہے کہ آپ ان کی حرکتوں کو نہ سمجھیں گے اور مجھے سزا دے بیٹھیں گے مگر آپ اتنے ذہین اور سمجھدار ہیں کہ آپ انکی چالوں کو سمجھ گئے اسی لئے

فجئتک معتذراً راجیا　　لعفوک أرھب منک النکالا

فلا تسمعن بی مقال العدی　　ولا تؤکلنی ھدیت الرجالا

میں آپ کی خدمت میں معذرت خواہی کرتے ہوئے حاضر ہوا ہوں اور آپ کی معافی سے لو لگائے ہوں اور آپ کی سزا سے ڈر رہا ہوں۔

اسی لئے آپ دشمنوں کی باتوں کو نہ سنیئے اور اللہ آپ کو ہدایت دے آپ مجھے ان لوگوں کے حوالہ نہ کر دیجئے۔

یہ قصیدہ خاصا لمبا ہے جو بظاہر معذرت نامہ جیسا ہے لیکن درحقیقت یہ وہ مثالی مدح ہے جس میں دوسروں سے موازنہ کا رنگ بھی شامل ہے اور یہ وہ فن ہے جس میں اس سے پہلے معذرت کے امام معلقات کے مشہور شاعر نابغہ نے اپنے قلم اور دل و دماغ کی ساری جولانیاں دکھائی ہیں۔ جس کا رنگ اس زمانہ میں حطیئہ کے کلام اور اس کے فن میں جھلکتا ہے۔

حطیئہ نے حکام اور امراء میں سے ولید بن عقبہ کی جو حضرت عثمان کے ماں جائے

تھے اور جس کو آنحضرتؐ نے بنو المصطلق کا انچارج بنایا تھا اور جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو اسے کوفہ کا گورنر بنایا۔ اس زمانہ میں اس نے نشہ کی حالت میں فجر کی نماز پڑھائی اور جب اس کی شکایت حضرت عثمان سے کی گئی تو انھوں نے حضرت علی کے ہاتھوں اس کو چالیس کوڑے لگوائے چنانچہ اس کے بعد وہ وہاں سے بھاگ گیا حطیئہ کو اس سے بڑا تعلق تھا۔ چنانچہ اس کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جس میں ولید کی برأت اور بے گناہی کی گواہی دیتا ہے۔

شهدُ الحطیئۃ یوم یلقی ربّہ — أنّ الولید أحقُّ بالعذر

یہ قصیدہ بہت سیدھا سادا ہے زبان و بیان کے اعتبار سے بہت بلند نہیں ہے لیکن حطیئہ جیسے شر پسند آدمی کے مخلص دل کی عکاسی ضرور کرتا ہے کہ ایسے لوگ جب کسی سے خلوص رکھتے ہیں تو برملا اس کا اظہار صرف ان آدمیوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ روز محشر خدا کے سامنے بھی کرنے کو تیار رہتے ہیں لہٰذا اس ولید کی ایک دوسرے قصیدے میں مدح کی ہے جس میں جاہلی رنگ میں محبوبہ کے کوچ کا منظر بیان کرنے کے بعد ولید کی بہادری کی شجاعت اور مہمان نوازی کی تعریف کی ہے۔

فتی یملأ الشیزی و یُروی بکفّہ — سنان الرُّدَینی (۱) الاصم وعاملہ

یومَ العدّ وحیث کان بجحفلٍ — یَغُمّ السمیعَ جرسہ وصواھلہ

حطیئہ نے ولید کے علاوہ سعید بن العاص طریف بن دفاع الحنفی کی شان میں بھی مدحیہ قصیدے کہے ہیں۔

حطیئہ کی زندگی کا یہ پہلو کہ اس کے دل میں بھی ایک ایسا دل تھا جو خلوص و محبت سے دھڑکتا تھا اور جس کی مثالیں ہم نے مذکورہ بالا قصیدوں اور حضرت عمر کے پاس جیل سے بچوں کی خاطر معذرت نامہ بھیجنے میں دیکھیں۔ ایک

---

(۱) الرُّدَینی: نیزے کی ایک قسم جس کی نسبت 'رُدینتا' نامی ایک عورت کی طرف کی جاتی ہے۔ جو نیزوں کو بناتی اور سیدھا کرتی تھی۔

دوسرے قصے میں بھی ملتی ہے۔ جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حطیئہ باوجود سخت بخیل ہونے کے اور باوجود تنگ دست و فاقہ مست ہونے کے بڑا دل والا تھا۔ ایک دفعہ فاقہ مستی کی حالت میں جب کہ وہ اور اس کے بچے تین دن سے بھوکے پڑے تھے۔ ایک مہمان آگیا اور سوچا کہ گھر میں دانہ نہیں اور عرب کی مہمان نوازی کا تقاضا ہے کہ مہمان کو واپس نہیں کر سکتے چنانچہ اپنے بیٹے کو بھی ذبح کر کے مہمان کو کھلانے پر تیار ہوگیا ادھر بیٹے نے بھی اس کے دل کی بات بھانپ لی اور باپ کو ایسا کرنے کی تلقین کرنے لگا۔ اتنے میں حطیئہ کو دور سے گورخروں کی ایک ڈار آتی دکھائی دی۔ چنانچہ اس نے ان میں سے ایک کو شکار کیا اور اپنے مہمان کو اس کا گوشت بھون کر کھلایا اور اس طرح مہمان نوازی کا فرض انجام دیا اور اپنی عزت اور عربی ضیافت کی ریت کی لاج رکھی۔

وطاوی ثلاث عاصب البطن مرمل　　　ببیداء لم یعرف بہا ساکن رسما

یعنی تین دن کے فاقہ سے پیٹ پر پتھر باندھے کھلے میدان میں پڑا تھا اور بچے بھی ننگے بھوکے بلک رہے تھے کہ

رأی شبحا وسط الظلام فراعہ　　　فلما رأی ضیفا تشمر واھتما

یعنی اس حالت میں رات کی تاریکی میں اسے ایک سایہ ہلتا نظر آیا تو وہ ڈر گیا۔ لیکن جب تھوڑی دیر تک غور کیا تو ایک مہمان کو دیکھ کر اس کی خاطر تواضع کے لئے اہتمام کرنے لگا مگر تھا کیا جس سے وہ اس کی پذیرائی کرتا اس لئے بڑے بیٹے کو ذبح کرنے کی سوچ رہا تھا اور بیٹے نے اس کی بات کو بھانپ کر ایسا کرنے کی اس کو ترغیب دی۔

تردی قلیلا ثم احجم برھۃ　　　وان ھو لم یذبح فتاہ فقد ھما

وقال ابنہ لما رآہ بحیرۃ　　　أیا ابت اذبحنی ویسر لہ طعما

یہ سوچ ہی رہے تھے کہ جنگلی جانوروں کا ایک گلہ دکھائی دیا جو چشمہ کی طرف پانی پینے کے لئے ایک بڑے نر کی قیادت میں جا رہا تھا چنانچہ گلہ پانی پی چکا تو حطیئہ نے

یک خوب موٹی تازی گدھی کو نشانہ لگا کر مار گرایا اور اس کا گوشت مہمان کو کھلا کر خود سرخ رو ہوا اور مہمان کی بھی پذیرائی ہوئی۔

فبنا ھُمْ عنّت علی البعدِ عانتاً

قد انتظمت من خلف مسحلها نظماً

فمهّلها حتیٰ تروّت عطاشها

فأرسل فیها من کنانتہ سھما

نخرّت نحوصٌ ذات جحش فتیّۃ

قد اکتنزت لحماً وقد طبقت شحما

یہ وہی حطیئہ ہے جس کے یہاں ایک دفعہ ایک مہمان ضمر بن اعیا نامی آ گیا تو مجبوراً اپنی لاج اور سماج کی ریت کے مطابق اس کی مہمان داری کی لیکن وہ جب چلا گیا تو اس کی سخت ہجو کہہ ڈالی جس میں کہا کہ بس خود ہی فقر و فاقہ میں مبتلا تھا اس پر نہ جانے کہاں سے یہ آن مراجی میں آیا کہ قبیلہ کاہل کی اس عورت کی طرح جس نے اپنے شوہر کے کھانے میں زہر ملا کر اس کو مار ڈالا تھا میں بھی اس بے وقت کے مہمان کو ٹھکانے لگا دوں لیکن مروت اور تقاضائے مہمان نوازی اور اس ڈر نے کہ ابن اُعیا ساری دنیا میں مجھے ذلیل و رسوا کر دے گا ایسا کرنے سے باز رکھا مگر اس کو اتنا پانی پلایا کہ اس کا پیٹ پھول گیا۔

غزل و وصف و سراپا:

اب تک حطیئہ کی جو تصویر ابھر کر سامنے آئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا منہ پھٹ ہجو گو بخیل بد دین تنگ دست و تنگ دل شاعر تھا۔ مگر تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے جو میرے خیال میں کم اہم نہیں ہے۔ اور وہ ہے وہ رخ جس میں اس کے دل کی تصویر ہے وہی دل جو ستایا ہوا ہے۔ غم و اندوہ کا مارا ہے اور حسرتوں تمناؤں کی آماجگاہ اس میں دو عکس بہت نمایاں ہیں ایک امامہ"

کا جو اس کی بیوی ہے اور دوسری "ام معبد" کا جو اس کی محبوبۂ دل نواز ہے دونوں سے حطیئہ کو شدید محبت ہے۔ اس لئے دونوں اس کی غزل اور تشبیب کا مرکز و محور ہیں۔

امامہ بھی شاعر کی تمام ظاہری برائیوں اور خاندانی گم نامی کے باوجود اس کو بہت چاہتی ہے اس سے حطیئہ کے بچے بھی ہیں اور حطیئہ بھی اس پر جان دیتا ہے حالاں کہ یہ وہی عورت ہے جس کی ہجو بھی کر چکا ہے۔ مگر محبت کا یہ عالم ہے کہ بقول اغانی ایک دفعہ جب وہ سفر کے لئے نکلا اور امامہ نے اونٹنی پر سوار ہوتے وقت جب یہ کہا کہ

اذکر تحننا إلیک، وشوقنا وارحم بنا تک انھن صغار

یعنی ہمارے دلی تعلق اور شوق فراواں کو یاد رکھنا اور اپنی بچیوں پر رحم کھانا کہ وہ ابھی بالی ہیں" تو فوراً اونٹنی سے اتر گیا اور بولا کہ کجاوا اتار دو میں اب کبھی سفر نہ کروں گا (۱)

دوسری عورت "ام معبد" ہے جو غالباً اس کی خیالی محبوبہ ہے، روایتی انداز سے اس کے پاس رات کی تنہائیوں میں جب کہ وہ دن بھر کے سفر سے تھکا ہارا قافلہ کے ساتھ کسی جگہ پڑاؤ ڈالے پڑا ہے، سب لوگوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو چلی ہیں، صحرا کی مہیب رات کے سناٹے میں مقام ذوطوالہ میں آتی ہے، اور جسمانی طور سے دور ہونے کے باوجود اس کی سانسوں کو اپنے دل کی دھڑکنوں سے سنتا ہے، چنانچہ وہ اپنی میٹھی باتوں سے اس کا دل بہلاتی ہے۔ اس کے دکھ درد کو بٹاتی ہے اور غم دوراں کی تلخیوں اور زندگی کی محرومیوں کو قند و شہد میں بدل کر جینے کا سہارا دیتی ہے۔ اس موقعہ پر حطیئہ عذری شعراء کی طرح پاک محبت کے لافانی نغمے بہت ہی خوبصورت غزل کی زبان میں الاپتا ہے۔ جس میں بڑا سوز و ساز ہے بڑا اثر ہے اور زبان بہت حسین اور

---

(۱) اغانی ۲/۶۷۷

انداز بڑا پیارا۔ اس انداز کو دیکھ کر یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ وہی منہ پھٹ اور رسوا زمانہ شاعر ہے جس کی زبان سے لوگ گھبراتے ہیں۔

وفی کل مُمسیٰ لیلۃٍ ومعرّس　　جیالٌ یوافی الرکبَ من ام معبد

فحیّاکِ ودٌّ من هواکِ لقیتُہٗ　　وخوصٌ باعلیٰ ذی طوالۃ هُجّد

واَنّیٰ اهتدت والدوّ بینی وبینها　　وما کان ساری الدوّ باللیل یهتدی

تسدّیتنا من بعد ما نام طالع الـکلاب واخبی نارَ کلُّ موقدِ (۱)

مذکورہ بالا اشعار حطیئہ کی عام غزل کے بہترین نمونے ہیں جن میں وہ ذی الرمّہ سے بھی سبقت لے جاتا ہے۔

مگر یہی شاعر جب اباحی غزل کہتا ہے تو عورت کا ایسا سراپا کھینچتا ہے کہ انسان کے سارے جذبات برانگیختہ کر دیتا ہے۔ اور اس میں امراؤالقیس کو بھی مات کر جاتا ہے۔

اس صنف میں اس کی ایک غزل ہے جو بہت شوخ ہے جس میں وہ عورت کا ایسا سراپا کھینچتا ہے کہ اس کا ایک ایک انگ صاف دکھائی دیتا ہے۔ ڈھکا چھپا نہیں بلکہ بقول اس کے برہنہ حالت میں کہ اعشیٰ بھی متجردہ کا ایسا شوخ اور حیا سوز منظر نہ کھینچ سکا۔ کہتا ہے۔

---

(۱) مشکل الفاظ۔ معرس۔ آرام کی غرض سے پڑاؤ ڈالنے کی جگہ۔ ممسیٰ لیلۃ = رین بسیرا یعنی رات گذارنے کے لئے جب لشکر پڑاؤ ڈالتا ہے تو ام معبد کا خیال چپکے سے آجاتا ہے۔ الخوص = وہ اونٹنیاں جو چلتے چلتے اس قدر تھک گئی ہیں کہ ان کی آنکھیں دھنس گئی ہیں۔ ذو طوالا = جگہ کا نام۔ ہُجّد = سوئے ہوئے۔ الدو = وہ سنسان جگہ جہاں صدائے بازگشت گونجتی رہتی ہے۔ جہاں راتوں کو چلنے والے راستہ بھول جاتے ہیں، تسدیتینا = سوار ہو کر ہمارے پاس آگئی۔ طالع الکلاب = چوکیدار جو سب کے سونے کے بعد آخر میں سوتا ہے۔ موقد = آگ جلانے والا۔

انداز بڑا پیارا۔ اس انداز کو دیکھ کر یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ وہی منہ پھٹ اور رسوا زمانہ شاعر ہے جس کی زبان سے لوگ گھبراتے ہیں۔

وفی کل مُمسیٰ لیلۃٍ ومعرّسٍ — خیالٌ یوافی الرکبَ مِن ام معبد

فحیّاکِ و دّمن ھواکِ لقیتُہٗ — وخوصٌ باعلیٰ ذی طوالۃ ھُجّد

واُنّیٰ اَھتدت والدوّ بینی وبینھا — وما کان ساری الدوّ باللیل یھتدی

تسدّیتنا مِنْ بعدِما نام طالع الکلاب واُخبی نارَ کلُ موقدِ (۱)

مذکورہ بالا اشعار حطیئہ کی عام غزل کے بہترین نمونے ہیں جن میں وہ ذی الرمۃ سے بھی سبقت لے جاتا ہے۔

مگر یہی شاعر جب ابای غزل کہتا ہے تو عورت کا ایسا سراپا کھینچتا ہے کہ انسان کے سارے جذبات برانگیختہ کر دیتا ہے۔ اور اس میں امراو القیس کو بھی مات کر جاتا ہے۔

اس صنف میں اس کی ایک غزل ہے جو بہت شوخ ہے جس میں وہ عورت کا ایسا سراپا کھینچتا ہے کہ اس کا ایک ایک انگ صاف دکھائی دیتا ہے۔ ڈھکا چھپا نہیں بلکہ بقول اس کے برہنہ حالت میں، کہ اعشیٰ بھی متجرد کا ایسا شوخ اور حیا سوز منظر نہ کھینچ سکا۔ کہتا ہے۔

---

(۱) مشکل الفاظ۔ معرس۔ آرام کی غرض سے پڑاؤ ڈالنے کی جگہ۔ ممسیٰ لیلۃ ۔ رین بسیرا یعنی رات گذارنے کے لئے جب لشکر پڑاؤ ڈالتا ہے تو ام معبد کا خیال چپکے سے آجاتا ہے۔ الخوص ۔ وہ اونٹنیاں جو چلتے چلتے اس قدر تھک گئی ہیں کہ ان کی آنکھیں دھنس گئی ہیں۔ ذو طوالا ۔ جگہ کا نام۔ ھُجّد ۔ سوئے ہوئے۔ الدو ۔ وہ سنسان جگہ جہاں صدائے بازگشت گونجتی رہتی ہے۔ جہاں راتوں کو چلنے والے راستہ بھول جاتے ہیں۔ تسدیتنا ۔ سوار ہو کر ہمارے پاس آگئی۔ طالع الکلاب ۔ چوکیدار جو سب کے سونے کے بعد آخر میں سوتا ہے۔ موقد ۔ آگ جلانے والا۔

أثرت إدلاجي على ليل حرة　　هضيم الحشا حسانة المتجرد ۴
إذا النوم ألهاها عن الزاد خلتها　　بُعَيد الكرى باتت على طي مجسد

اس میں سارا منظر انتہائی حیا سوز اور ناقابل بیان ہے لیکن انداز اتنا خوبصورت ہے کہ فن سراپا میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ ایسی محبوبہ دل نواز کے ساتھ وہ رات اتنی لذت آگیں تھی کہ جی چاہتا تھا کہ یہ رات سال بھر تک نہ ختم ہو بلکہ بڑھتی ہی جائے۔

اس طرح حطیئہ نے غزل اور محبوبہ کے سراپا کھینچنے میں بھی کمال کا مظاہرہ کیا ہے اگرچہ شرم و حیا کو پار کر کے معاملہ بندی کو ابتذال اور فحش گوئی میں تبدیل کر دیا ہے جس کی مثال اس دور کے شعراء میں تو بالکل نہیں ملتی البتہ زمانہ جاہلیت میں امرؤالقیس اور اعشیٰ کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن وہ بھی اتنی کھلی اور حیا سوز نہیں جتنی حطیئہ کے یہاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حطیئہ اپنے حالات کی وجہ سے اخلاقی ضابطوں اور دینی قیود سے بالکل آزاد ہو کر شعر کہتا تھا اور اس طرح اپنے انتقام کی آگ بجھاتا تھا۔

اونٹنی کا سراپا کھینچنا عربی شاعروں کا محبوب صنف ہے۔ حطیئہ نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور کوشش کی ہے کہ جاہلی شعراء میں اس صنف کے امام جیسے طرفہ بن العبد زہیر بن ابی سلمیٰ اور لبید بن ابی ربیعہ سے بھی بازی لے جائے۔ (۱)

حطیئہ نے جاہلی شعراء کے رنگ میں محبوبہ کے (طلل) ٹھہرنے کی جگہوں اور ان کے کھنڈرات کا بھی وصف بیان کیا ہے عام طور سے یہ وصف قصیدوں کے مطلعوں میں آیا ہے۔ جس میں ان جگہوں کے ویران ہو جانے، کھنڈرات کے مٹ جانے ان میں گھاس پھوس اگ آنے اور محبوبہ کی جگہ جنگلی جانوروں کے مسکن بن جانے کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اس وصف میں جاہلی ریت کے مطابق ان جگہوں کا نام لیا ہے

---

(۱) تفصیل کے لئے اس کتاب کے حصہ اوّل ص ۲۴۴ اور ص ۲۰۳ اور اسی حصہ دوم میں لبید کے حالات ملاحظہ کیجئے۔

اس محبوبہ کا نام لے کر ذکر کیا ہے جو وہاں رہتی تھی۔ اور جس کے جانے کے بعد اب وہاں نیل گائیں اور شتر مرغ زبنے لگے ہیں اور اس کے بعد بڑی تفصیل سے ان پھول پودوں اور درختوں کا ذکر کرتا ہے۔ جو اس جگہ اگ آئے ہیں تا کہ یہ دکھائے کہ ایک عرصہ ہوگیا کہ یہ بستی اجڑ کر پھر نہ بسی اس لئے جب ادھر سے گزرتا ہوں تو دیدہ و دل گنگا جمنی بہانے لگے ہیں۔

عفا مسحلان من سُلیمیٰ فحامرہ ۔۔۔ تمشی بہ ظِلمانہٗ وجآذرہ

بمستأسِدِ القُرْیان حوّ نباتہ ۔۔۔ فَنَوّارُہٗ مِیلٌ إلی الشمس زاہرہ

کأنّ یہوداً نشّرت فیہ بَزّہا ۔۔۔ برود اورقماً فاتک البیع فاجرہ (۱)

حکمت و فلسفہ :

حطیئہ نے جس طرح کی دکھ بھری زندگی گزاری اور جو تجربات اس کو حاصل ہوئے انھیں اس نے اپنے کلام میں بڑی خوبصورتی سے حکمت و فلسفہ کے رنگ میں پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دل و دماغ کی آنکھوں سے رفتار زمانہ کو دیکھتا تھا۔ اور حالات کے اتار چڑھاؤ کو بڑی گہرائی سے سمجھتا تھا۔ چنانچہ اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے کہ

۱۔ إذا ما المرءُ بأتَ علیہ وَکْفٌ ۔۔۔ من الحدثان لیس لہ کفاءُ

۲۔ لعمرکَ ما رأیتُ المرءَ تبقیٰ ۔۔۔ طریقتہ وإن طال البَقاءُ

۳۔ علی ریب المنون تداولتہ ۔۔۔ فأفنتہ، ولیس لھا فناءُ

۴۔ یَصُبّ إلی الحیاۃِ ویشتہیہا ۔۔۔ وفی طول الحیاۃِ لہ عناءُ

۵۔ ومنہا أن ینوءَ علی یَدَیہ ۔۔۔ وینھضَ فی براقیہ الخناءُ

(۱)۔ مشکل الفاظ۔ مسحلان اور حامر = جگہوں کے نام۔ ظلمان ظلیم کی جمع = نر شتر مرغ۔ جآذر۔ جوذرٌ کی جمع = نیل گائے کا بچہ۔ المستأسد = لپٹا ہوا لمبا، القُریان = پانی بہنے کی جگہ۔ الحوّ = بہت ہرا۔ میل = ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا۔ نوّار = کلیاں پھول۔ فاتک البیع = بہت زیادہ بکنے والا الرقم = چھپا منقش کپڑا۔ برود جمع بردۃ = چادر۔

۱۔ یعنی! آدمی پر جب مصیبتیں سخت سیلاب کی طرح آن پڑتی ہیں تو نہ رو کے رکتی ہیں اور نہ ختم ہوتی ہیں۔
۲۔ تمہاری جان کی قسم میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ آدمی کی عمر چاہے کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہو جائے وہ ختم ہو کر رہتا ہے کیوں کہ
۳۔ موت اس کو لے کر ختم کر دیتی ہے اور خود ختم نہیں ہوتی۔
۴۔ آدمی زندگی کے لئے مرتا ہے اس سے عشق کرتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ درازئ عمر محض تکلیفیں اور پریشانیاں ہی ہیں۔
۵۔ کیوں کہ کبھی کبھی درازی عمر کی وجہ سے آدمی اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ اٹھتے وقت اس کو اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر ٹیکنا پڑتا ہے۔

ایک دوسری جگہ جب اس کی بیوی امامہ سوتے سے اٹھ کر اپنی تکلیفیں اور پریشانیاں گنا کر اس کو لعن طعن کرتی ہے۔ تو کہتا ہے کہ امامہ خوا مخواہ مجھے کیوں ڈانٹ رہی ہو کہ آدمی وہی ظاہر کرتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے چاہے اچھی بات ہو یا بری اور پھر زمانہ کی مصیبتوں سے کہاں چھٹکارا مل سکتا ہے۔ کیوں کہ زمانہ کی مصیبتیں مقدر میں ہوتی ہیں ان سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ آدمی کو وہ چیز کبھی نہیں ملتی جس کی وہ خواہش کرتا ہے بلکہ زبردستی اس کو ایسی چیز کی طرف کھینچ کر لے جایا جاتا ہے جس کو وہ بالکل پسند نہیں کرتا۔ اور یہی کہانی تھی حطیئہ کی۔

أَلاهبتْ اما مةُ بعد هدءٍ على لومي وما قَفَّتْ كرا ها
فقلتُ لها أمامَ ذري عتابي فان النفس مُبدِيةٌ نثاها
وليس لها من الحدثان بُدٌّ اذا ما الدهر عن عرضٍ رماها
فهل أخبرتِ أو أبصرتِ نفسا أتاها في تلمسُّها مُناها

اس کے بعد نابغہ کی طرح اپنے کو اس سانپ کا ڈسا آدمی بتاتا ہے جس کا زہر اتنا سخت اور مہلک ہوتا ہے کہ آدمی اس سے جانبر ہو ہی نہیں سکتا۔(۱)

---

(۱) نابغہ نے جب نعمان سے ڈر کر معذرت نامہ لکھا تو اس سے اپنے ڈر کی تصویر یوں کھینچی ہے (باقی اگلے صفحہ)

اور وہ سانپ زمانہ ہے۔

کأنی ساورتنی ذات سُمٍ ‎   نقیع ماتلائمُھار قاھا

آخر میں حطیئہ بھی اس نتیجہ پر پہنچا کہ مال و دولت سب بے کار بس اللہ اور اس کا تقوی آدمی کے کام آتا ہے۔ اللہ بس باقی ہوس

ولستُ اری السعادۃ جمع مالٍ ‎   ولکن التقیَّ ھو السعیدُ

ولتقوی اللہ خیرُ الزاد ذُخرًا ‎   وعند اللہ للاتقی مزید

اور اس کی اس قسم کی باتوں سے بعض نقاد یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ آخری عمر میں وہ سچا اور پکا مسلمان ہوگیا تھا (۱)

اور اس طرح حطیئہ نے بھی اپنے استاذ زہیر بن ابی سلمیٰ کی طرح زندگی سے عقل و حکمت کے موتی چن کر دنیا کے سامنے بڑے خوبصورت انداز اور اسلوب سے بکھیر دیئے ہیں۔

یہ تھا حطیئہ جو دیکھنے میں کیری کیچر کی طرح تھا لیکن جس نے زندگی کی رزم گرم سے علم و فن کے رزم و بزم سے شعر و شاعری کے میدان میں ہر طرح کے پھول کھلائے تھے۔ جس میں مدح و ہجو غزل و نسیب سے لے کر حکمت و فلسفہ سب کچھ ہے اور اس طرح اپنے استاذ زہیر بن ابی سلمیٰ کے کلام کی فن کاری گہرائی صفائی ستھرائی اور قدرت کی بخشی ہوئی طبع رسا اور زبان و بیان میں مہارت کے وہ جوہر دکھائے جن کی وجہ سے اس کا کلام آج تک سند مانا جاتا ہے۔ کیوں کہ حطیئہ کے کلام میں کہیں بھی کوئی کمزوری نہیں ملتی نہ الفاظ میں نہ معانی میں اور نہ ردیف و قافیہ میں۔ چنانچہ اگر اس میں وہ طبعی برائیاں اور دینی خرابیاں اخلاقی کمزوریاں نہ ہوتیں جن کا ذکر اوپر ہوا اور جن کی وجہ سے وہ رسوائے زمانہ رہا۔ تو وہ تمام مخضرم شعراء میں سب سے بڑا شاعر ہوتا (۱) کہتے ہیں کہ اس نے

کہ جیسے مجھے ایسی زہریلی چیز نے ڈس لیا ہے جس کے دانتوں میں سخت زہر بھرا ہے۔ فبتُّ کأنی ساورتنی ضئیلۃ من الرُّقش انیابھا السمّ ناقعٌ

(۱) ڈاکٹر شوقی ضیف: تاریخ الادب العربی العصر الاسلامی ص۹۵،

(۲) الوسیط: احمد الاسکندری و عنانی ص۱۶۳.

سعید بن العاص کے کوفہ پر گورنری کے زمانہ میں وفات پائی (۱)

سب سے پہلے حطیئہ کا دیوان ۱۸۹۰ء میں قسطنطنیہ میں اس کے بعد ۱۸۹۲ء میں لیبسک میں پھر قاہرہ سے ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں چھپا شرح دیوان حطیئہ از ابن السکیت و السکری و سجستانی بتحقیق نعمان امین طہ قاہرہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔

---

(۱) ڈاکٹر شوقی ضیف : تاریخ الادب العربی العصر الاسلامی ص ۹۰۔

حوالہ جات:

۱۔ الشعر والشعراء لابن قُتَیْبَہ۔

۲۔ الاغانی للاصفہانی ۲/۱۶۔

۳۔ العقد الفرید ج ۱ و ۳

۴۔ المستطرف فی کل شی مستطرف للابشہی۔

۵۔ خزانۃ الادب للبغدادی۔

۶۔ جمہرۃ اشعار العرب للقرشی۔

۷۔ طبقات الشعراء لابن سلام الجمحی، ص۸۷۔

۸۔ الکامل للمبرد۔

۹۔ البیان والتبیین مختلف جگہوں پر۔

۱۰۔ الاشتقاق لابن درید۔

۱۱۔ زہر الاداب للحصری ج ۱۔

۱۲۔ تاریخ ابی الفداء ج ۱۔

۱۳۔ دائرہ المعارف: مادۃ الحطیئہ۔

۱۴۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان ج اوّل۔

۱۵۔ حدیث الاربعاء اوّل طہ حسین ص۱۲۲۔

۱۶۔ تاریخ الأدب العربی حنا الفاخوری ص۱۹٤۔

۱۷۔ تاریخ الادب العربی الزیات ص۱۵۵۔

۱۸۔ تاریخ الادب العربی' العصر الاسلامی شوقی ضیف ص۶۵۔

۱۹۔ " " عمر فروخ ص۳۳۱۔

۲۰۔ الوسیط ص۱۶۱۔

۲۱۔ الحیاۃ الادبیہ فی عصر صدر الاسلام: ڈاکٹر عبدالمنعم خفاجی

٢٢- المفصل فی تاریخ الادب العربی: احمد الاسکندری وغیرہ۔
٢٣- شعر المخضرمین واثر الاسلام فیه: یحییٰ الجبوری ص٢٣٢۔
٢٤- الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام ڈ عبداللہ الحامد ص٢٩۔
٢٥۔ فن الهجاء وتطورہ عند العرب: ایلیا حاوی۔
٢٦- الحطیئه فی سیرته وفنه ونفسیته: ایلیا حاوی۔
٢٧- الاصابة فی تمیز الصحابة ٢/٦٣۔

۵۔ حسانؓ بن ثابت الانصاریؓ

سنہ ۶۰ ق ھ مطابق سنہ ۵۶۳ء م سنہ ۵۴ھ مطابق سنہ ۶۷۴ء

پوری عربی ادب کی تاریخ میں شاید اور صدر اسلام میں یقیناً مخضرمین شعراً میں کوئی ایسا شاعر نہیں گذرا جس کو تمام شعراء پر ایک ساتھ تین فضیلتیں حاصل ہوئی ہوں سوائے صحابی اور انصار شاعر حضرت حسان بن ثابت کے۔ چنانچہ اغانی نے مشہور ناقد اور ادیب ابوعبیدہ کا حضرت حسان بن ثابت کے بارے میں ایک جملہ نقل کیا ہے جو حسان کی زندگی ان کے کلام ان کے اسلوب بیان اور ان کے مرتبے کا مختصر لیکن بڑا جامع اور معنی خیز تبصرہ و تجزیہ ہے وہ کہتا ہے "حسان کو تمام شعراء پر تین باتوں میں فوقیت حاصل ہے وہ دور جاہلی میں انصار کے خاص شاعر، نبوت ملنے کے بعد آنحضرتؐ کے خاص شاعر اور ظہور اسلام کے بعد پورے یمن کے خاص شاعر تھے (۱)

دور جاہلی میں حسان کے اسی مرتبہ اور انصاری شعراء میں ان کی اسی قدر و منزلت اور حیثیت کی وجہ سے مشہور شاعر الشماخ کا بھائی مزرد، کعب بن زہیر کے مقابلے میں ان کا نام لے کر فخر سے یہ کہا کرتا تھا کہ ارے جاؤ تم نہ حسان بن ثابت کی طرح تیز تلوار جیسے (شاعر) ہو اور نہ شماخ اور مخبل کی طرح" اور چلے ہو مجھ سے مقابلہ کرنے (۲) کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی"

فلست کحسان الحسام ابن ثابت   ولست کشماخ ولا کالمخبل

اس طرح حسان دور جاہلی کے ممتاز شعراء کے طبقے میں اب وہ تنہا شاعر رہ گئے تھے

---

(۱) الاغانی للاصفہانی جلد ۴۔ (۲) الشعر والشعراء لابن قتیبہ ص ۲۳۔

جن کا لبید بن ربیعہ، کعب بن زہیر اور حطیئہ کو چھوڑ کر مقابلہ تو کیا ہم سری کا دعویٰ بھی کوئی شاعر نہیں کر سکتا تھا۔ (۱) اور اسی وجہ سے کسی کو صدر اسلام میں وہ امتیازی شان اور حیثیت نہ حاصل ہو سکی اور کسی نے دعوتِ اسلام کا اس طرح جم کر ساتھ نہیں دیا۔ جس طرح حسان نے دیا۔ کہ نہ صرف شاعر نبی کے لقب سے سرفراز ہوئے بلکہ ان کی ذات سے اسلام میں پہلی دفعہ شاعر اور شعر کو اتنی اہمیت، حیثیت اور عزت ملی کہ آنحضرتؐ نے اپنے منبر سے قریش کی ہجو میں کہے گئے اشعار کو حضرت حسان کے منہ سے سنا اور فرطِ مسرت میں فرمایا شاباش کہے جاؤ! روح القدس تمہاری مدد کریں۔ (۲) یا ان کی ہجو کئے جاؤ جبرئیل تمہارے ساتھ ہیں۔" (۳)

حسان کی کنیت ابو الولید اور باپ کا نام ثابت تھا کبھی ابو عبدالرحمٰن اور کبھی ابو الحسام بھی کنیت کرتے تھے حسان کا نسبی تعلق مدینہ کے دونوں مشہور انصاری قبیلوں نجار اور خزرج سے جا ملتا ہے۔ قبیلہ خزرج کا تعلق قبیلہ ازد سے تھا جو قحطانی یعنی یمنی قبیلہ تھا اس طرح حسان نجاری خزرجی اور یمنی تھے (۴)

ان کی ماں کا نام الفُرَیْعَہ بنت خالد بن حبیش تھا جن کا سلسلہ نسب بھی انصار کے دوسرے مشہور قبیلہ خزرج سے جا ملتا ہے حسان کے باپ ثابت اور ان کے دادا المنذر اپنی قوم کے ممتاز لوگوں میں تھے اور قبیلہ اوس و خزرج کے حاکموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے دادا کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت نیک طبع صلح پسند امن جو اور مخلص آدمی تھے چنانچہ مدینہ کے قریب واقع ایک تالاب میں چھڑی جنگ کے بعد جس کو جنگ سمیحہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اوس اور خزرج

---

(۱) شعر المخضرمین واثر الاسلام فیہ: یحیی الجبوری ٦٤۔

(۲) العقد الفرید ۵/۲۹۴ اور زہر الآداب للحصری ۱/۶۲ اور دلائل الاعجاز بحوالہ شعر المخضرمین ص۱۶۴،

(۳) طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی ص۱۸۱،

(۴) پورا سلسلہ نسب یوں ہے: ابو الولید حسان بن ثابت بن المنذر زید مناۃ بن عدی جن کا تعلق ابن نجار کے بنو مالک سے تھا اور نجار کا نام تیم اللہ بن ثعلبہ بن عمرو بن الخزرج تھا اس طرح نجاری ہونے کے ساتھ حسان خزرجی اور یمنی بھی تھے۔
قحطانیوں سے متعلق ضروری معلومات کے لئے دیکھیے اس کتاب کا حصہ اول ص۳۵ و ص۳۲

میں خون بہا اور معاوضہ دینے کے مسئلے میں اختلاف جب بہت بڑھ گیا تو انھوں نے اپنی قوم خزرج کے خوں بہا کو معاف کرا دیا۔ اور اوس کے مقتولین کا خون بہا اپنے ذمہ لے کر اپنے مال سے ادا کر کے اس جھگڑے کو رفع دفع کر دیا ورنہ شاید پھر انصاری شعراء میں حضرت حسان کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے ننہیالی رشتہ داروں میں سے بھی تھے کیوں کہ آنحضرتؐ کے دادا عبدالمطلب کی ماں بنو نجار خاندان کی تھیں۔ اور بنو نجار کا تعلق بنو خزرج سے بھی تھا اس طرح دونوں خاندانوں کے واسطہ سے حسان کی آنحضرتؐ سے ننہیالی رشتہ داری ہوتی تھی (۱)

حسانؓ ہجرتِ نبوی سے تقریباً ساٹھ سال پہلے مدینہ میں ۵۶۳ء میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے اور جوانی کے بعد جب شعر و شاعری کے بال و پر نکلے تو اپنے قبیلے خزرج کے شاعر اس کی عزت و ناموس کے محافظ اور مفاخر کو اجاگر کرنے والے نقیب بن کر چکے اوس کے دونوں شاعر ابو قیس بن اسلت اور قیس بن الحطیم سے معرکہ آرائی ہوئی اور اپنی قوم کی جنگوں اور معرکوں میں بھی شریک ہوئے۔ جب ذرا شہرت بڑھی تو غسانی اور منذری بادشاہوں کی شان میں مدحیہ قصائد لکھ کر لے جاتے اور انھیں سنا کر انعام و اکرام حاصل کرتے ان کے خاص ممدوح غسانی بادشاہوں میں سے آل جفنہ تھے کیوں کہ وہ پڑوسی اور رشتہ دار تھے۔ اس طرح زمانہ جاہلی میں عیش و عشرت کی زندگی گزارتے تھے انھیں درباروں میں ان کی اس زمانے کے بعض نامور شعراء جیسے نابغہ الذبیانی وغیرہ سے شعری مقابلے اور جھڑپیں بھی ہو جاتی تھیں۔

---

(۱) غالباً انھیں رشتہ داروں سے ملنے آنحضرتؐ کی والدہ آمنہ مدینہ تشریف لے گئی تھیں۔ جہاں سے واپسی میں موضع "ابوا" میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ تفصیل کے لئے دیکھئے (سیرت النبیؐ اول علامہ شبلی نعمانی۔ اور سیرت کی دوسری کتابیں)۔

بادشاہوں اور امراء کی شان میں مدحیہ قصیدے کہہ کر انعام واکرام حاصل کرنا اس زمانے میں کوئی معیوب بات نہ تھی۔ چنانچہ پہلے گذر چکا ہے کہ زمانہ جاہلی میں اعشیٰ اور نابغہ اور حطیئہ (مخضرم) وغیرہ شاہان حیرہ اور نجران کی شان میں مدحیہ قصیدے کہہ کر انعام واکرام حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلے کرتے تھے۔ (۱)

حضرت حسان کا سب سے شاندار اور ان کے کلام کا سب سے اچھا اور اعلیٰ نمونہ بھی اسی شعری مقابلے کی دین ہے۔ جسے انھوں نے آخری غسانی بادشاہ کی شان میں کہا تھا۔

روایت یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت حسان شام کے غسانی بادشاہوں میں سے عمرو بن الحارث کے دربار میں حسب عادت پہنچے تو دیکھا کہ وہاں زمانہ جاہلی کے معلقات کا مشہور شاعر نابغہ الذبیانی اور علقمہ بن عبدہ پہلے سے موجود ہیں جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ غسانی بادشاہوں کو مدینہ کے پڑوس اور انصاریوں سے یمنی ہونے کے ناتے رشتہ داری اور قرابت کے خیال سے حضرت حسان سے بڑا لگاؤ اور تعلق خاص تھا۔ عمرو کو خیال ہوا کہ کہیں ان دو مشہور اور زبردست شاعروں کے مقابلے میں حسان کی سبکی نہ ہو جائے اس لئے اس نے چپکے سے حسان سے کہا کہ آپ کو شعر پڑھنے کی ضرورت نہیں میں آپ کے پاس ویسے ہی معقول انعام واکرام بھجوا دوں گا مجھے خطرہ ہے کہ یہ دونوں درندے (نابغہ اور علقمہ) آپ کے مقابلے میں اچھے اشعار پڑھ کر آپ کی بے عزتی نہ کریں تو حسان بولے کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں ضرور اپنا کلام سناؤں گا۔ چنانچہ ان دونوں شاعروں سے شعر پڑھنے کی اجازت لی اور اپنا وہ مشہور قصیدہ پڑھا جس کا مطلع ہے ؎

أسألتَ رسمَ الدارِ ام لم تسألِ   بين الجوابي فالبُضيع فحوملِ

اور جس میں آل غسان کی مدح کرتے ہوئے۔ وہ مشہور اشعار کہے ہیں جو مدحیہ قصائد میں نمونے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں جن کی ابتداء اس شعر سے

---

(۱) تفصیلات اس کتاب کے حصۂ اوّل میں مذکورہ شعراء کی حالاتِ زندگی میں ملاحظہ کیجئے۔

ہوئی ہے ؂

بِلّٰہِ درُّ عِصابۃٍ نادمتُہم یوماً بجلّقَ فی الزمانِ الاوّلِ (۱)

خدا بھلا کرے ان لوگوں کا جن کے ساتھ میں نے جلق (دمشق) میں گذشتہ زمانے میں زندگی گذاری۔

چنانچہ کہتے ہیں کہ عمرو نے ان کے قصیدہ کو نابغہ کے قصیدہ پر فوقیت دی۔ شاہان غسان حسان کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی ہر سال ان کا وظیفہ مستقل بھیجتے رہے حالاں کہ وہ لوگ بدستور عیسائی رہے۔

اس طرح زمانہ جاہلیت میں حسان کی زندگی اپنی قوم کے کارناموں کو بیان کر کے فخر کرنے قبیلہ کے مخالف اور حریف شعراء سے شعری نبرد آزمائی کرنے اور ان کے قبیلہ خزرج اور اوس کے درمیان چھڑی جنگوں میں شریک ہونے اور غسانی اور حیرہ کے بادشاہوں کی تعریف کرنے اور ان کے درباروں کے راگ و رنگ اور شراب و کباب کی مجلسوں میں شرکت اور ان کی تصویر کشی کرنے اور ان سے انعام و اکرام لے کر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے میں گذر رہی تھی اور کاروان عمر نے سکون و اطمینان کے ساتھ منزل مقصود کا آدھا راستہ طے کر لیا تھا کہ ساٹھ سال کی عمر میں ایک ایسا تاریخی واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کے دھارے کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور وہ واقعہ تھا اسلام کا جزیرہ نمائے عرب میں ظہور جس کے بعد حسان اور ان کی شاعری اسلام اور آنحضرت ؐ کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ان کی زبان میں قرآن کے اثر سے بڑی شیرینی اور معانی و مطالب میں گہرائی کے ساتھ پاکیزگی و رعنائی بھی آ گئی۔

مکہ والوں کی دشمنی اور ان کی سخت ایذا رسانی سے تنگ آ کر جب آنحضرت خدا کے حکم سے مکہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر گئے تو مدینہ والوں کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ جنھوں نے اسلام قبول کیا حسان بھی مسلمان ہو گئے۔ اور آنحضرت کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اپنی ساری صلاحیتیں آپ ؐ کے لئے وقف کر دیں۔ جس کا انعام

(۱) اس قصیدہ پر گفتگو بعد میں آئے گی۔

یہ ملا کہ آپ کو سب سے پہلے "شاعر رسول" اور شاعر اسلام کا خطاب ملا جس کے بعد حسان رسول اللہ کے مخالف مکی شعراء کے سامنے اپنی زبان و قلم سے سینہ سپر ہو کر آگئے اور اس کام میں حضرت جبرئیل کی مدد کے اعزاز سے نوازے گئے۔

مکہ والوں میں جو لوگ آنحضرت اور انصاریوں کی ہجو کہتے تھے ان میں تین آدمی بہت پیش پیش تھے۔ عبداللہ ابن الزبعری (۱) ابو سفیان بن الحارث بن عبدالمطلب اور عمرو بن العاص یہ لوگ اپنی قوم اور مکہ میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کے ساتھ کچھ چھٹ بھیئے آنحضرت کی مخالفت کے زعم میں ان کے ساتھ لگ گئے ان میں قابل ذکر ضرار بن الخطاب، ابو عزہ الجمحی جو جنگ احد میں گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا تھا۔ ہبیرہ بن ابو وہب القرشی اور اس زمانے کا ایک فلسفی اور شاعر امیہ بن ابی الصلت (۲)

چنانچہ جب مکہ والوں نے مکہ چھوڑ دینے کے بعد بھی ایک طرف تلوار سے اور دوسری طرف زبان سے آپ کا پیچھا نہ چھوڑا تو آپ نے بھی دونوں حربے استعمال کیئے چنانچہ زبان کے حربے کے استعمال کے لیئے آپ نے جب یہ فرمایا کہ جن لوگوں نے رسول اللہ کی اپنے ہتھیاروں سے مدد کی ہے (یعنی انصاری) انھیں اب زبانوں سے ان کی مدد کرنے میں کونسی چیز مانع ہے؟ تو حضرت حسان آگے بڑھے اور انھوں نے کہا کہ حضور میں اس کام کے لئے حاضر ہوں" اور اپنی زبان کو پکڑ کر کہا کہ خدا کی قسم اب اس کے ذریعے بُصریٰ اور صنعاء کے درمیان کسی دوسری بات سے مجھے خوشی نہ ہوگی" یعنی اب یہ زبان صرف آپ کی طرف سے مدافعت اور آپ کی طرف سے زبانی جنگ کے لیئے وقف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ لیکن تم مکہ والوں کی ہجو کرو گے کیسے! کیوں کہ میں بھی تو انھیں کا ایک فرد ہوں؟ اس پر حسان نے کہا کہ "حضور اس کی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو ان میں سے اس صفائی سے نکال لوں گا جس طرح گندھے ہوئے آٹے سے بال نکال لیا جاتا ہے" اس پر آپ نے فرمایا" اچھا جاؤ۔ خدا جبریل کے ذریعے تمہاری مدد کرے۔

---

(۱) اس کی سیرت کے لیئے دیکھیئے اس کتاب کا ص

(۲) اس کی سیرت کے لیئے دیکھیئے اس کتاب کا حصہ اول ص ۳۸۲

چنانچہ حضرت حسان اسی دن سے اپنی زبان سے آپؐ کی ڈھال بن گئے اور آنحضرتؐ کے وصال کے وقت تک اپنی زبان کی تلوار لیئے میدان شعروشاعری میں ڈٹے رہے اور آپؐ کی طرف سے مکہ والوں کو ایسے منہ توڑ جواب دیتے رہے کہ مکہ والوں کے چھکے چھوٹ گئے۔

اغانی کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ہجو شروع کرنے سے پہلے ابوبکر کے پاس جاؤ وہ تمہیں مکہ والوں کے بارے میں پوری تفصیلات بتادیں گے۔ ان کی جنگوں اور ان کے حسب و نسب کے بارے میں پوری معلومات فراہم کردیں گے۔ پھر ان کی ہجو کرو جبرئیل تمہارے ساتھ ہیں (۱) آنحضرتؐ نے یہ بات اس لئے کہی تھی کہ آپؐ خود بھی مکی اور قریشی تھے اور حسان مدنی اور انصاری تھے۔ اور مکہ والوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے اس لئے خطرہ تھا کہ کہیں ایسی بات ہجو میں نہ کہہ جائیں جس میں آنحضرتؐ یا آپؐ کے قریبی رشتہ داروں پر چوٹ پڑ جائے جس کا اظہار آپ نے حسان سے کردیا تھا۔ چنانچہ حسانؓ جب ابوبکرؓ کے پاس آئے تو انھوں نے حسان کو قریش کے حسب نسب کے بارے میں معلومات دے کر ان کی چھپی ڈھکی برائیاں اور برے بھلے لوگوں کی نشاندہی کی۔ اور کہا کہ دیکھو فلاں شخص کی برائی نہ کرنا اور فلاں شخص کی کرنا اور فلاں عورت کی برائی نہ کرنا۔ اور فلاں عورت کا ذکر کرنا یہ اس لئے کہ کہیں رسول اللہ پر آنچ نہ آجائے۔ چنانچہ حسان نے مکہ والوں اور قریشیوں کی اس طرح ہجو کی اور اس طرح ان کی بے عزتی کی کہ وہ سن کر تلملا اٹھتے تھے لیکن آنحضرتؐ پر چھینٹ بھی نہیں پڑتی تھی۔ چنانچہ حسانؓ نے اس کے بعد جب ابوسفیان بن الحارث بن عبدالمطلب کی ہجو کی جس میں کہتے ہیں ؎

إنّ سنام المجد من آل هاشم — بنو بنت مخزوم و والدک العبد

تو قریشیوں میں آگ لگ گئی اور وہ چیخ اٹھے کہ ہم سے چھوٹ کر ابن ابی قحافہ (ابوبکرؓ) نے شعر کہنے شروع کردیئے" چنانچہ آنحضرت فرماتے تھے کہ یہ (اس قسم کے ہجویہ اشعار) مکہ والوں کے لئے تیروں سے زیادہ تکلیف دہ ہیں۔"

---

(۱) الاغانی للاصفہانی ۴/۱۳۷، اور سیرت کی دوسری کتابیں۔

ایک روایت میں ہے کہ جب مکہ والوں کی ہجو سے مسلمانوں کا ناک میں دم ہوگیا تو ایک صحابی نے حضرت علی سے کہا کہ آپ ان لوگوں کی ہجو کیجیے جو ہماری ہجو کرتے ہیں تو حضرت علی نے فرمایا کہ ہاں کروں گا بشرطیکہ آنحضرت اجازت مرحمت فرمادیں۔" تو ایک آدمی نے آنحضرتؐ سے کہا کہ آپ ﷺ کو اجازت دے دیں کہ ہماری طرف سے ان لوگوں کی ہجو کریں جو ہماری ہجو کرتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ نہیں ان (حضرت علی) کے پاس وہ نہیں ہے" یعنی وہ ہجو یہ کلام جس طرح سے ہونا چاہیئے نہیں کہہ سکتے ہیں چنانچہ حضرت علی اور سب لوگ خاموش ہو گئے اور یہ کام حضرت حسان کے سپرد ہوا۔

جس طرح مکہ میں رسول اللہ کے خلاف شعراء کی ایک ٹیم کھڑی ہوگئی تھی اسی طرح مدینہ میں انصاری شعراء کی ایک ٹیم بن گئی تھی جن میں حضرت حسان کے علاوہ دو شاعروں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک کعب بن مالک اور دوسرے عبداللہ بن رواحہ جن کے بارے میں بعد میں گفتگو ہوگی۔

زبان و قلم کے اس معرکے میں حضرت حسان خاص طور سے اور کعب بن مالک عام طور سے مکہ والوں کی جنگوں میں شکستوں، معرکہ کارزار سے بھاگ کھڑے ہوئے اور ان کی بزدلی اور بخل کے قصوں کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتے تھے۔ اور ان کی بداخلاقیوں بے حیائیوں حسب نسب میں ملاوٹوں کمزوریوں اور برائیوں کو اچھالتے تھے جنھیں سن کر مکہ والوں کے مرچیں لگتی تھیں۔ اور بھنّائے بھنّائے پھرتے تھے لیکن کرتے کچھ نہ بن پڑتی تھی۔ مگر مسلمان اس انتقام اور مکہ والوں کی اس بدحواسی سے بہت خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت نے ایک دفعہ فرمایا۔ کہ میں نے عبداللہ بن رواحہ کو قریش کی ہجو کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے ہجو کی اور اچھی ہجو کی۔ اسی طرح میں نے کعب بن مالک سے ان لوگوں کی ہجو کرنے کو کہا تو انھوں نے بہت خوب ہجو کی پھر میں نے حسان بن ثابت سے اس کی فرمائش کی تو انھوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور میرے دل کی بھی" یہ اس لئے کہ حسان عبداللہ بن رواحہ کی طرح قریشیوں کے کفر اور شرک کا ذکر کرکے ان کو عار نہیں دلاتے تھے کہ اس کا ان کے اوپر بہت کم اثر ہوتا

کیوں کہ وہ تو کافر اور مشرک تھے ہی۔ اور اس پر ان کو نہ کوئی شرمندگی تھی نہ خجالت بلکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا وہ ان کے حسب نسب کی برائیوں ان کی بے ہودگیوں بد اخلاقیوں وغیرہ کے قصوں کو تاریخ میں سے ڈھونڈ نکالتے تھے اور ان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ اور یہ ہجویہ قصائد صحراء کی آگ کی طرح قبائل عرب میں پھیل کر قریشیوں کی بے عزتی کا سبب بن جاتے اور یہ قصے ان کی صدیوں کی عزت وناموس پر کالک لگا دیتے تھے اسی لئے آنحضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ انداز ہجو قریش والوں کے لئے اتنی سخت تکلیف دہ ہے جیسے گھور اندھیری رات میں کسی پر تیز تلوار سے اچانک بھرپور وار کردیا جائے۔ چنانچہ روایت ہے کہ مکی جب تک اسلام نہیں لائے تھے حسان اور کعب کے ہجویہ کلام سے تلملاتے رہے اور ابن رواحہ کے ہجویہ کلام کی جس میں ان کے کفر و شرک کا ذکر ہوتا تھا پرواہ بھی نہیں کرتے تھے لیکن جب مسلمان ہو گئے اور اسلام اور اس کی تعلیمات سیکھ لیں اور ان میں ان کی گہری نظر ہو گئی تو اب ان کو عبداللہ بن رواحہ کے ہجویہ کلام سے حسان اور کعب کے ہجویہ کلام کے مقابلے میں بہت زیادہ تکلیف ہوتی تھی کیوں کہ اب ہر وقت ان کو اپنے کفر و شرک اور اس زمانے میں جو کیا اس پر شرم آیا کرتی تھی۔

دربار نبوت سے مکہ والوں کی ہجو کرنے کی اجازت ملنے کے بعد حضرت حسان نے سب سے پہلے جس مکی شاعر کا جواب دیا اور اس طرح اسلام اور آنحضرت کی طرف سے شعر کے ذریعے سب سے پہلے مدافعت کرنے کی سعادت حاصل کی وہ ضرار بن الخطاب بن مرداس کے اشعار کا جواب تھا۔ ضرار قریش کا مشہور شاعر اور ان کا مانا ہوا شہسوار تھا۔

جب عقبہ (۱) کی دوسری بیعت ہوئی اور آنحضرت نے مدینہ والوں میں سے بارہ نقیب مقرر کئے کہ وہ آپ کے لئے اور اسلام کے لئے مدینہ میں کام کریں۔ اور ہجرت سے پہلے میدان ہموار کر رکھیں تو ان نقیبوں میں سعد بن عبادہ اور

---

(۱) عقبہ کی پہلی اور دوسری بیعت کی تفصیل سیرت نبوی کی کتابوں میں پڑھیئے۔

المنذر بن عمرو کو مدینہ واپس جاتے وقت راستہ میں قریش والوں نے پیچھا کر کے پکڑنے کی کوشش کی۔ منذر تو کسی طرح سے جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے مگر سعد بری طرح پکڑے گئے۔ چنانچہ قریش والے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کو مکہ لے کر پہنچے یہاں ان کو جبیر بن مطعم اور الحرث بن حرب بن امیہ نے قید سے رہائی دلائی اس موقع پر ضرار نے یہ دو شعر کہے تھے۔

تداركتُ سعداً عنوةً فأخذتُه ... وكان شفاءً لو تداركتُ منذرا

ولو نلتُه طُلّت هناك جراحه ... وكان حريّاً ان يُهان ويُهدرا

یعنی میں نے سعد کو جا پکڑا اگر منذر کو بھی پکڑ لیتا تو دل کے ارمان پورے ہو جاتے کیوں کہ اگر میں اس کو پکڑ پاتا تو پھر اس کے خون کا بدلہ لینے والا کوئی نہ ہوتا وہ اسی قابل تھا کہ اس کی بے عزتی کی جائے اور اس کا خون هدر کر دیا جائے یعنی کوئی خوں بہا لینے والا نہ ہو۔ اس کا جواب دیتے ہوئے حسان نے خوب چبھتی باتیں کہیں ؎

لستَ إلى سعدٍ ولا المرءِ منذرٍ ... إذا ما مطايا القوم أصبحن ضُمَّراً

فلا تكُ كالوَسْنان يحلم أنه ... بقرية كسرى او بقرية قيصرا

یعنی جب قوم کی اونٹنیاں شب و روز چلتے چلتے کمزور اور دبلی پتلی ہو چکی ہوتیں یعنی میدان جنگ میں پہنچ چکی ہوتیں تو تمہارا اور سعد اور منذر کا کیا مقابلہ تھا یعنی تم بہادری میں ان دونوں کے پاسنگ بھی نہیں ہو۔ اس لیے تم اس سوتے ہوئے آدمی کی طرح خام خیالی کی باتیں نہ کرو۔ جو خواب میں دیکھ رہا تھا کہ وہ قیصر اور کسری کے شہروں میں پہنچ گیا ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ اور تمہارے کلام کی یہ حالت ہے کہ وہ اتنے رکیک کمزور اور مہمل ہیں کہ اگر ابو وہب ان کو ہمیں نہ سناتا تو شاید وہ بادر ہوا ہو جاتے اور کوئی انھیں جان بھی نہ پاتا (کیوں کہ اس زمانے میں اچھے اشعار بجلی کی رو کی طرح سارے قبائل عرب میں پھیل جاتے تھے)۔

فلولا أبو وهبٍ لمرّت قصائد ... على شرف البرقاء يهوين حُسّرا

اس لیے ہم لوگوں سے الجھ کر خواہ مخواہ اپنے ہاتھوں اس بکری کی طرح اپنی موت کو

نہ بلاؤ جس نے اپنے ہی کھروں سے زمین کھود کر چھری کی نشاندہی کی، پھر اسی چھری سے ذبح کی گئی (۱)

ولاتک کالشاۃ التی کان حتفہا بحفر ذراعیہا فلم ترض محفرا (۲)

دوسرا موقعہ وہ خونیں معرکہ تھا جو اسلام اور مکہ والوں کے درمیان قول فیصل بن گیا یعنی معرکہ بدر جس میں مسلمانوں کی کامیابی نے صرف تاریخ اسلام ہی نہیں بلکہ انسانی تاریخ کے دھارے کو بدل دیا۔ ورنہ شاید آج اسلام اور مسلمانوں کا وجود روئے زمین پر نہ ہوتا (۳)

معرکہ ختم ہو چکا ہے۔ قلیب (گڑھے) میں مکہ والوں کی لاشیں پٹی پڑی ہیں جن میں ایک سے ایک مکی سردار مقتول پڑا ہے اتنے میں آنحضرتؐ تشریف لاتے ہیں اور چند مختصر لیکن بہت ہی مؤثر جملے ان کے انجام اور خدا کے وعدہ پورا کرنے کے بارے میں فرماتے ہیں اور پھر مخاطب کر کے پوچھتے ہیں "خدا نے جو وعدہ تم سے کیا تھا اسے تم نے سچ پایا کہ نہیں؟" اس پر لوگ تعجب سے پوچھتے ہیں کہ آپ مُردوں سے باتیں کر رہے ہیں؟ تو آپؐ فرماتے ہیں کہ ان سب کو معلوم ہو گیا کہ ان کے رب نے جو وعدہ ان سے کیا تھا وہ سچ تھا (۴)

---

(۱) اس شعر سے حضرت حسانؓ مشہور عربی مثل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک آدمی صحرا میں کئی روز سے بھوکا پیاسا مارا مارا پھر رہا تھا اتفاق سے اسے ایک بکری مل گئی لیکن ذبح کس چیز سے کرے نہ اس کے پاس چھری نہ چاقو۔ اتنے میں بکری نے اپنے کھروں سے زمین کھودنی شروع کی تھوڑی دیر کے بعد گڑھے میں ایک چھری دکھائی دی۔ آدمی نے چھری لے اس بکری کو ذبح کیا اور بھون کر خوب سیر ہو کر کھایا اس مثل کو ایسے موقعہ پر کہتے ہیں جب آدمی خود ہی اپنی موت کا سبب بن جائے۔

(۲) اس قصیدہ میں سات شعر ہیں اور ہر ایک انتہائی چبھتا ہوا۔ دیوان میں ملاحظہ کیجیے ص ۱۰۹ پر۔

(۳) رسول اللہ ؐ کی مدینہ میں ہجرت کے بعد مکہ والوں سے سب سے پہلی جنگ جس میں مسلمان صرف ۳۲۲ تھے اور مکہ والے ہزاروں کی تعداد میں لیکن مسلمانوں کو عظیم الشان فتح اور مکہ والوں کو سخت ذلت آمیز شکست ہوئی تفصیل سیرت نبویؐ یا غزوات نبوی کی کتابوں میں دیکھیے۔ (۴) تفصیل سیرت ابن ہشام میں ہے ابن ہشام نے غزوہ بدر سے متعلق حسان کے ۹ قصائد کا ذکر کیا ہے۔

اس مہیب اور عبرت ناک موقعہ پر حسان نے اپنا وہ قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے

عرفت دیار زینب بالکثیب　　کخط الوحی فی الورق القشیب

اس قصیدہ میں سولہ اشعار ہیں جس کو جاہلی ریت کے مطابق اپنی محبوبہ زینب کے دیار کے ذکر سے شروع کیا ہے اور جن میں ابوجہل عتبہ اور شیبہ کے قتل کے ذکر کے بعد آخر میں کہتے ہیں کہ جب ہم نے ان مکہ والوں کی لاشوں کو قلیب کے گڑھے میں پھینک دیا تو آنحضرت نے ان کو پکار کر کہا کہ کیا تم نے میری بات سچ نہیں پائی اور اللہ کا حکم تو دلوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے مگر بیچاروں کے منہ سے ایک بات بھی نہ نکلی اور اگر کچھ کہنے کی سکت ہوتی تو یقیناً وہ یہی کہتے کہ آپ نے سچ کہا اور آپ کی ہی رائے صحیح تھی ؎

یناديهم رسول الله لما　　قذفناهم كباكب في القليب
ألم تجدوا حديثي كان حقاً　　وأمر الله يأخذ بالقلوب
فما نطقوا ولو نطقوا لقالوا　　صدقت وكنت ذا رأي مصيب

چوں کہ معرکۂ بدر آنحضرت اور مکہ والوں کی پہلی مدبھیڑ اور حق و باطل کا پہلا معرکہ تھا، اور اس اعتبار سے تاریخ ساز کہ ایمان و یقین سے بھرپور گنتی کے چند لوگوں نے جن کے اسلحہ اور ساز و سامان کا یہ عالم تھا کہ پوری فوج میں صرف ۲ یا ۳ گھوڑے تھے۔ مکہ والوں کے ہزاروں لشکر جرار کو ایسی شکست فاش دی کہ جنگوں کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جس میں مکہ والوں کے نامی گرامی سردار اور جانے پہچانے بہادر کھیت رہے اور ان میں سب کا سردار ابوجہل بھی تھا جسے دو انصاری کم سن نوجوانوں نے مل کر قتل کیا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر حسان نے اس معرکہ سے متعلق کئی قطعات کہے جس میں مکہ والوں اور ان کے ساتھی شعراء کی خوب خبر لی ہے۔ اور اس پر فخر کیا ہے کہ ہم انصاریوں نے نہ صرف آنحضرت کا ساتھ اپنے گھر اور اپنے شہر میں دیا بلکہ بدر میں اپنے گھر سے نکل کر بھی ساتھ دیا اور اس طرح کہ سب سے بڑے دشمن ابوجہل کی گردن ہمارے بچوں نے کاٹ کر رکھ دی وغیرہ۔ حسان نے اس جنگ اور اس کے عبرت ناک انجام کے

پیش نظر مذکورہ بالا قصیدہ کے علاوہ ایک دوسرا بہت شاندار قصیدہ بھی کہا جس کا قافیہ میم کا ہے جس کا مطلع ہے ؎

تبلتْ فؤادَک فی المنام خریدۃٌ   تسقی الضجیعَ ببارِدٍ بسّامِ (۱)

دیگر باتوں کے علاوہ یہ قصیدہ تشبیب اور محبوبہ کے تقوی شکن سراپے کا بہترین نمونہ بھی ہے۔

اور جب احد کا موقع آیا جس میں مسلمانوں اور اسلام کے سب سے بڑے پُر جوش حامی اور آنحضرتؐ کے عزیز چچا حضرت حمزہ شہید ہوئے اور ان کی لاش کی تکا بوٹی کر دی گئی۔ تو حضرت حسان نے قلم کے تلوار سے اس معرکہ میں بھی شرکت کی اور بقول ابن ہشام اس موقعہ پر ایسا بولتا ہوا قصیدہ کہا جو ان کے کلام کا بہترین نمونہ ہے اس کا مطلع ہے ؎

منعَ النومَ بالعشاءِ الهمومُ   وخیالٌ إذا تغورُ النجومُ

یعنی رات کو رنج و غم اور پریشان کن خیالات کی وجہ سے میری آنکھ جھپک پائی

اس قصیدہ میں ۲۲ اشعار ہیں آگے چل کر حسان نے حیرہ کے بادشاہ کے دربار میں اپنی مجالس کا ذکر کیا ہے۔ پھر اپنے باپ ماموں اور خود اپنی ذات پر فخر کے بعد عبداللہ بن الزبعری مشہور دشمن رسولؐ کا ذکر کیا ہے پھر بنو عبدالدار بن قصی کے جنگ احد میں صبر اور بنو مخزوم کی شکست کا تذکرہ ہے۔ اور جنگ کی دوسری تفصیلات ہیں۔

یہ قصیدہ خود حسان کو اتنا پسند تھا کہ بقول ابن ہشام (۲) انھوں نے رات کو اپنی قوم کو بلایا اور کہا "مجھے ڈر ہوا کہ صبح کرنے سے پہلے رات کو ہی میری موت نہ آجائے تو تم لوگ میرے اس قصیدہ کی روایت نہ کر سکو" اس کے بعد یہ قصیدہ اسی وقت سب کو سنایا جو جاہلی رنگ پر ان کے کلام کا بہترین نمونہ ہے۔

---

(۱) دیوان حسان ص ۲۱۴۔

(۲) سیرت ابن ہشام اور دیوان حسان بن ثابت مطبوعہ بیروت۔

اس جنگ میں حضرت حمزہ کو قتل کر کے ان کی لاش کو نہ صرف بگاڑ دیا تھا بلکہ ابو سفیان کی بیوی ہند نے ان کا کلیجہ تک نکال کر کچا چبا لیا تھا۔ اس موقعہ پر حضرت حسان نے ان کا بہت ہی دردناک مرثیہ بھی کہا ہے جس کو انھوں نے جاہلی انداز سے شروع کیا ہے اور گریز کر کے مرثیہ پر آئے ہیں مطلع ہے ؂

أتعرف الدار عفا رسمها — بعدک صوب المسبل الهاطل

یعنی محبوبہ کے قیام کی جگہ پر جس کے نشانات اس کے جانے کے بعد مٹ گئے ہیں۔ موسلا دھار بارش نہ ہوئی یہ بات سوالیہ انداز میں کہی ہے اس کے بعد کہتے ہیں کہ میرے سوال کا جواب نہ ملا تو میں نے اپنے دل سے کہا کہ ارے ان بھولی بسری باتوں اور محبوبہ کے دیار کو جس کے نشانات کا بھی اب وجود نہیں ہے چھوڑ و اور سخی ان داتا، بے مثال بہادر شیر دل جاں باز اور جیون ہار حمزہ پر روؤ جسے بڑی بے دردی سے وحشی نامی غلام نے قتل کر دیا تھا۔ اور جس کے قتل ہو جانے کے بعد زمین پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور چاند کی ضیا پاشی تاریکی اور ظلمت میں بدل گئی پھر اس کے بعد ہند بنت عتبہ بن ربیعہ سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ اتنا نہ اتراؤ ابھی اپنے باپ کے قتل ہونے پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو بہاتی رہی (۱) کہتے ہیں ؂

دع عنک دارا قد عفا رسمها — وابک علی حمزة ذی النائل

اظلمت الارض لفقدانه — واسود نور القمر الناصل

لا تفرحی یا هند واستحلبی — دمعا و اذری عبرة الثاکل

وابکی علی عتبة إذ قطه — بالسیف تحت الرهج الجائل

اور جب آنحضرت اور مسلمانوں کو وہ فتح حاصل ہوئی جس نے صرف ملک عرب ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد سارے عالم میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا یعنی ۸ھ میں مکہ فتح ہوا اور جہاں سے بے یار و مددگار کسمپرسی کے عالم میں آنحضرت نکلے تھے

(۱) حضرت حمزہ نے جنگ بدر میں ہند کے باپ عتبہ بن ربیعہ کو قتل کیا تھا اس لئے اس نے جوش انتقام میں حضرت حمزہ کا کلیجہ چبا لیا تھا۔

وہاں فتح اور نصرت کے شادیانے بجاتے داخل ہوئے اور سرداران قریش سرنگوں آپ کے سامنے قطار میں کھڑے تھے تو حضرت حسّان نے سب سے پہلے اس خوشی کا ترانہ گایا جس نے سارے مسلمانوں اور خود آنحضرت کے دل میں خوشی کی لہر دوڑا دی اور زبان سے شکر الہٰی کے کلمات جاری ہو گئے۔ اس قصیدہ کو بھی جاہلی انداز کے مطابق محبوبہ کے دیار کے ذکر سے شروع کیا ہے پھر شام میں غسّانی بادشاہوں کے درباروں میں اپنی بزم ہائے طرب اور راگ و رنگ کا ذکر کرنے کے بعد بڑے پرجوش اور والہانہ انداز سے اس فتح کا ذکر کیا ہے۔ اور آنحضرت کی مدح اور ابو سفیان کی ہجو بھی ہے کہتے ہیں کہ اس قصیدہ کو حسانؓ نے فتح مکہ سے پہلے شروع کیا تھا اور جب مکہ فتح ہوا تو اسی میں دوسرے اشعار جوڑ کر اس فتح کا ذکر کیا ہے اس قصیدہ کا مطلع ہے۔

عفتْ ذاتُ الأصابع فالجواءُ　　　إلی عذراءَ منزلها خلاءُ

دس اشعار تک فخر اور مدح کرنے کے بعد بڑے شان سے فتح کا بالکل اسلامی انداز میں ذکر کرتے ہیں ؎

عَدِمنا خیلنا إن لم تَرَوها　　　تثیر النقعَ، موعدُها کداءُ
یبارین الأعنة مُصعِداتٍ　　　علی أکتافها الأسلُ الظِماءُ
تظلّ جیادُنا مُتمطِراتٍ　　　تُلَطِّمُهُنَّ بالخُمُرِ النساءُ
ألا أبلغْ أبا سفیان عنّی　　　فأنت مجوّفٌ نَخِبٌ هواءُ
بأن سیوفنا ترکتک عبدًا　　　وعبدُ الدار سادتها الإماءُ

اسی قصیدے میں وہ شعر بھی ہے جس میں حسان نے آنحضرت سے اپنی بے پناہ محبت کا ذکر کیا ہے اور یہاں تک کہا ہے کہ میرے باپ اور میرے دادا سب کی جانیں اور عزتیں آنحضرت کی عزت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ سب آپ پر فدا اور آپ کی عزت پر نچھاور ہیں۔

فإنّ أبی و والدہ وعِرْضی　　　لِعِرض محمدٍ منکم وقاءُ

غرض حضرت حسان اپنی عمر کے آخری دس برسوں تک جب تک آنحضرت

بقید حیات رہے ہر موقعہ پر اور ہر اہم واقعہ کی مناسبت سے اپنی زبان سے میدان کار زار میں سرگرم عمل رہے جس کی وجہ سے اس زمانہ کا ان کا کلام ان کی شعر و شاعری کا بہت اچھا اسلامی نمونہ ہی نہیں بلکہ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے جس میں ان جنگوں ان میں شریک حلیفوں اور حریفوں اور ان میں قتل ہونے والے مخالفوں اور اپنے شہیدوں اور غازیوں کا ریکارڈ ہے۔

حسانؓ نے تلوار سے تو کبھی جنگ نہ کی اور نہ معرکہ کارزار میں گئے کہ بقول روات بہت بزدل آدمی تھے (۱) لیکن مسلمان ہونے کے بعد رزم ہو یا بزم ہر موقعہ پر شاندار بولتے قصیدے ضرور کہتے چنانچہ جنگ بدر جنگ احد اور حضرت حمزہؓ کے مرثیہ کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہوا۔ خُبَیب بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو بھی جب قبیلہ ہذیل

---

(۱) حسانؓ اتنے بزدل تھے کہ جب جنگ ہوتی تھی تو میدان جنگ کا منظر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے بلکہ ان کی بزدلی کی حد یہ تھی کہ وہ کسی مردہ کو بھی نہیں دیکھ سکتے تھے اس لئے فوج کے پڑاؤ کے موقع پر عام طور سے عورتوں اور بچوں کے حصے میں رہا کرتے تھے۔ چنانچہ اغانی نے جلد ۴/۱۶۵ طبع ساسی اور مشعر المخضرمین یحیی الجبوری ص۴۷ ان کی بزدلی کا ذکر کرتے ہوئے ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے۔

وہ روایت کرتا ہے کہ غزوہ خندق کا معرکہ گرم تھا حسب دستور حسان عورتوں بچوں والے حصے میں فروکش تھے اتنے میں کچھ عورتوں کے چیخنے چلانے کی آواز آئی حسان صورت حال معلوم کرنے کے لئے نکلے تو دیکھا صفیہ بنت عبدالمطلب (آنحضرت کی پھوپھی) چلا چلا کر کہہ رہی تھیں کہ ارے کوئی ہے جو اس مردود کو مارے مواد دشمن ہمارے خیمے میں گھس آیا ہے۔ اتنے میں جو حسان کو دیکھا تو کہا کہ ارے اس کو مارو۔ ورنہ یہ سب کی بے عزتی کردے گا حسان کی نظر جو دشمن پر پڑی تو ان کے اوسان خطا ہو گئے بولے جی میں اگر یہ کام کر سکتا تو آپ لوگوں کے ساتھ یہاں کیوں ہوتا۔ میدان جنگ میں داد شجاعت نہ دے رہا ہوتا۔ مجھ میں کسی کو مارنے کی ہمت نہیں۔ اب صفیہ نے کہا کہ اچھا کوئی ہتھیار یا ڈنڈا وغیرہ ہی لاؤ۔ میں ہی موئے کا کام تمام کر دوں۔ چنانچہ کہیں سے ایک بانس کا ٹکڑا لے آئے۔ صفیہ نے اسی بانس سے دشمن کو مار مار کر ختم کر دیا۔ جب وہ گر گیا تو حسان سے بولیں کہ اچھا اب اس کے کپڑے اور اس کے ہتھیار وغیرہ اتار لاؤ میں یہ کام بھی کر دیتی لیکن وہ مرد ہے اس کے کپڑے کیسے اتاروں تو بولے جی مجھے اس سے بھی معاف رکھیئے آپ کپڑے اور ہتھیار وغیرہ اتارنے کی بات کر رہی ہیں میں تو مردے کو دیکھ کر ہی لرزنے لگتا ہوں۔ نا صاحب مجھ سے یہ کام نہ ہوگا چنانچہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

نے دھوکہ دے کر قتل کر دیا تو مرثیہ اور ہُذیل کی سخت ہجو کہی، جنگ موتہ کے شہداء جیسے زید بن حارثہ جعفر بن ابی طالب اور عبداللہ بن رواحہ کا دردناک مرثیہ کہا۔ اور جب آنحضرت کے ایک مبلغ کو الحارث بن عوف المری کی امان میں قتل کر دیا گیا تو حسان اس غداری کو معاف نہ کر سکے۔ اس کا ذکر اتنی تلخ ہجو سے کیا کہ الحارث اسے سن کر چیخ چیخ کر رونے لگے اور رسول اللہ کی پناہ میں آکر مزید ہجو کرنے سے حسان کو منع کرنے کی درخواست پیش کی۔ انھوں نے کہا تھا کہ

إِنْ تَغْدِرُوا فَالغَدْرُ مِنكُمْ شِيمَةٌ　　وَالغَدْرُ يَنْبُتُ فِي أُصُولِ السِّنْخَبْرِ[1]

یعنی اگر تم لوگ دھوکہ بازی کرو تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ دھوکہ دہی تو تمہاری فطری عادت ہے۔ سچ ہے دھوکہ بازی تمہارے خون میں ہے۔

قریشی اور یہودی مخالف رسول شعراء کا منہ توڑ جواب دینے کے علاوہ فتح مکہ کے بعد جب تمیم کا وفد آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے مقرر عطارد بن حاجب کی تقریر کا جواب آنحضرت کی طرف سے ثابت بن قیس الخزرجی نے بہت مناسب طریقے سے دے دیا تو وفد نے اپنے شاعر کے کلام کو سنانے کی اجازت چاہی۔ چنانچہ اس کے شاعر الزبرقان بن بدر نے اپنا وہ فخریہ قصیدہ پڑھا جس میں کہتا ہے کہ

نَحْنُ الكِرَامُ فَلَا حَيٌّ يُعَادِلُنَا　　مِنَّا المُلُوكُ وَفِينَا تُقْسَمُ الرُّبَعُ

یعنی ہم اتنے بڑے اور شریف لوگ ہیں کہ کوئی قبیلہ ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہم لوگ بادشاہ رہے ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد اتنے بڑے اور رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کے مالک تھے کہ مال غنیمت بٹ کر ہم کو ملتا تھا (دور جاہلی میں شیوخ قبائل اور سرداروں کو مال غنیمت میں سے برابر حصہ ملتا تھا) جب زبرقان اپنا قصیدہ پڑھ چکے تو آں حضرت نے حسان کو بلوا بھیجا جو اس موقعہ پر موجود نہ تھے۔ اور ان سے فرمائش کی کہ اس کا جواب دو۔ جو قاصد حسان کو بلانے گیا تھا۔ اس نے بتا دیا کہ تمیم کے شاعر نے ایسا فخریہ قصیدہ پڑھا ہے اور تم کو اس کا جواب دینا ہے۔ تو انھوں نے انصاریوں کی آنحضرت کی ہر موقعہ پر مدد کرنے کے سلسلے میں دو شعر پڑھے (دیوان ص ۱۴۴) اور آں حضرت کی مجلس میں پہنچے

---

(1) "السنخبر" ایک درخت کا نام ہے۔ دھوکہ دہی کے لئے ضرب المثل میں استعمال ہوتا ہے۔

اور جب آپ نے ... دینے کا حکم دیا تو فی البدیہہ انھوں نے ایک بہت شاندار قصیدہ کہا جس میں ... مدح کے علاوہ اپنے اور اپنے خاندان پر بھی فخر ہے جس کا مطلع ہے

إنّ الذوائب من فہر و إخوتهم قد بيّنوا سُنَّةً للناس تُتّبَعُ

اس قصیدہ میں ... شعر ہیں۔ اور بقول روات فی البدیہہ اشعار میں یہ قصیدہ حسان کے کلام کا بہترین نمونہ ہے۔

روایت ہے کہ جب حسان اپنا قصیدہ سنا چکے تو وفد کے ایک ممتاز رکن الاقرع بن حابس نے کہا کہ "میرے باپ کی قسم یہ شخص (آنحضرت) ضرور کامیاب ہوگا۔ اس کا مقرر ہمارے مقرر سے اور اس کا شاعر ہمارے شاعر سے کہیں بہتر ہے اور ان کی آوازیں ہماری آوازوں سے کہیں زیادہ بلند ہیں" روات کا کہنا ہے کہ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو سارا وفد مسلمان ہوگیا اور آنحضرت نے ان سب کو قیمتی تحفے تحائف سے نوازا۔

حسان بن ثابت اپنی طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے نہ شر پسند تھے اور نہ سیاست باز، اسی لئے ان کی تقریباً ساٹھ سالہ اسلامی زندگی میں ہمیں ایسے واقعات اور سیاسی مواقع کم نظر آتے ہیں جن میں حسان کا اچھا یا برا رول رہا ہو۔ سوائے دو موقعوں کے جن میں سے ایک میں ان پر کذب بیانی کی تہمت لگائی گئی اور دوسرا موقعہ حضرت عثمان کی شہادت کا ہے جس میں کہتے ہیں کہ حسان نے حضرت علی کو بھی ملوث سمجھا تھا اور اس کا اظہار کیا تھا۔

وہ واقعہ جس میں حسان پر جھوٹ تہمت تراشی کا الزام ہے تاریخ اسلام اور رسول اللہ کی نجی زندگی کا وہ اہم واقعہ ہے جس کی صفائی کے لیے قرآن کی ایک آیت اتری اور وہ ہے حضرت عائشہؓ پر غزوہ بنی المصطلق سے واپسی پر غلط تہمت اور الزام جسے عرف عام میں "حدیث افک" کہتے ہیں (۱) اس الزام کے لگانے والوں میں

(۱) اس کی مختصر روئداد یوں ہے :۔ کہ حضرت عائشہ پر صفوان بن المعطل کے ساتھ ملوث ہونے (جو فوج کوچ کر جانے کے بعد پڑاؤ کی جگہ پر چھوٹی یا بھولی بسری چیزوں کو دیکھنے کی غرض سے سب سے آخر میں روانہ ہوا کرتے تھے) کی تہمت لگائی گئی تھی۔

تین چار آدمیوں کے نام لیے جاتے ہیں جن میں حضرت حسان کا نام بھی آتا ہے۔ لیکن انھوں نے اس واقعہ سے اپنی برأت کا اور حضرت عائشہ کی پاکدامنی طہارت اور وقار و عظمت کا ایک بہت ہی خوب صورت قصیدے کے ذریعے اعلان کیا ہے جس میں کہتے ہیں کہ وہ (حضرت عائشہ) تو اتنی پاک دامن عفیفہ پر وقار اور صاحب تمکنت شخصیت ہیں کہ ان سے کسی برائی کا منسوب کرنا تو درکنار اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا وہ معمولی خاتون نہیں ہیں وہ رتبہ اور دین دونوں کے اعتبار سے دنیا میں سب سے بڑے اور ممتاز شخصیت (آنحضرت) کی شریک حیات ہیں اور خاندانی اعتبار سے بھی ان کا مقابلہ نہیں ہو سکتا خدا نے خود ہی انکو ہر قسم کی برائی اور جھوٹ سے پاک وصاف رکھا ہے ایسی عظیم شخصیت کی برائی یا اس پر تہمت لگانے کی میں جرأت کر سکتا ہوں؟ ہر گز نہیں اور اگر میں نے یہ تہمت لگائی ہے تو خدا کرے کہ میرے ہاتھوں پر فالج گر جائے کہ میں ان سے اپنا کوڑا بھی نہ اٹھا سکوں۔ اور یہ ممکن کیسے ہے کہ میں نے ساری عمر آل نبی پر وقف کردی۔ (۱)

روایت ہے کہ رسول اللہ اس واقعہ سے ایک عرصہ دراز تک بہت غمگین اور رنجیدہ رہے تھے اور حضرت عائشہ تو گھل گھل کر کانٹا ہو گئی تھیں آخر جب برأت کی آیت اتری تب رسول اللہ حضرت عائشہ اور خاندان ابوبکر اور تمام مسلمانوں کو سکون نصیب ہوا (صحیح بخاری)۔

دوسرا واقعہ جس میں حضرت حسان کا نام لیا جاتا ہے وہ حضرت عثمان کے بے دردانہ اور سفاکانہ اور انتہائی کسمپرسی اور مظلومیت کی حالت میں قتل کا ہے۔ اس موقعہ پر انھوں نے ایک بہت ہی موثر قصیدہ کہا جس میں حضرت عثمان کے اس بے دردانہ قتل پر نوحہ اور اسلام اور اس کی تعلیمات کی اس بے حرمتی کا رونا رویا ہے اور مدینہ میں رہنے والے صحابہ اور خاص طور سے حضرت علی کے اس موقعہ پر ساتھ نہ دینے پر اظہار افسوس اور اپنے رنج و غم کا تذکرہ کیا ہے۔ راویوں کا کہنا ہے کہ شاید وہ حضرت علی کو بھی اس جرم میں محض ان کے سکوت اور مدینہ سے نکل جانے کی

(۱) اس قصیدہ کا مطلع ہے: حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِيبَةٍ۔ وَتُصْبِحُ غَرْثَىٰ مِنْ لُحُومِ الْغَوَافِلِ۔

وجہ سے ملوث سمجھتے تھے۔ حالاں کہ بات ایسی نہ تھی حضرت علی نے اپنے دونوں صاحب زادوں حسن اور حسین کو حضرت عثمان کی نگہبانی اور مدافعت کے لیئے ان کے گھر پر چھوڑ دیا تھا جس کی تفصیلات سے تاریخ اور سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ امویوں نے حضرت علی کو بدنام کرنے اور اپنے سیاسی موقف کو مضبوط کرنے کے لیے حسان کی طرف حضرت علی سے بدگمانی کے قصے کو اچھالا اور اس طرح ایک جلیل القدر صحابی اور شاعر رسول کے نام سے فائدہ اٹھا کر اپنے سیاسی مقاصد پورے کیئے ورنہ معتبر سیرت نگاروں اور مورخین نے اس قصہ کو اہمیت نہیں دی ہے بہر حال حسان نے قتل عثمان کے اس حادثۂ عظیم پر دوسرے صحابہ کی طرح اپنے گہرے رنج و غم اور دکھ کا اظہار کیا اور یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں دو قصیدوں کا ذکر آتا ہے ایک کا مطلع ہے ؎

إن تمسِ دارُ ابن أروی منه خالیةً   باب صریعٌ وباب مخرق خَرِبُ

اور دوسرے کا مطلع ہے۔

ما لقیتم من ثیابٍ خلقةٍ   وعبیدٍ وإماءٍ وذهبٌ (۱)

ان قصوں کے علاوہ بعض مورخین اس کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ حسان صرف اپنی قوم انصاریوں کا ذکر اور ان کی ہی تعریف اور ان پر ہی اپنے قصیدوں میں فخر کرتے تھے اور مہاجرین کا کہیں بھی ذکر نہیں کرتے تھے۔ اور آنحضرت کو بھی یہ بات بری لگی تھی چنانچہ ایک دفعہ آپ نے ان کو مخاطب کر کے کہا کہ "یا حسان أنفِسْتَ علی قومی أن هداهم اللہ للاسلام؟" (۲) یعنی اے حسان کیا تم کو میری قوم سے اس لیئے حسد ہے کہ اللہ نے ان کو اسلام کی ہدایت دی اور اس کی وجہ ان کے اس شعر کو بتایا جاتا ہے جس میں کہتے ہیں جلابیب (۳) صرف صاحب عزت ہی نہیں ہو گئے

---

(۱) دیوان حسان مطبوعہ دار بیروت للطباعة والنشر ص۱۶ و ص۱۔

(۲) حسان شاعر الرسول: ڈاکٹر حنفی حسنین بحوالہ الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام د۔ عبداللہ الحامد ص۲۵۔

(۳) الجلابیب۔ جمع جلباب یعنی لنگی یا لمبی قمیص جو ٹخنوں تک ہوتی ہے اور جیسے آج بھی عرب گھروں میں پہنتے ہیں۔ اس زمانے کے مہاجرین کو ان کی تذلیل کے خیال سے بعض لوگ الجلابیب کہتے تھے۔

ہیں بلکہ ان کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ اور ابن الفُرَیعہ (یعنی حسان) ذلیل وخوار ہو کر رہ گیا ہے۔

أمسى الجلابيب قد عزوا وقد كثروا   وابن الفُريعة أمسى بَيضة البلد[1]

لیکن ڈاکٹر شوقی ضیف نے اس شعر کو قصہ افک کے ضمن میں ذکر کیا ہے جس میں یہ بات کہی جارہی تھی کہ اس قصے میں حسان کے ملوث ہونے کو مہاجرین اچھال رہے تھے اور خاص طور سے صفوان بن المعطل جن کے ساتھ تہمت لگائی جارہی تھی چنانچہ اس بات سے حسان کو نہ صرف بہت غصہ آیا بلکہ بہت رنج بھی ہوا کہ ہم لوگوں کی جنھوں نے رسول اللہ اور مہاجرین کی مدد کی اب کوئی حیثیت نہیں رہ گئی اور ہم ذلیل و خوار ہو گئے ہیں (۲)۔

بہر حال جیسا کہ اوپر ذکر ہوا حسان نہ عادتاً اور نہ فطرتاً سیاست باز فتنہ پرواز اور عیب جو آدمی تھے وہ سیدھے سادے مسلمان شاعر تھے جن کو آنحضرت کی ذات گرامی سے والہانہ عشق تھا۔ اور چوں کہ بزدل تھے اس لئے تلوار لے کر میدان کارزار میں آپ کی مدد نہیں کر سکتے تھے اس لیے قلم اور زبان سے آپ کی مدد کرتے تھے آنحضرت بھی آپ کے ساتھ لطف خاص کا سلوک کرتے تھے چنانچہ وہ آپ کے ممبر سے شعر پڑھا کرتے تھے اور اس قدر اعتماد فرماتے تھے کہ جنگوں میں جب تشریف لے جاتے تھے تو ازواج مطہرات کی نگہداشت وغیرہ کی ذمہ داری ان کے سپرد فرماتے تھے یا میدان جنگ میں عورتوں اور بچوں کے خیموں کی نگہبانی ان کو دیتے تھے اور جب جنگ سے واپس تشریف لاتے تو بالکل شریک جنگ سپاہیوں کی طرح مال غنیمت میں سے ان کو بھی حصہ دیتے تھے اسی طرح آپ نے ان کو ایک باغ بھی تحفۃً دیا تھا۔ آپ نے حسان کو 'سیرین'، جو آپ کی زوجہ مطہرہ ماریہ القبطیہ کی بہن تھیں

---

(۱) بیضۃ البلد یعنی شتر مرغ کا انڈا۔ عربی کہاوت ہے جس کا مطلب ہے ذلیل و خوار ہونا یا بے یار و مددگار ہو جانا کیوں کہ شتر مرغ انڈا دے کر چلی جاتی ہے، عام پرندوں کی طرح سیتی نہیں ہے۔

(۲) تاریخ الادب العربی: العصر الاسلامی؛ شوقی ضیف۔

ہدیہ میں دی تھی اور انھیں کے پیٹ سے حسان کے بڑے اور مشہور شاعر بیٹے عبدالرحمٰن پیدا ہوئے۔

اور اس طرح حسان آنحضرت کے زمانے میں آپ کے شاعر خاص اسلام کے نقیب اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ان کے مددگار، محترم اور قابل قدر شخصیت کی حیثیت سے اور ان کے بعد اموی دور میں بہت معزز اور مکرم بزرگ بن کر رہے۔ بیت المال سے خاصا وظیفہ ملتا تھا۔ جس سے چین سکون سے زندگی گذارتے تھے۔ ۵۴ھ میں بعض روایتوں کے مطابق حضرت معاویہ کے زمانہ خلافت میں اور بعض کے کہنے کے مطابق حضرت علی کی وفات سے پہلے ۴۰ھ کے لگ بھگ[1] یا اس سے تھوڑے ہی عرصے بعد ایک سو بیس سال کی عمر میں مدینہ میں انتقال کیا۔ جس میں آدھی عمر جاہلی دور میں اور آدھی یعنی ساٹھ سال اسلامی زمانے میں گذرے آخری عمر میں آنکھوں کی بصارت جاتی رہی تھی۔

امتیازی خصوصیات:

ابن سلاّم الجمحی نے حسان بن ثابت کو جزیرہ عرب کے، پانچ بڑے شہروں یعنی مکہ، مدینہ، طائف، یمامہ اور بحرین میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ اچھا اور تعداد میں سب سے زیادہ اشعار کہنے والا شاعر گردانا ہے (۲) چنانچہ نقادوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حسان اپنے زمانے میں شہرائی شعراء میں سب سے بڑے شاعر تھے اور تمام یمنی شعراء میں ان کے ٹکر کا کوئی شاعر نہیں گذرا اسی لئے ان کے اشعار سند اور ضرب المثل کے طور پر ہمیشہ پیش کئے جاتے رہے۔

ان کے اس امتیاز کا تجزیہ کرتے ہوئے خفاجی نے لکھا ہے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ حضرت حسان کا خاندان عرب کے ان قدیم خاندانوں میں شمار

(۱) حسان شاعر الرسول: بحوالہ الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام۔ ڈاکٹر عبداللہ الحامد ص ۲۴۹۔

(۲) طبقات فحول الشعراء ص ۱۷۹۔

کیا جاتا تھا جن کے یہاں شعر وشاعری کا رواج ایک زمانہ دراز سے چلا آرہا تھا
اور خاندان کا ہر فرد تقریباً اس فن میں ایک حیثیت کا مالک گذرا ہے. چنانچہ
حسان کے والد اور ان کے دادا دونوں شاعر تھے اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن بن حسان
اور ان کے پوتے سعید بن عبدالرحمٰن بھی شاعر تھے۔ (۱) چنانچہ مبرد نے کامل میں کہا
ہے کہ سب سے قدیم خاندان جس میں شعر کا رواج رہا ہے وہ خاندان حسان ہے کیونکہ
اس خاندان میں مسلسل چھ شاعر گزرے ہیں اور وہ ہیں سعید بن عبدالرحمٰن بن حسان
بن ثابت بن المنذر بن حرام. خاندانی وراثت کے علاوہ مندرجہ ذیل محرکات نے
بھی حسان کی شاعری کو جلا' زندگی اور تابندگی بخشی۔

۱۔ دور جاہلی کی جنگیں جھڑپیں اور حریف شعراء کے درمیان ہجو گوئی اور نوک جھونک
اور خاص طور سے ان کے اور قیس بن الخطیم کے درمیان چھڑی مہاجاۃ اور نوک
جھونک جو دور جاہلی میں ایک عرصہ تک دونوں شاعروں کے درمیان جاری رہی۔

۲۔ روپیہ پیسہ کی ضرورت کی وجہ سے غسانی اور حیرہ کے بادشاہوں کی شان
میں عرصہ دراز تک ایسے شاندار مدحیہ قصیدے کہنا جن کی نظیر جاہلیت
میں کم ملتی ہے۔

۳۔ اپنی قوم اور خود اپنی ذات پر فخر کرنا کہ قبیلہ بھی یمنی مدنی قبائل میں اعلیٰ تھا اور
خود بھی بحیثیت شاعر اور بحیثیت فرد قبیلہ معزز و محترم تھے اور ان باتوں پر
فخر کرتے تھے جن سے ان کی شاعری کو چار چاند لگے۔

۴۔ پھر جب اسلام کا ظہور ہوا تو یہ مسلمان ہو گئے اور صحبت رسول میں رہنے اور قرآن
کی تلاوت کرنے نے ان کی زبان وبیان میں وہ اعجاز پیدا کر دیا. کہ جب وہ
آنحضرت اور مسلمانوں کی طرف سے مدافعت کرنے کے لئے میدان شعر میں کودے
تو کلام میں اتنا زور، اسلوب اتنا شاندار اور بیان اتنا مؤثر ہوتا کہ خود آنحضرتؐ
بھی فرط مسرت سے بول پڑے تھے کہ کہے جاؤ جبرئیل تمہارا ساتھ دیں یا خدا

(۱) الحیاۃ الادبیۃ فی صدر الاسلام ص۲۰۵ محمد عبد المنعم خفاجی

تمہاری مدد کرے۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ حسان کی امتیازی خصوصیت اور شان دونوں زمانوں یعنی جاہلی اور صدر اسلام میں برقرار رہی۔
جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے حسان دور جاہلی میں انصار کے اور اسلام لانے کے بعد نبی صلعم کے اور بحیثیت مجموعی پورے یمن کے تنہا شاعر کی حیثیت سے مانے جاتے تھے چنانچہ عرب نقادوں کا اس پر اتفاق ہے کہ حسان عرب کے مشہور شہروں یعنی مکہ اور طائف اور قبیلہ عبد القیس کی جائے سکونت یعنی بحرین کے قصبوں اور شہروں کے شاعروں میں سب سے بڑے شاعر ہیں۔

چوں کہ حسان نے جاہلی زمانہ اور اسلامی زمانہ دونوں پایا ہے۔ اس لیے فطری طور سے ان کے کلام کے دو دور ہو گئے ہیں۔ ایک جاہلی دور کا کلام اور دوسرا اسلامی زمانہ کا کلام۔

عجیب اتفاق ہے کہ حسان نے جتنی عمر پائی کم و بیش اس کا نصف حصہ دونوں زمانوں میں گزرا ہے اس طرح تقریبًا ساٹھ سال جاہلی زمانہ میں اور کم و بیش اتنے ہی اسلامی زمانہ میں گذرے۔

بعض نقادوں کی رائے ہے کہ حسان کا بہترین کلام وہ ہے جو انھوں نے دورِ جاہلی میں اپنی جوانی اور اس کے بعد بھی اپنے ابتدائی بڑھاپے کے زمانہ میں کہا ہے اپنی بات کی دلیل میں یہ نقاد حسان کے دور شباب کا وہ کلام پیش کرتے ہیں جو انھوں نے قبیلۂ اوس اور خزرج کی جنگوں کے زمانہ میں اپنے حریف شاعر قیس بن الخطیم کے جواب میں کہے تھے اور اس کے بعد عمر ڈھلنے کے زمانہ میں ان مدحیہ قصائد کو پیش کرتے ہیں جنھیں وہ غسانی بادشاہوں آل جفنہ کی شان میں یا حیرہ کے بادشاہوں آل النعمان بن المنذر کی شان میں کہا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اول الذکر بادشاہوں کی شان میں ان کے قصیدے آل النعمان بن المنذر کی شان میں کہے گئے قصیدوں کے مقابلے میں زیادہ شاندار جاندار اور ان کے کمال فن کا بہترین نمونہ ہیں۔

جب حسان مسلمان ہوئے ہیں تو عمر کے ساٹھ سال گزر چکے تھے۔ ظاہر ہے جوانی کی امنگ راگ و رنگ کی ترنگ میں ٹھہراؤ بلکہ جھکاؤ پیدا ہونے لگا تھا۔ پھر محرکات شعر تقریباً ختم ہوجانے کی وجہ سے شاید زور بیان پر شبنم کی سی ٹھنڈک چھانے لگی تھی کہ اسلام کے ظہور پھر ان کے مسلمان ہوجانے اور پھر آنحضرت کے اس گوہر یکتا کو اپنا خاص شاعر کی حیثیت سے چن لینے نے یک بیک پھر ایک بار ان کے جذبات شعر و شاعری کو اس طرح بھڑکا دیا کہ ان کی زبان و قلم میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تقریباً وہی زور وہی جوش اور وہی اثر پیدا ہوگیا جو ان کے عہد جاہلی یا عہد شباب کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ اس وجہ سے کہ شاعر رسول بن کر حریف شعراء اور آنحضرت کے مخالفین کی طرف سے چیلنج ملا اور شعر کہنے کا محرک اور بحیثیت مسلمان اپنے ایمان اور یقین کی وجہ سے آنحضرت اور اسلام کی مدد اور دونوں کی طرف سے مدافعت کرنے کا ایمانی داعیہ ملا جو بہرحال دور جاہلی کی شاعری میں مفقود تھا اور جب فکر و نظر میں گہرائی کے ساتھ اعتقاد اور ایمان کی قوت شامل ہوجائے تو پھر فن میں ہمہ جہت کمال پیدا ہوجاتا ہے۔ جو اس کو آرٹ و فن کا شہ پارہ بنا دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کو آنحضرت نے اپنا شاعر منتخب فرمایا۔ اور جب حسان اپنے زور بیان کے ساتھ اپنے ایمان و یقین کی تاثیر کو بھی شامل کرکے کسی مکی مخالف شاعر کا جواب دیتے تو کلام میں وہ بلندی اور وہ رفعت پیدا ہوجاتی تھی کہ اس کے برقرار رکھنے کے لیے آنحضرت دعائیں مانگا کرتے تھے کہ یہ کلام مکہ والوں کے دل میں برچھی کی طرح پار ہوجاتا تھا اور اس طرح حسان اپنے دل کو اور میرے دل کو بڑا سکون پہنچاتے تھے۔" ان کی انھیں خصوصیات کی وجہ سے نقادوں نے حسان کو میدان شعر و شاعری کا استاد مانا ہے۔ چنانچہ ابن سلام نے حسان کو شہراتی شعراء میں بہت بسیار گو اور پرگو شاعر گردانا ہے (۱) اور اصفہانی نے ان کو "چوٹی کے شعراء میں سے یکتا شاعر" کا لقب دیا ہے اگرچہ دونوں کے

(۱) طبقات فحول الشعراء، ص ۱۷۹۔

بقول حسان کے کلام میں خلط ملط کے علاوہ ان کی طرف بہت سے اشعار منسوب بھی کر دیے گئے ہیں۔

حسان کے اس قسم کے اشعار کو دیکھ کر بعض نقادوں اور خاص طور سے اصمعی[1] کا جو عہد عباسی کا چٹکلہ باز ادیب اور نقاد ہے خیال ہے کہ حسان کا اسلامی زمانہ کا کلام کمزور اور لچر پوچ ہے مگر گہری نظر والے نقادوں کا خیال ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف اسلامی عہد کا ان کا کلام بھی بہت جاندار اور شاندار ہے اور اس کی مثال ان کے وہ شعری مقابلے ہیں جو انھوں نے مکی شعراء سے کیے ہیں ان میں چوں کہ نوک جھونک اور حریف کو زیر کرنے کا جذبہ اور اس میں کامیابی کے بعد فخر کرنے کا موقعہ ملتا ہے اس لیے اس قسم کے کلام میں کہیں بھول کر کمزوری یا پھسپھسا پن نہیں ہے اور جس کلام کو کمزوری یا پھسپھسا پن کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے درحقیقت وہ وہ کلام ہے جو ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور حقیقت میں ان کا ہے نہیں، بلکہ بقول شوقی ضیف اصحاب مغازی اور خاص طور سے ابن اسحاق نے حسان کی طرف بہت سے قصیدے منسوب کر دیے ہیں جو درحقیقت ان کے نہیں ہیں اس بات کو ابن ہشام نے "سیرت[2]" کو ابن اسحاق

---

(۱) پورا نام عبدالملک بن قریب الاصمعی پیدائش سنہ ۱۲۲ھ وفات سنہ ۲۱۶ھ۔ اپنے زمانے کا بہت بڑا عالم تاریخ لغت اور ملح نکات یعنی چٹپٹی مزیدار باتیں کرنے اور ان کو بیان کرنے میں ماہر اور صاحب نظر نقاد ایسے دس ہزار ارجوزے (چھوٹے قطعات یا رجزیہ شعر) یاد تھے ہارون الرشید اسے شیطان شعر کہا کرتا تھا۔ مشہور نحوی اخفش کہا کرتا تھا کہ شعر کی جانکاری میں اصمعی اور خلف سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا۔ ان دونوں میں اصمعی کو شعر کا سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا تھا کیوں کہ وہ نحو کا بھی بہت بڑا عالم تھا۔ البرذی نے اسے نسب، عربوں کی جنگی تاریخ اور عام تاریخ اور لغت کا سب سے بڑا ماہر بتایا ہے۔ تاریخ اور نقد شعر میں اصمعی کی ایک کتاب بھی ہے جس کا نام ہے فحولۃ الشعراء۔ اس میں اصمعی نے شعر و شاعری سے متعلق اپنے خیالات شاعروں سے متعلق اپنی رائے جمع کرنے کے علاوہ اکثر اچھے شعراء کا انتخاب بھی دے دیا ہے اس طرح یہ کتاب صرف نقد و نظر کی ہی بہترین کتاب نہیں ہے بلکہ معیاری شعر کی ایک بہترین بیاض اور انتخاب بھی ہے اور اس اعتبار سے فن شعر و شاعری میں یہ سب سے پہلی معیاری اور قدیم کتاب ہے۔

(۲) یعنی اس کی کتاب 'سیرۃ بن ہشام'۔

سے روایت کرتے وقت محسوس کیا۔ چنانچہ اس قسم کے مشتبہ قصیدوں کے بارے میں اس زمانے کے علماء اور خاص طور سے بصرہ کے مشہور راوی ابوزید الانصاری سے ابن اسحاق کے روایت کردہ اشعار کے بارے میں پوچھا کرتا تھا چنانچہ لوگ بعض اشعار کو صحیح بتاتے تھے اور بعض کو غلط، اور اس کی بھی نشان دہی کرتے تھے کہ کون سا قصیدہ حسان کے کس معاصر شاعر کا ہے اور کون سا بعد کے کسی شاعر کا۔ اسی لئے ابن ہشام سیرت نبوی میں بعض قصائد کو نقل کرنے کے بعد لکھا کرتا ہے کہ اہل علم اس قصیدہ کو نہیں مانتے۔ (۱) چنانچہ ایک دفعہ اسی اصمعی نے مشہور نقاد ابوحاتم کے سامنے کہا کہ "حسان چوٹی کے شعراء میں سے ایک ہیں" تو حاتم بولے لیکن ان کے یہاں پھسپھسے اشعار بھی ہیں "اس پر اصمعی نے کہا کہ "ان کی طرف ایسی چیزیں منسوب کی جاتی ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔"

چنانچہ وہ اشعار جن کو کمزور بتایا جاتا ہے ان میں اکثر وہ ہیں جن میں حسان نے اسلام کے عقائد یا اس کی تعلیمات کا ذکر کیا ہے یا جن میں عذاب وثواب کا ذکر ہے یا بعض ایسے قصائد بھی ہیں جن میں آنحضرت اور آپ کے صحابہ میں سے کسی کی مدح ہے یا صحابہ میں سے کسی کی شہادت یا خلفاء میں سے کسی کے انتقال پر مرثیہ شامل ہیں۔ اول تو جتنے مضامین کا اوپر ذکر ہوا اور جن میں حسان کے کلام کو کمزور بتایا جاتا ہے وہ عام طور سے ایسے موضوعات مثلاً عقائد یا تعلیمات یا جنت ودوزخ، عذاب و ثواب وغیرہ ہیں جو ایسے مضامین ہیں کہ لاکھ شاعر کی طبع رسا ہو بہت زیادہ پرواز کی گنجائش نہیں ہے۔ کیوں کہ حقائق کے بیان میں موشگافی یا دقت نظری، یا گہرائی کا سوال نہیں ہوتا پھر بھی اس بظاہر کمزوری کی توجیہہ بقول ڈاکٹر خفاجی (۲) یوں کی جا سکتی ہے۔

---

(۱) تاریخ الادب العربی العصر الاسلامی منشہ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس قسم کے ۴۴ مشتبہ قصیدوں کی فہرست دے دی ہے۔

(۲) الحیاۃ الادبیۃ فی عصر الاسلام: خفاجی عبدالمنعم۔

(۱) عقائد اور تعلیمات اسلام کے نظم کرنے میں جو کمزوری دکھائی دیتی ہے اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ مضامین انھوں نے قرآن سے لئے یا آنحضرت کی زبان سے سنے ظاہر ہے دونوں اسلوب اور زبان و بیان کے اعتبار سے معجز نما تھے اب حسان نے جب ان چیزوں کو اپنی زبان میں کہا تو ان کے مقابلے میں ظاہر ہے (وہ پھیکی اور بے مزہ لگیں. کیوں کہ اس اعلیٰ الٰہی نمونے کے سامنے انسانی تخلیق چاہے کتنی ہی اونچی کیوں نہ ہو کمزور اور پھسپھسی دکھائی دے گی۔

(۲) خود اصمعی نے جس نے حسان کے کلام میں کمزوری کا شوشہ چھوڑا تھا. بڑے پتے کی بات اس کمزوری کے سلسلے میں کہی ہے وہ کہتا ہے کہ حسان کے عام کلام کی کمزوری اور ہجو میں ان کے کلام کے زور کی وجہ یہ ہے کہ شعر بڑا نٹ کھٹ ہے برائی کے مضامین میں تو بڑا زور دکھاتا ہے اور بھلائی کے مضامین میں بڑا بودا پن[1]

(۳) اسلامی زمانہ کے کلام کا اکثر حصہ یا تو کسی فوری واقعہ یا حادثہ کے ضمن میں یا کسی حریف یا مخالف کے جواب میں فی البدیہہ کہا گیا ہے. جس میں سوچنے سمجھنے یا ہر شعر کو نوک پلک سے درست کرنے کا موقع ہی نہ تھا۔

(۴) اور یہ تو واقعہ ہے کہ اسلامی زمانہ کا کلام بڑھاپے کا کلام ہے جس پر کمزوری کی چھاپ کا ہونا ضروری ہے مگر یہ بات صرف عام کلام میں ہے حریفوں کا مقابلہ اور حلیفوں کی طرف سے مدافعت کے اشعار میں یہ بات نہیں۔

(۵) اسلامی عہد کے عام کلام میں کمزوری کے بارے میں ایک دفعہ جب ان سے کہا گیا کہ "اے ابو الحسام (کنیت حسان) اسلامی زمانہ میں آپ کا کلام کمزور یا بوڑھا ہو گیا"، تو خود ہی اس کی توجیہہ یوں کی: بولے "بے شک اسلام جھوٹ سے روکتا ہے اور شعر کو جھوٹ ہی سنوارتا ہے" اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ اثر پیدا کرنے کے لئے غلو کی چاشنی کلام یا فن میں ملانے کی اجازت ہے۔

---

(۱) الشعر نکد یقوی فی الشر و یضعف فی الخیر۔

۶۔ پھر حسان اپنے طبعی رجحان کی وجہ سے نابغہ اعشیٰ زہیر اور الحطیئۃ کی طرح اپنے کلام کو نوک پلک سے بہت زیادہ درست کرنے یا بار بار نظرِ ثانی اور کاٹ چھانٹ کر کے لمبے قصیدوں کو چند اشعار تک محدود کر دینے کے عادی نہ تھے۔ بلکہ جس حال میں اور جس طرح خیالات آتے انھیں اس وقت بالکل فطری انداز میں شعر کا جامہ پہنا دیا کرتے تھے پھر ان پر رنگ و روغن کرنے کی طرف بالکل دھیان نہ دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے کہیں کہیں کلام میں جھول دکھائی دیتا ہے۔

۷۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان کے نام سے ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے کلام کو ان کی طرف منسوب کر کے مشہور کر دیا گیا۔ اور اس کام کو سب سے زیادہ امویوں نے کیا ہے (۱) چنانچہ انھوں نے قاتلین عثمان حتیٰ کہ حضرت علیؓ کے خلاف بھی کئی شعر کہلوا کر ان کی طرف منسوب کرا دیئے تھے تاکہ اس طرح ایک طرف یہ بات ثابت کر سکیں کہ آنحضرت کے شاعر خاص بھی ان کی طرف تھے۔ تو دوسری طرف اس طریقہ سے اس عار اور ذلت کو دھو سکیں جو حسان کے ان اشعار سے ان کو پہنچ چکی تھی جو انھوں نے ابوسفیان اور ان کے مکی ساتھیوں اور مخالفین رسول کی ہجو اور ان کی برائیوں کے اچھالنے کے لئے کہے تھے اسی طرح ان کی طرف منسوب وہ اشعار بھی تھے جو زبیر بن العوام اور عبداللہ بن عباس کی تعریف میں ہیں۔ کہ اس قسم کے سارے اشعار سیاسی پارٹیوں نے کہلوا کر ان کے نام سے مشہور کرا دیئے تاکہ ان سے سیاسی فائدے حاصل کر سکیں اور ظاہر ہے اس قسم کے اشعار میں جان تو ہوتی نہیں چنانچہ یہ بے جان اور گڑھا ہوا کلام ان کی طرف منسوب کر کے ان کے فنی امتیاز کو بھی داغ دار کر دیا گیا اور مستقل طور سے حسان کے اسلامی کلام میں کمزوری کا شاخسانہ کھڑا کر دیا گیا۔ جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

---

(۱) الاستیعاب لابن عبدالبر بحوالہ شوقی ضیف تاریخ الادب العربی العصر الاسلامی۔

صحیح بات یہ ہے کہ حسان کا کلام ہر زمانے میں اپنے موقع محل کے لحاظ سے معیاری بلند اور مؤثر رہا ہے۔ چنانچہ مکی مخالف شعراء کے جواب میں یا ان سے نوک جھونک کے طور پر یا اسلام اور آنحضرت کی طرف سے مدافعت میں کہے گئے اشعار انتہائی شاندار زوردار خوبصورت اور فن کا اعلیٰ نمونہ ہیں جو ان کے عہد جوانی کے کلام سے کسی طرح کم نہیں چنانچہ اس زمانہ کا فخر اور حماسہ اور خود ستائی یا خاندان وقبیلہ کی تعریف جاہلی زمانے کے اس قسم کے کلام سے کسی طرح کم نہیں ہے مگر جب حریف کی آواز کمزور یا خاموش ہوگئی تو حسان کی آواز بھی کمزور یا خاموش ہوگئی اس کی وجہ نہ اسلام ہے اور نہ تقاضائے عمر، بلکہ تقاضائے حال وحالات۔ اور یہ سب کو معلوم ہے کہ یہ بلاغت کی ایک اہم صنعت ہے چنانچہ ڈاکٹر شوقی ضیف نے حسان کے مندرجہ ذیل قصیدوں کے بارے میں تحقیق کرنے کے بعد رائے دی ہے کہ وہ صحیح ہیں۔

(۱) ان کا وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

ألم تسأل الربعَ الجديدَ التكلما ... بمدفعِ أشداخٍ فبرقة أظلما

جس میں آگے چل کر فخر میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں کہتے ہیں ؎

لنا الجفنات الغرّ يلمعن بالضحى ... وأسيافنا يقطرن من نجدة دما (۱)

ولدنا بني العنقاء وابني محرّق ... فأكرم بنا خالا وأكرم بنا ابنا

یعنی ہمارے یہاں بڑے بڑے پتیلے دن چڑھے تک چربی کی وجہ سے چمکتے رہتے ہیں۔

---

(۱) اس شعر پر النابغۃ الذبیانی نے سوق عکاظ کے شعری مقابلہ میں اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا "تم شاعر تو ہو لیکن تم نے اپنے پتیلوں اور تلواروں دونوں کی حیثیت اس انداز سے گرادی اور جن کو پیدا کیا ان پر فخر کیا ہے اور جن لوگوں کی تم اولاد ہو ان پر فخر نہیں کیا" کہتے ہیں کہ اسی موقعہ پر خنساء نے جب اپنے بھائی صخر کے بارے میں اپنا وہ مرثیہ پڑھا جس کا مطلع ہے ؎

قذى بعينك أم بالعين عوّار ... أم أقفرت إذ خلت من أهلها الدار

(باقی اگلے صفحہ پر)

یعنی ہم لوگ اتنے سخی داتا مہمان نواز ہیں کہ ان میں رات دن مہمانوں کے لیے کھانا پکتا رہتا ہے۔ اور ہماری تلواروں سے مدد کرنے کی وجہ سے خون ٹپکتا رہتا ہے۔

ہم نے بنی العنقاء اور محرق کے دونوں بیٹوں کو جنم دیا ہے (۱) اور اس طرح ہم ماموں اور بیٹوں کے اعتبار سے بہت شریف لوگ ہیں۔

۲۔ حسان کا لامیہ قصیدہ جس میں غسانیوں کی مدح ہے جس کا مطلع ہے ؎

أسألت رسم الدار أم لم تسأل　　بين الجوابي فالبضيع فحومل

جس میں ان لوگوں کی تعریف میں اتنے خوب صورت شعر کہے ہیں جو حسان کے زمانہ جاہلی کے کلام کا بہترین نمونہ ہیں جیسے ؎

لله در عصابة نادمتهم　　يوما بجلق في الزمان الاول

بيض الوجوه كريمة أحسابهم　　شم الانوف من الطراز الاول

يسقون من ورد البريص عليهم　　بردى يصفق بالرحيق السلسل

(گزشتہ صفحہ کا حاشیہ) تو نابغہ بولا کہ اگر ابھی اعشی میمون اپنا قصیدہ نہ سنا چکا ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ تم انسانوں اور جنات میں سب سے بڑے شاعر ہو۔ یہ سن کر حسان بولے کہ خدا کی قسم میں تجھ سے تیرے باپ سے اور تیرے دادا سے بھی بڑا شاعر ہوں" اس پر نابغہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ بھتیجے تم میرے اس شعر جیسا کوئی اچھا شعر نہیں کہہ سکتے ہو ؎

فانك كالليل الذى هو مدركى　　وان خلت ان المنتأى عنك واسع

اس کے بعد خنساء سے کہا کہ اب تم ان کو اپنا کلام سناؤ جب وہ سنا چکیں تو بولا کہ "خدا کی قسم عورتوں میں میں نے تم سے زیادہ بڑی شاعرہ نہیں دیکھی" تو بولیں "اور نہ مردوں میں" (الشعر والشعراء لابن قتیبہ ۱/۳۰۳) اس قصہ سے متعلق اس کتاب کا پہلا حصہ ص۱۹۴ حالات النابغۃ الذبیانی بھی ملاحظہ کیجیے۔ مزید اس شعر پر نابغہ کو جو اعتراض تھا اس کا جواب اور تجزیہ بدوی طبانہ کی کتاب "دراسات فی نقد الادب العربی" ص۵۷ اور اس سے آگے دیکھئے۔

(۱) العنقاء کا پورا نام ثعلبۃ بن عمرو مزیقیاء بن عامر ماء السماء اور محرق کا نام الحارث بن عمرو مزیقیاء ہے یہ پہلا شخص تھا جس نے آگ سے جلانے کی سزا دی تھی۔

یہ تو تھے مدحیہ قصائد جو انھوں نے زمانہ جاہلی میں کہے تھے اب رہا اسلامی زمانہ کا کلام کا معاملہ اور اس میں قریش کی ہجو میں کہے گئے قصائد تو ان میں بھی ہمیں بڑی احتیاط اور چھان بین سے کام لینا پڑے گا اس لئے کہ ان میں بھی بڑا خلط ملط ہے اور اس زمانہ میں بھی ان کی طرف دوسروں کے اشعار بہت منسوب کئے گئے ہیں اس لئے ان قصائد میں سے ہم ان قصائد کو صحیح سمجھیں گے جن میں مکہ والوں کے حسب نسب اور جنگوں میں ان کی ناکامیوں اور فرار کو یاد دلا کر ان کی تحقیر کی گئی ہے اور ان کو بڑھا چڑھا کر بیان کر کے اس پر ان کی ہجو اور ان کے مقابلہ فخر کیا گیا ہے چنانچہ اس معیار پر ان کا قافیہ میم میں وہ قصیدہ پورا اترتا ہے جس کا مطلع ہے جس کو رواج کے مطابق تشبیب سے شروع کیا ہے ؎

۱۔ تبلتْ فؤادَک فی المنام خریدةٌ　　تسقی الضجیعَ ببارِدٍ بسّامِ[1]

یعنی رات کو خواب میں تمہارے دل کو ایک ایسی محبوبہ تڑپا گئی جو ہم بستر کو اپنے ہونٹوں کی شراب دو آتشہ پلاتی ہے۔ اس قصیدے میں ۲۸ شعر ہیں۔ اس میں حسان نے غزوہ بدر کی کامیابی پر فخر کیا ہے اور الحارث بن ہشام المخزومی کو اپنے بھائی ابوجہل بن ہشام کو بیچ معرکہ میں چھوڑ کر بھاگ جانے پر سخت شرم دلائی ہے اور لعنت ملامت کی ہے۔ بعد میں حارث بن ہشام مسلمان ہو گئے اور معرکہ اجنادین میں شہید ہوئے۔ یہ قصیدہ حسان کے اسلامی کلام کا بہترین نمونہ بھی ہے۔

۲۔ اسی طرح اس ضمن میں ان کا وہ قصیدہ بھی آتا ہے جس کا قافیہ بھی میم ہے جس کا مطلع ہے ؎

منع النومَ بالعشاءِ الهمومُ　　وخیالٌ إذا تغورُ النجومُ[2]

یعنی رنج و غم اور افکار و خیالات رات کو ستاروں کے ڈھلنے کے وقت نیند کو حرام کر دیتے ہیں۔ اس قصیدہ میں ۲۲ شعر ہیں۔ اس میں غزوہ احد کا ذکر اور

---

(۱) دیوان ص ۲۱۴ دار بیروت للطباعة والنشر۔

(۲) دیوان ص ۲۲۴۔

مکہ والوں کے مشہور شاعر ابن الزبعری کی ہجو ہے۔ اور اپنی قوم کی تعریف اور ان پر فخر میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں۔

۳۔ اس ضمن میں ان کا وہ لامیہ (قافیہ لام) قصیدہ بھی ہے جس کا مطلع یہ ہے

اھاجک بالبیداء رسم المنازل نعم قد عفاھا کل اسحم ھاطل

کیا تمہارے رنج و غم کو دوبارہ ان گھروں کی نشانیوں نے تازہ کر دیا جنہیں خوب برسنے والے کالے بادلوں نے مٹا دیا ہے؟ (۱) اس میں ۲۸ شعر ہیں اس قصیدہ کو جاہلیت کے مطابق محبوبہ کے اجڑے دیار کے ذکر سے شروع کرتے ہیں پھر اپنی قوم اپنے جوانوں پر فخر کرتے ہیں اس کے بعد آنحضرت کی جنگوں میں مدد کا ذکر کرتے ہیں جن میں بدر، احد اور غزوہ ثقیف کا خاص طور سے ذکر ہے۔

۴۔ حسان کے صحیح قصیدوں میں وہ قصیدہ بھی ہے جسے انھوں نے ایک سَرِیَّۃ کی موقعہ پر ابوسفیان کو مخاطب کر کے کہا تھا (۲)۔

---

(۱) دیوان ص۱۸۲۔

(۲) سَرِیَّۃ:۔ فوج کا ایک چھوٹا ٹکڑا یا دستہ جو کسی خاص مہم پر بھیجا جائے۔ آنحضرت مکہ والوں کے قافلہ تجارت کو لوٹنے یا کسی قبیلہ کی معمولی بغاوت یا ایذا رسانی کو روکنے کے لئے فوج کا ایک دستہ ایک سپہ سالار کی قیادت میں اسی خا، مقصد کے لئے بھیجا کرتے تھے جو کام گھات لگا کر کرتے تھے چنانچہ ایک دفعہ آپ کو معلوم ہوا کہ مکہ والوں کا ایک قافلہ جس میں بہت سا سونا چاندی اور ان کے برتن ہیں جن کا وزن ۳۰ ہزار درہم ہے صفوان بن امیہ، حویطب بن عبدالعزی اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کی نگرانی و سرکردگی اور فرات بن حیان کی رہبری میں شام جا رہا ہے۔ فرات بن حیان کو خطرہ ہوا کہ کہیں مسلمان چھاپہ نہ ماریں اس لئے اس نے شام کی طرف جانے والا راستہ چھوڑ کر ذات عرق سے ہو کر عراق جانے والے راستہ کو اختیار کیا۔ رسول اللہ صلعم کو فرات کی اس چال کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ آپ نے زید بن حارثہ کی سرکردگی میں ایک سو سواروں کا ایک دستہ قردہ کی طرف جو ذات عرق کی سمت میں نجد کے علاقے کے البزیدہ اور الغمرہ مقامات کے درمیان واقع ہے بھیجا۔ اس دستہ نے قافلہ کو تو لوٹ لیا مگر قریش کے سب لوگ جان بچا کر بھاگ گئے۔ زید قافلہ کو لے کر آنحضرت کی خدمت میں آئے تو آپ نے اس کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

جس کا مطلع ان کے دیوان (ص۱۸۱) میں یوں ہے ؎

أقمنا على الرس النزيع لياليا بأرعن جرّار عريض المبارك

یعنی ہم انھلے تالاب پر کئی راتیں ایک لشکر جرار کو جو سخت جنگجو تھا لیئے پڑے رہے۔ اس قصیدہ میں گیارہ شعر ہیں آخری شعر جس میں ابوسفیان کو مخاطب کیا ہے اس طرح ہے ؎

فابلغ ابا سفیان عنی رسالۃ فانک من شر الرجال الصعالک

یعنی میری طرف سے ابوسفیان کو یہ پیغام پہنچادو کہ تم چور زون اچکوں میں بد ترین آدمی ہو۔

۵۔ حسان کے صحیح قصیدوں میں وہ قصیدہ بھی ہے جس کا مطلع ہے

وان سنام المجد من آل هاشم بنو بنت مخزوم و والدک العبد

۶۔ ان کا چھٹا قصیدہ جو باتفاق رائے انھیں کا کہا ہوا ہے وہ ہے جسے ابوسفیان

(گذشتہ صفحہ کا باقی حاشیہ) پانچ حصے کیئے اس میں سے قرآن کی ہدایت کے مطابق پانچواں حصہ (انفال) جس کی مالیت بیس ہزار درہم تھی خود رکھا اور باقی ماندہ سریّۃ کے افراد میں تقسیم کرا دیا۔ (طبقات ابن سعد ص۲۴-۲۵) سریّۃ کا چھاپہ جنگ بدر کے تقریبًا ۹ مہینے بعد اور جنگ احد سے تقریبًا چار مہینے پہلے پڑا تھا. لیکن ابن ہشام نے سیرت نبوی میں اور حسان کے دیوان میں اس قصیدہ کو غزوہ بدر الموعد کے موقعہ پر کہنے کا ذکر ہے، جو غالبًا صحیح نہیں ہے کیوں کہ یہ غزوہ جنگ احد کے ایک سال کے بعد ہوا تھا۔ (حاشیہ طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی ص۲۰۶) ابن سلام نے اس قصیدہ کے صرف تین شعر دیئے ہیں جن میں پہلا ہے۔

دعوا فلجات الشام قد حال دونها جلاد كأفواه المخاض الأوارك.

یعنی ان لوگوں نے (قریشیوں) شام کے کھیتوں کو چھوڑ دیا کیوں کہ ان کے راستے میں سخت خونیں معرکہ کا خطرہ تھا جس کا آخری شعر ہے ؎ اذا سلکت حوران من أرض عالج فقولا لها: ان الطريق هنالک

یعنی اگر قافلہ شام کے راستہ پر چلے تو اس سے کہنا کہ عراق کا راستہ اختیار کرو کیوں کہ شام کے راستہ پر انصار اور مہاجرین اپنی تلواریں لیئے تاک میں بیٹھے ہیں۔

بن الحارث کو مخاطب کر کے کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

لعمرک ان إلک من قریش　　　کاِن السقب من رأل النعام

تمہاری جان کی قسم تمہارا نسبی تعلق قریش سے بالکل ایسا ہے جیسے ایک اونٹنی کے بچے اور شترمرغ کے بچے میں ہے۔

۷۔ ابوسفیان بن الحارث کی ہجو کرتے ہوئے ایک اور قصیدہ کہا ہے جس کے متعلق بھی یقین ہے کہ یہ انھیں کا ہے کہتے ہیں ۔

عفت ذات الاصابع فالجواء　　　إلی عذراء منزلها خلاءُ

یعنی ذات الاصابع، الجواء یہاں تک کہ عذراء تک کا سارا علاقہ جہاں میری محبوبہ ٹھہری تھی آج سب ویران وسنسان پڑے ہیں۔

جس میں آگے چل کر ابوسفیان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تم نے آنحضرت کی ہجو کی تو میں نے آپ کی طرف سے تمہارا جواب دیا جس کی وجہ سے خدا نے مجھے ثواب دیا اس قصیدے میں ۳۲ شعر ہیں اور یہ حسان کے کلام کا بہترین نمونہ بھی سمجھا جاتا ہے اس قصیدے کے متعلق بھی نقادوں کا خیال ہے کہ اس کے دو حصے ہیں ایک حصہ جاہلی دور کا ہے جس میں شراب وکباب اور محفل چنگ ورباب کا ذکر ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں آنحضرت کی طرف سے مدافعت کی ہے اور ابوسفیان سے کہا ہے کہ تم ایسے آدمی (آنحضرت) کے منہ لگتے ہو جس کے تم برابر نہیں ہو پھر اپنی قوم کی بہادری اور شجاعت کا ذکر کر کے قریشیوں کو دھمکاتے ہیں کہ خبردار آنحضرت سے نہ الجھو۔ ورنہ تم کو اس کا خمیازہ سخت جنگ سے بھگتنا پڑے گا۔

۸۔ اسی طرح ان کا وہ قصیدہ بھی ہے جس میں آپ کا اور آپ کے اصحاب کا جنگِ بدر کے موقعہ پر ذکر ہے ۔

مستشعری مانی المـاذی یقدمهم　　　جلد النحیزة ماض غیر رعدید

۹۔ حضرت حسان نے آنحضرت اور آپ کے صحابہ مثلاً ابوبکر اور حضرت عمر کے جو مرثیے کہے ہیں وہ بھی بلا اختلاف آپ کے ہی ہیں کہ ان میں بھی ان کے کلام اور اسلوب

بیان کا رنگ صاف جھلکتا ہے اور جن میں اسلامی رنگ اور اس کی تعلیمات کا عکس صاف نظر آتا ہے۔

درحقیقت حسان کے کلام میں اس خلط ملط یا ان کی طرف بعض قصائد کو غلط طریقے سے منسوب کرنے کا شبہ یوں پیدا ہوا کہ حسان کا اسلوب بیان جانا پہچانا ہے اور جاہلی اور اسلامی دونوں دوروں کے کلام کو اچھی طرح سے ایک دوسرے سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اسلامی زمانہ کا جو کلام ہے اس میں قرآن کا اسلامی تعلیمات کا اور حدیث نبوی کا اثر پوری طرح نمایاں ہے۔ پھر اس زمانہ کے کلام میں اسلامی الفاظ بکثرت استعمال کئے ہیں۔ جو ان کے جاہلی کلام میں نہیں ملتے۔ غرضکہ اسلامی زمانہ کا کلام اسلام اور آنحضرت اور اسلامی تعلیمات کا عکس ہے اور جاہلی زمانہ کا کلام مدح فخر اور غزل پر مشتمل ہے جس کا رنگ بالکل جدا ہے۔ اور دونوں زمانوں میں یہ بات مشترک رہی ہے کہ وہ فطری آمد کے فطری انداز سے شاعری کرتے تھے۔ بتکلف معنی آفرینی یا بلا وجہ کی حاشیہ آرائی ان کے مزاج کے خلاف بات تھی اس لئے ان کے بعض اشعار بہت ہی اونچے اور بعض بہت ہی سطحی اور معمولی درجے کے بھی ہیں، جن میں بعض جگہ شاندار اور خوب صورت اور سہل الفاظ کے ساتھ ثقیل شاذ اور مشکل الفاظ استعمال کر جاتے تھے۔

نمونۂ کلام :

حسان نے اکثر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ جیسے وصف منظر کشی غزل مرثیہ وغیرہ لیکن ان کا خاص میدان مدح ہجو اور فخر ہے جس پر زمانہ جاہلیت سے لے کر اسلامی دور تک ضرورت کے تقاضے کے مطابق طبع آزمائی کرتے رہے۔

مدح : جیسا کہ پہلے بیان ہوا حسان جاہلی شعراء کی ریت کے مطابق زمانۂ جاہلی میں غسّانی اور لخمی درباروں سے متعلق ہے اور ان قبیلوں کے فرماں رواؤں

اور بادشاہوں کی تعریف میں مدحیہ قصیدے لکھتے رہے چنانچہ انھوں نے غسّانی امرا میں سے عمرو الرابع ابن الحرث السادس (۵۹۷) اور اس کے بھائی النعمان السادس جو ابوکرب کے لقب سے مشہور تھا (۶۰۰) اور خاص طور سے جبلۃ الأیہم کی دل کھول کر تعریف و توصیف کی ہے یہ لوگ بھی نہ صرف دل کھول کر انعام و اکرام دیتے تھے بلکہ انھوں نے ان کا سالانہ وظیفہ بھی مقرر کر رکھا تھا جسے ان کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی انھوں نے جاری رکھا حالاں کہ وہ خود مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ چنانچہ زمانہ جاہلی کے مدحیہ کلام میں سب سے شاندار اور اسلوب بیان، معانی و مطالب تشبیہہ و استعارہ کنایہ و مجاز اور تمام فنی خوبیوں کے اعتبار سے سب سے جاندار کا وہی قصیدہ ہے جسے انھوں نے غسّانی بادشاہوں کے خاندان جفنہ کی شان میں لکھا ہے اور جس کا مطلع ہے۔

أسألت رسم الدار أم لم تسأل　　　　بين الجوابي فالبُضيع فحول

اس قصیدہ میں ۲۵ شعر ہیں جن میں سے چوتھے شعر تک جاہلی ریت کے مطابق تشبیب یعنی محبوبہ اور اس کی نگری کا ذکر اور ہجر و فراق پر تکلیف اور رنج و غم کا اظہار ہے اس کے بعد پانچویں شعر سے غسّانیوں کی تعریف شروع کی ہے اور مدح اور ان کی داد و دہش دونوں کا حق ادا کر دیا ہے کہتے ہیں ؎

لله درُّ عصابةٍ نادمتُهم　　　　يوماً بجلقَ في الزمان الاول

(ترجمہ پہلے گذر چکا ہے)

اس کے بعد ان کی بہادری شجاعت عالی نسبی امارت کا ذکر کرنے کے بعد ان کی مہمان نوازی اور غرباء، فقراء کی دست گیری کا ذکر کرتے ہیں۔

اولاد جفنة حول قبر أبيهم　　　　قبر ابن مارية الكريم المفضل

يسقون من ورد البريص عليهم　　　　بردى يُصفّقُ بالرحيق السلسل

یہ لوگ جفنۃ کی اولاد میں سے ہیں جن کے پرکھوں کی قبروں کے ارد گرد ابن ماریہ کی قبر ہے یعنی یہ لوگ خانہ بدوش نہیں بلکہ شام کے اس مرغزار میں جس کا نام

بریص (۱) سے ہمیشہ سے رہتے آئے ہیں چنانچہ جب کبھی ان کے پاس اس جگہ کوئی آتا ہے تو اسے وہ لوگ دریائے بردی (۲) کا پانی پلاتے ہیں جسے صاف ستھری شیریں اور ٹھنڈی شراب ملا کر روح افزا بنا دیتے ہیں۔ پھر ان کے حسب نسب کی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے چہرے کندن ان کی ناکیں اونچی اور ان کا خاندان بڑا عالی ہے اس لئے وہ لوگ اول درجہ کے لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔

بیض الوجوہ کریمۃ أحسابهم　　شم الأنوف من الطراز الاول

اس طرح اس قصیدہ میں فخر وصف سبھی طرح کے اشعار آ گئے ہیں۔

اسلامی زمانہ میں جو مدحیہ قصائد کہے ہیں وہ عام طور سے آنحضرت کی شان میں ہی ہیں اگرچہ بعض قصیدے آپ کے خلفاء اور بڑے صحابہ کی تعریف و توصیف میں بھی کہے ہیں اس زمانہ کے مدحیہ قصائد اور جاہلی زمانہ کے مدحیہ قصائد میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اسلامی زمانہ میں مدح کے پیرایہ میں انعام و اکرام کی طلب یا خوشامدانہ انداز بیان نہیں ہے بلکہ آنحضرت کی بحیثیت ایک سچے رسول کی ایسی سچی تعریف ہے جو ایمان و عقیدہ کی دین کے طور پر شدید محبت بے پناہ تعلق ان سے پیدا شدہ فدائیت کے ان جذبات میں ظاہر ہوتی ہے جن کے نتیجہ میں آدمی ممدوح کی خاطر جان ہار کر بھی اپنے آپ کو خوش قسمت شادکام اور کامیاب سمجھتا ہے جہاں خود بقول حسان ماں باپ آل اولاد عزیز و اقارب عزت اور حیثیت کچھ نہیں رہ جاتی بلکہ سب کو قربان کر کے بھی آدمی یہ سمجھتا ہے کہ کچھ کھویا نہیں بلکہ بہت کچھ پا لیا اور فخر کرتا ہے کہ

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

فان أبي و والـــده وعرضي　　لعرض محمد منكم وقاء

آنحضرت کی شان میں کہے گئے مدحیہ قصائد میں سب سے خوبصورت

---

(۱) دمشق کے قریب ایک جگہ کا نام۔

(۲) شام کا مشہور دریا۔

وہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے ؎

أغَرُّ علیہ للنبوۃ خاتمٌ　　　من اللہ مشھود یلوح ویُشھَدُ

یعنی آپ بڑے خوش خصال سراپا اخلاق ہیں آپ کے پاس خاتم نبوت ہے جس کی گواہی خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس قصیدے میں ۹ شعر ہیں۔ اس قصیدے میں آگے چل کر آنحضرت کا مقام اتنا اونچا دکھاتے ہیں کہ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہتے ہیں کہ آپ کی عظمت اور بڑائی کو کون پہنچ سکتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ خدا نے آپ کے ذکر کو اپنے نام کے ذکر کے ساتھ پانچ وقت کی نمازوں کی اذان میں اس طرح جوڑ رکھا ہے کہ کبھی چھوٹ سکتا ہی نہیں۔ (کیوں کہ مؤذن پانچوں اذانوں میں کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں) خدا نے آپؐ کا نام بھی اپنے نام ہی سے تراشا ہے تاکہ دوئی کا کوئی پردہ بیچ میں رہ ہی نہ جائے تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری" چنانچہ خود محمود ہے اور آپؐ کا نام محمد رکھ دیا[1] ؎

وضمّ الإلٰہُ اسم النبی إلی إسمہ　　　اذا قال فی الخمس المؤذنُ أشھدُ

وشق لہ من إسمہ لیُجلہ　　　فذو العرش محمود وھذا محمد

جب کسی نبی کی یہ شان ہو کہ خالق و مخلوق کے درمیان حائل سارے پردے ہٹ جائیں تو پھر عکس محبوب کی تجلیاں اس کو وہ روشن اور تابناک چراغ بنا دیتی ہیں جس کے نور ہدایت سے ساری دنیا اس طرح چمک اٹھتی ہے کہ جس چمک دمک کے سامنے ہندوستان کی بنی چمپاتی تلوار بھی ماند پڑ جاتی ہے

فامسی سراجا مستنیرا وھادیاً　　　یلوح کما لاح الصقیل المُھنّدُ[2]

آنحضرت کی مدح میں آپ کے بہت سے اشعار ہیں لیکن ان میں سب سے خوبصورت اور منفرد معنیٰ اور مفہوم کے اعتبار سے ان دونوں شعروں کا جواب نہیں جن میں کہتے ہیں کہ

---

(۱) دونوں کا مادہ 'ح م د' ہے۔　　　(۲) دیوان ص ۴۷۔

وأحسن منك لم تر قط عيني ۔۔۔ وأجمل منك لم تلد النساء
خلقت مبرأً من كل عيب ۔۔۔ كأنك قد خلقت كما تشاء

یعنی آپ سے بڑھ کر حسین آدمی آج تک میری آنکھ نے نہیں دیکھا اور عورتوں نے آپ سے بڑھ کر خوب صورت بچے کو جنم ہی نہیں دیا آپ تمام عیبوں اور برائیوں سے اس طرح پاک صاف پیدا کئے گئے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ آپ اس طرح پیدا ہوئے ہیں جس طرح آپ خود چاہتے تھے۔

آفاقها گردیده ام مهر بتاں ورزیده ام ۔۔۔ لیکن تو چیزے دیگری

مدح میں حسان عام طور سے جاہلی ریت کے مطابق تشبیب یعنی محبوبہ اور اس کے ٹھہرنے کی جگہوں کی یاد سے شروع کرتے تھے اور پھر دو تین شعر کے بعد گریز کر کے اپنے ممدوح کی تعریف شروع کرتے تھے۔ جس میں کبھی کبھی فخر یا اپنے قبیلہ اور افراد کے کارناموں کو گنا یا کرتے تھے اور اسلامی زمانہ میں آنحضرت کی مدد کرنے اور آپ پر جان تک نچھاور کر دینے کو سرمایہ حیات بتایا کرتے تھے۔ اسلوب بیان میں دونوں زمانوں یعنی جاہلی اور اسلامی میں کوئی بہت فرق نہیں ہے البتہ اسلامی زمانہ میں جہاں اسلامی حقائق ثابتہ کا ذکر آتا ہے تو وہ کچھ پھیکا لگتا ہے جیسے خدا کی وحدانیت یا جنت اور دوزخ کا ذکر یا شر کی برائی اور خیر کی بھلائی اور اس کی طرف ترغیب دلانا یہ حقائق ایسے ہیں جن میں نہ مبالغہ کی چاشنی کی آمیزش کی گنجائش ہے اور نہ اشارہ وکنایہ اور تشبیہہ واستعارہ کی۔ اس لیے ایسے موقعوں پر زبان کا چٹخارہ نہیں ملتا ہے جو قدرتی بات ہے اور یہی وہ مقامات ہیں جن کی وجہ سے بعض نقادوں نے حسان کے اسلامی زمانہ کے کلام کو کمزور بتایا ہے۔ مثلاً یہ شعر

وانذرنا ناراً وبشر جنة ۔۔۔ وعلمنا الاسلام فالله نحمد
وأنت إله الخلق ربي وخالقي ۔۔۔ بذلك ما عمرت في الناس أشهد

یعنی آنحضرت نے ہمیں دوزخ سے ڈرایا اور جنت کی بشارت دی اور ہمیں

اسلام کی دعوت وتعلیم دی اس لئے ہم اللہ کے شکر گزار ہیں اے خدا تو تمام مخلوقات کا معبود اور میرا بھی خالق اور پالن ہار ہے میں جب تک جیتا رہوں گا اس بات کی گواہی دیتا رہوں گا۔ اب ان باتوں کے بیان کرنے کے لئے جنھیں مسلمان حقائق مجردہ میں تسلیم کرتے ہیں کیا نکتہ آفرینی کی جا سکتی ہے۔ ان باتوں کو سیدھے سادے طریقے سے بیان کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ اور یہی حسان نے کیا بھی ہے اس میں کسی کمزوری کو نہیں بلکہ مجبوری کو دخل ہے۔

فخر اہجو:۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اسلام لانے سے پہلے حسان بحیثیت اپنے قبیلہ کے شاعر کے مخالف قبیلوں کے شاعروں سے نبرد آزمائی کے ذریعے اپنے قبیلہ کی طرف سے مدافعت کرتے تھے چنانچہ ان کا پہلا معرکہ قبیلہ اوس کے شاعر قیس بن الخطیم سے ہوا اور ایک زمانہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا جس میں حسان حریف قبیلے اور اس کے افراد کی برائیاں اور کمزوریاں گنا کر ہجو اور اسی ضمن میں اپنے قبیلہ اور افراد قبیلہ پر فخر کیا کرتے تھے۔ اس طرح ہجو کے ضمن میں فخر بھی خود بخود پیدا ہو جاتا تھا اس قسم کے ہجو یہ فخر یہ کلام کو بھی جاہلی ریت کے مطابق عام طور سے تشبیب سے شروع کرتے تھے اور پھر بڑے بلند آہنگ فخر پر آتے تھے جیسے ان کے یہ شعر جنھیں انھوں نے قیس بن الخطیم کے جواب میں لکھے تھے ؎

لعمر أبیک الخیر یا شعثَ ما نبا   علیّ لسانی فی الخطوب ولا یدی

یعنی اے شعثا، (ان کی محبوبہ کا نام) تمہارے نیک باپ کی قسم مصیبتوں، (جنگوں) میں نہ کبھی میری زبان تھکی اور نہ میرا ہاتھ بلکہ ؎

لسانی و سیفی صارمان کلاھما   ویبلغ ما لا یَبْلغُ السیفُ مِذْوَدی

میری زبان اور میری تلوار دونوں ہی دو بڑی تیز تلواریں ہیں البتہ میری زبان اس جگہ تک پہنچ جاتی ہے جہاں تلوار نہیں پہنچ سکتی۔ اس کے بعد اپنی سخاوت کا ذکر کرتے ہیں کہ جو کچھ مجھے ملتا ہے میں اسے لٹا دیتا ہوں اور مہمان نوازی کا یہ عالم ہے کہ سخت طوفانی راتوں میں کھانے پکانے کے لئے چولہے جلواتا ہوں اور میں

مزاج کا بڑا میٹھا ہوں مگر کبھی کبھی کڑواہٹ بھی آجاتی ہے۔ اوران چیزوں کو بالکل چھوڑ دیتا ہوں۔ جن کی مجھے عادت نہیں ہوتی ؎

وانی لمعط ماوجدت و قائل ۔۔۔ لموقد ناری لیلۃ الریح اوقد

وانی لحلو تعتریتی مرارۃ ۔۔۔ وانی لتراک لما لم أعود

اپنے اباء و اجداد کا ذکر بڑے فخریہ انداز میں کرتے ہیں میرے پرکھے (دادیہالی اور نانیہالی) ابولیلی (تیم اللہ جس کی کنیت نجار تھی) اور بنو کعب (خزرج بن ساعدہ) جیسی شخصیتیں تھیں جو قحط اور سخت سردی کے زمانے میں تنگ دست لوگوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔

جدی ابو لیلی و والدہ ۔۔۔ عمرو و أخوالی بنو کعب

وانا من القوم الذین إذا ۔۔۔ أزم الشتاء محالف الجدب

أعطی ذوو الاموال مُعسرَھم ۔۔۔ والنصاریین بموطن الرعب

مکہ والوں کے مشہور شاعر اور آنحضرت کے سخت مخالف مشرک الزبعری (۱) کا جواب دیتے ہوئے جو قصیدہ کہا ہے وہ حسان کے فخریہ اشعار کا بہت حسین نمونہ ہے جس کا مطلع ہے ؎

سالت قریشا فلم یکذبوا ۔۔۔ فسل وجوحا و أبا عامر

آگے کہتے ہیں۔

وانا مَسَاعِیرُ عند الوغی ۔۔۔ نرد شبا الأبلغ الفاجر

ورثتُ الفعال وبذل التلا ۔۔۔ دو المجد عن کابر کابرِ

دوسرا قصیدہ جو فخر میں نمونہ ہے اس کا مطلع یہ ہے۔

ألم تزنا أولاد عمرو بن عامر ۔۔۔ لنا شرف یعلو علی کل مرتقی (۲)

غزوہ بدر کے موقعہ پر مکہ والوں کی شکست اور اپنے قبیلہ کی بہادری پر یوں فخر کرتے ہیں۔

---

(۱) عبداللہ بن الزبعری کے حالات اس کتاب کے صفحہ پر ملاحظہ کیجئے۔ (۲) دیوان ص ۱۶۶۔

لقد علمت قریش یوم بدر　　غداة الأسر والقتل الشدید
باناحین تشتجر العوالی　　حماة الروع یوم ابی الولید
قتلنا ابنی ربیعة یوم ساروا　　الینا فی مضاعفة الحدید

اس کے بعد مکہ والوں کی ہجو کرتے ہیں۔

وفر بها حکیم یوم جالت　　بنو النجار تخطر کالأسود
وولت عند ذاک جموع فهر　　وأسلمها الحویرث من بعید
لقد لاقیتم خزیا وذلاً　　جهیزاً باقیا تحت الورید

وہ قصیدہ بھی جس کا مطلع ہے۔

وکنا ملوک الناس قبل محمد　　فلما اتی الاسلام کان لنا الفضل

فخر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ غرض کہ اس قسم کے اشعار جن میں فخر کے ساتھ ہجو بھی شامل ہر بہت ہیں اور اپنے انداز بیان اور معانی و مطالب کے اعتبار سے برے نہیں ہیں۔

حضرت حسان ہجو میں بہت فحش اور عریاں باتیں کہنے کے عادی تھے مسلمان ہونے کے بعد آنحضرت کے خیال سے فحش گوئی اور ابتذال سے احتراز کرنے لگے تھے چنانچہ خود کہا ہے

لولا النبی وقول الحق مغضبة　　لما ترکت لکم انثی ولا ذکرا[2]

یعنی اگر آنحضرت کا پاس ادب نہ ہوتا تو میں تم لوگوں کے مردوں میں سے کسی کی عزت نہ چھوڑتا اور نہ عورتوں کی۔ ہجو میں سب سے زیادہ سخت باتیں انھوں نے ابوسفیان اور قبیلہ مزینہ کو کہی ہیں کیوں کہ مکہ والوں میں جیسا کہ سب کو علم ہے ابوسفیان اسلام لانے سے پہلے آنحضرت اور اسلام کا سخت دشمن تھے اور اسی طرح قبیلہ مزینہ کو اسلام اور آنحضرت سے کد تھی۔ چنانچہ ان دونوں قصیدوں[3] میں فحش باتیں تک کہہ دی ہیں۔ چنانچہ حسان نے

---

(۱) دیوان ص ۱۹۱　(۲) دیوان ص ۱۳۰۔

(۳) ہجو مزینہ دیوان ص ۲۶ ہجو ابوسفیان ص ۹۹ دیوان ص ۱۲۱۔

جاہلی اور اسلامی دونوں زبانوں میں دشمنوں کے جواب دینے اور اپنے قبیلہ اور آنحضرت کی مدافعت کرنے کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی اس لئے ان کے دیوان میں مدح و فخر کے بعد جو جاندار اور زیادہ حصہ ہے وہ ہجو یہ کلام کا ہی ہے ۔

نقائض حسّان :۔

حسان کے ہجویہ اشعار میں نقائض بھی ہیں جن میں بعض اسلامی دور سے پہلے کے ہیں اور بعض اسلامی دور کے ۔ چنانچہ جاہلی دور کے نقائض میں امیہ بن خلف الخزاعی کے جواب میں کہا ہوا قصیدہ بہت مشہور اور جاندار ہے خزاعی نے کہا تھا ؎

أَلا مَنْ مبلغٌ حسّان عَنّي ۔۔۔ مُغلغلةً تَدِبّ إلى عُكاظ

یعنی ہے کوئی جو حسان کو میرا وہ پیغام پہنچا دے جو عکاظ میں بھی پہنچ کر رہے گا ۔ اس میں امیہ نے حسان کے باپ کو غلام بتایا ہے جس کا کام لوہار کی دھونکنی چلانا تھا ۔ حسان نے اس کو ایسا سخت جواب دیا کہ بیچارہ کے منہ پر تالا پڑ گیا مطلع ہے ۔

أتاني عن أمية زُورُ قول ۔۔۔ وما هو بالمغيب بذي حفاظ

یعنی امیہ کی طرف سے مجھے ایک بڑی جھوٹ بات کہنے کی اطلاع ملی ہے اب اس کی خیر نہیں ہے اس کے بعد اس کی سخت ہجو کی ہے اور کہا ہے کہ میری ہجو میں کہا ہوا تیرا قصیدہ تو عکاظ تک پہنچ کر رہے گا مگر میرا کہا ہوا قصیدہ صرف عکاظ ہی نہیں بلکہ تیری جان کہیں بھی نہیں چھوڑے گا ۔ اس قصیدہ کا قافیہ 'ظ' کا ہے اور 'ظ' کا حرف اور اس سے مرکب الفاظ دونوں بہت سخت اور ان کی زمین بہت سنگلاخ ہوتی ہے چنانچہ حسان نے اس قصیدے میں بعض بہت مشکل اور شاذ الفاظ بھی استعمال کئے ہیں ۔ (۱) جن کے معنی بغیر لغت کی مدد کے سمجھنا مشکل ہے ۔

---

(۱) دیوان صـ۳۹

جوابی شاعری میں حسان کا وہ قصیدہ بہت شاندار ہے جو انھوں نے شداد بن الاسود اور ابوسفیان بن حرب کے جواب میں کہا تھا۔ غزوہ احد ۳ھ کا معرکہ گرم تھا ایک صحابی حنظلہ بن ابی عامر ابوسفیان بن حرب کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر چڑھے ہوئے ہیں، شداد بن الاسود نے جب مکہ کے ایک سردار کی یہ بے بسی دیکھی تو اس نے پیچھے سے حنظلہ پر تلوار کا وار کر کے ان کو ختم کر دیا۔ رسول اللہ نے تھوڑی دیر بعد اپنے صحابہ سے کہا کہ دیکھو حنظلہ کو فرشتے نہلا رہے ہیں ذرا ان کی بیوی سے پوچھو تو کیا بات ہے۔ لوگوں نے جب ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ جب جنگ کا بگل بجا تو وہ ناپاک تھے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ یہی وجہ ہے کہ فرشتے ان کو نہلا رہے ہیں۔ چنانچہ شداد نے حنظلہ کو قتل کر کے کہا ؎

لَأُحْمِيَنَّ صاحبی و نفسی بطعنةٍ مثل شعاع الشمس

ابوسفیان نے شداد کی بروقت مدد اور حنظلہ کے قتل کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

لو شئتُ نجّتني كميتٌ طِمِرَّةٌ ولم أحمل النعماء لابن شعوب

اس کا جواب حسان نے اس قصیدے سے دیا جس کا مطلع ہے۔

ذكرت القروم الصيدَ من آل هاشم

ولستَ لزورٍ قلتَهُ بمُصيبِ

اس قصیدے میں صرف چار شعر ہیں لیکن سب برچھی کی انیاں ہیں۔

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے ان کا سب سے شاندار اور فوراً شعر کہنے میں مہارت کا ثبوت ان کا وہ قصیدہ ہے جسے انھوں نے بنو تمیم کے شاعر الزبرقان بن بدر کے جواب میں اس وقت کہا تھا جب بنو تمیم کا وفد آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور زبرقان نے اپنا مخریہ قصیدہ سنایا تھا جس کا مطلع تھا۔

نحن الكرام فلا حيٌّ يعادلنا منا الملوك و فينا يقسم الربع

اس کے جواب میں حسان نے جو قصیدہ کہا وہ فخر اور مدح کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے جس کا مطلع ہے۔

ان الذو اشب من فهر وإخوتهم   قد بيّنوا سنةً للناس تتّبعُ (1)

معرکہ بدر میں مکہ والوں کی جو ذلت آمیز شکست ہوئی تھی اس پر مکہ والے اور ان کے ساتھی شعراء اور حلفاء خون کے آنسو روئے تھے آنحضرت کا مخالف اور مکہ والوں کا ساتھی مشہور شاعر عبداللہ بن الزبعری نے بدر کے مقتولین کا ایک دردناک مرثیہ کہا تھا جس کا مطلع ہے۔

ماذا على بدر وماذا حوله   من فتية بيض الوجوه كرام

اس پر حسان نے ایک چبھتا ہوا قصیدہ کہا جس میں الزبعری کو مخاطب کر کے کہا کہ کاش تیرے آنسو خون کے آنسو ہو جاتے۔

ابكِ بكتْ عيناك ثم تبادرت   بدم تُعَلّ غروبها سَجّامُ

الزبعری اس وقت ان آنسوؤں کو خون کے گھونٹ کی طرح پی گیا لیکن جنگ احد میں جب مسلمانوں کو مکہ والوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تو اس کے انتقام کی آگ بھی چنانچہ اس نے اس شکست پر مسلمانوں کی خوب پھبتی اڑائی قصیدہ کا مطلع ہے۔

يا غرابَ البين أسمعتَ فَقُلْ   إنما تنطق شيئًا قد فُعِلْ

اس موقعہ پر اس کو حسان کی بدر کے موقعہ پر کہی ہوئی بات یعنی خون کے آنسو مستقل رونے کی بات یاد تھی چنانچہ حسان کی بات کا ذکر کر کے اس نے کہا

أبلغا حسانَ عني آيةً   فقريض الشعر يشفي ذا الغلل

حسان نے جب یہ سنا تو اس کو بدر کی شکست فاش یاد دلا کر جواب دیا کہ جنگوں میں یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے کبھی تمہاری جیت کبھی ہماری جیت۔

نزلتْ بابن الزبعرى ضربةٌ   كان لنا الفضل فيها لو عدل

ولقد نِلتمْ ونِلنا منكمُ   وكذاك الحرب احيانا دُوَلْ

---

(1) دیوان ص ۱۴۵۔

اس جنگ میں مسلمانوں کی شکست کے بعد مکہ والوں کے ایک دوسرے شاعر ہُبیرہ بن ابی وہب نے فخریہ کہا تھا کہ

سُقنا کنانۃَ من أطراف ذی یمنٍ — عرض البلاد علی ما کان یُزجیھا
قالت کنانۃ: أنیٰ تذھبون بنا — قلنا النخیل فأمّوھا ومن فیھا

اس کا بھی جواب حسان نے منہ توڑ دیا۔

سقتم کنانۃ جہلا من سفاھتکم — الی الرسول فجند اللہ مُخزیھا
اوردتموھا حیاض الموت ضاحیۃ — فالنار موعدھا والقتل لاقیھا
ألا اعتبرتم بخیل اللہ اذ قتلت — أھل القلیب ومن ألقینۃ فیھا

ان اشعار میں قرآن کی آیات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے (۱) مکہ والوں سے حسان کی نوک جھونک کی بہت سی عمدہ مثالیں ہیں تفصیل کے لئے ان کے دیوان کو ملاحظہ کیجئے۔

فخر اور ہجو میں حسان کا اسلوب بیان بالکل جاہلی انداز کا ہے وہی بھاری بھرکم اور گمبھیر الفاظ اور وہی ترکیبیں اور انداز تکلم ہے۔ ان کو دیکھ کر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا سہ اسلام لانے کے بعد حسان کے شعر میں کمزوری آگئی تھی۔

مرثیہ: اسلام سے پہلے حسان کے یہاں مراثی کا ذکر نہیں ملتا۔ جاہلی زمانہ کے کلام میں ان کے دیوان میں صرف ایک قصیدہ ہے جسے صحیح معنوں میں مرثیہ کہا جا سکتا ہے اور وہ ہے الحارث بن الجفنی کا مرثیہ جو شاہان غسّان میں تھا اور ابن ابی شمر الغسانی کے نام سے مشہور تھا اس کا مطلع ہے۔

انی حلفت یمیناً غیر کاذبۃٍ — لو کان للحارث الجفنی اصحابُ

لیکن اسلامی زمانہ میں آنحضرت کے وصال کے بعد جیسے ان کا دل پھٹ گیا اور ساری قوت گویائی جو فخر و ہجو میں بم کی طرح کام کرتی تھی اب رستے خون میں

(۱) تفصیل شعر المخضرمین: یحیی الجبوری ص ۲۷۔

تبدیل ہوگئی جوان کے ٹوٹے دل سے ہر وقت رستا رہتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے آنحضرت کے بہت ہی دل دوز مرثیے لکھے ہیں جنھیں پڑھ کر خود بھی زار و قطار روتے تھے۔ اور سننے والے بھی گنگا جمنی بہا دیتے تھے۔ حسان کا آنحضرت کے مرثیہ میں سب سے مؤثر اور دردناک وہ مرثیہ ہے۔

مابالُ عینک لا تنام کأنّما کُحِلتْ مآقیھا بکحل الأرمد

یعنی تمہاری آنکھوں کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ اس کی نیند اس طرح اُڑ گئی ہے جیسے کہ وہ بری طرح اٹھنے کو آ گئی ہوں۔ اس کے بعد ایک شعر میں کہتے ہیں کہ آپ کی وفات سے میرے اوپر ایسا سکتہ طاری ہے کہ سدھ بدھ سب کچھ جاتی رہی کاش میں یہ دن دیکھنے کے لیے پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔

فظللتُ بعد وفاتہ متبلّداً یا لھفَ نفسی لیتنی لم أُولدِ[1]

اس مرثیہ میں ۱۹ شعر ہیں اس میں انصاریوں کی آپ کی مدد کرنے کا ذکر اور پھر آپ کی ذات سے محرومی پر رنج وغم کا اظہار بھی ہے۔ اسی طرح کا ایک دوسرا مرثیہ بھی ہے جو نسبتاً لمبا ہے اس کا مطلع ہے

بطیبةَ رسمٌ للرسول ومعھدٌ منیرٌ وقد تعفو الرسوم وتھمدُ

اس میں ۴۷ شعر ہیں جن میں آنحضرت کے اوصاف انصاریوں کا آپ کا ساتھ دینے، دنیا میں آپ کی ذات سے ہدایت و رشد کے پھیلنے کے ذکر کے بعد آپ کے وصال پر شدید رنج وغم کا اظہار ہے اور مدینہ میں آپ کی ذات سے جو برکتیں نازل ہوتی تھیں ان کا ذکر بڑے درد دکھ کے ساتھ ہے۔ ان قصیدوں کے علاوہ دوسرے مرثیہ بھی ہیں جو بہت ہی دکھ بھرے ہیں۔

آپ کی زندگی میں حسان نے اصحاب الرجیع (۳) اور اس حادثہ میں شکار ایک

---

(۱) دیوان ص۵۷۔ (۲) دیوان ص۵۴۔

(۳) اصحاب الرجیع :- مکہ اور عسفان کے درمیان ایک تالاب تھا جس کا مالک قبیلہ ھُذَیل تھا۔ آنحضرت نے کچھ مسلمانوں کو قبیلہ عضل اور القارہ کے لوگوں کے ساتھ اسلام کی تعلیم دینے کے لئے بھیجا تھا ان لوگوں نے اس تالاب پر پہنچ کر ان مبلغین کو دھوکہ سے قتل کر دیا۔ اس پر حسان نے یہ مرثیہ کہا دیوان ص۱۸۔

صحابی خبیب بن عدی الانصاری حضرت حمزہ اور دیگر اشخاص اور مواقع پر بھی مرثیے کہے ہیں۔ جو زبان بیان کے اعتبار سے خاصے ہیں۔

آنحضرت کے انتقال کے بعد ایسا لگتا ہے کہ حسان بالکل بجھ سے گئے ان کو ایسی چپ سی لگ گئی کہ پھر کچھ نہ کہہ سکے جیسے کوئی ہرا بھرا درخت کہ باد سموم کے ایک جھونکے سے اس طرح مرجھا کر سوکھ جائے کہ پھر ہرا نہ ہو سکے۔ مگر آنحضرت کے خلفاء خاص طور سے ابو بکرؓ اور عمرؓ کے انتقال پر ایک بار پھر ان کے دل کو چوٹ لگی جس کی صدائے بازگشت ان دلدوز مرثیوں میں سنائی دی جو انھوں نے ان دونوں کے انتقال پر کہے تھے۔

آپ کے خلفاء میں حضرت عثمان کے ساتھ باغیوں نے جو سلوک کیا اور جس طرح ان کا بے دردانہ قتل ہوا اس کو حسان بھی برداشت نہ کر سکے اور ان کی بے کسی کسمپرسی دوست احباب کا ساتھ چھوڑ دینے پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور جب وہ قتل ہو گئے تو بہت دردناک مرثیے کہے۔ جن میں سے ایک کا مطلع ہے۔

إن تمس دار ابن أروى منه خالية

باب صريع وباب مخرق خرب

اس کے علاوہ کئی مرثیے اور بھی عثمان کے قتل پر کہے ہیں جو سب کے سب ہی دردناک ہیں (۱)

غزل:- جیسا کہ بیان ہوا حسان کا اصل میدان شعر مدح ہجو اور فخر تھا لیکن دوسرے اصناف سخن مثلاً غزل اور وصف میں بھی ان کی طبیعت ایک حد تک رواں تھی۔ غزل میں وہ اکثر شعثاء کے نام سے پھر عمرہ اور اس کے بعد زینب نامی تین محبوباؤں کے نام سے تشبیب یعنی اظہار عشق کرتے تھے۔ ان تینوں میں سے شعثاء کا ذکر قصیدے کے شروع میں اکثر آتا ہے۔ مگر یہ محض تشبیب کے طور پر ہے۔ عشق یا محبت کے طور پر نہیں اسی لئے اس سے گریز کر کے اصل مطلب مدح یا فخر پر آجاتے ہیں جیسے

فدع هذا، ولكن من لطيف يؤرقني إذا ذهب العشاء

---

(۱) دیوان ص۱۰۰، ص۱۰۲ و ص۱۰۳ وغیرہ

لشعثاء التي قد تيّمته	فليس لقلبه منها شفاء (۱)

یا

لعمر أبیک الخیر یا شعث ما نبا	علیّ لسانی فی الخطوب ولا یدی

یا جیسے زینب کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

عرفت دیار زینب بالکثیب	کخط الوحی فی الرق القشیب

حسان کے کلام میں غزل بطور فن کے نہیں ملتی اگر کہیں ملتی ہے تو وہ محض سخن گسترانہ بات ہے اسی لئے اس صنف میں ان کا رنگ بہت پھیکا اور مضامین بہت پٹے ہیں۔

وصف:- حسان کے کلام میں وصف بھی ملتا ہے اسلوب بیان اور معانی و مطالب کے اعتبار سے متوسط درجے کا ہے جس میں نہ جدت ہے اور نہ ندرت بلکہ معروف و مشہور مضامین پر مبنی ہے جیسے محبوبہ کی آنکھ کی تشبیہہ کم سن ہرن کی آنکھ سے یا گردن کی تشبیہہ ہرنی کی گردن سے جس کے حسن کو یاقوت اور زبرجد کا ہار دوبالا کر رہا ہے۔

تراءت لنا یوم الرحیل بمقلتی	غریر بملتف من السدر مفرد

وجید کجید الرئم صاف یزینه	توقّدُ یاقوتٍ وفصل زبرجد

کأنّ الثریا فوق ثغرة نحرها	توقّدُ فی الظلماء أی توقّد (۱)

البتہ شراب اور شراب کے اثر کے وصف میں حسان نے بہت معنی آفرینی کی ہے اور اپنے عام اسلوب بیان اور ریت سے ہٹ کر اس مضمون میں بہت خوبصورت اور ہلکے پھلکے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جیسے کہتے ہیں کہ میں نے میخانوں میں خوب نیز مرچ جیسی دُختِ رز کے ایسے جام کے جام لنڈھائے ہیں۔ جنھیں ایک ساقی گلفام جس کے کانوں میں آویزے دمکتے ہوتے ننھے ننھے بار بار دیتا تھا۔ چاہے میں پیاسا ہوں یا نہ ہوں۔

---

(۱) دیوان ص۔

ولقد شربتُ الخمرَ فی حانوتِها   صہباءَ صافیۃً کطعم الفلفل

یسعیٰ علیّ بکأسِہا مُتنطّفٌ   فیُعُلّنی منہا و لو لم أنہل

اور اس شراب کا جو اثر شرابی پر ہوتا ہے اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں کہ وہ شراب رگ و پے میں اس طرح ہولے ہولے سرایت کرتی ہے جس طرح نرم چکنی اور ریتیلی زمین پر ٹڈی کا نوزائیدہ بچہ رینگتا ہے۔

تَدِبُّ فی الجسم دبیبا کما   دَبَّ دبیّ وسط رقاق ھیام

حسان کے کلام کی مذکورہ بالا فنی خوبیوں اور ادبی امتیازی خصوصیات کے علاوہ ان کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری زمانہ جاہلیت سے لے کر اسلام تک کے زمانے کی تاریخ بھی ہے۔ کیوں کہ ان کے اشعار سے نہ صرف غسانی بادشاہوں اور ان کی مملکت اور دربار شام کے حالات وکیفیات کا علم ہوتا ہے بلکہ عربوں کی اور خاص طور سے قریش کی تاریخ کے بہت سے اہم باب اور دوروں کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں جنگوں کے نام تاریخ، بڑے اہم واقعات اور کارناموں کی طرف واضح اشارے ہیں۔ صدر اسلام کی تاریخ کا تو گویا شعری ذخیرہ ہے کہ عام طور سے سارے اہم واقعات خصوصاً غزوات اور ان سے متعلق غازیوں اور شہیدوں، اسلام اور آنحضرت کے دشمنوں کے تذکروں سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔ اس طرح بقول حنا الفاخوری "حسان صرف شاعر اور مؤرخ ہی نہیں تھے بلکہ ان کے کلام سے سیاسی شاعری کی ابتدا بھی ہوتی ہے جس نے اموی زمانہ میں شاعری کی ایک نئی قسم کے روپ میں عربی ادب کے دامن کو گلہائے رنگ رنگ سے بھر دیا۔" (۱)

صحابہ حسان کے کلام کو ان ظاہری اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے تقدس کی حد تک مانتے تھے اور اسی انداز سے سنتے تھے کیوں کہ انھیں کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ ممبر نبوی سے اپنے قصائد سنائے تھے چنانچہ اسماء بنت ابوبکر روایت

(۱) حنا الفاخوری: ... الادب العربی ...

کرتی ہیں کہ زبیر بن العوام ایک دفعہ صحابہ کی ایک محفل سے گزرے جس میں حسان اپنے شعر سنا رہے تھے انھوں نے محسوس کیا کہ لوگ کچھ دھیان سے ان کا کلام نہیں سن رہے ہیں تو بولے تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم ابن الفُریعۃ کے کلام پر کان نہیں دھرتے ہو حالاں کہ یہ وہ شخص ہیں کہ آنحضرت بھی ان کا کلام بڑی توجہ اور دلچسپی سے سنتے تھے اور بہت انعام و اکرام دیتے تھے اور جب وہ کلام سناتے تھے تو آپ ہمہ تن گوش بن جاتے تھے (۱) حسان کو بھی اپنی قادر الکلامی اور فنی مہارت کا احساس تھا چنانچہ انھوں نے خود ہی کہا ہے کہ میرے اور میرے بیٹے (عبدالرحمٰن بن حسان جو خود بھی شاعر تھے) کے بعد شعر و شاعری کا اور زید بن ثابت کے بعد قرآن کا کون رہ جائے گا ؃

من للقوافی بعد حسان وابنہ   ومن للمثانی بعد زید بن ثابت

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

حسان بن ثابت کا ایک دیوان بھی ہے جو انیسویں صدی کے وسط سے مستقل چھپ رہا ہے غالباً سب سے پہلے بمبئی میں المطبعۃ الحمیدیہ سے ۱۲۸۱؁ھ اور تونس میں بھی مطبعۃ الدولۃ التونسیۃ سے ۱۲۸۱؁ھ میں چھپا۔ پھر لاہور سے ۱۲۹۵؁ھ میں مصر کے مطبعۃ الامام سے ۱۳۲۱؁ھ میں چھپا یورپ میں پہلی دفعہ پروفیسر گب کی یادگار کمیٹی کے زیر اہتمام پروفیسر ہرشفیلڈ کی تحقیق سے لندن میں ۱۹۱۰؁ء میں چھپا۔ دیوان کی شرحوں میں شرح دیوان حسان بن ثابت مرتبہ شکری المالکی' مطبعۃ النیل قاہرہ ۱۹۰۴؁ء اور شرح دیوان حسان بن ثابت مرتبہ عبدالرحمٰن البرقوقی مکتبہ الخانجی ۱۹۲۹؁ء مشہور ہیں۔

---

(۱) کتاب العمدۃ ۱/۱۰ لابن رشیق القیروانی۔

حوالہ جات:-

۱- الشعر والشعراء لابن قتیبہ۔
۲- الاغانی جلد ۴ و ۸ و ۱۰ و ۱۳، اور ۱۴۔
۳- خزانۃ الادب جلد اول للبغدادی۔
۴- جمہرۃ اشعار العرب لابی زید القرشی۔
۵- طبقات فحول الشعراء لابن سلّام الجمحی ص۱۷۹۔
۶- سیرت النبی لابن ہشام۔
۷- تاریخ دمشق لابن عساکر۔
۸- تاریخ الطبری۔
۹- الموشّح للمرزبانی۔
۱۰- البیان والتبیین للجاحظ۔
۱۱- دائرۃ المعارف الاسلامیۃ۔
۱۲- تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان اول ص۱۸۳۔
۱۳- الوسیط احمد الاسکندری ص۱۵۵۔
۱۴- تاریخ الادب العربی: العصر الاسلامی۔ شوقی ضیف ص۷۷۔
۱۵- الاستیعاب ص۱۳۵۔
۱۶- الاصابۃ فی احوال الصحابۃ جلد ۲۔
۱۷- سیر أعلام النبلاء للذہبی جلد ۲۔
۱۸- شرح شواہد المغنی ص۱۱۴۔
۱۹- تاریخ الادب العربی۔ اول۔ عمر فروخ ص۳۲۵۔
۲۰- شاعر النبی حسان بن ثابت الانصاری: عبداللہ انیس الطباع۔
۲۱- حسان بن ثابت۔ خلدون الکنانی۔ مکتبہ عرفہ۔ دمشق سنہ ۱۳۶۳ھ۔

۲۲۔ عميد مدرسة الشعر الاسلامي حسان بن ثابت: عبد المجيد هندی
القاهره ۱۹۵۸ء سنۃ۔

۲۳۔ شعر المخضرمين واثر الاسلام فيه: يحيي الجبوری ص۶۳۔

۲۴۔ الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام: د، عبد الله الحامد ص۲۴۹۔

۲۵۔ تاریخ الادب العربی۔ حنا الفاخوری ص۲۳۱۔

۲۶۔ الحياة الادبية بعد ظهور الاسلام ڈ محمد عبد المنعم الخفاجی
القاهره ص۲۴۵ سے ص۲۹۷ تک۔

۲۷۔ ادباء العرب اول۔ بیروت ۱۹۳۴ء ص۲۵۱۔

۲۸۔ الحياة الادبية فی عصر صدر الاسلام۔ ڈ محمد المنعم خفاجی ص۲۰۳۔

۲۹۔ البعث الاسلامی' ندوۃ 'لکھنؤ' مجلد ۲۹، مارچ اپریل ۸۵ء اور مجلد ۳۰ کی
جون ۸۵ء۔ مضمون: حسان بن ثابت الانصاری: مولوی سعید الرحمن الاعظمی۔

۳۰۔ کتاب العمدۃ لابن رشیق القیروانی۔

۶۔ کعب بن مالکؓ

پیدائش ۲۵ سنہ ق ھ مطابق ۵۹۸ء

وفات ۵۰ یا ۵۵ م مطابق ۶۷۰-۶۷۳ء

آنحضرت کے زمانے میں مخضرم شعراء میں دو شاعر کعب کے نام سے مشہور رہوئے۔ ایک کعب بن زہیر جن کا تذکرہ ہو چکا ہے اور دوسرے ہمارے زیر تبصرہ شاعر کعب بن مالک۔ جو پکے مسلمان اور آنحضرت کے شیدائیوں میں سے تھے مگر ایک موقعہ پر ان سے آنحضرت اتنے خفا ہو گئے کہ خود بھی بول چال بند کر دی اور اس کے بعد ان کا مکمل بائیکاٹ کرا دیا تھا۔ چنانچہ بیچارے مدینہ کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے نہ کوئی ان سے بولتا تھا۔ اور نہ سلام کرتا تھا اور نہ سلام لیتا تھا۔ بات چیت کرنے کو ایک بیوی رہ گئی تھیں۔ ان کو بھی آنحضرت نے میکے بھجوا دیا تھا اب کعب اس شہر میں اکا و تنہا تھے آنحضرت کی نگاہ کیا بدلی سب نے آنکھیں پھیر لیں نہ کوئی دوست نہ جاننے والا نہ ساتھی نہ غم گسار مگر آخر مصیبت کے دن کٹ گئے اور ان کو ایسی معافی ملی کہ اسلامی تاریخ میں چند ہستیوں کو ہی ایسی خوش نصیبی حاصل ہوئی ہے یعنی قرآن شریف نے ان کی برأت کا اظہار کیا اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

نام کعب، والد کا نام مالک، سلسلۂ نسب خزرج قبیلہ کی ایک شاخ بنوسلمہ سے جا ملتا ہے پیدائش مدینہ میں سنہ ۲۵ قبل ہجرت ہوئی مطابق سنہ ۵۹۸ء جب عمر ۲۵ سال کے لگ بھگ تھی کہ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقعہ پر اپنی قوم کے ستر آدمیوں کے ساتھ مسلمان ہوئے اور آنحضرت کے ہاتھ پر اس عہد کے ساتھ بیعت کی کہ جن چیزوں سے ہم لوگ اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہیں ان سے آنحضرت کی بھی حفاظت کریں گے۔ (۱) اور جب آنحضرت مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لائے اور انصاریوں اور مہاجرین میں بھائی چارگی پیدا کی تو کعب بن مالک سے طلحہ بن عبیداللہ کی بھائی چارگی کرائی۔ (۱)

آنحضرت کے مکہ پہنچنے کے بعد جن انصاری شاعروں نے آپ کی زبان و قلم سے مدافعت کرنے کی ذمہ داری لی تو ان میں حسان اور عبداللہ بن رواحہ کے علاوہ کعب بن مالک بھی تھے جن کا درجہ اس طبقہ میں حسان کے بعد دوسرے نمبر پر آتا ہے۔
کعب چوں کہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے بہت پہلے اسلام قبول کرلیا تھا اسی لیئے ان میں ایمان و یقین پوری طرح راسخ ہوگیا تھا انصاریوں میں بڑے متقی پرہیزگار مشہور تھے آنحضرت ان کی اس خوبی اور پھر شعروشاعری کا ذوق رکھنے کی وجہ سے ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کے حق میں دعائے خیر و برکت کیا کرتے تھے اور اچھے شعر کہنے کی ترغیب دیتے تھے چنانچہ اصفہانی اور ابن ہشام نے روایت کی ہے کہ آنحضرت نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ تم نے ہی 'هَمَّتْ' والا شعر کہا ہے تو کعب بولے جی ہاں میں نے ہی کہا ہے۔

هَمَّتْ سخينةُ أنْ تغالبَ ربَّها و ليَغلبنّ مغالب الغلاّب

تو آپ نے فرمایا کہ خدا تمہاری یہ بات بھولا نہیں ہے (۲) اس لئے آنحضرت کعب کو اپنے سے بہت قریب رکھتے تھے چنانچہ کعب حدیث سنتے تھے اور یاد کرکے ان کی روایت بھی کرتے تھے اس لئے ان کو بھی حدیث کے راویوں میں شمار کیا جاتا ہے (۳) کعب صرف اچھے شاعر متقی پرہیزگار مسلمان اور آنحضرت

ملاحظہ کیجئے سیرت ابن ہشام اور جمہرۃ انساب العرب اور سیرت النبی اوّل علامہ شبلی نعمانی رحمۃ للعالمین منصورپوری

(۱) مکہ سے ہجرت کرکے جب مسلمان مدینہ آئے تو بے گھر بے در تھے۔ بے سہارا تھے ان لوگوں کو مدینہ میں رہنے کیلئے آنحضرت نے ہر مہاجر کا ایک انصاری بھائی بنا دیا تھا کہ یہاں وہ رہتا تھا چنانچہ انصاریوں نے اس بھائی چارگی کو اتنا نبھایا کہ جس نے اپنا آدھا مال بانٹ کر دیا ہر بھائی کو دے دیا۔ تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھیے۔

(۲) الاغانی ۱۵ / ۲۸ اور سیرت ابن ہشام ۲ اور شعر المخضرمین یحییٰ الجبوری ص ۲۔

(۳) بحوالہ سابق۔

کے پرستاروں اور رواۃ حدیث میں ہی نہ تھے بلکہ بہت اچھے شہ سوار بھی تھے اور حسان بن ثابت کی طرح صرف زبانی ہی تیر اور تلوار نہیں چلاتے تھے بلکہ بہادر اور نڈر سپاہی کی طرح میدان کارزار میں جاکر تلوار کے جوہر دکھاتے تھے۔ چنانچہ غزوہ احد میں وہ اس بے جگری سے لڑے تھے کہ ان کے جسم پر گیارہ زخم آئے تھے اور آنحضرت نے ان کی اس قدر عزت افزائی کی کہ ان کی زرہ خود پہنی اور کعب نے آنحضرت کی زرہ پہنی جو پیلی تھی۔ (۱)

مگر یہی چہیتے کعب، یہی بہادر سپاہی دو دیگر مسلمانوں کے ساتھ ایک غزوہ سے ایسے پچھڑے کہ آنحضرت کے غصہ اور اسلام میں پہلی دفعہ سماجی بائیکاٹ کے سب لوگ شکار ہوئے۔

امام بخاری نے کتاب المغازی میں اور ابن ہشام نے سیرت میں روایت کی ہے کہ آنحضرت نے شروع رجب سنہ ۹ھ مطابق (۶۳۰ء) میں شمالی حجاز کے قریب مدین کے علاقے تبوک میں غالباً رومیوں سے نبرد آزمائی کا ارادہ فرمایا۔ اور کوچ کا بگل بجا تو حسب دستور سارے مسلمان آپ کے ساتھ نکل پڑے۔ بقول خود کعب بن مالک سخت گرمی کے دن تھے اور میوہ و پھل پکے ہوئے درختوں پر لدے تھے ایسے میں باہر جانا اور وہ بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر، بڑا مشکل کام تھا۔ چنانچہ تقریباً ۸۳ آدمی اس غزوہ میں شریک نہ ہوئے بلکہ مدینہ میں رہ گئے۔ ان میں سے اکثر منافق اور ضعیف العقیدہ اور نادار مسلمان تھے۔ مگر تین آدمی ایسے تھے جن کے پکے اور سچے مسلمان ہونے میں کسی کو شبہ نہ تھا۔ ایک مرارۃ بن الربیع دوسرے ھلال بن اُمیّہ اور تیسرے ہمارے شاعر کعب بن مالک تھے مذکورہ بالا دو بزرگ تو اپنی بعض مجبوریوں اور عمر درازی کی وجہ سے نہ جاسکے لیکن کعب تندرست و توانا ہونے کے علاوہ بقول خود ان کے، اس وقت سب سے زیادہ خوش حال تھے۔ کیوں کہ ان کے پاس اس وقت دو خوب مضبوط اور تنومند و تندرست اونٹنیاں تھیں۔ وہ سوچتے تھے کہ یہ اونٹنیاں اتنی تیز ہیں کہ جب چاہوں گا

---

(۱) بحوالہ سابق۔

لشکر سے جا ملوں گا۔ لیکن یہی سوچتے رہ گئے اور آج کل کرتے کرتے نکل نہ پائے۔
یہاں تک کہ آنحضرت تبوک سے واپس تشریف لے آئے اور حسب دستور سارے پچھڑنے والوں نے آپ کی خدمت میں حاضری دے کر جھوٹی سچی بات کہہ کر معذرت کر لی اور آپ نے سب کی بات سن کر سب کو رخصت کر دیا۔ سوائے مذکورہ بالا تین اشخاص کے۔ چنانچہ جب یہ تینوں آئے اور غزوہ میں شریک نہ ہونے کے بارے میں معذرت کی تو آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے گھر جاؤ اور اس بارے میں خدا کے فیصلے کا انتظار کرو۔ اور چند دن کے بعد منادی کرا دی کہ ان تینوں سے نہ کوئی بات چیت کرے اور نہ کسی قسم کے سماجی تعلقات رکھے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں نے ان لوگوں سے ایسا قطع تعلق کر لیا کہ گویا کہ نہ جان تھی نہ پہچان اپنے ایسے پرائے ہو گئے کہ کعب کو سخت حیرت اور سخت تکلیف تھی۔ اس بائیکاٹ کے بعد مرارہ اور ہلال تو گھر میں بند ہو گئے لیکن کعب باہر نکلتے رہے۔ معاملہ صرف بائیکاٹ پر ہی نہ رہا بلکہ آپ نے حکم دے دیا۔ کہ یہ تینوں اپنی بیویوں کو بھی چھوڑ دیں۔ چنانچہ جب یہ حکم کعب کو ملا تو انھوں نے پوچھا کہ طلاق دے دوں یا صرف چھوڑ دوں۔ اس پر حکم ہوا کہ طلاق نہیں بس ان سے علیحدہ رہو۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بیوی کو میکہ پہنچا دیا اور اس طرح تنہا وا کا پچاس دن تک مدینہ کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے رہے اور کوئی نہ بات کرتا اور نہ ان کی طرف دیکھتا یہاں تک کہ بقول ان کے زمین ان کے لئے ایسی تنگ ہو گئی کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔
بخاری کی روایت میں ہے کہ اس سخت سماجی بائیکاٹ اور ذہنی اور روحانی کوفت کی حالت میں شام کے غسانی بادشاہ کا خط بھی کعب کو ملا کہ تمہارے ساتھی نے تم کو چھوڑ دیا تو کیا ہوا تم اتنے گئے گزرے نہیں ہو کہ تمہاری قدر نہ کی جائے تم میرے پاس آ جاؤ میں تمہاری خاطرداری اور مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھوں گا۔ کعب کہتے ہیں کہ اس کو بھی آزمائش کی ایک بات سمجھ کر میں نے اس خط کو تنور میں جھونک دیا۔ ان کے خاندان کے لوگوں نے بہت کہا کہ آنحضرت سے سچی

جھوٹی کہہ کر معذرت کر لو۔ لیکن کعب نے کہا کہ خدا قسم میں آپ سے جھوٹ نہ بولوں گا اگر آپ نے میری ایسی معذرت قبول بھی کر لی تو خدا تو آپ کو سب کچھ بتا سکتا ہے چنانچہ کعب اور ان کے تینوں ساتھی پورے پچاس دن تک ٹاٹ باہر رہے آخر کار ان لوگوں کے بارے میں توبہ کی وہ آیتیں نازل ہوئیں جس میں خدا نے کہا ــــ

"عَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا حَتَّىٰ إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَن لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

یعنی خدا ان تینوں پر بھی بڑا شفیق اور مہربان ہے جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ یہاں تک کہ جب زمین باوجود کشادگی کے ان پر تنگ ہو گئی اور خود ان کی اپنی زندگی ان کے لئے وبال جان بن گئی اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب خدا سے بچنے کے لئے سوائے خدا ہی کے پناہ کہیں اور ٹھکانا نہیں تو خدا نے ان کی توبہ قبول کی۔۔۔۔ الخ۔ تو ان لوگوں کے جان میں جان آئی کعب کہتے ہیں کہ جس آدمی نے مجھ سے توبہ قبول ہونے کی بشارت دی میں نے خوشی کے مارے اس کو اپنا جوڑا اتار کر دے دیا جو صرف دو کپڑوں پر مشتمل تھا اور خدا کی قسم میرے پاس ان دو کپڑوں کے علاوہ کوئی اور کپڑا نہ تھا چنانچہ جب میں نے ایک آدمی سے دو کپڑے مستعار لیئے اور ان کو پہن کر آنحضرت کی خدمت میں شکریہ ادا کرنے کے لئے حاضر ہوا (۲) آپ نے بھی توبہ قبول ہونے پر مبارک باد دی اور اب ناراضگی کا کوئی اثر آپ پر نہ تھا۔

کعب نے بھی خاصی عمر پائی۔ آنحضرت کے وصال کے بعد حضرت عثمان کے خلاف جو فتنہ فساد برپا ہوا اسے دیکھا پھر حضرت علی اور معاویہ کے درمیان خلافت پر جو جنگ وجدال اور حضرت عثمان کے قتل کا بدلہ لینے کے معاملہ میں جو اختلافات رونما ہوئے ان سے بھی دوچار ہوئے اور اس معاملہ میں حضرت

---

(۱) سورۃ توبہ آیت ۱۱۸ پارہ گیارہواں۔

(۲) بخاری کتاب المغازی۔

علی سے شدید اختلاف کیا اور ان سے حضرت عثمان کے قتل کا بدلہ لینے کا مطالبہ کیا کیونکہ ان کے خیال میں حضرت عثمان پر ظلم و زیادتی کی گئی تھی اور باغی اور فسادی واجب القتل تھے۔

آخری عمر میں کعب کی بصارت جاتی رہی تھی اور ۷۷ سال کی عمر میں ۵۰ھ اور ۵۵ھ کے درمیان انتقال کیا۔

امتیازی خصوصیات :-

کعب بن مالک نے بھی چوں کہ آنحضرت اور اسلام کی مدافعت کا بیڑہ اٹھایا تھا اس لیے ان کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بھی عہد نبوی کے اس سخت مرحلہ میں اور موت وزیست کے ان فیصلہ کن حالات میں جن سے آنحضرت فتح مکہ سے پہلے مدینہ میں گذر رہے تھے تقریباً ان تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے جن میں اس عہد کے ممتاز ترین اور آنحضرت کے محبوب ترین شاعر حضرت حسان نے کی ہے۔ چنانچہ کعب کے یہاں بھی حسان کی طرح مکی شاعروں کے جواب میں نقائض ملتے ہیں اور ان میں بعض وہ شاعر بھی ہیں جن کا جواب حسان نے بھی دیا ہے۔ جیسے ابن الزبعری اور حسان کی طرح ایک قصیدہ میں ابوسفیان کو دھمکایا اور ڈرایا بھی ہے اور حسان کی طرح آنحضرت کے مرثیہ سے لے کر حضرت حمزہ اور مقتولین بدر اور احد وغیرہ کا بھی مرثیہ لکھا ہے۔

وصف میں غزوات اور معرکوں کا ذکر بھی خوب ہے معرکہ بدر کے وصف اور اس میں ابوجہل کے قتل کے علاوہ غزوہ خندق کا بھی وصف انھوں نے لکھا ہے۔
اس قسم کی شاعری میں رزمیہ انداز کے علاوہ فخر وحماسہ کا عنصر بھی ملتا ہے مگر حسان کی طرح بہت زیادہ نہیں ملتا۔ بلکہ بڑے مدھم سروں میں اور بحیثیت داعی اسلام کے بھی ان کے خاصے قصائد ملتے ہیں۔ جن میں قرآن کی آیات اور اس کی تعلیمات کا رنگ پوری طرح نمایاں ہے۔ اور بعض اشعار تو بالکل مخصوص آیت کا چربہ

معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد کعب خاموش ہو گئے اور ایک مدت تک خاموش رہنے کے بعد غزوۂ طائف میں پھر بولے اور اس میں ایک شاندار دعوتی قصیدہ کہا۔

مگر حیرت ہوتی ہے اس بات کو دیکھ کر کہ قدیم تذکرہ نگاروں نے کعب پر بہت کم لکھا ہے اور خاص طور سے عربوں کے شعری ذخیرہ کو جمع کرنے والے نقاد اور عالم عبد السلاّم الجمحی نے طبقات فحول الشعراء میں (۱) اور ابو زید القرشی (۲) نے جمہرۃ اشعار العرب میں کعب کا ذکر اوّل تو کیا نہیں ہے اور اگر کیا ہے تو اس طرح نہیں کہ ان کی شخصیت ایک اچھے پر گو شاعر کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے چنانچہ اول الذکر نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ خوش گفتار شاعر تھے اور غزوہ تبوک میں ان کے بچھڑ جانے کا قصّہ نقل کر کے غزوہ احد اور خندق کے بارے میں ان کے قصائد کے کچھ شعر نقل کئے ہیں۔ البتہ ابن ہشام (۳) نے سیرت میں بروایت ابن اسحاق اور ابن عبد البر (۴) نے الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب میں اور الاصفہانی نے الاغانی (جلد ۱۵) میں کعب سے متعلق جو ذخیرہ اشعار جمع کر دیا ہے وہ اتنا ہے کہ اس کی روشنی میں ان کے کلام کا اچھا خاصا مطالعہ کیا جا سکتا تھا لیکن جدید تذکرہ نگاروں میں بزرگ اور ممتاز نقادوں جیسے ڈاکٹر طہٰ حسین اور ڈاکٹر شوقی ضیف نے کعب پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔ طہٰ حسین نے تو ان کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ البتہ شوقی ضیف نے ان کا تذکرہ کہیں کہیں کیا ہے لیکن حسان کی طرح الگ سے ان کے اشعار اور ان کی امتیازی خصوصیات پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ (۵)

---

(۱) محمد بن سلاّم الجمحی م ۲۳۱ھ (۲) ابو زید محمد بن الخطاب القرشی م ۱۷۰ھ۔

(۳) ابو محمد عبد الملک ابن ہشام صاحب السیرۃ النبویۃ۔

(۴) یوسف بن عبد البر الاندلسی مطبوعہ حیدر آباد ۱۳۱۸ھ (م ۴۶۳ھ)

(۵) ملاحظہ کیجیے تاریخ الادب العربی العصر الاسلامی۔

موجودہ نسل کے تذکرہ نگاروں میں کعب پر سیر حاصل بحث ڈاکٹر یحیی الجبوری نے (۱) کی ہے اور ان کے بعد ڈاکٹر عبداللہ الحامد نے ان پر لکھا ہے (۲)۔ ڈاکٹر عمر فروخ نے بھی اپنی تاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے لیکن بہت تشنہ سا۔ (۳)
حالاں کہ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کعب کا کلام اپنی خصوصیات اور مقدار میں بھی ایک حد تک حسان سے کم نہیں ہے بلکہ بقول یحیی الجبوری کعب نے راہ خدا میں اپنی زبان اور تلوار دونوں سے جنگ کی اور مسلمان شاعروں کے تھا اس زمانے کے حالات اور واقعات کی تصویر کشی کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے اور اس طرح سے کہ ان کے کلام میں اسلامی روح اور دین حنیف کا اثر پوری طرح واضح دکھائی دیتا ہے (۴)

نقائض :

کعب نے بھی حسان کی طرح مخالف شعراء کا جواب دیا ہے اور اس سلسلہ میں ان کے بھی نقائض خاصے اچھے اور موثر جواب ہیں مثلاً مکی شاعر ضرار بن الخطاب کا بدر کے موقعہ پر جواب دیتے ہوئے جو قصیدہ کہا ہے وہ حسان کے اس نقیضہ سے کم نہیں ہے جو انھوں نے بدر ہی کے موقعہ پر عبداللہ بن الزبعری کے کہے ہوئے قصیدہ کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا (۵) جس میں الزبعری سے کہا تھا کہ کاش تو مقتولین بدر پر اصلی خون کے آنسو روتا۔ چنانچہ کعب نے ضرار بن الخطاب کو جواب دیتے ہوئے جو قصیدہ کہا اس میں کہا ہے کہ
مجھے خدا کی اس بات پر بڑی حیرت اور بڑا تعجب ہوا کہ اس نے باوجود

---

(۱) شعر المخضرمین واثر الاسلام فیہ : مکتبۃ النہضۃ بغداد ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴ء
(۲) الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام ۱۹۸۰ء
(۳) تاریخ الادب العربی اول ۔
(۴) شعر المخضرمین ص۳۲
(۵) حالات حسان اس کتاب کا ص

اس کے کہ اس کے اختیار میں سب کچھ ہے اور اس پر کسی کا اختیار نہیں چلتا یہ فیصلہ کیا کہ جنگ بدر کے موقعہ پر ایسے لوگوں سے ہماری مدبھیڑ ہو جو اس کے باغی اور اس سے سرکشی کرتے ہیں اور ظاہر ہے سرکشی نافرمانی کا انجام ہلاکت اور تباہی ہوتا ہے۔ اور اس جنگ کے موقع پر یہ حالت تھی کہ رسول اللہ صلعم ہمارے بیچ میں تھے اور قبیلہ اوس آپ کے ارد گرد بہت مضبوط قلعہ کی طرح حصار بنائے ہوئے تھا اور قبیلہ بنو نجار کے لوگ آپ کے جھنڈے تلے زرہ بکتر سے لیس چل رہے تھے اور جب دشمنوں سے آمنا سامنا ہوا تو ہم میں سے ہر ایک نے چلا کر گواہی دی کہ سوائے خدا کے کوئی مالک و پالن ہار نہیں ہے اور یہ کہ آنحضرت کو حق کے ساتھ نصرت و کامیابی حاصل ہوگی۔ یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ

تم ... سے آنحضرت نے کہا تھا کہ ہماری طرف آجاؤ لیکن تم لوگوں نے روگردانی کی اور کہا کہ تم جادوگر ہو تو خدا نے کسی خاص وجہ ہی سے ان لوگوں کی ہلاکت آپ کے ذریعہ مقدر کی تھی اور وہ بات جس کا فیصلہ خدا کر دے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

عجبتُ لامرِ اللہ واللہ قادرٌ	علی ما أراد لیس للہ قاھرُ
قضی یوم بدرٍ أن نلاقی معشراً	بغوا وسبیل البغی بالناس جائرُ
فلما لقیناھم وکل مجاھدٍ	لاصحابہ مستبسل النفس صابرُ
شھدنا بأنّ اللہ لاربَّ غیرہ	وأنّ رسولَ اللہ بالحق ظاھرُ
وکان رسولُ اللہ قد قال أقبلوا	فولّوا وقالوا إنما أنت ساحرُ
لِأمرٍ أراد اللہُ أن یھلکوا بہ	ولیس لأمرٍ حمّہُ اللہ زاجرُ

کعب کے ان معانی و مطالب اور اندازِ بیان کا حسان کے معانی و مطالب اور انداز بیان سے موازنہ کیا جائے تو بڑی حد تک دونوں میں مشابہت ملے گی۔ جیسے بدر ہی کے سلسلہ میں حسان کا وہ مشہور قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے۔

عرفت دیار زینب بالکثیب	کخط الوحی فی الورق القشیب

جس میں آگے چل کر مشرکین کا جو انجام خدا نے مقدر کر دیا تھا اس کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی عقل مند آدمی ہے اور نہ دل آور۔ حالاں کہ یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ ہم لوگ بڑے عقل مند اور راہبر ہیں۔ اور جب ہم ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہو کر ان پر ٹوٹ پڑے تو خندق نہ آجاتی تو ہم ان کا صفایا کر دیتے۔

كأنهمُ إذا صالوا وصُلنا | بباب الخندق قين مُصالحونا
أناس لا نرى فيهم رشيدًا | وقد قالوا ألسنا راشدينا؟

یہاں تک کہتا ہے

فلولا خندق كانوا لديه | لدمّرنا عليهم أجمعينا
ولكن حال دونهم وكانوا | به من خوفنا متعوّذينا

اس کا جواب کعب بن مالک نے اسی بحر اور اسی کے قافیوں میں اتنا منہ توڑ جواب دیا کہ ضرار کی سٹی گم ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ ہم نے بڑے صبر و ضبط اور خدا کے بھروسہ اور توکل پر جنگ میں شرکت کی اور آنحضرت کے ساتھ جو تمام مخلوقات میں سب سے بلند و برتر ہیں ان لوگوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، جنھوں نے خدا کی نافرمانی اور ہمارے ساتھ بڑی ظلم و زیادتی کی تھی اور جو دشمنی میں ہمارے خلاف گھات لگا کر بیٹھے تھے اور اس موقعہ پر مکہ والوں کو جب وہ اپنی پوری جمعیت لے کر ہم پر ٹوٹ پڑے تھے معلوم ہو گیا کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے اور یہ کہ خدا مسلمانوں کا مددگار اور ساتھی ہے۔

وسائلةٌ تُسائلُ ما لقينا | ولو شهدتْ رأتنا صابرينا
وكان لنا النبي وزير صدقٍ | به نعلوا البريّةَ أجمعينا
نقاتل معشرًا ظلموا وعقّوا | وكانوا بالعداوة مرصدينا
ويعلم أهلُ مكة حين ساروا | وأحزابٌ أتوا متحزّبينا
بأن الله ليس له شريك | وأن الله مولى المؤمنينا

غزوہ خندق کے موقعہ پر حسان نے ایک قصیدہ کہا تھا جو بلاشبہ بہت خوبصورت اور بڑا شاندار ہے۔

جس میں اس موقعہ پر نازل قرآنی آیات کے معانی ومطالب کو بڑی خوبصورتی سے اپنے کلام میں سمویا ہے اس کا مطلع ہے ۔

هل رسم دارسة المقام يباب — متكلم لمحاور بجواب

کعب نے بھی اس موقعہ پر ایک نونیہ قصیدہ کہا ہے جس کا انداز بھی بالکل حسان کا سا ہے اور وہی بحر اور قافیہ ہے جس کا مطلع ہے ۔

أبقى لنا حدث الحروب بقية — من خير نحلة ربنا الوهاب

اس موقعہ پر ان کا ایک دوسرا قصیدہ بھی ہے جو بہت شاندار ہے ۔

لقد علم الاحزاب حين تألبوا — علينا وراموا ديننا ما نوادع

غزوہ احد کے موقعہ پر عبداللہ بن الزبعری نے ایک قصیدہ کہا تھا جس میں مشرکین مکہ اور اپنے اوپر بڑا فخر کیا تھا ۔ اس کا جواب کعب بن مالک نے ایک قصیدہ سے دیا جس کا مطلع ہے ۔

ألا هل أتى غسان عنا ودونهم — من الأرض خرقٌ سيره متنعنع

جس میں آگے چل کر کہتے ہیں ۔

مجالدُنا عن جذمنا كل فخمةٍ — مُذرَّبةٍ فيها القوانسُ تلمعُ

روایت ہے کہ آنحضرت نے جب یہ شعر سنا تو کعب سے فرمایا کہ کیوں مجالدنا عن جذمنا کی جگہ 'مجالدنا عن دیننا' اچھا نہ لگے گا کعب نے کہا جی ہاں تو آنحضرت نے فرمایا کہ پھر تو یہی زیادہ بہتر ہے چنانچہ اب پھر اس مصرعہ کو آنحضرت کی اصلاح کے مطابق "مجالدنا عن دیننا" ہی پڑھا کرتے تھے (۱) اس کے بعد ابن الزبعری کو مخاطب کر کے اس طرح کہتے ہیں کہ ارے تو میرے مقابلہ میں کیا فخر کرے گا پہلے ذرا اپنے بارے میں قبیلہ معد اور دوسرے قبیلوں اور لوگوں سے جا کر پوچھ تو لے کہ ہم دونوں میں سے تو سب سے زیادہ پست اور گرا ہوا اور بے حیثیت آدمی ہے، بھلا تو نے کسی جنگ میں کوئی ایسا کارنامہ کیا ہے جس پر فخر کر سکے

(۱) سیرت ابن ہشام ص۳۴۰ اور الاغانی ۱۵/۲۰

فخورٌ علی ابن الزبعریٰ وقد سری　　لکم طلبٌ من آخر اللیل متبع
فسل عنک فی عُلیا معدّ وغیرها　　من الناس من أخزیٰ مقاما واشنع
ومن ہو لم تترک لہ الحرب مفخرا　　من خدّہ یوم الکریہۃ اضرع

کعب کے یہاں دو ایک قصیدے نقائض کے اور بھی ملتے ہیں جو اپنے انداز بیان اور حریف کے جواب دینے کے طریقے میں حسان سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

وصف :

کعب کے یہاں وصف میں عام طور سے جنگوں اور میدان کارزار کا ہی نقشہ ملتا ہے جس میں کعب نے اپنی زبان و بیان کے خوب جوہر دکھائے ہیں ایسے موقعوں پر کعب عام طور سے اسلامی تعلیمات اور حق وصداقت کی فتح اور باطل وگمراہی کی شکست کا نقشہ بہت مؤثر انداز میں کھینچتے ہیں۔

بدر کا معرکہ اسلامی تاریخ اور آنحضرت کی سیرت کا ایک تاریخی موڑ تھا۔ اس پر آنحضرت کے سب مؤید شعراء نے طبع آزمائی کی ہے کعب نے بھی اس تاریخی معرکہ کا نقشہ کھینچا ہے چنانچہ ایک قصیدہ میں بعض عرب قبائل کو جنھوں نے مکہ والوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے بدر کے میدان میں جنگ کی تھی مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ معرکہ کارزار میں وہ بھی بڑھے اور ہم بھی۔ ان شیروں کی طرح بڑھے جن سے بچ کر کوئی جا نہیں سکتا چنانچہ یہ ہوا کہ وہ دم دبا کر بھاگے اور ہم نے تیز چمکتی تلواروں سے ان کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔

فساروا وسرنا فالتقینا کأنّنا　　أسودُ لقاءٍ لا یُرَجّیٰ کلیمھا
فولّوا ودسناھم ببیضٍ صوارمٍ　　لمنخر سوءٍ من لؤی عظیمھا
ضربناھمُ حتی ھوی فی مَکَرّنا　　سواءٌ علینا حلفھا وصمیمھا

بدر کے موقعہ پر ایک قصیدہ میں ابوسفیان کو دھمکی دیتے ہوئے اور فتح مکہ کی پیشین گوئی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے ابوسفیان معرکہ بدر میں تو تمہارے

شہ سواروں نے بڑی منہ کی کھائی ابھی گھبراؤ نہیں ذرا انتظار کرو ہمارے بہتر ین گھوڑے موضع کدا سے تمہارے اوپر چڑھائی کریں گے (یعنی مقام کدا سے مکہ پر حملہ کریں گے) اور خدا کے حکم اور روح القدس اور میکائیل کی شرکت سے ہم کو تم پر فتح و کامرانی حاصل ہو گی۔

فما ظفرتْ فوارسُکم ببدرٍ — وما رجعوا إلیکم بالسواءِ

فلا تعجلْ أبا سفیان وارقبْ — جیادَ الخیل تطلع من کداءِ

بنصر اللّٰہ روح القدس فیہا — ومیکال فیا طیب الملاءِ

اور بقول یحیی الجبوری کعب کو اس موقعہ پر حسان پر یہ فوقیت حاصل ہو گئی ہے کہ انھوں نے فتح مکہ کی بشارت حسان سے بہت پہلے دی تھی (۱)

بدر میں قریش کے بڑے بڑے سردار بڑی ذلت و خواری سے قتل کر دیئے گئے تھے اس میں رسول اللہ کا ازلی دشمن ابو جہل بھی تھا۔ کعب نے ان سب کے قتل ہونے کا نقشہ بہت ہی مؤثر انداز سے کھینچا ہے جس میں کہتے ہیں کہ ابو جہل عتبہ شیبہ اور تیمی سب معرکہ کارزار میں بری طرح ذلت کے ساتھ قتل ہو کر منہ کے بل اوندھے جہنم کا ایندھن بنے پڑے تھے اور اس طرح قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا جس میں خدا کہتا ہے کہ "قوا أنفسکم وأھلیکم ناراً وقودھا الناس والحجارة"۔(۲)

فکبَّ أبو جہلٍ صریعًا لوجہہ — وعتبةُ قد غادرنہ وھو عاثرُ

وشیبةُ والتیمیُّ غادرن فی الوغی — وما منھم إلّا بذی العرش کافرُ

فأمسوا وقود النار فی مستقرّھا — وکل کفورٍ فی جہنم صائرُ

تلظّی علیہم وھی قد شبّ حمیہا — بزبر الحدیدِ والحجارة ساجرُ

---

(۱) شعر المخضرمین ص۱۰۰

(۲) سورة التحریم آیت ۶۔

غزوۂ احد کے بارے میں جس میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی کعب نے بہت سے قصیدے کہے ہیں چنانچہ ایک لمبے قصیدے میں جس میں انھوں نے عبداللہ بن الزبعریٰ کا جواب دیا ہے اس معرکہ کا پرہول نقشہ یوں کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم ہماری ایک ایسی فوج سے مدبھیڑ ہوئی جو ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی طرح تھی جن میں ایسے سخت جنگ جو سپاہی تھے جو منہ کھولے یا اپنے خودوں سے اپنے چہروں کو چھپائے تھے۔ ان کی تعداد تین ہزار تھی اور ہماری مشکل سے تین یا چار سو۔ پھر بھی جب ہم حملہ کرتے تھے تو ان کو موت کے گھاٹ اتارتے جاتے تھے۔

فجئنا إلی موجٍ من البحر وسْطهٗ　　أحابيشُ منهم حاسِرٌ ومقنّعٌ

ثلاثة آلافٍ و نحن نَصِيبة　　ثلاث مئين إن كثرنا وأربعٌ

نغاورهم تجري المنيةُ بيننا　　نشارعهم حوضَ المنايا ونشرعُ

غزوہ خندق کا وصف اور کس طرح مکہ والے اپنے ساتھیوں کو لے کر مدینہ پر ٹوٹ پڑے تھے اس کا نقشہ بھی بہت مؤثر انداز سے کھینچا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب قیس بن عیلان اور قبیلۂ خندف وغیرہ ہم پر ٹوٹ پڑے اور انھوں نے ہم کو ہمارے دین سے نکال لینے کی کوشش کی اور ہم ان کو کفر سے نکال لینے کی کوشش کر رہے تھے تو ان کو اس کی بھنک بھی نہ لگی کہ آگے کیا ہونے والا ہے مگر انھیں بہت جلد یہ معلوم ہوگیا کہ ہم سے پیش پانا مشکل ہے۔ کیوں کہ خدا نہ صرف ہماری حفاظت کر رہا ہے بلکہ فتح ونصرت سے بھی نواز رہا ہے۔

لقد علم الأحزاب حين تألّبوا　　علينا و رامُوا ديننا ما نوادعُ

أضاميمُ من قيس بن عيلان أصفقت　　وخِنْدِفُ لم يدروا بما هو واقعُ

فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت غزوۂ حنین سے واپس آئے اور طائف کی طرف پیش قدمی فرمائی تو کعب نے ایک قصیدہ کہا جس میں کہا کہ تہامہ اور خیبر کا کام تمام کر چکنے کے بعد ہم نے اپنی تلواروں سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے تو اگر ان کی زبان ہوتی تو فوراً بول اٹھتیں کہ اب دوس یا ثقیف کی باری ہے۔

قفينا من تهامة كل ريب   وخيبر ثم أجمعنا اليسوفا
نخيرها ولو نطقت لقالت   قواطعهن دوسا او ثقيفا

چنانچہ ابن سیرین کہتے ہیں کہ قبیلہ دوس تو کعب کے اس کہنے کے ڈر سے کہ (قفینا تهامة.....) اسلام لے آیا (۱)

یہ قصیدہ خاصا بڑا ہے اس میں رزم کے علاوہ آنحضرت اور آپ کی دعوت کا ذکر کر کے سب کو اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی ہے ورنہ پھر گمراہی اور دشمنی کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

کعب کے یہاں اس قسم کی رزمیہ وصفیہ شاعری جس میں مبارزت کا رنگ نمایاں ہے خاصی ملتی ہے کعب کے اس رنگ کا آہنگ بھی خاصا سامعہ نواز اور نظر افروز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کعب کے دل میں اسلام نے ایسی جڑ پکڑ رکھی تھی۔ اور خدا کی مرضی اور اس کے دین کے خاطر اپنا سب کچھ لٹا کر بھی خوش رہنے کی ایسی لگن پیدا کر دی تھی، کہ وہ ایک داعی اور سپاہی دونوں کی حیثیت سے موت سے نہیں گھبراتے تھے۔ اور خاص کر اس احساس سے کہ راہ خدا میں جان کی بازی لگائیں گے تو خدا بھی اپنے برگزیدہ فرشتوں حضرت میکائیل اور جبرئیل کے ذریعہ ہماری مدد کرے گا چنانچہ مبارزت کے رنگ میں قریش کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

أبلغ قريشا وخير القول أصدقه   والصدق عند ذوي الألباب مقبول
إن قد قتلنا بقتلانا سراتكم   أهل اللواء ففيما يكثر القيل
يوم بدر لقيناكم لنا مدد   فيه مع النصر ميكال وجبريل
إن تقتلونا فدين الحق فطرتنا   والقتل في الحق عند الله تفضيل

کعب کے اس قسم کے اشعار سے سیرت اور موجودہ زمانے میں لکھی ہوئی تذکرہ کی کتابیں بھری پڑی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کعب اگر حسان سے بہتر نہیں تو شاید

---

(۱) تفصیل الاستیعاب ۱/۲۲۳ میں۔

کمتر بھی نہیں ہیں بلکہ بقول یحیٰ جبوری دین کی دعوت دینے اور حق بات کہنے اور اس کے لئے مال و دولت حتی کہ جان تک لٹا دینے میں کعب ان سے آگے ہیں (۱) کہ کعب کے نزدیک حق اور اسلام کی خاطر جان دے دینے میں ہی عزت و شرف ہے۔

ودارت رحانا واستدارت رحاهم　　وقد جعلوا کلا من الشر یشبع

ونحن اناس لا نری القتل سبة　　علی کل من یحمی الذمار ویمنع

یہ اس وجہ سے تھا کہ کعب کو یقین تھا کہ آنحضرت کا یہ قول کہ معرکہ حق و باطل میں موت سے نہیں ڈرنا چاہیئے بلکہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اس فانی زندگی کو ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی کے خاطر اللہ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اسی لئے تم لوگوں کو چاہیئے کہ اپنی تلواریں سونت کر اللہ کے سہارے نکل کھڑے ہو اس پر بھروسہ اور اس پر توکل کرو بالکل سچا امر اور حتمی فیصلہ ہے۔

قال رسول الله لما بدو لنا　　ذروا عنکم هول المنیات واطمعوا

وکونوا کمن یشری الحیاة تقربا　　الی ملک یحیا لدیه ویرجع

ولکن خذوا أسیافکم وتوکلوا　　علی الله ان الامر لله أجمع

مرثیہ :

مرثیہ میں جو وصف کی ہی درحقیقت ایک قسم ہے کعب کا انداز بیان بڑا مؤثر درد انگیز اور دل دوز ہے۔ مسلمانوں کو احد میں نہ صرف شکست ہوئی تھی بلکہ حمزہ جیسے شیر دل صحابی اور آنحضرت کے چچا نہ صرف قتل ہوئے تھے بلکہ مکہ والوں نے بڑی بے دردی سے ان کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے تھے اور ہند نے انتقام کے جذبہ میں ان کا کلیجہ نکال کر چبا لیا تھا اس دردناک موقعہ پر حسان اور دیگر تمام شعراء نے مرثیے کہے ہیں۔ کعب نے بھی اس موقعہ پر حمزہ کا بڑا اندوہ ناک مرثیہ کہا ہے جو بقول یحیٰ جبوری احد کے بارے میں جو کچھ کعب نے کہا ہے ان میں

(۱) شعر المخضرمین و أثر الاسلام فیه ص ۲۷۴۔

سب سے بہتر کلام ہے (۱) جس میں صفیہ بنت عبدالمطلب کو جو حمزہ کی بہن اور آنحضرت کی پھوپھی تھیں۔ مخاطب کر کے کہا ہے صفیہ اٹھو اور عورتوں کے ساتھ مل کر حمزہ کا سوگ مناؤ اور اس میں نہ گھبرانا اور نہ کوئی کسر اٹھا رکھنا کہ یہ اس شیر خدا پر رونا ہے جس نے اپنی جان محض مرضی رسول اور راہ مولی میں تج دی اور سوائے اس کی رضا اور خوشی کے کسی اور چیز کی تمنا نہ کی تھی۔

صفیۃ قومی ولا تعجزی ۔ وبکی النساء علی حمزۃ
ولا تسأمی أن تطیلی البکاء علی اسد اللہ فی الھزۃ
یرید بذاک رضا احمد ورضوان ذی العرش والعزۃ

حضرت حمزہ کو بنو عبد نوفل کے ایک حبشی غلام نے بے دردی سے قتل کیا تھا اس کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

فلاقاہ عبد بنی نوفل یبربر کالجمل الأوجِ

احد کے مقتولین کا مرثیہ بہت موثر انداز میں کہا ہے۔ جس میں ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے اور ان کے معرکہ کارزار میں ثابت قدم رہنے اور بے جگری سے لڑنے کا تذکرہ بھی ہے کیوں کہ وہ لوگ آنحضرت کے جھنڈے تلے لڑ رہے تھے۔

قتلاھم فی جنان النعیم کرام المداخل والمخرجِ
بما صبروا تحت ظل اللواء لواء الرسول بذی الاضوجِ

یہاں تک کہتے ہیں کہ

کذلک حتی دعاھم ملیک الی جنۃ دوحۃ المولجِ
فکلھم مات حر البلاء علی ملۃ اللہ لم یحرجِ

اس زمانے کے مرثیوں میں آنحضرت کے مراثی بہت ہی دردناک رہے ہیں اور اس زمانے کے ہر شاعر نے اس سلسلہ میں اپنے زبان و بیان کے ذریعے

---

(۱) شعراء المخضرمین واثر الاسلام فیہ ص ۲۷۲

(۲) حوالہ سابق

اپنے رنج وغم کا اظہار خون کے آنسوؤں سے کیا ہے جو شعروں کی شکل میں بہے ہیں اس ضمن میں حسان کے مراثی کا تو جواب نہیں مگر کعب نے بھی آپ کا جو مرثیہ کہا ہے اس میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ جب آپ کی ذات گرامی کے واسطہ سے نور ہدایت کے پانے اور رحمت اور جنت کے مستحق بن جانے کا ذکر کرنے کے بعد اس عظیم شخصیت پر خون کے آنسو بہائے ہیں جو نہ صرف پوری مخلوقات میں افضل و اعلیٰ تھی بلکہ روئے زمین پر سب سے بڑی متقی پرہیزگار شخصیت تھی۔

یا عینُ فابکی بدمعٍ ذری ۔۔۔ لخیر البریۃِ والمصطفیٰ

علی خیرِ من حملتْ ناقۃٌ ۔۔۔ وأتقی البریۃِ عند التقی

خدا نے آپ ہی کے طفیل میں ہم سب کو عذاب جہنم سے نجات دی۔

فأنقذنا اللّٰہ فی نورہٖ ۔۔۔ ونجّی برحمتہٖ من لظی

آنحضرت کے مرثیہ میں ایک قصیدہ بھی ہے جس کا مطلع ہے۔

الا أنعی النبی الی العالمینا ۔۔۔ جمیعاً ولا سیما المسلمینا

غزوہ موتہ کے موقعہ پر بھی کعب نے ایک بڑا دردناک مرثیہ کہا تھا۔ جس میں انتہائی رنج وغم کا اظہار ہے۔

نام العیون ودمعُ عینکَ یھملُ ۔۔۔ سجاماً وکفُ الطباب المخضل

وإعنادلی حزنٌ فبتُّ کأنّنی ۔۔۔ ببنات نعش والسماک موکل

وکأنما بین الجوانح والحشیٰ ۔۔۔ مما تأوبنی شھابٌ مدخلُ

وجداً علی النفر الذین تتابعوا ۔۔۔ یوماً بموتۃ أسندوا لم ینقلوا

صلی الالٰہ علیھم من فتیۃٍ ۔۔۔ وسقی عظامھمُ الغمامُ المسبلُ

حضرت علی اور حضرت عثمان کے اختلافات کے زمانے میں کعب حضرت عثمان کے ساتھ تھے حضرت حسان کی طرح یہ بھی یہ سمجھتے تھے کہ حضرت عثمان مظلوم شہید ہوئے ہیں اور ان کے خون کا قصاص لینا واجب ہے اور جو لوگ اس صریح ظلم و زیادتی میں خاموش رہے اور انھوں نے مظلوم خلیفہ کی مدد نہیں کی

انھوں نے بڑا گناہ کیا چنانچہ کعب نے اپنی قوم انصاریوں کو اس بات پر سخت لعنت و ملامت کی ہے کہ خلیفہ پر اتنی مصیبت ٹوٹی اس کے گھر میں آگ لگائی گئی جس کے دھوئیں اور گرمی میں اس کا دم گھٹتا رہا اور تم لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے رہے۔

مَنْ مبلغٌ الانصارَ منیّ آیۃً	رسلا نقصّ علیھم التبیانا
إنْ قد فعلتم فعلۃً مذکورۃً	کست الفضوحَ وابدت الشنآنا
بقعودکم فی دارکم و أمیرکم	تحتشی ضواحی دارہ النیرانا
بینا یُزَجّیْ د فعکم عن دارہ	ملئت حریقاً کابیا ودخانا

مذکورہ بالا مضامین کے علاوہ کعب کے کلام میں دوسرے مضامین خاص طور سے غزل نہیں ملتی وہ جاہلی ریت اور حسان کی عادت کے مطابق اپنے قصیدے تشبیب سے نہیں شروع کرتے تھے البتہ طرز بیان الفاظ کا انتخاب اور ان کی سج دھج جاہلی انداز کی ہوتی تھی چنانچہ ان کے یہاں بھی حسان کی طرح بھاری بھرکم اور موٹے الفاظ خاصے ملتے ہیں اس طرح انھوں نے بھی بعض مشکل اور سخت قافیوں والے اشعار کہے ہیں۔ جیسے غزوہ احد کے موقعہ پر الزبعری کے جواب میں قصیدہ۔ مگر عام طور سے ان کے اشعار سہل اور معانی و مطالب کے اعتبار سے قرآنی اور اسلامی تعلیمات پر مبنی ہیں ان کے یہاں حسان کی طرح تنوع ہے اور نہ وہ کثرت اور نہ وہ شان و شکوہ جو حسان کے بعض قصیدوں میں ملتا ہے ان کے تمام قصیدوں میں دعوتی رنگ جھلکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کو اسلام سے پہلے کبھی پیشہ کے طور پر استعمال نہیں کیا اسی لئے ان کے بارے میں حسان کی طرح امراء اور بادشاہوں کے دربار میں جانے اور مدحیہ قصائد کہنے کا تذکرہ یا روایت نہیں ملتی اور شاید اسی وجہ سے عہد عباسی کے علماء اور ناقدوں مثلاً اصمعی یا عمرو بن العلا وغیرہ نے ان کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ اور نہ ان کے کلام کا مطالعہ کیا جو سیرت اور مغازی کی کتابوں میں دبا پڑا ہے (۱) بہرحال اس زمانے کے شعراء میں حسان کے بعد کعب کا نمبر آتا ہے۔

---

(۱) جیسے سیرت ابن ہشام۔ طبقات ابن سعد و مغازی محمد بن عمر والواقدی۔

کعب کا دیوان چھپ چکا ہے (۱) اس کے علاوہ ڈاکٹر عبداللہ الحامد نے اپنی کتاب شعرالدعوۃ میں ۳۴ مقطوعات اور قصیدوں کا ذکر کیا ہے اور اپنی اس کتاب اور اپنی دوسری کتاب الشعرالاسلامی فی صدر الاسلام میں یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ان کے اشعار میں اتنا جھول ہے کہ شعر کی اصلی روح اور اس کا اصل لطف اور مزہ ختم ہوگیا ہے یہ اس وجہ سے کہ انھوں نے محض اقتباس کیا ہے اور کہی ہوئی بات دہرائی ہے۔ (۲) اقتباس اور نقل سے مراد وہ اشعار ہیں جن میں قرآنی آیات کا چربہ اور اسلامی تعلیمات کا عکس نظر آتا ہے مگر محض اس بات سے کلام میں جھول نہیں پیدا ہوتا اور نہ کلام بے مزہ اور پھیکا ہو جاتا ہے۔ حسان کے یہاں بھی یہی سب باتیں ہیں لیکن ان کے کلام کے بارے میں سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے ممتاز ترین شاعر تھے دراصل بات یہ ہے کہ حقائق اور بدیہات کے بیان میں زبان کا چٹخارہ اور اسلوب کا بانکپن اتنا نہیں ہو پاتا جتنا دوسرے مضامین میں مثلاً غزل وغیرہ میں ہوتا ہے۔ کعب کے یہاں چوں کہ قرآنی تعلیمات کے حقائق اور اسلامی عقائد و نظریات کو پیش کیا ہے اسی لئے ان کا کلام پھیکا نظر آتا ہے۔

آخری عمر میں کعب کی آنکھوں کی بصارت جاتی رہی تھی اور تقریباً سال کی عمر میں سنہ ۵۰ھ اور سنہ ۵۵ھ کے درمیان (سنہ ۶۷۰ء۔ سنہ ۶۷۳ء) انتقال ہوا۔

---

(۱) بحوالہ الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام ڈاکٹر عبداللہ الحامد حواشی۔

(۲) مصدر سابق ص ۲۶۹ مطبوعہ مطابع الاشعار التجاریہ الریاض سنہ ۱۹۸۲ء۔

حوالہ جات:

۱۔ سیرت ابن ہشام (ابو محمد عبدالملک ۲۱۸ھ)۔
۲۔ طبقات فحول الشعراء: محمد بن سلام الجمحی ۲۳۱ھ۔
۳۔ جمہرۃ أنساب العرب سمعانی۔
۴۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد (محمد بن سعد بن منیع الزہری (۲۳۰ھ)۔
۵۔ الاغانی لاصفہانی جلد ۱۵ (۳۵۶ھ)۔
۶۔ ألاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب لابن عبد البر (یوسف النمری ۴۶۳ھ)
۷۔ حماسۃ لابن الشجری (۵۴۲ھ) طبع حیدر آباد ۱۳۴۵ھ۔
۸۔ تاریخ الادب العربی: ڈاکٹر عمر فروخ۔
۹۔ شعر المخضرمین وأثر الاسلام فیہ: ڈاکٹر یحیی الجبوری۔
۱۰۔ الشعر الاسلامی: ڈاکٹر عبد اللہ الحامد۔
۱۱۔ الروض الأنف: لابی القاسم عبدالرحمن بن عبداللہ السہیلی (۵۸۱ھ)

۱۳۔ البعث الاسلامی، ندوۃ لکھنؤ۔
المجلد ۲۸ و ۲۹، اکتوبر، نومبر ۸۳ء و دسمبر، جنوری ۸۴ء۔
مضمون: کعب بن مالک الانصاری: مولوی سعید الرحمن الاعظمی۔

۷۔ عبداللہ بن رواحۃ

م ۹ سنہ ھ

مدینہ کے انصاری اور قبیلہ خزرج سے تعلق رکھنے والے تین شعراء میں جنہوں نے آنحضرت اور اسلام کی طرف سے مکہ والوں کے شاعروں کا جواب دینے اور اسلام کی مدافعت کرنے کا عہد کیا تھا اور جن میں حسان بن ثابت پہلے نمبر پر اور کعب بن مالک دوسرے نمبر پر شمار کئے جاتے ہیں۔ عبداللہ بن رواحہ تیسرے نمبر پر آتے ہیں۔ مگر ان مذکورہ بالا دونوں شاعروں پر عبداللہ بن رواحہ کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اس لئے آنحضرت نے ان کو اپنا کاتب یا منشی بھی مقرر کیا تھا۔ (۱) اور دوسرا امتیاز یہ حاصل ہے کہ وہ غزوہ موتہ میں مسلمانوں کی فوج کی قیادت کرتے ہوئے شہید ہوئے اور اس طرح تن من دھن سب نثار اسلام کر دیا۔

نام عبداللہ باپ کا نام رواحہ تھا کنیت ابو محمد اور ابو رواحہ کرتے تھے مگر ان کی کوئی اولاد نہ تھی (۲) باپ اور ماں دونوں کی طرف سے خاندان کا تعلق مدینہ کے مشہور قبیلہ خزرج سے جا ملتا ہے۔ (۳) ان کی ماں کا نام کبشتہ بنت واقد بن عمرو بن الاطنابہ تھا جو اوپر جا کر الخزرج ہی سے جا ملتا ہے۔

عبداللہ بقول الجمحی جاہلیت میں بھی اپنی قوم میں بڑی حیثیت کے مالک تھے اور سردار قوم سمجھے جاتے تھے اور بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

---

(۱) اس سلسلہ میں مضمون رسائل النبی مطبوعہ مجلۃ الوثیقہ ماہ رمضان سنہ ۱۴۰۲ھ مطابق جولائی ۱۹۸۲ء العدد الاول۔ السنۃ الاولی ملاحظہ کیجئے۔ شائع کردہ مرکز الوثائق التاریخیۃ بدولۃ البحرین،

(۲) دیکھئے الطبقات الکبری اور "الاستیعاب" اور "امتاع الاسماع" اور جمھرۃ انساب العرب لابن حزم۔

(۳) پورا سلسلہ نسب یوں ہے عبداللہ بن رواحہ بن امرئ القیس من بنی مالک بن کعب بن الخزرج۔

اور اس زمانہ کی جنگوں میں ان کی قیس بن الخطیم سے مدبھیڑ ہوا کرتی تھی اور اسلام لانے کے بعد آنحضرت ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور بڑی عزت اور قدر و منزلت فرماتے تھے (۱)، کیوں کہ یہ بھی ان نشتر انصاریوں میں تھے۔ جنھوں نے ۱۲ء میں بیعت عقبہ ثانیہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام قبول کیا تھا اور ان بارہ انصاریوں میں بھی تھے جن کو آنحضرت نے نقیب یعنی مبلغ یا داعی مقرر فرمایا تھا چنانچہ عبداللہ نے یہ ریت پوری طرح نبھائی۔ اور ہر طرح آپ کی حفاظت کرنے کا عہد کر کے مدینہ واپس آئے تھے۔ اور ایک مبلغ اسلام کی حیثیت سے مدینہ میں کام کرتے رہے اور جب آنحضرت مدینہ تشریف لائے تو صرف زبان و قلم ہی سے آپ کا ساتھ نہیں دیا بلکہ معرکہ کارزار میں بھی داد شجاعت دی۔ چنانچہ غزوۂ بدر، احد، خندق، حدیبیہ، خیبر اور عمرۃ القضاء میں بھی آنحضرت کے ساتھ رہے (۲) اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا اسی راہ میں غزوہ موتہ میں جام شہادت بھی نوش فرما گئے اور ایمان و یقین و وفاداری و استواری کی ایک انمٹ مثال رہتی دنیا تک کے لئے قائم کر گئے۔

عبداللہ بن رواحہ کی زندگی جاہلیت میں بھی اور اسلام لانے کے بعد بہت پاک و صاف اور بے داغ گزری۔ چنانچہ انھوں نے حسان کی طرح غزوۂ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم پر ناک بھوں نہیں چڑھائی اور نہ حضرت عائشہ پر تہمت لگانے میں جلد بازی سے کام لیا اور نہ کعب بن مالک کی طرح جو غزوۂ تبوک میں بچھڑ گئے تھے کسی غزوہ سے پچھڑے (۳)

(۱) طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمی ص ۱۸۶۔

(۲) الطبقات الکبری۔ ق ۲۔ ج ۳ ص ۷۹ لیدن "امتاع الاسماع بما للرسول من الانباء والاموال والحفدة والمتاع" لاحمد علی المقریزی (م ۸۴۵ھ) طبع محمود شاکر ۱۹۴۱ء بحوالہ شعرا المخضرمین ص ۸۵۔ مذکورہ بالا کتاب جلد اول ص ۳۲۶ میں آیا ہے کہ پھر عمرۃ القضیۃ ہوا جس کا نام عمرۃ القضاء، غزوۃ القضاء اور عمرۃ الصلح اور عمرۃ القصاص بھی ہے یہ ذی القعدہ ۷ھ میں ہوا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

عبد اللہ کی اس ایمانی ادا اور پاک دامنی کی بناء پر آنحضرت ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت و محبت کا برتاؤ کرتے تھے چنانچہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ عبد اللہ بن رواحہ بے ہوش ہو گئے۔ آنحضرت کو جب معلوم ہوا تو آپ تشریف لائے اور فرمایا کہ اے اللہ اگر اس کی موت آگئی ہے تو اس کو اس کے لئے آسان کر دے اور اگر موت نہیں آئی ہے تو اس کو شفا بخش دے، تو ان کو افاقہ ہو گیا۔(۱)
عبد اللہ کی ایمانی قوت اور خدا کی راہ میں سخت سے سخت تکلیف برداشت کرنے کا ان کے اندر ایسا جذبہ تھا جس کی نظیر عام طور سے کم ملتی ہے چنانچہ مشہور راوی حدیث حضرت ابوالدرداء روایت کرتے ہیں کہ ہم آنحضرت کے ساتھ بعض سفروں میں اتنی سخت گرمی کے زمانے میں بھی رہے ہیں جس میں شدت گرمی سے آدمی اپنے سر پر اپنے ہاتھ رکھ لیا کرتے تھے ایسی شدید گرمی میں پورے قافلے میں سوائے آنحضرت اور عبد اللہ بن رواحہ کے ایک آدمی بھی روزہ دار نہیں ہوتا تھا۔ (۲) ان کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ وہ غزوہ میں سب سے پہلے نکلنے والے اور سب سے آخر میں لوٹنے والے ہوتے اس لئے آنحضرت ان کو اکثر جنگی مہموں پر بھیجا کرتے تھے۔ بدر کی فتح کی خوش خبری سنانے کے لئے آپ نے عبد اللہ کو قافلہ کے کوچ سے پہلے ہی عالیہ روانہ کر دیا تھا۔ جب غزوہ بدر الموعد کے لئے آپ نکلے تو مدینہ میں عبد اللہ کو اپنا خلیفہ بنا گئے اسی طرح آپ نے تبیش

(گذشتہ صد کا حاشیہ) (۳) سیرت ابن ہشام اور امتاع الاسماع اول بحوالہ شعر المخضرمین ص ۹۶ ہرچند کہ دونوں صحابیوں کے متعلق یہ باتیں صحیح ہیں لیکن ان کو بدنیتی یا آنحضرت پر عدم اعتماد کا نتیجہ نہیں سمجھنا چاہیئے حضرت حسان بہت سیدھے سادے آدمی تھے اسی لئے ان سے ایسی باتوں کا ظہور کوئی تعجب کی بات نہیں۔ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم پر دوسرے انصاری بھی کبیدہ خاطر ہوئے تھے لیکن آنحضرت کی تقریر کے بعد سب مطمئن ہو گئے تھے۔ کعب ابن مالک جیسا کہ ان کے حالات میں ذکر ہوا آج کل کرتے کرتے محض تساہل اور ضرورت سے زیادہ اعتماد کی بناء پر تبوک میں شریک نہ ہو سکے چنانچہ ان کی برأت خود قرآن نے فرمائی۔ (۱) الطبقات الکبریٰ ق ۲ ج ۳ ص ۸۲

(۲) الاستیعاب ج ۱ ص ۳۶۲۔

نوجوانوں کے دستہ کا سپہ سالار رہا کر عبداللہ کو اُسَیر بن زارم یہودی کی سرکوبی کے لئے خیبر بھیجا۔ عبداللہ نے اس سے مقابلہ کیا اور اس کو قتل کر دیا اس کے بعد خیبر کے لگان کو متعین کرنے کے لئے آپ نے ان کو ہی متعین کر دیا چنانچہ یہ کام وہ جنگ موتہ میں اپنی شہادت کے وقت تک کرتے رہے تھے (۱)

جس طرح آنحضرت حسان بن ثابت کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اسلام کی تعریف اور مکہ والوں کے جواب میں اشعار سنا کرتے تھے اسی طرح عبداللہ سے بھی بڑی انسیت تھی اور فرمائش کر کے ان سے بھی شعر سنتے تھے۔

اور ایسے ہی ایک موقعہ پر آپ نے عبداللہ سے فرمائش کی کہ مکہ والوں کا مقابلہ کیا کرو۔ اور اس طرح ان کو اسلام کی طرف سے مدافعت کرنے والے شعراء میں شامل فرمایا۔ چنانچہ خود عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ میں ایک دفعہ مسجد نبوی سے گزر رہا تھا اور آنحضرت اپنے چند صحابہ کے ساتھ مسجد میں تشریف رکھتے تھے مجھے جو لوگوں نے دیکھا تو پکارنا شروع کیا اے عبداللہ بن رواحہ اے عبداللہ بن رواحہ تو میں سمجھ گیا کہ آنحضرت نے مجھے بلایا ہے میں ان کے پاس لپک کر پہنچا اور سلام کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہاں آؤ تو میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا تو آپ نے اس انداز سے کہ گویا آپ کو میرے اشعار پر کچھ تعجب سا تھا فرمایا کہ تم جب شعر کہتے ہو تو کس طرح کہتے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ اس کے بارے میں سوچ بچار اور غور و فکر کرتا ہوں پھر کہتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اچھا اب تم مشرکین کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ۔ عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے پہلے سے اس قسم کی کوئی چیز تیار نہیں کی تھی، چنانچہ میں نے آپ کو دوسرے اشعار سنانا شروع کئے اور جب اس شعر پر پہنچا

فخبرونی أثمان العباءِ متی   کنتم بطاریق أو دانت لکم مضر؟

اس شعر میں عمر بن مخزوم اور دوسرے قریشیوں کی ہجو ہے جس میں کہتے ہیں

---

(۱) الطبقات الکبری ق ۲ ج ۳ ص۸۰ امتاع الاسماع ج ۱ ص۲۳ اور طبقات فحول الشعراء۔

کہ اے عبا کی قیمتو ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم جنگوں کے آزمودہ کار اور پختہ کار سپہ سالار کب تھے یا کب قبیلہ مضر نے تمہارے سامنے اپنی گردن جھکائی (۱)

عبداللہ کہتے ہیں کہ مجھے ایسا لگا کہ آنحضرت کو یہ بات بری سی لگی کہ میں نے آپ کی قوم (قریش) کو اثمان العباء (یعنی اتنے گھٹیا کہ گھٹیا قسم کی عبا کی قیمت کے برابر جن کی وقعت ہو) کہہ کر مخاطب کیا ہے چنانچہ میں نے جب یہ اشعار پڑھے۔

نجالدُ الناسَ عن عُرضٍ فنأسِرُهم
فینا النبی و فینا تنزلِ السورُ
و قد علمتم بانا لیسَ غالِبُنا
حیٌّ من الناس، وانِ عزّوا وان کثروا
یا ھاشم الخیرانّ اللہ فضلکم
علی البریۃ فضلاً مالہ غِیَرُ
فثبّتَ اللہُ ما آتاک من حَسَنٍ
تثبیت موسی ونصراً کالذی نُصِرُوا

یعنی جب ہم لوگوں سے نبرد آزمائی کے لئے نکلتے ہیں تو دائیں بائیں ہر طرف بغیر کچھ پرواہ کئے وار کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کو گرفتار کر لیتے ہیں (یہ اس وجہ سے ہے کہ) ہمارے درمیان نبی ہیں اور ہمارے درمیان سورتیں نازل ہوتی ہیں اور یہ تو تم کو خوب معلوم ہے کہ کوئی قبیلہ چاہے اس کی تعداد کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو اور چاہے وہ لوگ کتنے معزز و مکرم کیوں نہ ہوں

---

(۱) طبقات فحول الشعراء جمحی ص۲۰۵ اس شعر میں بنو مخزوم کو ان کے بخل اور خستت کی وجہ سے بے وقعت اور گھٹیا ثابت کرنے کے لئے اثمان العباء یعنی عبا کی قیمتیں کہا۔ عبا گھٹیا درجے کی کملی کو کہتے ہیں، جو بہت سستی ہوتی ہے اس طرح اپنے حریف کو "کوڑیوں کے مول والے افراد" سے تعبیر کیا جو بہت چبھتی سی بات ہے۔

ہم سے ہرگز جیت نہیں سکتے۔ اے خیر کی تعلیم (ہاشم الخیر) یعنی بنو ہاشم (آنحضرت کا قبیلہ) کرنے والو خدا نے تم کو تمام مخلوقات پر ایسی دائمی فضیلت دی ہے کہ اب وہ بدلی نہیں جا سکتی خدا نے آپ کو جو اچھائیاں اور فضیلتیں دی ہیں ان میں آپ کو موسیٰ جیسی پائیداری دی ہے اور اس طرح مدد کی جس طرح گذشتہ نبی کی کی گئی"۔ جب آپ نے یہ اشعار سنے تو مسکراتے ہوئے میری طرف رُخِ مبارک کیا اور فرمایا "خدا تمہیں پائیداری نصیب کرے۔

نقادوں نے عبداللہ کے تذکرے میں کہا ہے کہ وہ زمانۂ جاہلی میں قیس بن الخطیم کا (شعری) مقابلہ کیا کرتے تھے اور ہجرت کے بعد آنحضرت اور اسلام کی طرف سے مدافعت کیا کرتے تھے (۱) مگر یہ عجیب بات ہے کہ دونوں زمانوں میں شعر و شاعری کا شغل رکھنے کے باوجود ان کا جو کلام ہم تک پہنچا ہے وہ نسبتاً بہت کم ہے اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ان کا کلام ضائع ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں یحيٰ الجبوری نے دو احتمالات کا ذکر کیا ہے جو دل کو لگتے ہیں۔

پہلا احتمال یہ ہے کہ عبداللہ کا بیشتر کلام ضائع ہو گیا چنانچہ اغانی نے روایت کی ہے کہ زمانۂ جاہلی میں قریش کے لئے سب سے آسان شعر عبداللہ بن رواحہ کا تھا لیکن ان کے اسلام لانے کے بعد عبداللہ بن رواحہ کا ہی کلام ان کے لئے سب سے زیادہ سخت تھا (تکلیف دہ) اس لئے کہ وہ ان کے کفر کا ذکر کر کے ان کو عبرت اور عار دلاتے تھے۔ ان کے مقابلہ میں ان کے لئے سب سے آسان اشعار ان کے دونوں ساتھی حسان بن ثابت اور کعب بن مالک کے تھے کہ یہ دونوں ان کو ان کی جنگوں اور ان کی اخلاقی بے راہ رویوں کا ذکر کر کے ہجو کرتے تھے (۲) اب سوال یہ ہے کہ وہ اشعار جو قریش کے لئے کبھی بہت تکلیف دہ اور کبھی بہت آسان لگتے تھے گئے تو کہاں گئے؟

---

(۱) طبقات فحول الشعراء: ابن سلام الجمحی ص۱۸۷۔

(۲) الاغانی للاصفہانی ج ۱۵ / ۲۹ بحوالہ شعر المخضرمین یحيٰ الجبوری ص۸۵۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ عبداللہ کا کلام اسلام کے بعد کم ہو گیا کیوں کہ وہ شعر کہنے کو گناہ سمجھتے تھے اور اپنا زیادہ تر وقت قرآن کی تلاوت میں گزارتے تھے۔ چنانچہ ابن سعد نے روایت کی ہے کہ "ایک مرتبہ رسول اللہ صلعم نے عبداللہ سے کہا کہ اپنی سواری سے اتر کر ہماری سواریوں میں تیزی پیدا کرو" یعنی اپنے اشعار کے ذریعہ حدی خوانی کرو تو ہمارے اونٹ تیز چلنے لگیں) تو عبداللہ بولے کہ" یارسول اللہ میں نے اس کا (شعر کا) کہنا ترک کر دیا ہے۔ (۱)"

ہشام بن عروہ سے روایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ" جب (آیت) وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ ۝ نازل ہوئی تو عبداللہ بن رواحہ بولے کہ خدا جانتا ہے کہ میں بھی ان (شعراء) میں ہوں (۲) مگر آنحضرت عبداللہ بن رواحہ کو شعر کہنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے اور اکثر اوقات ان سے شعر سنا بھی کرتے تھے چنانچہ اس بات سے اور اسی آیت میں خدا کے ارشاد سے کہ" اِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۳)" عبداللہ کو بڑا سکون ہو گیا اور انھوں نے شعر و شاعری جاری رکھی۔

ڈاکٹر عبداللہ الحامد نے ایک تیسرا احتمال بھی پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ عبداللہ کے کلام کی روایت کی کمی کا ایک سبب نوعمری میں ان کا انتقال بھی ہے کیوں کہ (جنگ موتہ) ۸ھ میں ان کا انتقال ہو گیا چنانچہ وہ ان بڑے ہنگامہ خیز واقعات کے زمانے میں زندہ نہ تھے جن میں شعر و شاعری کا میدان بہت وسیع ملتا تھا۔ چنانچہ ان کی نوعمری کی وجہ سے وہ اس وقت

---

(۱) الطبقات الکبری ق ۲ ج ۳/ ۸۰

(۲) حوالہ سابق

(۳) سورۃ الشعراء آیت ۲۲۷۔ اس آیت پر تفصیلی گفتگو مصنف کے مضمون "شعر و شاعری اسلام کی نظر میں" میں آ چکی ہے

لوگوں کو اپنا کلام نہ سُنا سکے۔ جب اُن کو جہاد اور ردت کی جنگوں اور فتوحات کے بعد ذرا سکون وچین سے رہنے کا موقع ملا۔ اور پھر سونے پہ سہاگہ یہ ہوگیا کہ ان کا بہت سا کلام کعب بن مالک کے کلام میں گڈ مڈ ہوگیا جس کی وجہ سے یہ پتہ چلا نا مشکل ہوگیا کہ کون سا قصیدہ کس کا ہے جیسا کہ ان کا وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

بکتِ عینی وحُق لھا بکاھا　　　وما یغنی البکاء ولا العویل

یا بدر صغری کے بارے میں ان کا وہ قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

عصیتم رسول اللّٰہ اف لدینکم　　　وامرکم السئی الذی کان غادیا

ان سب باتوں کے علاوہ ان کے شعر کی کمی کی ایک وجہ یہ ہے کہ عبداللہ بن رواحہ کا کلام بلند پایہ کا نہ تھا اسی لئے کہ وہ نہ ممتاز شعراء میں سے تھے اور نہ خوش گو شعراء میں سے چنانچہ ان کا مقابلہ نہ حسان سے کیا جا سکتا ہے اور نہ کعب بن مالک سے[1]

امتیازی خصوصیات:

عبداللہ بن رواحہ ان تین انصاری شعراء میں جن میں سے ایک حسان بن ثابت اور دوسرے کعب بن مالک تھے اور جنھوں نے رسول اللہ صلعم کی مدافعت اور آپ کی طرف سے مخالف شعراء کا جواب دینے کا بیڑہ اٹھایا تھا کلام اور اصناف سخن کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر آتے ہیں۔ لیکن بعض دوسری خصوصیات مثلاً شجاعت و بہادری اور ایمان و یقین اور عزم و ارادہ میں اپنے ہم عصروں سے کہیں بڑھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایمانی قوت اور عزم و ارادہ اور شجاعت و بہادری کا یہ عالم تھا کہ غزوہ موتہ کے موقعہ پر جب کہ رسول اللہ صلعم نے رومی بزنطینی شہنشاہ ہرقل سے نبرد آزمائی کا ارادہ کیا تو شدید خطرے اور مقابلہ کی نزاکت کی وجہ سے اس جنگ کے لئے تین سپہ سالار مقرر فرمائے چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اس معرکہ میں پہلے زید بن حارثہ قیادت کریں گے اگر وہ قتل ہوجائیں گے تو

---

[1] الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام ص ۲۰۸۔

جعفر بن ابی طالب جھنڈا سنبھالیں اور جب وہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ سپہ سالاری سنبھالیں۔ اتفاق سے ہرقل اس وقت ایرانیوں سے نبرد آزمائی کر کے ایک لاکھ کی سپاہ کے ساتھ واپس آرہا تھا۔ راستے میں شام کے قبائل بھی اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اور کچھ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ مسلمانوں کو مقابلہ سے چارہ کار نہ رہا۔ چنانچہ مؤتہ کے گاؤں پر مقابلہ ہوا۔ رومیوں کی تعداد اب ۲ لاکھ ہو گئی تھی اور مسلمان صرف تین ہزار تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے اور انھیں کے ساتھ سب سے پہلے زید بن حارثہ شہید ہوئے ان کے بعد دوسرے سپہ سالار جعفر بن ابی طالب نے جھنڈا سنبھالا لیکن انھوں نے بھی جام شہادت نوش کیا اب ہمارے شاعر کی باری تھی۔ وہ معرکہ کا رنگ دیکھ رہے تھے۔ ان کے دو پیشرو اپنی جانیں نثار کر چکے تھے۔ یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح میدان کارزار سے اکیلے یا پوری فوج لے کر نکل سکتے تھے۔ لیکن یہ بات آئین قیادت اور تقاضائے شجاعت کے خلاف تھی اس لئے میدان سے منہ نہ موڑا جھنڈا لے کر آگے بڑھے اور مارتے کاٹتے اتنے آگے بڑھ گئے کہ دشمنوں کے نرغہ میں گھر گئے اور پھر ان کی تلواروں کی نذر ہو گئے اور اس طرح زندگی بھی آنحضرت اور اسلام کی طرف سے مدافعت کرتے کرتے ان دونوں پر نچھاور کر دی۔

عبداللہ بن رواحہ کے کلام میں دوسرے انصاری شعراء کی طرح تنوع نہیں ہے ان کے یہاں صرف رجز، ہجو اور مرثیہ ملتا ہے۔ اسلوب کے اعتبار سے بھی حسان اور کعب بن مالک کے مقابلہ میں ان کا کلام کچھ کمزور سا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عبداللہ عام طور سے موقعہ اور حالات کے پیش نظر فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ ظاہر ہے حسان کی طرح پہلے سے سوچ سمجھ کر شعر کہنے میں اور فوراً بغیر بہت زیادہ سوچے سمجھے شعر کہنے میں ہر اعتبار سے بڑا فرق ہے۔ پھر بھی جہاں تک اسلامی تعلیمات کے بیان کا تعلق ہے تو ان کا کلام اسلامی شاعری کی زندہ مثال اور اعلیٰ نمونہ ہے اس اعتبار سے ان کے شعر میں کسی قسم کا کوئی

عیب یا نقص نہیں ملتا۔ چنانچہ ان کے یہاں قبیلہ یا قوم یا جاہلیت کی باتوں کا ذکر کرکے ان پر فخر نہیں ملتا (۱) اور اس نقطۂ نظر سے عبداللہ اپنے دونوں ہم عصروں سے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں کہ ایسے موقعوں پر ان کا اسلوب بیان بڑا واضح اور مؤثر اور پرکشش ہوتا ہے جیسے ان کے یہ اشعار جن میں وہ رسول اللہ صلعم کی تعریف اور آپ کی بدولت ہدایت پانے کا ذکر کرتے ہیں اور پھر آپ کی ذات پر پورے یقین اور اعتماد کا اظہار کرکے یہ کہتے ہیں کہ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا وہ ہو کر رہے گا اور ایک دن ہمیں اس دنیا سے جانا ہے اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے۔

و فینا رسولُ اللہ یتلو کتابہ　　إذا انشقَّ معروفٌ من الفجر ساطعُ
یبیتُ یجافی جنبَہ عن فراشہ　　إذا استثقلتْ بالکافرین المضاجعُ
أرانا الھدی بعد العمی فقلوبنا　　بہ موقنات أنّ ما قال واقعُ
واعلم علماً لیس بالظن أننی　　إلی اللہ محشورٌ ھناک فراجعُ

عبداللہ کو جیسا کہ اوپر بیان ہوا قرآن سے بڑا شغف تھا۔ رات دن قرآن کی تلاوت میں لگے رہتے تھے چنانچہ قرآن کے اسلوب بیان اور معانی و مطالب ان کے کلام میں رچ بس گئے تھے چنانچہ وہ قرآن سے متاثر ہو کر اس یقین کا اعادہ کرتے ہیں کہ خدا کا وعدہ سچا اور دوزخ کافروں کا ٹھکانا ہے اور عرش پانی کے اوپر قائم ہے اور اس پر سارے جہاں کا پالن ہار جلوہ افروز ہے اس عرش کو تنومند اور طاقت ور اور خدا کے مقرب ترین فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں۔

شھدتُ بأن وعد اللہ حق　　وان النار مثوی الکافرینا
وان العرش فوق الماء طاف　　وفوق العرش ربُّ العالمینا
وتحملہ ملائکۃٌ غلاظٌ　　ملائکۃ الإلٰہ مقرّبینا

---

(۱) الشعر الاسلامی فی صدر الاسلام۔ ڈاکٹر عبدالحامد ص ۲۷۹۔

اسلامی تعلیمات کے بیان میں جو مسلمانوں کے لئے حقائق مجردہ میں شامل تھے اور جو عبداللہ کے لئے خاص طور سے صرف حق و صداقت پر مبنی تھے کوئی بڑا معجز یا بہت مؤثر انداز بیان نہیں اختیار کیا جا سکتا تھا۔ اسی لئے مذکورہ بالا اشعار میں صرف حقائق کا سیدھے سادے الفاظ میں اظہار ہے (۱) البتہ دوسرے اصناف سخن میں خاص طور سے رجزیہ شاعری میں عبداللہ بن رواحہ کا رنگ بہت کچھ تیکھا اور اطوار و انداز بڑے مؤثر ہیں۔

معرکۂ موتہ کی ہلاکت خیزی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ رومیوں کی تعداد ۲ لاکھ تھی اور مسلمان صرف تین ہزار تھے شاید رسول اللہ اور اس جنگ میں شریک بڑے مسلمانوں کو اور خاص طور سے عبداللہ کو اس میں در پیش خطرات کا پورا اندازہ تھا اس لئے جب آنحضرت نے سپہ سالاری کے لئے باریاں مقرر کر کے فوج کو رخصت کیا تو عبداللہ رونے لگے تو لوگوں نے پوچھا کہ آخر روتے کیوں ہو؟ تو بولے کہ خدا کی قسم نہ مجھے دنیا کی محبت ہے اور نہ تم لوگوں سے شدید تعلق، لیکن میں نے رسول اللہ کو ایک آیت پڑھتے سنا ہے جس میں دوزخ کا ذکر ہے جو یہ ہے "وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا" اب میں پریشان ہوں کہ میری "ورود" یعنی دوزخ میں جانے کے بعد 'صدور' وہاں سے واپسی کیسے ہوگی۔ مسلمانوں نے یہ سن کر کہا کہ خدا تمہارا ساتھ دے اور دشمنوں کو تم سے دفع کرے اور تم کو صحیح و سالم ہم تک واپس لائے۔ تو عبداللہ نے اس موقعہ پر چند اشعار پڑھے جس میں اس کی دعا کی ہے خدا کرے کہ مجھے تلوار کی ایسی کاری ضرب لگے یا نیزہ کا ایسا سخت زخم آئے کہ دل اور آنتیں سب کے آر پار ہو جائے اور پھر جب لوگ میری قبر سے گزریں تو کہیں کہ اللہ نے اس کو ایسی رشد و ہدایت دی کہ وہ غازی بن کر چمکا۔

---

(۱) ڈاکٹر حامد عبداللہ نے اپنی کتاب "شعر الدعوۃ" میں اسلامی عقائد و تعلیمات پر مبنی اور ان کی تبلیغ سے متعلق عبداللہ کے ۹ قصیدے جمع کئے ہیں۔ جو یہ ہیں۔

قصیدہ ۱۱۴ء، ۱۱۸ء، ۱۲۳ء، ۱۵۷ء، ۱۶۸ء، ۲۱۱ء، ۲۰۵ء، ۳۳۶ء، ۳۸۹ء،

ولکنّنی أسالُ الرحمن مغفرةً	وضربۃً ذات فرغٍ تقذف الزبدا
أوطعنۃً بیدی حرّان مجھزۃً	بحربۃٍ تنفذ الأحشاءَ والکبدا
حتی یُقال إذا مرّوا علی جدثی	أرشدہ اللّٰہ من غازٍ وقد رشدا

ایسا لگتا ہے شہادت سے پہلے ہی عبد اللہ کو اس انجام کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے کلام میں اس خطرہ کا ذکر کیا ہے کہ مجھے جام شہادت پینا ہو گا

زید بن ارقم کہتے ہیں کہ میں یتیم تھا اور عبد اللہ بن رواحہ نے مجھے اپنا لے پالک بنا لیا تھا۔ چنانچہ جب وہ غزوۂ موتہ پر نکلے تو مجھے بھی اونٹنی پر پیچھے بٹھا لیا اور ساتھ لے کر چل پڑے چلتے چلتے ایک رات سنا کہ وہ بڑے درد سے اپنی اونٹنی کو مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں کہ حساء (ایک جگہ کا نام) سے چار دن کی مسافت کے بعد جب مجھے منزل مقصود پر پہنچا دیا تو تم کو سفر کی تکلیف سے ہمیشہ کے لئے چھٹی۔ خوب کھاؤ پیو مست رہو۔ میں اس کے بعد اپنے گھر واپس نہ جاؤں گا۔ بلکہ جب مسلمان آکر مجھے ارض شام میں میری محبوب قیام گاہ پر ہمیشہ کے لئے چھوڑ جائیں گے تو مجھے پھر اس کا غم نہ ہو گا کہ میں صحرا بیاباں میں پڑا رہوں یا کسی ہرے بھرے نخلستان میں۔

إذا أدّیتنی وحملت رحلی	مسیرۃً أربعٍ بعد الحساءِ
فشأنکِ أنعُمٌ وخلاکِ ذمٌّ	ولا أرجع إلی أھلی ورائی
وجاء المسلمون وغادرونی	بأرض الشام مُشتھیَ الثواء
ھنالک لا أبالی طلعَ بعلٍ	ولا نخلٍ أسافلھا رواء

زید کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ شعر سنے تو میں رونے لگا تو انھوں نے کوڑے سے ایک ہلکی ضرب لگائی اور بولے کہ ارے بے وقوف تم کو یہ پسند نہیں کہ اللہ مجھے شہادت سے سرفراز کرے؟ اس کے بعد چند شعر پڑھے جس میں رجز کے اس شعر میں زید کو مخاطب کر کے کہا کہ تیز چلنے والی اونٹنیاں چلتے چلتے تھک کر ہلکان ہو گئیں رات لمبی ہو گئی اب اتر پڑو کہ منزل آگئی۔

یا زیدُ زیدَ الیعملاتِ الذُّبَّلِ	تطاولَ اللیلُ ھُدیتَ فانزلِ

اور پھر جب معرکۂ موتہ گرم ہوا اور عبد اللہ نے پہلے بعد دیگرے دو سپہ

سالاروں کو اپنی آنکھوں سے گرتے دیکھا اور جب ان کی باری آئی تو ہاتھ میں جھنڈا لے کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ تقاضائے بشری سے دل گھبرا رہا تھا حوصلہ اور عزم و ثبات میں کمی نہ آئی دل کو قسم دلائی کہ اس آگ میں کودنا ہی ہے قدم پیچھے نہیں ہٹ سکتے کہ اگلا قدم جنت کے اندر ہوگا۔ خاک و خون کے دریا سے گزر کر تم کو جنت سے بے زاری کیوں ہے۔

أقسمتُ یا نفس لتنزِ لِنّہ　　　لتنزلِنّ أو لتکرھِنّہ

إذا أجلبَ الناسُ وشدّوا الرنّۃ　　　مالی أراکِ تکرھین الجنّۃ

قد طال ما قد کنتِ مطمئنّۃ　　　ھل أنتِ إلا نطفۃٌ فی شنّۃ

ایک دوسری رجز میں کہتے ہیں جس میں اپنے پیش رو سپہ سالاروں زید اور جعفر کے نقش قدم پر جامِ شہادت پینے کو ہدایت سے تعبیر کرتے ہیں۔

یا نفس إلا تقتلی تموتی　　　ھذا حمام الموتِ قد صَلِیتِ

وما تمنیتِ فقد أُعطیتِ　　　إن تفعلی فعلھما ھُدِیتِ

یہ پڑھ کر اتر پڑے اتنے میں ان کے چچا زاد بھائی آئے اور انھوں نے گوشت کا ایک ٹکڑا دیا اور کہا کہ اس کو کھا کر اپنی پیٹھ ذرا مضبوط کر لو انھوں نے اس پر دانت مارا ہی تھا کہ مسلمانوں کی فوج میں ایک طرف شور و غل سنائی دیا یہ سن کر بولے کہ تم اب تک اس دنیا میں ہو؟ گوشت کے ٹکڑے کو زمین پر پھینکا تلوار لے معرکہ میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے جامِ شہادت نوش کر لیا (۱)

وصف:

وصف میں عبداللہ نے بہت زیادہ نہیں کہا ہے جو کچھ کہا ہے موتہ سے متعلق کہا ہے۔ معرکۂ موتہ گرم ہے تلواریں چل رہی ہیں نیزے چمک رہے ہیں اس موقعہ پر عبداللہ نے معرکہ کا وصف یوں بیان کیا ہے۔

جلبنا الخیلَ من أجإٍ وفرعٍ　　　تُغَرُّ من الحشیش لھا العکومُ

---

(۱) سیرت ابن ہشام ص ۳۷۹

خدد نا ها من الصّوان سبتًا ... ازل كأنّ صفحته اُدیمُ
أقامتْ لَیلَتینِ علی مُعانٍ ... فاعقب بعد فترتِها جموم
فرُحنا والجیاد مسوّماتٌ ... تنفسّ من مناخرِها السمومُ
فلا واُبی مآبُ لنأتینَّها ... وإنْ کانتْ بها عرب وروم

ہجو :

عبد اللہ بن رواحہ کے کلام میں اول تو ہجو ملتی نہیں اور اگر ملتی ہے تو بہت اوچھی بہت مبتذل نہیں ہے ابن اسحاق نے ابو سفیان کی ہجو میں عبد اللہ کے ایک قصیدہ کی روایت کی ہے لیکن ابن ہشام نے حسب دستور اس کی تنقیح و تدقیق کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ عبد اللہ کا نہیں بلکہ کعب بن مالک کا ہے[1] جس میں پہلے غزوۂ بدر کے مقتولین کا ذکر ہے اور مکہ والوں کی شکست فاش کا تذکرہ ہے اور اسی کے ضمن میں آنحضرت کی تعریف اور آپ پر گھر بار سب کچھ فدا کر دینے کے جذبہ کا اظہار۔

یہ قصیدہ دوسرے غزوۂ بدر کے بعد جو ۴ھ میں ہوا تھا، کہا گیا ہے۔

وعدنا أبا سفیان بدرًا فلم نجد ... لمیعادہ صدقا وما کان وافیا
ترکنا بها أوصال عُتبةَ وابنه ... وعمرًا ابا جهل ترکناه ثاویا
عصیتم رسول الله اف لدینکم ... وأمرکم السیّئ الذی کان غاویا
فانی وان عنّفتمونی لقائلٌ ... فدی لرسول الله أهلي ومالیا
أطعناه لم نعدِلْه فینا بغیره ... شهابا لنا فی ظلمة اللیل هادیا

(1) یحیی الجبوری نے اپنی کتاب شعر المخضرمین میں مذکورہ قصیدہ کو بغیر کسی دلیل کے محض ظن و تخمین کی بنیاد پر کعب کا مان لیا ہے جو غالباً صحیح نہیں کیوں کہ یہ علمی دیانت کے خلاف ہے۔

مرثیہ :

مرثیہ میں بھی عبداللہ کے اشعار کا ذکر نہیں ملتا صرف بئر معونہ کی جنگ میں شہید ایک سپاہی نافع بن بدیل کے مرثیہ میں دو شعر ملتے ہیں جو بہت ہی سیدھے سادے ہیں ان میں نہ کسی جذبہ کا عکس ہے اور نہ رنج و غم کا اظہار یہ ایک طرح سے ان کا وصف ہے نہ کہ مرثیہ۔

رحم اللہ نافع بن بدیل — رحمۃ المبتغی ثواب الجہاد

صابر صادق وفیٌ اذا ما — اکثر القوم قال قول السداد

دوسرے اصناف مثلاً فخر حماسہ وغزل وغیرہ میں عبداللہ نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ شہدائے احد کا خاص طور سے حمزہ کا مرثیہ اس زمانے کے دونوں شعراء نے لکھا ہے عبداللہ بن رواحہ کی طرف بھی حضرت حمزہ کے مرثیہ میں ایک قصیدہ منسوب کیا جاتا ہے اگرچہ اس کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کعب بن مالک کا ہے کہ عبداللہ کا۔ ابن ہشام نے سیرت میں اس کو کعب بن مالک کا بتایا ہے اور کہا ہے کہ مجھے ابو زید الانصاری نے یہ اشعار سنائے تھے۔ (۱) اشعار یہ ہیں جو بہت سیدھے سادے ہیں۔

بکتْ عینی وحق لہا بکاھا — وما یغنی البکاءُ ولا العویل

علی أسد الإلہ غداۃ قالوا — أحمزۃ ذاکم الرجل القتیلُ

اصیب المسلمون بہ جمیعا — ھناک وقد اصیب بہ الرسول

ابا یعلی لک الأرکان ھُدّت — وانت الماجد البر الوصول

علیک سلام ربک فی جنان — مخالطھا نعیم لا یزول

کعب بن مالک اور حسان بن ثابت کی طرح عبداللہ بن رواحہ کے کلام میں بھی خلط ملط ہو جانے کی شبہات کا ذکر کیا گیا۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ بعض قصائد جو

---

(۱) سیرت ابن ہشام ص ۱۶۲

ان کی طرف منسوب ہیں۔ دراصل کعب بن مالک کے ہیں (۱)۔

حوالہ جات:

۱۔ طبقات فحول الشعراء للجمحی ص۱۸۶۔
۲۔ الشعر الاسلامی فی صدر الإسلام ڈ عبد اللہ الحامد ص۲۶۶
۳۔ تاریخ الادب العربی عمر فروخ ص۲۲۰۔
۴۔ شعر المخضرمین، یحیی الجبوری ص۸۵۔
۵۔ الطبقات الکبری لابن سعد۔ ق۳۔ ج۳۔ ص۸۹۔
۶۔ الاستیعاب فی معرفہ الاصحاب لابن عبد البر ج۱/ص۳۶۱
۷۔ امتاع الأسماع مما للرسول من أبناء والأموال والحفدة والمتاع۔ لاحمد بن علی المقریزی۔ ج۱۔ ص۳۶۔
۸۔ جمهرة أنساب العرب ص۳۴۴ لابن حزم الاندلسی (علی بن سعید ۴۵۶ھ)۔
۹۔ سیرت ابن ھشام۔
۱۰۔ الاغانی ج۱۵۔ ص۲۹۔
۱۱۔ المؤتلف والمختلف للآمدی۔

---

(۱) تفصیل کے لئے سیرت ابن ہشام اور شعر مخضرمین یحیی الجبوری ملاحظہ کیجئے۔

۸ - النَّابِغَۃُ الجَعْدِیُّ

م ۶۹۹ء / ۶۵/۸۰ھ

مخضرمین شعراء میں النابغۃ الجعدی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے اتنی لمبی عمر پائی(۱) کہ آنحضرت کے فیض صحبت سے لے کر اموی حکومت کے قیام کو نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھا بلکہ اس زمانہ کے سیاسی اتھل پتھل میں بھی برابر شریک رہے چنانچہ حضرت معاویہ کے خلاف جنگ صفین میں حضرت علی کے ساتھ معرکۂ کارزار میں شریک رہ کر داد شجاعت بھی دی جس کا خمیازہ بعد میں جائداد وغیرہ کی ضبطی سے بھگتنا پڑا، جو آخر میں حضرت معاویہ کے حکم سے پھر واپس کر دی گئی مگر جب تک جئے حضرت معاویہ اور اموی حکومت کی مخالفت کرتے رہے۔

مخضرمین شعراء میں ان کو دوسرا امتیاز یہ حاصل ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں شعر کہتے کہتے یک بیک ان کی زبان بند ہو گئی اور شعر و شاعری کے سارے سوتے خشک ہو گئے "جیسے کہ دور کا بھی اب شعر سے واسطہ نہیں" لیکن اسلام کے ظہور کے وقت اور مسلمان ہونے کے بعد ان کی زبان ایسی کھلی کہ آنحضرت نے اپنی شان میں مدحیہ قصیدہ سن کر بے اختیار فرمایا تھا کہ "أجدت لا يفضض الله فاك (۲) یعنی بہت خوب کہا خدا کرے تمہارے منہ سے تمہارے دانت کبھی

---

(۱) وفات اور عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ ۶۵ھ سے لیکر ۸۰ھ تک کی تاریخیں بیان کی جاتی ہیں۔

(۲) لفظی معنی:۔ خدا تمہارے منہ سے تمہارے دانت نہ گرائے۔ فضّ اللّٰہ فاہ: نثر أسنانہ ومنہا قولہم فی الدعاءلمن أجاد فی الکلام "لا فُضَّ فوک" ای لا نثرت أسنانک ولا فرقت استحسانا لما قالہ یعنی جو شخص بہت اچھا کلام کہتا تھا تو عرب داد دیتے ہوئے کہتے تھے کہ خدا تمہارے دانتوں کو بکھیرے نہیں اور نہ انھیں چھدرے کرے۔ کیوں کہ پوپلے منہ سے آواز صاف ستھری نہیں نکلتی۔

نہ گریں تم کبھی پوپلے نہ ہو۔ اور اسی دن سے ان کا لقب "نابغہ" یعنی چشمہ کی طرح پھوٹ کر نکلنے والا پڑ گیا اور اس طرح وہ نابغہ الذبیانی کی طرح خاصی عمر کے بعد بزم شعر میں سخن سنج ہوئے۔ شاعری میں یہ مقام ان کو حاصل تھا کہ ابن سلام الجمحی نے ان کو لبید بن ربیعہ کے ساتھ جاہلی شعراء کے طبقہ ثالثہ میں شمار کیا ہے۔ (۱)

نابغہ کا نام حسان یا عبداللہ کنیت ابولیلی اور لقب نابغہ تھا۔ خاندانی اعتبار سے بنو جعد بن ربیعہ العامری سے تعلق تھا اس لئے الجعدی کی نسبت سے مشہور ہوئے اور اسی نسبت کی وجہ سے نابغہ ذبیانی اور ان میں فرق کرنے میں آسانی بھی ہو جاتی ہے۔ مخضرمین شعراء میں لمبی عمر پانے وصف و مدح میں امتیازی حیثیت رکھنے کے علاوہ گھوڑوں کی پرکھ اور وصف میں مشہور زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ (۲) جنوبی نجد کے ایک چشمہ فلج نامی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت کا پتہ نہیں چلتا اس کی ماں کا نام "خصفہ" تھا اور اس کا تعلق ہجر والوں سے تھا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "خصفہ" ماں نہیں اس کی دائی تھی (۳)

روایت ہے کہ نابغہ جعدی نابغہ ذبیانی سے زیادہ عمر دراز تھا کیوں کہ نابغہ الذبیانی نے صرف النعمان بن المنذر کا زمانہ پایا تھا اور نابغہ الجعدی نے المنذر بن المحرق کا جو النعمان بن المنذر کا والد تھا کا زمانہ بھی دیکھا اور اس کے دربار سے منسلک رہا تھا (۴)

---

(۱) طبقات فحول الشعراء ص ۱۰۳۔ ڈاکٹر شوقی ضیف نے تاریخ آداب اللغۃ العربیہ۔ جرجی زیدان اول کے حاشیہ ص ۱۷۰ میں لکھا ہے: جمحی نے نابغہ کو جاہلیت کے طبقہ ثانیہ میں شمار کیا ہے جو غلط ہے طبقہ ثالثہ میں شمار ہے ص ۱۰۳

(۲) نابغہ کے نام اور سلسلہ نسب میں بڑا اختلاف ملتا ہے۔ چنانچہ کسی نے عبداللہ بن قیس، کسی نے قیس بن عبداللہ اور کسی نے حسان بن قیس لکھا ہے۔ ڈاکٹر شوقی ضیف نے اپنی کتاب تاریخ الادب العربی۔ العصر الاسلامی کے حاشیہ ص ۱ پر حبان بن قیس لکھا ہے جس میں شک ہے غالباً کمپوزر کی غلطی سے حسان سے حبان ہو گیا ہے۔ کیوں کہ کسی مستند کتاب میں حبان نام نہیں ملتا۔ ہم ابن سلام کا لکھا ہوا سلسلۂ نسب لکھتے ہیں جو قیس بن عبداللہ بن عُدس بن ربیعہ بن جعدہ بن کعب بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ ہے۔ ص ۱۰۳

(۳) تاریخ الادب العربی ڈاکٹر عمر فروخ ص ۳۴۳

(۴) الفیروز آبادی اور الشعر والشعراء لابن قتیبہ

ابن سلام نے اس کی دلیل میں نابغہ کے تین شعر بھی نقل کئے تھے جن میں سے دو یہ ہیں۔

تذکرتُ شیئاً قد مضیٰ لسبیله　　ومن عادة المحزون أن یتذکّرا

ندامایَ عند المنذر بن محرّقٍ　　فأصبح منهم ظاهر الأرض مقفرا

یعنی غمگین دل لوگوں کی طرح میں نے بھی اپنی اس چیز کو یاد کیا جو جا چکی یعنی اپنے ان ہم نشینوں کو جو المنذر بن محرق کے پاس تھے اور جو اب اس زمین پر نہیں ہیں۔
اس کے علاوہ لمبی عمر پانے کی دلیل "خُنان" کی جنگ میں نابغہ کی موجودگی سے دی ہے۔ جو بہت قدیم زمانہ میں چھڑی تھی بعض لوگ اس کو ایک بیماری بھی بتاتے ہیں بہر حال نابغہ کہتا ہے۔

فمَن یکُ سائلاً عنّی فإنّی　　من الفتیان أیّامَ الخُنانِ

أتتْ مئةٌ لِعامٍ ولدت فیه　　وعشرٌ بعد ذاک وحِجّتانِ

یعنی اگر کوئی میرے بارے میں پوچھے تو میں ان نوجوانوں میں سے ہوں جو معرکہ "خُنان" کے زمانے میں موجود تھے میری پیدائش کے سال پر اب تک ایک سو بارہ سال گذر چکے ہیں۔
اصفہانی نے الاغانی کے پانچویں حصے میں اور السجستانی نے اپنی کتاب المعمرین میں اس کے مزید چند شعر نقل کئے ہیں جن میں نابغہ نے اپنی لمبی عمر کا ذکر کیا ہے چنانچہ ایک جگہ کہتا ہے۔

لَبِستُ أناساً فأفنیتُهم　　وأفنیتُ بعد أناسٍ أناسا

ثلاثة أهلین أفنیتُهم　　وکان الإله هو المستآسا

یعنی میں نے کچھ لوگوں کے ساتھ زندگی گزاری اور ان کو فنا کر دیا اور ان لوگوں کے بعد بھی کچھ لوگوں کو فنا کیا اس طرح میں نے تین پیڑھیاں ختم کیں اس پورے عرصہ میں صرف خدا ہی وجہ صبر رہا ایک دوسری جگہ اپنی عمر اور منذر بن المحرق اور اسلام کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔

فإنْ تَكُ أمامَهُ عُمِّرتَ زمانةً　　وذبحتُ من عِترٍ على الأوثانِ

ولقد شهدتُ عُكاظَ قبل محَلِّها　　فیها وکنتُ أُعَدُّ ملفتیانِ

والمنذر بن محرّقٍ فی مُلکہ   وشھدتُ یومَ ھجائنِ النعمانْ[1]

وعُمِّرتُ حتی جاء أحمدُ بالھُدیٰ   وقوارعٍ تُتلیٰ مع الفرقانْ

ولبستُ مِلءِ سلامِ ثوباواسِعًا   من سَیّب لاحرمٍ ولامنّانْ[2]

کہتے ہیں کہ نابغہ الجعدی زمانہ جاہلیت میں حیرہ کے لخمی (۳) امراء کے یہاں آجایا کرتا تھا۔ اوران کے انعام واکرام سے مالامال ہوکر واپس آتا تھا نابغہ امیہ بن ابی الصلت اور ورقہ بن نوفل کی طرح خدا کی ذات، نظامِ کائنات وغیرہ پرغور وفکر کیا کرتا تھا اس نے شراب وکباب اور رندی وہوسناکی سے توبہ کررکھی تھی۔ بتوں کی پرستش نہیں کرتا تھا اور ازلام (فال نکالنے کے تیر) وغیرہ سے فال نہیں نکالتا تھا۔ دین ابراہیمی کا تذکرہ کیا کرتا تھا اور روزے رکھتا تھا اور توبہ واستغفار کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے زمانہ جاہلیت میں کہا تھا۔

الحمد للہ لاشریک لہ   مَن لم یَقُلھا فنفسہ ظلما

یعنی اس خدا کا شکر ہے جس کا کوئی شریک نہیں جس شخص نے یہ بات نہیں کہی اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

سال وفود میں جب عربی قبائل کے وفود آنحضرت کے پاس آنے لگے تو سنہ ۹ھ میں نابغہ بھی اپنی قوم کے ساتھ آنحضرت کے پاس آیا اور مسلمان ہوکر ایک بہت خوبصورت مدحیہ نعت کہہ کر آپ کو سنائی جو اسلوب اور انداز میں بھی بہت حسین ہونے کے علاوہ دینی معانی ومطالب کا بھی گہوارہ ہے اس کا مطلع ہے۔

اتیتُ رسولَ اللہ إذا جاء بالھدیٰ   ویتلوکتابا کالمجرۃ نیرا

---

(۱) یوم ہجائن النعمان کے لئے دیکھو ایام العرب فی الجاہلیۃ۔

(۲) نابغہ کی عمر کے بارے میں تفصیل اور تحقیق کے لئے دیکھئے۔ خزانۃ الادب للبغدادی جلد اول ۲۔ معجم الشعراء للمرزبانی ۳۔ اور جمہرۃ انساب العرب للسمعانی۔

(۳) اس ریاست کے بارے میں اس کتاب کی جلد اول ص ۴۷ ملاحظہ کیجیے۔

نابغہ قصیدہ پڑھتے جاتے تھے اور آنحضرت ہمہ تن گوش ہو کر سنتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ جب اس شعر پر نابغہ پہنچے۔

بلغنا السماءَ مجدُنا وجدودُنا — وإنّا لنبغي فوق ذلک مظهراً

یعنی ہم نے اپنی اور اپنے پرکھوں کی عزت آسمان پر پہنچا دی ہے اور اب اس کو اس سے (او نچے مظہر) بھی اونچی جگہ پر پہنچانا چاہتے ہیں" یہ سن کر آنحضرت نے فرمایا کہ "وہ مظہر کہاں ہے نابغہ؟" تو نابغہ نے جواب دیا "جنت" اس پر آپ نے فرمایا کہ "انشاءاللہ کہو" نابغہ نے کہا "انشاءاللہ" پھر قصیدہ جاری رکھا یہاں تک کہ جب یہ شعر پڑھا۔

ولا خیر فی جہلٍ إذا لم یکن له — حلیمٌ إذا ما أوردَ الأمرَ أصدرا

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بڑی تعریف کی اور وہ تاریخی بلیغ جملہ کہا جو پہلے گزر چکا ہے جس کا مطلب ہے کہ تم ہمیشہ گل افشانی کرتے رہو تمہارے دانت نہ گریں۔

بغدادی نے خزانۃ الادب میں لکھا ہے کہ اس قصیدہ میں تقریباً دو سو شعر تھے۔ جنھیں انھوں نے آنحضرت کو ایک ساتھ ہی سنائے تھے اس کا مطلع ہے[1]

خلیلیّ عوجا ساعۃً وتہجّرا — ونوحا علی ما أحدث الدھرُ أوذرا

یعنی اے میرے دونو دوستو ذرا رک جاؤ گھڑی بھر دم لے لو اور حوادث دھر پر روؤ یا چھوڑ دو؟

درحقیقت اس قصیدہ کے دو حصے ہیں ایک حصہ تو وہ ہے جو اس نے زمانۂ جاہلیت میں کہا تھا اور دوسرا حصہ وہ ہے جو اس نے اسلام لانے کے بعد کہا تھا۔ اس حصہ میں اسلامی تعلیمات اور قرآن کے معانی و مطالب اور اثرات پوری طرح نمایاں ہیں۔

نابغۃ الجعدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین اور عہد اموی کا ایک خاصا زمانہ دیکھا تھا اور ہر زمانہ میں ان کی ایک حیثیت رہی تھی۔

---

(1) خزانۃ الادب جلد اوّل ص ۵۱۳ بحوالہ شعر المخضرمین یحیی الجبوری ص ۲۳۹۔

کہتے ہیں کہ اسلام لانے کے بعد وہ اپنی قوم کے ساتھ بادیہ میں واپس نہیں گئے۔ مدینہ ہی میں رہ پڑے اور فتوحات میں شرکت کی چنانچہ فارس اور مشرق کی دوسری جنگوں میں شرکت کر کے دادِ شجاعت دی۔ آخری عمر میں جب قوی میں اضمحلال اور اعضاء و جوارح میں کمزوری پیدا ہوگئی، تو اپنی قوم سے ملنے اپنے اونٹوں کو دیکھنے اور بادیہ کی صاف ستھری زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان کا دل مچلنے لگا تو حضرت عثمان سے بادیہ واپس جانے کی اجازت چاہی اس پر حضرت عثمان نے کہا کہ ہجرت کرنے کے بعد اپنے پرانے گھروں کو واپس جانا تو مکروہ ہے تو بولے کہ صاحب مجھے یہ سب کچھ نہیں معلوم مجھے تو آپ اجازت بخشیں کہ میرا دل اپنی اونٹنیوں کا دودھ پینے اور بادیہ میں رہنے کے لیے ترس رہا ہے۔ بس اب خدا حافظ اور بادیہ چلے گئے۔

نابغہ کی یہ بادیہ پسندی اور اپنی قوم کے ساتھ والہانہ محبت اور تعصب کی وجہ سے وہ حضرت ابوموسی اشعری کے خلاف جو حضرت عثمان کی طرف سے بصرہ کے گورنر تھے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی ہجو کہہ ڈالی جس پر ابوموسی اشعری نے ان کے کوڑے لگوائے تو رسول اللہ کی قبر کے واسطہ سے مدد مانگی اور اس کے ساتھ اسلامی معانی و مطالب کا ذکر بھی کیا۔

رأیت البکر بکر بنی ثمود　　وأنت أراک بکر الأشعرینا

فإن یک ابن عفان أمیناً　　فلم یبعث بک البر أمینا

جب حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان خلافت کے معاملہ میں رسہ کشی شروع ہوئی تو انھوں نے حضرت علی کا صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ معرکہ صفین میں ان کے دوش بدوش لڑائی میں شریک ہو کر بھی ساتھ دیا۔ چنانچہ اس موقعہ پر حضرت علی کی تعریف اور حضرت معاویہ کی ہجو میں کچھ اشعار بھی کہے۔

قد علم المصران والعراقُ　　أنّ علیاً فحلها العتاقُ

إن الأولی جاروک لا أفاقوا　　لهم سیاق ولکم سیاق

یعنی کوفہ و بصرہ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ (حضرت) علی ہی اس خلافت

کے لئے موزوں ترین شریف امیدوار ہیں جن لوگوں نے تم پر ظلم زیادتی کی ہے خدا کرے وہ کبھی سنبھل نہ پائیں۔

روایت ہے کہ حضرت علی کی شہادت کے بعد جب خلافت کی باگ ڈور حضرت معاویہ کے ہاتھ میں آئی تو انھوں نے اپنے مدینہ کے گورنر مروان کو لکھا کہ نابغہ کا مال واسباب سب ضبط کر لئے جائیں۔ یہ خبر جب نابغہ کو ملی تو وہ معاویہ کے پاس آئے اس وقت مروان بھی ان کے ساتھ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان کے سامنے کچھ اشعار پڑھے جن میں کہتے ہیں۔

فإن تأخذوا أهلي و مالي بظنة — فإني لحرّاب الرجال مُجَرَّبُ

صبور على ما يكره المرء كله — سوى الظلم إني إن ظلمت سأغضب

یعنی اگر تم لوگ میرے اہل وعیال و مال و دولت کو محض بدگمانی کی وجہ سے ضبط کرو گے تو یاد رکھو میں بڑا جنگجو ہوں میں ہر تکلیف و مصیبت کو برداشت کر لیتا ہوں لیکن اگر میرے اوپر ظلم کیا گیا تو پھر میں اس کو برداشت نہیں کر پاتا ہوں بلکہ اس پر غیظ و غضب سے بھر جاتا ہوں۔

اس پر حضرت معاویہ نے مروان کی طرف دیکھا اور پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ مروان نے جواب دیا کہ میری رائے تو یہ ہے کہ ان کی کوئی چیز واپس نہ کیجئے۔ اس پر حضرت معاویہ نے کہا کہ تمہارے لئے یہ کہہ دینا بہت آسان ہے۔ لیکن اس کا خمیازہ کس کو بھگتنا پڑے گا؟ سارے عرب میں میری ناک کٹ کر رہ جائے گی۔ فوراً ان کی ساری جائیداد اور مال و دولت واپس کر دو۔

جب عبداللہ بن الزبیر نے یزید مروان اور عبدالملک کے خلاف اپنی خلافت کی مہم چلائی تو نابغہ نے عبداللہ کا ساتھ دیا اور ان کے پاس مکہ میں آکر ایک مدحیہ قصیدہ پڑھا جس میں کہا۔

حكيت لنا الصديق لما وليتنا — وعثمان والفاروق فارتاح مُعْدِمُ

أتاك أبو ليلى يجوب به الدجى — دجى الليل جوّاب الفلاة عَثَمْثَمُ

لتجبونه بانبا زعزعت به　　صروف الليالى والزمانُ المصممُ
چنانچہ ابن الزبیر نے باوجود اپنے بخل کے بہت انعام واکرام دیا۔

اغانی نے روایت کی ہے کہ مذکورہ بالا قصیدہ نابغہ نے بادیہ میں قحط پڑنے کے بعد ابن الزبیر کو سنایا تھا جس پر عبداللہ نے کہا کہ اے ابولیلی دھبرج دھروہم شعر کی وجہ سے تو تمہاری مدد نہ کریں گے لیکن اللہ کے مال میں تمہارے دو حق ہیں ایک تو اس وجہ سے کہ تم نے آنحضرت کی زیارت کی ہے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کوفے میں (مال غنیمت) شرکت کی وجہ سے۔ اس کے بعد ان کو بہت سا مال و دولت دے کر رخصت کیا (۱)

کہتے ہیں کہ اس کے بعد نابغہ اصبہان واپس آگئے جہاں ان کی قوم رہتی تھی اور ایک مختصر سی مدت کے بعد ان کا وہیں ۶۵ھ میں انتقال ہوگیا۔

روایت ہے کہ انتقال کے وقت ان کی عمر ایک سو بیس ۱۲۰ تھی (۲) اور اس رائے کے قائم کرنے میں ان کے ہی سابقہ شعر سے استدلال پیش کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ "میں اتنا جیا ہوں کہ میں نے تین پیڑھیاں اپنے سامنے ختم ہوتے دیکھیں"۔ ثلاثة اهلين۔ رواۃ کے خیال کے مطابق اگر ایک پیڑھی ۴۰ سال کی مان لی جائے تو پورے ایک سو بیس ۱۲۰ سال ہو گئے اس شعر سے پہلے والے شعر میں بھی بقول نابغہ کے "ایک سو بارہ ۱۱۲ سال وہ جیا" بعض راویوں کا خیال ہے کہ وہ النابغۃ الذبیانی سے بھی زیادہ عمر دراز تھا۔ چنانچہ ان کے خیال کے مطابق نابغہ جعدی ایک سو اسّی ۱۸۰ سال زندہ رہا۔ (۳)۔ اور اس کی دلیل میں وہ اشعار پیش کرتے ہیں جن کی ابتدا "... نشيا قد مضى لسبيله" سے کی ہے اور جن میں المنذر بن محرق کے ساتھ رہنے کا تذکرہ ہے لیکن یہ سب روایتیں مبالغہ پر مبنی ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ نابغہ نے بھی اپنے ہم نام اور ہم عصر النابغۃ الذبیانی کی طرح بہت لمبی عمر پائی جو ممکن ہے ایک سو بارہ ۱۱۲ سال سے

---

(۱) الاغانی ۵ ۲۰

(۲) الشعر والشعراء ابن قتیبہ ... (۳) الکامل للمبرد۔

لے کر ایک سو بیسؓ سال ہو۔ اس سے زیادہ کی بات معقول نہیں نظر آتی۔

امتیازی خصوصیات:

نابغہ کے جاہلی زمانہ اور اسلامی زمانہ کے کلام کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات صاف دکھائی دے گی کہ وہ دور جاہلی اور عہد اسلام دونوں میں بحیثیت ایک فطری شاعر کے بزم سخن میں گل افشاں رہا ہے اس کی بہترین مثال اس کا وہ لمبا قصیدہ ہے جو اس نے اسلام لانے کے بعد آنحضرت کو سنایا تھا اور جس کو سن کر آنحضرت نے اس کو دعا دی تھی جس کا تفصیلی ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اس قصیدہ کو نابغہ نے دور جاہلی میں شروع کیا تھا اور اسلام لانے کے بعد اس میں اشعار کا اضافہ کرتا گیا۔ چنانچہ دونوں زمانوں کے دو رنگ صاف صاف اس قصیدہ میں دکھائی دیتے ہیں۔

پہلے حصہ میں جو عہد جاہلی کی یادگار ہے اپنی زندگی کے اس حصہ کو بیان کرتے ہیں جو لخمی امراء اور عربی نوجوانوں کی معیت میں رنگ و راگ اور لطف و سرور میں گزرا جس میں اس رنگ کے علاوہ اپنی قوم اور اس کے کارناموں پر فخر ہے۔ اس حصہ میں اپنی قوم کی بہادری اور ان کے جنگی کارناموں کے ذکر کے علاوہ اپنے گھوڑوں تک کی بہادری، میدانِ کارزار میں ڈٹے رہنے نیزوں کی سخت بارش میں بھی منہ نہ موڑنے کا ذکر کرنے کے بعد مبالغہ کی چاشنی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان گھوڑوں کی قوت برداشت وفاداری جیالے پن کا یہ عالم ہے کہ نیزوں کی بوچھار کی وجہ سے ان کے جسموں سے اتنا خون بہا ہے کہ ان کا رنگ اس حد تک بدل گیا ہے کہ ہمیں ان کے پہچاننے میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم کالے گھوڑے کو لال اور لال کو کالا سمجھنے لگتے ہیں اس کے بعد وہ فخریہ شعر پڑھتے ہیں جس میں آسمان میں عزت و ناموری کی کمند ڈالنے کا ذکر ہے اور جسے سن کر آنحضرت نے پوچھا تھا کہ آسمان سے آگے کہاں مظہر ہے؟ تو بولے تھے

کہ "جنت" اس پر آنحضرت نے خوش ہو کر انشاء اللہ کہنے کی تلقین کی تھی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

إنّا لقومٌ ما تعوّد خيلنا | إذا ما إلتقينا أن تحيد وتنفرا
ونُنكر يومَ الروع ألوان خيلنا | من الطعن حتى نحسب الجون أشقرا
بلغنا السماءَ مجدُنا وجدودُنا | وإنا لنرجو فوق ذلك مظهرا

دوسرے حصہ میں ان خیالات وافکار کا ذکر ہے جو آنحضرت کی صحبت، رات دن قرآن کی تلاوت اور اسلام کی تعلیمات کی دین ہیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ دونوں زمانوں کے کلام میں کہیں جھول یا کمزوری نہیں ہے بلکہ عہد اسلامی کے کلام میں رقت حلاوت اور گھلاوٹ کا اظہار نسبتاً زیادہ ہے جو بہرحال عبادت وریاضت اور قرآن کے معجز نما اسلوب بیان سے تأثر کی غمازی کرتا ہے۔ اتنی لمبی عمر پانے اور اس ساری زندگی کو تلاش حق میں گزارنے کے بعد جب اسلام کی دولت ملی تو موت وزیست آلام واحزان خدا سے تعلق اور اس کی رضاجوئی اور اس کی خاطر ہر چیز کو قربان کر دینے یا ہیچ سمجھنے کا فلسفہ اور حکمت ان کی زندگی کا جز بن گیا چنانچہ ان کا خیال تھا کہ دنیاوی زندگی ہمیشہ بری چیز رہی ہے تم چاہے روؤ دھوؤ یا اس کو وقار اور سکون کے ساتھ جھیل جاؤ اور کوئی اگر ایسی مصیبت آن پڑے جس کو تم دفع نہ کر سکو تو واویلا نہ مچاؤ کہ اللہ کے فیصلہ سے مفر نہیں۔ لعنت وملامت کرنے سے کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

ولا تجزعا إنّ الحياة ذميمةٌ | فخفّا لروعات الحوادث أوقرا
وإن جاء أمرٌ لا تطيقان دفعهُ | فلا تجزعا مما قضى الله واصبرا
ألم تريا أنّ الملامة نفعها | قليلٌ إذا ما الشيء ولّى وأدبرا
تهيج البكاءَ والندامةَ ثم لا | تغيّرُ شيئاً غير ما كان قدّرا

جب زندگی کا یہ عالم ہے تو پھر راہ خدا میں اپنی جان کی بازی لگا دینے سے بھی آدمی کیوں دریغ کرے چنانچہ نابغہ جیسا کہ پہلے بیان ہوا اسلامی لشکر کے ساتھ ایران وفارس کی مہموں میں شریک ہوئے پھر بھی ہر وقت تقوی اور

خوف دوزخ دامن گیر رہا۔

وجاهدتُ حتى ما أحسُّ ومَن معي سُهَيلا إذا ما لاحَ ثمّتَ غوّرا

أُقيمُ على التقوى وارضى بفعلها وكنتُ من النارِ المخوّفةِ أوجرا

زہد وتقویٰ کے خیالات ان کے اس قصیدہ میں ہی نہیں ملتے ہیں بلکہ دوسرے قصیدوں میں بھی خدا کی وحدانیت اس کی ربوبیت اور اس کی خشیت اس کی خالقیت اور ہر چیز پر قادر اور ہر ایک کے مالک ہونے کا ذکر ملتا ہے اور بعض اوقات اس انداز سے کہ اسلوب اور معانی بالکل قرآن کا چربہ لگتے ہیں۔

الحمد لله لا شريكَ له من لَم يقلها فنفسه ظلما

المولج الليلَ في النهارِ و في الليل نهارا يفرّج الظلما

الخافضِ الرافعِ السماءَ على الارض ولم يبنِ تحتها دِعما

من نطفةٍ قدّرها فقدّرها يخلق منها الابشارَ والنسما

اس کے بعد ایران، سبا، اور مآرب کی سلطنتوں کی تباہی سے لوگوں کو نصیحت وعبرت حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دیکھو آج وہ غلام ہوکر تمہاری بکریاں چرا رہے ہیں ایسا لگتا ہے کہ ان کی حکومت ایک خواب تھی۔

یا ایها الناس هل ترون الی فارس بادت، وخدُّها رغما

أمسوا عبيداً يرعون شاءكُمُ كأنّما كان ملكهم حُلُما

أو سبأ الحاضرين مأرب إذ يبنون من دونه سيله العرما

تمزّ قواحي البلاد إعترفوا الـ ـهُون وذاقوا البأساء والعدما

نابغۃ الجعدی شعر کہنے کے لئے اپنے پیش رو شاعروں جیسے زہیر بن ابی سلمی اور حطیئہ کی طرح الفاظ کے انتخاب اور ان کی سج دھج یا معانی و مطالب کی گہرائی وگیرائی کی طرف بہت دھیان نہیں دیتے تھے بلکہ جو مضمون یا موضوع جس طرح فطری طور پر ذہن میں آگیا اسی طرح زبان سے نکل گیا۔ اس کو نوک پلک سے درست کرنے یا کاٹ چھانٹ کر اس کو اور زیادہ مؤثر یا پسندیدہ بنانے کی

کوشش نہیں کرتے تھے اس لئے ان کے اسلوب بیان میں بڑا فرق اور معانی مطالب میں بڑا اونچ نیچ ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کہیں پر ان کا کلام بہت ہی گٹھا ہوا چست اور بلند آہنگ ہے تو دوسری جگہ ڈھیلا ڈھالا کمزور اور پھسپھسا سا۔ اسی لئے اصمعی کہا کرتا تھا کہ "اس کے پاس ہزاروں دینار کی خام ریشم کی ایک منقش چادر ہے اور درہم سوا درہم کی ایک اوڑھنی" یعنی یا تو کلام اتنا شاندار جو ہزاروں کے مول سے بھی زیادہ کا ہے یا اتنا گھٹیا کہ کوڑیوں میں بھی کوئی نہ پوچھے۔ یہ بات صرف ان شعراء کے کلام میں ملتی ہے جو آمد کے قائل ہیں آورد کے چکر میں نہیں پڑتے۔

مگر یہ عجیب بات ہے کہ نابغہ الجعدی ان سب خوبیوں کے باوجود ہجو میں کسی سے نہ جیت سکے۔ اول تو کسی سے خود چھیڑ خانی کی نہیں اور اگر کہیں پھنس گئے تو دو ایک وار کے بعد ہار مان لی۔ اور اپنے سے بہت ہی گھٹیا قسم کے شاعروں کے مقابلہ میں بھی۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک معمولی شاعر اوس بن مغراء اور عقیل بن خالد بن العقیلی سے نوک جھونک پہل پڑی تو علد ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ اسی طرح حضرت معاویہ کی مخالفت میں ان کے شاعر کعب بن جعیل کی ہجو کا ... ڈالی لیکن جب وہ پیچھے پڑ گیا تو میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے یہی نہیں بلکہ عورتوں کے مقابلہ میں کبھی اپنی ہار مان لینے میں ان کو عار نہ تھا چنانچہ اصبہان کے زمانۂ قیام میں ایک دفعہ سوار بن اوفی القشیری سے چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی اس کی مدد کے لئے جب اس کی بیوی اس زمانہ کی مشہور شاعرہ لیلیٰ الاخیلیہ میدان میں کودی تو یہ حضرت خاموشی سے بیٹھ گئے اخطل سے بھی ان کی ہجوگوئی کا قصہ مشہور ہے لیکن اس کے مقابلہ میں جیتنے کا کیا سوال تھا جب وہ اوس اور عقیل جیسے گھٹیا شاعروں کے سامنے جھک جاتے تھے۔ نابغہ الجعدی "نابغہ الذبیانی کے ہم عصر تھے۔ لیکن اس نے ان کو ابھرنے نہیں دیا چنانچہ اس زمانہ میں ان کا کہیں ذکر بھی نہیں ملتا۔ حالاں کہ بقول خود نابغہ الجعدی کے وہ منذر کے باپ منذر بن محرق کے دربار سے وابستہ رہ چکے تھے اور نابغہ ذبیانی کی رسائی صرف اس کے بیٹے کے دربار تک ہو سکی تھی پھر بھی اس نے ... [illegible] ... دیا ... [illegible] ... کا خیال ہے کہ ... کے اس طرح ہر ایک کے مقابلہ میں میدان چھوڑ کر بھاگ جانے میں شاید ... [illegible]

تعلیمات کا اثر ہے۔ کیوں کہ وہ فحش ہجو گوئی کرنے کو پسند نہ کرتے تھے (۱) یہ بات
ایک حد تک تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ہر جگہ ہر ایک کے مقابلہ میں یہ رویہ سمجھ میں نہیں
آتا ایسا لگتا ہے کہ اسلامی اثرات کے علاوہ خود ان کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ کسی سے
زیادہ الجھنا پسند نہ کرتے تھے۔

مختلف اصناف سخن میں نابغہ کے محبوب اصناف مدح ہجو اور وصف ہیں
کہیں کہیں حکمت و فلسفہ کے مضامین خاص طور سے اسلامی رنگ کے فلسفیانہ
مضامین بھی ملتے ہیں۔ گھوڑوں کے وصف میں نابغہ مشہور زمانہ کے تھے عباسی
دور کا مشہور ناقد اصمعی کہا کرتا تھا کہ عرب میں تین اشخاص ایسے ہیں کہ گھوڑوں
کے وصف کرنے میں ان کا جواب نہیں۔ طفیل الغنوی أبودؤاد الأیادی اور
النابغہ الجعدی (۲) نابغہ وہ پہلے عرب شاعر ہیں جنھوں نے شعر میں ایک محبوبہ کا
نام لے کر دوسری کے نام کا کنایہ کیا ہے جیسے بعد کے آنے والے شعراء نے اپنایا
چنانچہ ان کا قول ہے ؎

أکنی بغیر اسمہا و قد علم اللہ خفیات کل مکتتم۔

یعنی میں اپنی محبوبہ کے نام کا دوسرے نام سے کنایہ کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ
دلوں کی ڈھکی چھپی باتوں کو جانتا ہے،

---

(۱) تاریخ الادب العربی العصر الاسلامی ۱۰۲
(۲) طبقات الشعراء لابن قتیبہ۔

نابغۃ الجعدی کے کچھ منتخب اشعار:

مدح اور دوسرے اصناف میں نابغہ کے کلام کے نمونہ پچھلے صفحات میں گزر چکے ہیں یہاں مرثیہ کے چند نمونے دیے جاتے ہیں۔

اپنے اَیا۔ تے محارب کا مرثیہ کہتے ہوئے اسی ضمن میں اپنے ایک سوتیلے بھائی "وَحوَح" کا ذکر کرتے ہیں جو اسی طرح ختم ہو چکا تھا۔

حوالہ جات:

۱۔ الشعر والشعراء لابن قتیبۃ ۱/۲۴۷۔
۲۔ طبقات فحول الشعراء لابن سلام الجمحی ۱۰۳۔
۳۔ الاغانی ۵/۱۔
۴۔ اسد الغابۃ فی معرفۃ احوال الصحابۃ لابن اثیر ۵/۷
۵۔ الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب: یوسف بن عبد البر النمری طبع حیدرآباد۔
۶۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابہ لابن حجر العسقلانی ۶/۲۱۸۔
۷۔ امالی المرتضی ۱/۲۶۳۔
۸۔ کتاب المعمرین: ابو حاتم سہل بن محمد السجستانی۔
۹۔ خزانۃ الادب ولب لباب لسان العرب لعبد القادر بن عمر البغدادی ۱/۵۱۷۔
۱۰۔ الموشح فی مآخذ العلماء علی الشعراء محمد بن عمران المرزبانی
۱۱۔ الشعر الاسلامی: ڈ۔ عبد اللہ الحامد ۲۷۸۔
۱۲۔ تاریخ الادب العربی: ڈ۔ عمر فروخ ۳۴۲۔
۱۳۔ من تاریخ الادب العربی: طہ حسین ۱/۲۴۴۔
۱۴۔ شعر الدعوۃ: ڈ۔ عبد اللہ الحامد ۱۳۸۔
۱۵۔ معجم الشعراء للمرزبانی ۹۵۔ (اسلامی زمانہ میں کہے گئے قصیدوں اور اشعار کے لئے)۔
۱۶۔ جمہرۃ أنساب العرب للسمعانی ۲۷۴۔
۱۷۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ لجرجی زیدان ۱/۷۵۔
۱۸۔ جمہرۃ اشعار العرب لابی زید القرشی (فی المنتوبات)۔

۱۹۔ جواہر الادب فی أدبیات وإنشا لغۃ العرب احمد الہاشمی۔
۲۰۔ الحیاۃ الادبیۃ بعد ظہور الاسلام۔ محمد عبد المنعم خفاجی۔
۲۱۔ المؤتلف والمختلف للآمدی۔
۲۲۔ السیرۃ النبویہ لابن ہشام۔
۲۳۔ تاریخ الأدب العربی حنا الفاخوری ص۲۴۱۔
۲۴۔ الوسیط: ۱۶۵ (احمد الاسکندری ومصطفی عنانی)۔
۲۵۔ تاریخ الادب العربی: العصر الاسلامی: شوقی ضیف ص۱۰۱۔
۲۶۔ شعر المخضرمین واثر الاسلام فیہ: یحیی الجبوری ص۲۲۶۔

۹۔ عَمْرو[1] بن مَعدی کَرِب الزُبَیدی

پیدائش سنہ ۷۵ ق ھ / سنہ ۵۴۷ء وفات سنہ ۲۱ھ / سنہ ۶۴۲ء

یمن کے شہسوار، مشہور مقرر اور عمر دراز شعراء میں عمرو بن معدی کَرِب کا نام بڑے احترام اور عزت سے لیا جاتا ہے۔ مخضرمین شعراء کے دوسرے طبقہ میں ان کا شمار ہوتا ہے ان کی کنیت ابو ثور تھی اور قبیلہ مَذْحِج سے خاندانی تعلق تھا (۲)۔ ان کی بہن کا نام ریحانہ تھا جو الصِّمَّہ بن الحارث کی بیوی اور مشہور شاعر دُرَید بن الصمّہ اور عبداللہ کی ماں تھی۔ الصمّہ زبرقان بن بدر التیمی کی خالہ کا لڑکا تھا۔

عمرو بن معدی کرب کی پیدائش ہجرت نبوی سے تقریباً ۷۵ سال پہلے (مطابق ۵۴۷ء) یمن میں ہوئی۔ عجیب بات ہے کہ بچپنے سے لے کر جوانی تک عمرو اپنے قبیلہ میں ایک پیٹو اور احمق نکمے جوان کی حیثیت سے مشہور رہا۔ جس سے نہ کسی خیر کی توقع تھی اور نہ کوئی اونچی حیثیت حاصل کرنے کی امید۔ حالاں کہ ڈیل ڈول کا بہت بڑا اور آواز بڑی موٹی اور گرجدار پائی تھی۔ مگر نہ کسی کام کا نہ کاج کا۔ دشمن اناج کا۔ اتنے میں ایک دن خبر اڑی کہ قبیلہ خثعم اس کے قبیلہ پر حملہ کرنے والا ہے۔ چنانچہ قبیلہ زُبید نے مدافعت کی تیاری کرنی شروع کی۔ عمرو نے جب

---

(۱) اردو میں لوگ اس نام کو عَمْرو (Umroo) پڑھتے ہیں جو غلط ہے حرف 'ر' کے بعد جو 'و' ہے وہ پڑھا نہیں جاتا۔ اسی طرح 'ع' کے اوپر جو پیش پڑھا جاتا ہے وہ بھی غلط ہے۔ یہاں 'ع' پر زبر ہے اور 'م' ساکن ہے اس طرح یہ لفظ عَمْر (Amr) ہے 'ر' کے بعد 'واؤ' لفظ 'عُمَر' سے اس کو ممتاز کرنے کے لئے بڑھایا جاتا ہے جیسا کہ دوسرے خلیفہ حضرت عُمَرؓ (Umar) کے نام اور مشہور صحابی حضرت عَمْرو (Amr) بن العاص کے نام میں فرق ہے۔

عَمْرو = Amr ۔ عُمَر Umar

(۲) پورا سلسلہ نسب یوں تھا - ابو ثور عمرو بن معدی کرب بن عبداللہ بن عمرو بن زُبید (جس کا تعلق قبیلہ سعد العشیرہ سے تھا) بن مَذحِج یمنی۔

یہ خبر سنی تو اپنی بہن کے پاس گیا اور بولا کہ مجھے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھلا دو کل معرکہ ہے۔ بہن نے یہ بات باپ کو بتائی۔ باپ نے کہا کہ اس احمق سے پوچھو کہ کس چیز سے اس کا پیٹ بھرے گا؟ چنانچہ وہ ایک پوری بکری تین سیر مکئی کی روٹی کے ساتھ کھا گیا اور ڈکار بھی نہ لی۔ دوسرے دن خشعیوں نے حملہ بول دیا ادھر گھمسان کا رن پڑنے لگا ادھر عمرو پڑے اینٹھتے رہے ان کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ یہاں تک کہ اس کے باپ کا جھنڈا جھک گیا اور قبیلۂ زبید کو شکست ہو گئی اب اس کو جوش آیا۔ اور تلوار لے کر میدان میں جو کودا ہے تو کشتوں کے پشتے لگا دیئے زبیدیوں نے جب یہ منظر دیکھا تو سب پھر پلٹ پڑے اور اب بانسہ پلٹ گیا عمرو نے تلوار کے وہ جوہر دکھائے کہ خشعم والوں کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور اس دن سے زبید کا یہ احمق نکما نوجوان زبید کے شہسوار کے نام سے مشہور ہو گیا جس سے عرب کے بڑے بڑے بہادروں کی جان نکلتی تھی اس کی بہادری اور بے جگری کا اتنا چرچہ ہوا کہ شجاعت و بہادری میں عمرو ضرب المثل بن گیا اور شعراء اس کی مثال دینے لگے چنانچہ ابو تمام نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ

إقدامُ عمروٍ في سماحةِ حاتمٍ　　　في حِلمِ أحنفَ في ذكاءِ إياسِ

اس کو بھی اپنی بہادری اور شجاعت کا احساس اور اس پر بڑا اعتماد اور ناز تھا۔ چنانچہ کہا کرتا تھا کہ اگر میں اکیلا ہو دے میں ایک پردہ نشین کو لے کر معد کے پورے تالاب پر قبضہ کر لوں تو بھی مجھے شکست کا کوئی ڈر نہ ہو گا۔ جب تک کہ معد کے دو آزاد اور دو غلام آدمیوں سے سابقہ نہیں پڑتا۔ اور وہ ہیں آزادوں میں عامر بن الطفیل اور عُیَیْنَۃ بن الحارث ابن شہاب اور غلاموں میں بنو عبس کا کالا یعنی عنترہ بن شداد العبسی (۱) اور سُلَیک بن السلکۃ (۲) جن سے میرا سابقہ پڑ چکا ہے۔

---

(۱) عنترہ سے متعلق تفصیل کے لیے اس کتاب کا پہلا حصہ ص ۲۲۶ اور تاریخ ادب عربی کی دوسری عربی کتابیں
(۲) صعالیک الشعراء یعنی خانماں برباد منچلے شعراء کا ایک رکن۔ تابط شرا اور شنفری کا ساتھی اور عرب کے مشہور کالے لوگوں میں سے ایک۔ ان کے بارے میں پڑھئے اس کتاب کا پہلا حصہ ص ۲۱۵ پر۔

کہتے ہیں اس رعب و دبدبہ اور شجاعت و بہادری اور اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد ایک لمبی عمر پانے اور مختلف معرکوں اور جنگوں میں داد شجاعت دینے کے باوجود دو ایک معرکوں میں اس کو سخت شکست بھی ہوئی ہے۔ چنانچہ جاہلی زمانے میں اس کو ربیعہ بن مکدم اور اسلامی زمانہ میں خالد بن سعید بن العاص نے سخت شکستیں دی تھیں۔

اسلام کے قبائل عرب میں پھیلنے اور آنحضرت کے غزوہ تبوک سے ۹ھ / ۶۳۱ء میں واپسی کے بعد عمرو اپنی قوم کے وفد کے ساتھ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے ساتھ اسلام لائے اور اسی کے ساتھ اپنی قوم میں واپس چلے گئے (۱) مگر آنحضرت کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر کی خلافت میں عمرو اپنی قوم کے ساتھ الاسود العنسی کی سرکردگی میں یمن میں مرتد یعنی اسلام سے پھر گئے۔ حضرت ابوبکر نے یمنیوں کی سرکوبی کے لئے خالد بن سعید بن العاص کی سرکردگی میں فوج بھیجی معدی کرب خالد سے مقابلہ کے لئے آئے لیکن بری طرح ہارے یہاں تک کہ خالد نے ان کی مشہور تلوار "صمصامۃ" کو بھی جس کی بڑی دھاک تھی ان سے چھین لیا۔ دوسری طرف انھوں نے دیکھا حضرت ابوبکر مستقل کمک بھیجے جارہے ہیں اب یہ سمجھ گئے کہ خیر نہیں۔ چنانچہ بغیر امان لئے یہ مہاجر کے پاس جو مسلمانوں کی فوج کے ایک سپہ سالار تھے پہنچ گئے۔ مہاجر نے ان کو رسیوں سے جکڑ کر قیدی بنا کر حضرت ابوبکر کے پاس مدینہ بھیج دیا۔ حضرت ابوبکر نے جب ان کو دیکھا تو فرمایا کہ معدی کرب تم کو شرم نہیں آتی ہر روز اس طرح جکڑے ہوئے یا شکست کھائے ہوئے میرے سامنے لائے جاتے ہو۔ اگر تم اس دین کو تقویت پہنچاتے تو خدا تم کو سربلندی دیتا۔ معدی کرب نے کہا کہ اچھا جو ہوا سو ہوا اب میں پھر اس دین میں واپس آتا ہوں اور پھر کبھی منہ نہ موڑوں گا۔ حضرت ابوبکر نے ان کو رہا کر دیا۔ چنانچہ معدی کرب اپنی قوم میں واپس آئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد پھر حضرت ابوبکر کے پاس مدینہ آگئے۔ ان دنوں شام کی مہمیں چل رہی تھیں۔ حضرت ابوبکر نے انھیں شام بھیج دیا۔ چنانچہ انھوں نے جنگ یرموک

---

(۱) بعض مورخین کا خیال ہے کہ مدینہ میں کچھ دنوں قیام کیا۔

میں بڑی جانبازی بہادری اور بے جگری سے حصّہ لیا۔ یہاں تک کہ اس معرکہ میں ان کی ایک آنکھ بھی چلی گئی، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے ان کو عراق کی مہم پر روانہ کر دیا، جہاں وہ معرکہ قادسیہ میں شریک ہوئے۔ انھوں نے ہی دشمن کے ہاتھی کی سونڈ پر اپنی تلوار کا ایسا بھرپور وار کیا کہ سونڈ کٹ کر دور جا پڑی، اور ہاتھی دیوانہ وار بھاگ پڑا جس سے ساری فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور مسلمانوں کو فتح ہو گئی۔ بعد میں جب شہر کوفہ بسایا گیا تو وہیں رہ بس گئے۔ اور جب اسلامی فوجوں نے فارس کی مہم شروع کی تو یہ بھی اس میں النعمان بن مقرن کی سرکردگی میں شریک ہوئے اور اس بے جگری سے لڑے کہ آخر اسی جنگ میں ۲۱ھ مطابق ۶۴۳ء میں شہید ہو گئے شہر 'قم' اور 'رے' کے درمیان واقع ایک جگہ 'فیذ ھان' میں دفن ہوئے جہاں کہتے ہیں کہ اب تک ان کی قبر موجود ہے۔

عَمْرو بن مَعْدِی کَرِبْ کا شمار بھی مخضرم شعراء میں ہوتا ہے کلام کی خوبی اور اور اسلوب بیان کے اعتبار سے ان شعراء میں ان کا نام دوسرے طبقہ میں آتا ہے ان کا کلام تھوڑا ہے لیکن جو ہے اس میں اس زمانے کے تمام اہم اصناف سخن مثلاً حماسہ، فخر، ہجو اور تھوڑی سی غزل، سب ہی کچھ آ گیا ہے۔ ان اصناف سخن میں حماسہ اور اپنی بہادری پر فخر زیادہ نمایاں ہے۔

تقریر کرنے میں بھی معدی کرب بہت مشہور تھے۔ چنانچہ النعمان بن المنذر نے جو وفد کسریٰ کے پاس بھیجا تھا اس میں معدی کرب بھی تھے۔ اس موقعہ پر انھوں نے جو تقریر کی تھی وہ فن خطابت میں مثالی حیثیت رکھتی ہے جس کے بعض جملے ایسے حکیمانہ تھے کہ ضرب المثل بن گئے ہیں جیسے "انما المرء باصغريه، قلبه ولسانه" یعنی آدمی عبارت ہے صرف اپنی دو چھوٹی چیزوں سے، ایک اس کا دل اور دوسری اس کی زبان۔ یا جیسے ان کا جملہ زبان کا نقطۂ عروج پکی اور ٹھیک بات ہے۔ اور چراگاہ تک دسترس ڈھونڈنے پر منحصر ہے"، یعنی محنت اور تگ و دو سے مقصد میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

امتیازی خصوصیات:

معدی کرب نے بہت زیادہ قصیدے نہیں کہے ہیں لیکن کے باوجود جو کلام بھی ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس عہد کا صحیح عکاس ہے۔ چنانچہ دوسرے شعراء کی طرح ان کے شعر میں بھی طبقہ مخضرمین کی اصل خصوصیات موجود ہیں۔ وہ قرآن و حدیث کے اثر سے جاہلی رنگ کے ساتھ اکثر خوبصورت اور موقعہ محل کے اعتبار سے مناسب اور معانی و مطالب کو صفائی سے بیان کرنے والے الفاظ کا مناسب ڈھنگ سے استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے اسلوب بیان میں سلاست و روانی آگئی ہے اور اشعار کے پڑھنے میں نہ رکاوٹ محسوس ہوتی ہے اور نہ گمبھیرپن کا احساس۔ معانی میں اگرچہ بہت گہرائی اور دقیقہ سنجی نہیں ہے لیکن زندگی اور اس کے مسائل انسان کے دکھ درد کی حکایت زندگی کو برتنے کے بعد اور اس سے ماخوذ اور اس سے سیکھی ہوئی حکمت و فلسفہ کی باتیں ملتی ہیں جو پسندیدہ عبرت آموز اور مفید ہیں۔ فخر میں غلو اور ہجو میں ابتذال اور فحاشی نہیں ہے۔ غزل معمولی ہے اور مدح نہ ہونے کے برابر۔

یمنی قبیلہ قضاعہ کی دو شاخیں جرم اور نہد نامی تھیں دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی، اور آخر میں جنگ چھڑ گئی جرمیوں نے شاعر کے قبیلہ زبید سے دوستی اور وقت پڑنے پر مدد کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ چنانچہ ایک جنگ میں بنو زبید کو شکست ہو گئی اور جرمی ان کو تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے اور معاہدہ کا پاس نہیں کیا معدی کرب نے اس موقعہ پر اپنی بہادری پر فخر اور جرمیوں کی معاہدہ شکنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

و مُرْدٍ على جُرْدٍ شهدتُ طِرادَها	قُبَيْلَ طلوعِ الشمسِ أوحينَ ذَرَّتِ
صَبَحْتُهم بيضاءَ يُبرقُ بَيْضُها	إذا نظرتْ فيها العيونُ ازمهرَّتِ
ظَلِلْتُ كأني للرماحِ دَرِيَّةٌ	أُقاتلُ عن أبناءِ جرمٍ وفرَّتِ
فلم تغنِ جرمٌ نهدَها إذ تلاقتا	ولكن جرماً في اللقاءِ ابذعرَّتِ

فلو أنّ قومي انطقتني رماحهم   نطقت ولكنّ الرماح أجرّت

یعنی جب بہت سے نوخیز اور نوعمر شہسواروں کو میں نے چھوٹے بالوں والے یعنی اچھے گھوڑوں پر بیٹھے معرکہ کارزار میں پوہنچنے سے پہلے جولانی کرتے دیکھا تو میں ان سے بھڑ گیا۔

اور صبح سویرے ہی ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ایک لشکر لے کر ان پر ٹوٹ پڑا جس کے ہتھیاروں اور خودوں کی چکاچوند سے آنکھیں چندھیا جاری تھیں۔

اور جب بنو جرم ہم کو معرکہ کارزار میں تنہا چھوڑ کر بھاگ لئے تو میں اکیلا ہی میدان میں کھڑا سارے تیروں کا نشانہ بنا رہا اور جرمیوں کی طرف سے بھی لڑتا رہا۔

اور جب جرمیوں اور نہدیوں کی لڑائی ہوئی تو جرمی نہدیوں کے سامنے ٹھہر نہ سکے بلکہ تتر بتر ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اگر میری قوم میرے ساتھ معرکہ میں ڈٹی رہتی تو میں بھی جا رہتا لیکن افسوس ہے کہ مجھے تنہا چھوڑ کر وہ لوگ بھی بھاگ لئے (اس لئے شکست ہو گئی)۔

اپنی بہادری اور حریف کے بڑے سورماؤں سے نبرد آزمائی کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

وعلمتُ أنّي يومَ ذا   كَ منازلٌ كعباً و نَهْدا

قومٌ إذا لبسوا الحديـ   ـدَ تَنَمّروا حِلَقاً و قِدّا

كلّ امرئٍ يجري إلى   يومِ الهياج بما استعدّا

أعددتُ للحدثانِ سا بغةً وعدّاءً علندى۔

نَهْداً و ذا شُطَبٍ يُقدّ   البيضَ والأبدانَ قدّا

لما رأيتُ نساءنا   يفحصن بالمعزاء شدّا

وبدتْ لميسُ كأنّها   بدرُ السماءِ إذا تبدّى

وبدتْ محاسنها التي   تخفى وكان الأمرُ جِدّا

نازلتُ کبشھُم ولَمُ   اَرَ مِن نزال الکبش بُدّا
ھم ینذرون دمی وأنذرُ   اِن لقیتُ بأن أشدّا

یعنی جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب کعب اور نھد سے مقابلہ کے بغیر چارہ نہیں
یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ہتھیار سے لیس ہو کر زرہیں اور ان کے اوپر چڑھے
کی صدریاں پہن کر میدان جنگ میں اترتے ہیں تو چیتوں کی طرح بہادری اور
شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہر آدمی جب میدان جنگ میں جاتا ہے تو اپنی حیثیت
کے مطابق اچھی تیاری کر کے جاتا ہے۔

میں نے بھی حوادث زمانہ یا جنگوں کے لئے ایک لمبی چوڑی زرہ بکتر ایک
تیز بھاگنے والا اور غیظ و غضب سے بھرا ہوا گھوڑا تیار رکھا ہے۔ جس کا سینہ
بڑا چوڑا چکلا ہے اور ایک تیز دھار کی تلوار جو خودوں اور جسموں کو کھیرے
ککڑی کی طرح کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔

جب میں نے دیکھا کہ ہماری عورتیں سخت و سنگلاخ زمین میں دخوف و
دہشت سے) بھاگ رہی ہیں جس کی وجہ سے گرد و غبار اٹھ رہا ہے۔

اور ان میں لمبش اس طرح دکھائی دی جیسے کہ چاند نکل آیا ہو اور اس طرح
کہ اس کے وہ محاسن جو عام طور سے چھپائے جاتے ہیں دکھائی دے رہے تھے
اور معاملہ بڑا گمبھیر تھا تو

میں دشمن کے سردار پر ٹوٹ پڑا کہ بغیر اس سے نبرد آزمائی کرنے کے کوئی
اور چارہ کار نہ رہ گیا تھا۔

انھوں نے ایک طرف میرے خون پینے کی منت مان رکھی تھی اور دوسری
طرف میں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب مقابلہ ہوگا تو ان کے چھکے چھڑا دوں گا۔

ہجو ا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا معدی کرب آنحضرت کے وصال کے بعد بعض دوسرے
قبیلوں کے افراد کی طرح اسلام سے پھر گئے تھے اس زمانہ میں انھوں نے اپنے

علاقے کے گورنر فروۃ بن مسیک کی ہجو لکھ ڈالی جس میں کہتے ہیں۔

وجدنا مُلکَ فروۃَ شرَّ ملکٍ　　حمارًا ساف منخرہُ بثغرٍ

وکنتَ إذا رأیتَ أبا عُمَیرٍ　　تری الحولاء من خُبثٍ وغدرٍ[1]

یعنی ہم نے فروہ کی حکومت کو بد ترین حکومت پایا اور خود اس کو ایک ایسا گدھا جس کا نتھنا نکیل سے گھس گیا ہے اور اگر تم ابو عمیر کو دیکھو تو تمہیں ایسا لگے گا جیسے کہ وہ خباثت اور غداری کی کانی بڑھیا ہو۔

قبیلہ جرم کی ہجو کرتے ہوئے کہا ہے۔

لحا اللہ جرمًا کلّما ذرّ شارق　　وجوہ کلاب هارشت فازبأرّت

یعنی قبیلہ جرم پر ہمیشہ اللہ کی لعنت ہو ان کے چہرے کتوں کی طرح ہیں اور وہ لڑتے بھی کتوں کی طرح ہیں لیکن ڈر کے مارے ان کے بال اٹھے رہتے ہیں۔

حکمت و فلسفہ:

عمرو بن معدی کرب نے روزمرّہ کی زندگی کے واقعات اور حوادث زمانہ سے متاثر ہو کر حکمت و فلسفہ کی کچھ ابدی باتیں بھی کہی ہیں جو آج بھی اسی طرح صحیح ہیں جس طرح ان کے زمانہ میں تھیں۔

کم من أخٍ لی صالحٍ　　بوّأتہ بیدیَّ لحدا

ما إن جزعتُ ولا ھلعتُ　　ولا یَرُدُّ بکای زندا[2]

ذھب الذین أحبّھم　　وبقیتُ مثل السیف فردا

یعنی کتنے ہی میرے نیک خو بھائی تھے جن کو میں نے خود ان ہاتھوں سے قبر میں دفن کیا ہے۔

بغیر روئے دھوئے اور واویلا کئے اور میرے رونے دھونے کو بالکل روکا نہیں جا سکتا۔

---

(۱) سیرت ابن ہشام ق ۲ ص۵۸۵ جمہرۃ انساب العرب ۳۸۲۔ فروہ شاعر بھی تھے ان کو حضرت عمرؓ نے ہی گورنر بنایا تھا۔

(۲) بعض نسخوں میں "زندا" کی جگہ "رُشدا" کا لفظ آیا ہے۔

جن کو میں چاہتا تھا وہ چلے گئے (مر گئے) اور میں بے نیام تلوار کی طرح اکیلا رہ گیا ہوں۔

ایک دوسری جگہ بہت عقل مندی کی بات کہتے ہیں کہ آدمی کا جوہر اور حسن ظاہری شان و شوکت لباس و کپڑا وغیرہ نہیں ہیں بلکہ اخلاق و عادات اور بلند نظری ہے جن کے ذریعہ عزت و بڑائی ملتی ہے۔

لیس الجمال بمئزر　　فاعلم وإن رُدّیت بُردا

ان الجمال معادنٌ　　ومناقبٌ اورثن مجدا

غزل یا النسیب:

غزل یا نسیب میں معدی کرب کا کلام بہت سادہ اور روایتی انداز کا ہے مگر سیدھا سادہ جیسے

أمِنْ ریحانة الداعی السمیعُ　　یؤرّقنی وأصحابی هجوعُ

أشابَ الرأسَ أیامٌ طوالٌ　　وهمٌّ ما تضمنه الضلوعُ

یعنی کیا ریحانہ کی طرف سے بلانے والے کی آواز (خیال) مجھے جگائے رکھتی ہے جب کہ میرے ساتھی سوئے ہوئے ہیں لمبی چوڑی جنگوں (یا درازیٔ عمر) اور دل کے غم و اندوہ نے میرے بالوں کو سفید کر دیا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ عمرو بن معدی کرب بسیار گو شاعر نہ تھے ان کا کلام بہت تھوڑا ہے لیکن جو ہے وہ بہت بلند نہیں تو بہت پست بھی نہیں ہے۔ اس لئے ان کو مخضرمین کے دوسرے طبقہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کا دیوان بھی ہے جس کی بعض لغویوں نے شرح بھی لکھی ہے۔

عمرو ایک اچھے مقرر بھی تھے، ان کی تقریر کا نمونہ وہ تقریر ہے جو انھوں نے کسریٰ کے دربار میں کی تھی، جس ابتدائی جملے یہ تھے، إنما المرء بأصغریه قلبه ولسانه (۱)

---

(۱) پوری خطبہ العقد الفرید میں ہے۔

حوالہ جات عمرو بن معدی کرب
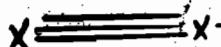
۱۔ الاغانی : اصفہانی ج ۱۵۔

۲۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ۔ جرجی زیدان

۳۔ الوسیط فی الادب العربی، احمد الاسکندری وعنانی۔

۴۔ تاریخ الادب العربی ڈ۔ عمر فروخ۔

۵۔ تاریخ الادب العربی: احمد حسن الزیات۔

۶۔ شعر المخضرمین۔ ڈاکٹر یحییٰ الجبوری۔

3/3

اَلَمْ تعلَمی اَنّی رُزِئتُ محاربا ۔ فمالکِ بعدَ الیوم خیرٌ ولا لیا

ومِن قبلِہ ماقدرُزِئتُ بوَحوَحٍ ۔ وکان ابنَ اُمّی والخلیل المصافیا

فتیً لکُنتُ خیراتُہ، غیرَ اُنّۃ ۔ جوادٌ فما یُبقِیْ من المالِ باقیا

فتیً تم فیہ مایُسّرصدیقَہ ۔ علیٰ اَنّ فیہ مایسوءُ الاعادیا

حِکمت وفلسفہ میں:

ولاخیرَ فی حلمٍ اذا لم تکن لہ ۔ بوادرُ تحمی صفوہ اَن یکدرا

ولاخیرَ فی جہلٍ اذا لم یکن لہ ۔ حلیمٌ اذا ما اَورد الامرَ اَصدرا

نابغہ جعدی کے دیوان کے بارے میں پتہ نہ چل سکا کہ وہ مکمل چھپا کہ نہیں۔

۱۰- اُبوذُؤَیب الھُذَلی

م ۲۸ھ / ۶۴۹-۶۴۶ء (۱)

صدر اسلام میں مخضرمین شعراء کے حلقہ میں کئی شعراء ایسے گذرے ہیں جو یا تو محض اپنے مخصوص صنف سخن میں امتیازی شان کی وجہ سے مشہور ہوئے جیسے خنساء کہ ان کا امتیازی صنف سخن مرثیہ تھا۔ یا جو صرف ایک قصیدے کی وجہ سے شہرت دوام حاصل کر گئے جیسے کعب بن زہیر کہ ان کو رسول اللہ کی شان میں کہا ہوا ان کا قصیدہ' بانت سعاد' ابدی زندگی دے گیا۔ اسی طرح زیر نظر شاعر ابوذُؤیب الھُذَلی کا بھی معاملہ ہے کہ اس کو بھی اس کا صرف ایک مرثیہ زندہ جاوید کر گیا۔

ابوذویب کا نام خُوَیلِد تھا اور کنیت ابوذویب اور نسبت قبیلۂ ھُذیل کی طرف تھی (۲)

خاندان ھذیل بہت مشہور اور مردم خیز قبیلہ ہے اس میں بہت سے نامور شعراء ہوئے ہیں جیسے ابوصخر الھذلی وغیرہ۔ ابوذویب جاہلی زمانہ میں پیدا ہوا لیکن اس کی ابتدائی زندگی کے حالات کا علم نہ ہوسکا۔ صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ وہ اپنے قبیلہ کے شاعر ساعِدۃ بجُؤیّہ الھذلی کا شاگرد اور اس کا راویہ تھا۔ قبیلۂ ھذیل حجاز میں رہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بقول مورخوں کے یہ بہت بعد میں اسلام لایا اسی لئے شاید ابوذویب الھذلی بھی بہت دیر

---

(۱) سن وفات میں اختلاف ہے بعض مورخین کا کہنا ہے کہ ان کا انتقال ۲۸ھ مطابق ۶۴۹ء میں ہوا۔

(۲) سلسلہ نسب یوں ہے خویلد بن خالد بن مُحَرِّث بن زبید بن مخزوم بن صاھلہ بن کاھل بن الحارث بن تمیم بن سعد بن ھُذیل۔

میں اسلام لایا۔ لیکن مسلمان ہونے کے بعد اتنا سخت اور مخلص مسلمان ہوا کہ
جب حضرت عثمان نے افریقہ کی مہم کے لئے فوج روانہ کی تو یہ بھی ۲۶ھ/۶۴۶ء میں
اپنے پانچ جوان بیٹوں کو لے کر فوج میں شامل ہوا اور افریقہ کی مہم جوئی کے لئے نکل
کھڑا ہوا خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کے پانچوں بیٹے مصر پہنچ کر طاعون میں مر گئے
لیکن ابوذویب نے ایسے صبر و سکون کا ثبوت دیا کہ نہ صرف یہ کہ منہ سے اف تک
نہ کی بلکہ افریقہ کی مہم جوئی پر جو عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی سرکردگی میں بھیجی گئی
تھی مستقل چلتے رہے، یہاں تک کہ قرطاجہ کے معرکہ میں شریک ہوئے اور فتح و
نصرت سے شاد کام ہوئے۔ قرطاجہ آج کل تونس کے مضافاتی علاقے میں
پڑتا ہے۔ اور اس زمانہ میں رومیوں کا دارالسلطنت تھا۔ فتح کے بعد سپہ سالار
عبداللہ بن ابی سرح نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ شریعت کے مطابق مدینہ میں
خلیفہ کے پاس بھیجنے کے لئے عبداللہ بن الزبیر اور ابوذویب الھذلی کو
متعین کیا۔ جب یہ دونوں مصر پہنچے تو ابوذویب کو ایک سانپ نے کاٹ لیا
اور وہیں ۲۸ھ/۶۴۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

امتیازی خصوصیات :-

ابن سلام الجمحی نے ابوذویب الھذلی کو جاہلی شعراء کے تیسرے طبقہ میں
النابغہ الجعدی اور لبید بن ربیعہ کے ساتھ ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ابوذویب
بہت بڑا شاعر تھا جس کے کلام میں نہ کہیں جھول ہے اور نہ کمزوری (۱)۔

ابو عمر نے روایت کی ہے کہ ایک دفعہ حسان بن ثابت سے پوچھا گیا کہ
سب سے اچھا شاعر کون ہے تو بولے "قبیلوں میں یا آدمیوں میں" تو کہا گیا کہ
"قبیلوں میں"، تو حسان نے کہا کہ قبیلوں میں تو شاعروں میں باکمال قبیلۂ ھذیل
ہے۔ اور ھذیلیوں میں بلا خوف تردید ابوذویب بڑا شاعر ہے۔ (۲)

---

(۱) طبقات فحول الشعراء ص۱۱۱ شرح محمود محمد شاکر۔

(۲) ابن سلام نے کہا ہے کہ یہ ابو عمرو کا قول نہیں ہے بلکہ ہمارا قول ہے نفس مرجع ص۱۱۱۔

جیساکہ پہلے بیان ہوا ابو ذویب کا جو کلام ہم تک پہنچا ہے وہ بہت نہیں ہے اس کا سب سے اعلیٰ اور وہ قصیدہ جس سے اس کو شہرت ملی وہ مرثیہ ہے جو اس نے اپنے پانچوں بیٹوں کے مرنے پر کہا تھا یہ مرثیہ خاصا بڑا ہے اور اس میں ذویب نے بہت سی حکمت و فلسفہ اور عقل مندی کی باتیں کہی ہیں اور زندگی کے رموز بتائے ہیں۔ کچھ شعر شراب و کباب اور سیر و شکار سے متعلق بھی ملتے ہیں۔ نمونہ کے طور پر مرثیے کے چند شعر ملاحظہ ہوں کہتا ہے۔

أمِنَ المنون و ریبها تتوجعّ   والدھرُ لیسَ بمعتبٍ من یجزعُ
قالت أمیمة ما لجسمک شاحبًا   منذ ابتُذِلتَ ومثل مالک ینفعُ
فأجبتُها أما لجسمی أنّه   أودی بَنيّ من البلاد فودّعُوا
أودی بَنِیّ وأعقبونی حسرةً   بعد الرقادِ وعبرة ما تقلعُ
سبقوا هَوَیّ واعنقوا لهواهم   فتُخُرِّموا ولکلِ جنبٍ مصرعُ
فغبرتُ بعدهمُ بعیش ناصبٍ   وإخال أنّی لاحقٌ مستتبعُ
ولقد حرصتُ بان أُدافِعَ عنهم   وإذا المنیةُ أقبلتْ لا تُدفعِ
فالعینُ بعدهمُ کأنّ حِداقها   سملت بشوکٍ فهی عورٌ تدمعُ
حتی کانّی للحوادث مروة   بصفا المشقرِ کلَّ یومٍ تقرعُ

یعنی کیا تم حوادث زمانہ اور موت سے ڈر کر آہ و زاری کرتے ہو حالانکہ زمانہ اس کو کبھی خوش نہیں رکھتا جو روتا دھوتا رہتا ہے۔ امیمہ نے کہا کہ میں تم کو دیکھ رہی ہوں (بیٹوں کے مرنے کے بعد سے جن کی موجودگی میں تم کو کام کاج نہیں کرنا پڑتا تھا) جب سے تم نے سفر اور کام کاج میں اپنے کو تھکانا شروع کر دیا ہے کہ تمہارا جسم گھلتا جا رہا ہے۔ حالاں کہ تمہارے پاس اتنا مال و دولت ہے کہ جو تمہارے لئے کافی ہوگا (اور تم کو کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی) یہ تمہارے جسم کو کیا ہو گیا ہے کہ کسی بستر پر قرار ہی نہیں آتا ہر بستر پر تمہاری نیند اڑ جاتی ہے یعنی ان کے غم میں نیند نہیں آتی۔

تو میں نے اس کو جواب دیا کہ جسم کو جو آزار لاحق ہے وہ وہی ہے جس نے

رے بچوں کو ہلاک کر دیا تو وہ ملک سے رخصت ہو گئے۔

میرے بچے تو ختم ہو گئے لیکن وہ مرنے کے بعد مجھے ایسی حسرت اور ایسے آنسو دے گئے کہ کبھی تھمتے ہی نہیں۔

وہ مجھ سے پہلے ہی یکے بعد دیگرے چل بسے حالاں کہ میں یہ چاہتا تھا کہ میں ان سے پہلے مرتا۔ پر کیا کیجئے کہ ہر آدمی کی موت مقرر ہے۔

میں ان کے بعد ایک تکلیف دہ زندگی گذارنے کے لئے رہ گیا (مگر) میں سمجھتا ہوں کہ (ایک دن) میں ان سے جا ملوں گا۔

میں نے یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ ان کی طرف سے مدافعت کرتا رہوں گا لیکن جب موت آگئی تو پھر ٹالے نہیں ٹلتی۔

اب آنکھوں کی ان کے مرنے کے بعد یہ حالت ہے کہ جیسے پتلی کو کسی کانٹے سے پھوڑ دیا گیا ہو جس سے تکلیف کی شدت کی وجہ آنسو مستقل بہے جا رہے ہیں

گویا میں حوادث زمانہ کے لئے مشقر پہاڑ کی وہ چٹان ہوں جسے ہر روز سنگریاں ماری جاتی ہوں۔ (۱)

حکمت و فلسفہ :-

اسی مرثیہ میں موت کے متعلق بڑی حکیمانہ بات کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ جب موت پنے پنجے گاڑ دیتی ہے تو پھر کوئی گنڈہ تعویذ کام نہیں آتا۔ اسی لئے مرنے والوں پر رونا دھونا بے وقوفی کی بات ہے۔ مگر کیا کیجئے کہ یہ زمانہ کی ریت ہے کہ جس کے دل پر موت کی وجہ سے چوٹ لگتی ہے تو اس کی آنکھیں گنگا جمنی بہانے لگتی ہیں۔

تم پر بھی ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ تم تو منہ ڈھانکے پڑے ہو گے اور لوگ تم پر رو رہے ہوں گے مگر تم نہیں سن رہے ہو گے۔

---

(۱) المشقر : ھذیل کے ایک پہاڑ کا نام ہے ممکن ہے یہاں اس کی مراد مشقر پہاڑ کی اس چٹان سے ہو جو مکہ کے قریب ہے اور جسے حاجی لوگ حج کے دنوں میں شاتت کنکریاں مار اکرتے ہیں ایک روایت میں "بصفا المشرق" بھی آیا ہے۔

جی کی تو یہ بات ہے کہ اس کو ڈھیل دو تو وہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اور اگر تھوڑے پر ہی اسے روک دو تو پھر رک بھی جاتا ہے۔

وإذا المنيةُ أنشبت أظفارها ... ألفيتَ كلَّ تميمة لا تنفعُ

ولقد أرى أن البكاءَ سفاهةٌ ... ولسوفَ يُولَعُ بالبكا مَن يُفجَعُ

وليأتينَّ عليك يومٌ مرةً ... يُبكى عليك مُقنَّعًا لا تسمعُ

والنفس راغبةٌ إذا رغّبتها ... وإذا تُرَدّ إلى قليل تقنعُ

اس مشہور قصیدہ کے علاوہ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب الشعر والشعراء میں کچھ مزید قصیدوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مگر ان کا معیاری قصیدہ یہی عینیہ قصیدہ ہے اور اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت و فلسفہ کے علاوہ اس کے اسلوب میں ابو ذویب کا وقار ان کی شخصیت کی متانت و سنجیدگی اور فکر و فن کی گہرائی صاف جھلکتی ہے جس میں نہ تکلف ہے اور نہ آورد بلکہ سہل آسان فہم اور صاف ستھرا انداز بیان اور اسلوب نگارش ہے۔

ابو ذویب الھذلی کا ایک دیوان بھی ہے۔ جسے یوسف (Hell J.) نے ہانوور سے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا تھا۔

حوالہ جات:

۱۔ طبقات فحول الشعراء؛ عبد السلام الجمحی۔

۲۔ تاریخ آداب اللغة العربية جرجی زیدان اول۔

۳۔ تاریخ الادب العربی؛ حنا الفاخوری۔

۴۔ تاریخ الادب العربی؛ ڈ۔ عمر فروخ۔